محمد عبد الغفار

امن اور اہل قلم

امن کے متعلق اگر اہل قلم کے فرائض کا کوئی ذکر کرنا چاہے تو میں اپنی
بات کو اس مفروضہ سے شروع کروں گا کہ امن سے بھی اہل قلم کو وہی نسبت
ہے جو جنگ سے ہے۔ ہر قوم کا ادب اس کے فکر اور احساس انسانی کا آئینہ
ہوتا ہے۔ اور اگر وہ یہ نہیں ہے تو پھر کچھ بھی نہیں ہے۔

دوسری عالمگیر اور عالم سوز جنگ کے بعد اب ہم ایک ایسے دور
تشکیک سے گذر رہے ہیں جس میں زندگی کی نہ تو قدریں ابھی تک معین
ہوئی ہیں۔ اور نہ انسانی افکار میں ٹھہراؤ۔ اور استقلال کی حالت پیدا ہو سکی
ہے۔ انسانیت کے وجود پر جنگ کے زخم ابھی ہرے ہیں۔ یہ ایک عبوری
دور ہے۔ جس میں آج چند نظریات قائم ہوتے ہیں۔ اور کل وہ مسمار ہو
کر رہ جاتے ہیں۔ جمہوریت حقوق انسانیت۔ چار آزادیاں حق خود
ارادیت اور آزادی کی بہت سی اصطلاحیں رقیق حالت میں ہیں اور
پانی کی طرح ایک سانچے سے دوسرے میں انڈیلی جا رہی ہیں! جس رنگ
کا شیشہ ہوتا ہے وہی رنگ اس پانی کا نظر آتا ہے۔

شک۔ خوف۔ فریب اور عقائد کے ضعف کی اس حالت میں
اہل قلم کو بھی ابھی کوئی سیدھا راستہ نہیں ملا ہے۔ عام طور پر ان کی حالت
یہ ہے کہ ؎

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

انسانوں کی زندگی کا شیرازہ اس قدر بکھر گیا ہے کہ اب پھر اس
کی شیرازہ بندی میں کچھ زمانہ صرف ہوگا۔

اگر میرے لئے اس موضوع کے انتخاب کا یہ مقصد ہے کہ اس
وقت اس مسئلہ سے بحث کی جائے کہ اہل قلم امن کے قائم کرنے میں
کیا مدد دے سکتے ہیں۔ تو میں سوائے اس کے کیا کہوں کہ اس کار خیر میں
قلم کی توانائی وہی کام کر سکتی ہے جو جنگ کے جیتنے میں تلوار کی توانائی
سے لیا جاتا ہے۔ قلم خود ایک تلوار ہے ـــــ مگر وہ دو دھاری تلوار
ہے ـــــ وہ دونوں طرف کاٹتی ہے اور اب بیسویں صدی عیسوی
کے افکار انسانی نے قلم میں اتنی طاقت پیدا کر دی ہے کہ اس کی نوک
کبھی تو احساس انسانی کی رگوں میں گھس کر ہر قسم کا زہر داخل کرتی ہے۔
اور کبھی پکے ہوئے پھوڑوں میں سوراخ کر کے ان کا مادۂ فاسد خارج
کر دیتی ہے۔

دوران جنگ میں ہم نے قلم کی قوت کے اتنے حقیقت نواز
اور حقیقت سوز مظاہرے دیکھ لئے ہیں کہ اب اس بات کا تعین کرنا
مشکل ہو گیا ہے کہ کبھی بھی اہل قلم امن و امان کی خاطر اتنا ہی زور قلم صرف
کر سکیں گے جتنا انہوں نے جنگ کے متعلق صرف کیا۔ لیکن جیسا کہ میں
نے کہا قوموں کا ادب اُن کی زندگی کا آئینہ اور اُن کے احساسات و
افکار کا ترجمان ہوا کرتا ہے اس لئے انسانوں کی وحشیانہ فطرت کی اُن
تصویروں کے بعد جو اس آئینہ میں ہم نے دیکھی ہیں اگر زندگی کا کوئی
گوشہ ایسا بھی موجود ہے جہاں خالص اور بے عیب انسانیت کارفرما
ہے یا ہو سکتی ہے تو یہ کام بلاشبہ اہل قلم ہی کا ہے کہ وہ امن و انسانیت
کے عکس کو اجاگر کریں۔ اس کے دھندلے نقوش میں رنگ بھریں اس
کے نقوش اور دائروں میں انسانیت کی روح کو (جو ابھی تک بے قرار
ہے) بھر دیں اور زندگی کے نگار خانہ میں تمدن اور اخلاق کے مسخ چہروں
کو از سر نو سنواریں۔

اس حقیقت سے روشناس ہونے کے لئے کہ آیا متمدن ممالک
کے اہل قلم اس حق اور حقائق کشی کی اس مصروفیت کے بعد جس نے
فسطائیت دشمنی کے رنگ میں خود اپنی فسطائیت کے تماشے بھی اہل
نظر کو دکھائے اب اپنا نقشہ بدلیں گے اور تخریب کے اس ہنگامہ کے
بعد تعمیر کی شرطیں پوری کر سکیں گے۔ ہمیں بہت دور جانے سے
پہلے خود اپنے گرد و پیش کے ادب کے جدید رجحانات کا [illegible]
[illegible] ہندوستان کی زبانوں کے ادب میں جو جدید [illegible]

نمایاں ہو رہے ہیں۔ اُن میں ابھی تک تنقیص، تخریب، نفرت و بغاوت کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ اور اگر آپ یہ چاہیں کہ میں آپ سے بے محابا یہ کہہ دوں کہ ادب میں نفرت و بغاوت اور تخریب کا یہ عنصر بہت بُرا ہے تو میں ایسا تو نہ کہوں گا! تخریب یا نفرت محض تخریب کی خاطر یقیناً بری چیز ہے لیکن تعمیر بغیر تخریب کے بھی اگر ممکن ہے تو یہ امن ارتقاء کی اس اصطلاحی افیون کا نشہ اور اس نشہ سے پیدا ہونے والی غنودگی کا تجربہ گزشتہ ڈیڑھ سو برس میں حاصل ہوا ہے وہ تو تعمیر کے اُن تھکے ہوئے نظریات کو مجھ پر ذرا بھی مؤثر نہیں بناتا۔

تعمیر کے لئے تخریب اتنی ہی ضروری ہے جس طرح ترقی کے لئے قدیم نظریات سے بغاوت! تغیر کے بغیر بغاوت موثر نہیں ہوتی۔ جس طرح بوڑھے جسم میں محض خضاب لگانے سے توانائی پیدا نہیں ہو سکتی۔ جدید ادب (میں صرف اپنے ہی ملک کا ذکر کر رہا ہوں) اگر زندگی کے قدیم بندھنوں کو توڑ کر میدان میں نہیں آتا وہ ان نئے افکار کی ترجمانی بھی نہیں کر سکتا جو جنگ کے بعد پیدا ہوئے ہیں تو زندگی کے قدیم نقشوں میں ان افکار کا کوئی مقام نہیں۔ ہمارے قدیم ادب میں امن کا تخیل یا تو قدیم دیوان خانوں کی محفلوں اور مشاعروں میں حسن و عشق، . . . ماہ، ابروئے خمدار۔ عارض تاباں اور وصل و فراق کی داستانوں یا زلفت۔ تک محدود ہو چکا تھا یا زیادہ سے زیادہ شاہنامہ اور طلسم ہوشربا کی قصہ خوانی کے کمالات تک پہنچ کر جب سر سید۔ حالی و شبلی سی قدر جاگے ادب کی سوئی ہوئی توانائی نے بھی ایک کروٹ لی ۱۸۵۷ء کے بعد سے شکست خوف اور کمتری کا ایک احساس اور (Escapism) کا عنصر ہمارے ادب پر حاوی تھا (Escapism) کا صحیح ترجمہ کرنے کیلئے مجھے ابھی تک کوئی اچھا لفظ نہیں ملا ہے مگر میں اسے ایک ایسی کیفیت سمجھتا ہوں جب عمل اور احتجاج کی طاقت سلب ہو چکی ہوتی ہے۔ اور انسان اپنی بدحالی اور مجبوری کے احساس کو بھول جاتا ہے اور حقائق سے دور بھاگنے کی خواہش سے مغلوب ہو کر آرٹ اور لٹریچر کی نغمات میں پناہ لیتا ہے۔

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے بعد سے ادب میں اہل قلم کی اس [illegible] ایک حرکت پیدا کرنے لگا اور ایک نا معلوم ذہنی انقلاب نے دھیرے دھیرے اپنے [illegible] کرنا شروع کیا۔ ابھی یہ جدید ادب [illegible] منزل میں تھا۔ جب دوسری جنگ عظیم نے اس کو [illegible] لیا کہ جو ممالک جنگ سے قریب تھے انہوں نے جنگ کے اغراض کیلئے اپنے تمام اہل قلم کی توانائیوں کو وقف کر دیا۔ ہندوستان [illegible] میں محض ایک پیش خدمت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس لئے اسے کسی قدر فاصلے سے دُنیا کے اس ابتلائے عظیم کا تماشا دیکھ کر کچھ سوچنے اور سمجھنے کا موقع ملا اور اس کی نظروں کے سامنے سے پردے اُٹھنے شروع ہوئے۔ شکست و فتح کے میدان میں بالادست ممالک کی ذہنی بد امنی کی حالتیں سامنے آ کر اور پھر اُس آئینہ میں اُسے خود اپنی صورت بھی زیادہ واضح نظر آنے لگی۔ اب اُس نے اس پس منظر میں خود اپنی زندگی کو ایسے ادب کے آئینہ میں پیش کرنا شروع کیا اور تعمیر کے ارادے سے تخریب شروع کی۔ جس نے قدیم افکار کی عمارتیں مسمار کرنی شروع کیں۔ قدیم ادب اور لٹریچر کے دیوان خانوں کے پردے اُٹھا دیئے اور اپنی دنیا کو یہ بتانا چاہا کہ زندگی ہے کیا اور ہونی کیا چاہیئے اس مقصد کے تحت اُسے ان چادروں کو کھینچ لینا پڑا جن کے نیچے اس کی سماجی، اجتماعی اور سیاسی زندگی کے بہت پرانے ناسور چھپا دیئے گئے تھے۔ جو لوگ شکست خوردہ ذہنیت اور احساس کمتری کی افیون کھا کر اونگھ رہے تھے اور گذرے ہوئے زمانہ کے خوابوں میں اب بھی آرٹ اور لٹریچر کے پریزادوں کو رقص کرتے دیکھ رہے تھے۔ انہیں جدید ادب نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ کوئی گزرا ہوا زمانہ واپس نہیں آیا کرتا۔ اپنے لئے اپنا زمانہ انسان خود بناتا ہے پرانی تصویریں چوکھٹوں میں سے نکال دی جاتی ہیں انہیں روغن لگا لگا کر چمکانا فضول ہے۔ نئی تصویریں اور ایسی صحیح تصویریں ان چوکھٹوں میں لگائی جاتی ہیں۔ جو ایکس رے کی طرح اندر کی حالت کو عیاں کر دیں تب ہی تو ان خرابیوں سے واقف ہو کر ان کا کچھ علاج ممکن ہے۔

نئے ادب نے اپنے اس انقلاب کو پیش کیا۔ کہ امن صرف ایک ذہنی کیفیت ہے وہ کوئی ایسی چیز نہیں جو [illegible] پیدا کی جا سکے اور ایٹم بم کی دھمکی سے قائم رکھی جا سکے! اس نے ان تصورات کو سب سے پہلے ان اقوام سے پیش کیا جو سب سے [illegible]۔ مزاج

مصائب برداشت کر چکی تھیں۔ چین اور سوویٹ روس کے ادب نے زندگی کے ان حقائق کو اپنی حقائق نگاری کا موضوع بنایا اور اس بھٹی روح کے دکھوں اور صدموں سے اپنے مفلوج اعضا میں حرکت پیدا کرنی چاہی۔ اس کوشش کے کیا نتائج حاصل ہو سکے اس کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔ اب ان ممالک کا لٹریچر ہندوستان تک پہنچ رہا ہے دوسرے ممالک کے ادب نے بھی ایک نئی کروٹ لی لیکن ان کے تصور کو (جس کے ساتھ ایک خوشحال سماج کا تصور وابستہ ہے) نئے ادب کے اس جدید تخیل کو سب سے زیادہ امداد انہی ممالک نے دی جو قدیم زندگی کی مصیبتوں سے نجات پاکر اپنے لئے ایک نئی دنیا بنانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنی دنیا کے لئے نیا لٹریچر پیدا کیا اور اس نئے لٹریچر نے نئے سانچوں میں نئی زندگی کو ڈھالا۔ اگر دنیا میں امن کا کوئی دور آنے والا ہے تو ہر جگہ ذہنی ارتقاء کا یہ استقلال عمل بہت ضروری ہے۔ ۱۹۴۶ء میں ابھی ابھی ایک ابتلائے عظیم سے نجات پانے کے بعد ہم نہ تو میر اور سودا اور انشاء کے شاعرانہ افکار کی تقلید میں اپنا وقت ضائع کر سکتے ہیں اور نہ شرر اور رتن ناتھ سرشار کی اصطلاحوں میں زندگی کی صحیح ترجمانی کر سکتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ آرٹ بجائے خود بھی ہماری جذباتی زندگی میں اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ لیکن ایسے تعیش کی ہمیں فرصت کہاں! بیشک میر و سودا اور شرر و سرشار بھی اپنے زمانہ کے کچھ مسائل رکھتے تھے جن کی اصلاح میں انہوں نے اپنے آرٹ کو استعمال کیا ہوگا۔ لیکن ہماری طرح اپنی نسل کے صرف (۲۵) سال میں عالمگیر جنگ کی دو ایسی انسانیت سوز اور دوزخی آتش زدگیوں سے کب گذرے تھے؟ کب انہوں نے اعلیٰ ترین انسانیت کو اس طرح ہلاک ہوتے دیکھا تھا؟ کب انہوں نے علم و فضل کے اتنے اونچے اونچے میناروں اور گنبدوں کو مسمار ہوتے دیکھا تھا! جو طوفانی ہوائیں آج چل رہی ہیں اس کے سامنے ان اساتذہ کی محفلوں کے چراغ کیا ایک لمحہ بھی روشن رہ سکتے!

معاف کیجئے۔ شاید آپ میری باتوں سے خفا ہو جائیں لیکن ادب کی قدیم محفلوں میں آرٹ کا تصور ایک قسم کی مارفیا کا اثر تھا۔ مارفیا درد کو تو دبا سکتی ہے اس کے احساس کی دھار کو کند تو کر سکتی ہے۔ لیکن درد کو ختم نہیں کر سکتی۔ وہی حال ہمارے قدیم آرٹ اور ادب کا تھا جسے ہم امن کا زمانہ کہتے ہیں۔ لیکن وہ دراصل بیماری کی غفلت کا زمانہ تھا۔

اب جبکہ دنیا ایک خوفناک زلزلہ کے بعد کچھ اور ہی ہو گئی ہے امن کا وہ تصور بھی باقی نہیں جو پچاس سال پہلے تھا۔ اب اگر ہم امن چاہتے ہیں تو اس کے ساتھ زندہ رہنے کے کچھ حقوق بھی مانگتے ہیں جن کے بغیر امن کی تمام اصطلاحیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ اس امن کی صحیح کیفیت پیدا کرنے کے لئے اہل قلم کو بھی حقائق نگاری سے آپ کے منہ کا مزا تلخ کرا دینا پڑے گا۔ بہت سے سماجی تالابوں کے ساکن پانی پر بڑے بڑے پتھر پھینک کر ان میں کچھ تلاطم پیدا کرنا پڑیگا۔ سماج کی جو مینڈکیں ان تالابوں میں امن اور سکون کی زندگی بسر کر رہی ہیں انہیں بار بار یاد دلانا پڑے گا کہ ان کے تالابوں کے باہر بھی ایک دنیا ہے جہاں سورج چمکتا ہے! اس عمل کو اگر آپ بغاوت اور تخریب کے نام سے موسوم کرتے ہیں تو کر لیجئے لیکن ہوگا تو یہی کہ ایک نئی دنیا نیا آدم بنایا جائے گا۔

سماج کے چور ضرور پکڑے جائیں گے اُن کی تمام چوریاں پکڑی جائیں گی۔ تب ہی ہمارا ادب اور ہمارا آرٹ حقیقی امن کا کوئی مؤثر پیام آپ کے دلوں تک پہنچا سکے گا —— اسے آپ بغاوت کہئے یا تخریب!

اس شخص کی نسبت آپ کیا کہیں گے جس کی صورت نہایت بری ہو لیکن وہ اپنے کو یا تو حسین سمجھنے پر اصرار کرتا ہو یا اپنی بدصورتی کی یاد کو بھلا دینے کے لئے کبھی آئینہ دیکھتا ہی نہ ہو۔ اب اگر ایسے شخص کے سامنے آپ زبردستی آئینہ رکھ دیں گے تو وہ یقیناً خفا ہوگا۔ حقیقی ادب ایک آئینہ ہے کسی کی مرضی کا پابند نہیں سب کے سامنے آتا ہے اور سب کو اُن کی اصلی صورت دکھاتا ہے۔ آپ خفا ہو کر اس آئینہ کو توڑ دیں لیکن اس کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں میں بھی صورت وہی نظر آئے گی! لہٰذا جب آپ اس آئینہ سے خفا ہوئے بغیر اس میں اپنی زندگی کے حقائق کا صحیح عکس دیکھنا گوارا کرنے لگیں اس وقت آپ جدید ادب کی اس بغاوت میں اپنے لئے حقیقی خوشحالی اور امن کا ایک

پذیر نہ پائیں گے ۔ ادب اور ادیب امن اور خوشحالی کے جن تصورات کو پیش کرتا ہے ۔ وہ جب تک بدحالی اور بدامنی کے پس منظر میں پیش نہ کئے جائیں ۔ موثر اور کارگر نہیں ہو سکتے ۔ جس دن آپ اس بات کو تسلیم کر لیں تو اسی دن آپ یہ بھی تسلیم کر لیں گے کہ ادب اور ادیب زندگی کا ایک ماہر فن معمار ہے ۔ تلوار جس بستی کو ویران کرتی ہے قلم اس کو آباد کر سکتا ہے !! اہل قلم کی جد و جہد جسے ہم جدید ادب کے نام سے موسوم کرتے ہیں ایک ایسا معیار ہے کہ اس کی کامیابی کو ہم امن کی کوششوں کی کامیابی کا پیمانہ بنا سکتے ہیں ۔ جس قدر "جدید ادب" "ترقی کرے گا ۔ اسی قدر "نئی زندگی" پیدا کرے گا ۔ اور جس قدر نئی زندگی پیدا ہوگی اسی قدر امن کی بنیادیں استوار ہوتی جائیں گی ۔ نوجوان نسلوں کی طرح نوجوان ادب سے بھی ہماری تمام تر آرزوئیں وابستہ ہیں ۔ ستر برس کی بوڑھی عورت کو کتنی ہی اچھی طرح دلہن بنا کر بٹھا دیا جائے ۔ مگر "نوجوان ادب" کی محفل میں کوئی نظر اس "آب و رنگ و خال و خد" سے دھوکا نہیں کھا سکتی ۔ ادب کے ذریعہ سے حقیقی امن کے تخیل میں توانائی پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ نئے ادب سے ملک کو زیادہ مانوس کیا جائے ۔ قدیم اصطلاحوں کے نگار خانوں سے ہم باہر آئیں اور بازار کی سجی سجائی دوکانوں کی آرائش سے دھوکا کھانے کے بجائے زندگی کی تنگ و تاریک گلیوں کے اندر گھسیں اور وہاں کی گندگی اور مصیبت سے اپنے زندہ رہنے کے ارادے کو تقویت پہنچائیں ۔ یاد رکھئے کہ امن کوئی بازار کا سودا نہیں جسے ہم دوکان سے خرید لائیں ۔ وہ خود اپنی اخلاقی اور سماجی زندگی کی ایک مستحکم تنظیم ہے جو کسی قانون کے ذریعہ سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اپنے ارادے اور اپنے قومی ادب کی تعمیر سے ہی حاصل ہو سکتی ہے جس طرح جسم کی عریانی کے لئے لباس کی ضرورت ہے اسی طرح سماجی زندگی کے تحفظ کے لئے ایک صحت بخش قومی ادب بھی ضروری ہے ۔ قومی زندگی میں قومی ادب کے بغیر جدید قومی کا دوران خون قائم نہیں رہ سکتا اس لئے ملک کے نوجوان ادیبوں کو چاہئے کہ وہ اپنی زندگی سے اپنے ادب کو قریب لائیں ۔ تب ہی وہ اپنی قوم میں ایک خوشحال اور باعزت امن کے احساس کی معنوی بنیاد قائم کر سکیں گے ۔

(نشرگاہ حیدرآباد سے نشر ہوا)

نئے زاویئے

مرتبہ : کرشن چندر (جلد دوم)

ایک نظریہ ، ایک پکار ، ایک نقطہ —— جو زندگی کی منتشر اور آوارہ لکیروں کا سنگم ہے —— ایک مینارۂ نور ، جس کی چوٹی سے شعاعیں پھوٹ پھوٹ کر ماحولی ظلمت کے دبیز پردوں کو تھرتھرا رہی ہیں —— زندگی ایک عبوری دور میں گرفتار ہے ۔ ماضی کے پچھتاوے اور حال کی کشاکش نے اسے ایک نازک ترین خم پر پہنچا دیا ہے اور آئندہ صبح کی دلفریب اور رعنا سپیدی اسے اشاروں سے بلا رہی ہے —— نئے زاویئے کے فنکار وقت کی ان تینوں کیفیتوں کی عکاسی کرتے ہیں ۔ یہ بیباک کارواں زندگی سے فرار نہیں ، پیار کرتا ہے ——

"نئے زاویئے جلد دوم" —— اس تابناک مینارے کی دوسری شعاع ہے ۔ زندگی اور ادب کا یہ نورانی اور حیات بخش سیلاب ، مسلسل ہے ، مستقل ہے ، جاودانی ہے ۔

اس کتاب میں آپ کے سبھی محبوب فنکار شریک ہیں ۔

قیمت : ۶ چھ روپے

مکتبہ اردو لاہور

افسانہ نگاری

نظیم

لانا ہے جوئے شیر کا......

کائنات کے چپہ چپہ میں افسانہ نگار کے لیئے بے گنتی، بے شمار موضوع ہے پڑے ہیں۔ مظاہر قدرت، سمندر، پہاڑ، جنگل اور ان سب میں پلی ئی زندگی۔ خدا کی پیدا کی ہوئی عجیب سے عجیب جاندار اور بے جان یں، ہاتھی، گھوڑے، اونٹ، گائیں، بکریاں، کُتا، بلی، طوطا، مینا، چوہے لوش، سانپ، بچھو اور ہر طرف رینگنے والے کیڑے مکوڑے۔ پھر سب پر حکمرانی کرنے والا انسان۔ اُس کی بوقلموں زندگی، اس بوقلموں ندگی کے نت نئے مسئلے۔ ایک انسان، دوسرا انسان، تیسرا انسان اس رح دنیا کے بے شمار انسان اور اُن میں سے ہر ایک کی اپنی اپنی عادت، اپنا کردار، اپنے جذبات، احساسات اور اندر چھپی ہوئی کتنی ہی نفسیاتی پیدگیاں ——— یہ اور نہ جانے کتنے موضوع ہر وقت افسانہ نگار کی فر اور فکر کو دعوت دیتے ہیں۔ پھر ہر افسانہ نگار کی اپنی الگ نظر ہے۔ نا علیحدہ سوچنے کا طریقہ ہے۔ اور اس طرح کائنات کے یہ بے نتی، بے شمار موضوع نہ کبھی ختم ہوتے ہیں اور نہ اِن میں کبھی پرانا پن پیدا ہوتا ہے، پرانا پن یا فرسودگی موضوع میں نہیں، موضوع تلاش لرنے والی نظر میں پیدا ہو جاتی ہے، سوچنے والے دماغ میں پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے موضوع تلاش کرنے والے کے پاس ایک متجسس، پریشان اور کبھی ایک جگہ نہ رُکنے والی نظر، اور کبھی ایک چیز سے مطمئن نہ ہونے والا مضطرب دل ہو تو افسانہ کے لئے موضوع بہت ہیں۔ یہ موضوع تیز نظر اور جاگتے ہوئے ذہن کے سامنے خود بخود آتے ہیں۔ اچھا افسانہ نگار آرام سے آنکھیں بند کئے اپنی کرسی پہ بیٹھا ہے یا دنیا کی ہر فکر سے آزاد ہو کر اپنے بستر پر دراز ہے۔ عین اس بے خبری میں جیسے کوئی آ کر دروازہ کھٹکھٹاتا ہے کہ "معاف کیجئے گا جناب! میں ایک افسانے کا موضوع ہوں۔ آپ مجھے استعمال کیجئے"۔ ایسے ناخواندہ لیکن مبارک مہمانوں کی کمی سوتے ہوئے ذہن کو تو شاید محسوس ہوتی ہو۔ لیکن جس نے اپنی نظر کو کائنات کی عکاسی

کے لئے وقف کر دیا ہے، جس کا دل ہر وقت کسی نئے جذبہ سے معمور نظر آتا ہے اور جس کے ذہن میں ہر وقت دیکھی اور محسوس کی ہوئی باتوں کو جگہ دینے اور اُن پر غور و فکر کرنے کی گنجائش ہے۔ اُسے افسانے کے موضوع ہر وقت سوجھتے ہیں اور بغیر کسی کاوش کے سوجھتے ہیں۔ وہ بن بلائے مہمانوں کی طرح ہر وقت اُس کے دروازے پر دستک دیتے ہیں۔ افسانہ نگار کی نظر کے سامنے کوئی چیز آتی ہے۔ اور یہ چیز جیسے خود بخود ذہن میں ایک نیا موضوع لا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ اُس کے ذہنی، اخلاقی اور جذباتی سرمایہ میں گھُل مل کر یہ موضوع یا مرکزی خیال ایک افسانہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے ——— یا پھر کبھی دوستوں سے باتیں کرتے وقت محض ایک لفظ، سڑک پر گزرتے ہوئے کوئی چھوٹا سا حادثہ، کسی کتاب میں دیکھی ہوئی کوئی تصویر، کسی کتاب، رسالہ یا اخبار کا ایک جملہ توانا ذہن کے لئے تازیانہ کا کام کرتا ہے۔ اور چھوٹی سے چھوٹی چیز، چھوٹی سے چھوٹی بات، ایک لفظ، ایک جملہ، ایک غلط انداز نظر، کسی نہ کسی نئے موضوع یا افسانے کے مرکزی خیال کا بہانہ بن جاتا ہے۔ اور افسانہ نگار اس خود بخود اُبھرنے والے مرکزی خیال پر کسی افسانہ کا ڈھانچہ بنا لیتا ہے۔ کبھی اُسی وقت افسانہ کی ہر تفصیل، اُس کا ایک ایک ٹکڑا، اُس کا سارا پلاٹ، اُس کی ابتدا، خاتمہ سب کچھ جیسے آئینہ کی طرح نظر کے سامنے آ جاتا ہے۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ اس موضوع یا مرکزی خیال کو مہینوں برسوں پالنا پوسنا پڑتا ہے۔ جب کہیں وہ اس قابل ہوتا ہے کہ واقعی افسانہ بن سکے۔ افسانہ نگار کو اپنی طبیعت پر ضبط اور قابو رکھ کر، اپنے جذبات کو دبا کر اس نئے موضوع کی تشکیل کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ یہ انتظار صبر آزما بھی ہے۔ اور دل شکن بھی لیکن فنی نقطۂ نظر سے بے حد اہم بھی۔ جو افسانہ نگار اِس طرح خود بخود پیدا ہونے والے خیال کو افسانہ بنانے کے لئے اتنا بے چین ہو جائے کہ اس کے پختہ ہونے کا بھی انتظار

نہ کر سکے وہ اچھے افسانے کبھی نہیں لکھ سکتا۔ اُس کے افسانوں میں پکے پھلوں کی شیرینی اور رَس دونوں چیزیں ناپید ہوتی ہیں اور اچھا افسانہ نگار کبھی اپنے پھلوں کو کھٹا اور کڑوا یا بے رس دوسرے کے سامنے لانا گوارا نہیں کرتا وہ ہر نئے آنے والے موضوع کا خیر مقدم کرتا ہے اور اُسے اپنی ذہنی اور جذباتی زندگی میں رچا کر دوسروں سے اس کا تعارف کراتا ہے۔ یہی طریقہ صحیح ہے۔ خود افسانہ لکھنے والے کیلئے بھی اور پڑھنے والے کیلئے بھی۔

لیکن موضوع ہمیشہ خود بخود ہاتھ جوڑ کر نہیں آیا کرتے ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ افسانہ نگار کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہی رہیں۔ اُسے موضوع تلاش کرنے بھی پڑتے ہیں۔ اپنے ذہن میں دبے دبائے تجربوں کو اُلٹ پلٹ کر کے دیکھنا پڑتا ہے۔ اپنے جذباتی سرمایہ کی پوری کھوج کرنی پڑتی ہے۔ اپنے پڑھے ہوئے مواد کی طرف نظر دوڑانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ جو دیکھا ہے، سوچا ہے، محسوس کیا ہے اُسے ایک ایک کر کے سامنے لانا پڑتا ہے۔ پھر بھی کوئی موضوع نہیں سُوجھتا کسی مرکزی خیال کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا۔ اس حالت میں جو کچھ سوجھتا ہے، وہ بھدا، بے رنگ اور فضول نظر آتا ہے لیکن بیٹھے بیٹھے یکبارگی انہیں اُلٹی پلٹی اور تلاش کی ہوئی چیزوں میں سے کوئی کام کی بات نکل آتی ہے اور اِس کام کی بات سے افسانہ بن جاتا ہے۔

موضوع کی تلاش افسانہ نگار کے لئے بڑا مشکل مسئلہ ہے۔ اگر اس کی نظر ہر وقت نگراں اور ذہن ہر وقت بیدار نہ رہے تو اچھے موضوع خود بخود پیدا نہیں ہوتے۔ اپنے سارے ذہنی، علمی اور جذباتی خزانے کی جانچ پڑتال کرنے کے بعد بھی یقینی نہیں کہ اچھا موضوع مل جائے اس لئے عموماً افسانہ نگار اپنا کام پُرانے اور فرسودہ موضوعوں سے چلاتے ہیں۔ کبھی کبھی ایک نیا اندازِ بیان اس فرسودگی میں کوئی ایسا نیا پن پیدا کر دیتا ہے کہ پُرانی چیز کے عیب اور اس کی اکتاہٹ چھپ جاتی ہے۔ لیکن ایسا ہمیشہ ممکن نہیں۔ کبھی نہ کبھی یہ راز فاش ہو جاتا ہے۔ اور پھر افسانہ نگار کا افسوں ہمیشہ کے لئے ختم سا ہو جاتا ہے افسانہ نگار خود بھی عموماً اِس انجام کے خطرہ سے واقف ہوتے ہیں اس لئے وہ بعض دوسری پیچیدہ راہیں اختیار کرتے ہیں۔

کبھی کبھی وہ ایسی چیزوں کو افسانہ کا موضوع بنا بیٹھتے ہیں جن میں وقتی کشش ہوتی ہے اور یہ وقتی کشش پڑھنے والوں کو اس طرف مائل کر کے افسانہ نگار کے لئے ایک وقتی سرور کا سامان مہیا کرتی ہے۔ لیکن حقیقت میں اس کشش اور سرور دونوں کو ثبات نہیں اس لئے کہ افسانہ نگار نے جس خیال کو اپنے افسانہ کا موضوع بنایا ہے اُس میں کوئی مستقل قدر نہیں۔ اور مستقل قدر کی کمی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ موضوع میں وقتی ہنگامہ کا سامان ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن اُس میں تاثیر کی پختگی نام کو نہیں ہوتی۔ ایسے موضوع کی مثال میں وہ افسانے پیش کئے جا سکتے ہیں جن میں جنس کی سطحی جذباتیت اور اُن کے مادّی نتائج کی تصویریں ہوتی ہیں یا جو افسانے کسی ایک فرقے یا گروہ کی خوشنودی کے لئے کسی دوسرے فرقے یا گروہ کی زندگی کو طنز یا جذباتی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ اِس کے علاوہ ایک دوسری چیز جسے بعض افسانہ نگار جدّت پسندی کے دھوکے میں برتنے لگتے ہیں۔ یہ ہے کہ وہ اپنے افسانہ کی بنیاد ایسے خیال یا واقعہ پر رکھتے ہیں۔ جس میں اُن کے نزدیک کوئی جدّت ہے۔ جس موضوع سے وہ خود اچھی طرح واقف نہیں ہیں، اُن کا خیال ہے کہ دوسرے بھی اُس سے ناآشنا ہیں۔ اس موضوع کی اُونچ نیچ کو اچھی طرح جانے پہچانے بغیر وہ اس میں کود پڑتے ہیں اور اُس کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جو تیراکی سے اچھی طرح واقف نہ ہونے والے اس تیراک کے لئے جو اندھا دھند گہرے پانی میں کود پڑے۔ افسانہ نگار کا پہلا منصب یہ ہے کہ وہ اپنے موضوع سے اچھی طرح واقف ہو اُسے اپنے مضمون اور موضوع سے سچی دلچسپی اور سچا لگاؤ ہو۔ اُسے اِس نے اس کی گہرائیوں میں ڈوب کر دیکھا اور سمجھا ہو۔ اِس کے متعلق ہر چھوٹی سے چھوٹی بات جاننے کی کوشش کی ہو۔ جب تک یہ سب کچھ نہیں ہوگا۔ افسانہ نگار کو موضوع پر پوری قدرت نہیں ہو سکتی۔ جسے موضوع پر قدرت نہیں وہ اس موضوع کو پھیلا کر اچھا افسانہ بنا ہی نہیں سکتا۔ جس نے گھر سے کبھی مناظر قدرت دیکھے ہی نہیں وہ منظر نگاری کیا جانے۔ جس نے گوشہ نشینی کو زندگی بنا لیا ہو۔ وہ زندگی کی مصوّری کیسے کرے؟

افسانہ نگار عموماً اس خطرہ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کی ۔۔۔ پڑ ۔۔۔ اور بُرے موضوع میں امتیاز باقی نہیں رہتا۔ جو موضوع ۔۔۔ لگے، ضروری نہیں کہ وہ اچھا ہی ہو۔ اِس لئے افسانہ ۔۔۔ ہے کہ ظاہری حسن و خوبی سے متاثر ہوئے بغیر موضوع کو ۔۔۔ الٹ پلٹ کر دیکھے اور اس بات کا یقین کرے کہ ظاہر میں خوبصورت ۔۔۔ دینے والی چیز اندر سے بھی خوبصورت ہے ۔۔۔ اس میں اچھا ۔۔۔ پرکھنے کی صلاحیت ہے۔ یہ چیز دشوار ضرور ہے، اور صرف تجربہ ۔۔۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑا معلّم ہے۔ لیکن بیدار ذہن رکھنے والا ۔۔۔ افسانہ نگار بھی اس مہلک مرض سے آسانی سے بچ سکتا ہے۔

افسانہ نگار کو اپنی آنکھیں کھُلی رکھنی پڑتی ہیں۔ اُسے اِن ظاہری ۔۔۔ دں کے ساتھ ساتھ دل اور دماغ کی آنکھوں سے بھی کام لینا پڑتا ۔۔۔ چیزوں کی بیرونی سطح سے زیادہ اُن کی گہرائیوں کا رازداں ضروری ہے۔ اس کے بغیر اچھی افسانہ نگاری ممکن نہیں۔ ایک ۔۔۔ کے ذہن میں کوئی موضوع آتا ہے وہ اس موضوع کو کہانی کا ۔۔۔ پہنا کر ہمارے سامنے لانا چاہتا ہے۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے ۔۔۔ ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ جب کسی کے پاس کہنے کے لئے کچھ بات ۔۔۔ اور اس بات کو کہنے کی خواہش بھی اُس کے دل میں موجود ہے ۔۔۔ سے یہ بات کہنی چاہئے۔ کہنے والے کے پاس موضوع ہے کہانی ۔۔۔ یا لکھنے کی خواہش ہے، اُسے کہانی کہنی چاہئے۔ لیکن سوال یہ ۔۔۔ کہ کیا کہانی کہنا اتنی آسان بات ہے۔ کیا کہنے کی ضرورت کا احساس ۔۔۔ کہانی کے کہنے کی کافی وجہ ہے؟ نفسیاتی نقطۂ نظر سے اس کا جواب ۔۔۔ ت میں دیا جائے گا۔ لیکن عملی نقطۂ نظر، جسے فنّی نقطۂ نظر بھی کہہ ۔۔۔ ہیں، اس سوال کے جواب میں آسانی سے "ہاں" نہیں کہے گا۔ ۔۔۔ عمل اور فن کے پاس "نہیں" کہنے کی معقول وجہ ہے۔

اچھی کہانی کہنا فن ہے۔ بُری کہانی کہنے سے اُس کا نہ کہنا کہیں ۔۔۔ ہے اور اچھی کہانی کہنے کے لئے، کہنے والے کو اُس کا فن سیکھنا ۔۔۔ فن سیکھنے اور اُس میں مہارت پیدا کرنے کے لئے انسان کو ۔۔۔ کی تربیت کرنی پڑتی ہے۔ ذہن میں ضروری سامان اور مسالہ ۔۔۔ ہے۔ جب تک ذہن میں مسالہ نہ ہو اور جب تک ذہن میں مسالہ جمع کرنے کی خواہش نہ ہو، فنّی مہارت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ آنکھیں زندگی کے بے پایاں مواد میں سے اپنے کام کی باتیں جمع کرنے کی عادی ہو جائیں اور ذہن آنکھوں سے دیکھی ہوئی چیزوں کو صحیح جگہ رکھ کر اُن سے وقتاً فوقتاً کام لے سکے کامیاب افسانہ نگار کی فنّی مہارت کے یہ دو پہلے زینے ہیں اور اِن دو زینوں کو طے کر لینے سے پہلے افسانہ نگار کو خاصا زادِ راہ جمع کرنا پڑتا ہے۔ اِس زادِ راہ کے جمع کرنے میں کئی چیزیں افسانہ نگار کو مدد دیتی ہیں۔

افسانہ نگار کو سب سے قیمتی اور قابلِ قدر خزانہ مشاہدہ کی مدد سے حاصل ہوتا ہے۔ آنکھ برابر کھُلی رہے تو زندگی میں تخیّل اور فکر کے لئے دولت کی کمی نہیں۔ جس فن کار کی نظر ہمیشہ اپنے گرد و پیش کی چیزوں کو غور سے دیکھتی اور اپنے تجربے کی دولت کو بڑھاتی رہتی ہے، اُس کے تخیّل میں کبھی کہنگی اور فرسودگی پیدا نہیں ہوتی۔ اور جس فنکار کے پاس ہر وقت دیکھنے والی نظر نہیں اُس کا تخیّل ایک نہ ایک دن ایسا تھکتا ہے کہ تازیانوں کی چوٹ سے بھی اُسے آگے چلانا ممکن نہیں۔ اس لئے ادب میں مشاہدہ کی عادت کو ادیب کی زندگی کا ایک لازمی جزو قرار دیا گیا ہے۔ مشاہدہ صبر آزما ہوتا ہے۔ اس سے تھکن پیدا ہوتی ہے لیکن جس افسانہ نگار نے اپنے ضبط و تحمل کو کام میں لاکر، تھکن سے ڈرے بغیر اس عادت کو اپنا رفیق بنالیا اُسے زندگی بھر تھکن نہیں ستاتی۔ ادب میں تھکن مواد کی کمی سے پیدا ہوتی ہے اور مشاہدہ کے عادی ادیب اور افسانہ نگار کو مواد کی کمی کی شکایت نہیں پیدا ہوتی۔

کسی نقّاد نے لکھا ہے ادبی تخلیق اصل میں واقعات کے انتخاب کے بجائے اُنہیں رد کرنے کا دوسرا نام ہے۔ جب تک ادیب کے پاس تجربات کا اتنا وافر سرمایہ نہ ہوگا۔ کہ وہ اس سرمایہ میں سے اپنے کام کی چیزیں چُن سکے اُس کے لئے کوئی اچھی ادبی تخلیق ممکن نہیں۔ مشاہدہ کے عادی افسانہ نگار کے سامنے تجربات کا یہ وافر سرمایہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ اور اس وافر سرمایہ میں سے وہ اپنی پسند کے قیمتی جواہر چُن کر اُنہیں اپنے پڑھنے والوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ مشاہدات کا یہ وافر اور کبھی نہ ختم ہونے والا

خزانہ اکٹھا کرنے کے لئے افسانہ نگار کو شروع شروع میں بڑی کاوش سے کام لینا پڑتا ہے۔ اُس پر یہ چیز بارگزرتی ہے اور اس عادت کو اپنے لئے بوجھ سمجھ کر اُسے اپنے کندھے سے پھینک دینا چاہتا ہے۔ لیکن اچھے افسانہ نگار کو آزمائش کے اس دور سے جبر اور ضبط کے ساتھ گذرنا چاہئے۔ یہاں تک کہ واقعات، مناظر اور زندگی کی دیکھی ہوئی ان گنت چیزوں سے نقوش بنانے کی عادت اُس کی فطرت کا ایک جزو لاینفک بن جائے اور نظر میں کیمرہ کی تاثیر پیدا ہو جائے۔ کہ جو کچھ اُس کے سامنے آئے اُس کی تصویر ذہن میں اُتار لے، زندگی کی کوئی بات دوسری بات سے نہیں ملتی کوئی منظر کبھی دوسرے منظر جیسا نہیں ہوتا اور ایک انسان کبھی اپنی عادتوں میں اپنے طور طریقوں میں دوسرے سے مشابہ نہیں۔ اس لئے نظر کا کام کبھی ختم نہیں ہوتا۔ جو اُس نے آج دیکھا ہے وہ اُس کے لئے کل دیکھنا ممکن نہیں۔ اور اسی لئے اُس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے ایک لمحہ کو بھی ضائع نہ ہونے دے۔ جو وقت ضائع ہو گیا وہ واپس نہیں آتا اور اس میں گذری ہوئی چیز کو نظر دوبارہ نہیں دیکھ سکتی۔ اس لئے کیوں نہ افسانہ نگار اپنے ہر لمحہ سے فائدہ اٹھائے کیوں نہ ہر نئے وقت میں ایک نیا منظر، ایک نیا واقعہ یا زندگی کا ایک نیا بھید دیکھ کر اپنی نگاہ بیدار کو اور بھی بیدار بنائے؟ مشاہدہ افسانہ نگار کا رفیق کار ہے تو نئے سے نئے موضوع ہمیشہ اُس کے حلقہ بگوش غلام رہتے ہیں۔

نظر کا کام مشاہدہ کرنا ہے اور مشاہدہ افسانہ نگار کی ذہنی اور جذباتی تعمیر کا ایک قیمتی جزو ہے لیکن اکثر سب کچھ دیکھ کر ہی نہیں جانا جاتا۔ صرف دیکھ کر باتیں سیکھی جا سکیں تو زندگی سے دور رہنے والے خانہ بدوش انسان شائد دنیا کے سب سے زیادہ تجربہ کار انسان ہوں لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ زندگی کے تجربہ کی مثال بھی معمل کے تجربوں کی سی ہے جہاں سائنس داں چیزوں کے مرکب بنا کر دنوں، ہفتوں، مہینوں اور برسوں کی کاوش کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ زندگی کے تجربے بھی گھر بیٹھے نہیں حاصل ہوتے۔ انسان کو زندگی کے ساتھ ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر چلنا پڑتا ہے، زندگی کی ٹھوکریں کھانی پڑتی پڑتی ہیں۔ ٹکریں سہنی پڑتی ہیں۔ بُرے اور بھلے انجام دیکھنے پڑتے ہیں، بہت کچھ کھونا پڑتا ہے۔ جب کہیں تجربہ اپنا بنتا ہے۔ تجربے جان بوجھ کر، کوشش کر کے اور ارادتاً حاصل کئے جاتے ہیں۔ تجربے وہ بھی ہوتے ہیں جن میں زندگی ہمیں کھینچ کر لے جاتی ہے۔ اس کی موجوں کے تھپیڑے کھلاتی ہے، اور ہم ایک نیا سبق سیکھ کر ایک مضبوط ارادے کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں۔ زندگی میں تجربے نہ ہوں تو کچھ نہیں۔ یہ بات سب کے لئے صحیح ہے، لیکن اتنی صحیح کسی کے لئے بھی نہیں جتنی افسانہ نگار کے لئے۔ افسانہ نگار نے تجربے نہیں کئے تو گویا اُس نے اپنی افسانہ نگاری کی زینت کا بہت سا سامان خود اپنے آپ کھو دیا۔ جو کچھ وہ حاصل کر سکتا تھا، اُسے حاصل نہیں کیا۔ اور جو حاصل ہو سکے اُسے حاصل نہ کرنا زندگی کی بہت بڑی بھول ہے۔ اُن کے لئے اور بھی بڑی جن کا منصب دُنیا کو کچھ دینا ہے۔ جنہیں دُنیا کو کہانیاں سنانی ہیں۔ اور ان کہانیوں سے سننے والوں کے دلوں کو اپنی مٹھی میں لینا ہے۔ افسانہ نگار کا پہلا اسلحہ مشاہدہ ہے اور دوسرا اس کا تجربہ۔ ان اسلحوں کے بغیر وہ نہتا سپاہی ہے۔

تجربہ کو افسانہ میں جو اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ مارک ٹوین کے ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ ایک مرتبہ جرمنی کی ریلوں کے انتظام کا اندازہ لگانے کیلئے مارک ٹوین نے ۱۵ مرتبہ ٹکٹ خریدا۔ اور پھینک پھینک دیا۔ لیکن ہر مرتبہ اُسے نیا ٹکٹ خریدنا پڑا۔ اس تجربہ کی بنا پر اُس نے جو افسانہ لکھا اُس سے پانچسو ڈالر کمائے۔

زندگی کا ہر تجربہ ضروری نہیں کہ افسانہ نگار کو پانچسو ڈالر دلوا دے۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ہر نئے تجربے سے اس کی دولت میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ جس کے بغیر ذہنی اور جذباتی تعمیر ممکن نہیں۔ مشاہدہ اور تجربہ کے علاوہ ایک اور چیز جسے مواد کی فراہمی کے سلسلہ میں افسانہ نگار کے لئے بے حد ضروری بتایا گیا ہے۔ ذاتی مطالعہ اور محاسبہ ہے۔ افسانہ نگار کو چاہئے کہ وہ برابر اپنے آپ سے اپنی ذات کے متعلق سوالات کرتا رہے۔ ہر انسان ایک سربستہ راز ہے۔ اور رازوں کا کھولنا افسانہ نگاری کی دلچسپی کا ایک اہم جزو۔ پھر کیوں افسانہ نگار سب سے پہلے اُسی بھید کا پتہ نہ چلائے جو اس سے سب سے زیادہ

ہے۔ اپنے جذبات، احساسات اور شعور کی الجھن کو سلجھانا۔ اپنے ہر عمل اور ہر ارادے کے پیچھے کسی نفسیاتی تحریک کی جستجو، اپنی کبھی چھپی جبلتوں میں اپنی اندرونی اخلاقی زندگی کا کوئی عکس دیکھنے کی کوشش، افسانہ نگار کے لئے بیسیوں ایک سے زیادہ ایک گہرے موضوع پیدا کر سکتی ہے۔ خود اپنی ہی زندگی میں بہت سی کہانیوں کا مواد چھپا ہوا ہے۔ افسانہ نگار کو اس مواد سے کام لینے کی عادت پیدا کرنی چاہئے۔ یہ عادت جب پختہ ہو جائے گی تو افسانہ نگار اسے پھیلا کر آسانی سے دوسری ذاتوں کے مطالعہ اور محاسبہ تک لے جاتا ہے اور اپنی تجرباتی دنیا میں ہر وقت ایک نئے راز اور بھید کا اضافہ کر سکتا ہے۔ اس طریقہ میں یہ خطرہ ضرور ہے کہ افسانہ نگار پر خود اس کی اپنی ذات اس طرح چھا جاتی ہے کہ اس کے لئے اپنے آپ کو اس سے باہر نکالنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اگر افسانہ نگار شروع ہی سے اس خطرہ سے آگاہ ہو اور اپنی ذات کے مطالعہ کو دوسروں کی ذات کے مطالعہ کی پہلی منزل سمجھ کر اس کام کو شروع کرے تو اس کے تجربات کی دنیا وسیع سے وسیع تر ہوتی جائیگی۔ تجربوں کی خاصی بڑی دنیا کتابوں میں بند ہے اس لحاظ سے نہیں کہ افسانہ نگار جو کچھ کتاب میں پڑھے اسے نقل کرکے یا بعض صورتوں میں مسخ کرکے اپنے افسانے کا موضوع بنائے مطالعہ افسانہ نگار کے لئے ایک بیحد ضروری عمل ہے لیکن یہ ضروری عمل اسی صورت میں مفید ہو سکتا ہے۔ کہ پڑھنے والا اس کے خطروں اور اس کی پیدا کی ہوئی الجھنوں سے بچ کر اس سے وہی اخذ کرے جو اس کے کام کو زیادہ مفید اور دلچسپ بنانے میں مدد دے۔ مطالعہ جیسا میں نے ابھی کہا تھا۔ اس لئے نہیں کیا جاتا کہ دوسروں کے اگلے ہوئے نوالوں کو اپنے دسترخوان پر سجا کر دعوت کا سامان جمع کریں، مطالعہ پڑھنے والے کے لئے ایک زبردست ذہنی تحریک کا کام دیتا ہے، اچھے مطالعہ سے پڑھنے والے کے ذہن میں جو تازگی، توانائی اور ایک نئی بات کہنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ وہ کسی اور چیز سے پیدا نہیں ہوتی۔ اچھا مطالعہ، ذہن میں تخلیق کی قوتوں کو ابھارتا اور اکساتا ہے اور انہیں کاہلی اور افسردگی سے بچاتا ہے۔ اس لئے ہر افسانہ نگار کو جہاں ایک طرف مشاہدہ اور ذاتی محاسبہ سے کام لینا ہے وہاں اسے زندگی بھر پڑھنا بھی ہے۔ دنیا میں اس سے اچھے اچھے لکھنے والے ہیں۔ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے زندگی کو اس سے مختلف انداز میں دیکھا ہے۔ اور اس نئے انداز کی جھلک ان کی تصنیفوں میں موجود ہے۔ یہ تصنیفیں بھی افسانہ نگار کے تجربات میں گہرائی اور پھیلاؤ پیدا کرتی ہیں۔

افسانہ نگار بہت کچھ دیکھتا ہے۔ زندگی سے بہت سے نئے سے نئے تجربے حاصل کرتا ہے۔ ذاتی محاسبہ سے اس پر فطرت انسانی کے چھپے ہوئے بھید آشکارا ہوتے ہیں اور وہ ان دیکھی اور سیکھی ہوئی چیزوں کو اپنے ذہن میں جمع کرتا رہتا ہے۔ تجربات برابر اس کی ذہنی، اخلاقی اور جذباتی زندگی کا جزو بنتے رہتے ہیں، اسے برابر پہلے سے زیادہ رنگین بناتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر یہ سارے تجربے اس کے ذہن میں جا کر اس طرح ایک دوسرے سے گھل مل جائیں کہ ایک کو دوسرے کے مقابلہ میں پہچاننا اور ضرورت کے وقت سامنے لانا ممکن نہ ہو تو یہ سمجھنا چاہئے کہ افسانہ نگار کی ساری محنت رائگاں گئی۔ جو کچھ اس نے اتنی کاوش اور جانفشانی کے بعد حاصل کیا تھا۔ وہ اگر ایک اندھیری کوٹھڑی میں بند ہے اور اس اندھیری کوٹھڑی کی کنجی اس کے پاس نہیں تو یہ سارا مال متاع اس کے کسی کام کا نہیں۔ اس لئے افسانہ نگار مشاہدہ سے، زندگی کے ساتھ چل پھر کر تجربہ سے، ذاتی محاسبہ سے، مطالعہ سے جو کچھ سیکھے اسے چاہئے کہ کبھی کبھی اس کا جائزہ لیتا رہے۔ پچھلے واقعات اور تجربات کو دبی ہوئی نچلی تہوں سے باہر نکال کر انہیں کبھی کبھی دھوپ بھی دیتا رہے ورنہ اندیشہ ہے کہ یہ سارے قیمتی تجربے کیڑے مکوڑوں کی نذر ہو جائیں اور افسانہ نگار خالی ہاتھ رہ جائے۔ گزرے ہوئے واقعات اور تجربات کی تصویریں بنا کر انہیں اپنی ذہنی زندگی میں زندہ اور تر و تازہ رکھنا افسانہ نگار کا ایک اہم فرض ہے اور یہ اہم کام اسے اپنی قوت تخیل سے لینا ہے۔ ہر تخیل کو استعمال میں لایا جائے اسے استعمال کرکے کبھی کبھی اس پر دھار نہ لگائی جائے تو وہ کند اور ناکارہ ہو رہ جاتا ہے اور کند اور ناکارہ تخیل افسانہ نگار کی زندگی کا ایک سانحہ ہے جس کا ماتم اسے جیتے جی کرنا پڑتا ہے۔ افسانہ نگار کو اگر اس ظلم سے بچنا ہے تو اسے چاہئے کہ اس دولت ابدی کو برابر استعمال کرکے زندہ رکھے۔ تخیل کا استعمال ہی اس کی حیات ابدی کا سب سے بڑا ضامن ہے۔ افسانہ نگار کا تخیل زندہ ہو تو اس کے پاس موضوعوں کی کمی نہیں۔ مواد کی فراہمی کے

سلسلہ میں افسانہ نگار کو جو کچھ کرنا چاہئے وہ اتنا زیادہ ہے کہ شاید غلط معلوم ہوتا ہو لیکن ایسا نہیں۔ اچھے افسانہ نگار کو خود اپنی ذات سے اور اُن سب سے جن کی رائے پر اُسے اعتماد ہے بڑا کام لینا پڑتا ہے۔ خود وہ مشاہدہ کرتا ہے، کڑوے اور میٹھے تجربے حاصل کرتا ہے، تخیل سے کام لیتا ہے، اُسے تازیانے لگاتا ہے، مطالعہ کرتا ہے اور اِس طرح اپنے افسانوں کے لئے مواد مہیا کرتا ہے۔ اور اس مواد کی بنیاد پر اپنے افسانوں کی عمارت کھڑی کرتا ہے لیکن افسانہ میں جو کچھ ہے وہ خود اُسی کا سوچا ہوا ہے۔ اپنی سوچی ہوئی باتوں میں انسان کو خامی نظر نہیں آتی۔ اس لئے افسانہ نگار کو چاہئے کہ وہ کوئی افسانہ چھپوانے سے پہلے اُسے اپنے دوستوں کو سنائے۔ اور اس کے ہر پہلو پر بحث مباحثے اور ردّ و قدح کے بعد اُس میں تبدیلیاں کرنے پر آمادہ ہو۔ اپنی غلطیوں کو مان لینا، اُن میں ترمیمیں اور تبدیلیاں کرنا، اور اپنی چیزوں کو اچھا بنانے کے لئے اُن میں کاٹ چھانٹ کرنا بھی ایک اچھے افسانہ نگار کی سیرت کی ایک خصوصیت ہونی چاہئے اس کے بغیر بھی ممکن ہے اچھا افسانہ لکھا جا سکے لیکن بحث مباحثہ کے بعد اُس کے اور زیادہ بہتر ہو جانے کے امکانات ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک آخری چیز اور: افسانہ نگار کو افسانہ لکھنے سے پہلے، اور افسانہ لکھنا شروع کر دینے کے بعد اپنی مشق کے ابتدائی دور میں اور خاصی مشق بہم پہنچا لینے پر، زندگی بھر ہوشیار، چوکنا اور بیدار رہنا پڑتا ہے۔ اُسے اپنے پتّے کو مارنا پڑتا ہے، جھوٹی لالچ سے بچنا پڑتا ہے اچھے اور بُرے کی تمیز کرنی پڑتی ہے۔ چیزوں کو غور سے دیکھنا، کتابیں پڑھنا، زندگی میں گھل مِل کر اُس سے نت نئے سبق حاصل کرنا، اپنی ذات کی تنقید، اس سے دوسروں کی زندگی سے نتیجے اخذ کرنے کی قوت۔ فکر و تخیل، بحث مباحثہ، اپنی کاوش اور محنت کی پیدا کی ہوئی ادبی تخلیق پر نکتہ چینی کو برداشت کرنے کی عادت، غرض افسانہ نگار کو ساری زندگی مصروف رہنا پڑتا ہے۔ ہر نیا قدم اُسے ایک نئی بات سکھاتا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ ہر نئی بات اُسے زبانی یاد رہے اس لئے افسانہ نگار کو زندگی بھر اپنے تجربات کے نوٹ لینے پڑتے ہیں، انہیں یادداشت میں محفوظ رکھنا پڑتا ہے اور اِس طرح اُس کی ساری زندگی صبر، آزمائش، ضبط، تحمل اور کاوشوں میں بسر ہوتی ہے اور یہ کاوشیں آزمائشیں، صبر اور تحمل اس لئے ضروری ہے کہ افسانہ نگار کو ایک اہم کام انجام دینا ہے اُسے ایک نئی دنیا کی تخلیق کرنی ہے، دنیا وہی ہے جس میں ہم آپ رہتے ہیں۔ جسے ہم آپ دیکھتے ہیں لیکن افسانہ نگار اپنے نکھار، زرخیز تخیل سے اِسی چھوٹی سی معمولی بات کو رنگین بنا دیتا ہے اور ہماری دیکھی ہوئی دُنیا بالکل نئی بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس پُرانی دُنیا کو نیا بنانے کے لئے اُس کی فرسودگی میں کوئی تازگی پیدا کرنے کے لئے وہ تجربات کے سمندر میں غوطے لگاتا ہے اس کی تہ میں سے دائیں، بائیں ہر طرف ہاتھ پھیلا کر چھوٹی اور بڑی بہت سی چیزیں چنتا ہے۔ ان چنی ہوئی چیزوں میں سے اُس کی نظرِ انتخاب کچھ جواہر ریزے نکال لیتی ہے اور اُن جواہر ریزوں کو اُس کا توانا تخیل زندگی کی نئی آب و تاب دے کر ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے اور اِس طرح وہی زندگی جو ہماری دیکھی بھالی ہے، جسے ہم نے برابر برتا ہے، بالکل نئی بن کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہاں تک کہ ہم اسے پہچان بھی نہیں سکتے۔ اس لئے کہ اِس نئی دُنیا میں افسانہ نگار کے تخیل، اُس کے جذبات اور اُس کے زندگی بھر کے تجربات نے کچھ ایسے رنگ ملا دیئے ہیں جو زندگی میں اس سے پہلے بکھرے ہوئے تھے۔ اور اب قوسِ قزح کی رنگینی لے کر ہمارے سامنے آ گئے ہیں۔

لیکن قوسِ قزح کی یہ رنگینیاں یوں نہیں پیدا ہو جاتیں۔ ان کے لئے "جوئے شیر" لانی پڑتی ہے ؂

لکھنوی

ایک خط کا بازیافتہ مسودہ

مالت بریلی
۲۷ جولائی ۳۱ء

محترمی جناب ایڈیٹر صاحب ــــــــــ تسلیم

میرا خیال ہے کہ ۲۲ جولائی ۳۱ء کے ضمیمہ اخبار ـــــــــ میں ڈاکٹر سر محمد اقبال کی غزل پر جو تنقید شائع ہوئی ہے۔ اس میں انصاف اور اعتدال سے کام نہیں لیا گیا نہ اُن کے اشعار کا مطلب سمجھنے میں دماغ سوزی کی گئی۔ امیدوار ہوں کہ مندرجہ ذیل سطور کو اپنے مقتدر اخبار کی آئندہ اشاعت میں جگہ دیجئے۔

خاکسار اثر

ڈاکٹر اقبال کا مطلع ؎ نالہ ہے بلبل شوریدہ ترا خام ابھی — اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

اعتراض: شعر میں نالے کی خامی کا ثبوت موجود نہیں ہے، نالے کو سینے کی دیگچی میں پکانا لطف سے خالی اور معنویت سے دور ہے۔

جواب: بلبل کا متواتر نالہ کش ہونا ہی خامیٔ نالہ کا ثبوت ہے، جس پر لفظ ابھی دلالت کرتا ہے۔ بقول میر علیہ الرحمۃ ؎

؎ دیتی ہے طول بلبل کیوں شورش فغاں کو — اک نالہ حوصلے سے بس ہے وداع جاں کو

جب نالے کا ظرف سینہ ہے اور نالہ خام ہے پھر اس کی پختگی سینے میں نہ ہوگی تو کہاں ہوگی۔ ضبط نالہ کا منشا یہ ہے کہ دل گداختہ اور جگر کباب ہو۔ اس کے بعد عالم اضطرار اور اضطراب میں نالہ اگر تا بہ لب آیا تو اثر میں ڈوبا ہوگا۔ یہی تاثیر نالے کی پختگی ہے ورنہ سینہ دیگچی اور نالہ شب دیگ نہیں ہے۔

۲؎ پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل — عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

اس شعر پر کوئی اعتراض نہ ہو سکا تو یہی کہہ دیا کہ مابعد کے شعر سے ملایا جائے تو برے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ فی الحال صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مابعد کے چار شعر اسی کلیہ کی شرح ہیں جو اس شعر میں قائم کیا گیا ہے یعنی مصلحت اندیش ہونا عقل کے لئے محمود ہے اور عشق کے لئے معیوب ہے۔

۳؎ بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق — عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

اعتراض: عشق تو نہ کودا نہ اس کی عادت کودنے کی ہے، اگر وہ کودتا بھی ہے تو کانوں، سینہ یا داغ کی مجمر میں۔ ابراہیم خلیل اللہ بھی خود کودے نہ تھے بلکہ زبردستی دھکیلے گئے تھے .... لب بام کیا تماشا ہو رہا تھا جس کے دیکھنے میں عقل محو تھی اور یہ عقل .... تھی کہاں، عشق کے ساتھ ساتھ کودنے کو آئی تھی، ہمت نہ پڑی، رہ گئی، یا لب بام نٹ کا تماشا دیکھنے میں مصروف ہو گئی۔

جواب: یہ ارشاد ہی غلط ہے کہ عشق کی عادت کودنے کی نہیں ہے، پروانہ سراپا عشق ہے اور شمع کی آگ میں کود پڑتا ہے۔ جیسا خود معترض کی عبارت سے بھی مترشح ہوتا ہے، عشق سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہے۔ شاعری کی دنیا معمولی تاریخی یا مذہبی دنیا سے الگ ہے۔ ..

---

[1] استدعا پذیرائی سے محروم رہی۔ نہ تو مضمون شائع ہوا نہ واپس کیا گیا۔ پرانے کاغذات میں مسودہ مل گیا وہی صاف کر کے محترمی حضرت احمد ندیم قاسمی کی طلب مضمون کی تعمیل میں حاضر کر دیا۔ کوئی تازہ مقالہ تعجیل میں قلمبند کرنا ممکن نہ ہوا۔ اثر

مانا کہ حضرت ابراہیم خود آگ میں نہیں کودے بلکہ منجنیق سے پھینکے گئے مگر راہ دوست میں قدم رکھنا اور راضی برضا ہو کر مصائب و آفات کا استقلال سے مقابلہ کرنا آگ میں پھاند نا نہیں ہے تو کیا ہے۔ حضرت ابراہیم فاعل مختار تھے اگر چاہتے تو امتحان سے کنارہ کش ہو جاتے مگر نہیں، ان کے سینے میں جذبۂ عشق الٰہی جوش زن تھا۔ وہ سرتاپا عشق و پیروئی عشق تھے شوق نے گویا پر لگا دیئے اور اڑتے ہوئے دہکتی آگ تک پہنچے

شعر کا حاصل یہ ہے کہ عقل دماغ سے کام لیتی ہے اور عشق دل کا تابع ہے۔ عقل ہر عمل کے انجام پر نظر رکھتی ہے اور خطروں سے بچنا چاہتی ہے، عشق اپنے ولولوں کا پیرو ہے۔ عقل بھٹکتی پھرتی اور منزل مقصود سے دور رہتی ہے، عشق ایک جرأت رندانہ یا لغزش مستانہ میں اپنے مشن کی تکمیل کرتا ہے۔ عقل ہر شے کے ظاہر کو دیکھتی ہے (یہی تماشائے لب بام ہے) عشق کا مطمح نظر باطن ہوتا ہے، جہاں عقل آگ دیکھتی ہے عشق کو گلزار نظر آتا ہے

ان شعروں میں عقل اور عشق کا تقابل ہے۔ توافق زمان و مکان لازم نہیں، خدا معلوم حضرت معترض عقل کو "مقام ابراہیم" میں کیوں لے گئے خصوصاً جب عشق کے ساتھ زمانہ ماضی اور عقل کے ساتھ زمانہ حال استعمال ہوا ہے۔

۴ عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گام عمل   عقل سمجھی ہی نہیں معنئ پیغام ابھی

اعتراض:۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا صاحب عاشق نے حکم دیا عشق چلتا پھرتا نظر آیا مگر عقل کو کس نے پیغام دیا تھا۔ کیوں ایسا مغلق پیغام دیا تھا جس کے معنی کی کھچڑی میں گتھیاں پڑیں اور پھر سلجھائے نہ سلجھیں۔ یا یہ عقل ہی ایسی بے وقوف تھی جس کی سمجھ میں معمولی پیغام کے معنی نہ آئے دوسرے سبک خرامئ عشق کو عقل کے پیغام نہ سمجھنے سے علاقہ ہی کیا ہے

جواب:۔ اس شعر میں بھی عقل اور عشق کا تقابل اور واقعۂ ابراہیمؑ کی مزید وضاحت ہے۔ ایک ہی پیغام ہے جو عقل اور عشق دونوں تک پہنچتا ہے۔ عقل میں پیغام کا سطحی مطلب سمجھنے کی صلاحیت زیادہ ہے مگر یہی صلاحیت غور و فکر کی موجد ہو کر قاطع عمل یا تعمیل میں تاخیر کا موجب ہوتی ہے۔ عشق نے پیغام سنا نہیں کہ بقول آتش علیہ الرحمۃ

چلا وہ راہ جو سالک کے پیش پا آئی   ٹھہر گیا جو کہیں بوئے آشنا آئی

عقل پیغام کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتی رہ گئی، عشق ایک جنبش میں شاہد مقصود سے ہمکنار ہو گیا۔ عقل اب تک حیران ہے کہ آگ میں کودنا، جان کو ہلاکت میں ڈالنا کیا معنی۔

خدا جانے حضرت معترض نے پیغام کو معمولی کس بنا پر سمجھ لیا حالانکہ پیغام ایسا اہم اور اس نہج کا ہے کہ عقل اس کے الفاظ تو سمجھتی ہے مگر اس کی غرض و غایت تک رسائی نہیں ہوتی، پیغام یہ تھا کہ آگ میں کود پڑ، عقل یہی سمجھی اور قرین مصلحت نہ جانا، عشق "بسم اللہ مجریہا و مرسیہا" کہہ کر کود پڑا اور آگ کو اس قدر خنک پایا کہ دانت بجنے لگے۔ ظاہری پیغام تو یہی تھا کہ آگ میں کود پڑ مگر اس میں یہ معنی مضمر تھے کہ تمہاری استواریٔ ایمان کا امتحان منظور ہے کیا طیار ہو؟ عشق نے لبیک کہی، عقل سوچتی رہ گئی۔

۵ شیوۂ عشق ہے آزادی و دہر آشوبی   تو ہے بندۂ صنم خانۂ ایام ابھی

اعتراض:۔ دیر آشوبی کس جانور کا نام ہے؟ تو تکار کا مخاطب کون ہے؟ ایام کا صنم خانہ یعنی چہ؟

جواب:۔ اگر شاعر نے دراصل دیر آشوبی کہا ہے تو میں بھی مطلب سمجھنے سے قاصر ہوں، میرا گمان ہے کہ یہ فقرہ دیر آشوبی نہیں بلکہ دہر (د۔ ہ۔ ر) آشوبی ہے جس کے معنی ہوئے عالم میں ہنگامہ برپا کرنا۔ "تو" کا مخاطب وہی ہے جو "بندۂ صنم خانۂ ایام" ہے

ایام (روزگار) کو صنم خانہ کہنے سے نیرنگئ زمانہ اور اس کے انقلابات و تغیرات کی طرف نہایت خوبی سے اشارہ ہوا۔ صنم خانہ کے اعتبار سے (...)، کے معتقد یا پرستار یا پیرو کو بندۂ صنم خانۂ ایام کہنا کس قدر پر لطف ہے۔ ایسی دلپذیر اور معنی خیز ترکیبوں پر شاعر کا مضحکہ اڑانا میرے

نزدیک بدعت سے کم نہیں۔ شعر کا مطلب یہ ہوا کہ عشق کا شیوہ آزادی (ترکِ رسوم و قیود، توہمات کی بیخ کنی) اور دہر آشوبی یعنی انقلاب انگیزی ہے۔ مگر عقل کے مرید زمانے کا رنگ اور ہوا کا رُخ دیکھتے اور اُس کے مطابق کاربند ہوتے ہیں۔ عشق نئی نئی راہیں نکالتا، دار و رسن کو جلوہ دیتا اور ایک ہنگامہ برپا کر دیتا ہے۔ مگر عقل اپنے کہنہ و فرسودہ و پامال جادوں پر گامزن ہے۔ ان میں سلامتی و سلامت روی تو ہے۔ مگر عشق کے مست کرنے والے خطرے کہاں۔

ے سعیِ پیہم ہے ترازوئے کم و کیفِ حیات تیری میزان ہے شمارِ سحر و شام ابھی

اعتراض: سعیِ پیہم معلوم نہیں کس کی ترازوئے کم و کیفِ حیات ہے۔ کیوں جناب یہ ترازو سعیِ پیہم کے ایک ہی پلّے سے بنی ہے یا اس کا دوسرا پلّڑا بھی ہے اور اس سعیِ پیہم کی ترازو میں کمیت و کیفیت کن باٹوں سے تولی جاتی ہے۔ تیری میزان یعنی آپ کے مخاطب مردود کی میزان کیا ہے۔ شمار سحر و شام، زمانِ حیات یعنی کمیت و حیات تو اسی سحر و شام کی ترازو سے معلوم ہوتی ہے لہٰذا سعیِ پیہم کی ترازو اور تیری کی میزان کا فعل ایک ہی ہوا۔ فرق صرف اتنا ہوا کہ سعیِ پیہم ڈنڈی ترازوئے کم و کیفِ حیات کی لئے ہوتے ہیں۔ وہ وا ہیں دو کر رہی ہے اور تیری صاحب انگلیوں پر یا دل میں سحر و شام کا شمار کر رہی ہیں۔ مگر میزان تو آلۂ وزن ہے نہ کہ آلۂ شمار۔

جواب: حضرت معترض "نہ بازاری" اصطلاحات کے زبردست ماہر معلوم ہوتے ہیں۔ اور مجھے شعر سے زیادہ اعتراض کی نوعیت ذہن نشین کرنے میں دقت پیش آ رہی ہے۔ شاعر نے "کم و کیفِ حیات" (حیات کی بوقلمونی و چگونگی) کو ایک جنس قرار دیا ہے۔ جس کے تولنے کی ترازو (قدر و مقرر کرنے کا آلہ) سعیِ پیہم ہے نہ کہ روز و شب، یا ماہ و سال۔ اتنا سمجھنے کے بعد تمام اعتراضات جو شعر نہ سمجھنے پر مبنی ہیں (ضلع جگت سمیت)، کالعدم ہو جاتے ہیں اور اُن کی تردید میں خامہ فرسائی کی ضرورت نہیں رہتی۔

شعر کا حاصل یہ ہوا کہ حیاتِ انسانی کی قدر و قیمت کا اندازہ اُس کی سرگرمیِ عمل سے لگانا چاہیئے نہ کہ امتدادِ زمانہ یا مرورِ ایام سے۔ ایک شخص ہزار برس جیا مگر کوئی کام مفید خلائق نہیں کیا تو مردے سے بدتر ہے۔ دوسرا شخص عین عنفوانِ شباب میں کوئی کارِ نمایاں کر کے مر گیا تو زندہ جاوید ہے۔ میں نے محض مفہوم واضح کرنے کو یہ مثال دی ورنہ یہ بھی ضرور نہیں کہ کامیابی سزاوارِ تحسین اور ناکامی درخورِ ملامت ہو۔ سعیِ پیہم چاہیئے، کامیابی یا ناکامی سے کوئی غرض نہیں۔ زندگی کے طول یا اختصار، مفید یا رائیگاں ہونے کی ترازو یا میزان یہی سعیِ پیہم ہے نہ کہ شمارِ مہ و سال ہے ؎

"صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے عمر یونہی تمام ہوتی ہے"

ڈاکٹر اقبال اس کو زندگی نہیں سمجھتے بلکہ سرگرمیِ عمل کی ترغیب دیتے ہیں کیونکہ یہی سرگرمیِ عمل منشائے حیات ہے۔

ے عذرِ پرہیز پہ کہتا ہے بگڑ کر ساقی ہے ترے دل میں وہی کاوشِ انجام ابھی

اس شعر پر کوئی اعتراض نہیں بلکہ یہ شکایت ہے کہ نظم کو قطعہ سمجھیں یا غزل سمجھیں؟

میری التماس ہے کہ اگر غزل کا دائرہ "سخن نرم با زناں گفتن" تک محدود نہیں ہے تو یہ نظم بلاشک و شبہ غزل ہے۔ غزل میں قطعہ بند اشعار رکھنا میر کے زمانے سے آج تک رائج ہے۔ میں میر کی ایک غزل نقل کرتا ہوں جس میں صرف ایک شعر اور مقطع الگ ہیں۔ باقی اشعار تین قطعات میں تقسیم ہیں۔

پہلا قطعہ

ہر چند وے رہے دست و بغل اٹھتے نہیں خروش کس کا ہے راز بحر میں یارب کہ یہ ہیں جوش
ابتر کو ہے موج کوئی چشم ہے حباب موتی کی کسو کی بات ہے سیپی کسو کا گوش!

علیحدہ شعر

حیرت سے ہووے پرتوِ مہ، نور آتشیں تو چاندنی میں نکلے اگر ہو سفید پوش

دوسرا قطعہ

کل ہم نے سیرِ باغ میں دل ہاتھ سے دیا — اِک سادہ و گلفروش کو پاکر سبدبدوش
جاتا ہوں بارگاہ سے جوں موسمِ بہار — آج اُس بغیر داغِ جگر ہے سیاہ پوش

تیسرا قطعہ

شب اس دلِ گرفتہ کو وا کر بزور مَے — بیٹھے تھے شیرہ خانہ میں ہم کتنے ہرزہ کوش
آئی صدا کہ یاد کرو دورِ رفتہ کو — عبرت بھی ہے ضرور ٹک اے جمع تیزہوش
جمشید جس نے وضع کیا جامِ کیا ہوا — وے صحبتیں کہاں گئیں کیدھر وے نائو نوش
جز لالہ اُس کے جام سے پاتے نہیں نشاں — ہے کوکنار اُسکی جگہ اب سبوبدوش
جھوٹے ہے بید جائے جوانانِ میگسار — بالائے خم ہے خشت سرِ پیرِ میفروش
میر اِس غزل کو خوب کہا تھا ضمیر نے
پر اے زباں دراز بہت ہو چکی خموش

---

۸ ابر نیساں یہ تنک بخشی شبنم کب تک — میرے کہسار کے لالے ہیں تہی جام ابھی

اعتراض: تنک بخشی شبنم کیا چیز ہے؟ پھر ابر نیساں سے شبنم کا طلب کرنا بھی کیا خوب۔ آپ جناب جب ابر ہوتا ہے تو شبنم کہاں ہوتی ہے ابر اور شبنم سے تو عداوت ہے۔ پھر ابر نیساں سے بجائے قطرہ باراں کے ابر نیساں اپنے کہسار کے لالوں کے خالی جام پُر کرنے کے لئے شبنم کا۔ یہ بھی آپ ہی کا کام ہے۔ بات یہ ہے کہ تنک بخشی شبنم کے معنی بوجہ بے علمی ہمارا سمجھ میں نہ آئے ورنہ یہ معمہ حل ہو جاتا۔

جواب: حضرت معترض پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے ہیں حیرت ہے کہ تنک بخشی شبنم کے معنی نہیں سمجھتے۔ اس کے معنی ابر نیساں سے شبنم طلب کرنا نہیں ہے بلکہ ابر نیساں سے گلہ ہے کہ شبنم کی طرح کم کم کیوں دیتا ہے۔ ٹوٹ کے برس۔

۹ جلوۂ گل کا ہے اک دام نمایاں بلبل — اس گلستاں میں ہیں پوشیدہ کئی دام ابھی

اعتراض: رگ گل کا دام تو تنکے کی چڑیا ہو سکتا ہے مگر جلوۂ گل کا دام سمجھ نہیں معلوم کس کارخانے میں تیار ہوتا ہے اور بلبل کمبخت کیلئے تو گل ہی کا دام کافی ہے۔ ایک مرتبہ گرفتار ہوتی تو کہیں پاس ہے سو دام ہوں تو کیا پروا۔

جواب: خود حضرت معترض گل کو دام کا بدل تسلیم کرتے ہیں دلیل کمبخت کے لیے تو گل ہی کا دام کافی ہے مگر جلوۂ گل کی نسبت فرماتے ہیں کہ دام نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ لفظ جلوہ سے دام کا پھیلنا ظاہر ہوا محض گل کی تشبیہ دام سے زیادہ قفس سے موزوں ہے۔ اُن کا فرمانا درست ہوتا کہ رگ گل کو دام کہہ سکتے ہیں، گل کو نہیں کہہ سکتے اگر لفظ گل کے ساتھ لفظ جلوہ اور لفظ نمایاں کا اضافہ نہ ہوتا۔ دام رگ گل نمایاں کب ہوتا ہے۔ مصرعۂ ثانی سے واضح ہوا کہ جلوۂ گل کے دام نمایاں کے علاوہ گلستاں میں پنہاں دام بھی ہیں مثلاً ہم جنسوں کی سردمہری، بغض و حسد و کینہ پروری، مکر و فریب، دغا بازی اور سب سے زیادہ تلخ دوستی کے پردے میں دشمنی۔ مگر یہ توجیہہ اُس وقت پیدا ہوگی کہ بلبل سے روح انسانی جو دام عناصر میں اسیر ہے گلستاں سے یہ عالم نیرنگ اور جلوۂ گل سے اس دنیا کے دلفریب مناظر مراد لئے جائیں ورنہ حضرت معترض کی تو کی چھتی پہنا جائے گی۔ بس کی داد چڑیا دے دیں گے۔

۱۰ ہم نوا لذتِ آزادی پرواز کجا — بے پری سے ہے نشیمن بھی مجھے دام ابھی

اعتراض: نشیمن کی تشبیہ دام سے خوبصورت نہیں ہے۔ نشیمن بمنزلہ قفس کہنا چاہیئے . . . . . . دام صرف قافیہ کی خاطر سے لایا گیا ہے

ایک ہی قافیہ کے تین چار شعر ایک جگہ لکھ دینے سے لطف اور زیادہ ہو گیا ہے۔

جواب:- حضرت معترض نے غور نہیں کیا کہ اگر لفظ دام کی جگہ لفظ قفس ہوتا تو ردیف "ابھی" بیکار ہو جاتی۔ موجودہ صورت میں یہ مطلب ہے کہ ابھی تو نشیمن دام ہے (دام کا مرادف ہے) رفتہ رفتہ قفس ہو جائیگا۔ علاوہ بریں شاعر نے نشیمن کو دام سے تشبیہ نہیں دی ہے۔ بلکہ جیسا خود معترض نے دبے پردہ اعتراف کیا ہے بمنزلہ دام کہا ہے (تھوڑی دیر کے لئے اُن کی عبارت "نشیمن بمنزلہ قفس کہنا چاہیے" میں قفس کی جگہ دام پڑھئے۔ تو میرے معروضہ کی تصدیق ہو جائیگی) اگر کوئی کہے کہ مجھے خار بمنزلہ گل ہے تو اس سے یہ مراد نہ ہو گی کہ خار و گل مشابہ ہیں بلکہ قائل کی حالت کا اندازہ ہو گا

شعر خبر اقبال کی لائی ہے گلستاں سے نسیم — نو گرفتار پھڑکتا ہے تہ دام ابھی

اعتراض:- یعنی قفس یا پھنکی کا استعمال ابھی صیاد نے نہیں کیا ہے نہ چھوٹی ہے مروار۔ نو گرفتار ہے۔ نہ پھڑکنا ہے نہ دام نہ وجود ہے نہ صیاد کا۔

جواب:- اس شعر کی تنقید پڑھ کے بے حد صدمہ ہوا۔ اور میر کا یہ مصرعہ یاد آیا ع "تھا وہ بے درد مجھے جس نے وفا کو سونپا" تاکہ معترض کا دل پتھر ہے۔ جسے اس سر تیز نشتر کی خلش محسوس نہیں ہو سکتی مگر کیا فن کے لحاظ سے ردیف کی بلاغت پر بھی غور نا ممکن تھا؟ کیا ردیف سے یہی پایا جاتا ہے کہ صیاد نے ابھی قفس یا پھنکی کا استعمال نہیں ہے۔ کیا لفظ ابھی سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس نو گرفتار کا پھڑکنا ذرا دیر میں سسکنے اور دم توڑنے میں مبدل ہو جائے گا؟

مقطع میں لفظ خبر کے اشارات صرف اہل دل کے لئے ہیں۔ اس کی تشریح کو نظر انداز کرنے پر معترض سے کوئی گلہ نہیں۔

ایک ہی قافیہ کو ایک ہی غزل کے متعدد اشعار میں باندھنا عیب نہیں بلکہ قادر الکلامی اور تنوع تخیل کا ثبوت ہے بشرطیکہ ایک ہی مطلب کی تکرار یا ذرا تغیر نہ ہو۔

حضرت اقبال کے باکمال شاعر ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن بقول آتش ؎

قابل گوش سکڑوں گوہر — گوش بھی قابل گہر ہے شرط

اور خود اقبال نظیری کی زبان سے کہتے ہوں گے ؎

ضمیرے پُر گہر دارم قرین ابر نیسانی
سخن را مستمع خواہم کہ چوں دریا کند گوشے

مولانا باری

اٹھارہویں صدی کا پنجاب

اورنگ زیب کی موت سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی تخت نشینی تک پنجابیوں کو ایک نہایت ہی پُرآشوب دور کا سامنا کرنا پڑا۔ دلی کی مرکزی حکومت کمزور ہو چکی تھی، ہندوستان کے بہت سے صوبے اس سے کٹ رہے تھے۔ پنجاب کے لئے بھی ایسا کرنا آسان تھا۔ لیکن پنجاب کی مقامی حکومت کو اجنبی حملہ آوروں نے مضبوط اور مستحکم ہونے کا موقعہ نہ دیا۔ دلی کی کمزور مرکزی حکومت میں اتنی قوت اور صلاحیت نہیں تھی۔ کہ وہ پنجاب کو اجنبی حملہ آوروں سے بچا سکتی۔ ان حملہ آوروں نے ایک طرف جہاں مغل اعظم کی کمزوری اور بے بسی کو نمایاں کر دیا وہاں انہوں نے پنجاب کے نظم و نسق کو تہ و بالا کر دیا۔ افغانوں کا یہ دعویٰ ہوتا تھا کہ پنجاب پر ان کا تسلط ہے۔ دلی کی مرکزی حکومت پنجاب کے معاملات میں دخیل ہونے سے باز نہیں رہ سکتی تھی چنانچہ افغانوں کو پنجاب پر اپنا تسلط جمانے کیلئے بار بار حملے کرنے پڑتے تھے۔ ان حملوں نے پنجاب کی سیاسی اور تہذیبی زندگی کو تباہ و برباد کر دیا کم و بیش ایک سو سال تک پنجاب کی یہی کیفیت رہی۔ اس صدی میں جہاں ہندوستان کے دوسرے آزاد اور نیم آزاد صوبے علوم و فنون میں کچھ نہ کچھ کرتے رہے۔ وہاں پنجاب میں علوم و فنون کے سرچشمے تقریباً سوکھ گئے "اس مدت میں چند شاعر ضرور دکھائی دیتے ہیں" ان کی شاعری پنجابیوں کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہے "اس افراتفری کے دور میں پنجاب تعمیرات میں خاک ترقی کر سکتا تھا۔ سینکڑوں، ہزاروں عمارتیں سطح زمین کے ساتھ ہموار ہو گئیں۔ یا ہموار کر دی گئیں۔ رہی سہی عمارتوں کی مرمت کے لئے بھی کوئی مشکل ہی سے ملتا تھا۔ اٹھارہویں صدی کا پنجاب عبارت ہے بیرونی حملوں اور اندرونی شورشوں سے۔

اورنگ زیب کی موت (۱۷۰۷ء) کے بعد اس کا بڑا بیٹا بہادر شاہ تخت پر بیٹھا۔ بہادر شاہ کے عہد میں بندہ بیراگی کی سرگرمیاں دکھائی دیتی ہیں۔ بیراگی اور اس کے ساتھیوں نے ستلج اور بیاس کے دوآبہ کے کئی شہروں کو لوٹنے کے بعد لاہور پر حملہ کرنا چاہا۔ لیکن سرہند پر شاہی فوج نے بندہ بیراگی کو شکست دی، بندہ بیراگی نے اپنے آپ کو لوہ گڑھ میں محصور کر لیا۔ تین مہینے تک شاہی فوجوں نے لوہ گڑھ کا محاصرہ کئے رکھا۔ اس موقع پر بندہ بیراگی قلعہ لوہ گڑھ سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اسی اثنا میں بہادر شاہ بھی دلی سے لاہور پہنچ گیا۔ لیکن چند دنوں کے بعد اس نے لاہور ہی میں وفات پائی۔

بہادر شاہ کی موت (۱۷۱۲ء) کے بعد اس کے بیٹوں میں تخت کے لئے لڑائی ہوئی، سب سے پہلے تین بھائیوں نے مل کر لاہور کی فصیل کے باہر چوتھے بھائی عظیم الشان کو شکست دی، شکست کھانے کے بعد عظیم الشان نے راوی عبور کرنے کی کوشش کی لیکن ساحل تک نہ پہنچ سکا، اب معزالدین نے اپنے دو بھائیوں سے علیحدہ علیحدہ لڑائی کر کے انہیں شکست دی، معزالدین نے تخت نشین ہوتے وقت جہاندار کا لقب اختیار کیا، جہاندار کو حکومت کرتے ہوئے ابھی سات مہینے ہی گذرے تھے کہ عظیم الشان کے بیٹے فرخ سیر نے اسے شکست دی۔

مغل شہزادوں کی باہمی لڑائیوں نے بندہ بیراگی اور اس کے ساتھیوں کو موقعہ دیدیا تھا کہ وہ دوبارہ منظم ہو جائیں، اب بندہ بیراگی نے کوہستانی پناہ گاہوں سے نکل کر سب سے پہلے سرہند پر حملہ کیا اور شہر کو آگ لگا دی، پھر بٹالہ اور کلانور پر یورش کی۔ اب فرخ سیر نے اس شورش کو دبانے کیلئے نواب عبدالصمد کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا، پنجاب کے پہاڑی راجاؤں کی مدد سے عبدالصمد نے بیراگی کو کئی ایک معرکوں میں شکست دی، بیراگی نے آخر کار اپنے آپ کو گورداسپور کے قلعہ میں محصور کر لیا۔ شاہی فوج نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ بندہ بیراگی اور اس کے بہت سے ساتھیوں کو گرفتار کر کے دلی بھیجدیا گیا۔

نواب عبدالصمد خاں کے بعد اس کا بیٹا نواب زکریا خاں پنجاب کا گورنر مقرر ہوا، زکریا خاں کے عہد میں پنجاب اندرونی شورشوں سے بچا رہا۔

یہی وجہ ہے کہ زکریا خاں کو اتنی مہلت مل گئی تھی کہ اس نے لاہور اور شالامار کے درمیان بیگم پورہ کو سرکاری عمارات سے سجا دیا۔ اس زمانہ کی بنی ہوئی عمارتوں میں سے صرف چند شکستہ باقی ہیں۔ زکریا خاں نے پنجاب میں امن و امان قائم کر دیا۔ قیام امن کی اس جدوجہد میں زکریا خاں کے ساتھ آدینہ بیگ کا بھی بہت حصہ ہے۔ آدینہ نگر، مسجد و مینار اسی کا بسایا ہوا ہے۔

ادھر زکریا خاں پنجاب میں مرکزی حکومت کے قبضہ کو مستحکم کرنے میں مصروف تھا۔ ادھر مرکزی حکومت سازشوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ کئی ایک صوبے مرکز سے کٹ چکے تھے۔ نظم و نسق میں ابتری پھیل چکی تھی۔ مرکزی حکومت کی ایک سازش نے نادر شاہ کی طوفانی فوج کا رخ ہندوستان کی طرف پھیر دیا۔ شاہی فوج کو پشاور کے قریب شکست دینے کے بعد نادر شاہ نے جلد ہی اٹک چناب کو عبور کر لیا۔ وزیر آباد میں زکریا خاں کی فوج نے نادر شاہ کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی۔ اب نادر شاہ نے لاہور کا رخ کیا۔ لاہور کو بچانے کیلئے زکریا خاں کی زیر کمان ایک فوج نے راوی کو پار کیا۔ تین دن تک لڑائی ہوتی رہی۔ آخر کار زکریا خاں کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ زکریا خاں بھاگ کر قلعہ میں داخل ہو گیا۔ اب اس نے قلعہ اور فصیل کو مستحکم کرنا شروع کیا۔ اسی اثنا میں نادری لشکر راوی پار کر کے شالامار میں ڈیرے ڈال چکا تھا۔ نادر شاہ کے ایک امیر کفایت خاں کے ذریعہ زکریا خاں اور نادر شاہ میں صلح ہو گئی۔ زکریا خاں نے بیس لاکھ روپے اور چند ہاتھی تاوان جنگ کے طور پر نادر شاہ کو پیش کئے۔ نادر شاہ نے زکریا خاں کو پنجاب کی گورنری پر بحال رکھا۔ اب نادر شاہ نے دلی کا رخ کیا۔ دلی میں قتل عام کرنے، لوٹ مار مچانے اور ان گنت دولت سمیٹنے کے بعد لاہور سے ہوتا ایران چلا گیا۔

نادر شاہ کے حملے نے مغل اعظم کی سیاسی کمزوری کو بے نقاب کر دیا تھا۔ چنانچہ ادھر نادر شاہ نے ایران کا رخ کیا ادھر ہندوستان کے مختلف صوبوں میں خود مختاری کی تحریک شروع ہو گئی۔ نادر شاہ کے حملے نے پنجاب میں مرکزی حکومت کے اقتدار کو کافی حد تک کمزور کر دیا تھا۔ ان حالات سے سکھوں نے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ پنجاب کی مقامی حکومت کی بے بسی اور دلی کی مرکزی حکومت کی کمزوری ان پر واضح ہو چکی تھی۔ لہٰذا انہوں نے سیاسی قوت حاصل کرنے کیلئے اپنی سرگرمیوں کو پہلے سے زیادہ تیز اور زیادہ منظم کر دیا۔

نواب زکریا خاں کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا یحییٰ خاں گورنر مقرر ہوا۔ یحییٰ خاں کا چھوٹا بھائی شاہنواز ملتان کا ناظم تھا۔ اس نے اپنے باپ کی جائداد میں اپنا حصہ طلب کیا۔ لیکن یحییٰ خاں نے اپنے چھوٹے بھائی کی درخواست پر زیادہ توجہ نہ دی۔ اس پر شاہنواز اپنی فوج سمیت اچانک شالامار کے قریب نمودار ہوا۔ شاہنواز نے دیوان صورت سنگھ کی معرفت یحییٰ خاں کو تصفیہ کرنے کا پیغام بھیجا۔ ابھی دونوں بھائیوں میں بات چیت جاری تھی کہ یکدم دونوں بھائیوں کے سپاہیوں میں لڑائی چھڑ گئی۔ اس لڑائی میں یحییٰ خاں کو شکست ہوئی۔ شاہنواز نے یحییٰ خاں کو قلعہ میں قید کرنے کے بعد مرکزی حکومت کی منظوری حاصل کئے بغیر اپنے گورنر ہونے کا اعلان کر دیا۔

تھوڑی مدت کے بعد یحییٰ خاں قید سے بھاگ کر دلی جا پہنچا۔ اب شاہنواز کو یقین ہو گیا کہ یحییٰ خاں شاہی فوج لے کر لاہور پر حملہ کرے گا۔ چنانچہ اس نے ۱۷۴۷ء میں احمد شاہ ابدالی کو پنجاب پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ اسی اثنا میں وزیر قمرالدین کے دباؤ سے شاہنواز نے احمد شاہ کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔ شاہنواز کے اس طرز عمل نے احمد شاہ ابدالی کے جوش و خروش کو اور بڑھا دیا۔ راوی کے کنارے پر پنجابیوں اور افغانوں کا مقابلہ ہوا۔ شاہنواز بھاگ کر دلی چلا گیا۔ احمد شاہ نے دیوان لکھپت رائے کو قید سے نکال کر لاہور کا حاکم مقرر کیا۔ افغانوں نے لاہور کے سب سے زیادہ بارونق اور امیر حصے یعنی مغلپورہ کو خوب لوٹا۔ اب احمد شاہ نے دلی کا رخ کیا۔ لیکن وزیر قمرالدین کے بیٹے نواب معین الملک (میر منو) نے احمد شاہ ابدالی کو سرہند کی لڑائی میں شکست دی۔

شاہ دلی نے میر منو کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے نے سکھوں کو موقع دے دیا کہ وہ لاہور کے آس پاس چھوٹے چھوٹے قلعے بنا لیں۔ میر منو نے ان قلعوں کو مسمار کرنے اور سکھوں کو دبانے کی جتنی زیادہ کوشش کی اتنا ہی اسے زیادہ ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ برسوں کی بدامنی سے تنگ آ کر زمینداروں نے بھی بغاوت کر دی تھی۔ زمینداروں کی اس بغاوت میں سکھوں نے پورا پورا ساتھ دیا۔ میر منو ان ہنگاموں کے فرو کرنے میں

معروف تھا کہ ۱۷۵۱ء میں احمد شاہ ابدالی نے پنجاب پر پھر لشکر کشی کر دی میر منو نے دربار دلی سے امداد طلب کی لیکن وہاں کیا دھرا تھا مقامی جنگجو عناصر پر وہ اتنا تشدد کر چکا تھا کہ ان سے کسی قسم کی امداد طلب نہیں کر سکتا تھا۔ چاروناچار میر منو نے پنجاب کے چار اضلاع کا مالیہ ہر سال احمد شاہ ابدالی کو بھیجنے کی شرط پر حملہ آور سے نجات پائی۔

دلی کے رہائشی دربار کو میر منو کا یہ اقدام پسند نہ آیا، چنانچہ شاہ دہلی نے شاہ نواز کو ملتان کا ناظم مقرر کر دیا، میر منو نے اس شاہی فرمان کو ذرہ برابر پرواہ نہ کرتے ہوئے ملتان کے دیوان کوڑا مل کو شاہ نواز کا مقابلہ کرنے کا حکم دیا۔ دیوان کوڑا مل نے شاہ نواز کو شکست دی۔ شاہ نواز اسی لڑائی میں مارا گیا۔

پنجاب میں افغانی فوج کی موجودگی کی بنا پر میر منو نے چار اضلاع کا مالیہ بھیجنے سے انکار کر دیا۔ اس پر احمد شاہ نے تیسری بار پنجاب پر حملہ کیا۔ لاہور کی دیواروں کے نیچے چار مہینوں تک پنجابیوں اور افغانوں میں لڑائی ہوتی رہی افغانوں نے چونکہ لاہور کا محاصرہ کر رکھا تھا اس لئے اپریل ۱۷۵۲ء میں محمود بوٹی کے قریب ایک کھلے میدان میں دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ دیوان کوڑا مل کے مارے جانے کے بعد پنجابی فوج میں بد دلی پیدا ہو گئی۔ پنجابی فوج کا ایک افسر عزیز بیگ اپنے پانچ بیٹوں سمیت اس لڑائی میں مارا گیا۔ چھٹے بیٹے نے اپنے باپ اور بھائیوں کی نعشوں کو ایک ہی قبر میں دفن کر دیا۔ محمود بوٹی میں اس قبر کے آثار بیسویں صدی کے آغاز تک موجود تھے، ممکن ہے اب بھی ہوں۔

میر منو نے احمد شاہ ابدالی کو پچاس لاکھ روپے دے کر صلح کر لی، احمد شاہ ابدالی نے جالندھر، لاہور اور کوہستان کی سند حکومت اس کے نام لکھ دی تھی۔ لیکن میر منو اس فرمان کے حصول کے بعد زیادہ مدت تک زندہ نہ رہ سکا۔ اس نے ۱۷۵۳ء میں وفات پائی۔

میر منو کی موت کے بعد اس کی بیوہ مراد بیگم نے عنان اقتدار کو سنبھالا۔ اس زمانے میں پنجاب پر دلی اور قندھار دونوں اپنے اپنے غلبے کا دعویٰ کرتے تھے۔ لیکن نہ مغل بادشاہ کو اور نہ احمد شاہ ابدالی کو اتنی فرصت تھی کہ وہ پنجاب کے نظم ونسق کو بہتر بنانے کیلئے کوئی قدم اٹھاتے، مراد بیگم نے حکومت کے کام کاج کی طرف کافی توجہ دی لیکن اس کے دربار میں دلی اور قندھار کے جاسوسوں کی موجودگی نظم ونسق کی راہ میں حائل ہوتی تھی دہلی کے بادشاہ کے طرفداروں کے طرز عمل سے تنگ آ کر مراد بیگم نے احمد شاہ سے امداد طلب کی، احمد شاہ ابدالی نے جہان خاں کو اپنا نائب بنا کر لاہور بھیجا، اس اثنا میں شاہ دلی نے غازی الدین حیدر کو ایک فوج کے ہمراہ لاہور روانہ کیا۔ اب شاہ دلی کا ایک نائب بھی لاہور میں رہنے لگا۔ ان حالات میں مراد بیگم نے احمد شاہ ابدالی کو پنجاب پر حملہ کرنے کی دعوت دی، جب غازی الدین حیدر کو مراد بیگم کے اس اقدام کا علم ہوا تو اس نے مراد بیگم کو گرفتار کرا کے جالندھر کے ناظم آدینہ بیگ کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا۔

احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۵۶ء کے جاڑوں میں چوتھی مرتبہ پنجاب پر حملہ کیا۔ آدینہ بیگ کانگڑہ کی طرف چلا گیا۔ احمد شاہ نے اپنے بیٹے تیمور کو لاہور کا حاکم مقرر کرنے کے بعد دلی کا رُخ کیا، ابدالی فوج کے سپاہیوں نے دو ماہ تک دلی کو خوب لوٹا۔ لوٹ مار کرنے کے بعد احمد شاہ نے قندھار کی راہ لی، تیمور نے پنجاب میں اپنے پاؤں جمانے کے لئے سکھوں اور پنجاب کے سابق گورنر آدینہ بیگ سے لڑائیاں شروع کر دیں، چونکہ تیمور کی فوجی قوت اس امر کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ اپنے دونوں دشمنوں سے بیک وقت لڑائی شروع کر دے۔ اس لئے اس نے سکھوں اور آدینہ بیگ میں افتراق پیدا کرانے کی کوشش کی۔ تیمور نے آدینہ بیگ کو لاہور طلب کیا۔ لیکن آدینہ بیگ نے لاہور آنے سے انکار کر دیا۔ اس پر افغانی فوج کو آدینہ بیگ کی گرفتاری کیلئے بھیجا گیا۔ لیکن یہ فوج آدینہ بیگ کو گرفتار نہ کر سکی۔ اس وقت آدینہ بیگ اپنے نام پر بسائے ہوئے شہر آدینہ نگر (موجودہ دینانگر) میں تھا، آدینہ بیگ کی فوج میں سکھوں کی کمی نہیں تھی۔ سردار جسا سنگھ آدینہ بیگ کی فوج کا ایک افسر تھا۔ آدینہ بیگ نے سکھوں کی ایک بڑی جمعیت کو لاہور پر حملہ کرنے کیلئے تیار کیا۔ اس فوج کا سردار جسا سنگھ کلال تھا۔ اس فوج کے مقابلے کی تاب نہ لا کر شہزادہ تیمور جناب پار چلا گیا، جسا سنگھ کلال نے لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد اپنا سکہ چلایا، جسا سنگھ کلال کا لاہور پر زیادہ دیر تک قبضہ نہ رہ سکا۔

مئی ۱۷۵۸ء میں مرہٹوں نے لاہور پر قبضہ کر لیا، درانی فوج کی تعداد چونکہ بہت تھوڑی تھی۔ اس لئے وہ پیچھے ہٹتی ہٹتی اٹک کے پار کر گئی۔

اس طرح اٹک تک کے علاقے پر مرہٹوں کا قبضہ ہو گیا۔ پنجاب کی حکومت آدینہ بیگ کے سپرد کرنے کے بعد بہت سے مرہٹے فوجی افسر واپس چلے گئے۔ لیکن چند ماہ بعد ہی آدینہ بیگ نے وفات پائی۔

پنجاب کا صوبہ تیمور کے ہاتھوں سے نکلنا تھا کہ احمد شاہ ابدالی نے پنجاب پر حملہ کرنے اور مرہٹوں سے لڑنے کی تیاریاں شروع کر دیں جب احمد شاہ ابدالی کی ان تیاریوں کا مرہٹوں کو پتہ چلا تو انہوں نے اٹک ملتان اور لاہور کو خالی کر دیا۔ پنجاب میں مرہٹوں کی چند ماہ تک عملداری رہی۔ لیکن اس عرصہ میں امن مفقود ہو چکا تھا۔ سکھوں نے مرہٹوں کو مالیہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اگر اس وقت احمد شاہ ابدالی پنجاب پر حملہ نہ کرتا تو پنجاب میں سکھوں اور مرہٹوں کا تصادم یقینی تھا۔ احمد شاہ ابدالی بلا روک ٹوک لاہور پر قابض ہو گیا۔ اس اثنا میں مرہٹوں کی ایک بہت بڑی فوج دہلی کے آس پاس جمع ہو رہی تھی۔ احمد شاہ ابدالی نے دہلی کا رُخ کیا، پانی پت کے میدان میں ۱۷۶۱ء میں ابدالی نے مرہٹوں کو شکست دی۔ مرہٹوں کو شکست دینے کے بعد احمد شاہ ابدالی نے بلند خاں کو پنجاب کا گورنر اور زین خاں کو سرہند کا ناظم مقرر کیا۔ جونہی احمد شاہ نے چناب پار کیا سکھوں نے اپنی سرگرمیوں کو تیز کر دیا۔ اب سکھ سرداروں نے جا بجا قلعے بنانے شروع کر دیئے۔ احمد شاہ ابدالی نے کابل پہنچ کر اپنے ایک جرنیل نور الدین کو سکھوں سے لڑنے کیلئے بھیجا لیکن سردار چڑت سنگھ نے نور الدین کو شکست دی۔ اب بلند خاں نے گوجرانوالہ پر حملہ کیا لیکن شکست کھا کر لاہور آ گیا۔

پنجاب میں سکھوں کا زور بہت بڑھ رہا تھا۔ بلند خاں اور زین خاں کیلئے ان کا مقابلہ کرنا بہت مشکل تھا۔ چنانچہ احمد شاہ ابدالی نے چھٹی بار پنجاب پر حملہ کیا۔ ایک مورخ کے الفاظ میں "احمد شاہ کی زندگی عقاب کی سی تھی۔ وہ پہاڑ کی بلندی سے زمین پر نگاہیں جمائے رکھتا۔ جہاں شکار اس کی نظر پڑتا وہ اپنے کوہستانی آشیانہ سے اڑ کر میدان میں اترتا، اور شکار کر کے چل دیتا۔ اور پھر ویسے ہی موقع کی تاک میں بیٹھا رہتا" ۱۷۶۲ء میں احمد شاہ نے پھر پنجاب پر حملہ کیا۔ سکھوں اور ابدالی فوج میں گوجروال اور برنالہ کے درمیان لدھیانہ سے پچیس میل دور مقابلہ ہوا۔ اس لڑائی میں سکھوں کو شکست ہوئی۔ گرفتار ہونے والے سکھ سرداروں میں سے ایک آلا سنگھ بھی تھا، احمد شاہ ابدالی نے اس کی شجاعت سے متاثر ہو کر اسے راجہ کا خطاب دیا۔ کابلی مل کو لاہور کا حاکم مقرر کرنے کے بعد احمد شاہ قندھار چلا گیا۔ احمد شاہ کے جاتے ہی بھنگیوں کی مثل نے گوجر سنگھ۔ لہنا سنگھ اور سوبھا سنگھ کے ماتحت لاہور پر حملہ کر دیا۔ کابلی مل نے حملہ آوروں کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی۔ اب پنجاب میں سکھوں کا زور بڑھنے لگا۔ انہوں نے سرہند کے افغان حاکم زین خاں کو قتل کرنے کے بعد سرہند کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ سرہند پر دوبارہ قبضہ کرنے کیلئے احمد شاہ ابدالی نے ساتویں بار پنجاب پر حملہ کیا۔ سکھوں نے لاہور خالی کر دیا۔ وہ سرہند کی طرف بڑھنا چاہتا تھا۔ کہ اُسے بعض حالات کی بنا پر واپس جانا پڑا۔ احمد شاہ نے اپنی طرف سے سردار آلا سنگھ کو سرہند کا ناظم مقرر کر دیا تھا۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اب احمد شاہ سکھوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے پر آ گیا تھا۔

احمد شاہ ابدالی نے مشکل سے چناب پار کیا ہو گا کہ سکھوں نے درانی کے مقرر کئے ہوئے حاکم لاہور کابلی مل کو لاہور سے نکال دیا۔ چند مہینوں کے اندر اندر سکھوں نے جہلم اور ستلج کے درمیانی علاقے پر قبضہ کر لیا۔ سکھوں کی بارہ مثلوں نے پنجاب کے اس علاقے کو آپس میں بانٹ لیا تھا۔ پنجاب میں افغانوں کی حکومت ختم ہو چکی تھی۔ لیکن ابھی تک پنجاب میں مرکزی حکومت قائم نہیں ہو سکی تھی۔ سارا پنجاب بڑے بڑے جاگیرداروں اور سرداروں میں بٹا ہوا تھا۔ ان سرداروں کی آپس میں کئی بار مقامی لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔

دو سال تک تیاریوں میں مصروف رہنے کے بعد احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۶۷ء میں پنجاب پر آٹھویں بار حملہ کیا۔ احمد شاہ ابدالی کا یہ آخری حملہ تھا۔ اس حملے میں ابدالی کو ناکامی ہوئی، ابدالی کی واپسی کے بعد اس کی زندگی ہی میں پنجاب اس کے قبضے سے نکل گیا۔ احمد شاہ ابدالی کی موت پر ۱۷۷۳ء کے بعد اس کے بیٹے اور جانشین تیمور شاہ نے دو مرتبہ ملتان پر قبضہ کرنا چاہا۔ لیکن اسے ناکامی ہوئی۔ تیسری بار وہ ملتان پر قابض ہو گیا۔ تیمور شاہ کو سندھیوں، کشمیریوں اور ازبکوں کی بغاوتوں نے اس قدر پریشان کر دیا تھا کہ وہ پنجابیوں کے ساتھ کوئی فیصلہ کن لڑائی نہ کر سکا۔ اس کے عہد حکومت ختم ہوتے ۱۷۹۳ء میں پنجاب کے مختلف حصوں پر سے افغانوں کا اقتدار بڑی تیزی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ پنجاب کے سردار [illegible]

کو اپنی حفاظت میں لے لیتے جو تیمور شاہ کے افسروں کو لگان دینے سے انکار کر دیتے تھے۔ تیمور شاہ کی وفات کے بعد جب شاہ زمان افغانستان کے تخت پر بیٹھا تو اس وقت پنجاب پر سے افغانوں کا اقتدار اٹھ چکا تھا۔

شاہ زمان کے عہد حکومت کے شروع ہی میں پنجاب خود مختار سرداروں اور جاگیرداروں میں بٹ چکا تھا۔ لیکن اس پر بھی شاہ زمان کو پنجاب میں حکومت کے معمولی اختیار حاصل تھے۔ ۱۷۹۵ء میں اس نے حسن ابدالی اور قلعہ رہتاس پر قبضہ کر لیا۔ اسی اثنا میں ہندوستان کے حالات یکسر بدل چکے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی فتوحات اور میسور کی صورت حالات نے ہندوستان پر شاہ زمان کے حملے کے امکانات پیدا کر دیئے تھے۔ سلطان ٹیپو اور شاہ زمان میں عہد و پیمان ہو چکے تھے، ایسٹ انڈیا کمپنی کی پوزیشن جنوبی ہندوستان میں کافی مضبوط تھی۔ اس کی مملکت پر اودھ ہی سے حملہ کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ لارڈ ویلزلی نے شاہ زمان کے حملے کی روک تھام کے لئے اودھ میں انگریزی فوج بھیجی۔

۱۷۹۸ء کے جاڑوں میں شاہ زمان لاہور پہنچا۔ جب شاہ زمان نے اپنے اس ارادے کا اظہار کیا کہ وہ انگریزوں کے ساتھ ایک فیصلہ کن لڑائی لڑنا چاہتا ہے۔ تو بہت سے سکھ سرداروں نے اس کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا۔ انیسویں صدی کے ایک مؤرخ کے الفاظ میں "لاہور کے بڑے بوڑھوں کو وہ وقت اب تک یاد ہے جب سیاہ ٹوپی اور سیاہ لباس پہنے ہوئے شاہ زمان قلعہ کی دیواروں تلے اپنی فوج کا معائنہ کر رہا تھا"۔ پنجاب کے سرداروں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کے بعد شاہ زمان دلی کی طرف بڑھنا چاہتا تھا کہ اس کے بھائی محمود کی شورش نے اسے واپسی پر مجبور کر دیا۔ اگلے جاڑوں میں شاہ زمان پھر لاہور پہنچا، اسی اثنا میں لارڈ ویلزلی نے ایران کے ساتھ ایک دوستانہ معاہدہ کر لیا تھا۔ جب شاہ زمان لاہور پہنچ گیا۔ تو شاہ ایران کی امداد سے محمود نے جو اس وقت ایران میں پناہ گزیں تھا۔ ہرات پر حملہ کر دیا۔ محمود کا یہ اقدام لارڈ ویلزلی کے اشاروں سے ہوا تھا۔ تھوڑی مدت تک لاہور میں رہنے کے بعد ۱۷۹۹ء میں اسے واپس جانا پڑا، واپسی پر شاہ زمان کی چند ایک توپیں چناب میں گر پڑیں، ان توپوں کو اس علاقے کے ایک نوجوان سردار رنجیت سنگھ نے نکلوا کر شاہ زمان تک پہنچا دیا۔ اس پر شاہ زمان نے ایک فرمان کے ذریعہ رنجیت سنگھ کو لاہور کا حاکم مقرر کر دیا۔ چونکہ اس وقت لاہور پر شاہ زمان کا قبضہ نہیں تھا۔ لہذا شاہ افغانستان کا یہ فرمان رنجیت سنگھ کیلئے ایک اخلاقی امداد سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔

لاہور تین حاکموں کے تصرف میں تھا۔ صاحب سنگھ، چیت سنگھ اور مہر سنگھ نے لاہور کے مختلف حصوں پر قبضہ کر رکھا تھا۔ لاہور کے یہ تینوں حاکم ان سرداروں کی اولاد تھے جو پنجاب کی تاریخ میں "سہ حاکمان لاہور" کہلاتے ہیں۔ صاحب سنگھ، چیت سنگھ، اور مہر سنگھ، ترتیب کے ساتھ گوجر سنگھ، لہنا سنگھ اور سوبھا سنگھ کے بیٹے تھے۔ ان تین حاکموں نے لاہور کو تباہ کر رکھا تھا۔

ادھر رنجیت سنگھ اس سوچ میں تھا کہ لاہور پر کیسے قبضہ کرے۔ ادھر لاہور کے لیڈر اس فکر میں تھے کہ لاہور کو مزید تباہی اور ویرانی سے بچانے کیلئے 'تین حاکموں' سے کس طرح رہائی دلائی جائے چنانچہ حاکم رائے، محمد عاشق، محمد باقر، محمد طاہر اور مفتی محمد اکرم نے رنجیت سنگھ سے درخواست کی کہ وہ لاہور پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کرے۔ چنانچہ رنجیت سنگھ اپنی فوج سمیت لاہور کی طرف بڑھا۔ اس نے باغ وزیر خاں (جسکی بارہ دری میں پنجاب لائبریری واقع ہے) میں ڈیرے ڈال دیئے۔ تینوں حاکموں نے اپنے آپ کو شہر کے اندر بند کر لیا۔ محکم دین جو اس وقت لوہاری دروازہ کی حفاظت پر مامور تھا لاہور کے ان لیڈروں کا ہم خیال تھا۔ جنہوں نے رنجیت سنگھ کو لاہور پر حملہ کرنے کی دعوت دی تھی۔ جب رنجیت سنگھ کی فوج نے لوہاری دروازہ پر حملہ کیا۔ تو مہر محکم دین نے دروازہ کھول دیا جب تینوں حاکموں کو پتہ چلا کہ رنجیت سنگھ شہر میں داخل ہو چکا ہے تو ان میں سے دو بھاگ گئے۔ اور چیت سنگھ قلعہ میں چلا گیا۔ تیسرے دن وہ بھی قلعہ چھوڑ کر بھاگ نکلا۔

رنجیت سنگھ کی فوج کے چند سپاہیوں نے لاہور کو لوٹنا چاہا۔ لیکن رنجیت سنگھ نے لوٹ مار کرنے کی سخت مخالفت کر دی۔ رنجیت سنگھ کے اس طرز عمل نے لاہوریوں کی ہمدردی حاصل کر لی۔ جس پر مہر محکم دین کو بعد میں وہ "باپو جی" کہہ کے پکارتا رہا۔ اس کی امداد سے وہ لاہور پر قابض تو ہو گیا تھا۔ لیکن ابھی لاہور پر اپنا قبضہ مستحکم کرنے کیلئے اسے پنجاب کے سرداروں کی ایک متحدہ فوج سے لڑنا تھا۔ چند مہینوں کے بعد سردار صاحب سنگھ،

سردار گلاب سنگھ اور سردار نظام الدین خاں حاکم قصور نے مل کر لاہور پر چڑھائی کر دی۔ لاہور سے تھوڑی دور بھسین کے مقام پر اتحادیوں اور رنجیت سنگھ کی فوجوں میں لڑائی ہوئی۔ اتحادی سردار شکست کھانے کے بعد منتشر ہو گئے۔ اس لڑائی میں رنجیت سنگھ کو اتحادیوں کی دولت اور ان کا سامان جنگ ہاتھ لگا۔ لاہور پہنچ کر رنجیت سنگھ نے ایک دربار کیا جس میں رنجیت سنگھ نے اپنے "مہاراجہ بہادر" ہونے کا اعلان کرنے کے بعد اپنے نام کا سکہ جاری کیا۔ اسی دربار میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے فرمان جاری کیا کہ پرانے قاضیوں اور مفتیوں کو ان کے عہدوں پر بحال کیا جاتا ہے۔

اٹھارھویں صدی کے پنجاب کی اس صورت حالات سے اس زمانے کے تمدنی اور معاشی حالات کا بہت آسانی کے ساتھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اورنگ زیب کی موت کے بعد پنجاب کے مغل گورنروں کو اندرونی شورشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان شورشوں میں حکومت اور عوام دونوں کو بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔ بہرحال پنجاب کے مغل گورنروں نے جب ان شورشوں پر قابو پانے کے بعد پنجاب کی معاشی اور تمدنی ترقی کی طرف قدم اٹھانا چاہا تو نادر شاہ اور اس کے بعد احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے پنجاب کی صوبائی حکومت کو بہت کمزور کر دیا۔ سنہ ۱۷۸۳ء میں پنجابیوں کو ایک ہولناک قحط کا سامنا کرنا پڑا۔ اس قحط میں لاکھوں انسان ہلاک ہو گئے۔ احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے پنجاب کی معاشی اور سماجی زندگی کو جس حد تک برہم کر دیا تھا اس کا اندازہ پنجابیوں کی اس کہاوت سے لگایا جا سکتا ہے "کھادا پیتا لاہے دا، رہندا احمد شاہے دا" ان حملوں کے باوجود احمد شاہ ابدالی پنجاب پر نہ تو پورے طور سے مسلط ہو سکا اور نہ اسے امن کے قیام میں کامیابی ہوئی۔ ان حملوں کا فوری اثر یہ ہوا کہ پنجاب کی صوبائی حکومت کمزور ہو گئی۔ اور پنجاب کے مختلف حصوں پر چھوٹے چھوٹے سرداروں کا قبضہ ہو گیا۔ ان سرداروں کی خواہش ہوتی تھی کہ ان کی ریاست میں امن قائم رہے۔ لیکن وہ ایک دوسرے پر حملے کرتے رہتے تھے۔ ان اندرونی جھگڑوں نے پنجاب کی تجارت اور صنعت کو مٹا دیا تھا۔ سنہ ۱۷۸۳ء کے قحط نے پنجاب کو تباہ اور ویران کر دیا تھا۔ مشرقی پنجاب کے ہزاروں گاؤں ویران ہو گئے۔ پنجاب کے وسطی اضلاع میں اس قحط نے لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ سینکڑوں ویران اور برباد شدہ گاؤں آج بھی اس قحط کے نشانات میں سے باقی ہیں۔

اٹھارھویں صدی میں پنجاب کے کئی ایک شاعروں نے اس زمانے کے سیاسی اور معاشی حالات کا نقشہ کھینچا ہے۔ پنجابی زبان میں لکھنے والے صوفی شاعر پنجاب کی تباہ حالی کا اکثر تذکرہ کرتے ہیں۔ اس صدی کے اختتام پر شاہ مراد فارسی اور اردو میں پنجاب کی تباہی پر نوحہ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ شاہ زمان کے حملے کے بعد پنجاب کی عمومی حالت کو وہ اس طرح پیش کرتا ہے۔!

نہ ہے شاہے کہ از کابل بلا ہور — چوں وحشی آمد و دیوانہ ساں رفت
نمے زیبد مرادؔ اور اشاہ گفتن — چہ شد گر نام سلطانے براں رفت
نہ ذوقِ سکّہ نے پروائے خطبہ — نہ اندیشہ کہ سود آمد زیاں رفت
براہ غارت و تاراج پنجاب — چوں دزدو آہستہ تر آمد دواں رفت
ز دست جور آں غول بیاباں — عجب حالت بجان شہریاں رفت
زمانے بر زمینے کس نیاسود — ز عالم راحت و امن و اماں رفت
کجا در بتکدہ ناقوس ماندے — کہ اکثر لوٹ مسجد ہا اذاں رفت

یہی شاعر "مگس نامہ" میں لاہور کی ویرانی اور اس کی گندگی کو پیش کرتا ہے۔

اس صدی میں جہاں وارث شاہ نے پنجاب کی دیہاتی زندگی کی ترجمانی کو کمال تک پہنچا دیا تھا۔ وہاں "بلھے شاہ" علی حیدر اور فرد فقیر نے اپنی صوفیانہ شاعری سے پنجابیوں میں انسان دوستی کے جذبات کو بیدار کئے رکھا۔ اگر وارث شاہ پنجاب کے جمالیاتی پہلو کے عکاس ہیں تو یہ صوفی شاعر پنجابیوں کے روحانی جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

عبادت بریلوی

شاعری اور عریانی

عریانی کا تصور بڑی حد تک اضافی ہے۔ ایک بات جو کسی خاص سماج کے ایک خاص فرد کو عریاں معلوم ہوتی ہو، ممکن ہے دوسرے سماج کے فرد کو عریاں نہ معلوم ہو۔ یہ چیز حالات و واقعات کے تقاضوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اسے حالات و واقعات کے پس منظر ہی میں دیکھنا چاہئیے۔ مثال کے طور پر یہ دیکھئے کہ مغربی عورتیں، جس طرح کا لباس پہنتی ہیں اور جس انداز سے بازاروں میں اٹھکیلیاں کرتی ہوئی چلتی ہیں، ہم اس کو ان کی بے حیائی پر محمول کرتے ہیں اور ان کی اس عریانی کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے۔ حالانکہ ان کی سماج کے افراد کیلئے یہ کوئی ایسی معیوب باتیں نہیں۔ ہم لوگ جب ان عورتوں کو اپنے جسم کی نمائش، اپنی باہوں کا چمپئی رنگ، اپنے غازہ آلود چہرے کی چمک دمک اور سینے کے اُبھار کو نمایاں کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ تو ان کو خود احساس بھی نہیں ہوتا۔ اور نہ اس سماج کے نوجوانوں پر وہ بیقراری کی سی کیفیت طاری ہوتی ہے، جس کا شکار ہندوستانی نوجوان، ان عورتوں کو پہلی ہی نظر میں دیکھ کر ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ہندوستانی سماج میں ایسے مناظر دیکھنے میں نہیں آتے۔ اس لئے یہاں کے نوجوانوں میں جنسی تشنگی کا احساس، سارے جسم کی رگ رگ اور ریشے ریشے میں ایک سیمابی کیفیت پیدا کر دیتا ہے —— یہ تو خیر مشرق و مغرب کا تقابل تھا۔ آپ ہندوستان ہی کے مختلف خطوں کو دیکھئے! شمالی ہندوستان میں جس بات، جس طریقے اور جس انداز کو عریانی سمجھا جاتا ہے، اس کو گجرات، وسط ہند اور جنوبی ہند کے اکثر قبیلوں میں معیوب نہیں سمجھتے۔ گجرات میں عورتیں جس طرح نیم عریانی لباس پہنتی ہیں اس کو شمالی ہند والے اچھا نہیں خیال کرتے —— گونڈ اور بھیل قوموں کے یہاں جو عورتوں کا لباس ہے، اسکو شمالی ہند کی کوئی عورت تحسین کی نظروں سے نہیں دیکھتی۔ کیونکہ اس میں ایک طرف تو ان کا جسم عریاں ہو جاتا ہے۔ اور دوسری طرف ان کے سارے خد و خال نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض قبیلے ایسے بھی ہیں جن کے یہاں نوجوان لڑکیاں اپنے پستانوں کو کسی چیز سے پوشیدہ نہیں کرتیں۔ وہ اسی طرح نمایاں رہتے ہیں۔ اور ان کے یہاں اس کو معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا —— یہی حال بعض خاص حالات و کیفیات کے بیان کا ہے۔ کہ کسی خاص دور میں اگر بعض خاص حالات کی تصویریں کھینچنی معیوب سمجھی جاتی ہیں، تو دوسرے دور میں ان کو برا نہیں سمجھا جاتا۔ وہ لوگ اس کی مخالفت کرتے ہیں، جو اس زمانے کے لوگ نہیں ہوتے۔ بلکہ "اگلے وقتوں کے لوگ" ہوتے ہیں۔ اور جو زمانے کی بدلتی ہوئی کروٹوں اور حالات و واقعات کے تیوروں کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ لیکن وہ لوگ جو ذہنی حیثیت سے آگے بڑھ چکے ہوتے ہیں، ان چیزوں کو اس طرح پیش کرتے ہیں۔ جیسے ان کے نزدیک ان کے بیان میں کوئی معیوب بات نہیں —!

جنسیات اور اس سے متعلق مختلف حالات و کیفیات کے بیان ہی کیساتھ عریانی کا تصور وابستہ ہے۔ جہاں کہیں بھی جنسی پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ یا اُس کے متعلق کوئی بات کہی جاتی ہے۔ تو لوگ اس کو عریاں سمجھتے ہیں۔ حالانکہ دنیا میں ہمیشہ یہ خیالات یکساں نہیں رہے۔ یعنی جنسیات کے متعلق تصورات قریب قریب ہر دور میں بدلا کئے ہیں۔ ایک زمانے میں اگر اُس کی مختلف کیفیات کے بیان کو معیوب مانا گیا ہے، تو دوسرے دور میں وہ کھُلم کھلا بغیر کسی جھجک کے پیش کئے گئے ہیں —— صدیاں گزریں، جب انسان اس دنیا میں بالکل نووارد تھا۔ تو جنسی تعلقات کو وہ ایسا گناہ خیال نہیں کرتا تھا، جیسا کہ ہم آج خیال کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے جنسی فعل اس کے نزدیک ایک بڑی مقدس اور اہم بات تھی — اور سینکڑوں مثالیں تو ایسی ملتی ہیں، جب جنسی اعضاء، ان کی پرستش اور ان سے متعلق مختلف کیفیات کو مذہبی رنگ دے دیا گیا تھا۔ ہیولیاک ایلس نے اپنے ایک مقالے "مذہب اور جنسیات" میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے کہ دُنیا کے تمام مذاہب کسی نہ کسی صورت میں جنسی مظاہرات سے وابستہ رہے ہیں۔ اگلے زمانے کے لوگ ایک لمحے کیلئے بھی اس بات کو ماننے کیلئے تیار نہ تھے کہ مذہب اور جنسی معاملات میں کوئی تعلق نہیں۔ دنیا میں مختلف [illegible]

پر یہ مختلف چیزیں ایک سنگم پر ملتی ہیں۔ جاپان، ہندوستان، نیو گنی، پولینیشیا، یونان اور روم وغیرہ میں اکثر جگہ یہ تصورات ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس زمانے سے لیکر جب انسان وحشی اور جنگلی جانوروں کی طرح شکار کرتا پھرتا تھا۔ اس وقت تک جب اس نے کھیتی باڑی کر کے اپنا پیٹ پالنا شروع کیا، اس کے یہاں ایسے رقص و سرود کا رواج عام تھا جو جنسی ہیجان پیدا کرتے تھے۔ اور جو جنسی فعل کی ایک تمثیل تھے ——— اور پھر وونگ وہ اس حقیقت کو پھیلا کر بیان کرتا ہے کہ عہد قدیم میں جو ممالک سب سے زیادہ تہذیب یافتہ خیال کئے جاتے تھے۔ ان سب کے یہاں ہمیں جنسیات اور مذہب ایک دوسرے سے گلے ملتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مصر، بابل، یونان، روم، ایشیائے کوچک، اور بحیرہ روم کے آس پاس کی قدیم تہذیبوں میں جنسیات کی پرستش کا دخل تھا ——— بات یہ تھی کہ وہ جنسی فعل کو ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اس تصور نے ان کے ذہنوں میں تقدس کا رنگ دے دیا تھا۔ اس لئے جنسیات، اور جنسی فعل سے متعلق گناہ کا تصور ان کے یہاں دور تک نظر نہیں آتا۔ عہد قدیم میں ہمیں ناگ کی پرستش کا ذکر اکثر جگہ ملتا ہے۔ اور جنسیات پر بہت سے لکھنے والے اس بات پر متفق ہیں کہ وہ جنسی فعل اور جنسی عضو کی ایک تمثیل ہے۔ ہندوستان میں شیو جی اور پاربتی کے تعلقات کی کہانیاں، اس بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ عورت اور مرد اور ان کے جنسی فعل کو کسی طرح بھی الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ اس کے چھپانے سے کچھ حاصل ہے۔ عہد مسیح سے قبل اکثر ممالک میں ایسے دیوتاؤں کا ذکر ملتا ہے جن کا تعلق جنسیات سے ہے۔ اور عوام جن کی پرستش بھی کرتے تھے۔ روم میں جنس کا دیوتا Priapus کہلاتا تھا۔ روم میں پامپئی Pompei کے ویران شہر کی دیواروں پر ایسی تصویریں ملتی ہیں، جن میں اس دیوتا کو قربانی دینے کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ وسطی امریکہ میں اس بات کے متعدد ثبوت ملتے ہیں کہ وہاں کسی زمانے میں جنسی اعضاء مقدس و متبرک خیال کئے جاتے تھے۔ یہودیوں تک کے یہاں بعض ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ وہ جنسی اعضاء کو تقدس کی نظروں سے دیکھتے تھے ——— غرض یہ کہ جنس اور جنسی اعضا کی پرستش قدیم مذاہب میں عام تھی۔ شرم یا گناہ کے تصور کو اس میں دخل نہ تھا۔ اور اس سماج کے افراد اپنی ان حرکات کو اسی تقدس کی نظروں سے دیکھتے تھے جیسے آج کے مذہبی لوگ اپنی مختلف حرکات کو دیکھتے ہیں۔ قدیم مصر کے مندروں میں بھی جنسی قربانیوں کا رواج عام رہا ——— چنانچہ ایفروڈائٹ کیلئے جو سب سے بڑی قربانی عورتوں کی طرف سے پیش کی جاتی تھی وہ یہ تھی کہ وہ اس کے نام پر اپنی عصمت و عفت کو وہاں کے پجاریوں کے حوالے کر دیتی تھیں اور وہاں کے پجاریوں نے اس چیز کو اپنی جنسی خواہشات کی تسکین کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ ان تمام باتوں سے ——————
یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جنس کے معاملات ایک زمانے تک مذہبیات سے وابستہ رہے۔ اور ان کو کسی طرح بھی معیوب نہیں سمجھا گیا۔ برخلاف اس کے ان کی اہمیت کے پیش نظر انسان نے ان کی پرستش کرنی شروع کر دی۔

لیکن جیسا کہ دنیا میں اور بہت سی باتوں کا ردعمل ہوتا ہے، ان خیالات کا بھی ہوا۔ یہ خیالات اور یہ رسومات بھی بہت دنوں تک ایک طرح پر نہ چل سکیں۔ وجہ یہ تھی کہ پہلے اس سلسلے میں مکاری، دغابازی اور جعلبازی کا دخل نہ تھا۔ برخلاف اس کے ان کو برتنے میں ایک کی سادگی اور معصومیت کارفرما تھی۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ مسخ ہوتی چلی گئیں ——— اور بہت سے لوگوں نے ان کو اپنی وحشیانہ خواہشات کی تسکین اور عیش پرستی کا ذریعہ بنا لیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ عیاشی کا خیال اس میں گھر کرتا گیا۔ جس کی زیادتی ساری سماج کیلئے مضر ثابت ہونے لگی۔ پہلی صدی عیسوی تک آتے آتے یہ رسومات بہت کافی مسخ ہو چکی تھیں۔ اور اگرچہ ان کا رواج اب بھی عام تھا۔ لیکن اب بہت سے لوگوں نے ان کو بری نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا۔ چنانچہ شروع شروع میں عیسائی مذہب کے پادریوں نے ان کی روک تھام میں بڑا حصہ لیا۔ لیکن ان کا تدارک کرنے میں وہ بھی انتہا پسند ہو گئے۔ چنانچہ عیسائی مذہب کے قبل جتنے مذاہب بھی عام تھے۔ وہ سب ان کے نزدیک غیر مقدس ٹھہرے۔ جنسی افعال کو ان مذاہب میں برا نہیں خیال کیا جاتا تھا۔ اس لئے عیسائی پادریوں کی نظروں میں یہ چیز بھی غیر مقدس قرار پائی اور انہوں نے اس کو گناہ قرار دے دیا۔ ردعمل کے طور پر ان کے اطوار انتہا پسندانہ ہو گئے۔ انہوں نے اپنے علاوہ ہر مذہب کو غیر مقدس اور اسی کے ساتھ ساتھ جنسی فعل اور جنسی تعلقات

کی اہمیت کو غلط اور اس کے ارتکاب کو شرم آگیں بتایا، جو ان مذاہب میں عام طور پر رائج تھے۔ چنانچہ تمام عیسائی لکھنے والوں کی تصانیف میں یہ باتیں کثرت سے نظر آنے لگیں۔ کہ جنسی فعل یا جنسیات کی مختلف کیفیات کا بیان گناہ ہے۔ عورت کا جسم مرد کیلئے لعنت ہے اور عورت مرد کو گمراہ کرتی ہے۔ اس قسم کی تحریروں کو فرائڈ کے نظریے کی روشنی میں دیکھا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اس کی روک تمام میں ان کی اس جنسی بھوک کو تسکین نہ ملتی سا سکون مل جاتا تھا۔ جو ان لوگوں میں عام تھی۔ بہرحال اس تحریک نے جنسیات کے سلسلے میں مختلف جگہ Taboos قائم کئے۔ اور جو آج تک اسی طرح موجود ہیں۔ لیکن وہ فطری نہیں بلکہ خود ہماری سماج کے بنائے ہوئے ہیں۔

جنسیات کا موضوع چونکہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے ہر انسان اس میں دلچسپی لیتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض سماجی بندھنوں کے باعث، وہ اس کے متعلق زیادہ کچھ سننے پر آمادہ نہ ہو۔ لیکن ایسے سماج کے افراد بھی تنہائی میں اس قسم کی کتابیں پڑھنے میں لطف لیتے ہیں، جن میں جنسی باتوں کا تذکرہ ہوتا ہے۔ چونکہ انسانی دل و دماغ دونوں پر یہ جذبہ سب سے زیادہ حکومت کرتا ہے، اس لئے اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنی ہر انسان کیلئے ضروری ہیں۔ وہ لوگ جو اس کے متعلق کچھ کہنے یا سننے کو معیوب سمجھتے ہیں، دوسروں کو ایک فریب دینا چاہتے ہیں، اور خود تنہائی میں اس سے لطف لیتے ہیں۔ H.R.L.Shepperd نے Some of My Religion میں لکھا ہے کہ بعض سماجی رسومات ایسے ہوتے ہیں جن کے متعلق بات چیت کرنی زیادہ خوشگوار نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن ان کے فراموش کر دینے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ جس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اس موضوع پر سوچنا بلکہ غور کرنا اور اس سے دلچسپی لینا، انسانی فطرت میں داخل ہے، خواہ سماجی احتسابات اس کو کتنا ہی مذموم قرار دے دیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے میں ہر ملک اور ہر قوم کے لوگوں نے اس سے دلچسپی لی —— کہیں چھپ کر اور کہیں کھلم کھلا —— جنسی تعلقات کی اہمیت کے پیش نظر بعض جگہ جنسی تعلیم کی اہمیت کو بھی محسوس کیا گیا۔ چنانچہ بعض وحشی اقوام کے یہاں آج بھی جنسی تعلیم کا رواج ملتا ہے۔ اور ہم حیران رہ جاتے ہیں جب ڈاکٹر میلینوسکی اور مس مارگرٹ میڈ ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ بہت سی وحشی اقوام مذہبی رسومات کے پردے میں جنسی تعلیم دیتی تھیں اور آج بھی دیتی ہیں۔ پلوٹارک لائی کرگس کی سوانح حیات میں ظاہر کیا ہے، کہ نوجوانوں کو شادی کی طرف راغب کرنے اور جنسی حیثیت سے صحت مند بنانے کیلئے رقص کو کس قدر دخل ہے —— وہ بعض ایسی رسومات کا تذکرہ کرتا ہے جس میں عورتیں اور مرد سربازار برہنہ نکلتے تھے۔ اور ان حرکات سے ان میں شادی اور محبت کے جذبات استوار ہو جاتے تھے۔

ان تمام باتوں سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ سماج کے جنسی احتسابات قابل ستائش نہیں —— اور نہ وہ ایسے فطری ہیں کہ بس ان میں ترمیم کی ہی نہیں جا سکتی —— تاریخ بتاتی ہے کہ وہ ہر دور میں بدلا کئے ہیں۔ ایک زمانہ میں جنسی افعال اور جنسی اعضا کی پرستش کی جاتی تھی۔ پھر ایک دور وہ آیا جب عیسائیوں کے شروع زمانے میں اس پر خوب لعن طعن ہوئی۔ اور اس فعل کو مذموم قرار دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنسی فعل اور عورت کا جسم انسان کے لئے لعنت قرار پایا۔ جب سینٹ پال کے منہ سے یہ جملہ نکلتا ہے کہ عورت کے جسم کو چھونا ہی انسان کیلئے اچھا ہے۔ تو ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی لیکن یہ دور بھی ہمیشہ قائم نہ رہ سکا۔ اس کے بعد ایک زمانہ وہ آیا جب عیسائی پادریوں نے عورتوں کے ساتھ افلاطونی انداز —————— میں رہنا شروع کیا۔ جس میں جنسی تعلقات پیدا کرنے کی ممانعت تھی۔ لیکن اسی زمانے میں زیادہ پادری بدچلنی کے الزام میں دھرے گئے۔ اور پھر آخر میں خانقاہوں کا رواج ہوا۔ جس میں راہب عورتیں اور مرد ایک ساتھ رہتے تھے۔ عورت اور مرد کا ایک ساتھ رہنا اور ان میں جنسی تعلقات کا پیدا نہ ہونا ناممکن ہے۔ چنانچہ یہاں بھی یہی ہوا کہ ان لوگوں کی حرکتوں نے کلیسا کو بدنام کیا —— ہاں تو جنسی احتسابات ہی انسان کی بدچلنی کا باعث ہوتے ہیں۔ اگر انسان کھلم کھلا، بالکل فطری انداز میں زندگی بسر کرے تو یہ بات پیدا نہیں ہو سکتی۔ انہیں خیالات کے پیش نظر اکثر ان مروجہ احتسابات کے نظریوں کے خلاف بغاوتیں ہوتی رہیں —— چنانچہ جنس کے معاملے میں کلیسا کے خلاف سب سے پہلا باغی انگریزی شاعر بلیک تھا جس نے اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخر میں کلیسا کے احتسابات کی دل کھول کر مخالفت کی۔ اس نے بتایا کہ جنسی فعل جو دنیا میں سب سے

نزدیک غیر صحت مند اور تو شرمناک فعل ہے ـــــــــــــ اس کو خواہ مخواہ مذہب نے جرم قرار دے دیا ہے۔ اور پھر انیسویں اور بیسویں صدی تک آتے آتے۔ فلسفیوں، سائنسدانوں اور ادیبوں نے جنسی احتسابات کے خلاف ایک اچھا خاصا محاذ قائم کر دیا۔ سکشول ریفارم کانگریس نے اس چیز کو ہوا دی، جس میں دنیا کے بڑے بڑے دماغ شامل تھے۔

جنسیات کے متعلق ان نظریات کا مد وجزر ہمیں ادب اور آرٹ میں بھی ملتا ہے۔ دنیا کے کسی ملک کا کوئی ادب اور آرٹ ایسا نہیں جس میں جنسیات اور اس سے متعلق حالات وکیفیات کا بیان موجود نہ ہو۔ چنانچہ بعضوں کا تو یہ خیال ہے کہ اگر جنسیات کے مختلف نظریوں، اس کی تاریخ، اور اس کے دھارے کے اُتار چڑھاؤ کو جس دور میں بھی دیکھنا ہو، تو اس کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ اس وقت کے ادب اور آرٹ کا مطالعہ و تجزیہ کیا جائے۔ اور یہ صحیح بھی ہے۔ اب مختلف ممالک کے مختلف زمانوں کے ادبیات کو دیکھئے! آپ کو اس میں جنسیات کے متعلق انہیں نظریوں کی تصویریں بے نقاب نظر آئیں گی، جو ان دنوں عام تھے۔ دنیا میں شاید سب سے پہلی ادبی تخلیق وہی ہوئی ہوگی جس میں جنسی تعلقات اور اس کی مختلف کیفیتوں کا تذکرہ ہوگا ـــــــ وحشی اور غیر مہذب انسان پر جنسی فعل اور اس کے کیف نے اس قدر اثر کیا ہوگا، کہ وہ اس کے متعلق بیساختہ بہترین انداز میں کچھ نہ کچھ کہنے کیلئے مجبور ہو گیا ہوگا۔ ایسے گیت کہے گئے ہوں گے جن میں جنسی معاملات اور کیف کا تذکرہ ہوگا ـــــــ یہ تو خیر اس وقت کی بات ہے جس کی بنیادیں صرف قیاس ہی پر قائم ہیں۔ لیکن اس کے بعد جب ہمیں ادبی تاریخ کی کڑیاں ملنے لگتی ہیں، تب بھی ہمیں قدم قدم پر ہر صنف ادب میں اسی بنیادی انسانی جذبے کا اثر کار فرما نظر آتا ہے۔ ادب میں پرانی داستانوں کو دیکھئے، ان سب میں آپ کو عورت کا بیان ضرور ملے گا اس کے مختلف اعضا کا تذکرہ ضرور ہوگا۔ اس کی ہستی جس کیف کا باعث بنتی ہے، اس کی مختلف تصویریں ضرور نظر آئیں گی۔ ہر ملک کی دیومالا میں جو چیز سب سے زیادہ ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کرتی ہے، وہ اسی چیز کا بیان ہے۔ حالانکہ دیومالا میں تقدس کا عنصر سب سے زیادہ موجود رہتا ہے ـــ پرانی تہذیبوں میں ہندوستان، چین، یونان، روم، مصر، بابل وغیرہ خاص طور پر قابل غور ہیں۔ ان مقامات کے رہنے والوں کی نظروں میں جو ان کے شاہکار ہیں اور جو اب کلاسکس کا مرتبہ حاصل کر چکے ہیں، وہ جنسیات کی مختلف کیفیات کے بیان سے خالی نہیں۔ ان سب میں ہم عورت کو دیکھتے ہیں۔ اور اس کی ہستی میں قسمت نے جن سرور و سرخوشی کی دنیاؤں کو سمو دیا ہے ان کا بیان بھی پاتے ہیں۔ کالی داس، دالمیکی، ہومر، لی پو۔ اوتو کے زمانوں سے لیکر گیٹے، شلر، شیکسپیئر اور اس کے بھی صدیوں بعد تک دیکھ جائیے۔ آپ کو ان میں ہر ایک کے یہاں ایسی باتیں ملتی رہیں، جن کے باعث بڑی حد تک ان کی تخلیقوں میں جگہ جگہ عریانی پیدا ہو جاتی ہے۔

اُردو شاعری بھی اس سے مستثنےٰ نہیں ہو سکتی۔ اس میں بھی قریب قریب ہر دور میں اس چیز کی فراوانی رہی ہے۔ غزل جو ساری اردو شاعری کا ایک بہت بڑا سرمایہ ہے، اس کے معنی ہی عورتوں کے متعلق باتیں کرنے کے ہیں۔ چنانچہ ہر دور کی غزلیات میں ایسے اشعار ملتے ہیں جو عریاں ہیں اور جن میں کھل کر شاعروں نے جنسی باتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ عورت اور اس کے ایک ایک عضو کا تذکرہ وہ سب کے سب بغیر کسی جھجک کے کرتے ہیں۔ معاملہ بندی ان میں سے بہتوں کا خاص موضوع ہے۔ عورت اور مرد کے تعلقات میں جو کیفیات ایک دوسرے پر طاری ہوتی ہیں، وہ ان کو بھی مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ جنسی فعل سے قبل جو حالت طاری ہوتی ہے وہ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی شرماتے نہیں ـــــــ غرض جنسیات سے متعلق کونسی کیفیت ہے جس کا بیان ان کے یہاں موجود نہیں ـــــــ آج جس کو عریانی کہا جاتا ہے۔ اس پر کسی زمانے میں مشاعرہ گاہوں کی چھتیں اڑ جاتی تھیں۔ ـــــــ یہ تو خیر فطری باتوں کا بیان ہے لیکن غزل گو شاعروں کے یہاں ایسی غیر فطری باتوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے جہاں جنسی حیثیت سے وہ ابنارمل نظر آتے ہیں، مثلاً ہمارے قدیم شاعروں میں اکثر کے یہاں امرد پرستی کا ذکر موجود ہے۔ وہ لطف لے لے کر لڑکوں کے حسن کا بیان کرتے ہیں اور ان کے فراق میں ان کے اوپر جو بے قراری کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اس کی تصویر بھی کھینچتے ہیں۔ اور بعض تو ایسے بے دھڑک ہیں کہ وہ ان کا نام تک لینے سے باز نہیں رہتے۔ چنانچہ غزل کی شاعری پر ایک زمانے میں یہ زبردست اعتراض تھا۔ جو ایک حد تک آج بھی کیا جاتا ہے کہ اس میں اکثر جگہ

ان حالات کا بیان موجود ہے جو انسان کے لئے قابلِ ستائش نہیں —— لیکن بہرحال قدیم اُردو شاعری میں یہ چیز موجود ہے۔ جواب کسی طرح بھی شائع نہیں جا سکتی ——!

تصوف قدیم شاعری کا ایک اہم موضوع ہے اور فارسی شاعری کے ساتھ ساتھ اُردو شاعری میں بھی اس کا پلہ اچھا خاصا بھاری ہے۔ تصوف کا خیال ہمیں خدا کی طرف لے جاتا ہے۔ دنیاوی معاملات اور خصوصاً جنسی رنگ کا اس میں شائبہ تک نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن قدیم شاعری میں تصوف کے متعلق جو کچھ بھی کہا گیا ہے ——، جہاں کہیں بھی اس کے اسرار و رموز کھولے گئے ہیں، وہاں جنسی رنگ جھلکتا ہے —— ہمارے شاعروں نے تصوف کے تحت حقیقت اور معرفت پر جو کچھ بھی لکھا ہے، وہ سب کا سب مجازی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ اور اگر کوئی ایسا شخص جو ان کی اشاریت سے واقف نہ ہو۔ ان کو دنیاوی اشعار کے علاوہ ایسے اشعار نہیں سمجھ سکتا جن میں دنیاوی معاملات سے الگ ہو کر کوئی بات کہی گئی ہو۔ ان میں بھی معشوق کے حُسن کا تذکرہ ہوتا ہے۔ کہیں اس کے عارض کا بیان ہوتا ہے۔ کہیں اس کے چشم و ابرو کی تعریف ہوتی ہے۔ کہیں اس کے سرو ایسے قد کی تصویر بنائی جاتی ہے۔ کہیں اس کے عشوہ و غمزہ و ادا کا ذکر ہوتا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں سے یہ لوگ مراد اور کچھ لیتے ہیں —— اور بڑے سے بڑا اللہ والا ان پر جھومتا ہے۔ مثال کے طور پر حافظؔ کی شاعری کو دیکھئے جس کو آج متصوفانہ شاعری میں ایک خاص مرتبہ حاصل ہے۔ لیکن اس کے یہاں اکثر جگہ ان کیفیات کا ذکر ملتا ہے، جن کا تمام تر تعلق جنسیات سے ہے۔ بھلا بتائیے جب وہ اس قسم کا شعر کہے ؎

؎ دو دو سالہ و معشوقِ چاردہ سالہ ۔۔۔ ہمیں بس است مرا صحبت صغیر و کبیر

تو کوئی کیا سمجھے۔ آخر اس خیال کو تصوف کا رنگ کیسے دیا جا سکتا ہے؟ —— یہی نہیں بلکہ ایسے بیسیوں اشعار حافظؔ کے دیوان میں ملتے ہیں — ایک حافظؔ ہی پر کیا منحصر ہے۔ اُردو اور فارسی کے قریب قریب ہر صوفی شاعر کا یہی حال ہے۔ ان میں سے اکثر کے اشعار فحشیات کی حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ حالانکہ ان میں تذکرہ کیا جاتا ہے تصوف کے رازہائے سربستہ کا۔ متصوفین کے یہاں اس چیز کا زور ہونے کی وجہ یہ ہے کہ گوشہ نشینی اور تجرد کی زندگی بسر کرنے کے باعث، ان میں سے اکثر جنسی بھوک کے شکار تھے۔ وہ خانقاہوں میں رہنے کے عادی تھے۔ اس لئے ان کی تجرد کی زندگی نے اس فطری جذبے کو دبا دیا۔ جس کے باعث وہ حقیقت کے متعلق بھی اپنے خیالات کو ان پیرایوں میں بیان کرنے کیلئے مجبور ہو گئے —— اور خوب کھل کھیلے۔ اُردو شاعروں میں ولیؔ، سراجؔ، میرؔ، میراثرؔ، میر دردؔ، مظہرؔ جانجاناں، تصوف میں بہت اچھے کہنے والے خیال کئے جاتے ہیں۔ لیکن ان سب کے متصوفانہ اشعار میں (میر دردؔ کو چھوڑ کر) جنسی رنگ کی جھلک موجود ہے۔ لیکن یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ جنسی دباؤ انسان سے عجیب عجیب باتیں کراتا ہے۔ ایک ذرا اُردو شاعری اور تصوف کو چھوڑ کر فرانس کے اس زمانے کو دیکھئے! جب وہاں کی عورتیں حضرت عیسےٰ کے متعلق اس قسم کے گیت گاتی تھیں ؎

Praise to Jesus, Praise his power,
Praise his sweet allurements. !
Praise to Jesus, when His goodness
Reduces me to nakedness:
Praise to Jesus when he say to me.
'My sister, my dove my beautiful one'
Praise to Jesus in all my steps,
Praise to his amorous charms!
Praise to Jesus, when His mouth

Touches mine in a loving kiss!
Praise to Jesus when his gentle Caresses
Overwhelm me with chaste joys!
Praise to Jesus when at my Leisure
He allows me to kiss him.

اگرچہ یہ نظم حضرت عیسٰے سے ایک عقیدت کا اظہار کرتی ہے۔ لیکن اس میں شروع سے آخر تک جنسی رنگ جھلکتا ہے۔ اور یہ نتیجہ ہے اس جنسی بھوک کا جو فرانس کے اندر ایک خاص دور میں رہبانیت نے پیدا کر دی تھی۔ زندگی کی یہ ایک عام حقیقت ہے کہ جو چیز زیادہ سے زیادہ دبائی جاتی ہے، وہ اسی قدر ابھرتی ہے۔ یہی حال جنسی جذبے کا ہے کہ جس قدر بھی اس کو دبانے کی کوشش کی جائے گی وہ ابھرے گا۔ اور دوسرے راستوں سے اپنے آپ کو ظاہر کرے گا ــــ متصوفانہ شاعروں میں جو جنسی رنگ موجود ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ شعراء اخلاقی بندھنوں اور ذہنی جکڑبندیوں کے باعث کھل کر اپنی جنسی کیفیات کا بیان نہ کر سکے ــــ اس لئے ان کی عارفانہ باتیں بھی جنسی رنگ میں رنگ گئیں اور بعض تو فحشیات کی حد تک پہنچ گئیں۔ میں جب میر اثر کی مثنوی "خواب و خیال" کو دیکھتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ کیسے وہ یہ سب کچھ لکھ گئے۔ حالانکہ بڑے اللہ والے صوفی اور حضرت میر درد کے مرید اور شاگرد تھے ــــ لیکن بہرحال وہ بھی انسان تھے۔ ان کی بھی فطری خواہشات تھیں جو دب کر ابھریں اور ان کا اثر خواب و خیال کی صورت میں نمایاں ہوا۔ اور جس سے ان کو ذہنی سکون بھی ملا۔

اس جذبے کا اظہار بھی سماجی ماحول کا پابند ہے۔ اور اس کی مختلف کیفیات کے بیان کو بھی ہمیں سماجی ماحول کے پس منظر ہی میں دیکھنا چاہئے جب زمانہ بدلتا ہے تو یہ خیالات بھی کروٹ لیتے ہیں۔ اور وقت اور حالات کے تقاضوں سے شاعری میں بھی اس کی صورتیں بدلا کرتی ہیں۔ خود انسانی زندگی اپنے سماجی ماحول کی پابند ہوتی ہے، اور انسان اپنی حرکات و سکنات کو سماجی نظریوں سے ہم آہنگ کرنے کیلئے مجبور ہو جاتا ہے۔ شاعری چونکہ سماج اور ماحول کا عکس ہوتی ہے اس لئے اس میں ان مختلف نظریوں کا بے نقاب ہونا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ ہر ملک کے مختلف زمانوں میں جنسی کیفیات کے بیان کے متعلق مختلف نظریے ملتے ہیں۔ اگر ایک زمانے کے شعر و ادب میں ان کیفیات کے بیان کو سماج معیوب نہیں سمجھتا تو دوسرے دور میں اس پر سخت احتساب کرتا ہے۔ ایسے دور میں شاعر ایسی باتوں کے بیان میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، دل کھول کر کہتے ہیں۔ اور چونکہ ان کی آواز وقت کی آواز ہوتی ہے اس لئے وہ کسی کے روکے رک بھی نہیں سکتی۔ دنیا بھر کی شاعری میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ جب سماج رنگین ہوتی ہے۔ اور تعیش کی دیوی ہر خاص و عام پر حکومت کرتی ہے۔ تو اس زمانے کی شاعری میں بھی وہی رنگ جھلکتا ہے۔ عیش پرستی کا عنصر اس میں قدم قدم پر بے نقاب نظر آتا ہے۔ ایسے دور میں شعراء عورت اور شراب کا تذکرہ کرتے ہیں۔ حسن و عشق اور اس کی مختلف کیفیات کا ذکر تو ایسے ماحول میں نہیں ہوتا لیکن ہاں عورت کے جسم کی تعریف اور اس کی ہستی جس کیف کا باعث بنتی ہے، اس کا بیان ضرور ہوتا ہے۔ جس کے باعث اس میں اکثر جگہ عریانی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اس سماج کے افراد اس کو عریاں نہیں سمجھتے۔ کیونکہ وہ شب و روز اسی دنیا میں بسر کرتے ہیں۔ وہ اسی ماحول میں سانس لینے کے عادی ہو چکے ہوتے ہیں۔ ہر ملک کی شاعری میں ایسے دور گذر چکے ہیں اور گذرتے رہتے ہیں۔ لیکن فرانس کی شاعری میں اس کی سب سے زیادہ فراوانی نظر آتی ہے۔ وہاں کے شعراء کھلم کھلا عورت کے ان اعضا کا ذکر کرتے ہیں۔ جن سے جنسی تحریک پیدا ہوتی ہے اور پھر وہ ایسی ایسی باتیں کہتے چلے جاتے ہیں جن کو ہندوستان والے تو شاید سننا بھی برداشت کرنے کیلئے تیار نہ ہوں۔ وہ کہیں اس کے پستانوں اور ان کے ابھار کا ذکر کرتے ہیں۔ تو کہیں اس کو عریاں ہو جانے کا درس دیتے ہیں Theophile-gautur کی ایک نظم ہے ــــ

(Ivory-۱۸۹۸ء) کو The Rose Coloured Gown جس میں اس نے انہیں تمام باتوں کو پیش کیا ہے۔ وہ کہیں ایک عورت کے پستانوں کو Globes سے تعبیر کرتا ہے اور کہیں یہ کہتا ہے کہ اگرچہ اس کی گاؤن اس کے جسم پر بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی ناز یبا ہے کیونکہ حقیقتوں کو چھپائے ہوئے ہے —— اور میری نظروں کو دیکھنے کیلئے بیقرار ہے۔ اس لئے تو اپنے اس لباس کو اتار کر پھینک دے کیونکہ حقیقتوں کے انکشاف میں بلا کی شیرینی اور مٹھاس ہوتی ہے —— ایک گائیژہی پر منحصر نہیں، فرانس کے اکثر شاعروں کا یہی حال ہے۔ اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انہوں نے ایسے سماج کے آغوش میں پرورش پائی، جو حد درجہ رنگین تھا۔ اور جس میں ان کو ایسی باتیں کرتے ہوئے جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی۔
—— اور نہ صرف فرانس بلکہ دوسرے ممالک میں بھی اس طرح کے دور آئے اور اب بھی آتے رہتے ہیں۔

اُردو شاعری میں بھی ایک ایسا دور آیا تھا۔ جب اس نے ایسی باتوں کو بڑے زور شور کے ساتھ اپنے دامن میں جگہ دی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لکھنؤ میں اودھ کی سلطنت اپنے شباب پر تھی۔ اور یہاں کے نوابوں کی رنگین محفلوں اور تعیش پسندیوں کے شہرے دور دور پھیل گئے تھے —— ان دنوں یہاں کی سماج کو سوائے جنسیات اور اس کے متعلقات کے اور کوئی بات سوجھتی ہی نہ تھی —— سوجھتی کیسے —— ؟ زندگی ایک نئے موڑ پر آ چکی تھی۔ اب یہاں رنگینیاں راج کرتی تھیں — اگرچہ صنف نازک کو آزادی اب بھی نصیب نہیں ہوئی تھی لیکن اس کا بدل اس طرح ہو گیا تھا کہ شاہدان بازاری سے محلّے کے محلّے آباد تھے۔ اور ان دنوں کے سماج میں ان کو ایک خاص مرتبہ حاصل تھا۔ شریف سے شریف اور بڑے سے بڑے گھرانے ان سے ربط وضوابط قائم کرنے میں ذرا بھی نہ جھجکتے تھے۔ خود مائیں اپنے نوجوان لڑکوں کیلئے اس کے انتظامات کرتی تھیں۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا —— یعنی ان دنوں کے ادب اور شاعری میں بھی وہی رنگ جھلکنے لگا۔ چنانچہ اس زمانے کے قریب قریب ہر غزل گو شاعر کا معشوق بازاری معشوق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ اس کے اوپری رنگ وروغن کی تعریف زیادہ کرتے ہیں۔ اور اس کے ظاہری حسن اور جوبن کی قصیدہ خوانی میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ لیکن عشق کی داخلی کیفیات جن کا تمام تر تعلق دل سے ہے۔ ان کے یہاں نظر نہیں آتیں۔ اور بعض جگہ تو ان کی یہ جنسی ہیجان پسندی ان سے ایسی ایسی باتیں کہلاتی ہے کہ ہم سُن کر حیران رہ جاتے ہیں۔ اور سوچنے لگتے ہیں کہ کیا یہی اس زمانے کی تہذیب تھی ؟ کیا تہذیب کے علمبردار ایسے ہی ہوتے ہیں —— ؟ اس زمانے کا بڑے سے بڑا شاعر حتیٰ کہ آتش تک اس سے نہیں بچ سکا — اس کی شاعری میں بڑی سنبھلی ہوئی کیفیت ہونے کے باوجود ایک ایسا رنگ ملتا ہے جس کو وہ اس سماجی ماحول میں سانس لینے کے باعث پیش کرنے کیلئے مجبور تھا — جب آتش تک اس سے دامن نہ بچا سکا تو پھر چھوٹے شاعروں کا تو خیر کہنا ہی کیا ؟ — ان کے یہاں یہی عریانی لطافت کے ساتھ ہوتی تو قابل اعتراض نہ تھی —— لیکن وہ تو اس قدر آگے بڑھے ہوئے ہیں کہ ان میں سے اکثر کی شاعری ابتذال کی حد تک پہنچ گئی ہے۔ جب وہ اس طرح کے اشعار کہتے ہیں ؎

اے پری تو نے جو پہنی ہے سنہری انگیا — آج آتی ہے نظر سونے کی چڑیا مجھ کو — ناسخ
بوسہ بازی سے مری ہوتی ہے ایذا ان کو — مُنہ چھپاتے ہیں جو ہوتے ہیں مہاسے پیدا — آتش
دوست کو لیکر بغل میں رات بھر سوتا ہوں میں — رشک ہے دشمن کو میرے طالع بیدار پر — "
وصل کی شب دل کے خوش کرنیکا ساماں کیجئے — خود بھی عریاں ہوجئے انکو بھی عریاں کیجئے — "
اُٹھ گئے ساقین جاناں سے جو شب کو پائنچے — اک دو شاخہ نور کا محفل میں روشن ہو گیا — امانت
ہاتھ میں انگیا کی چڑیا آ گئی — آج ہم طائر کو لائے دام میں — ناسخ
کسی کے محرم آب رواں کی یاد آئی — حباب کے جو برابر کبھی حباب آیا — آتش

تو ان کو پڑھ کر ہماری طبیعت منغض سی ہو جاتی ہے۔ لیکن بہر حال وہ ایک خاص دور اور ایک خاص سماج کی پیداوار ہیں۔ اس لئے ان کو مطعون نہیں

سلتا ۔ البتہ یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ان شاعروں میں کوئی ایسی بڑی ادبی شخصیت کا مالک نہ تھا جو اس دلدل کو پار کر جاتا ۔ لیکن اس میں صرف اس زمانے کی رنگین سماج ہی کو دخل نہ تھا بلکہ اقتصادی اور معاشی حالات بھی اس کے بہت کچھ ذمہ دار تھے ۔ اس زمانے کے شاعر بھی اپنے ماحول سے متاثر ہو رہے تھے ۔ انہیں اگر شعوری طور پر احساس نہ تھا ۔ لیکن غیر شعوری طور پر وہ یہ ضرور جانتے تھے ۔ کہ ان کی سلطنت کی بنیادیں ریت پر قائم ہیں ۔ انہیں معلوم تھا کہ مرہٹے اور انگریز اپنی طاقتیں روز بروز بڑھاتے جا رہے ہیں ۔ وہ تو نبرد آزمائی میں مشغول ہیں ۔ لیکن ان کے یہاں قلعوں کی جگہ راج محلوں نے لے لی ہے ۔ انہیں ان تمام بندھنوں کا احساس بھی تھا جن میں وہ بری طرح جکڑے ہوئے تھے ۔ ان میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ حالات پر قابو پا لیتے ۔ کیونکہ اندرونی حالات اس قدر بد سے بدتر ہو چکے تھے ۔ کہ ان کا علاج کسی طرح بھی ممکن نہ تھا ۔ ذاتی بغض و عناد ، مکاریاں ، جعلسازیاں ، یہ ساری چیزیں سلطنت کے رگ و ریشے میں سرایت کر چکی تھیں ۔ ان حالات نے ان کو زندگی سے فرار اختیار کرنے پر مجبور کیا ۔ چنانچہ ان کی شاعری میں بھی ایک فراری کیفیت ہے ۔ وہ زندگی سے دور بھاگے اور انھوں نے پناہ لی صنفِ نازک کے کیف بہم آغوشی میں ——! وہ کھو گئے شرابِ ناب کی لہروں کے سرور میں ! —— انہوں نے بسیرا لیا رنگینیوں اور رعنائیوں کے جھرمٹ میں ——! جہاں پہنچکر ان کی انتہا پسندی نے ، ان کی شاعری کی حدیں ابتذال سے ملا دیں ۔ اسی لئے آج ان کی شاعری ہمیں بری بھدی اور خراب معلوم ہوتی ہے ۔ لیکن ان دنوں لوگ انہیں شعروں کو پسند کرتے تھے جن کو آج ہم تنہائی میں بھی دہراتے ہوئے شرماتے ہیں ۔ اس زمانے میں معاملہ بندی ، اور جنسی تحریک پیدا کرنے والے اعضا کا تذکرہ اگر شاعری میں نہ ہوتا تو وہ روکھی پھیکی سمجھی جاتی ۔ یہ بھی زمانے کی بلہاری تھی ——!

برخلاف اس کے میرؔ و سوداؔ کے زمانے کی شاعری کو دیکھئے ! —— ان سب کے یہاں بھی جنسیات کا تذکرہ ہے لیکن ایسی عریانی نہیں جو آتشؔ و ناسخؔ اور دوسرے لکھنوی شعراء کے یہاں موجود ہے ۔ میرؔ و سوداؔ اور دلی اسکول کے دوسرے شعراء کے یہاں حسن و عشق کا ایک بلند تصور ملتا ہے ۔ وہ داخلی کیفیات کا بیان زیادہ کرتے ہیں ۔ ان کے یہاں ظاہری حسن اور خارجی کیفیات کا بیان نہیں ، جس کی وجہ سے ایسی زیادہ عریانی بھی پیدا نہیں ہوتی ۔ یہ سب بھی ایک خاص سماج کی پیداوار ہے ۔ میرؔ و سوداؔ نے جس زمانے میں سانس لی ، اس میں صنفِ نازک پر پابندیاں کچھ زیادہ عائد تھیں ۔ وہ مکانوں کے زنانوں میں اس وقت بھی مقید تھیں ۔ شاہدانِ بازاری کی بھی وہ فراوانی نہ تھی جو آگے چل کر لکھنؤ میں ہوئی ۔ اسی وجہ سے ہمیں ان سب کے یہاں جنسی بھوک کا پتہ چلتا ہے ۔ جس میں ایک سلگنے والی کیفیت ہے ۔ آزادی اور بغاوت کا تصور بھی پیدا ہی نہیں ہوا تھا ۔ کہ وہ اپنے ماحول سے بغاوت کر کے کچھ ایسی باتیں کرتے جو اگرچہ عریاں ہوتیں ۔ لیکن ذہنی حیثیت سے ان کو تھوڑا بہت سکون بخش دیتیں ۔ البتہ ان حالات کا ایک نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ امرد پرستی کا ذکر شاعری میں بھی ہونے لگا ۔ اور میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ یہ چیز صرف ایران کی تقلید ہی پر مبنی نہ تھی ۔ بلکہ حالات و واقعات کا تقاضا تھی ۔ اس سماج میں امرد پرستی کا رواج ضرور تھا —— ہر چند آج اس کو کوئی چھپانے کی کوشش کرے ، لیکن جب بھی کوئی ذرا گہری نظر سے دیکھے گا کہ ایسا تھا اور ضرور تھا ۔ چنانچہ اس دور کا شاید ہی کوئی شاعر (میر درد کو چھوڑ کر جن کی میرے دل میں بڑی عزت ہے اور جن کی شاعری کو میں سوائے متصوفانہ شاعری کے اور کسی قسم کی شاعری نہیں سمجھتا ۔) ایسا ہوا ہو جس نے امرد پرستی کا تذکرہ اپنی شاعری میں نہ کیا ہو —— اور چونکہ ان کے دیوانوں میں کھلم کھلا ایسے اشعار ملتے ہیں اس لئے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اس پر احتساب بھی اتنا سخت نہ تھا ۔ مشاعروں میں کھلم کھلا ان موضوعات پر اشعار پڑھے جاتے تھے ۔ اور سننے والوں کو ان پر وجد آ جاتا تھا —— ان کے یہاں فراری کیفیت بھی نظر نہیں آتی ۔ کیونکہ باوجود سپر ڈال دینے کے وہ ابھی میدان کارزار میں مصروفِ جنگ تھے ۔ ان کے پیچھے شاندار روایات تھیں جو انہیں آگے کی طرف دھکیل رہی تھیں ۔ وہ اگرچہ شکست کھا چکے تھے ۔ اور ان کی حکومت صحیح معنی میں لال قلعے ہی تک محدود تھی ۔ لیکن اس کے باوجود وہ سمجھتے تھے کہ اتنی بڑی اور شاندار حکومت کا تختہ آسانی سے نہیں اُلٹ سکتا ۔ اس لئے ان کی شاعری میں ایک حد تک سینہ سپری کا سا انداز بھی نظر آتا ہے ۔ جن کی تہ میں ایسی کراہوں کی آوازیں موجود ہیں جو زخموں سے چور ہو جانے کے بعد دکھے ہوئے دلوں سے نکلتی ہیں ۔ یہ سب بھی وقت اور ماحول کے لادے ہوئے

رکھتے تھے۔

یہ تو خیر اس زمانے کے ان شاعروں کا ذکر تھا جو فدا اونچے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن اسی زمانے میں آگرے کی سرزمین پر ہمیں ایک ایسا شاعر ملتا ہے جو ان سب سے الگ ہے۔ اس کی شاعری میں ہمیں بالکل ایک نیا رنگ نظر آتا ہے۔ وہ عوام کا ترجمان ہے۔ اس کی شاعری میں زندگی ہے اس میں حقیقتوں کا بیان ہے۔ اس میں تکلف اور تصنع کو مطلق دخل نہیں۔ وہ ایک ایسا انسان تھا جو ہر خاص و عام سے ملتا تھا۔ اس لئے اس کی شاعری میں بھی انہیں حالات و کیفیات کے مرقعے موجود ہیں۔ اور اس نے ان کی زندگی کے صرف کسی ایک پہلو پر قلم نہیں اٹھایا ہے۔ بلکہ سارے مسائل کو اپنی شاعری میں سمو دیا ہے۔ چنانچہ اس کے یہاں عورتوں کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ ان کے جسم کے ایک ایک عضو اور عشوۂ و ناز و ادا کی تصویریں بھی موجود ہیں۔ وہ جنسی جذبے اور اس کے مختلف حالات و کیفیات کا تذکرہ بھی کرتا ہے —— اور ان سب باتوں کو پیش کرتے وقت وہ کہیں بھی حقیقت نگاری کو ہاتھ سے نہیں دیتا۔ اس نے عشق کیا ہے۔ لیکن ایسا عشق نہیں جس میں صرف شبِ ہجر کی تلخیاں ہی سہنی پڑتی ہیں۔ اور مجنوں بن کر صحراؤں اور بیابانوں کی خاک چھاننی جس کی پہلی منزل ہے۔ اس کے عشق میں سب سے زیادہ جو چیز نمایاں نظر آتی ہے، وہ اس کا جنسی پہلو ہے۔ اس کا معشوق بازاری معشوق ہے، جس کے یہاں جا کر وہ جب بھی چاہے، اپنی پیاس بجھا سکتا ہے۔ وہ اندھیری رات میں فرقت کے جانسوز لمحے نہیں کاٹتا۔ بلکہ راستے میں جاتے ہوئے اس کا معشوق مل جاتا ہے اور اس کی دلی مراد بر آتی ہے۔ ان تمام چیزوں کے بیان میں بھی عریانی کو دخل ہے لیکن چونکہ حقیقتوں کا بیان ہے، اس لئے آج ہم اس کی قدر کرتے ہیں۔ حالانکہ اس کے زمانے میں اس کی وہ قدر نہ ہو سکی۔ جو اس کے دوسرے ہمعصروں کی ہوئی۔ شیفتہ تک نے اس کو شاعر نہیں مانا —— بات یہ تھی کہ اس نے اپنی دنیا اونچے طبقے سے علیحدہ بنائی تھی۔ اور وہ ایک عامی انسان کی طرح زندگی بسر کرتا تھا۔ اسی وجہ سے عامی انسانوں کی ذہنی کیفیات۔ اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تصویریں، اس کی شاعری میں بھی ملتی ہیں۔ وہ جنسی جذبات کا تذکرہ جس انداز سے کرتا ہے، وہ بھی ایک حد تک عامی ہے، لیکن اس میں حقیقت نگاری کا عنصر موجود ہے۔ اس کی تصویریں جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی معلوم ہوتی ہیں علاوہ وہ پیداوار ہیں اس سیاسی، سماجی اور معاشی ماحول کی جس میں اس نے سانس لی۔ یہ شاعر تھا نظیر اکبر آبادی ——!

پھر غدر کے زمانے کو دیکھئے! جب آزاد و حالی ایک انقلاب کا پیغام دے رہے تھے۔ جب سارا ہندوستان اپنا چولا بدل دینے کا متمنی تھا۔ ان کی تحریکوں میں ریفارم کی کوشش سب سے زیادہ نظر آتی ہے۔ وہ ہندوستان کے گیسوؤں کو سنوارنے کے خواہشمند تھے جو حقیقتاً ان دنوں منت پذیرِ شانہ تھے۔ ادب ہی پر کیا منحصر ہے، ان دنوں تو زندگی کے ہر شعبے میں ریفارم کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی تھی۔ سیاسی اعتبار سے بھی ہندوستان اب ریفارم چاہتا تھا۔ کیونکہ میدان کارزار میں تو اس نے سپر ڈال دی تھی۔ اور اب اس کے پاس سوائے اس کے اور کوئی چارۂ کار نہیں رہا تھا کہ وہ بیرونی حاکموں کے زیر سایہ اپنی حالت کو زیادہ سے زیادہ سدھارنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ سرسید احمد خاں کی سیاسی تحریکیں وجود میں آئیں —— ادب میں بھی یہی ہوا کہ اس کے اندر جو خرابیاں ایک انتشاری ماحول نے پیدا کر دی تھی، ان کو زیادہ سے زیادہ دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایسی حالت میں کوئی ایسی بات جنسیات سے متعلق پیش نہیں کی جا سکتی تھی۔ جس میں عریانی کو دخل ہو اور جو عوام میں کوئی فراری کیفیت پیدا کرے۔ اسی وجہ سے حالی کے یہاں جو اس زمانے کا نمائندہ شاعر ہے، حسن و عشق کا بیان تو ملتا ہے۔ لیکن لطیف انداز میں —— ! —— ایک سنبھلی ہوئی کیفیت کے ساتھ، جس میں سادگی کو سب سے زیادہ دخل ہے۔ چنانچہ حالی نے ان چیزوں کو سراہا نہیں، جو اکثر شعرا کے اب تک رواں تھیں۔ یعنی اس نے عریاں شاعری کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا۔ اس کے یہاں مولوی اور شاعر کی شخصیتیں ایک جگہ ملتی ہیں۔ اور وہ ہمارے ادب میں ایک بڑی قابلِ قدر ہستی ہیں۔ لیکن اس گروپ کو چھوڑ کر ذرا دیکھئے کہ قریب قریب اسی زمانے میں داغ اور امیر مینائی بھی اپنی اپنی محفلیں جمائے ہوئے ہیں۔ اور وہ اپنی شاعری میں جن خیالات کو سمو رہے ہیں۔ وہ حالی سے بالکل مختلف ہیں۔ داغ کے یہاں جنسی کیفیات کا تذکرہ بہت زیادہ ہے اور اس کی تقلید میں امیر مینائی بھی اسی رنگ میں رنگ گئے ہیں۔ داغ تو خیر اسی دنیا کا انسان تھا۔ اور اس نے ان تمام حقیقتوں کا [illegible]

کے دم کے ساتھ وابستہ ہیں۔ لیکن امیر مینائی نے باوجود ایک اللہ والے، صوفی ہونے کے ایسی باتیں کہیں جو بعض جگہ داغ کو بھی مات کر دیتی ہیں۔ —— آخر کیا وجہ ہے کہ ایک ہی دور میں ہمیں یہ دو رنگی نظر آتی ہے؟ —— بات یہ ہے کہ ان دونوں حلقوں کے شاعروں نے اپنی اپنی افتاد طبع کے مطابق اپنے سماجی ماحول سے اثر قبول کیا۔ ایک کا شعور چونکہ زیادہ بیدار تھا۔ اس میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں زیادہ تھیں واسطے اس نے زندگی سے فرار اختیار نہیں کیا۔ دوسرے نے دماغ کے بجائے دل سے زیادہ کام لیا۔ چنانچہ زندگی کی حقیقتوں سے بھاگ کر وہ رومان کی دنیا میں بسیرا لینے لگے۔ زمانہ جس انتشار سے ہم آغوش تھا۔ انہوں نے اس کو فراموش کر دینا چاہا! —— رنگینیوں اور رعنائیوں کے بیان میں کھو کر! —— یہ ساری کیفیت بھی سماجی اور معاشی ماحول کا تقاضا تھی۔

اس کے بعد جنگ عظیم اور اس کے آس پاس کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ جب ہندوستان میں مغربی تعلیم کا رواج اچھی طرح ہو گیا اور یہاں کے لوگوں نے زندگی کے ہر شعبے میں مغرب کا اثر قبول کرنا شروع کیا۔ ادب بھی اس سے بچ نہ سکا۔ چنانچہ جنگ عظیم کے بعد کی اردو شاعری مغربی شاعری سے بہت زیادہ متاثر نظر آتی ہے۔ لیکن اس زمانے میں اس رومان کا رنگ غالب ہے جو شیلے، کیٹس اور بائرن کا حصہ ہے۔ اقبال کو چھوڑ کر جس کی شاعری سوائے تفکر کے اور کچھ نہیں، اس زمانے کے سارے شاعر رومان کی رنگین شاہراہوں پر چلتے نظر آتے ہیں۔ اور جوش ان سب میں آگے ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں وہ کہیں بہاران کے متعلق نظم لکھتا ہے، کہیں "جنگل کی شہزادی" کی تصویر کھینچتا ہے۔ اور کہیں "مہترانی" یا "جامن والیاں" کا تذکرہ کرتا ہے۔ اور اگرچہ ان سب میں بھی رومانی عنصر غالب ہے۔ لیکن حقیقت کا بھی فقدان نہیں۔ وہ جامن والیوں کے حسن کی تعریف ہی نہیں کرتا۔ بلکہ آخر میں ایک حقیقت کا اظہار بھی کر دیتا ہے۔ اور وہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے باعث ان فصلوں میں اکثر اس کی رسوائی ہو چکی ہے ؎

جوش یہ کافر مناظر ہوش ہی رکھتے نہیں　　آہ ان فصلوں میں اکثر اپنی رسوائی ہوئی　　(جامن والیاں)

یہ بھی زندگی کی ایک عام حقیقت ہے۔ اور جنس کا ایک پہلو جس کے بیان کو گناہ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اس قسم کے واقعات کا ظہور پذیر ہونا کوئی ایسی بات نہیں جس پر تعجب کیا جائے۔ نوجوانوں کی دنیا میں ایسی باتیں آئے دن ہوتی رہتی ہیں۔ پھر اگر لطیف انداز میں ان کا بیان کر دیا جائے تو ایسی کونسی بری بات ہے —— لیکن اس قسم کی آوازیں اس دور میں دبی دبی اور گھٹی گھٹی سی آوازیں معلوم ہوتی ہیں۔ ابھی ان کے بیان میں وہ تندی اور تلخی نہیں آئی تھی۔ جو آگے چل کر پیدا ہو گئی —— جوش کے علاوہ جو شاعر اس راہ پر چلے، ان سب میں اگرچہ ایک انفرادیت ہے لیکن وہ بے باکی کا پہلو نہیں۔ جو جوش کے یہاں ہمیں جگہ جگہ ملتا ہے —— وہ سب عورت کا تذکرہ کرتے ہیں۔ لیکن روایتی انداز میں —— ! اگر ان کے انداز بیان اور طرز ادا کو چھوڑ کر دیکھا جائے۔ تو جہاں تک حسن و عشق کی کیفیات کے بیان کا تعلق ہے، وہ غزل میں سموئے ہوئے خیالات سے آگے نظر نہیں آتے۔ ان میں سے زیادہ تر عورت کے حسن کا بیان کرتے ہیں، جس میں کہیں کہیں جنسی پہلو ضرور پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن کسی خاص حقیقت کو وہ پیش نہیں کرتے۔ جوش نے یقیناً اس سلسلے میں بڑی ہمت سے کام لیا۔ اور آئندہ چلنے والوں کو اشارات سے دکھا دیا جس پر چل کر وہ دور —— بہت دور نکل گئے۔ حتیٰ کہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ لیکن بعض لوگوں کی آنکھوں میں کھٹکتے رہے۔

اب اردو شاعری کا بالکل ایک نیا دور شروع ہوا جس میں وہ حقیقت نگاری سے زیادہ قریب آ گئی۔ عورت کے متعلق صرف رومانی باتوں کا دور اب ختم ہو گیا۔ اب وہ ایک نئے موڑ پر آ گئی۔ جہاں جنسیات، اس کی مختلف کیفیات کا بیان، عورت کے جسم سے پیدا شدہ لذت کا تذکرہ، اب نوجوان شاعروں نے کھلم کھلا شروع کر دیا۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ یہ موضوع انسانی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس کے اثرات جسم اور ذہن، دونوں پر بیشمار ہیں۔ تو پھر اس کو پیش کرنے میں جھجک کیا معنی —— ؟ —— اس منزل میں جو شاعری ہوئی اور ہو رہی ہے، اس کو عریاں کہا جاتا ہے۔ لیکن صرف عورت کے جسم سے متعلق کچھ باتوں کا تذکرہ ہی کیا کسی فن پارے کو عریاں بنا سکتا ہے —— ؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ ایک زمانہ تھا جب ذہن پابہ زنجیر تھا۔ وہ انسان کے گلے کا ہار تھی۔ وہ پتھروں، درختوں، چاند تاروں، سورج اور پہاڑوں کے سامنے جھکتا

تھا۔ اور ان سب کو دیوتا مانتا تھا۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ سارے خیالات بدلتے گئے۔ اس کے اس طرح کے قائم کئے ہوئے خیالات اوہام معلوم ہونے لگے۔ پھر زمانہ اس کو رفتہ رفتہ زیادہ سائنٹیفک بناتا گیا۔ عورت کے جسم اور جنیات کے تذکرے کا بھی یہی حال ہے۔ کہ بعض زمانوں میں لوگوں نے اس کے بیان کو اچھا نہیں سمجھا۔ لیکن دنیا ہمیشہ تو ایک نہج پر نہیں چل سکتی۔ زندگی کی قدریں ہمیشہ بدلا کرتی ہیں۔ اس لئے جنیات کا تذکرہ اور اس کی فطری کیفیات کا بیان اب وقت کا تقاضا ہے۔ کیونکہ دنیا بدل چکی ہے۔ اب ہر بات کو سائنٹیفک طریقے پر سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اور جو ایسا نہیں کرتا۔ اس کو اس دنیا میں رہنے کا حق حاصل نہیں۔

جنیات کے متعلق غور کرنے کے لئے بیسویں صدی کا زمانہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس زمانے میں سارے یورپ میں اس مسئلے نے بڑی اہمیت اختیار کر لی۔ یورپ کے مختلف سائنسدانوں، فلسفیوں، طبیبوں اور ادیبوں نے اس پر غور کرنا شروع کیا۔ عورتیں تک اس کام میں کسی سے پیچھے نہیں رہیں۔ کلیسا تک نے اس کی اہمیت کو محسوس کیا۔ اور ان سب کے ہاتھوں جنیات کے اسرار و رموز کھلم کھلا بے نقاب ہونے لگے۔ ان سب میں ہیولاک ایلس ایک بہت بڑے مرتبے کا مالک ہے جس کی کتاب "مطالعہ نفسیات جنسی" نے شائع ہو کر سارے یورپ میں تہلکہ ڈال دیا۔ اور جس کی پہلی جلد کو ہندوستان میں ممنوع قرار دیا گیا۔ لیکن امریکہ نے اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ بلکہ اس کا خیر مقدم کیا ـــ ہیولاک ایلس نے جنیات کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی۔ جنسی مظاہرات، جو مختلف مذاہب و اقوام میں موجود تھے۔ ان کو بے نقاب کیا۔ اور نوجوانوں کو اس مسئلے کی گتھیوں کو سلجھانے کی طرف راغب کیا ـــ وہ لکھتا ہے کہ جنسی جذبہ ایک ایسی آگ کا شعلہ ہے جس کو کوئی بجھا نہیں سکتا۔ اور پھر اس کا بھی تذکرہ کرتا ہے کہ ابھی زیادہ دن نہیں گزرے جب عشق و محبت کو . . . . ایک فن کی حیثیت سے بیان کرتے ہوئے ہر شخص کے چہرے پر شرم و حیا کے رنگ دوڑنے لگتے تھے۔ لیکن اب ہمیں اس کو ایک مقدس فریضہ سمجھنا چاہئے۔ اب یہ چیز شاعروں ہی تک محدود نہ رہنی چاہئے بلکہ ہر شخص کیلئے ضروری ہے۔ کہ اس پر غور کرے۔ کیونکہ اس میں زندگی کے خوشگوار یا ناخوشگوار ہونے کا راز مضمر ہے۔ ایلس کے علاوہ جیمس ہنٹن، گیڈیز اور ٹامسن وغیرہ نے بھی ان خیالات کی اشاعت میں حصہ لیا۔ جرمنی اور فرانس میں آگسٹ بلاخ، کرافٹ ایبنگ اور فوریل وغیرہ پیدا ہوئے جنہوں نے جنسی مسائل پر کھل کر بحث کی۔ ان سب میں بڑا اور نامور ماہر جنیات میگنس ہرشفیلڈ تھا۔ جس نے جرمنی میں سب سے پہلے جنیات کے مطالعے کا ایک شعبہ قائم کیا۔ ہٹلر نے اس محکمے کو بند کر دیا اور ہرشفیلڈ بیچارے کو جرمنی چھوڑنا پڑا۔ اس نے لندن کی سیکشول ریفارم کانگریس میں جو خطبۂ صدارت پڑھا تھا۔ اس میں اس چیز کو بخوبی واضح کیا تھا۔ کہ جنیات کے معاملے میں شرم اور خاموشی اچھی باتیں نہیں۔ وہ کہتا ہے" اگلے زمانے میں جہالت کو معصومیت سمجھا جاتا تھا اور جنسی معاملات میں خاموشی ہی بہتر خیال کی جاتی تھی۔ لیکن اس وقت سے اب تک بہت سی تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ چنانچہ آج ہمیں اس کا پورا احساس ہے۔ کہ جنیات کے معاملے میں خاموشی معصومیت نہیں بلکہ جرم ہے۔ اور یہ ہمارا مقدس فرض ہے کہ ہم اس خاموشی کو جلد سے جلد ختم کریں۔ انہیں کے ساتھ ساتھ فرائڈ اور ایڈلر نے بھی اپنے نظریات کی نشر و اشاعت شروع کر دی۔ اور جن کے ساتھ جنیات کے معاملے میں انقلاب کا ایک ایسا سیلاب آیا جس نے ساری دنیا کا نقشہ بدل دیا۔ فلسفیوں نے بھی اس پر غور کیا اور اس سلسلے میں ونینگر اور کیسرلنگ اور کاؤسینلی وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں ـــ ادیب بھی ان خیالات سے بچ نہ سکے۔ ان میں لارنس اور جیمس جوائس خاص طور پر مشہور ہیں۔ لارنس ان سب میں سب سے زیادہ آگے ہے۔ اور اس کے سارے خیالات اس کے خطوط میں بے نقاب ہیں لیکن اس کے Phant Asia of the unconsious theRainbow اور Lady Chatterly Slover بھی اس لحاظ سے قابل غور ہیں ـــ اور اس کتاب کے دیباچے میں وہ لکھتا ہے" میں چاہتا ہوں کہ جنیات کے متعلق ہر مرد اور عورت پوری طرح ایمانداری اور صفائی کے ساتھ غور کرے۔ اگر ہم جنسی حیثیت سے وہ بات نہیں کر سکتے جو ہماری تسکین کا باعث ہے تو کم از کم جنسی طور پر سوچ تو سکتے ہیں۔ نوجوان لڑکیوں، اور دوشیزگی کی یہ ساری باتیں اس گندگی طرح ہیں، جس پر کچھ لکھا گیا نہ ہو جو سب کی سب حماقت آمیز ہیں۔ ایک نوجوان لڑکی اور ایک نوجوان لڑکا ایک گتھی ہے۔ جنسی جذبات اور خیالات کی ـــ ! ـــ برسوں کے بعد صحیح خیال کرائی

اور جنس کے معاملے میں نبرد آزمائی انہیں وہاں لے جائے گی جہاں ہم جانا چاہتے ہیں ـــــ یعنی صحت و عفت کے صحیح نظریوں تک۔ جہاں جائز جنسی خیالات اور جنسی افعال ہم آہنگ ہو جائیں گے۔ اور ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں گے ـــــ" لارنس کے علاوہ ہیولاک ایلس۔ ایچ۔ جی ویلز۔ برٹرینڈ رسل اور سی۔ سی پرینر، وغیرہ نے اسی طرح کے خیالات کا پرچار کیا۔ فرانس میں جولی رومین کا نام اس سلسلے میں خاص طور پر مشہور ہے۔ مختصر یہ کہ ساری دنیا کے ادبیات میں ان خیالات کا سیلاب آیا جو پرانے خیالات اور جنسیات سے متعلق صدیوں کی پرورد شرم و حیا کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے گیا۔ اب لوگوں نے کھلم کھلا اس پر سوچنا اور غور کرنا شروع کیا۔ ادب کی ہر صنف میں اب بغیر کسی جھجک کے جنسی فعل اور اس کے مختلف حالات و کیفیات کا بیان ہونے لگا۔ ظاہر ہے کہ یہ بغاوت قدامت پسند لوگوں سے دیکھی نہیں جا سکتی تھی۔ اسلئے اعتراضات کی بھرمار شروع ہو گئی۔ اور جنسیات پر لکھنے والے بری طرح ملعون و مطعون قرار پائے۔

اردو کے جدید شعر و ادب کو بھی اسی پس منظر میں دیکھنا چاہئے۔ کیونکہ وہ بھی بہرحال بیسویں صدی کی پیداوار ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ بیسویں صدی کے شروع کے اردو شاعر اس معاملے میں اتنا آگے بڑھے ہوئے نہیں تھے۔ وہ اپنی کچھ اور الجھنوں میں گرفتار تھے۔ اس لئے وہ اس طرف زیادہ توجہ نہ کر سکے لیکن ۱۹۳۰ء کے بعد جو شاعر آئے، ان میں زیادہ پڑھے لکھے اور سمجھدار تھے۔ انہوں نے دنیا کے ادبیات، سیاسیات اور معاشیات وغیرہ کے تمام شعبوں میں چلتی ہوئی ساری تحریکوں کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ اس لئے ان پر ان تمام تحریکوں نے اپنا پورا اثر کیا ـــــ اس میں اگر تقلید کو بھی دخل ہو تو ایسی قابل اعتراض بات نہیں۔ ادب کو چھوڑ کر زندگی کے دوسرے شعبوں کو دیکھئے! ہندوستان نے کئی چیزیں مغرب سے لی ہیں۔ پھر ادب میں اگر یہ خیالات لائے جاتے ہیں تو کونسا حرج ہے؟ اور پھر جب یہ خیالات و نظریات سماج کے ہر فرد کیلئے مفید و کارآمد ہیں ـــــ!

ایک طرف تو خیر یہ مغرب کا اثر تھا لیکن دوسری طرف خود ہندوستان کے حالات ان خیالات کو لانے میں ممد و معاون ثابت ہوئے۔ ہندوستان میں آزادی کے خیالات غدر کے بعد ہی سے شروع ہو گئے تھے۔ لیکن جنگِ عظیم کے بعد اور خصوصاً سن ۱۹۳۰ء میں راوی کے کنارے جب کانگریس نے مکمل آزادی کا ریزولیوشن پاس کر دیا تو ان میں اور بھی تیزی آگئی۔ چنانچہ آزادی کے خیالات نہ صرف سیاسی لحاظ سے پھیلے بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں انہوں نے اپنا رنگ بھر دیا۔ ادیب اور شاعر بھی ان سے نہ بچ سکے۔ اور انہوں نے زندگی کے تمام مسائل پر آزادی کے ساتھ غور کرنا اور اپنی تخلیقوں میں سمونا شروع کیا ـــــ اور چونکہ انہوں نے زندگی کو بہت ہی قریب سے دیکھا اس لئے ان کی پیش کی ہوئی چیزوں میں روحانیت کی جگہ خالص حقیقت نگاری نے لے لی۔ چنانچہ انہوں نے کھلم کھلا ان تمام باتوں کا تذکرہ کیا جس سے آج تک ادیب اور شاعر اپنا دامن بچاتے رہتے تھے۔ جنسیات کے متعلق اب جن مسائل کا تذکرہ ہوا، ان میں بھی آزادی کا رنگ تھا۔ تلخی تھی ـــــ ان تمام بندھنوں کو توڑ دینے والی ایک جنبش کا سا انداز تھا جو آج تک ہندوستانی سماج کے ہر فرد کو بری طرح جکڑے ہوئے تھے۔ ان کے نزدیک اب زندگی میں ہر بات کو حقیقت کی روشنی میں دیکھنے کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان کی باتوں میں کوئی راز دارانہ کیفیت نظر نہیں آتی۔ ہمیں ان میں جھجک کی بجائے مردانگی کا احساس ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انہیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ ہر چیز کی پردہ پوشی اور چھپانے کا طریقہ جاگیردارانہ اور سامنتی دور کی یادگار ہے اس لئے جہاں تک بھی ہو سکے اس سے احتراز کیا جائے۔ سامنتی دور میں شاعر جس طرح چاہتے تھے۔ اپنے خیالات کو مختلف معنی پہنا دیتے تھے۔ وہ کہتے کچھ تھے اور اس کا مطلب کچھ اور لیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر متصوفانہ شاعری ہی کو دیکھئے کہ شاعر ذکر تو کرتے تھے اس میں ان کیفیات کا جو تمام تر جنسیات سے تعلق رکھتی تھیں، لیکن ان کو روحانیت کے معنی پہنا دیئے جاتے تھے۔ نئے شاعروں نے اس دو رنگی کو اچھا نہیں سمجھا۔ یہ تو خود اپنے آپ کو ایک دھوکا دینے والی کیفیت، اور ایک مستقل فریب اور جھوٹ کی بین مثال! ـــــ نئے شاعر اللہ والے نہیں۔ انہیں احساس ہے اور یقین بھی کہ وہ اللہ والے نہیں بن سکتے۔ کیونکہ انہیں بہرحال اسی دنیا، اس کی الجھنوں اور پریشانیوں کے درمیان زندگی بسر کرنی ہے۔ اس لئے ان کو روحانی باتوں کا خیال نہیں آ سکتا۔ وہ تو اسی دنیا کے انسان ہیں۔ اس لئے اسی دنیا کے انسانوں کے مسائل اور ان کی متعلقہ کیفیات کو صداقت و دیانت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

نئے شاعروں کے ان پیش کئے ہوئے خیالات میں تلخی اور قدرے زیادتی ضرور ہے لیکن یہ ردعمل ہے جاگیردارانہ اور سامنتی دور کی ان رسومات کا جن کو نئے شاعروں نے اچھا نہیں سمجھا۔ اور جن کو انہوں نے ختم کرنے کا تہیّہ کر لیا۔ چنانچہ جنسیات سے متعلق مختلف کیفیات جن کو آج تک مذموم و معیوب سمجھا جاتا تھا اب بیدھڑک بیان کی جانے لگیں۔

جدید اُردو شاعری میں جنسیات کی مختلف کیفیات کے بیان سے جو عریانی پیدا ہوتی ہے، اس کو ہمیں ہر شاعر کے ذہنی پس منظر میں دیکھنا چاہئے ورنہ اس کا سمجھ میں آنا مشکل ہے۔ ہمارا جدیدیت عراب بہت کافی سمجھدار ہو چکا ہے۔ اس کے اوپر اب مختلف علوم کے دروازے کُھل چکے ہیں۔ اور اس چیز نے اس کی جذباتیت کو ختم کر کے اس کے محسوسات کو عقلیت سے ہم آغوش کر دیا ہے۔ وہ اب ہر چیز کو حقیقت کی روشنی میں دیکھنے کا عادی ہے۔ —— وہ انسان ہے اور نارمل انسان —— ! اس لئے وہ ایسی حرکتیں بھی کرنی نہیں چاہتا۔ جو مافوق الفطرت انسانوں ہی سے سرزد ہو سکتی ہیں۔ مثلاً ان کا عشق اب ایک انسان کا عشق ہوتا ہے —— ایک ایسے انسان کا عشق جو انسانوں کے درمیان، زندگی کی الجھنوں اور پیچیدگیوں کے سائے میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اور جس کے یہاں اس عشق کی تشکیل میں جنسی عنصر کا غلبہ سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اب وہ افلاطونی عشق کے خیالی نظریئے کا قائل نہیں۔ بلکہ اب اس کے عشق میں صنفِ نازک کے جسم سے پیدا شدہ جنسی لذّت کو دخل ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جسم و روح میں آہنگ ہے وہ دونوں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اس لئے دُنیا میں ایسے روحانی عشق کا وجود نہیں۔ جس میں جسمانی لذت کو دخل نہ ہو۔ اور جو کوئی بھی اس کے خلاف سوچتا ہے، وہ ایک موہوم لذت کا شکار ہے۔ اس کی آنکھوں میں حسرتِ اظہارِ شباب کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس کا اظہار نہیں کر سکتا۔ راشدؔ انہیں خیالات کو سامنے رکھ کر "حزنِ انسان" میں افلاطونی عشق پر طنز کرتا ہے ؎

جسم اور روح میں آہنگ نہیں
لذتِ اندوزِ دلآویزیٔ موہوم ہے تو
خستۂ کشمکشِ فکر و عمل!
تجھ کو ہے حسرتِ اظہارِ شباب
اور اظہار سے معذور بھی ہے،
جسم نیکی کے خیالات سے مفرور بھی ہے
اس قدر سادہ و معصوم ہے تو
پھر بھی نیکی ہی کئے جاتی ہے۔
کہ دل و جسم کے آہنگ سے محروم ہے تو!

اس کے خیال میں روح کے عظمت سے ہم آغوش ہونے کا ذریعہ جسم ہی ہے، جو ایک "منبعِ کیف و سرور" ہے۔ لیکن افلاطونی عشق پر ایمان رکھنے والا اس حقیقت سے واقف نہیں۔ اس کو کیا پتہ کہ زمستان کی حسین رات کے ہنگام کا طلسم کیا ہوتا ہے —— ؟ اس کے لئے عشق ایک نغزۂ خام ہے، —— ایک بے معنی سی چیز ہے۔ کیونکہ وہ دل و جسم کے آہنگ سے محروم ہے ؎

جسم ہے روح کی عظمت کیلئے زینۂ نور
منبعِ کیف و سرور
نارسا آج بھی ہے شوقِ پرستارِ جمال
آہ! انسان کہ ہے جادہ کشِ راہِ طویل

(روحِ یوناں پہ سلام)
اک زمستاں کی حسیں رات کا ہنگام تپاک
اس کی لذات سے آگاہ ہے کون؟ —
عشق ہے تیرے لئے نغمۂ خام
کہ دل و جسم کے آہنگ سے محروم ہے تو!

اور پھر وہ یہ کہتا ہے کہ شب ہائے زمستاں ابھی بیکار نہیں — اور نہ ایامِ بہار بے سود ہیں۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ تو جسم و روح کے آہنگ سے محروم ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ انسان ابھی تک وہموں کا شکار ہے۔ وہ حسن کو اب تک دھوکا دے رہا ہے۔ وہ آج بھی اس کو ذوقِ تقدیس پر مجبور کر رہا ہے۔ لیکن یہ حالات اس کے اندر رجائی کیفیت پیدا کر رہے ہیں۔ اس کو مستقبل ایک دوسرا رنگ بدلتا نظر آ رہا ہے۔ وہ مزامیر کے تار ٹوٹتے ہوئے دیکھ رہا ہے ؎

جسم اور روح کے آہنگ سے محروم ہے تو!
ورنہ شب ہائے زمستاں ابھی بیکار نہیں
اور نہ بے سود ہیں ایامِ بہار!
آہ انساں کہ ہے وہموں کا پرستار ابھی
حسن بے چارے کو دھوکا سا دیئے جاتا ہے
ذوقِ تقدیس پہ مجبور کئے جاتا ہے
ٹوٹ جائیں گے کسی روز مزامیر کے تار
مسکرا دے کہ ہے تابندہ ابھی تیرا شباب
ہے یہی حضرتِ یزداں کے تمسخر کا جواب!

ظاہر ہے کہ ان خیالات کو سامنے رکھ کر جو شاعری ہوگی اس میں قدامت سے انحراف ہوگا۔ ان کے خیالی نظریوں سے مخالفت ہوگی۔ ان میں پیش کئے ہوئے خیالات کو روحانیت اور تقدس سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اس میں جنسی باتوں کا بیان جگہ جگہ ملے گا۔ اس میں ایک انسان —— اور نارمل انسان کے جذبات و احساسات کی تصویر نظر آئے گی۔

چنانچہ نئی شاعری ہمیں اسی دنیا میں سانس لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس میں جس عشق و محبت کا تذکرہ ہے، وہ انسانوں کا عشق ہے —— فرشتوں کا نہیں! اس میں جن خواہشات کو پیش کیا جاتا ہے، وہ بھی انسانی ہیں ملکوتی نہیں۔ نیا شاعر خیالی دنیا میں رہنا نہیں جانتا۔ وہ چلتے پھرتے، ہنستے بولتے، حسین لڑکیوں کے حسن سے متاثر ہوتے اور ان سے ہم آغوشی کی خواہش رکھتے ہوئے انسانوں کے درمیان زندگی بسر کرتا ہے، اور اس ماحول کے اثرات جو اس کے دل و دماغ پر پڑتے ہیں۔ وہ ان کو کھل کر پیش کر دینے میں جھجکتا نہیں —— اور پھر پچھلے چند سالوں میں ہمارے سماج نے بھی تو کروٹ لی ہے۔ وہ بھی تو اب بہت کچھ بدل چکا ہے۔ بہت سے ایسے رسوم و رواج جو آج تک ان کو بیسیوں بندھنوں میں جکڑے ہوئے تھے، آج ختم ہو چکے ہیں۔ نئی زندگی نے اب صنفِ نازک کو بڑی حد تک مکانوں کے زنانوں سے باہر نکلنے کی ترغیب دی ہے۔ ان کے لباس میں تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں — وہ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ سجا بنا کر سرِ بازار شاہراہوں پر اٹکھیلیاں کرتی ہوئی چلتی ہیں۔ نیا شاعر ان کو دیکھ کر متاثر ہوتا ہے۔ اس کے جنسی جذبے کو تحریک ہوتی ہے۔ اور جو کچھ اس کے دل پر گزرتی ہے، وہ اس کا بیان کھل کر کر دیتا ہے۔ پرانے شاعروں نے بھی ان چیزوں کو پیش

کیا تھا لیکن ان کے بیان میں خارجی پہلو کو زیادہ دخل تھا۔ داخلی عنصر کی انہیں کمی تھی۔ بات یہ ہے کہ وہ نئے شاعروں کی طرح حساس نہیں تھے۔ اور چونکہ جنسیات کے معاملے میں وہ بعض سماجی بندھنوں میں جکڑے ہوئے تھے، اس لئے اس کے بیان میں وہ اپنے آپ کو زیادہ آلودہ بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ جنسی تعلقات، جنسی تحریک، اور اسی طرح کی دوسری باتوں سے دور بھاگتے تھے۔ کیونکہ ان میں سماجی بندھنوں کو توڑ دینے کی سکت نہیں تھی جو ان پر مسلیوں سے عائد تھے۔ اور پھر چونکہ خود ان کے دل میں چور تھا اسلئے وہ کھل کر ان باتوں کا بیان کرنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے جس ماحول میں سانس لی، وہ انہیں چھپ کر گناہ کرنے کا درس دیتا تھا۔ نئے شاعروں کو یہ دورنگی پسند نہ آئی —— وہ اپنی تمام کیفیات کو پیش کر دینے ہی میں اپنے آرٹ کی معراج خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ آج ہمیں، ان میں سے اکثر کے یہاں جنسی جذبات اور جنسی کیفیات کی تصویریں کھلم کھلا ملتی ہیں ——!

مثال کے طور پر جدید شاعروں میں راشد کو دیکھئے کہ وہ شروع شروع میں بالکل ایک رومانی شاعر نظر آتا ہے۔ جب وہ ایک حد تک روایتی طرز میں اپنے محبوب اور اپنی محبت کا تذکرہ کرتا ہے۔ چنانچہ "میں اسے واقفِ الفت نہ کروں"۔ "رخصت" "گناہ و محبت" —— اور "مری محبت جواں رہے گی" وغیرہ اس کی اسی طرح کی نظمیں ہیں۔ "گناہ و محبت" میں وہ اپنی محبت کو بالکل روایتی طرز میں پیش کرتا ہے۔ وہ پہلے کہتا ہے کہ جوانی نے اس سے بہت سے گناہ کرائے ہیں۔ وہ برسوں شب و روز اسی معصیت کی دنیا میں رہا ہے ؎

غرض جوانی میں اہرمن کے طرب کا سامان بن گیا میں

گنہ کی آلائشوں میں لتھڑا ہوا اک انسان بن گیا میں

لیکن اس کے بعد محبت نے اس کو ایک خاص راستے پر لگایا۔ اور اس کی زندگی کو گناہوں کی آلائشوں سے پاک کر دیا ؎

مجھے محبت نے معصیت کے جہنموں سے بچا لیا ہے

مجھے جوانی کی تیرہ و تار پستیوں سے اٹھا لیا ہے

یہ جوانی کی تیرہ و تار پستیاں، یہ گناہ کی آلائشیں، اس کو ایک خاص دور، ایک وقت اور ایک خاص ماحول کا انسان ثابت کرتی ہیں۔ لیکن جب وہ شاہراہ جنسیات پر آگے بڑھتا ہے۔ تو حالات کے تیور اس کو روش بدل دینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اور وہ ایک دوسری دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں اب اس کی دبی ہوئی خواہشات اور تقدس سے ہم آغوش زندگی، اس کیلئے عذاب بن جاتی ہے۔ اس کو رہ رہ کر اب یہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ کہ برسوں وہ تقدس کی دنیا میں رہا۔ کسی پیاس کی روح نمایاں نہ ہو سکی۔ اپنی امنگوں پر وہ خود حکومت کرتا رہا ؎

دبائے رکھا ہے سینے میں اپنی آہوں کو	وہیں دیا ہے شب و روز پیچ و تاب انہیں
زبانِ شوق بنایا نہیں نگاہوں کو	کیا نہیں کبھی وحشت میں بے نقاب انہیں
خیال ہی میں کیا پرورش گناہوں کو	کبھی کیا نہ جوانی سے بہرہ یاب انہیں

لیکن یہاں پہنچکر اس کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس کو اپنے ضبط کی یہ سزا مل رہی ہے کہ اس کا شباب ایک زہر سے لبریز شباب ہو چکا ہے۔ اب اس کے دل میں ایک عجیب سی خواہش چٹکیاں لیتی ہے۔ اور وہ حسرت کے انداز میں کہتا ہے ؎

اے کاش چھپ کے کہیں اک گناہ کر لیتا   حلاوتوں سے جوانی کو اپنی بھر لیتا

گناہ ایک بھی اب تک کیا نہ کیوں میں نے ؟

اور پھر وہ ادب اور آرٹ میں سکون تلاش کرتا ہے۔ لیکن ان سب میں بھی اس کو اسی "ایک خوابِ سیمگوں" کی حکومت نظر آتی ہے۔ چنانچہ اس کا دل یہ کہتا ہے ؎

مرا جی چاہتا ہے ایک دن اس خوابِ سیمیں کو   حجابِ فن رقص و نغمہ سے آزاد کر ڈالوں

ابھی تک یہ گریزاں ہے محبت کی نگاہ سے اسے اک پیکرِ انساں میں آباد کر ڈالوں

اس منزل کے بعد وہ اپنی شاعری کے اس موڑ پر آجاتا ہے۔ جہاں اس کے یہاں تقدس کا پتہ نہیں چلتا۔ اب وہ اس دنیا کا ایک نارمل انسان بن جاتا ہے۔ اب وہ صنفِ نازک کے جسم کے قریب بیدھڑک پہنچ سکتا ہے، اور اس نے "نیم نور، نغمہ" کر سکتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے سینے میں لرزش سی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ اس موقع پر "زندگی کی لذتوں" سے "سینہ بھر لینے اور اپنی روح کی تکمیل کر لینے کا خواہشمند نظر آتا ہے ؎

دیکھ اس جذبات کے نشے کو دیکھ!
تیرے سینے میں بھی اک لرزش سی پیدا ہو چلی
زندگی کی لذتوں سے سینہ بھر لینے بھی دے
مجھ کو اپنی روح کی تکمیل کر لینے بھی دے!

اور پھر اس کے بعد وہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ اب اس کی شاعری میں ہمیں کہیں "ہونٹوں کے لمس" کا تذکرہ ملتا ہے۔ کہیں زمستاں کی حسین رات اور اس میں کسی نازک کے سائے تلے ایک کیف وسرور کی دنیا کا بیان۔۔۔ جب وہ کسی جسم کے نیتانِ بہارستے اپنی روح کی تشنگی کو بجھاتا ہے۔ جب وہ ایک "لذتِ جاوید" کا آغاز کرتا ہے۔ جب وہ کسی کی نکہت و مستی سے کیف حاصل کرتا ہے۔ اور کسی کے سینے کے سمن زاروں میں لرزشیں سی اٹھا کر اس کے "انگاروں" کو بےتابانہ اپنی آغوش میں لے لیتی ہیں۔ اب وہ اس منزل پر آجاتا ہے جب وہ چاندنی میں شیشم کے درختوں کے نیچے بوسوں سے اپنی روح کا اظہار کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک روح کا اظہار ہی ایک چیز ہے۔۔۔ روح تو اظہار ہی سے زندہ و تابندہ ہے۔ ۔۔۔ اب اگر وہ محبت بھی کرتا ہے ۔۔۔ اور محبت تو اس نے کئی بار کی ہے ۔۔۔ تو اس میں تقدس کو دخل نہیں ہوتا۔ اب وہ محبت کی دنیا میں ایک بدلا ہوا انسان ہے ؎

میں جو سرمست ملنگوں کی طرح
اپنے جذبات کی شوریدہ سری سے مجبور
مضطرب رہتا ہوں مدہوشیٔ عشرت کے لیے
اور تیری سادہ پرستش کی بجائے
مرتا ہوں تیری ہم آغوشی کی لذت کے لیے

لیکن اس کے باوجود "اس کی محبت ہے محبت ۔۔۔! اس کی نوعیت ضرور بدل گئی ہے، لیکن یہی بدلی ہوئی نوعیت زیادہ سائنٹیفک ہے ۔۔۔ زندگی سے قریب ہے ۔۔۔ حقیقت ہے ۔۔۔ اس میں سچائی اور وفاکیشی کو دخل ہے۔ چنانچہ وہ یہ کہہ دیتا ہے ؎

مرے جذبات کو تو پھر بھی حقارت سے نہ دیکھ!
اور مرے عشق سے مایوس نہ ہو!
کہ مرا عہدِ وفا ہے ابدی!

یہ ہے راشد کے ذہنی ارتقا اور اس کی شاعری کی مختلف منزلوں کی مختصر سی کہانی ۔۔! اس نے عشق و محبت کو زیادہ سے زیادہ بنا سنوار کر حقیقت کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ جس میں روحانیت میں ڈوبی ہوئی خیالی باتوں کو مطلق دخل نہیں۔ برخلاف اس کے اس کی نوعیت شروع سے آخر تک جنسی ہے ۔۔۔ اور جس کا بیان شروع سے آخر تک حقیقت نگاری سے ہم آغوش ہے۔

راشد کے علاوہ بھی نئے شاعروں میں ازیادہ کا یہی حال ہے کہ وہ عشق و محبت کی تشکیل میں جنسی جذبے کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ اور

اپنے اس قسم کے جذبات و احساسات کو کھلم کھلا پیش کر دینے میں جھجکتے نہیں — میراجی کو دیکھئے کہ اس کی شاعری ابتدا سے آخر تک جنسیات کی ایک لمبی دوڑی ہوئی ہے۔ وہ خود لکھتا ہے کہ "جنسی فعل اور اس کے متعلقات کو میں قدرت کی بڑی نعمت اور زندگی کی سب سے بڑی راحت اور برکت سمجھتا ہوں۔ اور جنس کے گرد آلودگی جو تہذیب و تمدن نے جمع کر رکھی ہے۔ وہ مجھے ناگوار گزرتی ہے۔ اسلئے رد عمل کے طور پر میں دنیا کی ہر بات کو جنس کے اس تصور کے آئینے میں دیکھتا ہوں جو فطرت کے عین مطابق ہے اور ——— جو میرا آدرش ہے"۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے یہاں ہمیں قدم قدم پر جنسی جذبے کے مختلف حالات، و کیفیات کا بیان ملتا ہے — جو خیالات جنسی اعتبار سے آج کل کے نوجوانوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں، وہ ان سب کو پیش کرتا ہے۔ جن باتوں کو دوسرے کہنے میں جھجکتے ہیں۔ وہ ان کو کھل کر کہہ دینے سے باز نہیں رہتا۔ لیکن بہر حال وہ چند حقیقتوں کا بیان ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو صرف عریاں ہونے کے باعث مطعون نہیں کیا جا سکتا۔ وہ جب یہ کہتا ہے ـــہ

آج رات
میرا دل
چاہتا ہے تو بھی میرے پاس آ
اور سوئیں ساتھ ساتھ

تیرے پیراہن مجھے
یاد آتے ہیں بہت
آسماں بھی صاف ہے
اور ستارے اور چاند
بیخود و سرمست ہیں
تازگی
ہے عیاں
ذرّے ذرّے سے زمیں کے آہ لیکن بے بسی،
اور تنہائی مری!

آج تو آجا مری ہمراز بن
آ بھی جا!
آ گھٹائیں آ رہی ہیں بے نشاں رفتار سے
اور ان کالی گھٹاؤں میں سے سرمستی، خمار
اور پانی کے ہیں تار
تو بھی آ
مل کے ہم

آج رات
گا رہی ہیں چاہت کے گیت ؟
جسم بھی تیرا مجھے مرغوب ہے
اور تیری ہر ادا
اور یہ چہرہ ترا
محبوب ہے

تیری یہ پیاری جوانی اک اچھوتی سی کلی
اور صورت سادی سادی سانولی،
اور ترے بالوں میں یہ چمپا کے پھول
اور نازک ہاتھ پر لپٹا ہوا گجرا ترا
اور گلے میں ایک ہار
آہ تیرے سب سنگار
کھینچتے ہیں دل کے تار
اور اک ہلکی سی گونج
اس فضا کی وسعتوں میں کھو گئی

آ مری ننھی پری!
آ مری من موہنی!
آج رات
چاہتا ہوں تو بھی میرے پاس ہو! (سرگوشیاں)

تو نہ صرف اپنی خواہشات کی ترجمانی کرتا ہے بلکہ سارے نوجوانوں کی دلی کیفیات کو بے نقاب کر دیتا ہے۔ کون ایسا نوجوان ہے، جو تنہائی کے لمحوں میں ایسی باتیں نہ سوچتا ہو۔ دوسرے اس کو چھپاتے ہیں۔ میرا جی ان کو بیان کر دیتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کی شاعری میں ہمیں کہیں کہیں ایک صحت مند انسان کی جنسی کیفیات کا پتہ نہیں بھی چلتا۔ بر خلاف اس کے وہ کہیں کہیں جنسی حیثیت سے مریض معلوم ہوتا ہے۔ اس نے محبت کی ہے لیکن وہ عورت سے دور رہا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عورت کی اس دوری نے اس کو ایسے اقدامات کرنے کیلئے مجبور کیا ہے، جو فطری نہیں ہوتے اور جن کا ارتکاب انسان کو جنسی حیثیت سے صحت مند نہیں رکھ سکتا۔ چنانچہ وہ عورت کے جادو کو پھیلتی نظر سے دیکھ کر ہی جی بھر لیتا ہے۔ اب یہ عورت کے جادو کو پھیلتی نظر سے دیکھنے کا کیا مطلب ہے؟ — اس کا اندازہ آپ ہی لگائیے! آخر میں پہنچ کر اس کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ وہ "سب جو شبارے" میں جب ایک عورت کو ندی کے کنارے پیشاب کرتے ہوئے دیکھتا ہے، تو اس کی کچھ بن نہیں آتی۔ اس کو یقین ہے کہ وہ جنسی فعل کی تکمیل نہیں کر سکتا۔ اس لئے نتیجہ مشت زنی نکلتا ہے۔ اور اس طرح اس کے رہے سہے جنسی جذبے کو تسکین ہو جاتی ہے۔ "سرسراہٹ" میں

بھی اس نے جس جنسی کیفیت کو پیش کیا ہے، اس میں بھی یہی رنگ ہے۔ میرا جی نے اس کے متعلق خود لکھا ہے یہ سرسراہٹ ذہنی کیفیت کا ایک لمحہ ہے جس کی نوعیت جنسی ہے ۔۔۔ لیکن یہ لمحہ ایک صحت مند انسان کی ذہنی کیفیت کا لمحہ نہیں معلوم ہوتا۔ اس میں بھی ہمیں ابنارمل ذہنی عیاشی کا احساس ہوتا ہے۔ سلوٹوں کے استعارے ہی میں یہ چیز موجود ہے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس کا لکھنے والا اپنے آپ ہی ایک خاص حالت میں کیف محسوس کر رہا ہے۔ ؎

یہاں ان سلوٹوں پر ہاتھ رکھ دوں
یہ لہریں ہیں، بہی جاتی، اور مجھ کو بہاتی ہیں
یہ موجِ بادہ ہیں، ساغر کی خوابیدہ فضاؤں میں
اچانک جاگ اٹھتی ہے۔
حقیقت کے جہاں سے کوئی اس دنیا میں در آئے
تو اس کے ہونٹ متبسم ہوں، شاید قہقہہ اٹھ کر، جکڑ لے اپنے ہاتھوں سے (سرسراہٹ)

یہ سلوٹوں پر ہاتھ رکھنا، یہ لہروں کا بہے جانا، یہ ساغر کی خوابیدہ فضا کا اچانک دل میں جاگ اٹھنا، اس بات کی غمازی کرتا ہے، جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ میرا جی کی اسی غیر صحت مندانہ جنسی کیفیت نے اس کو بڑی حد تک قنوطی بنا دیا ہے۔ اس کی شاعری میں امنگ اور جولانی کا پتہ نہیں چلتا۔ بلکہ ایک بجھی بجھی سی کیفیت ہے۔

اور پھر نوجوان شاعروں میں وشوامتر عادل کو دیکھئے! اس کا بھی یہی حال ہے۔ یعنی وہ بھی اپنی شاعری میں اپنے آپ کو اسی دنیا کا ایک نارمل انسان بنا کر پیش کرتا ہے۔ اس کی شاعری میں زیادہ نظمیں اس بات کا احساس دلاتی ہیں کہ اس نے محبت کی ہے، لیکن بعض سماجی پابندیوں اور تمدنی جکڑبندیوں کے باعث، اس کو بار بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ اس کی آدرشی عورت اس کے راج محل کی رانی نہ بن سکی۔ برخلاف اس کے وہ دوسروں کے ساتھ باندھ دی گئی ۔۔۔ جس کا اثر عادل پر ہوا کہ وہ پریشان حال پھرنے لگا ۔۔۔ وقت کا ایک ایک لمحہ اس کو پہاڑ معلوم ہونے لگا۔ جو کسی طرح بھی کاٹے نہیں کٹتا۔ اس کی ساری زندگی بے کیف و بے رنگ، و بو ہو گئی۔ وہ ایک ناکام و نامراد نوجوان کی طرح سڑکوں کی خاک چھانتا ہوا، دیوانہ وار ادھر ادھر پھرنے لگا۔ زندگی کو سکون دینے کی غرض سے قہوہ خانوں کے پیالوں میں گھلتا رہا۔ اور دفتروں کے کاغذوں میں گم بھی ہوتا رہا۔ لیکن سب سے آخر میں جب ضبط کی انتہا نہ رہی، تو کسی شاہراہ پر گزرتے ہوئے ۔۔۔ ٹوٹے پھوٹے بھورے بھورے آشیانوں کی روشنی اس کے احساسات کو ترغیبِ گناہ دینے لگی۔ یعنی اس کی جنسی خواہشات میں بھی ارتعاش پیدا ہوا۔ کیونکہ وہ بہرحال فطری ہیں اور کسی طرح بھی دب نہیں سکتیں۔ اس لئے وہ کھلم کھلا ان آشیانوں کی طرف جا کر اپنی پیاس بجھانے لگا۔ لیکن اس کی آدرشی عورت کے خیال نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اس کی محبت برقرار رہی۔ اور وہ ایک لمحے کیلئے بھی اس کے خیال سے بے خبر نہیں رہا۔ یہ عجیب بات ہے کہ عادل اپنی شاعری میں ناکامی کی تلخی کو دور کرنے اور اس سے پیدا شدہ تکلیف کو فراموش کرنے کیلئے شراب کی طرف رجوع نہیں ہوتا۔ حالانکہ وہ زیادہ سکون کا باعث بن سکتی ہے ۔۔۔ لیکن جنسی جذبہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ یہ بات پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ جہاں تک جنسی جذبے کی تکمیل کا تعلق ہے وہ اس میں ہر نارمل انسان کی طرح بے بس ہے۔ کیونکہ فطرت کے سامنے کسی کی پیش نہیں جا سکتی۔ وہ شراب سے احتراز کر سکتا ہے۔ لیکن ایک فطری خواہش کی تکمیل کیلئے اس کو ٹوٹے پھوٹے بھورے آشیانوں کی طرف جانا ہی پڑتا ہے ؎

دفتروں کے کاغذوں میں گم ہوا جاتا ہوں میں
قہوہ خانوں کے پیالوں میں گھلا جاتا ہوں میں

یا اندھیری رات میں
سونے سونے راستوں کے آس پاس
سوکھے ہوئے شیشموں کے اور کھمبوں کے ہجوم
دیکھتا جاتا ہوں —— یونہی سوچتا جاتا ہوں میں
یا بڑھا جاتا ہوں میں
ٹوٹے پھوٹے بھورے بھورے آشیانوں کی طرف
من کی پھیلی کپکپاتی روشنی
میرے احساسات کو دیتی ہے ترغیبِ گناہ!
(..... کہ تو عورت نہیں)

عادلؔ کی ایک اور نظم ہے —— خاکے! جس میں اس نے اپنی محبت کی کہانی اور اس کی بعد کی کیفیت کا نقشہ پیش کیا ہے۔ وہ سب سے پہلے اپنی آدرشی عورت سے اپنی پہلی ملاقات کا بیان کرتا ہے۔ جب وہ عورت اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھی —— نظریں جھکائے ہوئے گویا خاموشی سے پیمان محبت باندھ رہی ہو۔ اور ادھر عادلؔ کے دل میں سینکڑوں خواہشات انگڑائیاں لے رہی تھیں۔ اس وقت اس کو سوائے اس کے کوئی اور خیال نہیں آتا کہ اگر وفورِ شوق میں۔ اس گرم جوان، گرم، تنومند ہاتھ اس کے خم کمر سے چھونے لگا تو کیا ہوگا۔ اور اس کے کمر کا خط گویا اس کے بازو کو بلاوا دے رہا تھا —— یعنی وہی خیالات اور وہی خواہشات جو جنسی ہیں —— مگر جو ہیں بالکل فطری! —— اور جن کا پیدا ہونا ہر نوجوان کے دل میں ازبس ضروری ہے ؎

فسردہ شام کی تنہائی پھیلتی ہی گئی
بڑھا بڑھا کے بڑھاتی ہوئی سکون کے ہاتھ
چمکتے کانچ کا گلدان تھا کنارے پہ
سفید پھول کی گردن جھکی جھکی ہی رہی
سکوت ریشمی پردوں کی نرم لہروں کو
تھپک تھپک کے سلاتا رہا، سلاتا رہا
کھڑی ہوئی وہ دریچے کے پاس دیکھتی تھی
ردائے آبِ افق تیرتی ابابیلیں،
میں اس کے پاس کھڑا اپنے دل میں سوچتا تھا
مرے قریب، مگر پھر بھی کتنی دور ہے تو،
کمر کا خط مرے بازو کو اک بلاوا ہے
جوان گرم تنومند ہاتھ بڑھ کے اگر
خمِ کمر سے جو چھونے لگا تو کیا ہوگا؟
کھنچے رہے مگر احساس کے ستار کے تار
اور اس کی گود میں خاموش درد کا مارا

اداس گیت محبت کا تھرتھراتا رہا!   (خاکے)

لیکن اس وقت اس کو اس کیفیت کے ساتھ مذہب و رسم و رواج کا ایک بھوت بھی نظر آ رہا تھا۔ جو اس کی طرف جھپٹتا تھا اور اس کی محبت کو ناکام بنانے کے درپے تھا ؎

فسردہ شام کی تنہائی پھیلتی ہی گئی
بڑھا بڑھا کے بڑھاتی ہوئی سکون کے ہاتھ
میں اس کے پاس کھڑا تھا مگر وہ تنہا تھی
افق پہ ابر کے ٹکڑے تھے سرد آئینے
ابھی یہ میری نظر تلخ انجما دہی
جھلک رہا تھا بھیانک مہیب تیرہ و تار
جہاں کے مذہب و رسم و رواج کا اک بھوت
جو بار بار لپکتا تھا، دانت پیتا تھا
وہ ڈر گئی، وہ تو عورت تھی اس نے کچھ نہ کہا
پرے کھجور کے اوپر نمدکش گول سا چاند
ابھر رہا تھا ابھرتا رہا، ابھرتا رہا   (خاکے)

جو اس کو ناکامی کا منہ دکھانے سے باز نہ رہا۔ اس کی دنیا اجڑ گئی۔ اور وقت کا ایک ایک لمحہ اس پر بار ہونے لگا۔ رینگتے لمحوں کی چیونٹیاں اس کے جسم کو چپ چاپ چوستی رہیں ؎

مری تڑپتی ہوئی روح پھڑپھڑاتی ہے
نحیف زیست سے عاری ہے، پر بھی ٹوٹے ہوئے
مگر یہ رینگتے لمحوں کی چیونٹیاں چپ چاپ
لپٹ لپٹ کے اسے بار بار چوستی ہیں   (خاکے)

لیکن بہر حال وہ انسان تھا۔ یہ ناکامی اور اس عورت کا خیال ہل کر اس کے جنسی جذبے کو ختم نہیں کر سکتے تھے جو بالکل فطری ہے۔ چنانچہ وہ تنہائی سے تنگ آ کر اپنے جسم کو (روح کو نہیں) ایک ایسے جسم کے قریب لے جاتا۔ جو چند لمحوں کے لئے اس کے قبضے میں ہے۔ وہ اس سے نگاہیں ملانا چاہے تو نگاہیں بھی ملا سکتا ہے۔ اگر اس کے بال بکھیرنا چاہے تو بال بھی بکھیر سکتا ہے۔ اگر لپٹنا چاہے تو بے دھڑک اور بغیر کسی روک کے لپٹ بھی سکتا ہے۔ غرض اس منزل پر اس کے لئے کوئی روک نہیں۔ اور وہ اب مجبوراً اسی دنیا میں۔ رہنے لگتا ہے۔

برہنہ جسم ہے اور اجنبی فضا لیکن
خزاں میں فرش گلستاں کا ایک آئینہ
"ذرا نظر تو اٹھاؤ" نگاہیں ملتی ہیں
"بکھیر بھی دو حسیں بال" وہ بکھرتے ہیں
"لپٹنے دو بھی مجھے" میں لپٹتا جاتا ہوں

کوئی بھی روک نہیں ہے کوئی بھی روک نہیں،
فسردہ رات کی تنہائی اب سمٹتی ہے،
سمٹ سمٹ کے سکڑتی ہوئی سکڑتی ہوئی
یہ مجھ سے کہتی ہوئی اب یہاں نہ آئیں گے
(خاکے)

عاملِ احساس کے علاوہ اکثر نوجوان شاعروں کا یہی حال ہے کہ وہ خیالی دنیا میں نہیں رہتے۔ بلکہ تمام حالات کو سائنٹیفک طریقے پر حقیقت کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ وہ جنسی جذبے کی اہمیت کو فراموش نہیں کرتے۔ وہ جانتے ہیں کہ خواہ کچھ بھی ہو لیکن اس جذبے کی تسکین بہت ضروری ہے۔ چنانچہ ان کے یہاں اس بنیادی جنسی جذبے کا ذکر بار بار ملتا ہے ــــ لیکن یہ حقیقت نگاری ہے ــــ عریانی نہیں ــ!
بعض لوگوں کے نزدیک اس قسم کے بیانات عریاں ضرور کہے جا سکتے ہیں لیکن یہ وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اس زمانے سے بہت پیچھے ہیں۔ جو سامنتی دور میں سانس لینے اور پرورش پانے کے باعث ہر چیز کو ایک خاص زاویۂ نظر سے دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ سامنتی دور میں نہ صرف جنسی مسائل کو بلکہ ہر چیز کو چھپانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اور آج بھی کی جاتی ہے۔ لیکن ہمارے شاعروں کو ایک طرف تو سامنتی دور کے خیالات سے نفرت ہے، اس لئے وہ اس کی ہر چیز کو توڑ پھوڑ کر رکھ دینے کے خواہشمند ہیں۔ اور دوسرے اب وہ زیادہ بالغ نظر ہو چکے ہیں۔ ان کا زاویۂ نظر اور ہر بات تک پہنچنے کا طریقہ اب زیادہ سائنٹیفک ہو گیا ہے۔ اس لئے قدامت و جدت کے درمیان ایک نمایاں فرق ہونا لازمی ہے ــــ یہ چیز شاعری میں بھی موجود ہے۔ اگر قدامت اس میں بعض پیش کی ہوئی باتوں کو عریاں سمجھتی ہے تو جدت اس کو حقیقت نگاری خیال کرتی ہے۔

نئے شاعر چونکہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر گہری نظر ڈالتے ہیں، اس لئے وہ ان باتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی جھجکتے نہیں، جہاں سماج کے بعض افراد، اپنی جنسی خواہشات کو تسکین دینے کیلئے بے جا دست درازیاں کرنے لگتے ہیں۔ ایسے لوگ موقع پا کر کسی دوشیزہ کی جوانی کو چند سکوں کے عوض خرید لیتے ہیں۔ کہیں کسی مزدور عورت کی عصمت و عفت پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ کہیں پروہت اور پجاریوں کا روپ دھار کر تقدس کے سائے میں کسی نوجوان عورت کی زندگی کو تباہ و برباد کرتے ہیں۔ ہمارے شاعر ان مسائل کو بھی فراموش نہیں کرتے ــ چنانچہ آج کل کی شاعری میں ایسی باتوں کا بیان بھی زیادہ ملتا ہے۔ کیونکہ ان سب کے یہاں موجودہ نظامِ زندگی کے خلاف تنفر کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی ہے۔ جس نے ان کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ سماج کی تمام چیزوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیں۔ نئے شاعر جب ان باتوں کا تذکرہ کرتے ہیں، تو وہ ان سے کوئی جنسی کیف حاصل کرنا نہیں چاہتے بلکہ سماج کے افراد میں دست دراز لوگوں کے خلاف نفرت کے جذبات کو ابھارتے ہیں۔ اس لئے یہاں جو عریانی پیدا ہوتی ہے، وہ اصل میں زندگی کے ایک رخ کی سچی تصویر ہے۔ اور دوسرے اپنے اندر ایک مقصد رکھتی ہے۔ جو حقیقتاً ایک بڑا مقصد ہے۔ سلام مچھلی شہری جب ایک مزدور عورت پر ایک سرمایہ دار کی دست درازیوں کا تذکرہ کرتا ہے تو اس میں کہیں بھی اس کا شائبہ نہیں ہوتا کہ وہ اس میں خود کوئی کیف محسوس کر رہا ہے۔ بلکہ وہ تو ایک مصور کی طرح ایک خاص منظر کی تصویر کھینچتا ہے ؎

یہ سیکری ہے، یہ تاج محل، یہ کرشن ہیں اور یہ رادھا ہیں،
یہ کرج ہے، یہ پائپ ہے ملا، یہ ناول ہے، یہ رسالہ ہے
یہ گاندھی ہیں، ٹیگور ہیں، یہ شاہنشہ، یہ ملکہ ہیں!
ــــ ہر چیز کی بابت پوچھتی ہے، جانے کتنی معصوم ہے وہ!
ــــ ہاں اس پہ رات کو سونے سے میٹھی میٹھی نیند آتی ہے

ہاں اس کے دبانے سے بجلی کی روشنی گل ہو جاتی ہے
سمجھی کہ نہیں، یہ کمرہ ہے، ہاں میرا ڈرائنگ روم ہے یہ!
—— اتنی جلدی مزدور عورت آخر یہ گھبراہٹ کیوں؟
سے دیر ہوئی اب بھاگ بھی جا، بس اتنی محبت کافی ہے
اس ملک کے رہنے والوں کو پیسے ہی کی حاجت کافی ہے
اتنی ہنسی، یکھ خاموشی، اتنی مانوس نگاہیں کیوں؟
—— میں سوچ رہا ہوں کچھ بیٹھا پاپ کے دھوئیں کے بادل میں
میں چھپ سا گیا ہوں اک نازک تخئیل کے میلے آنچل میں (ڈرائنگ روم)

اسی طرح جب "بھینٹ" میں ہر ایک بچاری کی کارفرمائیوں کو اس طرح بے نقاب کرتا ہے کہ ؎

تقدس کے حسین شیطان کے قدموں کی آہٹ میں | یہاں دوشیزگی کی چیخ بھی گم ہو گئی آخر
گھنے پتوں کے پیچھے مورتی کی مسکراہٹ میں | ہمیشہ کیلئے بھولی پجارن کھو گئی آخر (بھینٹ)

تو بھی کہیں اس کا پتہ نہیں چلتا کہ وہ خود اس منظر سے کوئی دلچسپی لے رہا ہے۔ برخلاف اس کے اس کی تہ میں ایک نفرت کا جذبہ ہے۔ اور یہاں تو کوئی ایسا زیادہ عریانی بھی پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کی فنکاری اس میں دبی پژمردگی کا عنصر پیدا کر دیتی ہے، جس سے اس کا تاثر بھی بڑی حد تک بڑھ جاتا ہے۔ اس قسم کی باتیں ہماری سماج کیلئے ایسی کچھ نئی نہیں ہیں۔ ایسے واقعات آئے دن ہم اپنی آنکھوں سے دیکھا، کانوں سے سُنا اور اخباروں میں پڑھا کرتے ہیں۔ شاعر ان سے تحریک لیتے ہوئے، ان کو نظم کا جامہ پہنا دیتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بعض جگہ جدید شاعر ایسی باتیں ضرور کرنے لگتے ہیں، جس سے ان کی ذہنی عیاشی کا پتہ چلتا ہے —— یعنی وہ عورت کے جسم اور اس سے پیدا شدہ کیفیت کو مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ لیکن عورت کے جسم اور اس سے پیدا شدہ سرور و کیف کا بیان کوئی ایسی چیز نہیں، جو صرف آج کی شاعری میں کیا جا رہا ہو۔ بلکہ دنیا بھر کے ادب اور آرٹ میں عورت کے جسم کے بیان کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ شاید ہی دنیا کا کوئی شاعر، کوئی ناول نگار، کوئی افسانہ نویس، کوئی بت تراش، اور کوئی مصور ہو جس نے عورت کے جسم اور اس سے پیدا شدہ لذت کا بیان اپنی تخلیقوں میں نہ کیا ہو۔ آج سے صدیوں پہلے بعضوں نے تو ایسی باتیں کہی تھیں، جن کو آج بیسویں صدی میں کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ لیکن آرٹ اور ادب کو اخلاقیات کے بندھنوں سے بلند ہونا چاہئے۔ اگر اس پر بھی اخلاق کی بندشیں عائد کر دی گئیں تو فنکاروں کی آوازیں گھٹی گھٹی اور ملول معلوم ہوں گی۔ آرٹ کیلئے تو بس اتنا کافی ہے کہ وہ کسی بھی حسین چیز کی تخلیق کرے۔ اگر وہ دنیا کے کسی موضوع کو بھی اپنا کر حسن سے ہم آغوش کر سکتا ہے۔ تو وہ کامیاب ہے۔ اور یہی حسن سچائی اور حقیقت ہے۔ اس لئے آرٹ کیلئے ضروری نہیں کہ ان پر کسی قسم کی پابندیاں عائد کی جائیں۔ چنانچہ ہیولاک ایلیس نے اپنی مشہور کتاب Dance of Life میں لکھا ہے کہ آرٹ میں اخلاق سے کہیں زیادہ اخلاق ہوتا ہے Art is more moral than morality ہمارے نئے شاعروں کے پیش نظر ایک چیز یہ بھی ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ وہ ایک ایسی سماج میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ جس کا نظام صحیح بنیادوں پر قائم نہیں۔ اس لئے زندگی کی قدروں میں بھی تناسب مفقود ہے۔ چنانچہ یہی چیز ہمارے آرٹ اور ادب میں جھلکتی ہے۔ کہ اس میں بھی شروع سے آخر تک ایک انتشاری اور مزاجی کیفیت ہے۔ ایسے ماحول میں سانس لینے والا انسان زندگی سے بھاگتا ہے —— فرار اختیار کرتا ہے۔ اور ایک کیف و سرور کی دنیا بسا کر سماجی تلخیوں کو بھلا دینا چاہتا ہے۔ ایسا ہر دور اور ہر زمانے میں ہوا کیا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کیلئے ایسے انسان نہیں پیدا ہوتے۔ جو ان حالات کو ختم کرنے کیلئے کوئی اقدام کریں۔

موجود ملتا ہے۔ جس کی ایک بین مثال اُردو کی نئی شاعری ہی ہے۔ کہ ایک طرف تو اس میں انقلاب کے پیغام دیئے جا رہے ہیں۔ لیکن دوسری طرف بعضوں کی شاعری میں فراری کیفیت بھی نظر آتی ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں ساتھ ہی ساتھ چل رہی ہیں۔

میں تو ساری اُردو شاعری کو حالات و واقعات کا تقاضا سمجھتا ہوں۔ اس میں جو چیز بھی لکھی جاتی ہے' اس کو لکھا ہی جانا چاہئے —— سماجی ماحول اور ادیب کی شخصیت کے امتزاج سے آرٹ کی تخلیق ہوتی ہے۔ بعض ادیب اور شاعر اپنے اندر ایک آگے بڑھ جانے والی کیفیت رکھتے ہیں۔ دوسرے تھک کر بیٹھ جانے کے سوا اور کچھ نہیں جانتے۔ چنانچہ آپ صرف ایک ماشدؔ کو دیکھئے ——! اس کی ذہنیت شکست خوردہ ذہنیت ہے۔ وہ زندگی سے فرار اختیار کرتا ہے۔ اور اس کی تخیل کو صنفِ نازک کی کیف ہم آغوشی اور شرابِ ناب کی لہروں کے سرور میں کھو کر بھلا دینا چاہتا ہے۔ لیکن ہندوستان کے مسائل بھی اس کی آنکھوں کے سامنے ہیں۔ وہ جب اس کی زبون حالی پر نظر دوڑاتا ہے تو اس کو یہ سرزمین جبرو استبداد کی آہنی زنجیروں میں جکڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اور جن لوگوں نے اس کو ان زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے' ان سے انتقام بھی لینا چاہتا ہے —— لیکن اس انتقام کی نوعیت بالکل دوسری ہے۔ اس کے پاس اتنی طاقت نہیں کہ وہ مخالفین سے میدان جنگ میں کھلم کھلا مقابلہ کرے۔ کیونکہ اس کے پاس نہ تو آلاتِ حرب ہیں' اور نہ اتنی ہمت کہ جرأت سے میدان جنگ میں آگے بڑھا وے۔ چنانچہ وہ انتقام لینے کا ایک دوسرا راستہ ڈھونڈتا ہے۔ اور وہ راستہ یہ ہے کہ وہ ایک بت فرنگ کو کہیں پاکر اپنے ہونٹوں سے آتش انتقام کو بجھاتا ہے' جس سے اس کو ذہنی سکون مل جاتا ہے۔ "انتقام" اس کی اسی طرح کی نظم ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ اگر اس نظم کی تخلیق نہ ہوتی تو اُردو شاعری ہندوستان کی دو تین سو برس کی تاریخ اور اس کے اثرات سے محروم رہ جاتی۔ اب صرف اس ایک نظم میں ہندوستانی زندگی کا سارا مدوجزر اور غلامی سے پیدا شدہ یہاں کے باشندوں کی ذہنی کیفیت کے بیان کا سارا نقشہ پیش کر دیا گیا ہے ؎

اس کا چہرہ —— اس کے خدوخال یاد آتے نہیں
اک شبستاں یاد ہے
اک برہنہ جسم آتشداں کے پاس
فرش پر قالین، قالینوں پر سیج
دھات اور پتھر کے بت
گوشۂ دیوار میں ہنستے ہوئے
اور آتشداں میں انگاروں کا شور
ان بتوں کی بے حسی پر خشمگیں!
اُجلی اُجلی اُونچی دیواروں پہ عکس
ان فرنگی حاکموں کی یادگار
جن کی تلواروں نے رکھا تھا یہاں
سنگِ بنیادِ فرنگ
یعنی سنگِ تربتِ ہندوستان!
اس کا چہرہ اس کے خدوخال یاد آتے نہیں
اک برہنہ جسم اب تک یاد ہے

اجنبی عورت کا جسم

میرے ہونٹوں نے لیا تھا رات بھر
جس سے اربابِ وطن کی بے بسی کا انتقام
وہ برہنہ جسم اب تک یاد ہے!
(انتقام)

اس نظم میں راشد نے اپنی ایک خاص حرکت کا بیان کیا ہے۔ جس کی نوعیت تو ضرور جنسی ہے لیکن جس سے جنسی کیفیت حاصل کرنا راشد کا مقصد نہیں۔ وہ تو صرف انتقام لینے کا خواہاں ہے۔ اور انتقام ہی کی خواہش اس کو یہ اقدام کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ راشد کی ذہنیت شکست خوردہ ذہنیت ہے۔ اور اس کی یہ حرکت، یہ اقدام، یہ عمل اسی شکست خوردہ ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ یہ بالکل ایک نفسیاتی بات ہے کہ انسان جب حد سے زیادہ کمزور ہو جاتا ہے، اور اس میں اپنے سے طاقتور ہستی کے مقابلے کی سکت باقی نہیں رہتی۔ تو سپر تو بہرحال ڈالنی ہی پڑتی ہے لیکن وہ دوسرے طریقوں سے مقابلہ کرتا رہتا ہے — یا کم از کم مقابلے اور انتقام کے خیال کو دل سے نہیں نکالتا۔ چنانچہ وہ یا تو اپنے حریف کو نقصان پہنچاتا ہے یا گالی دیتا ہے — گالی کو خالص علمی نقطۂ نظر سے ذرا نفسیات کی روشنی میں دیکھئے — آخر ایک شخص گالی کیوں دیتا ہے؟ — وہی انتقام کی ایک فطری خواہش اس کو ایسا کرنے کے لئے اُکساتی ہے۔ ماں اور بہن کی گالیاں کہاں عام نہیں؟ — صدیوں سے اسی طرح چلی آ رہی ہیں۔ اور پھر زیادہ تر یہ دیکھا گیا ہے کہ کمزور انسان زیادہ گالیوں سے اپنی آتشِ انتقام کو بجھاتا ہے — یہ نظم کوئی گالی نہیں لیکن جب تک ان خیالات کی روشنی میں اس کو دیکھا نہیں جائے گا۔ اس وقت تک یہ سمجھ میں نہیں آ سکتی! — صدیوں کی غلامی نے ہندوستان کو ناکارہ کر دیا ہے۔ اس میں اتنی سکت نہیں کہ وہ آگے بڑھ سکے۔ اس میں اتنی جرأت نہیں کہ وہ جبر و استبداد کی قوتوں کے خلاف کوئی جارحانہ اقدام کر سکے۔ اس کے نزدیک ان قوتوں سے انتقام لینا کوئی آسان کام نہیں۔ لیکن اس کے باوجود اجتماعی اور انفرادی دونوں حیثیتوں سے انتقام کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ انفرادی کوشش کی ایک مثال یہ بھی ہے، جو راشد نے اختیار کی ہے۔ اور جس میں اس کی شکست خوردہ ذہنیت کی تصویر بے نقاب ہے۔ لوگ اس کو عریاں نظم کہتے ہیں۔ میں اس کو ہندوستان کی کس مپرسی، زبوں حالی اور بے بسی کے مرثیے کا ایک رخ سمجھتا ہوں۔

ہمارے سماجی ماحول کی ایک 'کارفرمائی' یہ بھی ہے کہ ہمارے نوجوان بری طرح جنسی بھوک کے شکار ہیں۔ صنفِ نازک پر یہاں جو پابندیاں عائد ہیں۔ وہ اور کسی ملک میں نظر نہیں آتیں۔ یہاں مرد اور عورت ایک دوسرے سے کھل کر مل نہیں سکتے۔ بات نہیں کر سکتے، ایک ساتھ اٹھ بیٹھ نہیں سکتے۔ ان حالات کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستانی نوجوانوں کے یہاں ہمیں جنسی دباؤ Sex . Repressesr کا احساس ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان کا یہ فطری جذبہ گھٹ کر رہ گیا ہے چنانچہ جب وہ کبھی کوئی تخلیقی کارنامہ پیش کرتے ہیں تو اس کا اثر اس میں بھی صاف جھلکتا ہے۔ نئی شاعری بھی اس سے بچ نہ سکی۔ اکثر نئے شاعروں کے یہاں یہ کیفیت جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ میراجی جب "ترغیب" میں یہ کہتا ہے کہ —

رسیلے جرائم کی خوشبو
مرے ذہن میں آ رہی ہے
رسیلے جرائم کی خوشبو
مجھے حدِ ادراک سے دور لے جا رہی ہے
جوانی کا خوں ہے
بہاریں ہیں موسم نہیں پر
پسند آج مجھ کو جنوں ہے

نگاہوں میں ہے مرے نشے کی اُلجھن
کہ چھایا ہے ترغیب کا جال ہر اک حسیں پر
رسیلے جرائم کی خوشبو مجھے آج للچا رہی ہے !
قوانینِ اخلاق کے سارے بندھن شکستہ نظر آ رہے ہیں
حسیں اور ممنوع جھرمٹ، مرے دل کو پھسلا رہے ہیں
یہ ملبوسِ ریشم کے اوسان کی لرزش،
یہ غازہ ——— یہ انجن
نسائی خزاں کی ہر اک موہنی آج کرتی ہے سازش
مرے دل کو بہکا رہی ہے !
مرے ذہن میں آ رہی ہے
رسیلے جرائم کی خوشبو !

(ترغیب)

تو وہ صرف اپنی ایک داخلی کیفیت کی تصویر ہی نہیں کھینچتا ۔ بلکہ سارے ہندوستانی نوجوانوں کی ترجمانی کر دیتا ہے ۔

لیکن عریانی کے یہ پہلو اِن کا بیان اوپر ہوا ، اُردو کے سارے نئے شاعروں کے یہاں نظر نہیں آتے ۔ ایسے شاعر بہت ہی کم ہیں ۔ آج کل ہندوستان ، چونکہ ایک انتشاری اور امتحانی دور سے گزر رہا ہے ، اسلئے ہمارے زیادہ شاعر اپنی شاعری میں وقت کے ضروری اور اہم مسائل کو سمو رہے ہیں ۔ وہ اپنی شاعری سے بھی صور کا کام لینا چاہتے ہیں ۔ ان میں سے اکثر پر عورت سوار نہیں ہے ! ——— خصوصاً وہ شاعر جن کا تعلق ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند گروپ سے ہے ۔ ان کے یہاں تو عریانی دور تک نظر نہیں آتی ۔ بعضوں کے یہاں تو رومان تک کا فقدان ہے ۔ وہ سب کے سب زندگی کی تلخ اور ٹھوس حقیقتوں کو بے نقاب کرتے ہیں ۔ فیض اگرچہ جدید شاعروں میں ایک بڑے مرتبے کا مالک ہے ۔ لیکن اس کے یہاں عریانی کا شائبہ بھی نہیں ہوتا ۔ ایک دور وہ ضرور تھا ۔ جب وہ رومان کے چمن زاروں میں بھٹک رہا تھا ۔ لیکن پھر رومان و حقیقت کے سنگم پر آ گیا ۔ اور آخر میں زندگی کی تلخ اور ٹھوس حقیقتوں کو بے نقاب کرنے لگا ۔ یہی حال احمد ندیم قاسمی کا ہے ، کہ وہ عرصے تک رومان کی دنیا میں رہا ۔ لیکن ادھر آ کر اس کی شاعری بالکل ایک دوسری راہ پر چلنے لگی ——— علی جواد زیدی ، علی سردار جعفری ، مخدوم محی الدین جاں نثار اختر اور جذبی تو اپنی شاعری میں زندگی کے ضروری اور اہم مسائل کو پیش کرنے کے سوا اور کچھ جانتے ہی نہیں ——— وہ تو عورت تک کا تذکرہ کم کرتے ہیں ۔ نئے شاعروں میں یوسف ظفر ، قیوم نظر ، اختر الایمان اور منیب الرحمٰن کے یہاں بھی بڑی سنبھلی ہوئی کیفیت ہے ۔ ان کی شاعری میں بھی کوئی بے راہ روی نظر نہیں آتی ۔ اگرچہ ان کی شاعری میں بھی داخلی عنصر غالب ہے ، لیکن وہ کسی جگہ بہکتے نہیں ——— پھر بھی جدید شاعری کی عریانی کے خلاف ایسا ہنگامہ ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی ——— !!

کنہیالال کپور

خارستان

ایک سیاح نے جو حال ہی میں جزیرہ خارستان سے لوٹا ہے۔ اس جزیرہ کے متعلق چند ایسے انکشافات کئے ہیں جو سندباد جہازی کے سفرناموں سے زیادہ سنسنی خیز اور الف لیلیٰ کی کہانیوں سے زیادہ ہوشربا ہیں۔ یہ سیاح لکھتا ہے کہ خارستان ہندوستان کے ساحل سے پندرہ سو میل کے فاصلہ پر بحر ہند میں ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے۔ اس جزیرہ میں صرف دو قومیں بستی ہیں "ہنگم اور بے ہنگم"۔ یہ دونوں قومیں پچھلے ایک ہزار برس سے آپس میں برسرِپیکار ہیں۔ ہنگم قوم کے افراد اپنے دیوتاؤں کی خوشامد کرتے وقت شمال کی طرف منہ کرتے ہیں اور بے ہنگم جنوب کی طرف۔ نیز ہنگموں کو بینگن کا بھرتہ پسند ہے اور بے ہنگموں کو آلو کا۔ خارستان میں کوئی بے ہنگم اپنی ہتھیلی پر آلو رکھ کر اس بازار یا محلہ میں سے نہیں گزر سکتا جس میں ہنگم رہتے ہیں۔ چند سال ہوئے۔ اس جزیرہ میں بڑا زبردست ہنگم بے ہنگم فساد ہوا۔ جس میں تین ہزار ہنگم مارے گئے اور تقریباً اتنے ہی بے ہنگموں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ایک ہنگم نے ایک عدد بینگن ایک بے ہنگم کے سر پر دے مارا تھا۔

جس وقت کوئی نووارد خارستان کی سرزمین پر قدم رکھتا ہے تو اس کو اہلِ ہنگم یوں مخاطب کرتے ہیں: "اگر آپ نہ ہنگم ہیں نہ بے ہنگم۔ تو ہم آپ کی عزت کرتے ہیں اگر آپ بے ہنگم ہیں تو ہم آپ سے لڑنے کو تیار ہیں۔ اگر آپ ہنگم ہیں۔ تو ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں۔ کہ فوراً بے ہنگموں کے خلاف اعلانِ جنگ کیجئے۔"

خارستان میں پچاس فیصدی لوگ نیم پاگل ہیں۔ لیکن خارستان میں ایک بھی پاگل خانہ نہیں۔ یہ لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ مثلاً ایک نیم پاگل کہتا ہے "بٹیر متبرک پرندہ ہے۔ اس کا گوشت نہیں کھانا چاہئے۔" دوسرا جواب دیتا ہے: "بٹیر کا گوشت بہت لذیذ ہوتا ہے۔ میں ضرور کھاؤں گا۔" چند منٹ آپس میں اس مسئلہ پر تکرار کرنے کے بعد پہلا نیم پاگل دوسرے کے پیٹ میں چھرا گھونپ دیتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے۔ کہ یہ نیم پاگل ایک دوسرے کے گھروں کو (اور کبھی کبھی اپنے گھروں کو) آگ لگا کر تالیاں پیٹنے لگتے ہیں۔

خارستان میں سب سے عجیب المخلوقات انسان "راہنما" ہیں۔ یہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ راہنما جن کی کھوپڑیوں میں دماغ سرے سے غائب ہے اور راہنما جن کی کھوپڑیوں میں دماغ تو ہے لیکن اس کی ساری چولیں ڈھیلی ہیں۔ ہر دو قسم کے راہنماؤں کا شغل "آدم بازی" ہے۔ بٹیروں اور مرغوں کی بجائے یہ لوگ آدمی پالتے ہیں۔ اور ان کو آپس میں لڑا کر اپنے لئے تفریح کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ راہنما بننے کیلئے خارستان میں زیادہ دماغ سوزی کی ضرورت نہیں۔ جزیرہ کے وسط میں ایک عمارت "لال کوٹھڑی" ہے۔ جو شخص اس عمارت کی سیر کر آتا ہے۔ راہنما قرار دیا جاتا ہے۔ چاہے وہ "لال کوٹھڑی" میں جانے سے پہلے کوچوان یا عطار کیوں نہ رہا ہو۔

خارستان کے کھیتوں میں گندم یا دھان کی بجائے سونا۔ چاندی اور جواہرات اگتے ہیں لیکن خارستانی کسانوں کی طبیعت کی افتاد کچھ ایسی ہے۔ کہ وہ ساری کی ساری فصل ہمسایہ جزیروں کو بیچ دیتے ہیں اور اس اقدام کے جواز میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں۔ کہ اگر ہم ان جزیروں کی سرپرستی نہ کریں۔ تو ان کے باشندے بالکل کنگال ہو جائیں۔ خارستان میں زراعتی مشینوں کا استعمال قانوناً ممنوع ہے۔ جو شخص ان مشینوں کے فوائد گنوائے اسے فوراً سنگسار کر دیا جاتا ہے۔ روایت ہے کہ ایک نووارد ایک دفعہ غلطی سے اس جزیرہ میں ایک زراعتی مشین لے آیا اور اسے اس مشین کے ساتھ باندھ کر سمندر میں پھینکوا دیا گیا۔

خارستان میں عورتوں بالخصوص بیویوں کی حالت قابلِ رشک ہے۔ بیشتر خاوند اپنی بیویوں کی عصمت کی پاسبانی اس شدت سے کرتے ہیں کہ انہیں لوہے کے بڑے بڑے صندوقوں میں بند کر دیتے ہیں۔ جہاں وہ ساری عمر چشمِ بد سے محفوظ رہتی ہیں۔ اس جزیرہ میں بہت سی عورتیں گوشت پوست کی بجائے موم کی

ہی ہوئی ہیں۔ ان پر غیر مرد کی نگاہ پڑ جائے تو فوراً پگھل جاتی ہیں۔ خارستانی عورتوں کے منہ میں زبان نہیں ہوتی۔ اس سیاح نے چند عورتوں سے بات چیت کرنے کی کوشش کی مگر اسے پتہ چلا کہ سب کی سب گونگی ہیں۔

خارستان میں سب سے زیادہ نفع بخش تجارت توہمات کی ہے۔ غالباً اس لئے کہ اس کے لئے سرمایہ کی ضرورت نہیں۔ جو شخص توہمات کا بیوپار کرتے ہیں انہیں شعبدہ باز کہا جاتا ہے۔ کاروبار شروع کرنے سے پہلے وہ ایک آدھ شعبدہ دکھاتے ہیں مثلاً کسی چوراہے پر سر کے بل کھڑے ہو جاتے ہیں کوئی اونچے درخت سے سمندر میں چھلانگ لگا دیتے ہیں کسی اڑتے ہوئے پرند کو غلیل کا نشانہ بناتے ہیں۔ شعبدہ بازوں کی دکانیں قابل دید ہیں کسی نے اپنی دکان میں ایک مردہ رکھا ہوا ہے کسی نے کوئی وزنی کتاب یا پتھر کسی نے ایسی تصویر جسے دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ ان دکانوں پر رات دن ہجوم رہتا ہے خریداروں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ کوئی مردے کو سلام کر رہا ہے۔ کوئی کتاب کے چکر کاٹ رہا ہے۔ کوئی تصویر کے سامنے گڑگڑا رہا ہے۔ سماجی لحاظ سے خارستان میں دو جماعتیں ہیں "قصاب" اور "دبیل"۔ قصابوں کا پیشہ ذبح کرنا اور دبیلوں کا ذبح ہونا ہے۔ دبیل ضرورت سے زیادہ سادہ لوح اور شریف واقع ہوئے ہیں۔ ان کی شرافت کا یہ عالم ہے۔ کہ اگر ان کی پیٹھ پر کوڑے بھی برسائے جائیں۔ تو خفا نہیں ہوتے۔ عموماً دبیل بیدا ہونے لئے ہوتے ہیں لیکن مرتے قصابوں کے لئے ہیں۔ ہر قصاب کے گھر دو تالاب ہوتے ہیں۔ ایک خون کا اور دوسرا شراب کا۔ خون کے تالاب میں دبیل لوگوں کی نعشیں تیرتی رہتی ہیں۔ اور شراب کے تالاب میں طوائفوں اور رقاصاؤں کی۔ قصاب لوگ تعداد میں اتنے تھوڑے اور دبیل اتنے زیادہ ہیں کہ تعجب ہوتا ہے۔ دبیل قصابوں سے نجات کیوں نہیں حاصل کر لیتے۔ سیاح کے خیال میں اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ دبیلوں کو ذبح ہونے میں لطف آتا ہے۔

خارستان کی خاص چیز یہاں کا نیلام گھر ہے۔ جہاں ہر اتوار کو روحیں نیلام کی جاتی ہیں۔ نیلام گھر کا مالک "روح فروش" کو حاضرین کے سامنے پیش کرنے کے بعد باآواز بلند کہتا ہے "فلاں ابن فلاں اپنی روح بیچنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے بولی دیجئے" بولی عموماً ڈیڑھ ڈیڑھ سے شروع ہوتی ہے۔ اور ڈیڑھ سو روپے تک جاتی ہے۔ خارستان میں روحوں کی قیمت کچھ اتنی زیادہ نہیں۔ یہ سیاح لکھتا ہے۔ کہ اس نے ایک دفعہ ایک راہنما کی روح صرف سترہ روپے میں خریدی۔

خارستان میں کئی متبرک مقامات ہیں جہاں پاکیزگی کے سوا سب کچھ ہے کئی تعلیمی درسگاہیں ہیں۔ جہاں صرف بربریت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ کئی باغیچے ہیں جن میں کانٹوں کے سوا کچھ نہیں اگتا۔ خارستانی راہنماؤں کا خیال ہے کہ جب تک خارستان میں کافی تعداد میں عبادت گاہیں نہیں بنیں گی۔ خارستان کا شیرازہ پریشان ہی رہیگا سیاح کی رائے میں جب تک خارستان میں بڑے بھاری پیمانے پر پاگل خانے تعمیر نہیں کئے جائیں گے "خارستان" گلستان نہیں بن سکے گا۔

حمیدہ سلطان

غالب کا ایک شعر

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

ابھی ابھی کے دن ہیں، سلطنتِ مغلیہ کی شان و شوکت کی شمع ابھی تک ٹمٹما رہی ہے، حضرت بہادر شاہ ظفر لال قلعے میں اپنی عظمتِ رفتہ کی مٹی مٹائی سی یادگار موجود ہیں۔

دِلّی پر جوبن ہے، چاندنی چوک کی رونق اور جامع مسجد کے جمگھٹے اپنی پوری شان پر ہیں۔ آخری وقت میں دلّی نے سنبھالا لیا ہے، ہر فن مولا اساتذہ اور باکمالانِ فن یہاں موجود ہیں۔

گلشنِ شعر و ادب ذوقؔ، مومنؔ اور غالبؔ کے دم سے ہرا بھرا ہے۔ دیارِ دلّی میں علم و فن کی جمنا لہریں لے رہی ہے، جو کوئی پیاسا آ نکلتا ہے، سیراب ہو کر جاتا ہے۔

عمائدین اور امراء کے دیوان خانے فردوسِ ارم پر چشمک زن ہیں۔ وہ دیکھئے، نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّرؔ رخشاں کے دیوان خانے "بیت الضیا" میں اس وقت کیسی بہار آ رہی ہے۔

گرمیوں کا موسم ہے، آفتاب ابھی ابھی غروب ہوا ہے، دونوں وقت مل رہے ہیں۔ نواب صاحب ابھی خس خانے سے باہر نکلے ہیں۔ بہت خوبرو اور جامہ زیب ہیں، گلے میں سفید شبنم کا کرتا ایسا معلوم ہو رہا ہے گویا چنبیلی کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہو، ایک بر کا سفید نین سکھ کا زیر جامہ ہے، بائیں ہاتھ میں عقیق کی سمرن ہے، دائیں ہاتھ کی انگلی میں بیش قیمت ہیرے کی انگشتری جگمگا رہی ہے، لباس سے عطرِ خس کی لپٹیں چلی آ رہی ہیں۔ صحن میں سقوں نے اس قدر چھڑکاؤ کیا ہے، کہ بارش کا دھوکا ہوتا ہے، تپتی ہوئی زمین پر پانی پڑا ہے، تو سوندھی سوندھی خوشبو اٹھ رہی ہے، نواب صاحب چاندی کے پایوں کی بیچ بندوں سے کسی ہوئی پلنگڑی پر بیٹھ گئے ہیں، خادمانِ باادب نے جلدی سے مرصّع کام کا پیچواں سامنے لگا دیا ہے سیاہ مخمل کی چوگوشیہ ٹوپی پاس لا کر رکھ دی ہے، ایک صندلی پر پلنگڑی کے قریب چنگیر میں گلاب اور موتیا کے پھول رکھ دیے گئے ہیں، چوکوں پر اُجلی براق چاندنی کا فرش ہے، اس پر سفید سوزن کاری کام کی سوزنی بچھی ہوئی ہے، چاروں جانب گاؤ تکیے لگے ہوئے ہیں، گلاب اور موتیا کی خوشبو سے ہوا مہکی ہوئی ہے۔

شام ہوتے ہوتے نواب صاحب کے احباب کی آمد شروع ہو گئی، سب سے قبل اُستاد میرن جانؔ دلّی کے مشہور کنجوس وارد ہوئے، ان کے بعد نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ مفتی صدرالدین خاں آزردہ اور مولانا صہبائی یکے بعد دیگرے پہنچے۔

اُستاد میرن خان کی کنجوسی کی داستانیں محفلوں کی جان تھیں، دوست احباب ان کی کنجوسی کے افسانے سنتے اور کہتے تھے، اور استاد بگڑ بگڑ کر سب کو صلواتیں سناتے تھے۔ چنانچہ اس وقت بھی نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے بیٹھتے ہی استاد کو چھیڑا۔

"کہو بھئی میرن۔ کنجوسی کا کوئی اور نیا طریقہ بھی سوچا؟"

اُستاد میرن جان خلافِ عادت بہت سنجیدگی سے بولے "جی ہاں"۔

مولانا صہبائی نے تبسم آلود لہجے میں کہا "ہم بھی تو سنیں"

اُستاد میرن جان بولے۔ "سنئے حضرت۔ پرسوں ایک صاحب میرے گھر پر بیٹھے مولی نوش فرما رہے تھے، اور ساتھ ہی میری کنجوسی کے متعلق استفسار بھی فرماتے جاتے تھے، اُنہوں نے مولی کے جو پتے توڑ پھینکے تھے میں نے صاف کر کے دھو لئے اور کھا گیا، وہ حیران رہ گئے۔ اور میں نے کہا۔ حضور۔ روپیہ یوں جمع کیا جاتا ہے۔"

اُستاد کے بخل کی یہ حیرت انگیز داستان سن کر تمام اصحاب ہنس پڑے، اور محفل کشتِ زعفران بن گئی۔

نواب ضیاء الدین احمد خاں نے کہا "بھائی میرن۔ تمہاری کنجوسی کا شہرہ ایک دن حاتم کی سخاوت کی شہرت کو بھی مات کر دے گا۔ اور دنیا کے تمام کنجوس تم کو اپنا استاد مان لیں گے۔"

نواب مصطفیٰ خاں" اُن سے ملاقی اس مرتبہ تو ہار و جا کر رہ ہی گئے"

نواب ضیاء الدین احمد خاں :۔ "خط اُن کا پرسوں آیا ۔ اس میں انہوں نے لکھا ہے ، آئیندہ ہفتے تک آنے کا ارادہ ہے۔"

مفتی صدر الدین آزردہ :۔ "شاید مشاعرہ کی شرکت کے لئے آ رہے ہوں گے "۔

استاد میرن جان :۔ "کہاں مشاعرہ ہے ؟ ہمیں تو خبر بھی نہیں ۔ اور یہ مشاعرہ کون ہے ؟"

مفتی آزردہ :۔ "حکیم احسن اللہ خاں اِس مشاعرے کو ترتیب دے رہے ہیں ، کیوں بھائی نیر ۔ آپ تو تشریف لے جائیں گے نا ؟"

نواب نیر :۔ "نہیں بھائی ۔ میں نے تو اب مشاعروں میں نہ جانے کا عہد کر لیا ہے ، گذشتہ مہینے منشی فیض پارسا کے ہاں اجمیری دروازے والے مشاعرے کا اشتعال ابھی بھولا نہیں ، آپ اُن دنوں میرٹھ میں تشریف رکھتے تھے ، پناہ بخدا ۔ مشاعرہ تھا یا آفت !"

مفتی آزردہ :۔ "ہاں ۔ میں نے آکر یہ بات سنی تھی ، خیر ۔ سنی تھی ، حکیم آغا جان عیش نے میدان جنگ گرما کر حضرت غالب کی ہجو سنائی تھی ، لیکن پورا واقعہ نہیں سنا"

نواب شیفتہ :۔ "ارے بھائی آزردہ ۔ وہ تو یہ غنیمت سمجھئے کہ مصرعِ طرح میں "تیاں" ہی تھیں ، اگر لاٹھیاں ہوتیں تو شاید کشتوں کے پشتے لگ جاتے ۔ یہ ساری کارستانی استاد ذوق کی ہے ۔"

مولانا صہبائی :۔ "استاد ذوق اپنی ذات سے ایسے نہیں ہیں۔ سارا کیا دھرا اُن لوگوں کا ہے ، جن کو لڑائی کرانے میں لطف آتا ہے ، حضرت غالب نے کسی مشاعرے میں جانے کی اب قسم کھالی ہے ، اس لئے اب ہم لوگ بھی نہیں جائیں گے ، بھائی شیفتہ ۔ کیا آپ اس مشاعرے میں تشریف لے جائیں گے ؟"

نواب شیفتہ :۔ "ارادہ تو میرا بھی ، بھائی ، جانے کا نہیں تھا لیکن حکیم صاحب کے اصرار سے استاد[1] نیم رضی ہو گئے ہیں ، بھلا جب استاد جائیں تو میں کیسے انکار کر سکتا ہوں ، لیکن حضرت غالب کے بغیر مشاعرے کی رونق آدھی رہ جائے گی ، اور اساتذہ فن کو بالکل لطف نہ آئے گا۔"

مفتی آزردہ :۔ "دراصل مشاعروں کی جان یہ تینوں[2] حضرات ہیں۔ اور اُن کا باہمی فنکارانہ چشمک حاصل مشاعرہ ہوا کرتی ہے۔"

نواب نیر ۔ "معاصرین کی باہمی نوک جھونک تو بجائے خود ایک دلچسپ چیز ہے ، لیکن منشی فیض پارسا کے ہاں عیش نے ہجو کو بیچ میں لا کر سارا مزا کرکرا کر دیا ، اور اس پر لطف یہ کہ استاد ذوق کے چہیتے شاگرد حافظ ویران بگڑ بیٹھے ، اور اُن کا بگڑنا خدا کی پناہ ! اندھے ہیں تو کیا ، آنکھوں والوں کے استاد ہیں ۔ پھر اندھے کی مار کی داد نہ فریاد"

نواب شیفتہ ۔ "دراصل چند کم ذوقوں کی بدولت مشاعرے پہلوانوں کے اکھاڑے ہو گئے ہیں ۔ یہ لال قلعے والے چاہتے ہیں ، کہ استاد ذوق کو سارے دنیا مانے ۔ مومن خاں اور مرزا غالب کو سب بھول جائیں ۔

نواب نیر :۔ (جوش بھری آواز میں) "یہ ممکن نہیں ، غالب انشا اللہ سب پر غالب رہے گا ، موجودہ زمانے میں اگر غالب کی کوئی قدر نہ کر سکا ، تو آنے والی نسلیں اس کو سمجھیں گی ، ذوق کا کلام آسان اور عام فہم ہے ، لیکن حق شاعری غالب نے ہی ادا کیا ہے ۔ غزل کے محدود میدان میں فلسفیانہ مضامین کو ادا کرنا ذوق کے بس کی بات نہیں ، میر کے کلام میں بہتر نشتر ہیں ، لیکن غالب کا ہر شعر ایک نشتر ہے ، جو رگ دل سے خراجِ تحسین حاصل کرتا ہے ۔ ابھی جو مرزا نے ایک غزل کہی ہے ، ہائے کیا خوب ہے ، میں نے نذیر خاں قوال کو یاد کرا دی ہے سنتا ہوں اور سر دھنتا ہوں"

نواب شیفتہ :۔ "مرزا کا کلام سننے کا مزا خود اُن کے منہ سے ہے ، لیکن اُن کو عارف کی جوانمرگی نے ایسا از خود رفتہ کر دیا ہے ، کہ اپنے اشعار سناتے ہیں تو رونے لگتے ہیں"

مفتی آزردہ :۔ "عارف کی جوان موت تو غیروں کو خون کے آنسو رلاتی ہے ، مرزا کا تو وہ چہیتا بھانجا اور محبوب شاگرد تھا ۔ ہائے عارف کی خوش کلامی ، عارف کی علمی و ادبی قابلیت ، کمبخت موت نے جوانی کا کیسا لہلہاتا باغ لوٹا ہے"

مولانا صہبائی ۔ "مرثیہ بھی عارف کا حضرت غالب نے ایسا لکھا ہے

[1] حکیم مومن خاں

[2] مومن ۔ ذوق ۔ غالب

جس کے لفظ لفظ سے وہ محبت و خلوص ٹپکا پڑتا ہے جو ان کو عارف کے ساتھ تھا۔"

نواب شیفتہ :۔ "یہ مرثیہ اُردو ادب میں لافانی چیز ہے، ہائے! کس قدر حسرت بھرا شعر ہے ؎

تم کون سے ایسے تھے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور"

نواب نیر :۔ "میری اور عارف کی معاصرانہ چشمک کو کس خوبی سے بیان کیا ہے ؎

مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور"

مفتی آزردہ :۔ "عارف کی جوانمرگی کا داغ تو ہم سب کے دلوں پر تازیست رہے گا۔ لیکن بھائی نیر۔ مرزا کی تازہ غزل سنوائیے۔"

نواب نیر :۔ "ارے کوئی ہے! وزیر خاں کو بلاؤ۔"

چند لمحوں کے بعد وزیر خاں قوال حاضر ہو کر آداب بجا لاتا ہے اور ہاتھ باندھ کر دریافت کرتا ہے "کیا حکم ہے عالیجاہ!"

نواب نیر :۔ "وزیر خاں۔ حضرت غالب کی وہ غزل سناؤ جو ہم نے تم کو پرسوں یاد کرائی ہے۔"

وزیر خاں "بہت خوب" کہہ کر بیٹھ جاتا ہے، سازندے ساز ملاتے ہیں اور وزیر خاں تھوڑی دیر تان سر ٹھیک کرنے کے بعد دھیمی اور پرسوز آواز میں موثر انداز سے گاتا ہے ؎

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

حاضرین جھوم رہے ہیں، اور واہ واہ کی صدائیں بے اختیار سب کے لبوں پر ہیں۔ ایک عالمِ وجد طاری ہے، کلام کی تاثر آفرینی نے مجمع کو بے خود کر دیا ہے، وزیر خاں نے ذرا آواز کھینچ کر دوسرا شعر ادا کیا ؎

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

نواب نیر :۔ "دیکھا بھائی کس غضب کا شعر ہے۔"

مفتی آزردہ :۔ "ہائے، کیا نرالا انداز ہے، اور کتنا دلکش تخیل۔"

وزیر خان نے تیسرا شعر دلآویز سروں میں گایا ؎

کھیل سمجھا ہے، کہیں چھوڑ نہ دے، بھول نہ جائے
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

سب کے منہ سے بے اختیار نکل گیا "کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے"

نواب شیفتہ :۔ "اُف، کیا بے مثل خیال اِس شعر میں پیش کیا گیا ہے، یہ شاعری نہیں اعجاز ہے اعجاز!"

وزیر خان نے اونچی آواز سے چوتھا شعر گایا ؎

غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے، تو چھپائے نہ بنے

اس پر پھر مصطفیٰ خان بے خود ہو گئے، وزیر خاں نے پانچواں شعر کہا ؎

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

مفتی آزردہ نے جھوم کر کہا "یہ غالب ہی کا حق ہے، ؎

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

اُف، کس غضب کا شعر ہے، پھر کہو۔"

وزیر خان نے شعر دہرایا۔ اور پھر ہلکی آواز سے چھٹا شعر ادا کیا ؎

موت کی راہ نہ دیکھوں؟ کہ بن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں؟ کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

اِس شعر پر واہ وا کا شور بلند ہوا، جب ذرا سکون ہوا تو وزیر نے مطلع دہرایا، اور پھر یہ شعر دلکش لَے سے گایا ؎

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

استاد میرن جان بولے :۔ "وزیر خان۔ مصرعِ اولیٰ ذرا دہرانا۔"

وزیر خان نے مسکرا کر شعر پھر ادا کیا۔ تو استاد میرن جان نے طنزیہ لہجے میں کہا :۔ "ارے بھئی، اس کلام کی تم تعریف کر رہے ہو جو بالکل مہمل ہے، بھلا اس مصرع کے کیا معنی ہوئے ع

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اُٹھے!

جو بوجھ گرنے کے بعد اُٹھ نہیں سکتا، وہ سر پہ آ کیسے گیا۔ معلوم ہوتا

ہے، اطرابی کے نشے میں یہ بے تکی ہانک مرزا صاحب نے لگائی ہے، اور آپ سب صاحبان اعتقاد اُن کے مداح ہیں، کہ شعری نقص بھی نہیں دیکھتے، بس مدح سرائی کئے جاتے ہیں۔ اسی مہمل انداز نے غالب کی شاعری کو عوام کی نظروں میں گرا دیا ہے۔"

میرن جان کی اس تنقید پہ مجمع کا تمام جوش ٹھنڈا پڑ گیا، چند لمحے سب خاموش رہے، پھر نواب ضیاء الدین احمد خان بولے "بہتر ہوگا کہ اسی وقت حضرت غالب سے اس شعر کا مطلب دریافت کرایا جائے۔"

مفتی آزردہ: "یہ ٹھیک ہے۔"

اُستاد میرن جان نے نواب شہاب الدین خان ثاقب خلف اکبر نواب ضیاء الدین احمد خان سے، جو اس وقت بالکل نو عمر تھے۔ اور بزرگوں کی اس محفل میں مؤدب دو زانو ایک جانب گوشے میں بیٹھے تھے، کہا "میاں ثاقب، اِدھر تو آؤ، دیکھو، مرزا صاحب کے پاس میرا پیغام لے جاؤ، کہنا، اُستاد میرن جان نے دست بستہ آداب عرض کیا ہے، اور کہا ہے کہ حضور اس مصرع کے معنی تو سمجھا دیجئے ع

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے

جو بوجھ گرنے کے بعد پھر نہیں اُٹھ سکتا، وہ پہلے سر پر رکھا کیسے گیا تھا؟"

ثاقب حضرت غالب کی خدمت میں حاضر ہوئے، وہ اس وقت شغل مے نوشی میں مصروف تھے، اور پرسوز لحن میں اپنی اسی غزل کے مقطع کو گنگنا رہے تھے ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

اُنہوں نے بادب عرض کیا "قبلہ و کعبہ، آپ کی یہ غزل وزیر خان قوال گا رہا تھا، اور سب پر عالم وجد طاری تھا، مگر ساقی شعر کے مصرع اولیٰ پر استاد میرن جان نے اعتراض کیا۔ وہ کہتے ہیں، یہ بالکل مہمل ہے، اُنہوں نے مجھے اس مصرع کے معنی دریافت کرنے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے، وہ دریافت کرتے ہیں کہ جو بوجھ سر سے گرنے کے بعد پھر سر پر رکھا نہیں جا سکتا وہ پہلے سر پر کس طرح آ گیا تھا۔"

حضرت غالب نے قہقہہ لگا کر کہا "اس بڈھے سے کہنا خبطی کنجوس، تو روپیہ جمع کرنے کی فکر کر، اسی کے نکات و رموز سیکھ۔ استادانِ فن کے معاملاتِ شعری سمجھنے کی تجھ کو کیا ضرورت پیش آئی۔ یہ ذرا سی بات تو نہ سمجھ سکا، ایک تیلن تیل لئے جا رہی ہے، تیل کا کپا قدم کی لغزش سے سر سے ڈھلک کر نیچے آ رہا، تیل تمام بہ گیا۔ تو اب وہ غریب تیلن تیل کس طرح سمیٹے گی (ایک دم سنجیدہ ہو کر) میرا عارف مر گیا، میری مثال اس تیلن کی سی ہے جس کا تیل گر چکا ہے، نہ وہ گرا ہوا تیل سمیٹ سکتی ہے، نہ میں دوبارہ عارف کو پا سکتا ہوں ؎

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور"

اویس احمد ادیب

ریڈیائی ڈرامے اور اُنکا فنی تجزیہ

ہندوستان میں ریڈیو کی ابتدا نے دنیائے ڈراما نگاری میں زبردست انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ ایک ایکٹ کے ڈراموں کا ابھی آغاز ہی تھا۔ کہ ریڈیو کی دلفریب اور مسحور کن آوازوں نے "اُردو دنیا" کے ڈراما نگاروں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اسٹیج کے طویل یعنی پانچ ایکٹ کے ڈرامے ابھی "میلوڈراما" کی حدود بھی نہ طے کرنے پائے تھے۔ کہ پردۂ سیمیں کی نظر فریبی نے اُن کو اپنا دلدادہ بنا لیا تھا۔ بعینہٖ یہی حال ایک ایکٹ کے تمثیلی ڈراموں کا ہوا۔ اسٹیج کے ایک ایکٹ کے ڈرامے اپنے تخلیقی دور سے گذر رہے تھے۔ کہ پردۂ سیمیں نے انکو اپنانا شروع کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک ایکٹ کے ڈرامے پردۂ سیمیں کے لئے کھیلے جانے لگے۔ مگر نشری ضروریات نے ڈراما نگاروں کو اپنی طرف رجوع کر کے اُردو کے ڈراما نگاروں کے لئے ایک نیا "رخ" پیش کیا۔ حالانکہ ظاہرا طور پر ریڈیو کے لئے ڈراما لکھنا اور اس کا نشر کرنا کوئی دشوار امر نہیں معلوم ہوتا مگر اس کی طرف متوجہ ہونے کے بعد یہ حقیقت بے نقاب ہوتی ہے۔ کہ ایک ایکٹ کا نشری ڈراما لکھنا۔ اسٹیج اور پردۂ سیمیں کے لئے ایک ایکٹ کے ڈرامے ضبطِ تحریر میں لانے سے زیادہ دشوار ہوتا ہے۔ گو ریڈیو سے کسی ڈراما نگار کے ڈرامے کا نشر ہونا اپنے اندر بڑی جاذبیت، کشش اور دلفریبی رکھتا ہے مگر اس جاذبیت میں جو دقتیں اور دشواریاں پوشیدہ ہوتی ہیں وہ اس وقت منہ کھول کر سامنے آتی ہیں جب کوئی ڈراما نگار نشری ضروریات کو پیشِ نظر رکھ کر ایک مکمل ڈراما لکھنے کی کوششیں کرتا ہے۔ اسٹیج کی ضروریات کو پیشِ نظر رکھ کر ڈراما آسانی کے ساتھ لکھا جا سکتا ہے پردۂ سیمیں کے ایک ایکٹ کے ڈرامے میں صرف سینیریو کی تکمیل میں دقتیں پیش آتی ہیں مگر جب ریڈیو کے لئے نشری ضروریات کے ماتحت ڈراما لکھا جاتا ہے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اسٹیج اور اسکرین کی دقتیں اس کی دقتوں کے مقابلہ میں گرد ہیں۔ اسٹیج اور اسکرین کی فنی خوبیاں نشری ڈرامے کی فنی خوبیوں سے علیحدہ ہوتی ہیں۔ فنی خوبیوں سے مراد ریڈیو ٹکنیک ہے۔ کیونکہ ریڈیائی ڈراما فنی ضروریات کا تابع ہوتا ہے۔ ٹکنیک کو ڈرامے کا تابع نہیں بنایا جا سکتا۔

ہندوستان کی ریڈیائی دُنیا میں اگر بہترین شاہکار تلاش کئے جائیں تو کافی تعداد میں مل جائیں گے۔ کیونکہ کچھ عرصہ سے آل انڈیا ریڈیو کے مختلف اسٹیشنوں سے ہندوستان کے بہترین ڈراما نگار ڈرامے نشر کرا رہے ہیں۔ ریاستوں میں نشرگاہ لاسلکی سرکارِ عالی حیدرآباد دکن معیاری ڈرامے پیش کرنے میں کوشاں ہے۔ یہ دور ہندوستان کے ریڈیائی ڈراموں کا ابتدائی دور ہے۔ گو انہوں نے اس قلیل مدت میں کافی کامیابی حاصل کر لی ہے مگر یہ ابھی اطمینان بخش نہیں۔ ممالکِ غیر کے ریڈیائی ڈراموں پر جب غور کیا جاتا ہے۔ اور ان کے معیار کا ہندوستان کے ریڈیائی ڈراموں کے معیار سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ڈرامے ابھی تشنۂ تکمیل ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ "موضوع" اور "فن" کی حیثیت سے ابھی اس قدر بلند پایہ نشری ڈرامے نہ لکھے جا سکے کہ وہ ہندوستان کو ریڈیائی دنیا کی بہترین پیداوار کہلا سکیں۔ پھر بھی گذشتہ چند سال میں انہوں نے جو تدریجی ترقی کی ہے وہ اس کے امید افزا مستقبل کی آئینہ دار ہے۔ فنی حیثیت سے ان میں سقم ضرور ہیں۔ مگر نقشِ اول کی حیثیت سے وہ نظرانداز کر دینے کے قابل ہیں۔ نظرانداز کر دینے سے یہ مقصد نہیں۔ کہ ان غلطیوں کی اصلاح نہ کی جائے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ ابتدائی دور کی یہ کوششیں مستحسن ہیں۔ مگر ان تسکین بخش جملوں سے مطمئن ہو کر اپنی آئندہ ترقیوں کو محدود کر دینا نقصان دہ ہوگا۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ بہترین فنی ایک ایکٹ کے ڈرامے لکھے جائیں۔ اور ان میں ہندوستانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو انتہائی حسن و خوبی کے ساتھ پیش کیا جائے۔ ہندوستانی ریڈیائی ڈراموں کی ابھی نہ تو کوئی مبسوط تاریخ لکھی جا سکتی ہے اور نہ اس کی ٹکنیک کے متعلق سخت ترین قواعد بنائے جا سکتے ہیں۔ یہ مغربی ایجاد ہے اور مغرب سے ہمیں ملی ہے اسلئے

ہے اس کے مغربی اصولوں کو اپنی ضروریات اور اپنے ماحول کے مطابق بنانا ہوگا۔ اگر انہیں اپنانے اور ان میں مقامی رنگ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی گئیں۔ تو وہ ہندوی پیدائش رکھنے کے بعد بھی غیر ملکی ہی محسوس ہوں گے۔ ان میں "وطنیت اور قومیت" کہیں بھی ظاہر نہیں ہو سکتی۔ فی الحال ہندوستانی ریڈیائی ڈراما نگار کو اپنے اوپر چند پابندیاں عاید کر لینا پڑتی ہیں۔ انہی کو اگر ایک ایکٹ کے ریڈیائی ڈراموں کے فنی قوانین کہہ دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

تماشائی یا سامعین

ریڈیائی ڈراما نگار کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ڈراما لکھنے سے پہلے یہ سوچے کہ وہ کن لوگوں کے لئے ڈراما لکھ رہا ہے۔ اسٹیج کے لئے ایک ایکٹ کا ڈراما لکھتے وقت ڈراما نگار کو اس کا پورا احساس ہوتا ہے۔ کہ وہ ایسے لوگوں کے سامنے اپنی ڈرامائی کوششوں کو منظرِ عام پر پیش کریگا۔ جو اپنی آنکھوں سے اُسے از ابتدا تا انتہا اسٹیج پر دیکھیں گے۔ اداکار اپنی اداکاری سے اس کے مفہوم کو تماشائیوں کے ذہن نشین کر دیں گے۔ ناظرین ڈراما کو دیکھ اس کی قدر و قیمت کا خود بخود اندازہ لگالیں گے۔ ڈراما نگار اسٹیج پر اپنے ڈرامے کو پیش کر کے اس کے معائب و محاسن کا فیصلہ تماشائیوں پر چھوڑ دیتا ہے۔ کیونکہ ان کے پیشِ نظر ہر چیز ہوتی ہے۔ وہ اس کو مجموعی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور جو اثرات مرتب ہوتے ہیں ان کا احساس بھی کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اسٹیج کے لئے ڈراما لکھتے وقت ڈراما نگار کے تخیل میں اس کے تماشائی ہوتے ہیں۔ وہ اُن کی ضرورت سے آگاہ ہوتا ہے۔ ان کے رجحانات اُسے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ان کا اندازہ لگا کر ایسے منظر پیش کرتا ہے جو اُن کی دلچسپیوں کا مرکز بن جاتے ہیں۔ تماشائی کی آنکھیں خود مسحور ہو کر اس کی تمام تر قوتوں کو ڈراما کی طرف رجوع کر دیتی ہیں۔ دردناک مناظر پیش کر کے وہ اپنے ناظرین سے اشک عقیدت حاصل کر سکتا ہے۔ ایسے طربیہ مناظر پیش کر کے وہ ان سے خراج تحسین حاصل کر سکتا ہے۔ جس سے ان کی روح میں بالیدگی پیدا ہو جائے۔ مزاحیہ سین پیش کر کے وہ اپنے تماشائیوں کو زیر لب مسکراہٹ کے لئے ہی نہیں بلکہ قہقہہ لگانے پر مجبور کر سکتا ہے۔ یہ تمام انقلابات اسٹیج سے ڈراما نگار کے جادو نگار قلم کی سحر کاری کا نتیجہ ہو سکتے ہیں مگر اس میں اداکاری، مکالمہ، منظر، اور روشنی کے مجموعی اثرات بھی شامل ہوتے ہیں۔ غرض ڈراما نگار اپنے تماشائیوں سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ وہ اپنے ڈرامے کے ذریعہ سے ان کے دل و دماغ پر چھا کر اُن کی زبان سے اپنے ڈرامے کی خوبیاں منوا لیتا ہے۔ وہ بعض اوقات تماشائیوں کو ذھکہ کی (Suspense) میں مبتلا کر دیتا ہے اور بعض اوقات ان کے جذبات میں ہیجانی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ تماشائی اپنے خیالات اور احساسات سے مجبور ہو کر اس کی ہمنوائی کرنے لگتے ہیں۔

ناظرین ڈراما نگار کی نظر میں مجموعی حیثیت (Collectively) سے رہتے ہیں۔ وہ اپنے تصور میں وہ منظر پیدا کرتا ہے جہاں سیکڑوں تماشائی انفرادی حیثیت سے آ کر جمع ہوتے ہیں — کسی تھیٹر — کسی ڈراما ہال میں — کسی سینما ہال میں — وہ سب مجموعی حیثیت سے ایک اکائی بن جاتے ہیں یعنی ان میں سے ہر ایک کی انفرادیت، اجتماعیت میں مدغم ہو جاتی ہے۔ وہ ایک گروہ کی شکل میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اس کے نزدیک وہ شخصیت کے مالک نہیں رہتے وہ سب کو یکساں تصور کر کے سب کے لئے ایک ہی ڈراما پیش کرتا ہے۔ اس کے خیال میں سب کی ذہانت، قابلیت، طباعی اور مرتبہ وغیرہ میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ڈرامے کی تخلیق کے وقت اس کے ذہن میں تماشائیوں کی تعداد بھی رہتی ہے۔ کتنا بڑا ہال ہوگا؛ کتنے تماشائی بیک وقت اس کو دیکھ سکیں گے؟ پانچسو، ایک ہزار، دو ہزار . . . . . وغیرہ وغیرہ۔ میرا مقصد ایک ایسی تعداد سے ہے جو اس کے ذہن میں بآسانی آ سکتی ہے۔ مگر ریڈیائی ڈراما نگار کے لئے یہ صورتیں قطعاً سودمند نہیں ہو سکتیں۔ جہاں ڈرامے کے ساتھ "ریڈیو" کا لفظ متعلق ہوا۔ تمام صورتیں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

ریڈیائی ڈراما نگار کے لئے "تماشائی" یا "ناظرین" "سامعین" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کے لئے وہ ڈراما لکھتا ہے وہ اس کو دیکھ نہیں سکتے۔ نہ تو ڈراما نگار اُن کی نظروں کے سامنے ہوگا۔ نہ اداکار ان کو نظر آئیں گے۔ اور نہ وہ اداکار کے منہ دیکھ سکیں گے۔ نہ سین اور سینریاں ان تک پہنچ سکیں گی۔ ریڈیو کے سامعین صرف آوازیں سن سکیں گے۔ یہ "سامعین" انفرادی حیثیت اور انفرادی شخصیت کے مالک رہیں گے۔ اُن کی اجتماعیت انفرادیت میں تبدیل ہو جائے گی۔ وہیں

پانچ آدمی اگر کسی ریڈیو سٹ کے سامنے بیٹھ کر کوئی ڈراما سن سکیں یا کسی خاص وقت کسی خاص مقام پر یکجا ہو کر ڈراما سنیں، تو اس صورت میں بھی ان کی حیثیت ڈراما نگار کے لئے انفرادی ہی ہو گی کیونکہ اس کا تخیل ان کو مجموعی حیثیت سے کسی سنیما ہال یا تھیٹر ہال میں جمع ہو کر ڈراما سننے کے خیال سے نہیں پیش کر سکتا۔ یہ اجتماعیت بھی اس کے نزدیک انفرادیت ہی رہتی ہے۔ یہ درست ہے کہ بعض مقامات پر اس قسم کے اجتماع اکثر دیکھے گئے ہیں مثلاً کانپور، جیسے مزدوروں کے شہر میں ہر ویلفیئر سنٹر قائم ہیں۔ وہاں سرکاری ریڈیو سٹ مزدوروں کی دلچسپی کے لئے لگائے گئے ہیں۔ گورنمنٹ کے دیہی شعبوں نے دیہاتوں میں ایسے سنٹر قائم کئے ہیں جہاں بیٹری کے ریڈیو سٹ پر نزدیک کے دیہاتوں اور گاؤں کے لوگ جمع ہو کر ضروری خبریں اور دیہاتی پروگرام سن سکیں مگر ریڈیائی ڈراما نگار کے پیش نظر ان کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ شہروں میں کافی ہاؤس ہوٹل، دوکانیں، کلب وغیرہ ایسے مقامات ہیں جہاں ریڈیو سٹ اکثر لگے ہوئے ملتے ہیں۔ وہ جہاں نادار اور مفلس ریڈیو کے شیدائی جمع ہو کر اپنی ریڈیائی تشنگی دُور کرتے ہیں۔ مگر ریڈیائی ڈراما نگار ان کو بھی کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ مطلب یہ ہے کہ ریڈیو ڈراما نگار کے لئے ریڈیائی سامعین کی حیثیت انفرادی ہی ہوتی ہے۔ وہ سامع خواہ دس روپیہ سالانہ لائسنس پر خرچ کر کے پانسو روپیہ کا سیٹ اپنے گھر میں لگائے یا بغیر پیسہ صرف کئے کہیں بیٹھ کر یا کسی دوکان کے سامنے کھڑے ہو کر ڈراما سن لے۔ اُسے اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

انفرادیت سے یہ مقصد نہیں کہ ریڈیو کے سامعین کی تعداد کم ہوتی ہے۔ "تعداد" کا تعین کسی طرح بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ایک وقت میں کتنے اصحاب ایک ڈراما ریڈیو سے نشر ہوتے ہوئے سنتے ہیں، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کسی ڈراما نگار کے شیدائیوں کی تعداد بھی متعین نہیں کی جاسکتی۔ اسٹیج اور پردۂ سیمیں کے ایک ایکٹ کے ڈراما کے تماشائیوں کی تعداد ہال کی گنجائش کا اندازہ لگا کر ایک وقت بتائی جاسکتی ہے۔ مگر ریڈیائی ڈراما نگار کے سامعین کسی طرح گنے نہیں جاسکتے۔ ایک وقت میں دس ہزار آدمی بھی اس کا ڈراما سننے والے سامعین بن سکتے ہیں اور دوسرے وقت صرف پانچ یا چند آدمی اس کا ڈراما سن سکتے ہیں یعنی کبھی سامعین کی تعداد غیر معمولی طور پر زیادہ ہو جاتی ہے۔ اور کبھی کم اور کبھی اوسط پر آکر ٹک جاتی ہے۔ اس وجہ سے یہ طریقہ وضع کر لیا گیا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ ریڈیائی ڈرامے کے سامعین لاتعداد ہیں۔ مگر اس اکثریت کے باوجود اُن کی اجتماعی حیثیت کچھ نہیں ہوتی۔ ان کی انفرادی شخصیت کبھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔

اس انفرادیت کی وجہ سے ڈراما نگار ہر فرد کے نزدیک تر پہنچنے کی کوششیں کرتا ہے۔ وہ اپنے ڈراما کو ایسا بنانا چاہتا ہے جس میں ان کا ہر سامع اپنی زندگی کے واقعات محسوس کرے۔ اُسے اپنے دل کی دھڑکنیں اس میں سنائی دیں۔ اُسے اپنی زندگی کی خامکاریاں اس میں نظر آئیں۔ غرض اسے یہ محسوس ہونے لگے کہ یہ ڈراما "شخصی" ہے۔ اس میں اس کی شخصی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ ڈراما نگار کی کامیابی کی دلیل ہوتی ہے اگر وہ ہر سامع کو یہ محسوس کرا دے کہ جو واقعات اس نے پیش کئے ہیں۔ وہ اسے اپنی لہراتی اور بل کھاتی ہوئی زندگی میں پیش آئے ہیں۔ اس خیال کی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ ڈراما نگار کا انداز "شخصی" ہو جاتا ہے اس میں "عمومیت" باقی نہیں رہتی یعنی، اس کے پیش کرنے کا انداز عام نہیں رہتا۔ اس کے نشر کرنے میں بھی فنی تکمیل کے علاوہ یہ خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کہ وہ سامعین کی زندگی کا پرتو ہے۔ یہاں پر ایک غلط فہمی پیدا ہو جانے کا امکان بھی ہے ———— اور وہ یہ کہ ہر سامع یہ تصور کرے کہ ریڈیو کا ہر ڈراما اس کی زندگی کا پرتو ہو گا۔ کسی قدر صحیح نہیں ہے۔ سامعین کی تعداد میں سے اکثریت کی تعداد ایسی ہوتی ہے جن کی زندگی سے اس کا ڈراما مطابقت کرے گا۔ یہ اکثریت کے خیال سے تحریر کیا گیا ہے کیونکہ کوئی اصول اور کوئی قانون اکثریت ہی کو پیش نظر رکھ کر وضع کیا جاتا ہے۔

اسٹیج کے ڈرامے میں تماشائی ڈراما نگار کا مددگار بھی بن جاتا ہے کبھی کبھی ایسے پہلو بھی نکل آتے ہیں کہ ڈراما نگار اپنے ڈراما کے مداح یا حامی یا مددگار یا پسند کرنے والے تماشائیوں کے گروہ میں پیدا کر لیتا ہے وہی کسی خاص تھیٹر یا ڈراما ہال میں اُس کے ڈرامے کو کامیاب بنا دیتے ہیں اور وہ اس طرح کہ وہ خود تالیاں بجا کر ان کی گونج سے دوسروں کو بھی تالیاں بجانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ یہ اپنی طبیعت اور اپنی پسند ہوتی

ہے [illegible] ڈراما [illegible] یا ان کو [illegible] کا شدید [illegible]
پر بے [illegible] ہیں تو [illegible] کی [illegible] کرنے لگتے ہیں۔ وہ اپنی
طبیعت کے بہاؤ کے ساتھ دوسروں کو بھی بہالیجانے کی کوششیں کرتے ہیں۔
مگر ریڈیائی ڈراما نگار کا ایسا کوئی مددگار نہیں ہوتا۔ اس کا کوئی ہمدرد و معاون
نہیں ہوتا۔ وہ اور اس کا ڈراما دونوں پروڈکشن انچارج کے رحم و کرم پر
ہوتے ہیں وہ اگر چاہے تو اُس کے ڈرامے میں چار چاند لگا دے اور اگر
چاہے تو اُسے ملیا میٹ کر دے۔ اُس کے سامعین میں سے کوئی تالیاں
بجا کر اس کی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتا۔ قہقہہ لگا کر بھی کوئی اس کی ہمت
نہیں بڑھا سکتا۔ ان سامعین کے لئے اور ایسے حالات کے ماتحت
ڈراما نگار ریڈیو کے لئے ڈراما لکھتا ہے۔ وہ گویا ادھورے ہتھیاروں سے
دشمنوں کا مقابلہ کرنے کی کوششیں کرتا ہے۔ اس کے سامعین کو اداکاروں
اور ڈراما نگار سے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔ وہ نقاد کی حیثیت سے کان
لگا کر اس کے ڈراما کو سنتے ہیں۔ اور فوراً ہی اپنی رائے ظاہر کر کے اس
کے ڈرامے کی قسمت کا فیصلہ کر دیتے ہیں۔

ریڈیو کا ڈراما ایسا ہونا چاہئے کہ اس سے سامعین کو دلچسپی پیدا ہو
جائے وہ اس کو ادھورا چھوڑ کر نہ اٹھ کھڑے ہوں۔ یا اس سے بد مزہ
ہو کر ریڈیو سیٹ بند نہ کر دیں۔ وہ اس کو دلچسپی کے ساتھ سنیں اور اس
سے استفادہ بھی کریں۔ ڈراما نگار نثری ڈرامہ ضبط تحریر میں لاتے
وقت صرف یہ سوچ سکتا ہے کہ اس کے سننے والے کسی خاص قوم،
مذہب، ملت سے تعلق نہیں رکھتے۔ وہ مختلف اقوام، مختلف مذاہب
اور مختلف گروہوں کے افراد ہوتے ہیں۔ وہ صرف گورے نہیں
ہوتے بلکہ گندمی اور کالے رنگ کے بھی ہوتے ہیں۔ ان میں پڑھے
لکھے اور جاہل بھی شامل ہوتے ہیں۔ ان میں رؤسا اور امرا بھی ہوتے
ہیں جو اپنے کوٹھی کمروں میں بیٹھ کر ڈراما سنتے ہیں اور ایسے غربا بھی ہوتے
ہیں جو کسی ہوٹل میں بیٹھ کر ڈرامے سے محظوظ ہوتے ہیں۔ اوسط درجہ
کے لوگ بھی اپنے کسی دوست یا محسن کے سیٹ پر ریڈیائی ڈراما سن
کر اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ ڈراما نگار اپنے سامعین کی مختلف
النوع طبیعتوں اور رجحانات کی وجہ سے ایک عجیب کشمکش میں مبتلا
ہو جاتا ہے۔ وہ یہ سوچنے لگتا ہے کہ ایسا کونسا موضوع اختیار
کرے جو ان سب میں مشترک ہو اور جو دلچسپی بھی ہو۔ اس کا دماغ چکرا جاتا
ہے مگر اس کی یہ کوشش رائیگاں نہیں جاتی۔ وہ اپنی مسلسل کوشش سے
ایک نہ ایک ایسا موضوع ڈھونڈ نکالتا ہے۔ جو ہر گروہ یا قسم کے سامعین
کے رجحانات سے مطابقت کرتا ہے۔ مگر مزید فکر اُسے اور دقتوں میں
مبتلا کر دیتی ہے۔ وہ کس عمر کے سامعین کے لئے اپنا ڈراما لکھ رہا ہے
اس کے سامعین میں عمر کی کوئی قید نہیں لگائی جا سکتی۔ بچے۔ بوڑھے،
نوجوان اور ادھیڑ سب ہی عمر کے سامعین ہو سکتے ہیں۔ پھر یہ سوال پیدا
ہوتا ہے۔ کہ یہ کس صنف سے تعلق رکھتے ہیں؟ صنف نازک یا صنف
قوی سے؟ ڈرامے میں کس کو فضیلت دی جائے؟ اور کس کو
پچھاڑا جائے؟ مگر ایسے نزاعی مسئلہ اور ایسی بحثیں عام طور پر تکلیف
کا باعث بن جاتی ہیں اُسے اس کو بھی دور کرنا پڑتا ہے۔ اگر اس کے نثری
ڈرامے سے کسی کو صدمہ پہنچتا ہے تو آئندہ وہ اُس ڈراما نگار کے ڈراموں
کو سننا پسند نہیں کرے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی مقبولیت کم
ہو جائے گی۔ اس وجہ سے ریڈیائی ڈراما نگار کے لئے "دلچسپی" اس کا
مطمح النظر ہونا چاہئے۔ اور ایسے موضوع کا انتخاب کرنا چاہئے۔ جو عام
دلچسپی کے ہوں۔ جن کو سن کر کسی کو افسوس یا رنج نہ ہو۔ بلکہ سامعین کے
دماغ میں خوش عقیدگی پیدا ہو جائے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب
یہ ہوا کہ ڈراما ایسا اچھوتا اور نرالا ہو کہ ملک کے طول و عرض میں پسند کیا
جائے۔ کیونکہ نثری ڈراما کے خلاق کو یہ تصور کر لینا پڑتا ہے کہ اس
کے سامعین ملک کے گوشہ گوشہ اور چپہ چپہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔

قبولِ عام کی سند اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے۔ جبکہ ڈراما نگار
اپنے فن پر پورے طور سے حاوی ہو اور اپنے موضوع سے بخوبی
واقف ہو۔ مگر یہ واقفیت اس کی دقتوں میں اور اضافہ کر دیتی ہے
کیونکہ اُسے اپنے ڈراما کو ایسے چونکا دینے والے جملوں سے شروع
کرنا پڑتا ہے جو سامعین کو اپنی طرف متوجہ کریں۔ سامعین کو متوجہ کرنیکا اس بیکس
ڈراما نگار کے پاس اس کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ اس کا ڈراما
دیکھا نہیں جا سکتا۔ صرف سنا جا سکتا ہے۔ یہ کمی، کہ ڈراما نگار اپنے
ڈرامے کو صرف آوازوں کے ذریعہ پیش کرے۔ اس کے فن کو اور
زیادہ مشکل بنا دیتی ہے۔ اگر سامعین ڈراما کے شروع ہوتے ہی اس

کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تو یہ ڈراما نگار کے طرزِ تحریر کی زبردست خامی ہوتی ہے۔ بعض اوقات یہ خوبی پروڈکشن انچارج پیدا کر دیتا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ریڈیائی ڈرامائی کامیابی کا راز اس کی ابتدا میں مضمر ہوتا ہے۔ اگر ابتدائی نقوش اچھے ہوئے تو بعد کے نقوش کی کمزوری ڈرامے کی تباہی میں معاون نہیں ہونے پاتی۔ اگر ابتدا بے ہنگم طور پر ہوئی تو بعد کی خوبیاں بھی سامعین پر زیادہ اثر انداز نہیں ہوتیں۔ وہ پریشان ہو کر اور ڈراما نگار کو صلواتوں سے نواز کر ریڈیو سیٹ بند کر دیتا ہے۔

ایک ایکٹ کا فلمی ڈراما انسان کی دو نمایاں قوتوں سے متعلق ہوتا ہے یعنی قوتِ سامعہ اور قوتِ بصارت۔ وہ سُنا بھی جاتا ہے۔ اور دیکھا بھی جاتا ہے۔ اس وجہ سے عوام کی خاص دلچسپی کا مرکز بنا رہتا ہے۔ مکالمے اور گانے سُنے جاتے ہیں اور تصویروں کے ذریعہ سے اداکاری، واقعات اور پلاٹ کی نوعیت کو دیکھا اور سمجھا جاتا ہے۔ مگر ریڈیائی ڈراما صرف "قوتِ سامعہ" کو نوازتا ہے۔ اس وجہ سے وہ فلمی ایک ایکٹ کے ڈرامے سے زیادہ مقبول نہیں ہو سکتا۔ اس "کمی" کو دور کرنے کے لئے اس میں دیگر دلچسپیاں پیدا کرنا پڑتی ہیں جو اس کی کمی کے احساس کی تلافی کر دیتی ہیں۔ پھر بھی یہ کہا جاتا ہے کہ ریڈیائی ڈراما اپنے مقصد کی تکمیل عموماً پورے طور سے نہیں کرنے پاتا۔ مگر اس کے باوجود بھی ریڈیائی ڈراموں کی مقبولیت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کی ابتدا نے ہندوستان کے ڈراما نگاروں کے لئے ایک وسیع میدان پیش کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے ڈراما نگاروں کی تعداد میں روز افزوں ترقی ہوتی جا رہی ہے۔ عوام کی دلچسپی بھی بڑھ رہی ہے جیسا کہ لائسنسوں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے پتہ چلتا ہے۔

تمثیلی اور نشری ڈرامے | ریڈیائی ڈراموں میں بھرتی کے واقعات پیش نہیں کئے جا سکتے۔ ڈراما نگار کا یہ اوّلین فرض ہوتا ہے۔ وہ ایسے واقعات یکجا کرے جن کو وہ اپنے ڈرامے کے لئے مفید سمجھتا ہے۔ وہ اُن کا انتخاب کرتا ہے اور ان میں یہ دیکھتا ہے کہ اس کی ضرورت کے مطابق کونسے ایسے ڈرامائی واقعات ہیں جن کو وہ پہلے پیش کرے۔ کونسے ایسے ہیں جن کو وہ بعد میں لائے۔ گویا اسے اپنے ڈرامے کے لئے واقعات کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ ازاں بعد وہ اُن میں ربط پیدا کرتا ہے۔

اس طرح اس کے ریڈیائی ڈرامے کا پلاٹ مکمل ہوتا ہے۔ اسے تنقیدی نظر سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ اور یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ اس پلاٹ کے منتخب واقعات میں سے کون کون سے ایسے ہیں جن کو آواز کے شیدائیوں کے لئے پیش کرنا سودمند ہوگا۔ اور جو ڈراما نگار کی شہرت کا سنگِ بنیاد بن جائیں گے۔ اور کون کون سے ایسے ہیں جو اس کی شہرت کو صدمہ پہنچائیں گے۔ اس وقت اُسے قطع و بُرید اور تخفیف و اضافہ سے کام لینا پڑے گا۔ بھرتی کے غیر ضروری واقعات کو نکال کر ان کی جگہ ضروری واقعات کو دینا پڑے گی۔ اس کے بعد وہ نشری ضروریات کے ماتحت اس کی تشکیل کرے گا۔

ریڈیائی ڈراما میں غیر منظم پلاٹ کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس میں ترتیب اور تسلسل کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ بے ہنگم طور پر واقعات کا آجانا سامعین کی طبع پر نہایت گراں گذرے گا۔ اس میں جو واقعہ پیش کیا جائے وہ انتہائی واضح ہو۔ گنجلک واقعات کی اس میں قطعی گنجائش نہیں ہوتی۔ وضاحت کے ساتھ ہر واقعہ پیش ہونا چاہئے۔ مبہم طریقہ پر واقعات بھی پیش نہیں کئے جا سکتے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر واقعہ متعلقہ نکتہ، نظریہ یا خیال کی وضاحت کرے اور جس جذبہ کے تحت میں وہ پیش کیا گیا ہے۔ وہ خود اس کی تفسیر ہو۔ اس کے پیش کرنے کے انداز میں سادگی ہو تاکہ سامعین ریڈیو سیٹ کی پہلی آواز کے ساتھ ہی واقعات کو سمجھتے ہوئے آگے بڑھیں اگر واقعات اُلجھے ہوئے رہے تو خاتمۂ ڈراما تک مکمل ڈراما ایک معمہ بن جائے گا۔ ایسے معمے ممکن ہے کہ اسٹیج کے لئے زیادہ مفید ہو سکیں مگر ریڈیائی ڈراموں کے لئے مفید نہیں ہو سکتے۔

بعض ڈراما نگار اپنے ڈرامے اسٹیج کے لئے لکھتے ہیں اور اسٹیج کی تمام ضروریات کو اپنے پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ مگر جب اُن کا ڈراما کسی وجہ سے اسٹیج پر کامیاب نہیں ہوتا تو وہ اُسے نشر ہونے کیلئے کسی نشرگاہ میں بھیج دیتے ہیں، جہاں سے وہ شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا جاتا ہے۔ وہ یہ حرکت اس نظریہ کے تحت میں کرتے ہیں کہ جو ڈراما اسٹیج پر کامیاب نہیں ہو سکتا وہ آواز کے ذریعہ سے زیادہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ یہ خیال ایسے ڈراما نگاروں کا ہوتا ہے۔ جن کو ریڈیو کی تکنیک کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا اور جو ریڈیائی ڈرامے کی فنی ضروریات سے قطعی نابلد ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک ریڈیائی ڈراما وہ ہو سکتا ہے جو اسٹیج پر ناکامیاب ہے؛

مبتدی ڈراما نگار عموماً اس غلطی کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ اپنی ابتدائی کوششوں کو مکمل ریڈیائی ڈراما سمجھ کر اسے نشرگاہ روانہ کر دیتے ہیں۔ حالانکہ انکے نشری ڈراما کے تجربہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے۔ کہ نو مشقی کہنہ مشقی میں صرف اسی وقت تبدیل ہو سکتی ہے۔ جبکہ اس فن کی باقاعدہ تکمیل کی جائے۔ مگر ان کی جلد بازی انہیں کچھ نہیں سیکھنے دیتی۔ وہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ بلا کسی محنت کے وہ جلد از جلد ڈراما نگاروں کی اولین صف میں آ کھڑے ہوں۔ اگر غور کیا جائے تو ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ان خامیوں کو دُور کرنا نہیں چاہتے جو نو مشقی کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ ان کی ذرا سی توجہ ان کو کامیاب ڈراما نگار بنا سکتی ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر وہ ڈراما جو اسٹیج پر نہیں پیش کیا جا سکتا، ریڈیائی نہیں ہو سکتا۔ ایسے ڈراموں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ جو تمثیلی نہ ہونے کے باوجود ریڈیو سے نشر کئے جا سکیں۔ ممکن ہے کہ فنی خامیوں کی وجہ سے وہ اسٹیج پر ناکامیاب رہا ہو۔ مگر ہو سکتا ہے۔ کہ اس کا موضوع مائیکروفون کی ضرورت کے مطابق ہو۔ اس مسئلہ پر غور کرنے کے بعد ایک انتہائی اہم نتیجہ نکلتا ہے۔ اور وہ یہ کہ ایک حیثیت سے تمثیلی اور نشری ڈرامے ایک ہیں یعنی ان دونوں میں ایک چیز مشترک ہے۔ اور وہ اس کا موضوع ہے مگر اس کلیہ میں بھی بعض صورتوں میں شاید ہمیں ترمیم کرنا پڑے۔ کیونکہ تمام موضوع ایسے نہیں ہوتے، بعض تو صرف اسٹیج کی ضروریات کے لئے مخصوص ہوتے ہیں اور بعض ریڈیو کے لئے کچھ ایسے ضرور ہوتے ہیں جو دونوں میں مشترک بن سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈرامے وہی کامیاب ہوتے ہیں۔ جن کے موضوع کے متعلق ڈراما نگار کو کچھ کہنا اور بیان کرنا ہوتا ہے۔ انہیں وہ کس طرح پیش کرتا ہے۔ یہ ضرورت وقت اور موقع و محل پر منحصر ہوتا ہے۔

اگر کبھی ایسا اتفاق ہو کہ ڈراما تمثیل کے لئے لکھا جائے اور وہ اسٹیج پر ناکامیاب ہو تو ڈراما نگار کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ پہلے موضوع کا تجزیہ کرے۔ اور پھر یہ دیکھے کہ اسٹیج پر ڈرامے کی ناکامیابی کے اسباب کیا تھے؟ اس وقت وہ یہ غور کر سکتا ہے۔ کہ وہ موضوع ریڈیو کا موضوع ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اگر جواب اثبات میں ملے تو اس ڈرامے کو بغیر محنت نظر انداز کر کے، دوسرا لکھنا چاہئے۔ سابقہ ڈرامے کو توڑ مروڑ کر ریڈیائی نہ بنا دینا چاہئے۔ کیونکہ ریڈیائی ڈراما سامعین کے لئے لکھا جائے گا۔ نہ کہ تماشائیوں کے لئے۔ اگر اسٹیج اور ریڈیائی ڈرامے ہم آہنگ ہوتے ہیں اور ان میں یکسانیت پائی جاتی ہے تو یہ مقصد کی نوعیت سے بھی ایک ہو سکتے ہیں۔ دونوں کے لئے ڈراما نگار ڈرامے لکھتا ہے مگر ایک ہی مقصد کی تکمیل ہوتی ہے۔ گو راہیں اور تکنیک مختلف ہوتی ہیں۔

صوتی اثرات کے متعلق لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اگر ریڈیو ڈراما میں زیادہ سے زیادہ آوازیں پیدا کرنے اثرات مرتب کئے جائیں تو ڈراما زیادہ کامیاب رہتا ہے۔ کہیں پر شور و غل اور کہیں پر رونے پیٹنے اور چیخنے چلانے کی آوازیں پیدا کی جاتی ہیں۔ گھنٹیوں کی آواز سے گاڑیوں کی کثرت، اور ریکارڈ بجا کر ہزاروں آدمیوں کا مجمع پیش کیا جا سکتا ہے وہ کہا جاتا ہے مگر ان آوازوں کو پورے طور پر ڈراما کی کامیابی کا ضامن قرار دے دینا غلطی ہے۔ حالانکہ ماہرین فن کا یہ خیال ہے کہ کامیاب ڈراما میں کم سے کم صوتی اثرات ہوں گے۔ اور تجربہ نے بھی یہی بتایا ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ ایک کلیہ ہو گیا۔ بعض ڈراموں میں زیادہ آوازیں پیدا کرنے کی بھی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ مگر یہ مستحسن نہیں تصور کیا جاتا۔ آوازوں کی زیادتی ڈراما کو گنجلک بنا دیتی ہے اور اس کی روانی میں خلل انداز ہوتی ہے۔

جہاں یہ دشواریاں ہوتی ہیں وہاں ریڈیائی ڈراما نگار کے لئے وقت کا سوال بھی بہت ضروری ہوتا ہے۔ وہ پردہ سیمیں یا اسٹیج کے لئے اپنی اپنی مرضی کے مطابق طویل یا مختصر ڈراما لکھ سکتا ہے مگر ریڈیو کی ضرورت اسٹیج کی ضرورت سے مختلف ہوتی ہے۔ کس نوعیت کے ڈرامے کی ضرورت ہے؟ کس موضوع پر ڈراما ہونا چاہئے؟ اور اس کو کتنا وقت دیا جا سکتا ہے؟ ممالک غیر میں نشری ڈراما کبھی سوا گھنٹے کی مدت کا، کبھی ایک گھنٹے کا اور کبھی اس سے بھی کم مدت کے لئے لکھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ طویل ڈرامے یا تو کامیاب نہیں ہوتے یا سامعین کی طبع پر گراں گذرنے لگتے ہیں۔ ہندوستان کی ریڈیائی دنیا میں بھی ڈرامے عموماً کم وقفہ کیلئے لکھے جاتے ہیں۔ کوئی پانچ منٹ کا ہے تو کوئی دس منٹ کا۔ اسی طرح پچیس اور تیس منٹ سے لیکر گھنٹے اور سوا گھنٹے کے ڈرامے لکھے گئے۔

رہتے ہیں۔ یہاں پر بھی اس کی وہی وجوہ ہیں جو مذکور ہیں۔ اول تو ریڈیو کے پروگرام مرتب کرنے والے اپنی مختلف النوع ضرورتوں کو پیش نظر رکھتے ہیں، دوسرے روزانہ زندگی کے تجربوں نے ان کو یہ سکھایا ہے کہ سامعین زیادہ دیر تک اپنی قوت سامعہ پر زور دیکر اس کو ایک طرف رجوع نہیں کر سکتے۔ سامع چاہتا ہے کہ پروگرام جلد او جلد تبدیل ہوتا رہے۔ اس وجہ سے طویل ڈرامے ان کو محظوظ کرنے کے بجائے ان کی تکلیف کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ اس کا ایک خاص سبب یہ ہے کہ ریڈیائی ڈرامے بغیر کسی وقفہ (Intervals) کے پیش کئے جاتے ہیں۔ اسٹیج پر جہاں مناظر، اور اداکاری مجموعی حیثیت سے ڈرامے کی پیدا کردہ "تکان" کو کم کر دیتی ہیں وہاں "وقفہ" بھی اس کی طوالت کو محسوس نہیں ہونے دیتا۔ پردۂ سیمیں کے ڈراموں کا بھی یہی حال ہوتا ہے۔ مگر ریڈیائی ڈراما کا تسلسل ہی اس کی زبردست خوبی ہوتی ہے۔ اس کا پروگرام اس طرح مرتب کیا جاتا ہے۔ کہ اس کی رنگارنگی اس تکان کو دور کر دیتی ہے۔ مگر ڈراما کے درمیان کوئی وقفہ نہیں دیا جاتا۔ خواہ سامع اس کو سنے یا ریڈیو سیٹ کو بند کر دے۔ اگر کوئی سامع چند لمحات کے لئے کسی اور طرف متوجہ ہو جاتا ہے یا کسی ضرورت سے اٹھ کر کہیں چلا جاتا ہے تو وہ ڈرامے کا بہت سا حصہ نہیں سن سکتا۔ اگر وہ اس کو دوبارہ سننا چاہے گا۔ تو وہ اپنی خواہش کی تکمیل میں ناکام رہے گا۔ اس وجہ سے ریڈیائی ڈراما نگار کو اپنے ڈرامے پر مقابلتاً زیادہ توجہ مبذول کرنا پڑتی ہے۔ تاکہ اس کا ڈراما ریڈیائی ٹکنیک کے مطابق ہو اور وہ سامعین کے لئے بار گراں نہ ہو۔

ان پابندیوں کے درمیان نثری ڈراما نگار اپنے ڈرامے کا آغاز کرتا ہے۔ اس کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ ایسے موضوع کا انتخاب کرے جو انتہائی آسانی کے ساتھ کم سے کم وقت میں پیش کیا جا سکے۔ جن کے ساتھ کردار نگاری دشوار نہ ہو جائے اور جن کے پلاٹ سادہ ہوں۔ مخلوط پلاٹ یا گنجلک واقعات ریڈیو ڈراما کیلئے موزوں نہیں ہوتے۔ اسی کے ساتھ ساتھ "ظرف زماں" اور "ظرف مکاں" کی پابندی بھی عاید ہو جاتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ پابندی ان دقتوں کو کم کر دیتی ہے جو ایک اسٹیج کے ڈراما نگار کو پیش آتی ہیں۔ یعنی یہ کہ اسٹیج کے ڈراما نگار کو "ظرف زماں" کے سلسلہ میں دو دقتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے اول وہ "وقت" جو کھیل میں ظاہر کیا جاتا ہے دوئم وہ "وقت" جو اس وقت کو ظاہر کرنے میں صرف ہوتا ہے جب ڈراما کے وقت کو کم کرنا ہوتا ہے تو اکثر اوقات گھڑی کے ذریعہ یہ وقت کم کر دیا جاتا ہے۔ گھنٹہ اسٹیج پر ظاہر کیا جاتا ہے۔ اور وہ چند منٹ میں گھنٹے بجا کر وقت گذار دیتا ہے۔ اور یہ اس لئے کہ کھیل کے وقت کی طوالت میں کمی ہو جائے۔ ورنہ شاید ڈراما کے ختم ہونے کیلئے ایک عرصہ کی ضرورت ہو۔ مگر ریڈیائی ڈراما میں "ظرف زماں" کی دقتیں کم ہو جاتی ہیں۔ اور وہ اس طرح کہ گھنٹے کی آواز مدت کے گذرنے کا صحیح اندازہ دے دیتی ہے کیونکہ سامعین ڈراما سنتے وقت ہر چیز پر غور کرتے رہتے ہیں۔ ان کی یہ توجہ انہیں یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر لیتی ہے کہ وقت گذر رہا ہے۔ اسٹیج پر جو نظر فریب واقعات پیش کئے جاتے ہیں۔ ان کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ تماشائی اور اسٹیج کے درمیان فاصلہ کافی ہو۔ دوسری چیز کھیل کا "ظرف مکاں" ہے۔ پردے، روشنی، اداکاری اور مناظر ایمائی اثرات پیدا کرتے ہیں مگر ریڈیو ڈراما میں ان چیزوں سے ایمائی اثرات (Suggestive Effects) نہیں پیدا کئے جا سکتے بلکہ ریڈیائی ڈراموں کا مکالمہ یہ اثرات خود پیدا کرتا ہے۔ یہ آسانیاں اپنے اندر بہت سی مشکلات بھی پوشیدہ رکھتی ہیں۔ کیونکہ ایسے حالات اور ایسی صورتیں پیدا کرنا پڑتی ہیں کہ تمام کردار کسی نہ کسی بہانے اپنے موقع اور محل کے لحاظ سے ایک مقام یا ایک جگہ پر آتے جائیں۔ اتنا ضرور ہے کہ سین کی تبدیلیاں اس میں بہت معاون ہوتی ہیں۔ یکے بعد دیگرے تمام سین بہ آسانی پیش کئے جا سکتے ہیں۔ مگر ان میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور وہ اس وجہ سے کہ کہیں ڈراما بے ربط نہ ہو جائے۔ اس کا تسلسل ختم نہ ہو جائے اور وہ مضحکہ خیز نہ بن جائے۔ یہ ابتداء ہی میں تحریر کیا جا چکا ہے کہ سامعین آنکھیں رکھنے کے باوجود ان سے استفادہ نہیں کر سکتے اور نہ ان سے کچھ دیکھ کر حظ اٹھا سکتے ہیں۔
وہ اندھوں کی طرح سے ریڈیو سیٹ کے سامنے بیٹھے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "زماں" و "مکاں" کے ساتھ ساتھ ڈراما نگار کو پلاٹ کو دور

نگاری اور کرداروں کی بجائے تعداد کی طرف زیادہ توجہ دینا پڑتی ہے اور بہت محتاط ہو کر ڈرامہ کو پیش کرنا پڑتا ہے تاکہ اس کا ڈراما چیستان بن کر نہ رہ جائے۔

ریڈیائی ڈراما کی قسمیں ریڈیائی ڈراما لکھنے اور پیش کرنے کے دو طریقے فی الحال رائج ہیں۔ ان میں ایک آسان ہے اور دوسرا کسی قدر مشکل — آسان طریقہ "فیچر" Feature سے متعلق ہے۔ فیچر دراصل وہ بیانیہ ڈراما ہوتا ہے جس میں راوی حالات اور واقعات مکالمہ کی صورت میں بیان کرتا جاتا ہے یا خود ڈراما نگار اپنے قلم سے بیانات لکھتا جاتا ہے اور ایسے مواقع پیدا کرتا جاتا ہے۔ جہاں وہ اصل واقعات۔ ڈرامائی انداز میں پیش کر کے ڈرامائی اثرات مرتب کرتا ہے۔ اس منظر کے ختم ہوتے ہی "راوی" پھر اپنا بیان شروع کر دیتا ہے۔ اس طرح وہ گذشتہ واقعات اور آنے والے بیانات میں ایک ربط قائم کر کے ان کو آنے والے واقعات سے ایک خاص رشتہ اور تناسب کے ذریعہ سے ملا دیتا ہے۔ کبھی کبھی دو یا تین کردار کی گفتگو سے بھی فیچر کی ابتدا کی جاتی ہے۔ ان میں سے ایک واقعات اور حالات سے واقف کرتا ہے اور دوسرے استفسار کے ذریعہ سے صرف اپنی معلومات ہی میں اضافہ نہیں کرتے بلکہ قصہ کی تدریجی ترقی میں بھی مدد دیتے ہیں۔ یہ طریقہ دراصل اسوقت مناسب سمجھا جاتا ہے جبکہ برسوں کے واقعات کو کسی ڈراما میں پیش کیا جائے۔ یا مختلف عہد کے واقعات میں پیوند لگایا جائے۔ عموماً شعراء کی منظوم مثنویوں اور قصوں کو بھی فیچر ہی کے ذریعہ سے پیش کیا جاتا ہے۔ سنگیت ناٹک بھی اکثر فیچر کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ ناول نگاروں کی طویل ناولوں کو ریڈیائی ڈراما میں صرف فیچر ہی کے ذریعہ سے کامیابی کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ایسے قصوں میں اختصار پیدا کرتے وقت "ریڈیائی پیش کشی" اور "ریڈیائی اثرات" نہیں پیدا ہو سکتے۔ اگر ضروری بیانات راوی کی زبان سے نہ سُنے جائیں۔ یہ ممکن ہے کہ بعض واقعات بذات خود ڈرامائی ہوں مگر دوسرے واقعات سے تسلسل اور ربط قائم رکھنے کے لئے ان کو فیچر ہی کی شکل دینا ہوگی۔ "فیچر" نگار کو بھی اپنے پیش نظر یہ رکھنا پڑتا ہے کہ اس کے ڈرامے میں اثرات گفتار، سین اور اداکاری سے نہیں پیدا کئے جا سکتے۔ انسانی چہرے، ان کا میک اپ اور ان کا طریقۂ اظہار جذبات بھی فیچر کی کامیابی میں معاون نہیں ہو سکتا اس وجہ سے کہ یہ نظر سے غائب رہتی ہیں۔ صرف مکالمہ اور ان کے پیش کرنے کا انداز اس کے جذبات اور احساسات کو پیش کر دیتا ہے۔

"فیچر" نگار کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ "سحر نگار" قلم رکھتا ہو۔ اس کو اپنی ایمائی قوت سے۔ سامعین کی قوت سامعہ اور قوت تخیل کو متاثر کر کے اپنا ہمنوا بنانا پڑتا ہے۔ اسے چاہئے کہ وہ اپنے بیانات میں جادو بھر دے۔ یہ جادو نگاری سامعین کے دماغ میں آنے والے تصورات کی مکمل تصویریں بنانے میں مدد دیتی ہے۔ کیونکہ قوت سامعہ سینری، ملبوسات اور روشنی وغیرہ کے اثرات سے متاثر نہیں ہوتی۔ ان کے اثرات پُر زور بیانات اور مؤثر مکالموں سے پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ راوی جس قدر پُر زور انداز میں پس منظر پیش کریگا اسی قدر مکمل خاکے سامع کے تخیل میں مرتب ہو کر اس کے دل و دماغ پر اثر انداز ہو سکیں گے۔ غیر مؤثر انداز دراصل فیچر کے تسلسل کو ختم کر کے اس میں ایک خلا پیدا کر دیتا ہے۔ اور صحیح اثر مرتب نہیں ہونے پاتا، اس کے بیانات صدیوں کے واقعات میں ربط پیدا کر کے انہیں ایک کڑی بنا دیتے ہیں۔ فیچر میں ایک مبتدی کو بہت محتاط رہنا پڑتا ہے۔ اس کا یہ خیال ہوتا ہے کہ مکالموں کی طوالت فیچر کی کامیابی کا سبب ہوتی ہے۔ مکالمہ صرف مناظر کو پیش کرنے کے لئے کم سے کم ہونے چاہئیں۔ فیچر کے مرکزی کردار میں بھی کوئی کمی نہ ہونی چاہئے۔ پورا فیچر کئی حصوں پر منقسم کیا جا سکتا ہے۔ اور ہر حصہ ایک خاص زمانے اور ایک خاص وقت سے متعلق ہو سکتا ہے۔ اور ہر ایک میں ایک نیا واقعہ اور ایک نیا نظریہ پیش کیا جا سکتا ہے مگر ان کے ربط اور تسلسل میں کوئی سقم نہیں پیدا ہوتا۔ غلو کو اس میں جگہ نہ دینی چاہئے۔ ادبی بیانات مکالموں میں نہ آنے چاہئیں۔ وہ منظری اثرات پیدا کرنے میں استعمال ہو سکتے ہیں۔

اکثر فیچر کے واقعات، بیانات اور مکالموں میں یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ یکسانیت مختلف طریقوں سے پیدا ہوتی ہے کبھی

راوی کے بیانات ایک تھکا دینے والے انداز میں پیش کئے جاتے ہیں۔ ان کا انداز کہیں تبدیل ہی نہیں ہوتا۔ فیچر نگار کو مختلف طریقوں سے بیانات پیش کرنا چاہئیں۔ مختلف طریقوں سے مطلب یہ ہے کہ طرزِ تحریر میں نمایاں فرق ہونا چاہئے ورنہ یہ یکسانیت فیچر کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ فیچر کے مختلف حصوں کے واقعات کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ واقعات مختلف کردار سے ضرور متعلق ہوتے ہیں مگر سب ایک طرح کے ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی ندرت، اور کوئی عجوبہ پن نہیں ہوتا۔ یہی حال مکالموں کا بھی ہے۔ ان کی یکسانیت تو فیچر کی تمام خوبیوں کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ مکالموں کو علیحدہ علیحدہ حصوں سے علیحدہ علیحدہ نظریوں سے متعلق ہونا چاہئے۔ الفاظ فقرے اور جملے بھی مختلف ہوں۔ ہر کردار کی زبان سے ایک ہی طرح کی باتوں کا نکلنا ان کے کرداری امتیاز کو باقی نہیں رہنے دیتا۔ فیچر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہونی چاہئے کہ وہ سامع میں "تذبذب" کی کیفیت پیدا کر دے۔ اس طرح ان کے اندر ایسا جذبہ پیدا ہو جائے کہ وہ آئندہ کے واقعات اور بیانات کو سننے کے لئے آمادہ ہو جائیں۔

نشری ڈراما فیچر سے مشکل ہوتا ہے کیونکہ اس میں راوی کا گذر نہیں ہوتا۔ پس منظر، تاریخی بیانات یا سماجی حالات صرف ڈراما نگار ہی پیش کر سکتا ہے اور وہ بھی اپنے کردار کے ذریعہ سے۔ ریڈیو ڈراما میں کردار کے معنی مکالمہ کے ہوتے ہیں کیونکہ مکالمہ ہی اس کا سب سے ضروری جزو ہوتا ہے۔ اسی کے ذریعہ سے کرداری ارتقا پیش کیا جاتا ہے۔ اسی کے ذریعہ سے پلاٹ، کہانی اور واقعات پیش کئے جاتے ہیں۔ اس لئے مکالمہ پر سب سے زیادہ زور دینا چاہئے اس کا تسلسل تھکا دینے والا نہ ہونا چاہئے۔ مکالمے ایسے ہوں جو گفتگو سے خود بخود پیدا ہوں اور ڈرامے کو خود بخود ایک خاص نتیجہ کی طرف رجوع کر دیں۔ ڈراما ابتدا کے بعد ہی جوشش اور تحریک کا حامل ہو کر منتہا کی طرف رجوع ہو جاتا ہے، واقعات بھی یکے بعد دیگرے اور تیزی سے آتے جاتے ہیں۔ کردار بھی آتے اور جاتے رہتے ہیں۔ غیر ضروری کردار کہیں نہ آنے چاہئیں۔ ڈراما کسی ایک پہلو یا ایک رُخ سے متعلق ہونا چاہئے۔ اس میں مختلف نظریوں کے پیش کرنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ ڈرامے کی ابتدا ایسی ہو کہ سامعین اس کا پہلا جملہ سنتے ہی اس کو کامل طور پر سننے کے لئے مجبور ہو جائیں اور منتہا تک پہنچتے پہنچتے اُن کی بھی سانس اسی قدر تیز چلنے لگے جیسی کہ کردار کی۔ ڈرامے میں ایکشن کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر وہ صرف مکالمہ اور آوازوں کے اتار چڑھاؤ سے پیش کی جا سکتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ ریڈیائی ڈراما نگار کے پاس "فضا" پیدا کرنے کے لئے خارجی طور پر کوئی عنصر نہیں ہوتا۔ صرف مکالمہ اس کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ اسی کے ذریعہ سے اسے اپنے ڈراما کو کامیاب بنانا پڑتا ہے۔

ریڈیائی ڈراموں میں کردار بھی زیادہ تعداد میں استعمال نہیں کئے جا سکتے۔ کردار کی کم تعداد ڈراما نگار کو بہت سی دقتوں سے محفوظ رکھتی ہے۔ زیادہ کیریکٹروں کی تعداد میں آواز کے امتیاز کو برقرار نہیں رکھا جا سکتا مگر کردار کے تعداد کی کمی اس مشکل کو جلد از جلد حل کر دیتی ہے۔ بعض اصحاب کا یہ خیال ہے کہ وہ ڈراما بہترین ریڈیائی ڈراما کہا جا سکتا ہے جس میں کرداروں کی تعداد کافی ہو، کافی سے وہ متعدد کردار مراد لیتے ہیں۔ اور جس میں ایک سے زیادہ اسٹوڈیو کام میں لائے جائیں، مختلف قسم کے صوتی اثرات پیدا کئے جائیں۔ طرح طرح کا موسیقی کے کمالات بھی دکھائے جائیں۔ ایسی صورت میں نہ صرف ڈراما نگار بلکہ پروڈیوسر بھی حیران و پریشان ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ڈراموں کو سادہ ہی رکھنا بہتر ہوتا ہے۔ گنجلک اور پیچیدہ اور زیادہ صوتی اثرات رکھنے والے ڈرامے زیادہ کامیاب نہیں ہوتے۔ اس ضمن میں دو باتوں کا یاد رکھنا ضروری ہے اول تو یہ کہ مکالمہ تیر بہدف ہو اور اس کو تخیل کی امداد سے انتہائی رنگ آمیز بنایا گیا ہو۔ اور دوم موضوع ریڈیائی ضرورت کے مطابق ہو۔

موضوع | موضوع کی ضرورت اور اہمیت کے متعلق مختلف مقامات پر اشارات کئے گئے ہیں۔ مگر کہیں بھی اس کا تفصیلی تجزیہ نہیں کیا گیا "موضوع" کی اہمیت کا اندازہ گذشتہ بیانات سے لگایا جا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ ڈراما نگار کو نشری ڈراما تحریر کرنے سے قبل یہ سوچ لینا چاہئے کہ زیر نظر موضوع مائیکروفون کے ذریعہ سے سامعین تک کامیابی

کے ساتھ پہنچایا بھی جا سکتا ہے یا نہیں۔ یہ سمجھ لینا غلطی ہے کہ ہر موضوع ریڈیائی ضرورت کے مطابق ہوتا ہے اور اگر نہیں ہوتا ہے تو زبردستی بنایا جا سکتا ہے۔ موضوع کی تلاش اور جستجو ریڈیائی تکنیک کو پیش نظر رکھ کر کرنی چاہیے۔ آلات کی پابندیاں بھی موضوع کی تلاش و جستجو میں روڑا بن سکتی ہیں۔ موضوع کی تلاش و جستجو میں یہ امر مد نظر رکھنا ہوگا۔ کہ وہ زیادہ سے زیادہ سامعین کی طبیعت سے مطابقت کرے۔ اگر کسی ڈراما نگار کے ڈرامے سے کسی شخص کو تکلیف پہنچتی ہے۔ تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ وہ ڈراما نگار موضوع کے انتخاب میں کامیاب نہیں ہوا۔ ان کے موضوع ایسے ہونے چاہئیں کہ عوام ان سے دلچسپی لیں جن کو ہر شخص سُن کر خوش ہو اور جو اس میں ایسا جذبہ پیدا کریں جس سے وہ اس ڈراما نگار کے ڈرامے آئندہ سننے کے لئے تیار ہو جائے۔ "دل آزاری" کی ریڈیائی دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔ اس وجہ سے اگر کسی ڈراما سے کسی متنفس کو ذرا سا بھی آزار پہنچتا ہے۔ تو وہ ڈراما "ناقص" تصور کیا جائے گا۔ ہندوستان کی "فضا" عرصہ دراز سے مکدر چلی آ رہی ہے۔ اس وجہ سے یہاں کی ریڈیائی دُنیا نے اس امر کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے کہ ہندوستان کی کثیر سے کثیر آبادی سے لیکر قلیل سے قلیل آبادی تک کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ ایسے موضوع انتخاب کئے جائیں جن کا نزاعی مسئلوں سے کوئی لگاؤ نہ ہو۔ ایسے ڈرامے جو ہندوستان کی دو بڑی اقوام ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلاف پر مبنی ہوں یا ان میں ایک کو دوسرے پر فضیلت دی گئی ہو یا ایسے تاریخی واقعات پیش کئے گئے ہوں۔ جن میں کسی قوم یا فرقہ کی سبکی ہوتی ہو یا مجموعی حیثیت سے قومی احساس اور قومی وقار کو ٹھیس لگتی ہو۔ یا کسی خاص طبقہ کے رہن سہن کے طریقے اور رسم و رواج کو دکھلا کر اُسے مطعون کرنے کی کوشش کی گئی ہو ہندوستان کی ریڈیائی دنیا سے نشر نہیں کئے جا سکتے۔ اگر کوئی ڈراما نگار ایسا موضوع اختیار کر کے ڈراما لکھتا ہے۔ اور نشر کیا جاتا ہے تو صدائے احتجاج ملک کے مختلف گوشوں سے بلند کی جاتی ہے۔ ایسے ڈرامے جو کسی ایسے خاص موضوع پر لکھے جائیں ممکن ہے کہ وہ کسی خاص طبقہ کے تماشائیوں کو خوش کر سکیں اسٹیج پر بھی "دل آزاری" کو پیش نظر رکھا جاتا ہے مگر ریڈیائی دُنیا میں تو اس قسم کے ڈراموں کا گذر ہی نہیں۔ آواز کے شیدائیوں کے لئے ڈراما نگار ایسے ڈرامے لکھے جو کسی طرح کسی کی بھی دل شکنی نہ کرے تو وہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ عام موضوع مثلاً طلاق، منگنی، کورٹ شپ اور طوائف، بھی ریڈیائی ڈراموں کے لئے موزوں تصور نہیں کئے جاتے۔ ایسے موضوع جن میں کہیں بھی اختلاف پیدا ہوتا ہو فوراً حذف کر دینے چاہئیں۔ نظریوں کے اختلافات کی بھی ریڈیائی ڈراموں میں گنجائش نہیں۔

ڈراموں کے موضوع ایسے ہونا ضروری ہیں۔ جن کو سُن کر سامعین میں اچھے جذبات پیدا ہوں۔ دوسرے الفاظ میں اس کو یوں کہیے کہ ان کی روح میں پاکیزگی پیدا ہو جائے۔ مجھے ڈراما کے قدیم پرستاروں کی وہ باتیں یاد ہیں جن میں یہ کہا گیا ہے کہ ڈراما کو تماشائیوں میں "جذبۂ رحم اور جذبۂ خوف و ہراس" پیدا کر دینا چاہیے۔ ممکن ہے کہ زمانہ قدیم میں ایسے جذبات پیدا کر کے بہترین انسان بنا دیئے گئے ہوں۔ آج کی دنیا میں "رحم" کی جگہ تو کسی قدر ضرور ہے۔ مگر خوف و ہراس کی قطعی گنجائش نہیں۔ آج کل ایسے ڈراموں کی ضرورت ہے جو تعلیمی ہوں اور جو ساتھ ساتھ تفریح طبع کا باعث بھی ہوں۔ اسٹیج کے ڈراما نگار موضوع کے انتخاب کے وقت یہ تصور کر لیتا ہے کہ تماشائی اس کا ڈراما دیکھ رہے ہیں۔ ان میں کس قوم، کس نسل، کس طبقہ اور کس کس مذہب کے لوگ ہیں مگر ریڈیائی ڈراما نگار یہ تصور نہیں کر سکتا۔ کہ کون کون سامعین، کہاں کہاں، کس کس ماحول میں اور کن کن جذبات اور احساسات کے ساتھ اس ڈرامے کو سُن رہے ہیں وہ لاتعداد سامعین کے لئے ایک موضوع انتخاب کر کے ایک ڈراما لکھتا ہے۔

"موضوع" کا انتخاب ریڈیائی ڈراما نگار کے لئے بہت دشوار ہے۔ اُسے ہر فرد کی دلچسپی کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ "صنفی جذبات" کا اُسے احترام کرنا پڑتا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ اس کے سامعین صرف مرد ہیں یا صرف عورتیں۔ اُسے یہ قیاس آرائی کرنا پڑتی ہے اور یقین کرنا پڑتا ہے کہ مرد اور عورتیں دونوں اس کے ڈرامے کو سنتے ہیں۔ دونوں صنف کے سامعین اپنی اپنی انفرادیت کے علاوہ "صنفی خوبیاں" بھی رکھتے ہیں۔ اس کے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے۔ کہ ہندو، قومی اور

صنفِ نازک میں سے کسی کو بھی اس کے ڈرامے سے صدمہ نہ پہنچے۔ "موضوع" ایسا نہ ہونا چاہئے کہ وہ ایک کے مخالف پڑے اور دوسرے کے موافق۔ اسے ڈرامے کو اس طرح تحریک کے بعد جوش میں لاکر منتہا تک پہنچانا پڑتا ہے۔ کہ دونوں میں سے کسی میں بھی "احساس کمتری" پیدا نہیں ہونے پاتا۔ غرض ڈرامے کا "موضوع" نوعیت کے لحاظ سے انتہائی بلند ہونا چاہئے اور اس موضوع کے پیش کرنے کا انداز بھی اچھوتا ہونا چاہئے۔ تاکہ وہ بوڑھوں، بچوں، جوانوں، نوجوانوں، مردوں اور عورتوں کی طبیعتوں کو یکساں طور پر خوش کر سکے۔ سوسائٹی کے مختلف طبقے امیر و غریب، سب کے سب اس سے محظوظ ہوں۔ جہاں تک مختلف فنون کا تعلق ہے، ڈرامے کو ہر فن کے ماہر کے لئے دلچسپ ہونا چاہئے یعنی "موضوع" عام دلچسپی کا ہو نہ کہ چند مخصوص افراد کے لئے وہ موزوں ہو۔ بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ "موضوع" ایسا ہو جو ہر فرد کو خوش کر سکے۔ یقیناً ڈرامے کو ایسا ہونا چاہئے مگر یہ امر محال معلوم ہوتا ہے کہ ہر سامع ڈرامے سے محظوظ ہو۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سامع کی طبیعت خود کسی ناخوشگوار واقعہ کی وجہ سے بدمزہ ہو جاتی ہے۔ اس وقت اسے کوئی ڈراما اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ ایسی صورت میں ڈراما نگار کی تمام تر کوششیں بیکار اور فضول ہو جاتی ہیں۔ مگر یہ صرف اس سامع کے نقطۂ نظر سے۔ ہر کلیہ کے لئے دو ایک مستثنیات کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اگر ڈراما چند سامعین کو خوش نہ کر سکا یا اس کا موضوع ان کی طبیعت کے مناسب حال نہ ہوا تو اکثریت کی خوشنودیٔ طبع پر ڈرامے کے "موضوع" کی کامیابی کا انحصار ہوگا۔

گانے کہا جاتا ہے کہ "گانے" ریڈیائی ڈراموں کے لئے اسی قدر ضروری ہیں جس قدر کہ انسانی زندگی کے بقا کے لئے نمک۔ اگر انسان نمک کا استعمال جاری نہ رکھے تو وہ متعدد امراض کا شکار ہو جائے۔ اسی طرح اگر ریڈیائی ڈراموں میں موسیقی نہ پیش کی جائے تو اس میں کوئی جاذبیت اور دلکشی باقی نہ رہے گی۔ عوام ڈراما دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں سننے کے نہیں۔ مگر آواز کے شیدائیوں کو ڈراما سننے کا عادی بننا پڑتا ہے۔ اور دیکھنے کی عادت کو ترک کرنا پڑتا ہے۔ عام طور پر لوگ گانا سننے کے عادی ہوتے ہیں پھر اگر سننے والے ڈراموں میں موسیقی یا گانے نہ ہوں تو ان کی قوت سامعہ تشنہ رہ جاتی ہے اور اس کو کچھ کمی سی محسوس ہوتی رہتی ہے۔ یہی کمی نشری ڈرامے میں عیب بن کر ظاہر ہو جاتی ہے۔ مگر "موسیقی" اور "گانے" کا مقصد ان پکے گانوں سے نہیں جن میں آواز کے زیر و بم سے راگنیوں کی لڑائی کا سا اظہار کیا جاتا ہے۔ میرا مطلب ان ہلکے پھلکے گانوں سے ہے جو بآسانی عوام کی سمجھ میں آجائیں اور جن سے وہ دلچسپی لے سکیں۔ اگر "پکے" گانوں کو ڈراما کے لئے ضروری قرار دے دیا جائے تو ڈرامے خاک میں مل جائیں۔ وہ صرف راگ اور راگنیوں کا مرقع بن جائیں گے۔ اسکے سامعین کی تعداد میں بھی کمی ہو جائے گی۔ عام طور پر عوام کی سمجھ کے مطابق گانے نشری ڈراموں میں پسند کئے جاتے ہیں۔ غزلیں اور نظمیں، موقع اور محل کے لحاظ سے ڈراما کی دلچسپی کا باعث ہوتی ہیں اور اس کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتی رہتی ہیں۔ کیونکہ "احساس سامعہ" میں برتری پیدا ہو جاتی ہے۔ گانوں کا اصل پلاٹ سے تعلق ہونا ضروری ہے۔ اگر وہ بے موقع اور بغیر کسی واقعہ کی ضرورت کے لحاظ سے پیش کر دیئے گئے تو وہ بدنما پیوند ہو جائیں گے۔ اور اُن کی تمام تر خوبی خاک میں مل جائے گی۔ ان کا پلاٹ میں ایک جزو کی حیثیت سے شامل ہو جانا ضروری ہے۔ تاکہ پلاٹ میں دلکشی اور بڑھ جائے۔ کردار اور ان کے ماحول سے بھی گانوں کا متعلق ہونا ضروری ہے۔ ایک ریڈیائی ڈرامے میں کتنے گانے ہونے چاہئیں؟ ایک ایسا سوال ہے جس کے جواب میں "گانوں" کی تعداد کو متعین کر دینا چاہئے۔ مگر اس کے لئے کوئی قانون، کلیہ یا اصول نہیں بنایا جا سکتا۔ بلکہ صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ ڈراما نگار کے ڈرامائی احساس یا ریڈیائی احساس پر منحصر ہوتا ہے۔ کہ اس کے ڈرامے کو کتنے گانوں کی ضرورت ہے؟ کبھی ابتدا میں، کبھی درمیان میں اور کبھی اختتام پر ان کی ضرورت پڑتی ہے کبھی ہر وقفہ پر گانوں سے کرداروں کی کیفیت کا اظہار کیا جاتا ہے اور قصہ کی تدریجی ترقی میں مدد لی جاتی ہے۔

غرض گانوں اور سازوں کے پیش کرنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ضرور ہونا چاہئے۔ کیونکہ جس طرح ریڈیائی ڈراموں کے کردار اپنی آواز

کی وجہ سے نظرانداز نہیں کئے جا سکتے۔ اسی طرح "گانے" بھی پس پشت نہیں ڈالے جا سکتے۔ کبھی کبھی پس منظر سازوں کے ذریعہ سے پیش کیا جاتا ہے، کبھی ریڈیائی فضا پس منظر کے گانوں اور نغموں سے مرتب کی جاتی ہے۔ بعض اوقات کیا اکثر اوقات یہ نغمے اور گانے کرداری جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ یعنی گانوں کی نوعیت یہ بخوبی ظاہر کر دیتی ہے کہ کردار کس ماحول سے گزر رہا ہے۔ اور اس کا کیا اثر اس کے دل و دماغ پر مرتب ہو رہا ہے۔ اس کے نغمے کبھی خوشی کے پیامبر ہوتے ہیں اور کبھی درد و غم کا پتہ دیتے ہیں۔ کبھی وہ مایوس ہو کر گاتا ہے اور کبھی امید کو سہارا بنا کر پھولے نہیں سماتا اور گا گا کر اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے کس طرح کا گانا کس قسم کے ریڈیائی ڈرامے میں ہونا چاہئے؟ دراصل ایک غور طلب مسئلہ ہے مگر گانوں کی قسم کے متعلق کوئی تحقیقی بات تحریر نہیں کی جا سکتی۔ صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ گانے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو انسانی روح کو سرور بخشیں اور دوسرے وہ جو انسان کو مغموم بنا دیں۔ ان کے بارے میں اتنا بتایا جا سکتا ہے کہ ریڈیائی ڈراما میں گانے کا انحصار ضرورت پر ہونا چاہئے۔ جس طرح کے حالات ہوں، جیسی فضا ہو اور جس قسم کا ماحول ہو۔ یعنی ماحول کے مطابق گانے بھی ڈراما کی طرح المیہ اور طربیہ ہوں گے۔ اگر ماحول اور ریڈیائی فضا کے خلاف گانے ہوں گے تو ڈرامائی اثرات خاک میں مل جائیں گے۔ یہ گانے ہلکے پھلکے اور عوام کی سمجھ اور پسند کے مطابق ہونا چاہئیں۔ اگر کوئی ریڈیائی ڈراما نگار گانوں پر قدرت نہیں رکھتا تو اُسے یہ کام غزلوں اور نظموں سے نکال لینا چاہئے۔ غزلوں اور نظموں یا گیتوں کو جگہ دیتے وقت ان کی موزونیت پر بھی غور کر لینا چاہئے۔ دوسروں کی غزلوں اور نظموں کو لیتے وقت ان کے مصنف یا ناشر کی اجازت لینا واجب ہوتا ہے۔ کیونکہ نشرگاہ کبھی ان کی ذمہ داری اپنے سر نہیں لیتی۔ اگر کسی کو کوئی اعتراض ہوا تو اُس کا تمام تر ذمہ دار ڈراما نگار ہوتا ہے۔

گانے کبھی کبھی بالکل جذباتی ہو جاتے ہیں یعنی وہ سامعین میں بھی وہی جذبات پیدا کر دیتے ہیں جو کہ اس وقت کردار کے دل و دماغ پر حاوی ہوتے ہیں۔ ایسے گانے بہت پسند کئے جاتے ہیں مگر وہ گانے جو جذباتی نہیں ہوتے اُس قدر مؤثر بھی نہیں ہوتے اور ان سے اتنے اثرات بھی مرتب نہیں ہوتے۔ کبھی کبھی "نغموں" پر ڈرامے کا انحصار ہوتا ہے یعنی ڈراما سنگیت ناٹک کا روپ لے لیتا ہے۔ اس میں بھی ڈرامے کی نوعیت کا خیال رکھ کر گانے پیش کرنے چاہئیں۔ اگر کوئی "نغمہ" کسی ڈرامے کے وجود کا سبب بن جائے تو اسے ڈراما کی "جان" سمجھ کر اسی نوعیت کے اور گانے لانے چاہئیں۔ گانوں کو ڈراموں میں جگہ نہ دینا گویا جسم کو "روح" سے محروم رکھنا ہے۔ ایسے ڈرامے دراصل مکالمے بن جاتے ہیں۔ اس لئے مبتدی ڈراما نگاروں کو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ڈراما کو مسحورکن اثرات سے معمور کر کے گانوں کو مناسب وقفوں کے ساتھ مناسب موقعوں پر پیش کرنا چاہئے۔

<u>کردار اور اداکار</u> | اسٹیج اور اسکرین پر کرداروں کو پیش کرنا بہت زیادہ دشوار ہوتا ہے کیونکہ سامعین کے بجائے وہاں تماشائی ہوتے ہیں جو اس امر کا فیصلہ کرتے ہیں کہ پارٹ کی ادائیگی کے لئے ان کا انتخاب صحیح بھی ہوا یا نہیں۔ ان کو تماشائیوں کے روبرو اسٹیج اور اسکرین پر نمودار ہو کر . . . اپنی اداکاری اور اپنے مکالموں سے مسحور کرنا پڑتا ہے۔ ان کا قدرتی حسن سڈول جسم، خوبصورت چہرہ اور مقناطیسی آنکھیں ان پر مجموعی حیثیت سے اثرانداز ہوتی ہیں سونے پر سہاگہ یہ کہ میک اپ مناظر اور روشنی وغیرہ اس اثر کو مکمل بنانے میں اور معاون ثابت ہوتی ہیں مگر ریڈیائی ڈراما نگار کے لئے ان میں سے کوئی بھی معاون ثابت نہیں ہو سکتیں کیونکہ مناظر، روشنی، میک اپ اور قدرتی حسن اس کے سامعین کے روبرو پیش نہیں کئے جا سکتے۔ اس وجہ سے نشری ڈراما نگار کے لئے اپنے سامعین کو رام کرنا زیادہ دشوار ہوتا ہے۔ ملبوسات سے بھی ریڈیائی ڈرامے کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اگر ایک اداکار فقیر کا لباس پہن کر بادشاہ کے بول ادا کرتا ہے۔ تو ریڈیو کے سامعین پر اس متضاد پہلو کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مگر اسٹیج اور پردۂ سیمیں کے سلسلہ میں ایسی متضاد صورتوں کی زبردست اہمیت ہے۔ مائکروفون کے ڈراما میں کردار

کی اہمیت کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتی کیونکہ ڈرامے کی تخلیق کے ساتھ ساتھ ہی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے کردار کو پیش کرنے کیلئے کس قسم کے افراد کا انتخاب کیا جائے۔ اداکاروں کا انتخاب اصل ڈرامے کے موضوع پر ہوتا ہے۔ پروڈکشن انچارج کو اس کا اندازہ لگانا پڑتا ہے کہ کس قسم کے اداکار کیلئے کن کن سے آرٹسٹ اور افراد موزوں ہیں۔ یہ موزونیت جسم اور چہرہ یا اُن کی اداکاری کی نوعیت سے نہ ہوگی بلکہ اس کا انحصار "آوازوں" پر ہوگا۔ کس قسم کے کردار کی ادائیگی کے لئے کس قسم کی آوازوں کی ضرورت ہے؟ اس ضرورت کے مطابق پروڈیوسر کردار پیش کرنے والے افراد کا انتخاب کرے گا۔ اگر عورتوں کی آوازوں کی ضرورت ہے تو وہ مختلف الآواز عورتیں تلاش کرے گا۔ جس طرح کا کیریکٹر ہوگا۔ اسی طرح کی آوازیں بھی ان کو پیدا کرنا ہوں گی۔ اگر مخنی آواز کی عورت کی ضرورت ہے تو ایسی ہی آواز والی اداکار کو پسند کرنا ہوگا۔ کڑک کر بولنے والی آواز کے لئے اس قسم کی عورت کی ضرورت ہوگی۔

سن و سال کے لحاظ سے بھی اداکاروں کا انتخاب ضروری ہوگا۔ بوڑھی جوان۔ ادھیڑ اور کمسن عورتوں اور لڑکیوں کی آوازوں میں امتیاز قائم رکھنے کے لئے علیحدہ علیحدہ کرداروں کا انتخاب صنف نازک سے کرنا پڑے گا۔ مردانہ کرداروں میں بھی "آواز" انکے انتخاب کا فیصلہ کرتی ہے۔ بوڑھے۔ جوان اور کمسن۔ جس عمر کے کیریکٹر کیلئے اداکاروں کی ضرورت ہوگی ویسے ہی ان کو انتخاب کرنا ہوگا۔ بچوں کے پروگرام میں اگر بچوں کی ضرورت ہو تو بچوں کی "آواز" کی مناسبت سے انتخاب کرنا چاہئے۔

ڈراما نگار اپنے ڈرامے میں ایسے کردار عموماً رکھتا ہے جو انسانی زندگی سے انتخاب کئے گئے ہوں تاکہ سامعین کو یہ معلوم ہونے لگے کہ تمام اداکار اپنی ہی سوسائٹی کے افراد ہیں۔ انکا چناؤ ایسا ہونا چاہئے کہ وہ سامعین کے بالکل نزدیک آجائیں اور انہیں وہ اپنے ہی جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرتے نظر آئیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے افعال اور ان کی آوازیں ایسی ہوں جو برقی لہروں کے ذریعہ سے سامعین تک پہنچا دی جائیں۔ اگر وہ کامیابی کے ساتھ نشر کی جا سکتی ہیں۔ تو یقیناً ڈراما کامیاب ہوگا۔ ورنہ اس کے نقص کا احساس ہو جائے گا۔ نشری ڈراما میں کرداری ارتقا اور کرداری تکمیل کا احساس بہت جلد ہو جاتا ہے۔

نشری ڈراما لکھتے وقت کردار کی تعداد کا خیال رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اگر ڈراما نگار غیر ضروری کردار پیش کرتا ہے تو یہ سمجھ لینا ضروری ہے۔ کہ یہ غیر ضروری کردار ڈراما کی ناکامیابی کا سبب بھی بن سکتے ہیں۔ نشری ڈراما میں کردار کا تصور "چلتے صوتی" ہونا چاہئے۔ اس کے کردار گوشت اور پوست کے کردار بن کر سامعین کو دکھائی نہیں دے سکتے وہ کردار دراصل وہ آوازیں ہوتی ہیں جو اپنے امتیازات کی بدولت علیحدہ علیحدہ کردار کی خصوصیت ظاہر کرتی ہیں۔ اس طرح گویا ریڈیائی "کردار" "آوازیں" ہیں جو کردار کے نام بتا کر نشر کی جاتی ہیں۔ زیادہ کردار کے معنی زیادہ آوازیں ہیں۔ زیادہ آوازوں کے معنی آوازوں کے امتیاز کی دشواری کے ہیں۔ ایک آواز عموماً ایک کردار ظاہر کرتی ہے۔ آوازیں اکثر ملتی جلتی بھی ہوتی ہیں۔ اس وجہ سے پیش کرنے والے کی دقتوں کا احساس بھی ڈراما نگار کو رکھنا چاہئے۔ وہی ڈراما کامیابی کے ساتھ نشر کیا جاتا ہے۔ جن میں کردار کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی یعنی جن میں آوازوں کے امتیازات کی دشواریاں زیادہ نہیں پائی جاتیں۔ آواز کے امتیاز کے مٹ جانے سے پورا ڈراما خاک میں مل جاتا ہے۔ اور سامعین متنفر ہو کر اپنا سیٹ بند کر دیتے ہیں۔

مکالمے | ریڈیائی ڈراما کامل طور پر آوازوں کے ذریعہ سے سامعین تک پہنچایا جاتا ہے۔ اس میں کہیں گانے پیش کئے جاتے ہیں اور کہیں صوتی اثرات پیدا کئے جاتے ہیں۔ مگر اس کا بیشتر حصہ مکالموں پر مبنی ہوتا ہے۔ مکالموں ہی کے ذریعہ پلاٹ کے واقعات۔ ان کی ترتیب اور کردار کے جذبات اور احساسات پیش کئے جاتے ہیں۔ گویا ریڈیائی ڈرامے دراصل مکالمے ہوتے ہیں۔ ان کو نظر انداز کرنا گویا اصل ڈرامے کو ختم کر دینا ہوتا ہے۔ عام طور پر ڈراما نگاروں کا یہ خیال ہوتا ہے کہ مکالمے ہماری روزانہ زندگی کی بات چیت کے مانند ہوں۔ مگر اس میں اس قدر اضافہ کی ضرورت ہے کہ ان مکالموں میں ڈرامائی اثرات بھی ہوں۔ ہماری روزانہ زندگی کے بہت سے مکالمے "بیکار" "فضول" لغو اور لچر ہوتے ہیں۔ ان میں کبھی نہ تو زور ہوتا ہے۔ اور نہ کیف "نہ ان سے کوئی لذت محسوس ہوتی ہے۔ اور نہ ان سے کوئی مطلب برآمد ہوتی ہے۔ اگر ریڈیائی ڈراما کے مکالمے ایسے ہوئے تو وہ بھی بےکیف ہونگے۔ اس کے روزانہ زندگی سے متعلق ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ غیر

فطری نہ ہو جائیں۔ ان میں مافوق العادت باتیں نہ پیش کر دی جائیں۔ جو مکالمہ ہو وہ فطرت سے مطابقت رکھتا ہو۔ غیر ضروری اور بھرتی کے مکالمے نہ ہوں۔ ان میں جگہ جگہ اور موزوں مقامات پر سوال و جواب استفہام و تعجب، غم و غصہ اور طرب و تاسف کے انداز کو پیش نظر رکھا گیا ہو مگر یہ انداز بھی غیر فطری نہ ہو۔

کہا جاتا ہے کہ مکالموں کی کامیابی کا انحصار کردار کے طرز ادا پر ہوتا ہے۔ مگر کردار تو در اصل ڈراما نگار کے تحریر کردہ مکالموں کو پیش کرنے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ایک حد تک اداکار اس کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ مگر پوری ذمہ داری اس کی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ مصنف کے مقرر کردہ انداز میں مکالموں کو ادا کرے گا۔ اس وجہ سے ریڈیائی ڈراما نگار کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ جن جذبات کو جہاں ادا کرنا چاہئے وہاں وہ اسی طرح کے پر جوش مکالمے پیش کرے تاکہ اس کا مفہوم، اس کا مقصد اور اس کے جذبات پورے طور پر ادا ہو جائیں۔ اگر وہ عبارت کے اختتام پر تعجب، سوال، استفہام وغیرہ کی علامتیں بھی لگاتا جائے تو اس غلطی کا امکان ہی باقی نہیں رہتا۔

ریڈیائی ڈراما نگار کا یہ اولین فرض ہوتا ہے کہ وہ مکالمے "موضوع" سے متعلق لکھے اور اس طرح کہ مکالمہ موضوع میں پیوست ہو جائے۔ دونوں میں کوئی جوڑ اور پیوند محسوس نہ ہو۔ یہ نہ محسوس ہو سکے کہ ڈراما نگار کو الفاظ محاورے اور فقرے ایسے نہ مل سکے جو وضاحت کے ساتھ اس کے موضوع کو پیش کر دیتے۔ مکالمے کے جملوں اور فقروں کو برجستہ، برمحل اور چست ہونا چاہئے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مکالموں کو برجستہ بنانے میں غیر ضروری اور غیر متعلق مکالمے آ جائیں۔ بات چیت کا جو فطری جواب ہو وہی آئے۔ بلاوجہ تمثیلیں اور استعارے لانا در اصل ڈرامے کو بوجھل اور غیر فطری بنانا ہوتا ہے۔ مکالموں کی طوالت سے بھی احتراز کرنا چاہئے۔ ان کی بہترین خوبی ان کا اختصار ہے۔ مگر اختصار بھی کبھی کبھی بدنما معلوم ہونے لگتا ہے اختصار اتنا نہ ہو کہ اصل مطلب کی وضاحت بھی نہ ہونے پائے جہاں زیادہ اختصار سے یہ عیب پیدا ہو جاتا ہے۔ وہاں طوالت بھی قوت سامعہ پر گراں گذرنے لگتی ہے۔ ایجاز یا اختصار کو ریڈیائی محدود وقت کی وجہ سے اور بھی مد نظر رکھنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ریڈیائی ڈرامے مقررہ وقت میں ختم ہو جاتے ہیں جو ڈرامے مقررہ وقت کے اندر ختم نہیں ہوتے ان کو مستحسن تصور نہیں کیا جاتا۔

مکالمے پیش کرتے وقت کردار کے سماجی مرتبہ کو بھی پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔ وہ کس طبقہ کے لوگوں سے متعلق ہے؟ اس طبقہ کے لوگوں کا مخصوص انداز گفتگو، ان کے مخصوص جملے اور فقرے مکالموں میں جان ڈال دیتے ہیں اور لطف کو دوبالا کر دیتے ہیں۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ادنی طبقہ لوگوں کی رکیک اور ناگفتہ بہ باتوں کو مکالموں میں لایا جائے۔ یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ ہماری زندگی کا ہر مکالمہ، ہر گفتگو اور ہر بات چیت صفحۂ کاغذ پر نہیں پیش کی جا سکتی اور وہ آوازوں میں بھی منتقل نہیں کی جا سکتیں۔ اس وجہ سے پاکیزہ گفتگو اور پاکیزہ مکالموں کا انتخاب کرنا ہوگا۔ اور تب ان مکالموں کو صاف اور شستہ انداز میں پیش کیا جا سکے گا۔ تاکہ ابتذال بھی نہ پیدا ہونے پائے۔ اور ناگفتہ بہ باتیں سننے والوں کی قوت سامعہ پر گراں نہ گذریں۔ اسی طرح اعلیٰ طبقہ کے افراد کی گفتگو بھی من و عن پیش کر دینا درست نہیں ہوتا۔ ان کی باتوں میں سے انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ اور صاف ستھری اور سلجھی ہوئی گفتگو کو پیش کیا جاتا ہے پیشہ وروں کی اصطلاحات بھی استعمال ہو سکتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تمام گفتگو پاکیزہ، صاف اور سلیس ہو کسی قسم کا تنفر سامعین کے دلوں میں پیدا نہ ہو۔ ایسی باتیں مکالموں سے نکال دینی چاہئیں جو افراد یا طبقوں یا پیشہ وروں میں اختلافات پیدا کریں۔

"مکالمے" لکھتے وقت کرداروں کے سن و سال کا خیال رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ کس عمر کا کیرکٹر ہے؟ وہ کس جذبہ کے تحت میں جملے بول رہا ہے؟ اگر ڈراما نگار یہ بات اپنے پیش نظر رکھے۔ تو اس کے مکالمے کبھی غیر فطری نہیں ہو سکتے۔ سن و سال کے لحاظ سے جو مکالمے ضبط تحریر میں لائے جاتے ہیں۔ وہ انتہائی مؤثر ہو جاتے ہیں اور ڈرامے کی کامیابی میں مدد کرتے ہیں۔ بچوں کی زبان سے بچوں کے تخیل کے مطابق جملے ادا ہونے چاہئیں۔ ان کی زبان سے بوڑھوں کی باتیں قبل از وقت معلوم ہوتی ہیں یا بوڑھوں کی زبان

سے جوانوں کی سی باتیں مضحکہ خیز ہو جاتی ہیں۔ جوانوں کی باتوں سے اگر یہ مترشح ہو کہ وہ بوڑھے ہیں یا بچے ہیں تو اُن کی جوانی کا سامعین پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ قبل از وقت بوڑھے معلوم ہونے لگتے ہیں یا ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ ان کے قویٰ نے پورے طور پر نشوونما نہیں پائی۔ مطلب صرف یہ ہے کہ گفتگو غیر متاثر اور غیر فطری نہ ہونے پائے۔ ریڈیائی ڈراموں میں مکالمے انتہائی سادے ہونے چاہئیں جو آسانی سے سمجھ میں آجائیں۔ یہ مکالمے سادے اسی وقت ہو سکتے ہیں۔ جبکہ کردار کی صنف کو پیشِ نظر رکھا جائے، عورتوں کی زبان سے ایسے مکالمے ادا کرائے جائیں جن میں نسوانیت پورے طور پر جلوہ گر ہو۔ مردوں کے مکالمے ان کی پوزیشن یا مرتبہ کے مطابق ہونا چاہئے۔ اس وقت مکالمے زیادہ فصیح ہوں گے۔ ریڈیو میں بلاغت کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ بلیغ جملے اور فقرے اس کے حسن کو ختم کر دیتے ہیں۔

ریڈیائی ڈراموں کی زبان

ریڈیو کی زبان کا مسئلہ صرف مسئلہ زبان نہیں رہا ہے۔ بلکہ وہ ادبی حدود سے گذر کر کسی حد تک سیاسی بن گیا ہے۔ ریڈیائی ڈراموں کی زبان کیا ہونی چاہئے؟ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب یکلخت نہیں دیا جا سکتا۔ یہ مسئلہ ہندی اور اردو کا نزاعی مسئلہ ہے۔ کوئی راشٹر بھاشا استعمال کرنا چاہتا ہے اور کوئی فارسی اور عربی آمیز اُردو یعنی کوئی ریڈیائی ڈراموں کی زبان کو ہندی کے سنسکرت آمیز الفاظ سے سنوارنا چاہتا ہے۔ اور کوئی عربی اور فارسی کے الفاظ، محاورات اور فقرے استعمال کرکے اس میں زور پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ریڈیو کی حکمت عملی اس کا تصفیہ کر سکتی ہے مگر یہ حکمت عملی ان دونوں طبائع کے تابع ہوتی ہے اور جہاں جس کو موقع ملتا ہے وہ اپنی سی کر گذرتا ہے۔ یہ حکمت عملی ریڈیو کے سامعین کی تعداد کا تعین کرتی ہے۔ جس ملک میں ایک قوم اور ایک مذہب کے لوگ آباد ہوتے ہیں۔ وہاں اُن کی مادری زبان بھی ایک ہوتی ہے۔ مگر جو ملک "اُردو" یعنی لشکر گاہ بن جاتا ہے۔ وہاں ایک قوم نہیں رہتی۔ وہاں ایک قومیت کی تشکیل نہیں ہونے پاتی۔ اسوجہ سے وہاں ایک زبان بھی نہیں ہوتی۔ جتنی قومیں ہوتی ہیں اتنی ذیلی زبانیں ہوتی ہیں۔ ان میں سے چند زبانیں (Languages) بن جاتی ہیں۔ ایسے ممالک میں زبان کا مسئلہ ہمیشہ جھگڑے کا سبب بن جاتا ہے۔ یہاں یہی دشواری ہے۔ پھر بھی اس کا ایک حل نکالا گیا ہے۔ اور اس کے لئے ایک لفظ اختیار کر لیا گیا ہے: "ہندوستانی" —— اس سے مراد وہ زبان ہے جو گفتگو اور کاروبار کی زبان ہے۔ ملک کا اکثر و بیشتر طبقہ اسی کو بولتا اور سمجھتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ بعض لوگوں نے اس کو ایک خاص زبان سے منسوب کرنے کی کوشش کی مگر اس کا عام مفہوم یہی ہے۔ اس کو ریڈیو کی ضرورت کے ماتحت اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے لئے ڈرامے عام طور پر ہندوستانی میں لکھے جاتے ہیں۔ ڈراما نگار کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے ڈراموں میں ہندوستانی کو جگہ دے یعنی وہ عوام کی سمجھ کے لئے آسان سے آسان زبان استعمال کرے۔ ریڈیائی ڈراموں میں اگر ادبیت پیدا کی جائیگی اور زبان کی نکات پیش کی جائیں گی تو وہ صرف ایک طبقہ تک محدود ہو کر رہ جائیگا۔ اس میں تشبیہات، استعارات، صنائع لفظی و معنوی، اور تلمیحات کی کوئی خاص جگہ نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے ہمیشہ عام فہم زبان، عام فہم انداز، اور عام فہم لب و لہجہ میں پورا ریڈیائی ڈراما پیش کرنا پڑتا ہے۔ تاکہ وہ ہر طبقہ کے سامعین سے خراجِ تحسین حاصل کر سکے۔

مذکورہ بالا سطور میں جو کچھ تحریر کیا گیا ہے۔ وہ ریڈیائی ڈراموں کی ضروریات کو مدِنظر رکھ کر لکھا گیا ہے مگر ریڈیائی ڈراما نویسی کے فن کے متعلق قواعد و ضوابط مرتب کرنا در اصل ڈراما نویسی کے فن کو محدود کرنا ہے۔ ڈراما نگار ایک فنکار ہوتا ہے۔ وہ اپنے آرٹ کو بخوبی سمجھتا ہے۔ مگر صرف آرٹ کے سمجھ لینے سے وہ کامیاب ڈراما نگار نہیں بن سکتا۔ اسے اپنے اوپر پابندیاں عاید کرکے ڈراما لکھنے کی مشق بہم پہنچانا پڑتی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ وقت کی تبدیلیوں کو بھی پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے۔ اگر وہ زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ قدم نہیں اٹھاتا تو اس کا فن کند ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے ڈرامے قبول عام کی سند حاصل نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ سامعین کے رجحانات کی تبدیلیوں کا بھی اندازہ لگاتا رہے جس زمانے میں لوگ طربیہ ڈرامے پسند کریں تو اسے ان کی طرف توجہ دینا چاہئے۔ اگر المیہ ڈراموں کی مانگ ہو تو اُسے المیہ لکھنے چاہئیں۔ اگر سامعین مزاحیہ ڈرامے پسند کرتے ہوں تو مزاحیہ ڈرامے لکھنا ضروری ہیں۔ مگر یہ سب اسوقت جبکہ ڈراما نگار کو ان تمام اسالیب نگارش پر قدرت ہو۔

عندلیب شادانی

ترانہ، دوبیتی، رباعی

جولائی، اگست ۱۹۴۲ء کے شاعر (آگرہ) میں یہ سطریں نظر سے گذریں:

"استفسار۔

دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر حریمِ کبریا سے آشنا کر
جسے نانِ جویں بخشی ہے تو نے اُسے بازوئے حیدر بھی عطا کر

مندرجہ بالا کو بعض لوگ رُباعی کہتے ہیں اور بعض قطعہ۔ اس سلسلہ میں کوئی صحیح فیصلہ نہیں ہو سکا ہے۔ آپ اپنی رائے سے مطلع فرمائیے"...

... دل شاہ بسمل دھورہی

جواب:۔ "یہ اشعار بطور قطعہ ہیں۔ رباعی نہیں۔ کیونکہ ان کی بحر ہزج مسدس مقصور ہے۔ جس کا وزن یہ ہے:۔ مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیل[1]

رُباعی کے مخصوص اوزان یہ ہیں:۔ مفعول، مفاعلن، مفاعیلن، فع (رُباعی کے ۲۴ وزن اور نکلے ہیں) ان اوزان میں سے جواب طلب اشعار کسی وزن پر نہیں۔ اس لئے وہ بطور قطعہ جانے چاہئیں"۔ آلم مظفر نگری

پھر اکتوبر ۱۹۴۲ء کے شاعر میں یہ استفسار و جواب شائع ہوا:۔

استفسار:۔ "جولائی، اگست کے شاعر میں آپ نے لکھا ہے کہ اقبال کے اشعار "دلوں کو مرکزِ مہر و وفا کر" الخ قطعہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن کتاب رباعیات ابوسعید ابوالخیر میں مندرجہ ذیل اشعار بھی اسی وزن میں ہیں:۔

خدا وندا بگردانی بلا را
ازیں آفت نگہداری تو ما را
بحقِ آں دو گیسوئے محمد
مشوش کن خراب آباد ما را

کتاب کا نام ظاہر کرتا ہے کہ مندرجہ بالا دو شعر رباعی ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے"۔ ... گلشن جلال آبادی

جواب:۔ "ہاں اقبال کے اشعار کو رباعی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ وہ رباعی کے مقررہ اوزان سے باہر ہیں۔ اسی طرح ابوسعید ابوالخیر کے اشعار بھی رباعی نہیں۔ رہی یہ بات کہ پھر وہ رباعیات کے سلسلے میں کیوں درج کر دئے گئے۔ اس کی ذمہ داری مدون کتاب پر ہے نہ کہ مصنف پر"۔

... آلم مظفر نگری

۱۹۲۳ء میں جس وقت علامہ اقبال کی "پیامِ مشرق" کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا تو میں لاہور میں موجود تھا۔ وہیں اور انہی دنوں میں نے اس کتاب کو پہلی بار سرسری نظر سے دیکھا۔ فہرست عنوانات میں ایک عنوان ہے "لالۂ طور" اور اس کے نیچے لفظ "رباعیات" تحریر ہے۔ اس عنوان کے ماتحت جو "رباعیات" درج ہیں، ان کا نمونہ یہ ہے:۔

تنے پیدا کن از مشتِ غبارے تنے محکم تر از سنگیں حصارے
درونِ او دلِ دردآشنائے چو جوئے در کنارِ کوہسارے

ظاہر ہے کہ یہ اشعار رباعی کے مخصوص وزن پر نہیں۔ اسلئے قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے کس بنیاد پر انہیں رُباعی قرار دیا اور عنوان "رباعیات" ان کے لئے درست سمجھا۔

کئی دن تک یہ سوال میرے دل میں کھٹکتا رہا اور اس کا کوئی تسلی بخش جواب میری سمجھ میں نہ آیا۔ بالآخر ایک دن میں نے علامہ مرحوم سے پوچھا کہ پیامِ مشرق میں لالۂ طور کے ماتحت جو اشعار درج ہیں ان کے لئے آپ نے "رباعیات" کا عنوان کس بنا پر اختیار فرمایا ہے۔ حالانکہ وہ اشعار رباعی کے مخصوص وزن پر نہیں ہیں۔ علامہ نے فرمایا کہ باباطاہر عریاں ہمدانی[2] کی

---

[1] اقبال کی مندرجہ بالا رُباعی کا یہ وزن نہیں جو آلم صاحب نے لکھا ہے۔ اس کا وزن ہے: مفاعیلن مفاعیلن فعولن اور اس بحر کا نام ہے ہزج مسدس محذوف (شادانی)

[2] بقول بعض باباطاہر، فردوسی کا ہم عصر ہے۔ بعض نے اس کو سلجوقیوں کا معاصر مانا ہے

"رباعیات" تو آپ نے دیکھی ہوں گی۔ میں نے عرض کیا کہ دیکھی ہیں۔

اس پر علامہ نے بابا طاہر کی یہ رباعی پڑھی :۔

نسیمے کز بنِ آن کاکل آیو مرا خوشتر ز بوئے سنبل آیو
چو شو گیرم خیالش را در آغوش سحر ز بسترم بوئے گل آیو[2]

اور فرمایا کہ دیکھئے اسکا بھی وہی وزن ہے جو میرے زیرِ بحث اشعار کا ہے۔ اور رباعی کا مخصوص وزن نہیں۔ اس کے باوجود اہلِ ایران انہیں رباعی ہی کہتے ہیں اور ایران، ہندوستان اور یورپ میں جتنے مجموعے کلام بابا طاہر کے چھپے ہیں۔ اُن سب کے سرورق پر "رباعیات بابا طاہر" ہی لکھا ہے۔ جہاں تک فارسی کا تعلق ہے۔ ایرانی اہلِ زبان ہیں اور ہم زباں داں اور اصولاً زبان کے معاملے میں جمہور اہلِ زبان کا تتبع زبان دانوں کیلئے ضروری ہے۔ دستورِ زبان کے کلیات بجائے خود درست ہیں لیکن استثناء کی صورتوں میں اہلِ زبان کی پیروی لازم ہے۔ مانا کہ رباعی کا ایک مخصوص وزن ہے۔ لیکن بابا طاہر کے اشعار کو اگر اہلِ ایران عام طور پر رباعی کہتے ہیں تو ہمیں کیا حق ہے کہ عروض کی کتابوں کا سہارا لے کر ہم ان پہ اعتراض کریں۔ اسی بنا پر میں نے اپنے اشعار زیرِ بحث کو رُباعی کہنا درست سمجھا۔ کیونکہ وُہ بھی بابا طاہر کی رباعیات کے وزن پر ہیں

میں نے عرض کیا کہ مخصوص وزن کے علاوہ رُباعی کے پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعوں کا ہم قافیہ ہونا ضروری ہے اگر پہلے مصرع میں قافیہ نہ ہو تو ہم اُسے قطعہ کہتے ہیں اور آپ کی رباعیات میں اس قسم کے قطعات بھی شامل ہیں۔ ان کے متعلق کیا ارشاد ہے۔ فرمایا کہ یہ اعتراض آپ کا صحیح ہے اور یہ سہوِ کاتب ہے کہ رباعیات و قطعات کے بجائے اُس نے صرف رباعیات لکھا

علامہ کے اس بیان سے میں مطمئن ہو گیا اور ۱۹۴۲ء میں جس وقت میں نے رباعیات بابا طاہر کا ایک خاص ایڈیشن (مع ترجمہ و شرح) لاہور سے شائع کیا تو اُس کا نام "الدّرر الزاہر فی شرح رباعیات بابا طاہر" رکھا

۱۹۳۳ء میں جب مجھے سیاحتِ ایران کا اتفاق ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہاں صرف عوام ہی نہیں بلکہ خواص بھی اشعار بابا طاہر کو عموماً رباعیات ہی کہتے ہیں۔

رضا قلی خاں ہدایت نے جو قاچاری دور کا ایک نامور شاعر، مصنف اور لغت نویس ہے۔ اپنی مشہور تالیف مجمع الفصحا میں بابا طاہر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :۔

"رباعیات بدیع و مضامین رفیع بزبانِ قدیم دارند"

آج سے بیس سال قبل آقا۔ سے وحید دستگردی مدیر مجلّۂ ارمغان نے طہران سے اشعار بابا طاہر کا جو مجموعہ شائع کیا ہے۔ اس کے مقدمہ نگار آقائے محمود خاں عرفان شیرازی نے بھی ان اشعار کو "رباعیات" کہا ہے

فاضل مستشرق پروفیسر براؤن نے المعجم فی معاییر اشعار العجم تالیف شمس قیس رازی کا جو یورپین ایڈیشن شائع کیا ہے۔ اُس کے حاشیے (صفحہ ۸۰) میں بابا طاہر کے اشعار کا ایک حوالہ دیتے ہوئے انہیں "رباعیات" ہی کہا ہے

ظاہر ہے کہ رضا قلی خاں ہدایت۔ عرفان شیرازی۔ پروفیسر براؤن اور علامہ اقبال جیسے فضلا کی متفقہ رائے کو ہم آسانی سے غلط قرار نہیں دے سکتے۔ علامہ اقبال کی رائے کا سبب تو ہمیں معلوم ہو گیا۔ پروفیسر براؤن اور دوسرے مستشرقین نے بھی غالباً اہلِ ایران کے تتبع میں اشعار بابا طاہر کو رباعیات قرار دیا۔ لیکن اس امر کی تحقیق ہنوز باقی ہے کہ خود اہلِ ایران کس بنا پر ان اشعار کو رباعی کہتے ہیں۔

شمس قیس رازی جس نے ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں اپنی بیش بہا تالیف "المعجم فی معاییر اشعار العجم" مرتب کی۔ وزنِ رباعی کے ذکر میں لکھتا ہے :۔

"اہلِ دانش نے اس وزن کے گانوں کا نام "ترانہ" رکھا اور اس کے اشعار کو دوبیتی کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کی بنا دو بیت پر ہے اور عربی عوام

---

[1] اُس زمانہ میں رباعیات بابا طاہر پنجاب یونیورسٹی میں ایم۔ اے فارسی کے کورس میں داخل تھیں (شادانی)

[2] میں نے اس شعر کو تھوڑے سے تغیر بلکہ اضافے کے ساتھ اردو میں اس طرح نظم کیا ہے :۔

تھا شب ترا خیال ہم آغوشِ خواب میں بستر مہک رہا ہے مرا بوئے گل سے آج

اسے رباعی کہتے ہیں۔

المعجم کے علاوہ چہار مقالہ نظامی عروضی سمرقندی میں جو ۵۵۲ھ کی تالیف ہے۔ ایسی تصریحات موجود ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ترانہ دوبیتی اور رُباعی ایک ہی مُسمّیٰ کے تین مختلف نام ہیں۔ چنانچہ مقالہ دوم میں امیر معزی کا یہ واقعہ مذکور ہے کہ

"سب سے پہلے سلطان نے چاند دیکھا اور بہت مسرور ہوا۔ علاؤالدولہ نے مجھ سے کہا کہ تم برہانی کے بیٹے ہو۔ اس ماہِ نو کے متعلق کچھ کہو۔ میں نے فوراً یہ دوبیتی کہی :-

اے ماہ چو ابروانِ یاری گوئی ؞ یا نے چو کمانِ شہریاری گوئی
نعلے زدہ از زرِ عیاری گوئی ؞ در گوشِ سپہر گوشوارى گوئی

جس وقت میں نے یہ (دوبیتی) پیش کی تو امیر علی نے بہت تعریف کی اور سلطان نے کہا کہ جاؤ، شاہی اصطبل سے جو گھوڑا تمہیں پسند ہو کھول لاؤ . . . پھر ہم سب دسترخوان پر بیٹھے۔ امیر علی نے کہا کہ اے پسرِ برہانی خداوندِ جہاں نے تمہیں جو انعام دیا ہے۔ اس کے متعلق تم نے کچھ نہیں کہا۔ ابھی ایک دوبیتی کہو۔ میں فوراً اُٹھ کر تعظیم بجالایا اور فی البدیہہ یہ دوبیتی کہی :-

چوں آتشِ خاطرِ مرا شاہ بدید ؞ از خاک مرا بر زبرِ ماہ کشید
چوں آبِ یکے ترانہ از من بشنید ؞ چوں بادیکے مرکبِ خاصم بخشید

ظاہر ہے کہ یہ دونوں دوبیتیاں رباعیاں ہیں اور انہیں میں سے پہلی رباعی کو شاعر نے "ترانہ" بھی کہا ہے۔

اسدی طوسی نے لغتِ فرس میں جو پانچویں صدی ہجری کی تالیف ہے ترانہ کے معنی دوبیتی لکھے ہیں، اور فرخی کا یہ شعر سند میں نقل کیا ہے

ز دل آویزی و تری چو غزل ہائے شہید
و ز غم انجامی و خوشی چو ترانہ بو طلب[1]

ان بیانات سے یہ بات تو ثابت ہوگئی کہ ترانہ۔ دوبیتی۔ اور رباعی ایک ہی چیز کے تین مختلف نام ہیں اور وہ نظم کی ایک مخصوص صنف ہے جو بحرِ ہزج مثمن اخرم اور اخرب میں لکھی جاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اہلِ ایران بابا طاہر کی رباعیات کو جو رباعی کے مخصوص وزن بحرِ ہزج مثمن اخرب یا اخرم کی بجائے بحرِ ہزج مسدس مقصور یا محذوف میں ہیں۔ کس بنا پر رباعیات کہتے ہیں۔

اہلِ ایران کے قول کے مطابق جس طرح وزنِ رباعی ایرانی موسیقی کے لئے نہایت مناسب و موزوں ہے۔ اسی طرح بابا طاہر کی رباعیات کا وزن بھی ایرانیوں کو بے حد پسند ہے۔ چنانچہ شمس قیس نے اس وزن کو "خوشترینِ اوزان"[2] کہا ہے اور اس وزن کے اشعار خصوصاً رباعیات بابا طاہر عام طور پر ایران میں ستار پر گائی جاتی ہیں۔ جس طرح وضع کے اعتبار سے رباعی کو دوبیتی کہتے ہیں۔ اسی طرح بابا طاہر کے اشعار کو بھی دوبیتی کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ بھی دو دو شعروں کے جوڑے ہیں اور رباعی کی طرح ان میں پہلا، دوسرا اور تیسرا مصرع ہم قافیہ ہیں۔ چنانچہ مرزا لطف علی بیگ آذر نے "آتشکدہ" میں بابا طاہر کے اشعار کو "دوبیتی" کے نام سے موسوم کیا ہے اور گذشتہ بیس سال میں اشعار بابا طاہر کے دو ایڈیشن جو آقائے وحید دستگردی مدیر مجلہ ارمغان کے اہتمام سے طہران سے شائع ہوئے۔ اُن میں بھی اُنہیں دوبیتی کہا گیا ہے اور چونکہ یہ دوبیتیاں اپنے سادہ و دلنشین مضامین نیز اپنے مطبوع و دلپسند وزن کی وجہ سے ایران میں عام طور پر گائی جاتی ہیں۔ اس لئے اُن میں اور عام رباعیات میں کئی باتیں مشترک ہیں:-

(۱) وضع کے اعتبار سے دونوں کو دوبیتی کہتے ہیں
(۲) اپنی خوش آہنگی کی بنا پر دونوں کو ایرانی موسیقی سے خاص مناسبت ہے اور دونوں گانوں کے لئے مخصوص ہیں۔ گویا دونوں "ترانہ" ہیں۔
(۳) دونوں بحرِ ہزج میں ہیں۔ فرق یہ ہے کہ رُباعی کا وزن مثمن ہوتا ہے اور ان دوبیتیوں کا مسدس۔

اسی مماثلت کی بنا پر اہلِ ایران انہیں بھی رباعیات کہتے ہیں اور اُنہیں قطعہ کہنا اس لئے درست نہیں کہ قطعے کے پہلے مصرع میں قافیہ نہیں ہوتا اور رُباعی میں ضروری ہے۔ چنانچہ جن دوبیتیوں میں بابا طاہر نے پہلے مصرع میں قافیہ اختیار نہیں کیا۔ اگرچہ وزن ایک سا ہے

---

[1] دیکھو المعجم تالیف شمس قیس یورپین ایڈیشن صفحہ ۸۸ [2] دیکھو المعجم تالیف شمس قیس یورپین صفحہ ۸۰

[illegible]الایمان نے انہیں قطعہ کہا ہے۱؎

حاصل اس بحث کا یہ ہے کہ چونکہ اُردو کا عروض فارسی کے عروض پہ مبنی ہے لہذا اگر اہلِ ایران اُن دوبیتیوں کو بھی رُباعی کہتے ہیں جو بحر ہزج مسدس مقصور یا محذوف میں لکھی جائیں اور جس کا نمونہ باباطاہر کی رباعیات ہیں تو اقبال یا کسی دوسرے شاعر کی لکھی ہوئی اردو یا فارسی کی اُن دوبیتیوں کو بھی رُباعی کہنا جائز ہے جو اسی بحر و وزن میں ہوں۔ لہذا اقبال کی اس دوبیتی کو جو اس مضمون کے شروع میں نقل کی گئی۔ رباعی کہنا صحیح اور قطعہ کہنا غلط ہے۔ کیونکہ جیسا ہم پیشتر بیان کر چکے ہیں قطعہ کے پہلے مصرع میں قافیہ نہیں ہوتا۔ زیرِ بحث دوبیتی میں رباعی کی طرح پہلا دوسرا [illegible] ہم قافیہ ہیں۔

یہ بات نہ بھولنا چاہئے کہ زبان کے معاملے میں قیاس کو دخل نہیں دوبیتیاں اور بحروں میں بھی لکھی جا سکتی ہیں۔ لیکن ہر بحر کی دوبیتی کو رُباعی نہیں کہہ سکتے۔ بحر ہزج مثمن اخرب یا اخرم میں جو دوبیتیاں لکھی جائیں۔ اُنہیں رُباعی کہتے ہیں۔ یہ قاعدۂ کلیہ ہے اور بحر ہزج مسدس مقصور یا محذوف میں جو دوبیتیاں لکھی جائیں اُنہیں بھی رباعی کہتے ہیں یہ اُس قاعدۂ کلیہ کا استثنا ہے۔

۱؎ دیکھو دیوان باباطاہر مرتبہ وحید دستگردی پہلا ایڈیشن [illegible]



غالب کے بعد

[ادبی تنقید اور علم النفس کے موضوع پر پروفیسر کلیم الدین احمد نے ایک سیر حاصل اور بدیع مقالہ انگریزی میں تحریر فرمایا ہے۔ اس زاویۂ خاص سے عملِ تنقید کا جائزہ اب تک کسی نے اُردو میں نہیں لیا کاش پروفیسر کلیم کا گرانمایہ مضمون اردو کا لباس پہن لے!

ایک دفعہ ادب لطیف، لاہور میں کسی صاحب کا مضمون اختر شیرانی کی ایک نظم کے نفسی تجزیہ پر شائع ہوا تھا۔ پروفیسر سید محمد محسن، شعبۂ فلسفہ و نفسیات پٹنہ کالج اسی رنگ میں تفصیلی کام کر رہے ہیں۔ اول الذکر مضمون بہت تشنہ تھا۔ پروفیسر محسن اردو غزل گو شعرا کی پوری نسل پر نفسیاتی تجزیہ کا نازک نشتر چلا رہے ہیں۔ اگر یہ کام پورا ہو گیا تو گذشتہ تین صدیوں کی اندرونی کھڑکیاں کھل جائیں گی اور ایک قوم کی ذہنی و نفسی زندگی کی تصویر سامنے آ جائے گی۔ کیونکہ شعرا سماج کے نمائندہ، اظہاریہ اور قبلہ نما ہوتے ہیں۔

میرا ایک طویل مضمون ۱۹۴۱ء اکتوبر رسالہ اردو، دہلی میں بعنوان "غالب کا فن اور اس کا نفسیاتی پس منظر" شائع ہوا تھا۔ میں نے غالب کے ادبی اور ذہنی اور نفسی ورثوں اور پھر اس کے ماحول کا تجزیہ کر کے اس جلیل القدر شاعر کی قماش نفس کو سمجھانے کی کوشش کی تھی اور میں نے یہ بھی دکھلایا تھا کہ اس قماش کا ٹھپہ غالب کی شاعری خصوصاً اور طرزِ ادا پر نمایاں طور سے پڑا ہے۔ اس طرح غالب اور غالب کے قبل کی شاعری پر اس رنگ میں تنقید ہو گئی تھی۔ ماحول کے سلسلے میں اس کے زمانے کی شاعری بھی زیرِ بحث و نظر آ گئی تھی۔ میں مندرجہ ذیل مقالہ میں غالب کے بعد کی شاعری کا جائزہ لینا چاہتا ہوں]

ادب میں روحانی نتائج کا سلسلہ چلتا ہے اور روایات ادب کے ذریعہ ورثہ منتقل ہوتا رہتا ہے۔ اس طرح ماضی کی پکار برابر سنائی دیتی رہتی ہے۔ مگر تاریخ پورے طور پر کبھی دہرائی نہیں جاتی۔ فطرت کے خزانے میں نئے نمونوں کی کمی نہیں۔ حال کے مطالبات بھی اٹل ہوتے ہیں۔ ماحول کا اثر بھی ایک بہت بڑی قوت ہے۔ غرض ورثہ اور ماحول کا قانون ادب کی زندگی میں بڑی شدت سے کارفرما رہتا ہے۔ ادب حیات کے دوسرے مظاہر کی طرح ایک تسلسل ہے۔ لیکن فنکار صرف ورثہ اور ماحول کے اثرات کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ اس کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں فیضانِ رحمت کا بلا واسطہ دخل بھی ہوتا ہے۔ یہ فیضان ورثہ اور ماحول کو بعض دفعہ غیر متوقع انداز میں ترکیب دیتا ہے اور فنکار کی شخصیت کی انوکھی تنظیم رونما ہوتی ہے۔ علم الکیمیا میں ایک عمل (Catalysis) کہلاتا ہے۔ دو اجزاء مل کر عام طور سے جس طرح ترکیب پاتے ہیں، وہ ترکیبی صورت اور نوعیت ایک تیسرے چھوٹے سے کیمیاوی جز کی محض موجودگی سے بدل جاتی ہے اور وہ جز خود نہیں بدلتا۔ یعنی نئے مرکب میں وہ خود نہیں ملتا۔ شادی بیاہ کے معاملہ میں جو حیثیت مشاطہ یا اگوا کی ہوتی ہے وہی Catalytic ایجنٹ کی ہوتی ہے۔ میں اسے عمل مشاطگی کہوں گا۔ مشاطۂ فطرت بھی ورثہ اور ماحول کو کبھی نئی طرح سے سنوارتی اور انوکھے انداز سے رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیتی ہے اور جب فیضانِ فطرت کا یہ عمل ہوتا ہے تو ورثہ اور ماحول کے انہیں تاثرات کی ترکیبی شکل نرالی اور خاص الخاص ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض دور یا دبستان میں کوئی شاعر یا ادیب بالکل نرالا اور انوکھا نظر آتا ہے۔ مثلاً دبستان دہلی میں غالب اور دبستان لکھنؤ میں میر انیس۔

اس انوکھے پن کی ایک اور وجہ بھی ہوتی ہے۔ اس کی تشریح میں نے غالب والے مقالہ میں علم الحیات کے قانون بداعت (Mutation) سے کی تھی۔ یعنی یہ کہ ورثے کے ذریعہ نسلی خصوصیات تمام کی تمام ایک ساتھ رونما نہیں ہوتیں بلکہ بعض دفعہ ایک خصوصیت کئی پشت بعد اچانک ظاہر ہو جاتی ہے اور اس درمیان میں دبی دبائی رہتی ہے۔ بچہ باپ، ماں، چچا، ماموں سے تھوڑی یا بہت مشابہت تو رکھتا ہی ہے۔ مگر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خاندان کے کسی نزدیکی رشتہ والے

کوئی مشابہت نہیں پائی جاتی بلکہ پر دادا یا لکڑ دادا یا نانا سے صورت ملتی ہے۔ جن خاندانوں میں تصویریں یا فوٹو رکھے جاتے ہیں۔ وہاں اس امر کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ ادب میں بھی یہ بداعت کا قانون عمل کرتا ہے۔ روایت ادب کے نسل میں الگ الگ روایتی سلسلے بھی ہوتے ہیں۔ میر انیس کی شاعری میں خارجیت اور داخلیت کے امتزاج کو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے۔ جب تک سودا اور ملا وجہی دکنی کی شاعری میں داخلیت اور خارجیت کی آمیزش کا مطالعہ نہ کرلیں۔ حسرت موہانی بھی اسی سلسلے میں شامل ہیں۔ اصغر گونڈوی نے غالب اور میر کی وراثت پائی ہے۔ خیال عظیم آبادی کی فنکارانہ تخیل آفرینی سعدی شیرازی کی وراثت ہے۔ اور شاد کی شاعری انیس، سودا اور میر کی۔

"بداعت" اور "مشابہت" کے قوانین کا ادب و فن میں اس لئے نفاذ ہوتا ہے کہ تخلیق ادب کا تعلق براہ راست دل و دماغ سے ہے اور یہ ذہنی حیات وجہد، حیاتیاتی، نفسیاتی اور کیمیاوی قوانین کے ماتحت ہیں۔ اس کے علاوہ مطالعہ و مشاہدہ اور دوسرے نوع در نوع تجربات زندگی اور فیضانِ فطرت، تاثیر و تاثر اور عمل و ردّ عمل کے ذریعہ دماغ و دل کی قماش کو بدلتے رہتے ہیں۔ ادب و شاعری کی جڑیں بطنِ زندگی میں ہیں۔ لہٰذا ان کی پوری سمجھ بوجھ کے لئے علم الحیات اور علم النفس کی روشنی ضروری ہے۔

میں نے اپنے متذکرہ بالا مضمون میں یہ عرض کیا تھا کہ غالب ایک دوراہے پر کھڑا تھا اس کے زمانہ میں ایک عصر ختم ہو رہا تھا۔ اور دوسرا شروع۔ غالب دونوں کے درمیان تھا اور ایک نفسی دوبدھے میں مبتلا۔ عصر دہلی کے فیضانہ رجحانات کے ساتھ بدلتی ہوئی فضا کے اثباتی عناصر بھی غالب کی شاعری میں ظاہر ہوتے ہیں۔ غالب کے بعد اردو شاعری میں نئے رجحانات کے دو سلسلے نظر آتے ہیں۔ ایک ارتقائی اور دوسرا انحطاطی۔ مگر ان دونوں کا تعلق اپنے ماقبل کے دور سے براہ راست ہے۔ غالب کے بعد کے ارتقائی سلسلہ کی پہلی کڑی حالی کی شاعری ہے۔ اس کی دوسری اہم کڑی اکبر الہ آبادی کی شاعری اور تیسری اقبال کی شاعری ہے۔ انحطاطی سلسلہ دبستان لکھنؤ ہے۔ میں پہلے مدرسہ لکھنؤ سے بحث کروں گا۔ اور بعد ازاں ارتقائی زنجیر کے سرے کو ہاتھ لگاؤں گا۔

دبستان لکھنؤ کا نفسیاتی تعلق دبستان دہلی سے ہرچند کہ نمایاں نہیں معلوم ہوتا مگر وہ بہت گہرا ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ خصوصیات جو دبستان لکھنؤ میں بالیدہ ہوئیں ان کی ابتداء دلی میں ہی ہو گئی تھی یعنی رجحانات پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے۔ آیئے پہلے اس تعلق کا تجزیہ کیا جائے۔

ادب و شاعری پر اجتماعی قماش دماغ کا اثر پڑتا ہے۔ کیونکہ فنکار کی نفسی ترکیب اجتماعی رجحانات سے متاثر ہوتی ہے اور تخلیق فن دماغ کے کارخانے میں ہی ہوتی ہے۔ یہ اجتماعی نفسی قماش قانون ورثہ اور ماحول کے مطابق حال اور ماضی کی ادبی، اخلاقی، سیاسی و اقتصادی خصوصیات سے متاثر ہوتا ہے۔ لہٰذا ادب و شاعری کی پیدائش اور ان کی نوعیت کی تشکیل میں مذکورہ بالا چیزوں کا بڑا دخل ہے۔

دبستان دہلی کی فیضانہ خصوصیات اس عہد کی عام خصوصیات کے نتیجہ میں پیدا ہوئی تھیں۔ اپنے پہلے مضمون میں میں نے اس پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ میں نے یہ بھی بتایا تھا کہ عام دبستانی خصوصیات کا رنگ تو دبستان کے سارے شعراء پر چڑھتا ہے۔ مگر کچھ انفرادی خصوصیات بھی ہوتی ہیں جو انفرادی ردّ عمل، قانون بداعت اور قانون مشابہت کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں۔ بہرکیف دبستان دلی کی عام خصوصیات کی تہ میں نفسی و ذہنی اضمحلال، فرار و گریز، غم و الم، آہ و نالہ ہی ہیں۔ غرض کہ ایک فیضانہ کیفیت طاری ہے۔ جس کے اثر سے داخلیت، شدید انفرادیت جذبات پروری، رقت خیزی تخیئلت، مبہم تصورات کی صورت نمائی اور ظاہری رکھ رکھاؤ، آرائش و نفاست طرز ادا کی صنعت گری سے بیگانگی وغیرہ باتیں ہوئیں۔ دبستان دلی کے پہلے دور میں یعنی عہد میر، سوز درد و سودا میں یہ کیفیات بہ نسبت دوسرے دور یعنی عہد مومن، ذوق و غالب کے زیادہ ہیں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ نفسی ردّ عمل کی نوعیت اور ماحول بدل رہے تھے۔ پہلے دور میں اجتماعی احساسِ زوال تازہ تھا زمانہ نے دلوں پر جو چرکے لگائے تھے۔ اس کا زخم ابھی ہرا تھا ٹیسیں رہ رہ کے اٹھتی تھی۔ اضطراب میں کسی پہلو چین نہ ملتا تھا۔ مگر اقدام

کے لیے کسی جانب راہ بھی نہ ملتی تھی۔ سارے دروازے بند تھے۔ ناامیدی مایوسی و حسرت کی کالی بدلیاں برسنے والے بادلوں کی طرح منڈلا رہی تھیں۔ مایوس فضا میں فنکاروں نے اپنے من مندر میں پناہ لینی چاہی مگر اس باطنی دنیا میں بھی احساسات نے بے چین ہی رکھا۔ ماضی کی یاد کے نشتر لگتے رہے ناکامی و نامرادی، پستی و ذلت، انحطاط و زوال، پسپائی و گریز نے ان کے قدم اکھاڑ دیئے مگر بھاگ کر بھی انہیں سوز و درد سے نجات نہ ملی۔ دل میں جو کسک اٹھتی رہی، خلش و اضطراب باقی رہے۔ وہ غم عشق بھول سکے نہ غم روزگار۔ سودا کی بالیدہ و نسبتاً متوازن شخصیت بھی اپنی غزلوں میں کراہ اٹھی اور اپنے ہجووں میں چڑچڑی اور کف در دہن ہو گئی۔ میر تو مجنون سا ہی ہو گیا۔ دوسرے دور میں اجتماعی تجربہ نے ماضی کی نامرادیوں کو ٹھنڈا ٹھنڈا بھولنا شروع کیا۔ زخم اب ناسور بن چکا تھا۔ درد دل کا مرض مزمن ہو چکا تھا۔ نیا گھاؤ زیادہ دکھ دیتا ہے۔ پرانے زخم میں اتنی ٹیس نہیں ہوتی۔ کم از کم گھائل کا اضطراب کم ہو جاتا ہے عادی ہو جانے کے سبب یا تڑپتے تڑپتے تھک کر نڈھال ہو جانے سے۔

ع۔ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا (غالب)

غالب کو اس امر کا گہرا ادراک تھا اور کہتا ہے۔ ع

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

دوسرے دور میں مشکلیں کم نہیں ہوئی تھیں، درد گھٹا نہیں تھا، بلکہ صبر مجبور پیدا ہو گیا تھا۔ ایسا صبر نہیں جو حالات کو بدل دینے کی تحریک کرتا اور عمل کی خاموشی قسم کھا لیتا ہے۔ منفیانہ کیفیت طاری ہی رہی، صرف سوز و اضطراب۔ اور آہ و نالہ گھٹ گئے۔ دلی کی شہر آشوب بلائیں دور تو ہوئیں۔ مگر ان لعنتوں کے دور ہو جانے کے بعد سطحی امن پیدا ہوا۔ اور نقلی برکتوں نے تاڑ کی چھاؤں کی طرح دلی کو اپنے سایۂ عاطفت میں لیا۔ کچھ تو اپنی افتاد طبع اور پرزور شخصیت کے سبب اور کچھ بدلی ہوئی معنوی فضا کی وجہ سے غالب مثبت اور منفی اثرات کی کشاکش میں مبتلا ہو کر مذبذب اور متشکک ہو گیا۔ اردو شاعری میں نشاطِ حیات اور زندگی سے محبت کا جوش سب سے پہلے دکنی شعراء میں ملتا ہے۔ اس کی کرن سودا کی تشبیبوں میں پھوٹتی ہے مگر کالی گھٹاؤں میں پھر چھپ جاتی ہے۔ غالب کی شاعری میں نئے نور کے ساتھ امید کی پو پھوٹتی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اس تیز رو رنگ کا مکمل جلوہ اقبال و جوش میں نظر آیا۔

نصیر دہلوی اور ذوق دبستان لکھنؤ کے اُسی طرح پیش رو تھے جیسے محمد شاہ رنگیلے واجد علی شاہ کا نقش اول تھا۔ دلی میں بھی وہی نفسی اور ثقافتی تبدیلیاں شروع ہو گئی تھیں جن کے عروج نے دبستان لکھنؤ پیدا کیا اور بعد میں بھی خود دلی میں داغ پیدا ہو گئے جو اپنے ذہنیت کے اعتبار سے بالکل لکھنوی اور رام پوری ہے۔ امیر مینائی ثم لکھنوی اور داغ دہلوی ایک ہی قماش نفس کی پیداوار ہیں۔ ان پر ایک ہی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ داغ جہاں آباد کا آخری شاعر نہیں، امیر مینائی مجروح آخری شاعر تھا۔ خزاں رسیدہ باغ کا آخری تنہا پتہ اور اسے بھی صرصر نے جلد گرا دیا۔

زوال و انحطاط کی جب انتہائی منزلیں پہنچ جاتی ہیں اور معاشرہ میں شکست خوردگی کی ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے۔ تو اس حال میں دو طرح کے رد عمل ہو سکتے ہیں۔ ایک تو وہ نفسی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ جسے قرآن حکیم نے یوں پیش کیا ہے:۔

فِی قُلُوبِہِمْ مَرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا۔ یعنی بداعمالیوں اور بدفکریوں کے نتیجے میں قوانین فطرت کا اس طرح عمل شروع ہوتا ہے کہ بیماری اور بڑھ جاتی ہے اور اس فزونیٔ مرض کا احساس بھی باقی نہیں رہتا۔ سماج کے دلوں پر مہر لگ جاتی ہے۔ اور اس کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ وہ اپنے گرد فریب کی ایک دنیا بنا لیتی اور سراب آسا عشرت میں مبتلا ہو کر طغیان میں بھٹکتی پھرتی ہے جدید علم النفس بھی اس نفسی کیفیت کی مثالیں پیش کرتا اور اسے خود فریبی کہتا ہے۔ دوسرا رد عمل یہ ہو سکتا ہے۔ کہ حالت زوال کو بدلنے کی خواہش پیدا ہو اور موت کے بعد زندگی کی ہوا چلنے لگے۔ یُحْیِی الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ آخر الذکر تبدیلی غالب کے بعد حالی کی شاعری سے شروع ہوئی۔ حالی کی شاعری محاسبۂ نفس کی شاعری ہے اکبر الہ آبادی میں تنقید و طنز دونوں چیزیں مل گئیں اور اقبال طنز و تنقید کے بعد پیام عمل سنانے لگا۔ یہ مثبت ارتقائی سلسلہ تھا۔ اول الذکر فرع کا ردِ عمل دبستان لکھنؤ میں ظاہر ہوا۔ فریب زندگی اور سراب نشاط۔ انحطاطی منفی سلسلہ وہاں

…کی تبدیلیاں معاشرہ کی تہذیب و ثقافت میں عام طور پر پیدا ہوتی ہیں کیونکہ اجتماعی نفسی حالت بھی ویسی ہی ہوتی ہے۔ پھر عام ثقافتی رجحانات کا اثر ادبی زندگی پر بھی پڑنے لگتا ہے۔ حالی کے خاص ماحول کا اثر حالی کی شاعری پر پڑا۔ اسی طرح لکھنوی کلچر کی عام خصوصیات کا اثر لکھنؤ کے ادب پر پڑا اور ان ثقافتی خصوصیات کی پیدائش اجتماعی نفس کے بطن سے پیدا ہوئی۔

آیئے اب لکھنؤ کلچر کے نفسی محرکات کا جائزہ لیا جائے اور پھر اُسکی خصوصیات کا یہی خصوصیات وہاں کے ادب میں بھی جلوہ گر ہوں گی۔ مغلیہ تہذیب اورنگ زیب کے بعد مائل بہ انحطاط و زوال ہوتی گئی۔ اس تہذیب کا مرکز دہلی طرح طرح کی اندرونی و بیرونی شہر آشوبیوں میں گرفتار رہا۔ اس کلچر کے علمبردار خصوصاً اور سارا ملک عموماً ناکامی و نامرادی، شکست و افتاد، پھر بے عملی و بے غیرتی اور یاس و حسرت میں مبتلا ہو گیا۔ اس گراوٹ کی انتہا یہ ہوئی کہ درد خیز حقیقتوں سے بچنے کے لئے عیش کوشیوں کا فریب کھایا گیا۔ ایک ذہنیت نے صبر و جبر کے ساتھ گوشہ نشینی اختیار کی اور وہ اپنے دل کی دنیا کو چپ چاپ الٹ پلٹ کرتی رہی۔ دوسری نے غم غلط کرنے کیلئے فریب رنگ و بو کا ایک عالم پیدا کیا اور اسی میں رنگ رلیاں منائیں۔ نمک حرام وزیر نے دلی سے غداری کرکے نوابانِ اودھ نے لکھنؤ کو ایک سلطنت کا مرکز بنایا۔ گومتی کے کنارے ایک رونق سی پیدا ہوئی۔ ایک عروج سا رونما ہوا۔ اہل لکھنؤ نے سمجھا دن پھرے ہیں، قسمت کا پانسہ پلٹا ہے، قومی استیلا کا دور پھر آیا ہے۔ مگر یہ سربلندی کسی نئی تحریک، کسی جیتے جاگتے ولولے کسی فتح و اقدام کے نتیجے میں نہ تھی۔ ایک سڑتے ہوئے جسم کے بہ ظاہر صحت مند مگر بہ باطن جراثیم زدہ عضو کا کٹ کر الگ ہونا تھا۔ بیمار و مفلوج سلطنت مغلیہ کا ایک ٹکڑا۔ اس دراصل روگی ٹکڑے نے اپنے کو قوی سلطنت سمجھا حالانکہ گھن سارے ملک کو لگ چکا تھا۔ لکھنؤ کلچر کی بانی کوئی غالب صحت مند نفسی رو نہ تھی کوئی زبردست مطالبۂ حیات نہ تھا۔ کوئی عظیم الشان قومی تحریک نہ تھی۔ بلکہ ایک بزدل غداری ایک مفلوک الحال حرص۔ ایک درباری سازش۔ دلی کلچر کی ابتدا محمد غوری اور اس کے ہم جلو ایک تازہ دم عظیم الشان قوم کی حوصلہ مندیوں سے ہوئی تھی۔ بانی لکھنؤ کے پیچھے اِنے گنے تلے سپاہی تھے۔ جن کی روحوں کو گرم کرنے والی کوئی قوت نہ تھی۔ وہ تو ایک عیش زدہ قوم کے مطلب پرست

تلور ہیئے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ دبستانِ دہلی کی اردو شاعری کو دہلی کا دورِ عظمت نہ کہا جا سکے پھر بھی کہتے ہیں۔ باقی مزا بھی تو سرا الگ کا۔ دبستان دہلی کی فضائے بسیط تو دوال کی حالی و جوال تھی انحطاط کے دور میں بھی دلی والے اتنے نہ گرے تھے۔ کہ زوال کو عروج سمجھنے لگیں۔ میر اور سودا کی شہر آشوبیں اسکا ثبوت ہیں۔ گئی گذری حالت میں بھی دلی کے اندر کچھ جان باقی تھی۔ آخر نادر شاہ کو قتل عام کی سزا کیوں دینی پڑی۔ دلی والے کچھ تو ترنگ میں آئے تھے۔ حضرت اسمٰعیل شہید (مومن کے پیر بھائی) خاکستر دہلی کی ایک رشک مہر چنگاری تھے ۱۸۵۷ء میں بھی دلی لکھنؤ سے کہیں زیادہ چونچال تھی۔ اسی سبب سے اغیار کو بقول غالب چوک کو مقتل بنانا پڑا اور جب واجد علی شاہ کی گرفتاری کو . . . . . انگریز سپاہی لکھنؤ میں داخل ہوئے تو کہتے ہیں کہ شہر کے رنگیلے بالا خانوں میں بیٹھے شطرنج و گنجفہ کی بازی لگائے داد عیش دے رہے تھے۔ نیچے سے گوروں کی پلٹن جو گذری تو یاران حلقہ نے کہا:۔
"بھئی دیکھو! کیا سجیلے جوان ہیں!" اور پھر اسی سرگرمی سے بازی چلنے لگی۔

بات یہ ہے کہ دلی پر زوال آیا اور لکھنؤ اس سے بھی نیچے گرا۔ لکھنؤ میں صرف زوال نہیں بلکہ ابتذال زوال ظاہر ہوا۔ انحطاط و پستی کی وہ بدترین صورت جب پستی کو عروج سمجھا جانے لگے۔ سارے ملک کی اس وقت وہی حالت ہو گئی تھی۔ لکھنؤ تو صرف زوال و ابتذال کا دارالخلافہ تھا۔ زیب مسرت و نشاط میں غرق۔ جہانگیر کے عیش اور واجد علی کے عیش میں جنت اور باغ عدن کا فرق ہے۔ محمد شاہ رنگیلے کی عشرت کوشیاں بھی تمدنی بھونڈے پن کے باوجود اسفل السافلین تک نہیں پہنچی تھیں۔ یہ مقام تو رنگیلے پیا کے لئے ہی مخصوص تھا۔

لکھنؤ کی تہذیب ایک ایسا کوڑھی جسم ہے۔ جسے حریر و پرنیاں کے اندر چھپایا گیا ہو۔ ایک ایسا مرصع نیام جس کے اندر تلوار ہو ہی نہیں۔ بیگانہ روح ایک رنگیلا، سجیلا، جسد خاکی! مصر کی حنوط شدہ لاشوں کی طرح زرو جواہر سے آراستہ و پیراستہ۔ لکھنؤ کی شاعری بہ استثنائے انیس سحر سامری کا فروغ لئے ہوئے ہے۔ اس کے نغمے سامری کے بچھڑے کی آواز معلوم ہوتی!

لکھنؤ کلچر کی نفسی کیفیت یہ ہے کہ وہ ایک لاشعور کا فریب کھانے کے سبب شعور کی سچی تنقید اور ضمیر کی آواز کو سن ہی نہیں سکتی تھی۔ لاشعور نے شعور کی درد خیز حالت سے اکتا کر خارجی دنیا کی طرف توجہ منعطف کی۔ شعور بیمار ہو کر بالکل بے دست و پا مفلوج ہو گیا۔ توازن قائم نہ رہ سکا۔ اور

.... ایک پرفریب لاشعوری رو کے ماتحت شخصیت ایک سطحی خارجیت کی رنگینیوں میں مبتلا ہوگئی۔ اسے 'پرورشن' (Perversion) کہتے ہیں۔ جس طرح فرد کو اس کا مرض لاحق ہوتا ہے۔ مثلاً Megalomania یا Hallucination بالکل اسی طرح کسی کلچر کو بھی اس نوع کا روگ لگ سکتا ہے۔ جب احساسِ کمتری کے نشتر برداشت نہیں ہوتے تو اس قسم کی پرفریب سنک پیدا ہو جاتی ہے۔ لکھنؤ کلچر ایک اُلٹے دماغ کی تہذیب ہے۔ Perverted توازنِ شخصیت تو دلّی کلچر کے عہدِ زوال میں بھی نہیں۔ اُس عہد کے فن کاروں نے اپنے دل کے نہاں خانے میں پناہ لی تھی، مگر انہیں حقیقی تلخی کا احساس باقی تھا اس کی شخصیت (Introverted) داخلیت کی جانب منقلب تھی۔ کبھی کبھی یہ داخلیت حد سے زیادہ ہو کر ملنکولیا (Melancholia) کے آثار ظاہر کرتی تھی۔ شخصیت کا توازن حالی سے پیدا ہونا شروع ہوا۔

آئیے اب لکھنؤ کلچر کے مظاہرہ کا جائزہ لیا جائے۔ فسانۂ آزاد کا خوجی لکھنؤی نفسی کیفیت کا مظہر اصلی ہے۔ آپ اپنے خیال میں مرد میدان و کیداں ہیں مگر نحیف الجثہ اور خفیف الحرکت بھگوڑے۔ "افسوس نہ ہوئی قرولی! ورنہ ...." یہی ذہنیت وہاں ہر جگہ نظر آتی ہے۔ مبالغہ و لاف زنی لکھنؤ کی خصوصیات ہیں۔ آپ پانچ روپیہ کے وثیقہ دار ہیں مگر ابن رئیس بننے اور کہلانے کا شوق۔ پیٹ خالی اور مونچھ میں گھی لگا کر اینڈتے ہوئے نکلنا اور گھر سے پلاؤ کھا کر آنے کی دھونس جمانا۔ نواب صاحب کا بٹیر شیر کو مار گراتا ہے۔ افیون کا نشہ اس نفسی کیفیت کی ہم آہنگی بڑی کامیابی سے کرتا ہے اور فریبِ تخیّل کو دوچند کر دیتا ہے۔ لکھنؤ میں اسی وجہ سے افیون کی بڑی قدر ہوئی۔ اس کے لئے ایک داخلی مطالبہ موجود تھا۔ حسنِ لب بام کی عام حکومت تھی۔ چوک میں بیٹھے ہوئے رنگیلوں، بھانڈوں کے ٹھٹ، تلوریوں، اور شہدوں کی ریٹ رپٹ۔ مرغ اور بٹیر کی پالیاں، کنکوے بازی اور ہیجڑوں اور زنخوں کے نخرے۔ یہ سب اُلٹے دماغی' (Perversion) کے مظاہر تھے۔ جب کسی قوم میں جہد و مقابلہ کی صلاحیت نہیں رہتی تو پھر مرغے، بٹیر اور کنکوے ہوتا کر فطرتِ صحیحہ کو فریب دیا جاتا ہے۔ داخلی اخلاقی خوبیاں بھی ایسی قوم سے رخصت ہو جاتی ہیں۔ نمائش، ظاہرداری اور تصنع کا دور دورہ ہوتا ہے۔ لکھنؤ کی تہذیب اس فن میں بھی ماہر تھی۔

اس سطحیت اور خارجیت کا اظہار فنونِ لطیفہ میں بھی ہوا۔ لکھنؤی تہذیب کے فنِ تعمیر کے نمونوں کو دیکھئے۔ ان کی بنیاد میں کوئی گہرا تجربۂ حیات نہیں نہ احساس نہ جذبہ۔ اُن میں اعلیٰ حسن مفقود ہے صرف سطحی نزاکت اور آرائش پائی جاتی ہے۔ رفعتِ جمال ـ (Monumentality) ـ بالکل نہیں۔ مسجد قوۃ الاسلام دہلی، تاج یا جامع مسجد دہلی کا مقابلہ لکھنؤ کے امام باڑوں سے تو بالکل فضول ہے۔ مغلِ متاخرین کی عمارتیں بھی ان سے فنکارانہ طور پر بلند ہیں۔

لکھنؤی مصوری اور موسیقی بھی اس سطحی خارجیت کی شکار ہوئی۔ عمیق ترنم و توازن وہاں مفقود ہیں۔ لکھنؤی مصور نہیں ..... محض نقاش تھے اور وہاں کے موسیقار صرف "چلتی ہوئی چیزیں" ہی ایجاد کر سکے مثلاً ٹھمری اور خیال۔ کہا جاتا ہے کہ ٹھمری خود رنگیلے پیا نے ایجاد کی۔

غرض لکھنؤی کلچر کی ایک خاص نفسی حالت نے ہر شعبۂ تمدن پر اپنا سایہ ڈالا۔ ادب و شاعری بھی اسی فریبِ نشاط اور سطحی خارجیت کے شکار ہوئے۔ لکھنؤی دبستانِ شاعری کی نمود ار اور اس کا جوش و رقص کسی گہرے، بیکراں جذبۂ حیات کے نتیجہ میں نہیں۔ اس کی جڑیں زندگی کے باطنی سرچشموں سے غذا حاصل نہیں کرتیں۔ اس کے رخسارِ شاعری کی سُرخی صحت مند القام خون سے پیدا نہیں ہوئی بلکہ غازۂ رنگین سے۔ اس کی سرمستی افیون کا نشہ ہے اور اس کی قوت اور اس کا طنطنہ ایسا ہے جیسے مُقوّی دوا اور طلا سے رجولیت پیدا کی جائے۔ لکھنؤ کی شاعری میں باطنی محاسن گویا مفقود ہیں۔ صرف ظاہری صنعت گری پر اس کا دارومدار ہے۔ اعلیٰ صناعت نہیں بلکہ تصنع۔ تجربہ کا عمق، اصلیت اور جوش نہیں بلکہ صرف طرزِ بیان کی رنگینی و آرائش محض الفاظ کے رکھ رکھاؤ یا بندش، چست، نوک پلک، پالش اور رعایتِ لفظی، ضلع جگت، محاورات وغیرہ پر لکھنؤی شاعری کی ساری چمک دمک اور دلفریبی منحصر ہے۔ اس دبستان کی عشقیہ شاعری میں حسن کے جمالِ باطنی اور اس کی تاثیرات کو پیش نہیں کیا جاتا۔ بلکہ محض اس کے جوبن، انگیا، سرمہ اور مسی کو۔ لکھنؤ کے فنکار اوصافِ حسن کی مصوری نہیں کرتے۔ صرف سراپائے محبوب کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ وہ وارداتِ محبت کی ترجمانی نہیں کرسکتے

صرف معاملاتِ عشق کی عکاسی کر پاتے ہیں۔ خیالات و افکار کی شاعری میں وہ بلند پروازی و نکتہ آفرینی کے بجائے امام باڑے کی صرف بھول بھلیاں تعمیر کرتے ہیں۔ ناسخ کی شاعری ایک پہیلی ہے۔ جس میں ذہن کی رسائی و طباعی نہیں۔ ذہن کی پیچیدگی اور شعبدہ گری ہے۔

اہلِ لکھنؤ تخلص رکھنے میں بھی خارجی ذہنیت کا اظہار کرتے ہیں اور دلی والے اس امر میں بھی باطنی نظر رکھتے ہیں۔ لکھنؤ میں آتش ہے تو دلی میں سوز۔ آتش، ناسخ، صبا، رند، نسیم۔ ان تخلصوں کی خارجیت ظاہر ہے مگر درد، سوز، سودا، جانجاناں مظہر، مومن، ذوق، غالب یہ سب داخلی رنگ ظاہر کرتے ہیں۔

اختر اورینوی کی تصنیفات

منظر و پس منظر

اختر اورینوی کا مجموعہ اُردو افسانہ نگاری کے اس عبوری دور میں ایک ایسا ادبی کارنامہ ہے جس کی قدر و قیمت ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے۔

اِن افسانوں میں نفسیاتی تحلیل، جزئیات، زندگی کا مشاہدہ، دلنشیں کردار نگاری ظاہر کرتی ہے کہ مصنف نے حیاتِ انسانی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ افسانوں کے منظر اور پس منظر نفسِ اتنے اُجاگر ہیں کہ ایک دوسرے کو جِلا دیتے ہوئے زندگی کی تابناک تصویریں بن گئے ہیں۔

دوسرا ایڈیشن ——— قیمت :- دو روپے بارہ آنے۔

کلیاں اور کانٹے

اختر اورینوی کے افسانوں کا مجموعہ، حیات کے نشیب و فراز، زندگی کی لغزش اور استقامت، سفر اور قیام کی سچی فلمیں، فنکارانہ قلمکاری کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔

قیمت :- ایک روپیہ بارہ آنے

تنقید جدید

تنقید ایک تخلیقی عمل ہے۔ ایک فنکار کے اندر اگر ذوقِ انتقاد پایا جائے تو وہ نقدِ ادب اور تخلیقِ ادب دونوں کیلئے محمود و مبارک ہے۔

اختر اورینوی نے اُردو دنیا میں اپنی ہوشمندانہ اور جدید تنقیدوں کا سکہ چلایا ہے۔ اُس کا فن اور اس کا ذوقِ انتقاد ساری عمر ہم عناں رہے ہیں۔ "تنقید جدید" کے اندر عصرِ حاضر کے اکثر اہم ادبی مسئلے مختلف مقالوں کی صورت میں زیرِ بحث آگئے ہیں۔ ان میں بیشتر ایسے مقالے ہیں جو اُردو ادب میں جدتِ فکر کے لحاظ سے بے مثال ہیں۔

(زیرِ طبع)

نوائے زندگی

اختر اورینوی کی پندرہ سالہ شاعری کا انتخاب۔ اختر زندگی کی جنت اور دوزخ سے گذر رہا ہے۔ نوائے زندگی میں حیات کی ... شاعرانہ تعبیر ہے۔ شاعر اپنے ماحول سے صرف انفعالی انداز میں متاثر نہیں ہوا۔ بلکہ اسنے شعوری طور پر اثر قبول کیا ہے۔ نوائے زندگی شاعر جمال و جلال اور مفکرانہ پیام کا حسین مجموعہ ہے۔ (زیرِ طبع)

تعمیر

یہ اختر اورینوی کا وہ ناول ہے جو قطعی عصری کہا جا سکتا ہے چھوٹا ناگپور کے رومانی پس منظر کے جلو میں ایک کارخانہ دار کا مرکزی کردار، مزدوروں اور کسانوں کی زندگی، کئی دلچسپ اور جیتی جاگتی سیرتیں، دورانِ جنگ کے لرزہ خیز واقعات، صنعتی پلان، سیہ بازیاں، رنگ رلیاں، عشق بازیاں، نیز انسانی ہمدردیوں کے روح پرور واقعات فنکارانہ خلوص، جرأت، صداقت اور حسن کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ یہ ناول فضا آفرینی اور ایک بالیدہ ترقی پسند تصورِ حیات کا مرقع ہے (زیرِ طبع)

سیمنٹ اور ڈائنامائیٹ

یہ اورینوی کے افسانوں کا چوتھا مجموعہ ہے۔ منظر و پس منظر، کلیاں اور کانٹے، انارکلی اور بھول بھلیاں کے خالق نے نئے افسانوں کو فنی زندگی عطا کی ہے اختر اورینوی کا فن پختہ تر ہوتا جا رہا ہے۔ فنکار کی نئی دنیا کی سیر آپ کو زندگی کی تازہ بصیرت عطا کرے گی۔ (زیرِ طبع)

کارواں

اختر اورینوی نے اس عہد آفریں ناول کے پلان میں تین سال صرف کئے ہیں۔ لِن یُتانگ کا ناول "مومنٹ ان پیکنگ" چین کی گذشتہ صد سالہ زندگی کا ارژنگ ہے۔ اورینوی کا "کارواں" ۱۸۱۴ء سے ۱۹۱۴ء تک بر اعظم ہند میں سرگرم سفر نظر آتا ہے۔ (زیرِ طبع)

مکتبہ اُردو لاہور

منظومات:۔

نظمیں:۔

عبدالمجید بھٹی

ن۔م۔ راشد — ظہیر کاشمیری

اختر الایمان — ساحر لدھیانوی

علی سردار جعفری — قتیل شفائی

احمد ندیم قاسمی — تصدق حسین خالد

منظور حسین شور — مقبول حسین احمد پوری

مخمور جالندھری — کرشن موہن

جاں نثار اختر — مظفر برنی

مجید امجد

غزلیں:۔

جگر مرادآبادی

حامد عزیز مدنی — اثر لکھنوی

انجم رومانی — عبدالحمید عدم

سلام مچھلی شہری — حفیظ ہوشیارپوری

سیّد فیضی — اختر شیرانی

ادا بدایونی — احمد ندیم قاسمی

منیب الرحمٰن — سیف الدین سیف

ضمیر جعفری — ناصر کاظمی۔ موج علیگ

فکر تونسوی — شکیل بدایونی۔ مسعود پرویز

جدید شعری ادب

جوش (ملیح آبادی):-
سیف و سبو
آیات و نغمات
جنون و حکمت

ن۔ م۔ راشد:-
ماوراء

فیض احمد فیض:-
نقشِ فریادی

فراق گورکھپوری:-
شعلۂ ساز

ساغر نظامی:-
بادۂ مشرق

اسرار الحق مجاز:-
آہنگ

معین احسن جذبی:-
فروزاں

یوسف ظفر:-
زہر خند

مخمور جالندھری:- طلسم
جلوہ گاہ

ساحر لدھیانوی:-
تلخیاں

سلام مچھلی شہری:-
وسعتیں

اختر انصاری:-
خواب

حفیظ ہوشیار پوری:-
غزلیں

اختر الایمان:-
تاریک سیارہ

عبدالحمید عدم:- آتش کدہ (غزلیں)
آبگینے (قطعات)

جان نثار اختر:-
پرتو

احمد ندیم قاسمی:-
جلال و جمال

اختر اورینوی:- ؟

حمید نسیم:-
سلسلہ (غزلیں)

گوپال متل (مرتب):-
گھن گرج (انقلابی نظمیں)

رام پرکاش اشک (مرتب)
سارنگ۔ (گیت)

ادارہ ادبِ لطیف:-
۱۹۴۲ء کی منتخب نظمیں
۱۹۴۴ء کی منتخب نظمیں
۱۹۴۵ء کی منتخب نظمیں

حلقہ اربابِ ذوق
۱۹۴۱ء کی بہترین نظمیں
۱۹۴۳ء کی بہترین نظمیں

ن۔م راشد

آواز

(ایک فوجی پروگرام کے تاثرات)

"یہ دلّی ہے
اپنے غریب الوطن بھائیوں کے لئے
نار غزلوں کے لائی ہے اُن کی بہن
اور گیتوں کے گجرے بنا کر......
"چھما چھم چھما چھم دلہنیا چلی رے
یہ دنیا ہے طوفان میل
او مدینے کے عربی جواں
تیری زلفیں ہمیں ڈس گئیں ناگ بن کر"——"
مگر اس صدا سے بڑا ناگ ممکن ہے
جو لے گیا ایک پل میں
ہزاروں کو غارِ فراموشگاری
میں یوں کھینچ کر ساتھ اپنے
کہ صدیاں گذرنے
پر اُن کی سیہ ہڈیاں بھی نہ شاید ملیں گی؟

جہاں سے یہ آواز آئی
اُسی سرزمیں میں
سمندر کے ساحل پہ لاکھوں گھروں میں
دیئے ٹمٹمانے لگے
اور اک دوسرے سے
بہت دھیمی سرگوشیوں میں
یہ کہنے لگے:
"لو سنو اب سحر ہونے والی ہے
لیکن مسافر کی اب تک خبر بھی نہیں ہے!"

اختر الایمان

ریت کے محل

تجھے تو یاد نہ ہو گی وہ شامِ کیف آگیں
شفق کے رنگ میں لکھی ہوئی کہانی سی
مچل رہی تھی ترے رُخ پہ تیری آنکھوں میں
ترے لبوں پہ حکایت تھی اِک سہانی سی
مجھے گماں ہُوا جیسے میں وہ مسافر ہوں
جو رات دن کی مسافت کے بوجھ سے تھک کر
یہ چاہتا ہو کہیں گوشۂ اماں مل جائے
جسے نہ زیست کا مقدور ہو نہ جاتے مفر
جو ڈھونڈتا ہو اندھیرے میں اپنے گم کردہ
محبتوں کے ذخیرے، دلوں کے سرمائے
نہ سنگِ میل، نہ راہوں میں قافلوں کے نشاں
بسی ہوئی ہو نگاہوں میں راہ کی سختی!
ہر ایک گام پہ صحرا بدوش تھے قزّاق
بھٹک رہے تھے بگولے سے رہنما لاکھوں
کہیں نہ چشمۂ شیریں نہ سایۂ اشجار
پڑے ہوئے تھے سرِ رہ شکستہ پا لاکھوں
جو اپنے دل میں کبھی شوقِ بیکراں لیکر
چلے تھے پارِ زمیں سوئے آسماں لے کر
دلوں کا درد نگاہوں کا سوز کام آیا!
"دیارِ ہُو" میں لبوں پہ کسی کا نام آیا!
یہ کاروبار، یہ محفل، یہ ریگ زار، یہ دھوم
سرودِ نالہ کہیں، رقصِ ناتمام کہیں
صدائیں کھوئی ہوئیں وسعتِ بیاباں میں
طلوعِ صبح میں غلطاں وہ رنگِ شام کہیں
حکایتِ گل و لالہ کے باب وا نہ ہوئے
کسی کے اشک بھی اس وقت آسرا نہ ہوئے

میں استخوانِ شکستہ کے ڈھیر سے بچتا
دیارِ ہو میں پریشاں خیال، آوارہ
اسی تلاش میں پھرتا تھا کوئی رہ نکلے
اِس اضطرابِ مسلسل سے پاؤں چھٹکارا
پھر ایک شام، ترے حسنِ لازوال کی خیر!
صدائیں آئیں، اِدھر آ ترے مآل کی خیر!
پھر ایک بار تصوّر کے رنگ محلوں میں
ہجومِ شوق ہوا، شورِ نائے و نوش ہوا
دیئے جلائے گئے، راستوں میں پھول بچھے
حیاتِ رفتہ کا افسانہ بارِ گوش ہوا
تڑپ کے ساز کے تاروں سے غم ربا نغمے!
بساطِ خواب پہ انگڑائی توڑتے نکلے!
سکوں نواز دھندلکا سا چھا گیا ہر سُو
مرا یہ حال کہ جیسے کسی کو نیند آئے
خمارِ لطفِ مسلسل سے لڑکھڑایا میں
کنارِ ساز میں رقصاں تھے ہر طرف سائے
بڑھایا دستِ تمنّا کہ دامنِ امید
کہیں نہ عالمِ وارفتگی میں چھوٹ جائے
تلاش کرتا ہوں وہ ساعتیں جو کھوئی تھیں!
بگولے کاٹ رہا ہوں ہوائیں بوئی تھیں!
نہ وہ زمیں ہے نہ وہ آسماں نہ وہ شب و روز
کبھی سمٹتی، کبھی پھیلتی ہیں غم کی حدود
ٹھہر گئی ہے اِک ایسے مقام پر دنیا
جہاں نہ رات نہ دن ہے نہ بیکلی نہ جمود
پکارتے ہیں ستارے سنبھالتی ہے زمیں
ہر ایک شے سے گریزاں ابھی ہے میرا وجود
میں سوچتا ہوں کہیں زندگی نہ بن جائے
خزاں بدوش بہار و خمارِ زہر آلود!

علی سردار جعفری

یاد

زمیں پہ رات کی پلکوں کی چھاؤں پڑتی ہے — اندھیرا سخت خموشی کا بار اٹھائے ہوئے
ہوا میں اڑتے ہیں لمحات جگنوؤں کی طرح — فضا کے سینے میں اک آگ سی لگائے ہوئے
سرک رہے ہیں اندھیرے کے مخملیں پردے — نکل رہا ہے کوئی جسم کو چرائے ہوئے
ابھر رہا ہے کوئی وقت کے تلاطم سے — جبیں پہ قوسِ قزح کی کماں جھکائے ہوئے
خمارِ نیم شبی کا ہے آنکھ میں کاجل، — ہتھیلیوں پہ حنا کے کنول جلائے ہوئے
مری جوان تمنا کے سرخ پھولوں سے — سیاہ زلف کو گوندھے ہوئے، سجائے ہوئے
وہ دھندلے دھندلے ستاروں کے نرم جھرمٹ میں — کنارے سبز دوپٹے کے جگمگائے ہوئے
دھڑکتے سینے پہ آنچل کی ریشمی شکنیں — گذشتہ شب کی حسیں چاندنی چھپائے ہوئے
سڈول اور سبک بازوؤں کی لرزش میں — شباب و شعر کی انگڑائیاں دبائے ہوئے
کھڑی ہے خواب و فسانے کی سرحدوں کے قریب — اندھیری رات کے دل میں چمن کھلائے ہوئے
وفا کے جوش سے چہرے پہ روشنی دل کی — حیا کے رنگ سے رخسار تمتمائے ہوئے
بھووں پہ کتنی ہی انکار کی حسیں شکنیں — لبوں پہ کتنے ہی اقرار مسکرائے ہوئے
منزّہ جبیں پہ محبت کے خون کا ٹیکا — بڑے غرور، بڑے ناز سے لگائے ہوئے
یہ ایک یاد ہے بیتے ہوئے زمانے کی — جو میرے سینے [illegible] اٹھائے ہوئے

احمد ندیم قاسمی

فن

ایک رقاصہ تھی ـــــ کس کس سے اشارے کرتی
آنکھیں پتھرائیں، اداؤں میں توازن نہ رہا،
ڈگمگائی، تو سب اطراف سے آواز آئی ـــ
"فن کے اِس اَوج پہ اک تیرے سوا کون گیا!"
فرشِ مرمر پہ گری، گر کے اُٹھی، اُٹھ کے جھکی
خشک ہونٹوں پہ زباں پھیر کے پانی مانگا
اوک اُٹھائی تو تماشائی سنبھل کر بولے ـــ
"رقص کا یہ بھی اِک انداز ہے ـــ اللہ! اللہ!"
ہاتھ پھیلے رہے، سل سی گئی ہونٹوں سے زباں ـــ
ایک رقّاص کسی سمت سے ناگاہ بڑھا،
پردہ سرکا، تو معاً فن کے پجاری گرجے ـــ
"رقص کیوں ختم ہُوا؟ وقت ابھی باقی تھا!"

منظور حسین شور

دوراہا

میں کہ تیری بزم سے اٹھا تھا ساغر توڑ کر
کتنے طوفانوں سے الجھا ہوں سفینہ چھوڑ کر

اک طرف رود و رباب و عنبر و عطر و گلاب
ایک جانب جنتِ آدم کے لیے تعبیرِ خواب

اک طرف زلف و جبین و عارض و رخِ نور پاش
اور اک جانب افق کے دوش پر سورج کی لاش

اک طرف حسن و شباب و نور و نکہت کا فشار
اک طرف صدیوں کی راتوں کو سحر کا انتظار

اک طرف تاروں کے سائے میں فسانوں کی تلاش
اک طرف احساس کے سینے پہ نظروں کی خراش

دہکی دہکی اک طرف آنچل میں رخساروں کی آگ
اک طرف کرب و الم کی زد پہ چہروں کا سہاگ

ایک جانب جلوہ جلوہ نکھرا نکھرا سا جمال
ایک جانب وقت کے رخسار پر خونیں گلال

اک طرف سیال سی چاندی میں بھیگی بھیگی رات
اک طرف سورج کی کرنوں سے سلگتی کائنات

اک طرف نغمات سے دہکے ہوئے طاؤس و رود
ایک جانب سرد سینوں میں جوانی کا جمود

ایک جانب چنگ و تار و عود و بربط نغمہ بار
ایک جانب ہر روش پر سرخ صبحوں کی پکار

اک طرف آنکھوں میں کچھ ناگفتہ افسانوں کی رات
ایک جانب زہر سے لبریز پیمانوں کی رات

ایک جانب قہقہے آواز سی دیتے ہوئے
اک طرف نغمے لہو میں کشتیاں کھیتے ہوئے

اک طرف چھڑتا ہوا حسن و محبت کا رباب
اک طرف جلتی ہوئی عرفان و حکمت کی کتاب

ایک جانب عشق کو اپنی ہی عظمت کا غرور
اک طرف ہر آبگینہ وقت کی ٹھوکر سے چور

ایک جانب عشق کو توہینِ فطرت ناگوار
اور اک جانب جنوں خود بیڑیوں کا سوگوار

اک طرف حسن و جنوں عالم کو ٹھکرائے ہوئے
اک طرف دنیا پہ بادل کرب کے چھائے ہوئے

ایک وہ عالم کہ تجھ بن سانس تک لینا گناہ
اک طرف ناسور سینے میں چھپائے خانقاہ

ایک جانب حسن خود مشتاقِ پیغام و سلام
اک طرف جینا بھی ذلت اور مرنا بھی حرام

تو سراپا پیکرِ حسن و جمال و رنگ و نور
تیری جنت کا تصور میرے دوزخ میں قصور

یاد کر سکتا نہیں، دل سے بھلا سکتا نہیں
دور جا سکتا نہیں نزدیک آ سکتا نہیں

عہد بھی ممکن نہیں، اقرار بھی ممکن نہیں
اور تیرے پیار سے انکار بھی ممکن نہیں

محمود جالندھری

مگرمچھ کے آنسو

سنتے ہیں۔ یاد مصیبت میں خدا آتا ہے
آسرا — اک یہی مجبور کی تقدیر میں رہ جاتا ہے

"کھول دو بند کلیساؤں کے در کھول بھی دو
مانا مانوس نہیں ہاتھ دعاؤں سے — دعائیں مانگیں
مملکت پر کہیں خورشید نہ ہو جائے غروب
حکم دیدو کہ سبھی اپنے خداؤں سے دعائیں مانگیں"

جی پہ بن جائے تو ذلت بھی اٹھا لیتے ہیں
سنتے ہیں — باپ مصیبت میں گدھے کو بھی بنا لیتے ہیں

"ناگ ہے اپنا معاون تو کوئی بات نہیں
کام لینا ہے ہمیں ناگ خزانے پہ بٹھا لو اپنے
شہد کا گھونٹ سمجھ کر سمِ قاتل پی جاؤ
کسی قیمت کسی اجرت پہ اسے ساتھ ملا لو اپنے"

ارا دھن جاتا ہے تو نصف لٹا دیتے ہیں
نتے ہیں — بچے جو جنیں انہیں افیون کھلا دیتے ہیں

"سب کو بخشیں گے مصائب کی سلاسل سے نجات
جنگ لڑتے ہیں صداقت کی مساوات کی اعلان کردو
اپنی من مانی ہی آخر میں کریں گے، اب تو
دہر کو وعدۂ پُر کیف سے منت کشِ احساں کر دو"

ناگ ڈستا ہے۔۔ اسے دودھ پلاؤ کتنا
سوکھی بیری سے کبھی بیر نہیں جھڑتے ہلاؤ کتنا

"عہدِ آلام بھی معدوم، خدا بھی معدوم
کوئی خدشہ نہیں پھر سے ستم و جور کو ارزاں کر لو
فتح کا جشن منانا ہے مگر دھوم کے ساتھ
اپنے گھر جشن سے، باخون کی بوندوں سے چراغاں کر لو
اپنے محکوموں کی ہستی بھی کوئی ہستی ہے
یہ تو وعدوں پہ بھی جی سکتے ہیں ان سے نئے پیماں کر لو"

تیرگی بڑھتی ہے طوفان اُمڈ آتا ہے
بدلیاں چھا کے برستی ہیں فلک پھر سے نکھر جاتا ہے

جاں نثار اختر

اُس جانِ کائنات کے نام

رات کا پیچ و خم تری زلفِ عنبر — چاندنی کا نکھار تیرا بدن
صبح کی نرم لَو جبیں تیری — پگھلا پگھلا سا آنچ پر کندن
ہونٹ تیرے شفق کا مے خانہ — آنکھ تیری خمار کا مسکن
اِک لچکتا ہلال یا ابرُو — اِک لپکتی شعاع یا چتون
تیری مژگاں کی جنبشِ پیہم — سینۂ کائنات کی دھڑکن
نکہتِ ماہ و عطرِ بادِ صبا — کیا ہے! جُز تیرا فیضِ پیراہن
جنبشِ مہر و ماہ تیرا خرام — گردشِ روز و شب ترا دامن
تیری لَے نظمِ ثابت و سیار — تیرا نغمہ کشش کا رازِ کہن
شمعِ کونین ہے کہ تیرا نفس — حسنِ تقدیر ہے کہ تیرا سخن
تجھ سے بیدار قلبِ آب و گل — تجھ سے سرشار روحِ سرو و سمن
لطف تیرا کہ سیلِ ابرِ بہار — قہر تیرا کہ آتشِ خرمن
ہر تلطف میں ہر تغافل میں — تو جنوں دوست، آگہی دشمن
اور وہ تیرے سکوت کا عالم — جیسے سکتے میں ہوں زمان و زمن
عشق! تیرا جلال مہر شکار — حسن! تیرا جمال ماہ شکن

زندگی ہے کہ تیرا آئینہ!
تو ہے یا کائنات کا جوبن!!

مجید امجد

معیّت

. . . . دوست!
تجھ کو جینا دوبھر کیوں؟
مجھ سے کہہ دے من کی بات!
آہ یہ شیتل چاندنی رات،
گردوں پہ تاروں کا ناچ
چھنن چھنن چھوچھم چھم چھاچ
نیچے خاک کی بستی ا—ا ہم
نیندیں زخمی — آنکھیں نم
سوئی گلیاں، سویا شہر
جھونکوں کے امرت میں زہر
یہ سب سچ ہے پھر بھی دوست
جی، دو دن اور بھی جی، دوست!
دو دن اور بھی میرے ساتھ
کہہ لے کہہ لے من کی بات
پلکیں ہیں تیری تر کیوں؟

. . . . دوست!
تجھ کو جینا دوبھر کیوں؟
دنیا تیرے آگے ہے
ہنستے لب پر ہنستی لے
اِس وادی میں گاتا پھر
من کی تان اُڑاتا پھر
تو نے دیکھی کھیتوں میں
کھردری کھردری ریتوں میں
اِک کتے کی سڑتی لاش
ٹکڑے ٹکڑے قاش ہی قاش
گِدھ بوٹی بوٹی کھائیں
انتڑیاں نوچے جائیں
یہ انجام؟ ہمارا ہو؟
ساتھی! کیسے گوارا ہو؟
تیری آنکھیں مُند جائیں؟
تو اور یہ خواہش؟ ہائیں!
کیا کہتا ہے؟ یوں مت کہہ
یہ رودادِ جنوں مت کہہ!
کون مرے اور کون جیئے،
آ ہاتھوں میں ہاتھ لیے
چلتے جائیں — میں اور تو
سونی سڑک کے کارخ و خو
سوچیں: یہ راہی ہیں کون؟
سوچیں: کون ہے تو؟ میں کون؟
ہم ان کے سایوں کے تلے
چلتے جائیں رات ڈھلے
ہونٹوں پر ہو من کی بات
شیتل شیتل چاندنی رات
گردوں پہ تاروں کا ناچ
چھنن چھنن چھوچھم چھم چھاچ!
بھلا نہیں یہ منظر؟ کیوں
تم کیوں

————— دوست
تجھ کو جینا دوبھر کیوں؟

حامد عزیز مدنی

مادرِ گیتی سے

یہ ترا ہمدمِ دیرینہ، رفیق و غمخوار
شبنمی نور میں ملبوس یہ مہتاب ابھرتا ہوا برگد کی حزیں شاخوں سے
زہر خند اس کی ضیائے خاموش
یوں سرِ راہ تجھے دیکھ کے عریاں شاید
اپنے ہی سینے کے داغوں میں بدل سکتا تھا۔
توڑ کر رات کی زنجیر نکل سکتا تھا۔
دور اس حلقۂ پرویں و ثریا سے بھی دور
شب کے زندانیِ بے سوز سے یہ بھی نہ ہوا۔!

خوں ٹپکتا ہے درِ شام کی پیشانی سے!
اور ویرانی لپٹ جاتی ہے ویرانی سے
شمعیں بجھتی ہیں، دھواں اٹھتا ہے!
اک نہ اک پردۂ اسرارِ جہاں اٹھتا ہے
اور تغیر کے اشاراتِ نہاں پا ہی گئے
— راہ اپنی تیرے اشکوں میں تیری آہوں میں
تجھے آنا ہی پڑا —
سنگ و آہن کے ستونوں کی کڑی باہوں میں
تیرے سینے سے لپٹتے رہتے ہیں یہ شعلہ و دود!

کیا مرے سامنے دہراتی ہے
وہ اساطیرِ جنوں خیز وہ پارینہ حدیث
جو کبھی بابل و یونان کی خوابیدہ فضاؤں میں لہو بنکے رواں رہتے تھے
لوٹ کر لے گئے کچھ لوگ تبسم تیرا
درسگاہیں بھی ارسطو کی کمیں گاہیں تھیں
مشعلیں جلتی رہیں تیرہ مگر راہیں تھیں!

اور افسانے ہیں گذرے ہوئے روز و شب کے

آج باقی نہیں پیراہنِ صد رنگ ترے
چھوڑ کر گلتی ہوئی پوشاک کے انباروں کو
اپنی عریانی پہ ہنس لینے دے سیاروں کو
آئیگا آئیگا کوئی تو شہابِ ثاقب
اسکے دامن میں دہکتے ہوئے انگاروں کی چادر کا اک آنچل ہی سہی
میں تماشائی سہی آج تری خلوت کا
میری اس حیرتِ طفلی پہ نہ جا
ماں! تجھے گھورتے رہنے کا خطاکار ہوں میں!

انجم رومانی

روپ اور بہروپ

پھیکی پھیکی سی رنگینی — اب روپ نیا کیوں بھرتی ہے
اپنی سی کوئی بات نہیں — دنیا بہروپ پہ مرتی ہے

بہروپ پہ مرنے دو مجھ کو — میں اپنے روپ کو پا نہ سکا
ہر آن تک و دو رہتی ہے — سایہ ہوں دھوپ کو پا نہ سکا

سورج نکلا، پھر آنکھ کھلی — بھینی بھینی رنگینی کی
پھر ہر صورت یوں آئی نظر — جیسے ہو مورتی چینی کی

اک مورتی ایسی سنتا ہوں — جو روپ بھی ہے بہروپ بھی ہے
مَیں سایہ ہوں وہ بھی سایہ ہے — مَیں دھوپ نہیں وہ دھوپ بھی ہے

کب سایہ دھوپ کو پائے گا؟ — وہ اِس کا غم کب کرتی ہے!

پھیکی پھیکی سی رنگینی
اب روپ نیا کیوں بھرتی ہے؟

سلام مچھلی شہری

"لیکن اب دنیا میری ہے!"

پیپل کے گھنیرے پتوں نے
پھر سارا مندر گھیر لیا
اور اُڑ کر اک دیوتا آیا۔ مندر کے کلس کو چوم گیا!
دیوداسی نے انگڑائی لی ــــ
شمعیں جاگیں کلیاں مہکیں دھیرے دھیرے دیوداسی کے ناچ سے مندر جھوم گیا
مندر کے پجاری نے شانوں پر اپنی جٹائیں پھیلا دیں ــــ

جگمگ کرتی ریکھائیں پھر ننگی گلیوں میں ناچ گئیں۔
اور سب سے بڑے راجہ نے اک رنگین تبسم فرمایا!
کنیائیں سج دھج کر آئیں ــــ
پیالے کھنکے کنگن چھلکے اور کنیاؤں کے جوبن پر سنسار سمٹ کر لہرایا۔
اور اندر نے جیون مدھ شالہ پر پھر سے گھٹائیں پھیلا دیں ــــ!!

پھر ہار سنگھار کی شاخوں نے
مسجد کے مناروں پر گر کر
پھولوں کی طرف سے سجدہ کیا ــــ
اور ایک فرشتے کی آمد سے تکبیریں کچھ تیز ہوئیں!
فانوس جلے گلزار کھلے اور دھیرے دھیرے جانِ ایمان کی دھڑکنیں ڈوب گئیں
واعظ نے منبر کے زینے پر زرد عبائیں پھیلا دیں ــــ!!

پھر اونچے نگر کے محلوں میں
چاندی سونے کے دیپ جلے

صدیوں سے یہ ہوتا آیا ہے
صدیوں سے یہی دیکھا میں نے ــــ
بیمار زمیں کے چہرے پر جب صحت کے آثار آئے
جب دھرتی کچھ شاداب ہوئی
جب دنیا کچھ بیدار ہوئی ــــ
اس مندر نے۔ اس مسجد نے۔ ان اونچے اونچے محلوں نے
دھرتی کو اپنانا چاہا
اس پر قابو پانا چاہا ــــ
لیکن اب دھرتی میری ہے
لیکن اب دنیا میری ہے

سید فیضی

مَیں گنہگار ہُوں

ستارہ ٹوٹا کہ شعلہ بھڑکا!
سیاہ دیوِ فلک کا سینہ بس ایک لمحے کو کھل گیا تھا،
تڑپتی۔ بل کھاتی ایک زرّیں لکیر آنکھوں میں پھر گئی تھی،
نہیں ——! یہ شیطاں کے سر پہ انگارے آسماں سے برس رہے ہیں
غریب کو جگمگاتے افعی نہ جانے کس دن سے ڈس رہے ہیں!

میں سوچتا ہوں۔ خموش ہوں۔ دم بخود ہوں اور پھر بھی سوچتا ہوں
عجب نہیں کم نگاہیاں مجھ کو میری نظروں میں پست کر دیں
قصور ہی کیا تھا چشم پوشی۔ اور اس پہ فطرت کی گرمجوشی!
نہ جانے یہ جگمگاتے افعی غریب کو کب سے ڈس رہے ہیں۔

سیاہ چادر کی چھاؤں میں یوں تو کھُل چکے ہیں ہزار سینے
چمکتے اور پُر بہار سینے!
تڑپتے۔ بل کھاتے ایک زرّیں لکیر سے داغدار سینے!!
اور آج بھی کھُل رہے ہیں لاکھوں ——
قصور ہی کیا ہے؟ چشم پوشی —— اور اس پہ فطرت کی نرم کوشی!
نہ تارا ٹوٹا —— نہ شعلہ بھڑکا
بس ایک دھڑکا سا دل نے آخر میں خود ہی محسوس کر لیا تھا۔

آوا بدایونی

سہارا

ادھر دیکھ یہ ریشمیں، مرمریں، نرم باہیں
یہ کلیوں کے گجرے، یہ حسنِ شبستاں
لچیلی، رسیلی، حسیں مسکراتی ہوئی شوخ کلیوں کے گجرے
یہ حسنِ فروغِ جمالِ شبستاں!
یہ مرکز تری آرزوئے جواں کا
یہ حاصل تری زحمتِ جاوداں کا
تری سینہ کوبیِ پیہم کا دردِ نہاں کا
"یہ قوسِ قزح کی چرائی ہوئی شوخ رنگت"
"یہ پھولوں کی نرمی، یہ کلیوں کی نزہت"
"ستاروں کی شوخی، بہاروں کی فطرت"
یہ جاتی ہوئی کہکشاں کو سبک گام راہیں!
یہ بے چین ہیں امتحاں کو،
یہی ریشمیں، نرم باہیں،
فروغِ شبستاں سے اب پھیر بھی لے نگاہیں،
یہ مانا کہ چشمِ فلک نے نہ اب تک جھلک دیکھ پائی
مبادا پڑے بال ان آئینوں میں
نہ زخمِ نگہ آنے پائے!
مگر اب ذرا آزما ان کی ہمت
یہ مدت سے بے چین ہیں امتحاں کو
تری تیرہ بختی، تری بے نوائی
ترے اشکِ پیہم، تری آہِ سوزاں
ترے درد کا اب بھی ممکن ہے درماں!
تجھے جس سہارے کی ہے جستجو مدتوں سے
ز فیضِ تمنا ابھی مل بھی جائے
بہت ہے کہ اب تک جواں ہیں ارادے
ذرا حوصلے دیکھ ان کے!
یہی ریشمیں، مخملیں، مرمریں باہیں
جو چاہیں،
اٹھا کر پٹک دیں زمین و زماں کو
ترے آسماں کو
ترے آسمانوں کے رازِ نہاں کو
یہ حسنِ فروغِ جمالِ شبستاں!

هرجائی

[illegible]

نہ جانے کب یہ پہاڑ سی رات ختم ہو گی
نہ جانے کب آفتاب کی قرمزی شعاعیں ہمیں پیامِ حیات دیں گی!
سکوت بردوش ہیں فضائیں
چراغ بھی ٹمٹما رہے ہیں
اور ایک بے برگ و بار چیری کا پیڑ اپنی نگاہیں نیچی کئے کسی سوچ میں مگن ہے
تمہاری آنکھوں میں ایسی واماندگی ہے گویا وہ کہہ رہی ہوں،
نہ جانے کب یہ پہاڑ سی رات ختم ہو گی
ہمیں تو اب نیند آ رہی ہے!'

میں لوٹتا ہوں تو اس کی پرچھائیں میرے کمرے کے زرد پردوں سے جھانک کر مجھ سے پوچھتی ہے
"بتاؤ کیا تم مری محبت سے بے خبر ہو؟
ذرا نگاہیں اٹھا کے دیکھو
تمہاری آوارہ و پریشان حال چیزوں کو کس سلیقے سے میں نے آراستہ کیا ہے ——!
مگر یہ باتیں تمہیں سنانے سے فائدہ کیا؟
میں جانتی ہوں کہ تم انہیں ہنس کے ٹال دو گے!"

وہ مجھ سے کہنے لگی (نگاہیں تو اُس کی دیوار پر جمی تھیں!)
"کبھی کبھی میں یہ سوچتی ہوں کہ اپنے کپڑوں کو پھاڑ کر ایک دن نکل جاؤں گھر سے باہر
برہنہ پا بھاگتی پھروں میں
ہواؤں میں اُڑ رہے ہوں میرے سنہری گیسو"
پھر ایک حسرت بھری نظر مجھ پہ ڈال کر —— "ہاں بتاؤ کیا یہ کبھی بھی ممکن نہیں کہ میں خود کو بھول جاؤں؟"

کسے خبر تھی کہ ایک ہی جام اُس کے جذبات کی فصیلوں کو توڑ دیگا۔
وہ میرے شانے پہ اپنا سر رکھے رو رہی تھی
نہ جانے پہلے بھی کتنی موہوم سی تمنائیں اُس کی آنکھوں میں آئی ہونگی
مگر —— یہ کیا، تم بھی رو رہی ہو!
سنو مری جان! قبل اس کے کہ تم کو ہو جائے مجھ سے نفرت
خدارا اک بار مسکرا دو!!

ضمیر جعفری

چورنگی

(کلکتہ کا پُر رونق بازار)

سڈول جسم پہ یہ تنگ ریشمیں ملبوس!
جوان چہروں پہ خوش رنگ آنچلوں کا خرام

لبوں کی نرم لکیروں سے پھوٹتے نغمات
حسین آنکھوں کی جھیلوں میں ٹوٹتے سے جام

اُلجھ کے سینے کی پیشانیوں سے گرتے ہوئے
طویل زلفوں کے تاریک آبشار کہ دام

یہ رنگ و رقص میں ڈوبے ہوئے نشاط کدے
یہ برق تاب چراغوں سے جھلملاتے بام

سیاہ زلفوں کی چھاؤں میں آتشیں رخسار
افق میں جیسے گلے مل رہی ہو صبح سے شام

یہ زر پہ بکتی ہوئیں "مہوشانِ نیم فرنگ"
(بساطِ سبزہ پہ ہوتی ہیں عصمتیں نیلام)

"مسافروں" کے قوی بازوؤں کے حلقوں میں
مچل رہا ہے خریدا ہوا "جمالِ تمام"

تفکّرات سے عاری کھلی جبینوں پہ
مسرّتوں کی سُبک چاندنی کا رقص و خرام

یہ کائنات کی نازک تھمی تھمی نبضیں!
یہ ایک نکتہ پہ ٹھہری سی گردشِ ایّام

الٰہی! کیا یہ وہی خطّۂ زمیں ہے جہاں
ترس کے مر گئے روٹی کو چار لاکھ غلام—؟

یہی وہ ارضِ ستم دیدہ ہے جہاں اب بھی؟
ہے "کارگر" پہ مشقّت روا، اناج حرام؟

یہیں پہ کھائے تھے کیا بیچ بھوکی ماؤں نے؟
جگر کے لختِ نظر کے قرار، دل آرام؟

غلط غلط کہ ہے بدلا ہوا نظامِ جہاں
ستم ستم کہ بشر ہے ابھی بشر کا غلام

غریب ہے اُسی صورت رہینِ فاقہ و غم
امیر کو وہی حاصل فراغِ عیشِ مدام

میرے لئے تو معمّہ ہے زیست کا یہ تضاد؟
مرے لئے تو اک عبرت ہے یہ سنہری شام

کمار تونسوی

وہاں سے یہاں تک

پلٹ کے دیکھو
کہ دیوتاؤں نے دیکھ پایا تھا عرش کی چوٹیوں سے مجھکو
زمیں کے بے برگ و بار سینے پہ، ایک سوکھے شجر کے نیچے
مقامِ برتر سے لَو لگائے، کہیں فلک پر نظر جمائے
جبیں پہ تلوار سی لکیریں، علامتِ سرکشی ہوں — گویا
وہ ایک گنبھیرِ بے نیازی، وہ ایک اندازِ خود پسندی
کہ "اندر دیوتا" کے تختِ زرّیں سے چھین ہی لونگا سربلندی
— مگر مجھے تم معاف کر دو!
وہ میری اک بھول تھی رفیقو!
غلام بندو، گناہ گارو!
ذلیل جسمو، مریض روحو، حقیر کیڑو! — معاف کر دو!
اسے مری ایک بھول سمجھو
کہ پاکبازانِ عرش سے جا کے اپنی نظریں ملا سکوں گا
کہ نیکیوں کی بلند چوٹی سے دیکھ پاؤں گا زندگی کو
کہ "برتری" کی عبادتوں سے میں "اندر" کا تخت جیت لوں گا

(۲)

ٹھہر کے دیکھو
ٹھہر کے دیکھو —! کہ دیوتاؤں کی بستیوں سے دھواں سا اٹھا
دھوئیں کے جنباں پروں کے جھولے پہ ایک شعلہ اتر رہا ہے
وہ ایک شعلہ، وہ ایک گندم کا دانۂ زرنگار — جس نے
ادا و عشوہ سے میرے آبا کی جنتوں کو جلا دیا تھا
وہ ایک دانہ، وہ ایک شعلہ، وہ ایک مینکا اتر رہی ہے
(وہ آزمودہ گناہ کا تیر، عرش کی نیک ہستیوں کا)
اتر رہی ہے وہ رقص کرتی، وہ چھم چھماتی، فسوں جگاتی
مری نگاہوں میں سرسراتی
مرے خیالوں میں گنگناتی
مرے ارادوں کو ڈگمگاتی

مری چٹانوں کو تھرتھراتی
مری لکیروں پہ چھپاتی
مجھے جگاتی، مجھے سلاتی، مجھے جگاتی
خزاں کے سینے پہ گل کھلاتی
بلندیکی نے آزمودہ بدی سے مجھکو مرا دیا ہے
وہ "مہرِ بخشی بسوامتر"۔۔ لب ہائے شعلہ ساماں کو چومتا ہے
وہ گرسنہ بے نیاز، اک زرنگار دانے پہ جھومتا ہے
وہ سرکش و تیغ باز جھٹلا رہا ہے اپنی عبادتوں کو
وہ۔۔۔ آسماں کا دھواں فضاؤں میں قہقہہ بن کے گھومتا ہے

(۳)

سنبھل کے دیکھو
سنبھل کے دیکھو یہ آسماں بوس محل، یہ سیم گوں عمارت
بلند ہیں دیوتا ابھی تک، ابھی مقدس ہیں عرش والے
ابھی ہے ان چوٹیوں میں وہ جادو نے لب شعلہ بار پنہاں
جو اپنی تقدیر ہے ازل سے، جو اپنا مقصود ہے ابد تک
ابھی ہے ان ترکشوں میں وہ تیرِ آزمودہ ۔۔۔ وہ نانِ گندم
دھوئیں کے جھولے پہ جس کو یہ دیوتا، زمیں پہ اُتارتے ہیں
جسے یہ اب بھی اُتارتے ہیں
سنوارتے ہیں نکھارتے ہیں
ہماری تلواریں کاٹتے ہیں
بموں کی تانوں پہ ناچتے ہیں
اُبھار کر آہنی منارے
"مقامِ برتر کو تھامتے ہیں"
ذلیل جسموں، مریض روحوں، حقیر کیڑوں کو جانتے ہیں
انہیں یہ اب بھی نوازتے ہیں
کہ اب بھی ہیں ان تختے پیچ کھاتے دھوئیں سے معمور یہ فضائیں
کہ اب بھی ہیں آسمانِ برتر کے پاس وہ سیمگوں ادائیں
کہ جب بھی ہم زندگی کے بے برگ و بار گوشوں سے سر اٹھائیں
تو دیوتا، نیکیوں کی چوٹی پہ تلملا اُٹھیں، بم گرائیں
کہ ہم کہیں اندر دیوتا کا وہ تختِ زرّیں نہ چھین پائیں
سنبھل کے دیکھو
پلٹ کے دیکھو، ٹھہر کے دیکھو، بلندیوں کو سنبھل کے دیکھو!

تغیّر

عبدالمجید بھٹی

ایک سنگین و سیہ ہاتھ نہ جانے کب سے
گلشنِ دہر میں تھا جبرِ مسلسل کی نمود
اس کے ہونے سے بہاروں میں بھی تھا خوفِ خزاں
اس کے ہونے سے ہر اک شے پہ تھی لرزش طاری
کپکپاتی ہوئی کلیاں تھیں، شگوفے لرزاں
پھول اس دستِ ستمگر سے ہراساں ترساں
جس کو جب چاہے وہ چٹکی میں مسل دیتا تھا
روکتا کوئی نہ تھا اس کو تہِ چرخِ کبود!
اس کے ہونے سے تھی معصوم جوانی مبہوت
اس کے ہونے سے تھے بہکے ہوئے ارماں خاموش
اس کے ہونے سے چہک پر بھی کھٹک تھی غالب
اس کے ہونے سے مہک پر بھی تھا اک خوف محیط
نقرئی قہقہے یوں ٹوٹ کے رہ جاتے تھے
جیسے آوارہ فضاؤں میں کسی کی فریاد
جیسے دم توڑتی راتوں میں سسکتی جانیں
روکتا کوئی نہ تھا اس کو تہِ چرخِ کبود
... نے اس دستِ ستم کار کو دیکھا تو کہا:-

کاش تجھ پر ترا اپنا ہی غضب ٹوٹ پڑے
قہر اللہ کا تجھ پر کسی ڈھب ٹوٹ پڑے
انگلیاں تیری جھڑیں اور یہ پنجہ ہی قلم ہو جائے
تیرا اک ایک لہو تیری رگوں میں جم جائے
تجھ پہ بجلی گرے، ہو ختم تری تاب و تواں
گلشنِ دہر میں باقی نہ رہے خوفِ خزاں
کوئی باقی نہ رہے دہر میں بن کر فتنہ
کوئی باقی نہ رہے بخت و مقدر کا نشانہ
اپنے ہاتھوں میں ہو سب سلسلۂ بست و کشود
میری نفرت بھری آنکھوں نے جو روکا اس کو
قہر آلود نگاہوں نے جو ٹوکا اس کو،
اس طرح اس کے ارادوں کی کماں ٹوٹ گئی
اس طرح سمٹی لپک اس کی جھپٹ چھوٹ گئی
جیسے اک ننھی دلہن ساس کی دھمکی سہ جائے
جیسے دہشت زدہ خرگوش سمٹ کر رہ جائے
اور بے معنی ہوا مسئلہ بود و نبود

ظہیر کاشمیری

بین الاقوامیت

دُور اُدھر — جب میرے اجداد نے تقسیم کیا
رنگ اور نسل کی بنیاد پہ انسانوں کو
پرچمِ امن اتارے گئے تحقیر کے ساتھ
جنگ کی گونج نے تھرّا دیا ویرانوں کو

تیغ بردار، جگردار جواں آتے تھے
اور وہ انکے رجز — "ہم ہیں قبیلے کے امیر
وہ قبیلہ کہ پہاڑوں کو دھنک کر رکھ دے
وہ قبیلہ کہ تہوّر میں نہیں جس کی نظیر
وہ قبیلہ کہ بگولوں پہ کمندیں ڈالے
وہ قبیلہ کہ شہیدوں کا لہو جس کا خمیر
کون اِس آہنی دیوار سے ٹکرائے گا؟
پنجۂ موت میں لے آئی ہے کس کو تقدیر؟"

اِسی انداز سے بہتا رہا انساں کا لہو
اسی انداز سے ہر ملک میں چمکی شمشیر

صبح ہوتی ہے تو سورج کی طلائی کرنیں
مشرقی کوہ پہ سمٹی ہوئی تھرّاتی ہیں
دن چڑھے تک یہی سمٹی سی طلائی کرنیں
بحر و بر حلقۂ انوار میں لے آتی ہیں

تابشِ زیست قبیلوں سے نکل کر پھیلی
چالی پیکن و پیرو کے سمن زاروں میں،
نور کی موج کسی طور نہیں بٹ سکتی
رنگ اور نسل کی گرتی ہوئی دیواروں میں

تاج، اہرام، ابوالہول، معلّق باغات
ایک مضبوط تسلسل کا پتہ دیتے ہیں۔

ساحر لدھیانوی

مادام

آپ بے وجہ پریشان سی کیوں ہیں مادام!
لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے
میرے احباب نے تہذیب نہ سیکھی ہوگی
میرے ماحول میں انسان نہ رہتے ہوں گے

نورِ سرمایہ سے ہے روئے تمدن کی جِلا
ہم جہاں ہیں وہاں تہذیب نہیں پل سکتی
مفلسی حسِ لطافت کو مٹا دیتی ہے
بھوک، آداب کے سانچوں میں نہیں ڈھل سکتی

لوگ کہتے ہیں ـــ تو لوگوں پہ تعجب کیسا
سچ تو کہتے ہیں کہ ناداروں کی عزت کیسی
لوگ کہتے ہیں! مگر آپ ابھی تک چپ ہیں
آپ بھی کہیئے، غریبوں میں شرافت کیسی

نیک مادام! بہت جلد وہ دَور آئے گا
جب ہمیں زیست کے ادوار پرکھنے ہونگے
اپنی ذلت کی قسم، آپ کی عظمت کی قسم
ہم کو تعظیم کے معیار پرکھنے ہونگے

ہم نے ہر دَور میں تذلیل سہی ہے، لیکن
ہم نے ہر دَور کے چہرے کو ضیا بخشی ہے
ہم نے ہر دور میں محنت کے ستم جھیلے ہیں
ہم نے ہر دَور کے ہاتھوں کو حنا بخشی ہے

لیکن ان تلخ مباحث سے بھلا کیا حاصل؟
لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہونگے
میرے احباب نے تہذیب نہ سیکھی ہوگی
میں جہاں ہوں وہاں انسان نہ رہتے ہونگے

قتیل شفائی

ہرجائی

کھیت سے دور، دمکتے ہوئے دوراہے پر
ایک سرشار جواں میں نے کھڑا پایا تھا
تمتماتے ہوئے چہرے پہ سلگتی آنکھیں
جیسے مہکے ہوئے گلزار کا خواب آیا تھا

کھیت بھرپور جوانی کو لٹا بیٹھے تھے
ہر درانتی پہ تسلسل کا جنوں طاری تھا
جانے کیا دیکھ رہا تھا وہ مرے چہرے پر
اِس قدر یاد ہے، انگلی سے لہو جاری تھا

سر پہ پانی کے چھلکنے سے جو تارے ٹوٹے
آسماں جھانک رہا تھا مجھے حیرانی سے
ٹن سے کنکر جو پڑا میری حسیں گاگر پر
ایک نغمہ سا اُبھرنے لگا پیشانی سے

"کانچ کی چوڑیاں کل رات نہ ہوں بانہوں میں
اتنی اونچی تری پازیب کی جھنکار نہ ہو
سرسراتا ہوا ملبوس نہ لہرا جائے
کسی سائے کا گماں بھی پسِ دیوار نہ ہو"

ڈھلتی رات گئے، گھر کو پلٹنا میرا
ایک لپکتے ہوئے سائے نے ڈرایا تھا مجھے
"تم؟ ارے تم؟" (وہی سرشار جواں تھا شاید)
"جی یونہی ایک سہیلی نے بلایا تھا مجھے"

جب کبھی چاند سے پگھلی ہوئی چاندی برسی
اونگھتی رات کے شانے کو جھنجھوڑا ہم نے
بھول کر بھی کبھی پلکیں نہ جھپکنے پائیں
اِس قدر نیند کو آنکھوں سے نچوڑا ہم نے

اب مگر چاندنی رات آ کے گزر جاتی ہے
پوچھتا ہی نہیں کوئی مری تنہائی کو
کھیت سے دور، دمکتے ہوئے دوراہے پر
ڈھونڈتی ہیں مری آنکھیں کسی ہرجائی کو

تصدق حسین خالد

یاد

خود بخود دل میں کھنچے جاتے تھے
مجھے معلوم نہ تھا
تیرے نظاروں میں یہ کیفیت جذب بھی ہے
کسی منزل کی حدیں چھو لی تھیں

زندگی، گرمِ سفر۔
روز نئی اک الجھن
آج کیا کرنا ہے
کل کیا ہوگا۔

ریت کا سیلِ رواں
اور یہ دوپہر کی چلچلتی ہوئی دھوپ
دل کے اک دُور سے کونے میں چھپی بیٹھی تھی۔
دلہن کی طرح
وقت کچھ نہ کر سکا
پھر تری یاد خراماں آئی

گیت ہی گیت
محبت کے پُرانے رمنے
کسی نوخیز جوانی کا دہکتا ہوا پھول
رُوح کہتی ہے لگاؤں کی ستاروں کا سراغ
یہ مسرت میں چبھن کیسی ہے ؟

مقبول حسین احمد پوری

گیت

اس یُووَن[1] کی ماؤکتا[2] سے نت انگ[3] میں رہتی جولانی!

ہر رنگ میں ہے اک سُندرتا ہر بھاؤ میں شوبھا من مانی

ہر شبد لئے سنگیت نیا ہر بات میں موہنی نادانی

اس یُووَن کی ماؤکتا سے نت انگ میں رہتی جولانی!

وہ پریم جو دو نینوں میں پلے آشاؤں کی چھایا پیاری

وہ مُورتی جو ہردے میں ڈھلے ابھلاکھا[4] کی مایا نیاری[5]

اس یُووَن کی ماؤکتا سے نت انگ میں رہتی جولانی!

اے پریمی تجھ سے بھول ہوئی جس بھاؤ[6] پہ ہے تو بَورایا[7]

وہ ایک ترنگ ہے جیون کی اور تیری آتما کی چھایا

تو بنا پجاری مایا کا اور تتو[8] سے کی آنا کانی[9]

اس یُووَن کی ماؤکتا سے نت انگ میں رہتی جولانی!

---

۱ جوانی ۲ نشہ ۳ جسم ۴ آرزو ۵ نرالی ۶ جذبہ ۷ دیوانہ ہوا ۸ حقیقت ۹ غفلت

کرشن موہن

سُراغ

میں نے خاموش ستاروں سے محبت کی ہے
مرے محبوب رہے ہیں یہ الم خیز مزار
بارہا مَیں نے جلائے ہیں چراغ

میں نے دیکھا ہے فضاؤں کا تبسم اکثر
مجھے مرغوب رہی ہے یہ مسرت کی بہار
میں نے دیکھے ہیں یہ شبنم کے ایاغ

کہکشاں زارِ تمنا کے امیں، یہ چہرے
میں نے ان چہروں پہ بھی دیکھا ہے حسرت کا نکھار،
جلوہ گسترِ ــــ دلِ مایوس کے داغ

مجھے تسلیم کہ تخلیق کا سرچشمہ ہے دل
کتنے ارمانوں کا مقتل ہے یہی نادرہ کار
کتنے مفقود عزیزوں کا سراغ

مَیں نے اِس شہرِ خموشاں میں چراغاں بھی کیا
میں نے ان داغوں میں دیکھی ہے چراغوں کی قطار
دشتِ افسردہ میں سرسبز ہوتے باغ

سید مظفر برنی

ایک منظر

چاند ستارو! مل کر گاؤ!
آج زمیں پر خون کی ندی
بہتے بہتے سوکھ گئی ہے
درد کے سائے ظلم کی چھاؤں
سمٹ سمٹ کر دور ہوئی ہے

چاند ستارے مل کر بولے
ہم نے اس آکاش کے نیچے
روز یہی منظر دیکھا ہے

چاند ستارو! اشک بہاؤ!
آج زمیں پہ خون کی ندی
بڑھتے بڑھتے یہ نکلی ہے
ظلم کے سائے، درد کی چھاؤں
سارے جہاں پر پھیل گئی ہے

چاند ستارے ہنس کر بولے
ہم نے اِس آکاش کے نیچے
روز یہی منظر دیکھا ہے

جگر مراد آبادی

جگر پارے

دنیا کے ستم یاد نہ اپنی ہی وفا یاد — اب مجھ کو نہیں کچھ بھی محبت کے سوا یاد

کہتے ہیں نہیں ہم کو تری مہر و وفا یاد — اب دیکھیے کب تک اُنہیں رہتا ہے خدا یاد

میں شکوہ بہ لب تھا مجھے یہ بھی نہ رہا یاد — شاید کہ مرے بھولنے والے نے کیا یاد

بندے کی نہیں تاب کرے یاد خدا کی — بندے کو اگر خود نہ کرے اس کا خدا یاد

چھیڑا تھا جسے پہلے پہل تیری نظر نے — اب تک ہے وہ اک نغمۂ بے ساز و صدا یاد

کیا جانیے کیا ہو گیا اربابِ جنوں کو — جینے کی ادا یاد نہ مرنے کی ادا یاد

جب کوئی حسیں ہوتا ہے سرگرمِ نوازش — اس وقت وہ کچھ اور بھی آتے ہیں سوا یاد

مدت ہوئی اک حادثۂ عشق کو لیکن — اب تک ہے ترے دل کے دھڑکنے کی صدا یاد

کیا لطف کہ میں اپنا پتا آپ بتاؤں — کیجے کوئی بھولی ہوئی خاص اپنی ادا یاد

ہاں ہاں تجھے کیا کام مری شدتِ غم سے
ہاں ہاں نہیں مجھ کو ترے دامن کی ہوا یاد

اثر لکھنوی

غزل

عشق کی گرمیٔ بازار کہاں سے لاؤں
یوسفِ دل کا خریدار کہاں سے لاؤں

جن سے میں اپنی محبت کا چمن سمجھا تھا
آہ وہ پھول سے رخسار کہاں سے لاؤں

سنتے ہی نغموں کی اک لہر رگوں میں دوڑے
میں تری شوخیٔ گفتار کہاں سے لاؤں

وہی شوریدہ سری ہے وہی ایذا طلبی،
عشق میں جادۂ ہموار کہاں سے لاؤں

دلِ بیتاب خدارا تری تسکیں کے لئے
جلوۂ حسن بتکرار کہاں سے لاؤں

تو ہی بتلا دے اگر تجھ کو ہو معلوم کوئی
تجھ سا اک بے سببِ آزار کہاں سے لاؤں

تیرے انوارِ تجلی کی جھلک تھی جس میں
وہ دلِ آئینۂ اسرار کہاں سے لاؤں

ہو گئیں آنکھوں سے وہ مست ادائیں اوجھل
عشرتِ خانۂ خمار کہاں سے لاؤں

دل کی دھڑکن میں سنا کرتا تھا پیغام ترا
اب وہ ہنگامۂ بسیار کہاں سے لاؤں

اُس پہ آئینہ ہو کس طرح تمنا دل کی
شوقِ منت کشِ اظہار کہاں سے لاؤں

مجکو اب دعوتِ گل چینیٔ نظارہ نہ دے
دل حریفِ گل و گلزار کہاں سے لاؤں

تو وہی ہے وہی شانیں وہی جلوے تیرے
پہلی سی طاقتِ دیدار کہاں سے لاؤں

سر وہی، شوق وہی، جوش وہی سجدوں کا
کوچہ و سنگِ درِ یار کہاں سے لاؤں

معبدِ دل میں پرستارِ محبت ہوں اثر
روشِ کافر و دیندار کہاں سے لاؤں

آتشکدہ

عبدالحمید عدم

مری جوانی کے گرم لمحوں پہ ڈال دے گیسوؤں کا سایہ
یہ دوپہر کچھ تو معتدل ہو، تمام ماحول جل رہا ہے

تخلیقِ کائنات کے دلچسپ جرم پر
ہنستا تو ہوگا آپ بھی یزداں کبھی کبھی

شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہوں آپ
محفل میں اس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں

مسکرانے لگی تھی ایک کلی
کہ اچانک بہار بیت گئی

ایک عنواں کا تجسس ہے کہانی کے لئے
ایک شعلے کی ضرورت ہے جوانی کے لئے

ذرا اک تبسم کی تکلیف کرنا
کہ گلزار میں پھول مرجھا رہے ہیں

بے خودی میں مرا آغوش ہے مجھ سے آگے
شرم مت کیجئے میں شاملِ آغوش نہیں

میں نے شراب، تو نے مروّت کا خوں پیا
میرا قصور نرم ہے تیرے قصور سے

اس چاند سی جبیں پہ عبادت کا تلخ بوجھ
ظالم خیال کر، ابھی عہدِ شباب ہے

یہ کائنات تری اے طلسم بندِ ازل
بڑی حسین ہے، لیکن بہت پرانی ہے

اِک ستارہ، اک کلی، اک مے کا قطرہ، ایک زلف
جب اکٹھے ہو گئے، تعمیرِ جنت ہو گئی

جہاں جہاں رہِ ہستی میں تیرگی دیکھی
وہاں وہاں ترے رخ سے نقاب اُٹھا دونگا

حفیظ ہوشیارپوری

غزل

نہیں ہے کس کی خبر، کیا تمہیں نہیں معلوم
مگر جو حال ہے میرا، تمہیں نہیں معلوم

سکونِ ضبط و سکوتِ الم کہیں جس کو
وہ اضطرابِ تمنّا تمہیں نہیں معلوم

مری نگاہ کو ذوقِ نگاہ سمجھے تم
مری نگاہ میں کیا تھا تمہیں نہیں معلوم

مری نظر کے تقاضوں پہ یہ عتابِ نظر!
کبھی تو دل کا تقاضا تمہیں نہیں معلوم

یہ احترامِ تمنّا، یہ احتیاطِ نظر
کچھ اس طرح تمہیں دیکھا تمہیں نہیں معلوم

یہ میرے دل سے، یہ میری نگاہ سے پوچھو
جہاں میں ہے کوئی تم سا تمہیں نہیں معلوم

جفائے دوست وفا ہے یہ جانتا ہوں میں
کہے گی کیا تمہیں دنیا تمہیں نہیں معلوم

ستا رہی ہے تمہیں کس لیے حفیظ کی یاد
وہ تم کو بھول چکا، کیا تمہیں نہیں معلوم

غزل

اختر شیرانی

کون آیا بزمِ گل و یاسمن میں؟
کہ شادابیاں جاگ اٹھیں چمن میں

تری یاد باقی، ترا غم سلامت!
بہلتا نہیں دل کسی انجمن میں

یہ کس نے نگاہِ بہاریں سے دیکھا
بہاروں نے انگڑائیاں لیں چمن میں

بہت پھول دیکھے کسی میں نہ پائی
جو خوشبو بسی تھی ترے پیرہن میں

ن کا جواب اس چمن وش کا دیگا
بہت فرق ہے گل میں اور گلبدن میں

ذرہ اک آنکھ بن کر ہے مضطر
وہ کب آئیں گے میرے دارالمحن میں

بدن اور شفق رنگ عارض
کہ گلہائے احمر ہیں شاخِ سمن میں

وہ جانِ چمن آج آئے گی اختر
چلو چل کے کلیاں بچھا دیں چمن میں

غزل

احمد ندیم قاسمی

مری نگاہ سے یہ پردہ کس نے سرکایا
جبینِ شوق کو سجدوں کا پھر خیال آیا

یہی لُٹی ہوئی نیندیں یہی فسردہ دلی
میں سوچتا ہوں کہ سب کچھ لٹا کے کیا پایا

یہاں نہ ساز کی جھنکار ہے نہ رقص کی دھن
خیال نے مجھے کس انجمن میں پہنچایا

یہ تیری بزم ہے یا پتلیوں کا ناٹک ہے
ابھی تو لا کے بٹھایا، ابھی نکلوایا

حنا کا اب نہ بہانہ تراش میں خوش ہوں
کہ دل کا آخری قطرہ بھی تیرے کام آیا

خدا کو مدِ نظر تھی جمال کی تخلیق
تو اک فرشتہ ہیولیٰ ترا اٹھا لایا

ترے جہاں میں ہے کیوں تشنگی فنا کی دلیل
کہ غنچہ ہنستا رہا، اور پھول مرجھایا

مجھے بھی دیکھ، ستاروں کو ڈھانپنے والے
بجھا کے اپنا دیا تیرا نام چمکایا

سیف الدین سیف

غزل

راہ آسان ہو گئی ہو گی
جان پہچان ہو گئی ہو گی

موت سے تیرے دردمندوں کی
مشکل آسان ہو گئی ہو گی

پھر پلٹ کر نگہ نہیں آئی
تجھ پہ قربان ہو گئی ہو گی

اُن سے بھی چھین لو گے یاد اپنی
جن کا ایمان ہو گئی ہو گی

تیری زلفوں کو چھیڑتی تھی صبا
خود پریشان ہو گئی ہو گی

دل کی تسکین پوچھتے ہیں آپ
ہاں مری جان ہو گئی ہو گی

مرنے والوں پہ سیفؔ حیرت کیوں
موت آسان ہو گئی ہو گی

ناصر کاظمی

غزل مسلسل

محرومِ خواب دیدۂ حیراں نہ تھا کبھی
یہ تیرا رنگ اے شبِ ہجراں نہ تھا کبھی

تھا لطفِ وصل اور کبھی افسونِ انتظار
یوں دردِ ہجر سلسلہ جنباں نہ تھا کبھی

پرساں نہ تھا کوئی تو یہ رسوائیاں نہ تھیں
ظاہر کسی پہ حالِ پریشاں نہ تھا کبھی

ہر چند غم بھی تھا مگر احساسِ غم نہ تھا
درماں نہ تھا تو ماتمِ درماں نہ تھا کبھی

دن بھی اداس اور مری رات بھی اداس
ایسا تو وقت اے غمِ دوراں نہ تھا کبھی

اے عشق کیا ہوئے ترے لمحاتِ پُرسرور؟
میں بے نصیبِ خلوتِ جاناں نہ تھا کبھی

دورِ خزاں میں یوں مرے دل کو قرار ہے
میں جیسے آشنائے بہاراں نہ تھا کبھی

کیا دن تھے جب نظر میں خزاں بھی بہار تھی
یوں اپنا گھر بہار میں ویراں نہ تھا کبھی

بے کیف و بے نشاط نہ تھی اس قدر حیات
جینا اگرچہ عشق میں آساں نہ تھا کبھی

شکیل بدایونی

غزل

اب تک شکایتیں ہیں دلِ بدنصیب سے
اک دن کسی کو دیکھ لیا تھا قریب سے

اکثر بہ زعمِ ترکِ محبت خدا گواہ
گذرا چلا گیا ہوں دیارِ حبیب سے

دستِ خزاں نے اس کو وہیں بڑھ کے چن لیا
جو پھول گر گیا نگہِ عندلیب سے

اہلِ سکوں سے کھیل نہ اے موجِ انبساط
اک دن الجھ کے دیکھ کسی غم نصیب سے

تا اہلِ ناز کو بھی ملے فرصتِ نیاز
ہیں دور ہٹ گیا جو وہ گذرے قریب سے

یہ کس خطا پہ روٹھ گئی چشمِ التفات
یہ کب کا انتقام لیا مجھ غریب سے

اُن کے بغیر بھی ہے وہی زندگی مگر
حالاتِ زندگی ہیں مگر کچھ عجیب سے

سمجھے ہوئے تھے حسنِ ازل جس کو ہم شکیل
اپنا ہی عکسِ رُخ نظر آیا قریب سے

غزل

موج (علیگ)

شوخیِ دیدۂ تر، کیفِ نظر باقی ہے
آج بھی اُنکی محبت کا اثر باقی ہے

ابھی راتیں ہیں مری نغمہ و پیمانہ بلب
آج بھی انجمنِ شمس و قمر باقی ہے

ابھی قائم ہیں نگاہوں میں جوانی کی حدیں
ابھی پہلو میں کوئی شعلۂ تر باقی ہے

میں کہاں اور بلندی کے مقامات کہاں
آج بھی حسرتِ پرواز مگر باقی ہے

ابھی قائم ہے سنورنے کیلئے ایک جہاں
ابھی اُٹھنے کیلئے اُنکی نظر باقی ہے

مدتوں سے غمِ انساں کا مقدر ہے وہی
آج بھی وقت کی پلکوں میں گہر باقی ہے

اور اُبھرے گا ابھی لیلیٰ گیتی کا شباب
ابھی اندیشۂ طوفانِ دگر باقی ہے

آج بھی دوڑ رہا ہے رگِ احساس میں خوں
آج بھی غیرتِ توہینِ بشر باقی ہے

ابھی مشرق کی فضائیں ہیں رہینِ ظلمت
[illegible] سے اُبھرنے کو سحر باقی ہے

غزل

مسعود پرویز

ساحل ملا تو موجِ بلا ڈھونڈتے رہے
ہم عرصۂ حیات میں کیا ڈھونڈتے رہے

گذری بہار چاک گریباں کئے ہوئے
ہم اپنے ضبطِ غم کا صلا ڈھونڈتے رہے

آنکھوں میں اپنی خونِ تمنا لئے ہوئے
ہر نقشِ پا میں رنگِ حنا ڈھونڈتے رہے

وارفتگی تھی خاک بسر کوئے غیر میں
اے دوست آج تیری وفا ڈھونڈتے رہے

شاید تری نگاہِ کرم ہی میں تھا نہاں
وہ قہر جس کو اہلِ جفا ڈھونڈتے رہے

پاکیزگی شریکِ ہوس تھی، جو آج ہم
بیباکیٔ نظر میں حیا ڈھونڈتے رہے

اِک جست میں جنوں کی میانِ حریم
بابِ اثر کو دستِ دعا ڈھونڈتے رہے

افسانے اور ڈرامے

کرشن چندر
اختر حسین رائے پوری
پرکاش موہن
جاوید اقبال
راجندر سنگھ بیدی
عصمت چغتائی
احمد ندیم قاسمی
علی عباس حسینی
ابراہیم جلیس
دھرم پرکاش آنند
ممتاز مفتی
ہاجرہ مسرور
عزیز احمد
بلونت سنگھ
مہندر ناتھ
شفیق الرحمٰن

جدید افسانوی ادب

منٹو کے افسانے — سعادت حسن منٹو
بگولے — احمد ندیم قاسمی
طلوع و غروب — "
ان کہی — ممتاز مفتی
زندگی کے موڑ پر — کرشن چندر
ٹوٹے ہوئے تارے — "
طلسم خیال — "
ان داتا — "
چراغ تلے — "
چٹان — اپندر ناتھ اشک
کونپل — "
باسی پھول — علی عباس حسینی
میلہ گھومنی — "
رفیق تنہائی — "
گرہن — راجندر سنگھ بیدی
دانہ و دام — "

چاندی کے تار — مہندر ناتھ
کرنیں — شفیق الرحمٰن
بھرے بازار میں — حیات اللہ انصاری
درپن — شکیلہ اختر
ہائے اللہ — ہاجرہ مسرور
ایک بات — عصمت چغتائی
زندگی کا میلہ — اختر حسین رائے پوری
جدید، جدید تر — دھرم پرکاش آنند
جگا — بلونت سنگھ
منظر پس منظر — اختر اورینوی
کلیاں اور کانٹے — "
خونی — اختر انصاری
ایک لڑکی — خواجہ احمد عباس
الاؤ — سہیل عظیم آبادی
تین پیسے کی چھوکری — قاضی عبدالغفار
پردہ سیمیں — ڈاکٹر نصیر الدین

پودے

(ایک رپورتاژ)

کردار، مقام، واقعات سب حقیقی ہیں۔ مصنف صرف ترتیب اور تسلسل کا ذمہ دار ہے

کرشن چندر

جب کرشن چندر بوری بندر کے سٹیشن پر پہنچا تو اُس نے دیکھا کہ سید سجاد ظہیر جو کمیونسٹ ہونے کے باوجود اپنے نام سے پہلے سید لکھتے ہیں، کچھ اُداس، کچھ پریشان سے کھڑے گیارہ نمبر کے پلیٹ فارم کے باہر اُس کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ پستہ قد مصنف نے جس کے فراخ ماتھے سے بال بڑی تیزی سے غائب ہو رہے تھے۔ اور جس نے اپنی بھینگی آنکھوں کو عینک کے دبیز شیشوں سے ڈھانپ رکھا تھا سید سجاد ظہیر کے قریب جا کر طفلیانہ انداز میں معذرت پیش کرنے کی جرأت کی۔

"بھئی" ـــــ سید سجاد ظہیر نے شروع کیا، لیکن کرشن چندر اُسی لمحے بول اٹھا: "بھئی معاف کرنا دیر ہو گئی۔" اُس نے اپنے لبوں پر ایک جھوٹی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا: "یہ تو دیکھو۔ ملاڈ سے آ رہا ہوں۔ یہاں سے اٹھارہ میل کا فاصلہ ہے۔ پھر بیوی بچوں سے بھی رخصت ہونا تھا۔ علاوہ ازیں سامان ساتھ تھا۔ اور نوکر عین وقت پر کہیں بھاگ گیا۔ اور ..."

بس کرشن چندر اسی طرح بے ربط جملے کہتا جا رہا تھا۔ بظاہر بے ربط لیکن بباطن بدرجۂ غائت مرتب جملے۔ یہ بے ربطی جو اُس کے افسانوں میں ہے۔ اُس کی زندگی میں بھی نظر آتی ہے۔ لوگ بہر صورت دھوکا کھاتے ہیں ـــ بے چارے۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ سید سجاد ظہیر کے لبوں تک بھی ایک مسکراہٹ آ گئی۔

یہ کس قدر لطیف پاکیزہ نورانی مسکراہٹ تھی۔ سید سجاد ظہیر اطوار و گفتار میں بالکل چمڑے کے سوداگر معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کی متین اور خاموش صورت دیکھ کر کوئی اُن کی جودتِ طبع کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ لیکن جب وہ مسکراتے ہیں تو ذہانت بے نقاب ہو جاتی ہے۔ تبسم ہے کہ ہنستا ہوا کنول ہے۔ شستہ ہے، خوبصورت ہے، دلکش ہے، نور کا فوارہ ہے، تخیل کا کوندا ہے، ذہانت کی لہر ہے، اُمڈتی ہوئی، بل کھاتی ہوئی، آگے بڑھتی ہوئی۔ ہیجانی، سیلابی، طوفانی۔ جو چشم زدن میں ایک سیدھے سادے، موٹے موٹے، رُندھے رُندھے چہرہ کو سرسبز و شاداب بنا دیتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید سجاد ظہیر کے پاس اس تبسم کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ (شاید اب وہ ہر روز آئینے میں دیکھ کر مسکرایا کریں گے۔ ہاں واللہ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ تبسم [illegible]

سید سجاد ظہیر نے مسکرا کر معاف کر دیا: "چلو بھئی۔ بس اب ... [illegible] چھوٹنے میں چند منٹ باقی ہیں۔" اتنا کہہ کر انہوں نے گھبرا کر پلیٹ فارم کی گھڑی کی طرف دیکھا۔

دفعتاً علی سردار جعفری سر پر آن کھڑے ہوئے۔ اُن کی بے کریز پتلون، بڑھے ہوئے بال اور گھونسہ مار کر چہرہ بڑے بڑے جغادری ادیبوں پر رعب طاری کر دیتا ہے۔ کرشن چندر نے انہیں آتے دیکھ کر اپنی پلکیں جھپکائیں اور ادھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا۔ لیکن ان حرکتوں سے کیا ہوتا تھا۔ سردار نے بڑھ کر چندر کے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا: "کیوں بھائی، کیا حرکت ہے۔ اس وقت چلے آ رہے ہو۔ گیارہ بجے کا وقت نہیں دیا تھا؟ اب دیکھو ایک بج ... اب خیر جلدی سے سامان ..." "ٹھیک ہے" سید سجاد ظہیر نے چونک کر کہا۔ "ہاں بھئی چلو! خدا جانے اب تک وہاں کھڑے کیا سوچ رہے تھے۔"

(۲)

تھرڈ کے ڈبے پر سکندر آباد لکھا تھا۔ سکندر آباد جو حیدر آباد دکن میں واقع ہے۔ تھرڈ کا ڈبہ جو نظام اسٹیٹ ریلوے کی ملکیت تھا۔ اُس وقت بوری بندر کے سٹیشن پر کھڑا تھا۔ اور مسافر اِس میں گڑ کی بھیلیوں کی طرح ٹھنسے ہوئے تھے۔ نظام اسٹیٹ ریلوے کے تیسرے درجے کے ڈبوں میں بھی بجلی کے پنکھے لگے ہوتے ہیں۔ چنانچہ جہاں ترقی پسند ادیبوں کا گروہ بیٹھا تھا وہاں اتنی گھٹن نہ تھی۔ دراصل ان لوگوں نے اپنے بیٹھنے کیلئے اچھی جگہ حاصل کر لی تھی۔ پورے ڈبے میں صرف دو پنکھے تھے اور جہاں یہ پنکھے تھے وہیں ترقی پسند ادیب بھی تھے، دونوں پنکھوں کے نیچے آمنے سامنے ٹولیاں بنا کے بیٹھ گئے تھے۔ گاڑی میں اس لئے بیٹھے تھے۔ کیونکہ حیدر آباد دکن جا رہے تھے۔ اور حیدر آباد دکن اس لئے جا رہے تھے۔

کوشاں اُردو کے ترقی پسند ادیبوں کی کُل ہند کانفرنس تھی۔

ایک ٹولی میں سید سجاد ظہیر، ڈاکٹر ملک راج آنند، مدن گوپال، سبطے حسن اور مہندر ناتھ شامل تھے۔ دوسری ٹولی میں علی سردار جعفری، رفعت سروش، قدوس صہبائی، عادل رشید، کرشن چندر، اور کیفی اعظمی تھے، کیفی اعظمی نے اپنی صورت ایک چرس پینے والے فقیر کی سی بنا رکھی تھی، وہ ایک بوسیدہ کمبل اوڑھے ہوئے کھڑکی سے پیٹھ لگائے، آنکھیں بند کئے اونگھ رہے تھے اور دوران سفر میں کبھی کبھی آنکھیں کھول کر کمال حیرت و استعجاب سے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھ لیتے۔ اُن کی نگاہ گویا کہہ رہی تھی۔ ہائیں۔ تم لوگ ابھی تک اس ڈبے ہی میں ہو۔ کچھ کھا کے سو کیوں نہیں گئے۔ اُن کی شکایت آمیز نگاہ کا نوحہ دوسرے ادیبوں کیلئے اک مسلسل مرثیہ تھا۔ عادل رشید اپنی سیٹ پر اس طرح بیٹھے تھے گویا فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے ہوں، سبطے حسن اور مہندر ناتھ نے دنیا کی بے ثباتی اور موجودہ دور کی رجعت پسندی پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد شطرنج بچھالی تھی اور مُہروں کو پیٹنے میں مصروف ہو گئے۔ کیونکہ امیر لوگوں کو پیٹنے سے تو یہ لوگ رہے۔ رفعت سروش کا سانولا چہرہ اپنی معصومیت اور خطرناک سادگی کی مکمل رعنائیاں لئے ہوئے اک سرمئی کبوتر کی طرح نظر آ رہا تھا۔ کہ جو اپنی چھتری پر بیٹھا ہوا بڑی بے صبری سے دانے کا انتظار کر رہا ہو۔ جی چاہتا تھا کہ کوئی اس کے کان میں چپکے سے کہدے "غٹرغوں" بول کبوتر بول"!

گاڑی کے چھوٹنے میں ابھی دو منٹ باقی تھے کہ کرشن چندر نے جو حال ہی میں کسی فلم کمپنی میں ملازم ہوا تھا اپنی نئی امارت جتانے کیلئے چار روپے کے سنگترے پھل والے سے خرید کئے اور انہیں اپنے ساتھیوں میں بانٹنے لگا۔ ازل کا بھوکا اور کمینہ ساتھ ساتھ کہتا جا رہا تھا۔ لو بھئی کھاؤ نا۔ ارے یار۔ بہت میٹھے ہیں یہ سنگترے" اور چہرے پر وہی چھوٹی مسکراہٹ تھی "خوب ہیں یہ سنگترے۔ رنگترے۔ رس بھرے۔ ارے بھائی اس میں وٹامن بھی ہے، اماں یار ایک تو چکھو"۔ پلکیں جھپکا جھپکا کر وہ سنگترے تقسیم کر رہا تھا۔ راک فیلر کا سالا!

ادیبوں کے کاہن ملک راج آنند اور سید سجاد ظہیر آمنے سامنے بیٹھے تھے، دونوں براق کھدر میں ملبوس تھے۔ سجاد ظہیر کے کھدر کا رنگ سپید تھا تو ملک راج آنند کا رنگ جوگیا تھا۔ لیکن لباس دونوں کا وہی تھا وہی ٹوپی، وہی جواہر جیکٹ، وہی پائجامہ۔ ملک راج آنند کے مُنہ میں پائپ تھا تو سید سجاد ظہیر کے لبوں پر تبسّم۔ ملک راج آنند کے گال اور سُرخ گلے اور اس کے بھرے بھرے فرنچ بیئرڈ انگلستان کی آسودگی کے مظہر تھے۔ اُن کے پائپ کا دھواں اڑ کر چھت کی طرف جاتا تھا اور پھر پنکھے کی ہوا سے فضا میں منتشر ہو جاتا تھا۔ آنند اور سجاد ظہیر دونوں ادبی کانفرنس کے پروگرام طے کر رہے تھے اور مدن گوپال جنہوں نے منشی پریم چند کے آرٹ پر ایک کتاب انگریزی میں لکھی ہے۔ اُن کے قریب بیٹھے ہوئے اپنا مُنہ کھولے ہوئے ان دونوں ادیبوں کی گفتگو اس انہماک سے سُن رہے تھے گویا کسی الہامی تفسیر سے روشناس ہو رہے ہوں۔ مدن گوپال کا خاصہ یہ ہے کہ وہ اپنی خاموشی ہی سے لوگوں کو پریشانی میں مُبتلا کر سکتے ہیں۔ مہندر ناتھ اور سبطے حسن کبھی کبھی بساط سے گردن اُٹھا کر نگاہ پھیر کر ڈبے میں چاروں طرف دیکھ لیتے اور کہیں آسودگی نہ پا کر پھر مُہروں کو پیٹنے میں مصروف ہو جاتے۔ قدوس صہبائی میز نما تکیہ کا سہارا لئے منہ میں یوکلپٹس کی گولی ڈالے دونوں ٹانگیں سکیڑے اس طرح بیٹھے تھے۔ گویا پُرانی بواسیر کے شکار ہیں۔ کرشن چندر نے از راہِ ہمدردی اُن سے کہا۔ "لیجئے۔ آپ بھی کھائیے نا"

"شکریہ"۔ وہ بولے "مجھے تو نزلہ ہے"۔ اس کے بعد انہوں نے خود سگرٹ پیش کیا۔ "لیجئے"!

"شکریہ"۔ کرشن چندر نے انکار کرتے ہوئے کہا "مجھے تو پیچش ہے اور پیچش میں تمباکو۔ آپ خود جانتے ہیں"۔

قدوس صہبائی نے شہیدوں کا سا تبسم اپنے چہرے پر لا کر کہا۔

"مجھے دس سال سے پیچش ہے"!

"مجھے پندرہ سال سے ہے" کرشن چندر نے عاجزی سے کہا۔

"اور میرے نرخرے کے اعصاب میں ورم بھی ہے"۔ قدوس صہبائی نے نہایت انکسار سے جواب دیا۔

"میری آنتوں میں سوزش ہے اور دل میں اختلاج ہے اور جگر میں پتھری ہے"۔ کرشن چندر نے نہایت مسکین سے لہجے میں کہا۔ "ڈاکٹر کہتے ہیں۔ میں صرف تین سال تک زندہ رہوں گا۔ خدا کرے وہ میرا ناول مکمل ہو جائے۔

"کونسا ناول؟" قدوس صہبائی نے پوچھا۔ "کوئی نیا ناول آپ لکھ رہے ہیں۔ بھئی ضرور ہی لگا کے لکھئے گا۔ وہ آپ کا ناول "شکست" تو بالکل ۔۔۔ ف کیجئے گا۔ بھئی خاپ ہے بالکل ۔۔۔"

کرشن چند سنگترے کی پھانک کھاتے کھاتے اس کے کڑوے بیج بھی نگل گیا۔ کہنے لگا۔ "ذرا یہ ۔۔ اس پنکھے کا رُخ اِس طرف موڑ دیجئے اماں کسقدر گرمی ہے۔ دم گھٹا جا رہا ہے۔"

قدوس صہبائی نے مُسکرا کر کہا۔ "یہ یوکلپٹس کی گولی لیجئے مفرح ہے۔"

"وہ مارا ۔۔۔ وہ مارا ۔۔۔ دوستو ۔۔۔ وہ مارا!" یکایک بہندرا ما تھ دوڑ پڑا۔

"کیا بات ہے؟ کیا بات ہے؟" یکایک کیفی اعظمی نے گھبرا کر اور آنکھیں کھول کر پوچھا۔

"دوستو۔ میں کچھ نہیں کہتا۔ بس اسی سبطے حسن سے پوچھو۔ مات دے دی اسے کہ نہیں؟ وزیر اور فیل اور سب پیادے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ دوستو!"

سبطے نے اپنے گھنگھریالے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اک بےتعلق انداز میں کہا۔ "اماں ہٹاؤ بھی کیوں شور مچاتے ہو بیکار۔ اگر پنجابی ہونا تو آج اب کے تمہیں مات نہ دے دیں تو۔"

گارڈ نے یا خدا جانے کس نے سیٹی بجائی اور گاڑی چلنے لگی سارے ادیب گاڑی سے باہر جھانکنے لگے۔ لیکن ان بیچاروں کو الوداع کہنے والا وہاں کون تھا۔ ایک خوبصورت ایرانی عورت اپنے خاوند کو الوداع کہہ رہی تھی۔ ایک پارسی لڑکی قوس قزحی ساڑھی پہنے دوسرے درجے میں کھڑی رومال ہلا رہی تھی اور اس کا محبوب پیار بھری نگاہوں سے اُسے تکتا گیا۔ اور گاڑی آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ ایک مرہٹے نے اپنے بیٹے سے کہا۔ "گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ شولاپور پر بھائی صاحب تجھے گاڑی سے اُتار لیں گے۔ گھبراؤ نہیں۔" لیکن ان ادیبوں کے لئے وہاں کوئی نہ تھا۔ نہ باپ۔ نہ محبوب نہ مداح۔ بیچارے خود ہی ہاتھ ہلا ہلا کے رہ گئے۔ اور جب گاڑی پلیٹ فارم سے باہر نکل گئی۔ تو پھر اپنی سیٹوں پہ آن بیٹھے اور بےبسی کے عالم میں اونگھنے لگے۔

کرشن چند جب اُداس ہوتا ہے تو سگریٹ پیتا ہے۔ لیکن خود خرید کر کبھی نہیں پیتا ہے۔ ہمیشہ دوسروں سے مانگ کر پیتا ہے۔ اس کی عادت سے اُس کے دوست اچھی طرح واقف ہیں اور اُسے اکثر پریشان بھی کیا کرتے ہیں۔ اِس وقت بھی کرشن چند کو سگریٹ کی طلب محسوس ہوئی۔ لیکن اُسے کسی نے سگریٹ نہیں دیا۔ نجانے اُن لوگوں کے پاس سگریٹ نہیں تھا یا اُن لوگوں نے اُسے پریشان کرنا ہی مناسب سمجھا بہر حال اُسے اپنے ساتھیوں سے سگریٹ نہیں ملا اور وہ مایوس ہو کر اور گردن جھکا کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اور اُس کے دل کی ویرانی اور بڑھ گئی۔ یکایک اُس کے قریب بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے کہنی مار کر اپنی طرف متوجہ کیا۔ کرشن چندر نے دیکھا کہ ایک کالا بھجنگ بدصورت نوجوان ہے جس کے دانت بیحد سپید ہیں اور اپنی جلا سے موتیوں کو بھی شرماتے ہیں۔ اور وہ اسے سگریٹ پیش کر رہا ہے۔ کرشن چندر نے شکریہ کے ساتھ اُس سگریٹ کو قبول کیا۔ باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ وہ نوجوان نظام اسٹیٹ ریلوے میں مزدور ہے اور حیدرآباد دکن جا رہا ہے۔ کرشن چندر کو یاد آیا کہ سنگترے تقسیم کرتے وقت اُس نے اپنے ہمسائے کو سنگترہ نہیں پیش کیا تھا۔ کیونکہ اُس کے کپڑے نیلے رنگ کے تھے اور میلے کچیلے تھے اور اس کا رنگ کالا تھا۔ اور وہ بدصورت بےڈول اور کریہہ منظر تھا اور مزدور تھا۔ کرشن چندر نے سگریٹ پیتے وقت سوچا کہ وہ ابھی تک بورژوائی اخلاق کے تضاد میں گرفتار ہے۔ سردار نے اس کی ذہنی کشمکش کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ "دیکھا تم نے ایک پرولتاری کا اخلاق" اور پھر فوراً چُپ گیا۔ رفعت سروش نے عادل رشید سے کہا۔ "بھئی ہمیں تو بھوک لگی ہے۔" سیٹ کے نیچے ایک ٹوکری میں کچھ سامان خورد و نوش بھی تھا۔ عادل رشید نے وہ ٹوکری اُٹھا کر اپنی رانوں پر رکھ لی۔ اور اب وہ دونوں انڈے اور روٹی مکھن نکال نکال کر کھانے لگے۔ مکھن ٹین کے ڈبے میں بند تھا۔ اور چاقو کسی کے پاس نہ تھا۔ مگر اس وقت بھی وہی مزدور اپنے کام آیا۔ اور سب لوگ کھانے میں مصروف ہو گئے۔ اس مرتبہ بھی کرشن چندر نے اپنے ہمسائے کو کھانے کیلئے پوچھنا بھول گیا۔ سب لوگ جلدی جلدی انڈے اور مکھن اور پھل ڈکار گئے۔ بہت عرصے کے بعد یکایک کرشن چندر کو خیال آیا اور اُس نے چونک کر کہا۔ "ارے بھائی۔ کچھ اسے بھی دے دیا ہوتا اپنے ساتھ

مزدور مسکرایا۔ وہ ان کا ساتھی تھا۔ لیکن انڈے توس مکھن اور پھل کھانے والا ساتھی نہیں۔ وہ تو فرش خاک پر بیٹھ کر تقریریں سننے والا ساتھی تھا۔ اُس نے آہستہ سے اپنے ہاتھ سے مکھن کو اُٹھا لیا اور آہستہ ہنس کے اپنی جیب میں ڈال کر چار مینار کا سگریٹ پینے لگا۔

ترقی پسند ادیبوں کے علاوہ اُس ڈبے میں کوئی سوڈیڑھ سو آدمی اور ہوں گے، دو مولوی تھے۔ چار سود خور پٹھان سے ... تھے جو دوسرے درجے میں سفر کر سکتے تھے لیکن روپیہ بچانے کی خاطر تھرڈ میں آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ کوئی پندرہ بیس ریلوے کے مزدور تھے۔ ایک چنا جور گرم بیچنے والا تھا۔ ایک دیسی عیسائی اپنی بیوی کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ بیوی نے ... بچے سیٹوں پر سوار رکھے تھے۔ اور خود بھی نیلا سایہ پہن کر پسکڑا مارے بیٹھی تھی۔ اُس کی سیاہ اور مضبوط ٹانگیں گھٹنوں تک ننگی نظر آتی تھیں۔ اور بالوں سے پُر تھیں ٹخنوں پر اونچی ایڑی کے سپید سینڈل کا تسمہ بندھا ہوا تھا۔ اُس ڈبے کے چار دروازے تھے۔ ہر دروازے پر مفلوک الحال کسان لوسیہ چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے کھڑے تھے اور بلند آواز میں باتیں کرتے جاتے تھے۔ کتنی عجیب باتیں تھیں وہ۔ زمین کی باتیں۔ پٹواری کی باتیں۔ جریب اور کھتونی کی باتیں۔ تحصیلدار کی باتیں۔ ہل کی باتیں۔ بیل کی باتیں۔ قحط کی باتیں بیاہ کیلئے بنئے سے سود پر رقم حاصل کرنے کی باتیں۔ گھر کو گروی اور زمین کو رہن کرنے کی باتیں۔ عجیب و غریب باتیں۔ نہ عشق و محبت کی باتیں نہ حسن جہانسوز کی باتیں، ساقی کی باتیں نہ شراب ناب کی باتیں، مذہب کی باتیں نہ جنت کی باتیں، اک بے پناہ شور تھا۔ ایک مسلسل ہنگامہ۔ ایک مستقل دوزخ، اک آگ، اک بو۔ اِک سڑاند۔ جیسے تھرڈ کلاس کا ڈبہ انسانیت کی سنڈاس تھا۔ اور جس میں وہ ترقی پسند ادیب اس طرح دھرے تھے۔ جس طرح کوئی کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر سیب کی سُرخ و سپید قاش پھینک دے۔

ڈاکٹر ملک راج آنند نے کہا۔ "ادب کی دوامی قدریں بھی ہوتی ہیں"۔

"بے شک۔ بے شک"۔ مدن گوپال نے طوطے کی طرح رٹتے ہوئے کہا۔

"کونسی دوامی قدریں ہوتی ہیں جناب"۔ علی سردار جعفری نے گویا گھونسا دکھلاتے ہوئے کہا۔ سردار کے چہرے پر سیاسی نعروں کی صعوبتوں کے تمام نشانات موجود ہیں۔ اس کی پیشانی پر مستقبل کے خواب کی تحریر ہے۔ وہ جب بات کرتا ہے دانت پیس کر، گویا غضب کر ایک جوالا مکھی انداز میں، جوبات چہرہ میں ہے وہی چال ڈھال میں، وہی گفتار میں اک تنا ہوا مخصوص گھونسا، اک جابر متوڑا اور بنیا سُرخ جھنڈا گویا اس کے چہرہ پر گڑا ہوا ہے، سردار کی ذاتی شخصیت اب گھٹتے گھٹتے صفر ہو کے رہ گئی ہے۔ اس سے بات چیت کیجئے معلوم ہوتا ہے آپ ایک کتاب پڑھ رہے ہیں۔ ایک تحریک کا سامنا کر رہے ہیں۔ فلسفے کی اک شق کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ اک نئے انداز فکر سے دوچار ہو رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کس نے اُس کے دل کو شاعر بنا دیا ہے ؎

پھول سے کھل گئے تصویریں دامن شوق بھر گیا کوئی ....

ملک راج آنند نے پائپ کی راکھ جھاڑ کر اک مخصوص مدبرانہ انداز میں کہا۔ "یہی۔ خوبصورتی۔ ترتیب۔ تزئین جمال مجھے یہ جان کر افسوس ہوتا ہے کہ جہاں ہندوستانی ادیبوں نے سماجی مواد کی فراہمی میں اتنی مستعدی سے کام لیا ہے، وہاں وہ اُسے پیش کرنے میں کمال فن کا ثبوت نہیں دے سکے ...... میری مراد ہیئت سے ہے۔ سماجی مواد کو خوبصورتی سے پیش کرنا ہی صحیح حسن کاری ہے۔ جنگ کے دوران میں ہندوستان کے ترقی پسند ادیبوں نے کونسا ایسا قابل فخر کارنامہ ......"

کرشن چندر نے جھلا کر کہا "اور آپ کے انگریزی ادیبوں نے کونسا ایسا کمال کر کے دکھا دیا ہے۔ آپ کے آڈن نے ......"

"آڈن بہت بڑا شاعر ہے جناب" آنند نے جواب دیا۔ "اس کی شاعری میں شیکسپیئر کے کلام کی سی عظمت ہے۔"

لیکن کرشن چندر نے سنی ان سنی کر کے کہا۔ "آپ کے آڈن نے، سپنڈر نے، میک نیس نے، ہکسلے نے، پریسٹلے نے، کوئی یوگا میں اُلجھ کے رہ گیا تو کوئی سنٹ فلموں کے مکالمے لکھنے لگا۔ پریسٹلے سیدھا سادھا پراپیگنڈہ کرنے لگے ہیں ......

انگریزی استعماریت کے حق میں بیورلے نکلس ہندوستانیوں کو صلواتیں سناتے ہیں۔ کچھ لوگ۔ اے۔ آر۔ پی پر کتابیں لکھ رہے ہیں۔ واہ رے حسن کاری ...."

"یہ میں مانتا ہوں کہ ابھی تک بیشتر امریکی اور انگریز مصنف اس

[illegible] کے [illegible] ہیں۔ اس لئے کہ یہ اُن کا خیال ہے کہ اُن کی تہذیب اور اُن کا سماج اور [illegible] اقتصادی نظام ابھی بیس پچیس برس اور [illegible] اسلامی [illegible] کسی خوف [illegible] سے لڑائی مول لیں اور اپنی ہستی خطرے میں ڈالیں وہ اتنے بیوقوف نہیں ہیں۔ اب یورپی مصنفوں کو لیجئے جدید یورپی شاعری کو جو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔"

"کہاں ہو رہا ہے" سردار نے جل کر کہا۔ "ایک آراگاں کو چھوڑ دیجئے اور دو ایک اور کو۔ باقی شاعروں نے کیا اپنے آپ کو اور اپنے فن کو نازیوں کے حوالے نہیں کر دیا تھا۔ خاص طور پر فرانسیسی زوال پسندوں نے۔ کہئے تو ایک نہیں درجنوں مثالیں پیش کروں۔ ابن الوقتی پر آمادہ کو "ہاں کر دینے سے کبھی آرٹ یا آرٹسٹ عظیم نہیں ہو سکتا۔"

" Apocalyptics " آنند نے شروع کیا۔ لیکن اب اُس پر چاروں طرف سے حملے ہو رہے تھے۔ کیفی نے جھنجھلا کر کہا۔ "اس گروپ کا کیا کہتے ہو۔ ایک ہی مجموعہ چھاپ کر رہ گئے۔ لغویات کا پلندہ۔ چلے تھے ویشٹ دیو مالا کے بل پر قوم کی حالت سدھارنے 'ویشٹ دیومالا' جس میں انسانی بھیڑیوں کے قصّے اور جہاں دوست کی بیوی کو بہکانا بیوتائی میں شامل ہے۔ . . . .

. . . کیا یہی ادب کی دوامی قدریں ہیں۔ کیا انہی قدروں کی بنا پر اک نئے بہتر اور بھرپور سماج کی داغ بیل ڈالی جائے گی۔؟"

"ارے کن لوگوں کا ذکر کر رہے ہو" سردار نے کہا۔ "وہ بیچارے تو کب کے ختم ہو گئے اب تو شاعری چھوڑ چھاڑ کر صرف اپنے پیٹ کا دھندا کر رہے ہیں۔"

"بے شک۔ بے شک۔" مدن گوپال نے دویں جوشک کی گردان دہرائی۔ اور عادل رشید بے ساختہ ہنس پڑے۔ جس پر مدن گوپال کو غصہ آگیا اور وہ عادل رشید کو گھورنے لگے۔

آنند نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "بھئی ہم نے بھی سب پڑھا ہے۔ ہم نے بھی اقبال اور جوش کا مطالعہ کیا ہے۔ لندن میں بیٹھ کے جھک نہیں مار رہا ہوں، مجھے تو معاف کیجئے ان میں کوئی عظیم بات نظر نہیں آئی۔ اقبال بہت اچھے ہیں لیکن ان کا فلسفہ متضاد خیالات کا مجموعہ ہے اور جوش اردو میں بہت شور و غل مچاتے ہیں لیکن جب بھی انگریزی میں ترجمہ کرو۔ گھانس معلوم ہوتے ہیں۔ نِل گھانس۔"

"آپ خود گھاس کھا گئے ہیں۔" سردار نے غصے میں آکر کہا۔ "آنند صاحب پہلے آپ اس ملک کی حالت کا اندازہ کیجئے اس کی ادبی تحریک کا مطالعہ کیجئے۔ اس کے سیاسی رجحانات کا تجزیہ . . . . . ."

"دوستو!" مہندر ناتھ نے چیخ کر کہا۔ "دوستو۔ اردو ادب کو کچل کے رکھ دیا۔ دوستو۔ میدان جنگ سے بھگا دیا۔"

"کیا ہوا بھئی" سجاد ظہیر نے سخت پریشان ہو کر پوچھا۔

"کچھ بھی تو نہیں ہوا" سیطے نے جیں بہ جبیں ہو کے کہا۔ "بس ایک دفعہ اور مات کیا دے دی۔ جب سے گلا پھاڑ کے چلا رہے ہیں میرے سید سجاد ڈگمگے ہیں تا آخر تہذیب چھو تک نہیں گئی ہے۔ شادیہ بساط ہم نہیں کھیلتے۔"

"لاؤ ہم تمہاری مدد کرتے ہیں۔" علی سردار جعفری نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"بہت خوب۔ آپ میری مدد کریں گے۔ آپ!" سیطے نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"کیوں مجھے کیا ہوا ہے۔" سردار نے چونک کر پوچھا۔

"آپ؟" سیطے حسن ہنسا۔

"ہاں میں!"

"آپ!"

"ہاں! ہاں میں!" ـــــ اب سردار کو واقعی غصہ آگیا۔

"تم!"

"میں!!"

"تم!!!"

"بے شک بے شک"۔ مدن گوپال نے سر ہلا کے کہا اور سب ہنس پڑے۔

گفتگو ایک لمبے عرصے کیلئے خود بخود بند ہو گئی۔ سجاد ظہیر، رفعت سروش، عادل رشید اور مہندر ناتھ کسی نہ کسی طرح سو گئے۔ جب یہ سب سو گئے تو چرس پینے والا فقیر کیفی اعظمی اک گونہ بے خودی سے سرشار ہو کر گنگنانے لگا۔ قدوس صہبائی چپکے سے کریم کلیپٹس کی میٹھی گولی چوسنے لگے۔ آنند الیکسی ٹالسٹائی کی Road to Lalvery پڑھنے لگے مدن گوپال

...کے متعلق اپنا انگریزی شاہکار پھر سے پڑھنا شروع کردیا۔ اور اس پر پنسل سے نشان لگاتا گیا۔ گویا دوسرے ایڈیشن کے لئے اُسے نئی نئی باتیں ابھی سے سوجھ رہی تھیں۔ کرشن چندر کا جی پان کھانے کو چاہتا تھا۔ لیکن گاڑی کہیں رکتی نظر نہ آتی تھی۔ اُس نے سبطے حسن سے کہا۔ "دم گھٹا جارہا ہے۔"

"اگلے اسٹیشن پر اُتر کر ڈائننگ کار میں چلیں گے۔" سبطے نے تجویز پیش کی۔

"میں بھی چلوں گا۔" سردار نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ یعنی ڈبے کے بیچ میں خاموشی تھی۔ ورنہ چاروں طرف شور تھا۔ اور کسان اور مزدور اور غریب بدصورت مفلوک الحال لوگ چلا چلا کے باتیں کر رہے تھے۔ وہ اس قدر اکیلے، کمینے اور بھوکے لوگ تھے۔ کہ اگر نہ چلاتے تو شاید پاگل ہو جاتے۔ اس خاموش۔ کائنات کی اندھی بسیط گنہگار خاموشی میں دب کر رہ جاتے، اسی لئے تو اُن کی روحیں چیخ چیخ کر اپنی زندگی کا نوحہ بیان کر رہی تھیں۔ وہ ہنستے تھے۔ وہ بات کرتے تھے۔ وہ مسکراتے تھے۔ وہ خوش ہوتے تھے۔ وہ غصہ میں آکر چیختے تھے۔ لیکن بات ایک تھی۔ نوحہ، مرثیہ، دفنائی ہوئی، کفنائی ہوئی، آرزوؤں کے ننگے مزار، ہر ہنسی کے پیچھے ہر تبسم کے پیچھے۔ ہر انداز گفتگو کے مرکز میں گویا اپنا سینہ کھولے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ہمیں دیکھ لو۔ جاہل وحشی ظالم درندو، ہمیں بھنبھوڑ کر کھا جانے والے دیوتا نما شیطانو۔ آؤ۔ آؤ، ہمیں قریب سے دیکھ لو......" کرشن چندر نے منہ پھیر لیا۔ باہر شفق کھل گئی۔

سبطے کے ذہین چہرے پر کرب کی ایک لہر آئی۔ اُس نے آہستہ سے کہا "وہ دیکھا تم نے......" سبطے کے چہرے پر کرب کی بے شمار لکیریں ہیں۔ جیسے سمندر کا جھاگ ساحل سے ٹکرا ٹکرا کے پختہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ذہنی احساسات کا تموج سالہا سال سے اس کے نازک چہرے پر منجمد ہوتا چلا گیا ہے۔ اس کا چہرہ خفیف سے خفیف انسانی جذبات کا بھی عکاس ہے۔ اور اکثر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا سبطے نے زندگی سے کرب ہی اخذ کیا ہے۔ زندگی کی بے پناہ مسرتوں اور گہری سے گہری مسرتوں سے بھی اُس نے کرب ہی حاصل کیا ہے۔ غالباً اس کے انداز فکر میں ایک ایسی تازگی ہے اور اُس کے احساسات اور جذبات پر ایک ایسی شدت کی کیفیت ہے جو اسے ہر غم اور ہر مسرت سے ایک خاص قسم کا درد محسوس کراتی ہے۔ ایک ... کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ایسی ہی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ جیسے ایک فاقہ زدہ بھکاری کو دیکھ کے۔ اس کا چہرہ شدتِ احساس کا مکمل تمثال ہے جہاں حسن اور غربت دونوں ایک ہی درد کی تفسیر بن جاتے ہیں۔ اپنی جواں سالی کے باوجود یہ چہرہ بوڑھا ہو چلا ہے۔ اس میں صدیوں کی تھکن آ چکی ہے۔ کرب کی ننھی ننھی لاکھوں لکیریں اس چہرے کے ہر روزن سے شب و روز جھانکتی نظر آتی ہیں جیسے انہوں نے دنیا کے سارے غم کا احاطہ کر لیا ہو۔

شفق کے نازک رنگوں کو دیکھ کر سبطے کے چہرے پر وہی مخصوص کربناک کیفیت پیدا ہو گئی۔ اُس نے آہستہ سے کہا۔ "وہ دیکھو۔ وہ دیکھو۔"

کرشن چندر نے شفق کی طرف دیکھا۔ افق پر پھولی ہوئی سرسوں کی کیاریاں۔ کشمیر کی کشت ہائے زعفران۔ اسے بھی شفق بیحد پسند ہے۔ شفق جو اس کے دل میں نہ تھی، یہ پیلا پیلا سنہرا جادو جو اُس کی روح میں نہ تھا۔ یہ شادابی۔ یہ رنگینی۔ یہ حسن کاری جس کے نہ ہونے سے اُس کا رواں رواں بھوکا تھا...... یہ شفق جواب سونا نہ تھی۔ جواب زعفران بھی نہ تھی۔ جواب گل مہر کے پھولوں کی طرح شعلہ بداماں تھی۔ سورج نیچے ڈھل گیا تھا۔ بادلوں کا ہر غرفہ پھول پھول تھا۔

سبطے نے کہا... "وہ دیکھو...... وہ دیکھو......"

سیاہ بادلوں کے پیچھے سونا ابل رہا تھا۔ سیاہ بادلوں کے مرکز میں آسمان نیلا تھا۔ ایک کھڑکی سی کھلی تھی۔ سمندر پر کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اور سورج غروب ہو رہا تھا۔ اور وہ کھڑکی میں بیٹھ کر ڈوبتے ہوئے سورج کو تک رہا تھا۔ اور لہریں ریت کو چوم کر واپس چلی جا رہی تھیں۔ یہ نور کی لہریں یہ سورج کا سمندر...... یہ خدائی کا مرکز۔ "وہ دیکھو...... وہ دیکھو"

شام بڑھنے لگی، شفق ڈوبنے لگی، تاریکی پھیلنے لگی۔ ہر چیز ڈوب جاتی ہے۔ اس تاریکی کے سمندر میں وہ سنہرا رنگ کہیں کھو گیا۔ وہ گلابی تاج محل شہابی ہو گئے۔ مرمریں سے گلابی گلابی سے شہابی، شہابی سے قرمزی۔ محل ہاتھی بن گئے اور پھر تاریکی۔ نور کی آخری لہر افق سے ٹکرا کر ڈوب گئی اور چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔

"اب کچھ نظر نہیں آتا۔" سبطے نے افسردگی سے کہا۔ اور اُسے

ڈائننگ کار یا ہوٹل؟ اگلے سٹیشن پر وہاں چلیں گے۔"

"سب کچھ نظر نہیں آتا۔" کرشن چندر نے کہا۔ "بجلی کے پنکھے اور بہت سے گیت اور ... کے جو چہرے اور دھرتی کے بیٹے اور بیٹیاں"

"عورت کا ذکر تم ضرور کرو گے۔" سردار نے چڑ کر کہا۔ "میاں کسی ڈاکٹر سے علاج کراؤ اپنا۔ شفق کو دیکھ کر تمہیں عورت ہی یاد آتی ہے۔ اس خونیں منظر کو دیکھ کے بھلا تمہیں میدان جنگ کیوں یاد نہیں آتا؟" . . . .

گاڑی دھیمی ہو رہی تھی۔ آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ چلتی چلتی رک گئی۔ سردار سبطے اور کرشن چندر اُتر کر ڈائننگ کار میں بیٹھ گئے۔

ڈائننگ کار میں خوبصورت فانوس تھے۔ شفاف بلوریں میزیں تھیں۔ انگریزی شراب تھی۔ ہنستے ہوئے چہرے تھے اور عورتیں جن کے چہرے گلاب تھے۔ قد لمبا۔ مہنی نقرئی اور جسم پر غاب اُن کے لباس کا سرسراتا ہوا ریشم اپنے رنگ دور سے نگاہوں کو خیرہ کئے دیتا تھا۔ اور وہ بیٹھی ہوئیں اور مسکراتی ہوئیں اور چلتی ہوئیں اس طرح دکھائی دیتی تھیں گویا کسی شیشے کی صراحی میں رنگین مچھلیاں تیر رہی ہوں۔ یہ ڈائننگ کار کی مچھلیاں تھیں۔ یہ وہ مچھلیاں نہ تھیں جو ساحل سمندر پر گھومنے والے ماہی گیروں کی میراث ہوتی ہیں۔

سبطے سردار اور کرشن چندر کو معلوم ہوا گویا وہ کسی نئی دُنیا میں آ گئے ہیں۔ ویٹر سپید مکلف لباس پہنے مؤدب کھڑے تھے تین کورس کا انگریزی کھانا . . . . اس کے بعد کافی پھر وہ لوگ اخروٹ کھانے لگے۔ لوگ اخروٹ توڑنے والا ہتھوڑا استعمال کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے اپنے دانتوں سے وہی کام لیا۔ مقابل کی میز پر تین انگریز فوجی بیٹھے تھے ایک دوسرے سے شناسا نہ تھے۔ اس لئے بات نہ کر سکتے تھے ہاں وہ ان قہقہہ مار کر ہنسنے والے ادیبوں کی بدتمیزیوں کو بڑی حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ان تین انگریز فوجیوں کے ساتھ چوتھی کرسی پر ایک موٹا پارسی بھی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بار بار کہہ اُٹھتا: "میں پریشان ہوں۔ میں بیحد پریشان ہوں بھائی!"

"ٹھیک ہے۔" ایک انگریز فوجی نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں تم نہیں جانتے۔ میں زندگی سے عاجز آگیا ہوں۔ بیرا ایک لارج برانڈی لاؤ۔ آپ پئیں گے؟"

"نو تھینکس۔" دوسرے فوجی نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"تمہاری مرضی۔ لیکن میں بہت پریشان ہوں۔ تم بیان نہیں کر سکتا میں کس قدر پریشان ہوں۔" فوجی افسر اٹھ گئے۔ موٹے پارسی نے سبطے کی طرف نگاہ دوڑائی اور کہا: "بھائی میں بہت پریشان ہوں۔"

"آپ پریشان نہ ہوں۔" سبطے نے مشورہ دیا۔

"کیسے پریشان نہ ہوں۔ میں تو پریشان ہوں۔ میں اس زندگی سے اس دنیا سے پریشان ہو چکا ہوں۔ یہ سب دھوکا ہے۔ سراب ہے۔" اس نے گلاس ختم کرتے ہوئے کہا: "بیرا ایک لارج برانڈی اور لاؤ — آپ پئیں گے؟"

"نہیں شکریہ!" کرشن چندر نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"آپ کی مرضی۔ مگر میں بہت پریشان ہوں!"

اتنے میں ایک اور موٹا پارسی آخری میز سے اُٹھ کر ادھر آیا۔ دونوں پارسیوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ بڑے ٹھاٹ سے "صاحب جی" ہوا: اور وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے۔

"کیا حال ہے؟" نو وارد نے پوچھا۔

"کیا پوچھتے ہو؟ دوست یہ دنیا ایک دھوکا ہے۔ سراب ہے۔ مایا ہے۔ میں تو بیحد پریشان ہوں!"

"آخر ہوا کیا ہے"؟ دوسرے پارسی نے پوچھا۔

"ارے بھائی۔ امسال ایک کروڑ انکم ٹیکس میں جا رہا ہے۔ اس سال کے بزنس پر۔ بتاؤ ہم لوگ کیا کمائیں گے۔ جب اسی فیصدی تو سرکار ہی منافع میں سے لے جائے گی۔ I tell you — it is a Swindle. میں بہت پریشان ہوں۔ کہیں بھاگ جانا چاہتا ہوں بوائے دو لارج برانڈی لاؤ۔ جلدی!" اتنا کہہ کر وہ موٹا پارسی میز پر سر ٹیک کر رونے لگا۔

(۳)

دوسرے روز صبح جب آنکھ کھلی تو گاڑی نظام اسٹیٹ کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ اور ایک اندھا لڑکا ہاتھ میں کھجری لئے دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ اپنی دلدوز آواز میں گا کر بیان کر رہا تھا۔ باہر میلوں تک "سنکا"

[illegible] یا سیلن تک [illegible] ں کا جنگل تھا جو گرتی
[illegible] سے جو گھٹ کر جھاڑیوں سے نکل بھاگتے تھے۔
[illegible] پر چڑھتا رہتا ہے جا رہا تھا اور بیلوں کے پاؤں سے اُڑتی ہوئی گرد میں [illegible] کی کرنیں اک زریں دھند کے پیچھے کھوئی گئی تھیں۔ یہ دھندلکا اُفق [illegible] تھا جہاں سورج سُرخ لحاف سے سر نکال کر نئے دن کو دیکھ رہا تھا۔ چلتی ہوئی گاڑی کو دیکھ رہا تھا۔ ترقی پسند ادیبوں کے سُتے ہوئے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ کھنجری کا نغمہ سُن رہا تھا جو چلتی ہوئی زندگی کو زہریلی موت کا پیغام دے رہی تھی۔ مسافر آنے والی موت سے مرعوب ہو کر اُسے کو خیرات بانٹ رہے تھے۔ ہزاروں سالوں سے یہی آسا کی دھن اور یہی موت کا نغمہ صبح سویرے سارے ہندوستان میں گونج اُٹھتا ہے۔ چھوڑ دو دُنیا۔ چار دن کی چاندنی ہے۔ پھر اندھیری رات ہے۔ مایا کا جنجال ہے مسافر کس بھول میں پڑا ہے۔ ان گیتوں میں سراب ہے، اندھیرا ہے، تاریکی ہے، موت ہے۔ زندگی نہیں۔ حرکت نہیں۔ خوشی نہیں۔ خود اعتمادی کی وہ جگمگاتی ہوئی کرن نہیں جو انسان کو صبح سے شام تک دنیا کے تکلیف دہ کاموں میں مسرت وشادمانی سے مصروف رکھتی ہے۔ اسی لئے تو یہاں ہر فرد فاقہ مست ہے۔ ہر شخص کا چہرہ سُتا ہوا ہے۔ جیسے ابھی ابھی اُس نے اپنے باپ کے انتقال کی خبر سُنی ہو۔ اسی لئے تو یہاں ہنسی ہونٹوں سے غائب ہے۔ کرۂ ارض پر شائد ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں ہنسنا بدتمیزی میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور رونا عین ثواب ہے۔ رونا ہمارے نغمے میں ہے، ہمارے فلسفے میں ہے، ہمارے سماج میں ہے، ہمارے فن میں ہے، ہمارے مذہب میں ہے۔ رونا ہمارے تمدن کی معراج کمال ہے۔ "سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا ..... "کھنجری والے اندھے نے دوسرا رونا شروع کیا۔ اور سردار نے چِلّا کر اُسے ڈانٹ دی اور کہا "بس کرو اور اگر مزدوری کچھ گانا چاہتے ہو تو کوئی کام کی چیز گاؤ۔" اندھا بے چارہ چند لمحے چُپ رہا۔ اُس کے ساتھی نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اندازہ لگایا کہ ڈبے میں مسلمان مسافروں کی تعداد زیادہ ہے۔ اُس نے اندھے کے کان میں کچھ کہا اور اندھے نے کھنجری کی تھاپ سے ایک نعت شروع کی۔ اور جب وہ نعت گا چکا اور صرف مسلمان مسافروں سے پیسے وصول کر چکا تو اُس نے اب دوسری چیز شروع کی۔ "مرلی والے گھنشام ....."

اب کے صرف ہندو مسافروں نے اُسے پیسے دیئے۔ [illegible] گاڑی میں بیٹھا ہوا ہر ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی طرف [illegible] دیکھ رہا تھا۔ جیسے اُسے کچا ہی کھا جائے گا۔ اور کرشن چندر کو ایسا [illegible] ہوا گویا گاڑی کے ڈبے میں اک گہری خلیج حائل ہوتی جا رہی ہے۔ دو قوموں کے درمیان، دو نظریوں کے درمیان، دو زندگیوں کے درمیان۔ جیسے کوئی سویا ہوا احساسِ نفرت یکایک بیدار ہو گیا تھا۔ اور سانپ کے پھن کی طرح سر اُٹھا کر لوگوں کے دلوں میں لہرا رہا تھا۔

یکایک گاڑی رُک گئی اور اندھا اُتر کر دوسرے ڈبے میں چلا گیا۔ وہاں سے پھر صدا آنے لگی، "سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا ... کملی والے ..... مرلی والے گھنشام ..... اور کیفی اعظمی نے اس طرح بُرا سا مُنہ بنایا جیسے کسی نے زبردستی اُس کے گلے میں زہر اُنڈیل دیا ہو۔

مدن گوپال نے سر ہلا کے کہا۔ "ظالم نے کیسا اچھا گلا پایا ہے۔"

"ہائیں!" یکایک سب ترقی پسند ادیب جھلا کر اس کے پیچھے پڑ گئے۔ اگر ان کا بس چلتا تو وہ اُسے اسی وقت گاڑی سے نیچے اُتار دیتے لیکن پھر یہ سوچ کر چپ ہو رہے۔ کہ اِس آدمی نے منشی پریم چند پر ایک کتاب لکھی ہے۔

ہر طرف بیزار سے چہرے تھے۔ عادل رشید کھٹے ڈکار لے رہے تھے۔ ملک راج آنند مُنہ پر ہاتھ رکھے شریفانہ انداز میں جمائیاں لے رہے تھے۔ مہندر ناتھ اپنی بڑھی ہوئی داڑھی کھجا رہے تھے۔ رفعت سروش بے وجہ مسکرا رہے تھے۔ کرشن چندر پائنچوں میں دونوں ہاتھ ڈالے سیٹ پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ قدوس اپنے حلق میں یوکلپٹس کی گولی رکھ رہے تھے سبطے آنکھیں مل رہے تھے۔ اور سجاد اونگھ رہے تھے اور علی سردار جعفری لوٹا لئے باتھ روم کی طرف اس طرح بڑھ رہے تھے۔ گویا کسی انقلابی مہم پر روانہ ہو رہے ہوں۔

"مسلم چائے، مسلم چائے" کسی نے پکارا۔

یہاں بہت سے لوگوں نے ایک ساتھ کہا۔ "لاؤ!"

"کتنی چائے؟"

"پندرہ بیس تیس۔ چالیس۔ جتنی ہو سکے لے آؤ۔" عادل رشید نے حکم دیا۔ چائے والے نے کہا۔ "اگلے سٹیشن پر ملے گی۔" اور یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

... بیٹھا تھا اور جب تک یہ لوگ چائے ختم کرتے حیدرآباد کا ... میاں ... کمیٹی کے دس پندرہ ارکان حاضر تھے۔ اور ... آنے پر بڑا فرد فرد سے دکھائی دیتے تھے۔ اُن کے چہرے روشن آئینے ... کی کوشش میں مصروف تھے۔ مگر بشرے سے یہی عیاں ہوتا تھا۔ میاں، اگر انسان ہو تو ابھی واپس لوٹ جاؤ۔ صبح سویرے ہمیں جگایا۔ یہ کوئی شرافت نہیں ہے۔ بھاڑ میں جائے تمہاری ترقی پسندی۔ یہاں حیدرآباد میں ہم لوگ دس بجے سے پہلے نہیں اُٹھتے۔ دوکانوں کے دروازے گیارہ بجے کھلتے ہیں اور بارہ بجے کے قریب کہیں کوئی اِکا دُکا خریدار سردی میں ٹھٹھرتا ہوا شیروانی کے بٹن کالر تک بند کئے اک معذرتی انداز میں گھومتا ہوا نظر آتا ہے اور ایک آپ ڈھیٹ ہیں۔ کہ نو بجے ہی اسٹیشن پہ آدھمکے ہیں۔ لعنت!"

چند لمحوں تک مہمانوں نے میزبانوں کو اور میزبانوں نے مہمانوں کو دیکھا پھر ہونٹوں پر تبسم آتے گئے۔ یہ تبسم بھی خوب ہے۔ کاروباری۔ تجارتی ہمدردی، احمقانہ، ہر طرح کا تبسم ہوتا ہے۔ مایوس تبسم، عیار تبسم، محجوب تبسم، منفعل تبسم، جاہل تبسم۔ عالم تبسم جیسے ہم سب کچھ جانتے ہیں اور آپ بڑے چغد ہیں کا طرز تبسم، جیسے میاں بتاؤ اب کیا کروگے تمہاری لونڈیا تو ہم لے اُڑے۔ اور تبسم جس میں حسرتوں کی خاک بھری ہوتی ہے۔ ابراہیم جلیس کے چہرے پر بھی تبسم تھا۔ کچھ عجیب قسم کا ملتجیانہ، مٹیالا مایوس تبسم۔ گویا کہہ رہا ہے۔ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔ قد چھ فٹ سے کچھ نکلتا ہوا۔ اور اس پر ایک فٹ کی اونچی سمور کی ٹوپی پہن کر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ابھی ابھی کسی سرکس سے نکل بھاگے ہیں۔ یہ شہاب ہیں۔ پستہ قد۔ گندمی رنگ۔ گول چہرہ سیدھا سادہ لیکن آنکھیں بیحد ذہین۔ گویا کہہ رہی ہوں "ہم تمہیں پہچان گئے۔ ایک ہی لمحے میں" یہ نظر حیدرآبادی ہیں۔ چوڑا سیاہ چہرہ۔ چوڑا ماتھا۔ چوڑا دہانہ۔ بڑے بڑے اُلجھے ہوئے بال۔ ہر چیز میں وسعت کا احساس دکن کا مثالی باشندہ جیسے دکن نے خود اپنی وسیع، عریض چٹانوں سے تراشا ہو۔ بے باک قہقہہ۔ بے جھجک تبسم جو خود بخود لبوں پر آتا جاتا ہے۔ نظر شاعر ہو کر بھی زمین کے اس قدر قریب کیسے ہو سکتا ہے۔ اُس کا اندازہ اُسے دیکھتے ہی ہو سکتا ہے۔ یہ مسلم ضیائی ...... پستہ قد۔ سنولا رنگ، گنجا سر، آنکھوں پر دبیز شیشے ہونٹوں پر شرمیلی کنواریوں کی سی مسکراہٹ، مسکراہٹ جو کھو جاتی تھی اور آجاتی تھی...... پیچھے ہٹ جاتی تھی اور سامنے آجاتی تھی۔ اسی قدر حساس مسکراہٹ تھی۔ وہ کہ فیصلہ ... کر ... تھی۔ کہ ... لوگ ... دوست ہیں یا دشمن۔ اجنبی ... عزیز۔ مسکراہٹ ... کہہ رہی تھی میں اکیلی ہوں میں تنہا ہوں۔ میں نے بہت کچھ کھو دیا ہے۔ سب کچھ کھو دیا ہے پھر بھی ... ہوں۔ اکیلی ہوں۔ مجھے نہ چھوڑو۔ میں تمہیں اپنا بنانا چاہتی ہوں۔ لیکن مجھے تم پر اعتبار نہیں۔ اپنے آپ پر اعتبار نہیں۔ اس ذلیل ... پر اعتبار نہیں۔ جو آدمی کو آدمی نہیں رہنے دیتا۔ تم میرے رفیق ہو سکتے ہو۔ ہاں۔ ہاں۔ ... نہیں۔ نہیں۔ .. مجھے چھوڑو نہیں۔ میرے پاس اب اپنا کچھ نہیں۔ ایک نام تھا وہ بھی اپنا نہیں رہا۔ ضیائی میرا ایک دوست تھا۔ وہ مر گیا۔ اس کا نام میں نے اپنا لیا۔ اب وہ مجھ میں زندہ ہے۔ تم میری ہستی اُڑانا چاہتے ہو۔ لو میں چلی۔ نہیں تم مجھے نہیں سمجھو گے اس دوست نے مجھ سے مرتے وقت کہا تھا کہ میں شراب نہ پیئوں۔ اُس دن سے میں نے کبھی شراب نہیں پی۔ تم پھر ہنسنے لگے۔ لو میں ہونٹوں سے غائب ہوتی جارہی ہوں۔ ...... تم مجھے نہیں سمجھو گے۔ میں جو معصومیت کی میراث ہوں۔ میں جو محبت کے آنسو سے پیدا ہوتی ہوں اور ناکامی کی گود میں موتی بن کر چھپی رہتی ہوں۔ ....

مسلم ضیائی اور مہندر ناتھ گلے ملنے لگے۔

"آپ سے ملئے" کسی نے کرشن چندر سے کہا اور کرشن چندر نے مڑ کر دیکھا۔ معمولی قد و قامت کا بے ڈول سا انسان۔ چہرہ پہ اک لایعنی۔ بے مطلب تبسم۔ پُر اسرار تبسم نہیں کہ جسے آدمی نہ سمجھ سکے۔ بلکہ ایک ایسا تبسم جو اپنی تفسیر میں کسی طرح اسم مہمل سے نہ بڑھ سکے۔ بے حد روکھا پھیکا چہرہ۔ نہ لبوں پر چمک نہ آنکھوں میں ذہانت، نہ پیشانی پہ نور۔ چپ چاپ گم سُم۔ مٹی کا مادھو۔ چہرے کا رنگ پیلا۔ نہیں مٹیالا۔ نہیں خاکستری.... نہیں کچھ خاکستری کچھ سبز سا..... بالکل مینڈک جیسا "لاحول ولا قوۃ" کرشن چندر نے دل ہی دل میں کہا۔ اُسے دیکھ دیکھ کر متلی سی ہو رہی تھی۔ کس کا منہ دیکھنا پڑا صبح سویرے.......

"آپ جگر حیدرآبادی ہیں۔ ابراہیم جلیس کے بڑے بھائی ہیں"۔

"اوہ جگر حیدرآبادی ہیں! بڑی مسرت ہوئی آپ سے مل کر" کرشن چندر نے مصافحہ کرتے ہوئے اپنے غلیظ کثیف دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر مڑ کر سبطے کے کان میں "جگر جہاں بھی دیکھو۔ جلا بھنا ہی بنتا ہے کمبخت!"

سبطے نے ہنس کر کہا۔ "ہاں۔ حیدرآباد میں ہو یا مرادآباد میں یا اردو شاعری میں۔ اس کا ایک ہی رنگ ہے۔"

سردار نے سبطے اور کرشن چندر دونوں کو ڈانٹا۔ "آئینے میں اپنی صورتیں ملاحظہ فرمائیے ذرا۔ پھر دوسرے پہ انگلی اٹھائیے گا۔"

"کچھ بھی ہو مجھے تو اس شخص سے نفرت ہو گئی ہے۔" کرشن چندر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"یہ آپ کی بدقسمتی ہے کیونکہ قیام و طعام کے تمام انتظامات جگر صاحب کے ذمہ ہیں۔" سردار نے ہر لفظ پر زور دے کے کہا۔

"باپ رے" کرشن چندر چونک کر اچھل پڑا۔

(۴)

جس مکان میں مہمان ادیبوں کو ٹھہرایا گیا۔ وہ حیدر گوڑے میں واقع تھا۔ علی سردار جعفری نے کرشن چندر کو حیدر گوڑہ جاتے راستے میں ایک محل کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ گذشتہ مرتبہ اردو کانگریس کے موقع پر ہم لوگ اس محل میں ٹھہرائے گئے تھے۔ قیام و طعام کا اس قدر اچھا انتظام تھا۔ بلکہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی اچھا تھا۔ ہر مہمان کیلئے دو نوکر وقف کئے گئے تھے۔ جو ہر وقت اس کے کمرے کے باہر بیٹھے رہتے تھے۔ اس وقت کے نظم و نسق میں جاگیرداری کا مکمل شکوہ موجود تھا۔ اور کرشن چندر نے سوچا اب کے پرولتاریت کی حد ہو گئی ہے۔ دراصل اسے جگر سے لغض للہی ہو گیا تھا اس لئے اسے یہ مکان بھی پسند نہ آیا۔ حالانکہ مکان نیا نیا تعمیر کیا گیا تھا۔ اور پورا مکان ان لوگوں کے قبضے میں تھا۔ کرشن چندر نے دل ہی دل میں سب کو گالیاں دیتے ہوئے سب سے اچھا کمرہ اپنے قبضے میں کر لیا۔ باقی تین کمروں میں چھ چھ سات سات آدمی ٹولی بنا کر بس گئے۔ اور بستر فرش پر بچھ گئے۔ اُونھ چارپائی تک تو میسر نہیں۔ اور یہ باتھ روم کی کنڈی بھی غائب ہے اور نہانے کے لئے برتن موجود نہیں۔ جگر اس کے ساتھ ساتھ چلے آ رہے تھے اور اس کے دل کی وحشت بڑھتی جا رہی تھی۔ یکایک اس نے رک کر جگر صاحب کو مخاطب کیا۔

"بہت اچھا مکان لیا ہے آپ نے"

"اجی صاحب۔ ابھی ابھی بنا ہے۔" جگر معصومیت سے فرمانے لگے۔

"وہ دیتا نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے اسے حاصل کیا۔ آپ لوگوں کے لئے۔ بالکل نیا ہے۔ ڈپٹی جلال الدین جو ہیں نا......"

کرشن چندر نے دل میں کہا۔ "اب آپ اس مکان کی کہانی سنائیں گے۔ اس کا شجرۂ نسب بیان کریں گے۔ ٹھیک ہے صاحب۔ کہئے۔ ہم سنیں گے۔ آپ کے مہمان جو ٹھہرے۔"

اتنے میں ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا۔ "جگر صاحب سجاد ظہیر صاحب پلنگ مانگ رہے ہیں۔ ان کے کمرے میں پلنگ ڈلوا دیجئے۔"

جگر صاحب نے کہا۔ "پلنگ تو یہاں نہیں ہے۔ مگر ٹھہرو میں انتظام کرتا ہوں۔ اتنا کہہ کر وہ اپنی کہانی ادھوری چھوڑ کے چل دیئے اور کرشن چندر نے سوچا کس قدر عجیب آدمی ہے۔ بھئی تم اپنی کہانی تو پوری کرتے جاؤ۔ یہ کیا بدتمیزی ہے کہ عین گفتگو کے بیچ میں اٹھ کے چل دیئے۔ کس قدر بری بات ہے یہ۔ اچھی تہذیب ہے یہ۔ واہ!

پھر اسے سجاد ظہیر کے پلنگ کا خیال آیا۔ بنّے سجاد پلنگ ہی پر سو سکتے ہیں۔ فرش پر نہیں۔ آخر ان کے لئے پلنگ کیوں منگایا جا رہا ہے۔ وہ کیوں پلنگ پر سوئیں۔ اور ہم کیوں نہ پلنگ پر سوئیں۔ واہ۔ یہ اچھی رہی۔ کرشن چندر نے سوچا۔ بنّے پلنگ پر سوئیں گے تو میں بھی پلنگ پر سوؤں گا۔ بنّے کیلئے پلنگ آئیگا تو میرے لئے بھی آئے گا۔ میں کسی سے کم نہیں ہوں۔ اور یہ جگر صاحب کس صفائی سے مجھے یہاں اکیلا چھوڑ کے بنّے کے لئے پلنگ کا انتظام کرنے کیلئے چلے گئے۔ میں بھی تو ان کا مہمان ہوں۔ مہمان ہوں۔ خاک مہمان ہوں۔ گھنٹوں سے یہاں خالی کمرے میں کھڑا ہوں۔ کوئی پوچھتا ہی نہیں ہے اور بنّے کیلئے پلنگ منگایا جا رہا ہے اور میں یہاں فرش پر سوؤں گا۔ میرا تھا تو اسی وقت ٹھنکا تھا جب میں نے جگر کو سٹیشن پر دیکھا تھا۔ خباثت اس کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ پلنگ لانے گئے ہیں۔ سجاد ظہیر ان کے رشتہ دار ہوتے ہیں کیا۔ میں یہاں فرش پر سوؤں گا۔ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں لیکن لیکن۔ میں جب سے یہاں کھڑا ہوں کوئی نوکر بھی تو اس کمرے میں جھاڑو دینے نہیں آیا۔ اور دوسرے کمروں میں پلنگ بچھائے جا رہے ہیں۔ کون پوچھتا ہے مجھے۔ میں کون ہوں جو مجھے کوئی پوچھے گا۔ دراصل یہ سب سازش ہے مجھے ذلیل کرنے کیلئے یہاں بلایا ہے۔ وہ بیچارا احمد علی ٹھیک کہتا تھا۔ کرشن چندر کو اپنے آپ پر رحم آنے لگا۔ اور اس کی آنکھیں غم و غصہ کے آنسوؤں سے نمناک ہو گئیں۔ اتنے میں مجلسِ استقبالیہ کے ایک رکن تشریف لائے۔

"چلئے چائے پی لیجئے۔"

"نہیں۔ میں چائے نہیں پیوں گا" کرشن چندر نے کہا۔
"آپ چائے نہیں پیتے؟"
"پیتا ہوں۔ مگر اس وقت نہیں پیوں گا"
"کیوں کوئی خاص بات ہے؟"
"جی نہیں۔ مجھے ذرا سی پیچش ہے"
"تو پیچش میں تو چائے مفید ہوتی ہے"
"ہوتی ہوگی۔ مگر میرے لئے نہیں۔"
"اچھا تو چلیے۔ تھوڑا سا ناشتہ ہی کر لیجئے۔"
"ناشتہ! میں ناشتہ بھی نہیں کروں گا"
"چلیے بھائی۔ تکلف نہ کیجئے۔ آپ ناشتہ نہیں کریں گے، تو جگر صاحب مجھ پر خفا ہوں گے"

"جگر صاحب کہاں ہیں۔ انہیں میرے پاس بھیجدیجئے۔"
"وہ ابھی آتے ہوں گے۔ سجاد ظہیر کیلئے پلنگ کا انتظام کرنے گئے ہیں"
یکایک کرشن چندر نے چلا کر کہا۔ "نہیں صاحب میں ناشتہ نہیں کروں گا۔ مجھے پیچش ہے۔ سر میں درد ہے۔ ہلکی ہلکی حرارت بھی ہے۔"
"بخار ہے۔ پیچش ہے۔ سر میں درد ہے۔ تو ٹھیریئے۔ میں ڈاکٹر کو بلا کے لاتا ہوں"
کرشن چندر نے کہا "ٹھیریئے ٹھیریئے" مگر وہ رُکا نہیں اور ڈاکٹر کو بلانے چلا گیا۔

اتنے میں سردار قریب سے گزرا۔ "یہاں کھڑے کھڑے کیا کر رہے ہو کرشن، چلو ناشتہ پر لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔" اور وہ دونوں بانہوں میں بانہ ڈال کر چل دیئے۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر جب وہ اپنے کمرے کو گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ باہر دہلیز پر جگر کھڑے ہیں اور اس کے کمرے میں پلنگ بچھایا جا رہا ہے۔ جگر نے کہا "ڈاکٹر ابھی آتا ہوگا۔ میں ابھی بستر کے دیتا ہوں آپ اس پر آرام کیجئے"

(۵)

کانفرنس کا پہلا اجلاس، افتتاح کے موقعہ پر مسز سروجنی نائیڈو کی شعلہ بیانی، کیا عورت ہے۔ معمر ہونے پر بھی آنکھوں کی جواں سالی نہیں کھوئی، تبسم کی حیرانی نہیں کھوئی، روح کی جستجو اور پیہم کاوش نہیں کھوئی۔ بدلتا ہوا زمانہ ہر بار اک نیا مرحلہ سامنے لاتا ہے، اور یہ شاعرہ اس مرحلے کا یوں استقبال کرتی ہے۔ گویا مدت سے اس کی منتظر تھی، اٹھتی ہوئی لہریں بار بار ساحل سے ٹکراتی ہیں۔ اور ان رواں دواں بلند و بالا موجوں کے تخت پر آپ اس عورت کو دیکھیں گے جس نے ہندوستانی سیاست اور ادب کے سارے رنگ دیکھے ہیں۔ فن سے زندگی تک، اور ہوم رول سے جمہوریت تک۔ وہ کبھی پیچھے نہیں رہی۔ اس کے قدم کبھی نہیں ڈگمگائے۔ وہ زمانے سے ہمیشہ دو قدم آگے رہی ہے۔ "ممکن ہے اپنے باغیانہ خیالات کی بنا پر اب کے اسے کانگریس کی ورکنگ کمیٹی میں بھی جگہ نہ ملے" سردار نے سبطے سے کہا۔ "ش" سبطے نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ سنو۔ کرشن اپنا مقالہ پڑھنے جا رہا ہے۔ ہال میں خاموشی تھی۔ پانچ ہزار آدمی چپ چاپ بیٹھے ہوئے ایک ادبی مقالہ سن رہے تھے۔ اس سے پہلے ایسا نہ ہوا تھا۔ یہاں مشاعرہ نہ تھا۔ خطیبانہ انداز تکلم نہ تھا۔ کوئی گہری فلسفہ طرازی نہ تھی۔ لیکن لوگ خاموشی سے سن رہے تھے۔ پانچ ہزار آدمی کالج کے طالبعلم، سکول کی لڑکیاں، سرکاری ملازم، دوکاندار، ریلوے مزدور، بے کار۔ ہر طبقے کے لوگ شامل تھے۔ اور خاموشی سے سن رہے تھے۔ اور جب مقالہ نگار نے مراکو سے لے کے جاوا تک کے آزادی پسندوں کی تحریک کا ذکر کیا تو ہال نعروں سے گونج اٹھا۔ اور جب ادب میں اشتراکیت کا ذکر آیا۔ انسانیت کا ذکر آیا۔ ایک بہتر نظام زندگی کا ذکر آیا۔ جنس کی انقلابی ماہیت کا ذکر آیا۔ اور ان طبقوں کا ذکر آیا جن پر ہمارے ادب کے دروازے ابھی تک بند ہیں۔ تو سننے والوں کے دلوں کے تار جھنجھنا اٹھے جیسے مقالہ نگار کی زبان اور ان کے دل مل گئے تھے۔ جیسے اُس مقالے میں وہ لوگ خود بول رہے تھے۔ پہلے روز یہ ہوا۔ دوسرے روز بھی اسی طرح ہوا۔ تیسرے روز اور چوتھے روز بھی یہی ہوا۔ یہ مکمل انہماک، یہ سچائی کو پالینے کی پاکیزہ جستجو ہر چہرے سے عیاں نظر آئی۔ گذشتہ دس سال سے لوگ تہذیبی اور ادبی کاوشوں کی طرف توجہ دینے لگے تھے۔ انہیں اپنی قومی زندگی کا عنصر بھی سمجھنے لگے تھے۔ اور گو تعمیری تنقید نے اتنی ترقی نہ کی تھی۔ پھر بھی باشعور پڑھے لکھے طبقے میں ان باتوں کا چرچا تھا۔ نئی تحریروں پر بحثیں ہوتی تھیں۔ بہ نظر تعمق نگاہ ہر مضمون کے حسن و قبح پر اس کے افادی یا غیر افادی پہلوؤں پر۔ اس کے ترقی پسند یا ترقی پسند رجحانات پر بڑی تفصیل سے گفتگو

ہوتی تھی، مختلف نظریے تھے۔ مختلف اذہان تھے۔ مختلف زاویہ ہائے نگاہ لیکن ایک چیز ان سب میں دھاگے کی طرح تھی۔ ادب اور کلچر اور تمدن سے دلچسپی۔ حقیقی دلچسپی اور قومی اور ملکی ادب کو اُس راہ پر گامزن کرنے کی آرزو ۔۔۔۔۔۔ جہاں وہ اس کی بڑھتی، اُٹھتی، مچلتی ہوئی زندگی کا ترجمان بن جائے ہندوستان کے نوجوان کا دل جاگ اُٹھا تھا۔ اور ادب کی ہر تفسیر میں اپنی جگمگاتی ہوئی تمناؤں کے فانوس خیال روشن کر رہا تھا۔ یہ روشنی جو بڑھتی جا رہی تھی۔ جو اندھیرے پر حاوی ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ گیت جس کے ہر مصرعے میں اِک نئی نے کی چمک تھی۔ ۔ ۔ درجس کی ہر نے میں کروڑوں انسانوں کی آرزوؤں کی گونج تھی۔ اس نئے نغمے نے ہر ادیب کے دل کو بہجت سے لبریز کر دیا اور اُن کے دلوں کی دھڑکنیں اُن ہزاروں دلوں کی دھڑکنوں میں کھو گئیں جو اس وقت ہال میں موجود تھے۔ روشن چہرے ذہین آنکھیں۔ تالیوں کا شور اور نئی زندگی نیا ادب۔ نئے انقلاب کے نعرے۔ یکایک کئی ادیبوں نے حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ گویا سب کے دل معاً شدت سے یہی محسوس کرنے لگے کہ ادب صرف تخیل کی چار دیواری میں محبوس ہو کر کس قدر محدود ہو جاتا ہے۔ اور اس بڑھتی ہوئی زندگی۔ کشمکش حیات کی آویزشوں سے ٹکراتی ہوئی زندگی کے بحرانی لمحوں میں گھل مل کر ادب اور ادیب کیسے اک نئی وسعت، اک نئے رُخ، اک نئے کیف وکم سے سرشار ہو جاتے ہیں۔

پہلے اجلاس کے ختم ہونے کے بعد بہت رات گئے اجلاس کی کامیابی پر گفتگو ہوتی رہی۔

—— کالجوں کے لڑکے بڑے انہماک سے ادیبوں کی گفتگو سنتے رہے اور آٹوگراف لیتے رہے۔ یہ آٹوگراف کی بدعت بھی خوب ہے۔ ادیب جلدی ہی یوں دستخط کرتے ہیں گویا کہہ رہے ہوں۔ ارے بھئی۔ ان لوگوں نے تو پریشان کر دیا۔ اب کوئی کہاں تک دستخط کرے۔ کبھی کبھی کسی لڑکی کی آٹوگراف بک آ جاتی تو قلم لے کے بیٹھ جاتے اور سوچتے کہ کس طرح ایک فقرے میں لیلیٰ ومجنوں کی پوری داستان بیان کر دیں۔ بعض لوگ بہت ہی کلبی بننے کی کوشش کرتے۔ ایں۔ اس میں ہے کیا آخر۔ آخر تو عورت ہی تو ہے۔ شوپن ہار والی عورت، جامعات کر دیا تجھے۔ مدن گوپال سے کسی نے آٹوگراف نہیں مانگا۔ تو آپ نہیں نکالے ہر ایک سے پوچھ رہے ہیں۔ بھئی۔ اُس خوبصورت لڑکی کی بید بہ صورت آٹوگراف بک پر تم نے کیا لکھا۔ ہی ہی ہی۔ اب کوئی پوچھے اس میں ہنسنے کی کیا بات تھی۔ آٹوگراف بک جو مسلم ضیائی کے پاس تھی کئی اعتبار سے بہت دلچسپ تھی۔ سجاد ظہیر نے لکھا تھا "اشتراکیت زندہ باد"۔ کرشن چندر نے لکھا تھا "انسانیت زندہ باد" جوش نے لکھا تھا "ابھی تم دونوں بچے ہو" آگے ساغر نے لکھا تھا "قریبا چار سو بیس ہے"۔ یہاں آ کے تسلسل ٹوٹ گیا اور جوش اور ساغر کے مناقشات پر گفتگو ہونے لگی۔ جوش کی رُباعیوں کا ذکر آیا۔ فراق نے بھی رباعیاں کہنا شروع کی تھیں۔ موازنہ ہُوا۔ اس جھگڑے میں رات کے دو بج گئے۔ صبح ہی سردار کو نظام کالج میں ایک تقریر کرنا باقی تھی۔ اُس نے سوچا لاؤ ابھی شیو کر ڈالوں۔ کرشن تمہارا شیو کا سامان کہاں ہے۔ کرشن کا سامان غائب تھا اُس نے بہت ڈھونڈا۔ لیکن کہیں نہ ملا۔ اُس نے گھور گھور کر جگر صاحب کی طرف دیکھا۔ جگر نے کوئی توجہ نہ کی۔ کرشن چندر کے دل میں نفرت اور بڑھ گئی۔ خوب۔ اب یہ پوچھتے تک بھی نہیں کہ بھئی آپ کا شیو کا سامان کہاں ہے۔ کیسے گُم ہُوا۔ یہیں کہیں ہو گا۔ میں ڈھنڈوا دیتا ہوں۔ مگر جگر نے جمائی لے کے کہا۔ "میں تو چلتا ہوں۔ صبح فراق اور احتشام احمد ڈاکٹر سعید العلیم تشریف لائیں گے۔ اسٹیشن جانا ہو گا۔"

"اور ہمیں تو نظام کالج جانا ہے" کرشن چندر نے کہا۔ "گاڑی کا انتظام کر دیجئے۔"

"میں دیکھتا ہوں"۔ جگر نے سرسری طور پر کہا۔ اور کرشن چندر کا جی جل کے کباب ہو گیا۔ اور وہ اسی لمحے اپنے کمرے میں جا کے بستر پر دراز ہو گیا اور اس نے سوچا۔ میں کل نظام کالج نہیں جاؤں گا۔ نہیں جاؤں گا۔ چاہے مجھے کوئی کچھ بھی کہے۔ میری بلا سے" وہ صبح اُٹھا تو شیو کا سامان غائب ہی تھا دوبارہ ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملا۔ سردار بے چارہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں گھوم رہا تھا۔ لیکن کسی کا شیو کا سامان خالی نہ تھا۔ آنند داڑھی مونڈ رہے تھے۔ سبطے نیند میں کراہ رہا تھا۔ سجاد ظہیر اپنے شیو کا سامان کسی کو مستعار نہیں دیتے۔ قدوس صہبائی نے جب دونوں ادیبوں کو نظام کالج کا عزم کرتے دیکھا۔ تو بولے "آپ لوگ شیو بنا لیتے تو اچھا تھا۔ سُنا ہے نظام کالج میں لڑکیاں بھی پڑھتی ہیں" سردار کا چہرہ تمتما گھورتا تھا۔ اور کرشن چندر کا چہرہ ایک بھوکی بھیڑ کا۔ اتنے میں جگر کا

ئے۔ چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری۔ نہ غم نہ مسرت۔ نہ حیرانی۔ نہ دلچسپی۔ نہ ادیبوں سے مرعوب تھے۔ نہ اُن سے بیزار نظر آتے تھے۔ جیسے کوئی خاص دلچسپی انہیں اُن لوگوں سے نہ تھی۔ اور پھر کوئی ایسی اجنبیت بھی نہ تھی۔ کچھ عجیب قسم کی لاتعلقی چہرہ پر عیاں تھی جسے دیکھ کر کرشن چندر اور بھی بوکھلا گیا۔ اور اپنے چہرے کی بڑھی ہوئی داڑھی پر یوں ہاتھ پھیرنے لگا۔ گویا عجلت ہی میں اُن کا شیو کا سامان گم گیا تھا۔

جب سردار اور کرشن چندر نظام کالج سے لوٹے تو فراق اور احتشام اور ڈاکٹر عبدالعلیم لکھنؤ سے تشریف لے آئے تھے۔ یہ سب لوگ کھانے پر بیٹھے عریانی پر بحث کر رہے تھے۔ سردار نے آتے ہی قلم ہاتھ میں لیکر ایک تجویز اس امر کے متعلق لکھنا شروع کی اور بحث طویل ہو گئی۔ فراق حسن کار ہیں۔ اس لئے انہیں عُریانی سے اتنی نفرت نہیں، احتشام کی صحبت میں نوجوانی کے باوجود اتنا ٹھہراؤ ہے کہ وہ عریانی کو دیکھ کر بدکتے نہیں۔ برافروختہ نہیں ہو جاتے سزائیں سنانے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کا انداز یہ تھا "میاں ابھی تم بچے ہو۔ کیا طفلانہ باتیں کر رہے ہو"! اُن کے ہشاش بشاش چہرے پر مسکراہٹ کی لہر دوڑ دوڑ کے گم ہو جاتی تھی۔ وہ اپنی داڑھی اور وضع قطع سے فرانسیسی معلوم ہوتے ہیں۔ اور اپنے درشت اندازِ تکلم سے ہیڈ ماسٹر اور تنک مزاج ہوتے وقت سو فیصدی کمیونسٹ نظر آتے ہیں۔ اکثر لوگ غلط بات غلط موقع پر کہتے ہیں یا غلط بات صحیح موقع پر کہتے ہیں یا صحیح بات صحیح موقع پر کہتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر عبدالعلیم کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہمیشہ صحیح بات کہتے ہیں اور ہمیشہ غلط موقع پر کہتے ہیں۔

چدر گھاٹ کالج میں انہوں نے تقریر کرتے ہوئے طلبا کے مجمع میں اُن کے اُستادوں کو وہ ڈانٹ پلائی کہ بیچارے اب تک یاد کرتے ہوں گے اسی طرح P. E. N کانفرنس کے موقع پر جب ڈاکٹر ملک راج آنند نے تجویز پیش کی کہ ہندوستان میں بھی فرانسیسی انسائیکلوپیڈیسٹ کی طرح ایک تحریک جاری کی جائے تو بہت سے لوگوں نے اس انقلابی تجویز کی حمایت کی۔ ان میں ریاست بیکانیر کے وزیر سردار پانیکر بھی شامل تھے لیکن صرف ایک آدمی کی پرزور مخالفت سے یہ تحریک رہ گئی۔ یہ مخالفت کرنے والا جانتے ہیں کون تھا۔ یہی اپنے ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب۔ آپ نے اُٹھ کر کہا۔ تجویز تو بہت معقول ہے۔ لیکن میں یہ پوچھتا ہوں۔ کہ فرانس میں اس تحریک کے چلانے والوں میں بڑے بڑے لوگ تھے۔ وولٹیر اور دیدرو۔ یہاں ایسا کون ادیب ہے، کون ایسا مفکر ہے آپ نے پورے مجمع پر نظر ڈال کر کہا۔ مجھے تو آپ لوگوں میں سے ایک آدمی بھی اُس پائے کا نظر نہیں آتا۔

اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا۔ پھر مجمع میں سے کسی من چلے نے پوچھا۔

"کیا تو ایسے پر بھی کوئی ایسا آدمی آپ کو نظر نہیں آتا"!

اس وقت پرمیرو جنوں نائیڈو تشریف فرما تھیں۔ جواہر لال نہرو تھے۔ ڈاکٹر تارا چند تھے۔ فاسٹر اور ملک راج آنند، ہرمن اولڈ اور احمد شاہ بخاری۔ ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب نے ڈائس پر بھی نگاہ ڈالی۔ سب کی طرف دیکھا اور پھر مڑ کر مجمع کو مخاطب کر کے کہا "نہیں۔ ان میں بھی کوئی نہیں"!

تحریک گر گئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر صاحب سچائی کو اس شدت احساس سے پیش کرتے ہیں۔ اور اس پر سختی سے کاربند ہوتے ہیں کہ اکثر اوقات بہت سے مخالف ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کی انہیں کوئی پروا نہیں۔ وہ ادیبوں کے نہایت کامدی ہیں لیکن عدم تشدد کے قائل نہیں۔ اور اگر کبھی ہندوستان میں ایسا قانون نافذ ہوا کہ ادیبوں کو ان کی فکری۔ ذہنی یا خارجی غلطیوں کی سزا ملنے لگی۔ تو اس احتساب کا محکمہ ڈاکٹر صاحب کے ہی سپرد ہو گا۔ اُن کی صاف گوئی سے بہت سے لوگ ان سے گھبراتے ہیں۔ لیکن اسی میں اُن کی خوبی ہے اور اگر اس صنف میں کوئی اُن سے ٹکر لے سکتا ہے۔ تو وہ حسرت موہانی ہیں جو خوش قسمتی سے وہیں کانفرنس میں تشریف رکھتے تھے۔ اور بلاناغہ اس کے ہر اجلاس میں شرکت کرتے رہے۔ چنانچہ جب ترقی پسند ادیبوں کی طرف سے عریانی کے خلاف قرارداد پیش کی گئی تو اس کی مخالفت کرنے والے مولانا حسرت موہانی تھے اور قاضی عبدالغفار مزے کی بات یہ تھی کہ نوجوان عریانی کے خلاف تحریک پیش کر رہے تھے اور بزرگ اس تحریک کی مخالفت کر رہے تھے۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا۔ کہ شاید اس طرح نوجوان اذہان کی قوتیں مسلوب ہو جائیں گی اور اُن کی تخیلی نزاکت جاتی رہے گی۔ مولانا حسرت موہانی کی پرزور تقریر سے قرارداد مسترد کر دی گئی۔ سجاد ظہیر ناخوش تھا۔ کہنے لگا "مولانا کا ہمیشہ سے یہی رول رہا ہے۔ وہ جہاں گئے لوگوں کو مصیبت میں ڈالتے گئے۔ جب کانگریس میں تھے تو ہوم رول کے دنوں میں آزادی کا ذکر کرکے

کانگریس ہائی کمانڈ کو خائف کیا کرتے تھے۔ اور جب کانگریس نے لاہور کانگریس کے موقع پر مکمل آزادی کی قرارداد منظور کر لی تو آپ نے اشتراکیت کی بیخ کنی کی اور کانگریس سے ایسے ناخوش ہوئے کہ مسلم لیگ میں چلے گئے۔ وہاں پہنچے ہیں تو اب بیچارے شریف خاں بہادروں کو بغاوت پر اکسا رہے ہیں۔ اور مکمل آزادی کا ریزولیوشن پاس کئے دے رہے ہیں۔ ہر جگہ مصیبت میں ڈالتے ہیں، لوگوں کو۔ بھئی اب اچھا بھلا ریزولیوشن پاس ہو رہا تھا۔۔۔۔۔ خیر۔۔۔۔ ہٹاؤ اب اس قصے کو۔" یہ کہہ کر وہ رُک گیا۔ اور اس کے چہرہ پر ہزاروں درد کی لکیریں یکایک معدوم ہو گئیں اور پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ "مگر بھئی۔ یہ خوب ہیں مولانا۔ چٹان ہیں۔ بس کسی کی نہیں سنیں گے۔ اپنی جگہ سے کبھی نہیں ہٹیں گے۔"

دوپہر کو پریم چند سوسائٹی کا افتتاح تھا۔ حسین ساگر میں جو کلب ہے وہاں دعوت بھی تھی۔ ادیبوں کو کشتیوں میں سوار کر کے کلب میں پہنچایا گیا۔ حالانکہ ایک راستہ خشکی سے بھی جاتا تھا۔ غالباً موٹر بوٹ کی نمائش مقصود تھی کلب کی عمارت جھیل میں تعمیر کی گئی ہے۔ کوئی پچاس کے قریب ملازم ہوں گے۔ آٹھ کورس کا کھانا۔ اس دعوت پر اتنا صرف کیا گیا تھا۔ غالباً پریم چند کو اپنی زندگی میں اتنی رائلٹی نہ ملی ہو گی۔ یورپ میں جب ادیب زندہ ہوتا ہے تو اس کی قدر ہوتی ہے۔ ہندوستان میں مرنے کے بعد اُسے پوچھا جاتا ہے چنانچہ آج پریم چند سوسائٹی کا افتتاح تھا۔ قاضی عبدالغفار تقریر کر رہے تھے۔ اور مرغن کھانے دعوت میں شامل تھے۔ اور جھیل کے منظر سے ادیب لطف اندوز ہو رہے تھے۔ قاضی عبدالغفار صاحب کی شخصیت پر متانت کا ایک دبیز پردہ پڑا ہوا ہے۔ لیکن اتنا دبیز بھی نہیں کہ ان کی جبلی خوش طبعی اس متانت کے اندر سے جھلک نہ اُٹھے۔ متانت ہے لیکن بوجھل نہیں ہے۔ خوش طبعی ہے۔ لیکن کھلکھلا کر نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کس چیز نے، کسی خاص واقعہ نے یا کسی خاص ماحول نے ان کے ذہن کے، اُن کے فکر کے، اُن کی فطری صلاحیت کے دو ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ وہ اس پر بھی مجبور ہیں۔ اُس پر بھی۔ دونوں رنگ ایک ہی شخصیت میں جھلکتے نظر آتے ہیں۔ پیرس کی رنگینی بھی ہے۔ عالمانہ زُہد بھی ہے، شگفتہ انشا پردازی بھی ہے اور فکری ٹھہراؤ بھی، لباس میں امارت کی جھلک ہے اور گفتگو میں علم کی چاشنی، تیور جاگیردارانہ ہیں۔ اور ذہن باغیانہ، قاضی صاحب ایک ایسے نوجوان ہیں۔ جیسے عرصے سے کسی نے گدگدایا نہ ہو۔ لیکن خود اُس کے اپنے دل میں شوخیاں چٹکیاں لے رہی ہوں کاش کوئی مصنف لیلہ کے خطوط کو گدگدا دے۔ اس طرح کہ وہ بھری محفل میں ۔۔۔ یاروں کی محفل میں نہیں۔ ہزاروں لاکھوں معمولی آدمیوں کی محفل میں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ یہ گدگدی ایک بہت بڑے شاہکار کا پیش خیمہ ہو

کرشن چندر نے مسلم ضیائی سے پوچھا "بھئی تم شادی کیوں نہیں کر لیتے ہو اب تو تمہاری آنکھوں پر عینک بھی آ چکی ہے۔"

مسلم ضیائی نے اپنی عینک کے شیشوں کو صاف کرتے ہوئے کہا "تم نہیں جانتے۔ آہ!"

"کون ہے وہ ظالم!" کرشن چندر نے پوچھا۔

"وہ ہر روز کانفرنس میں آتی ہے۔ آہ!"

گاڑی چار مینار کے گرد گھوم کر ایک گل فروش کی دوکان پر کھڑی ہو گئی۔ مسلم ضیائی اُتر کر گجرے خریدنے لگے۔

"یہ گجرے کیا کرو گے؟"

"میں اُسے بھیجوں گا۔ اُسے یہ گجرے بہت پسند ہیں!"

"آہ!" کرشن چندر نے کہا۔ "مجھے اپنی بیوی کیلئے چوڑیاں خریدنی ہیں اور ایک مراد آبادی پاندان۔"

"واہ! یہ سب چیزیں تو قریب ہی کے بازار میں مل سکتی ہیں۔" مسلم ضیائی نے جواب دیا۔

"آہ!" کرشن نے کہا۔

قریب کے بازار سے سب چیزیں مول لیکر واپس ہوئے تو چار مینار کے قریب گاڑی روک کر ایک طرف کھڑی کر دی گئی۔ مینار پر گھڑی میں ابھی پانچ نہ بجے تھے۔ چاروں طرف سیٹیاں بج رہی تھیں۔ سائیکل والے سائیکلوں سے اُتر کر۔ گھوڑا گاڑی والے گاڑی ٹھیرا کر۔ کار والے کار ایک طرف کر کے اور پیدل چلنے والے جہاں تھے وہیں رُک کر جامد و ساکت ہو گئے۔ چاروں طرف جدھر نگاہ جاتی تھی۔ خاموشی تھی۔ گہرا سناٹا اور مخلوق کے سر جھکے ہوئے تھے اور شیروانیوں کے بٹن گلے تک بند تھے۔ اور آنکھیں آسمان کی پہنائیوں کو چھوڑ کر زمین کی پتھریلی سطح پر جھکی ہوئی تھیں اور پسینہ میں عرق عرق پیشانیاں کسی نظر نہ آنے والے خدا کے آستانے کی جبہ سائی کر رہی تھیں۔ یکایک کہیں سے ایک سیاہ موٹر گذر گئی۔ مینار کے

سامنے کھڑے ہوئے سپاہیوں نے سلامی اتاری، اور گاڑی بہت دور نکل گئی اور یکایک مینار کے گھڑیال نے پانچ بجائے۔ اور یکایک جیسے ساری فضا کی خاموشی چھن سے ٹوٹ گئی۔ اور جھکی ہوئی گردنیں اوپر اٹھ گئیں۔ اور موٹر اور سائیکل اور گھوڑا گاڑیاں چلنے لگیں۔ اور دکاندار گاہکوں کو سودا دینے لگے۔ اب پھر وہی شور و غل تھا۔ وہی ہاؤ ہو۔ وہی زندگی۔

"کیا ہوا تھا بھئی!" کرشن چندر نے ایک چاؤش سے پوچھا جو اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔

چاؤش نے اُسے گھور کر دیکھا۔ اور اپنی تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھ کر کہا "ابھی سرکار کی سواری ادھر سے گزر گئی ہے۔ اندھے ہو کیا تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں؟"

"چلو۔ چلو۔ گاڑی بڑھاؤ!" مسلم ضیائی نے ٹیکسی والے سے کہا اور پھر مڑ کر کرشن چندر سے کہنے لگا۔

"یہ چاؤش ازاد عرب کے لوگ ہیں۔ ان سے" یا چاؤش "کہہ کے گفتگو کرنا چاہیئے "بھئی" کہہ کے نہیں۔ وہ تو یوں کہو۔ شریف چاؤش تھا۔ ورنہ کوئی دوسرا ہوتا تو ابھی اس بات پر تمہارے پیٹ میں چھری بھونک دیتا!"

"یا چاؤش"! کرشن چندر نے گھبرا کر کہا "اب کہاں چلو گے؟"

"راجہ شامراج جی کے ہاں دعوت ہے۔ چھ بجے!"

راجہ شامراج کا محل۔ پرانا محل۔ شہر میں واقع ہے۔ اونچی فصیل کے اندر ایک باغیچہ ہے۔ باغیچہ میں ایک مور ناچ رہا تھا۔ جب ادیب لوگ وہاں پہنچے تو دس بائیس موٹریں ایک طرف استقبال کیلئے کھڑی تھیں۔ راجہ صاحب غائب تھے۔ ادیبوں کو موٹر ڈرائیوروں۔ سپاہیوں اور راجہ صاحب کے مصاحبوں نے جھک کر سلام کیا۔ اور یہ بیچارے کچھ حیران، کچھ پریشان، کچھ پشیمان سے، محل کی سیڑھیوں پر کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ اتنے میں کسی نے کہا "ادھر تشریف لائیے۔ ادھر لائبریری کی طرف" یہاں راجہ صاحب سے تعارف ہوا۔ بظاہر صدق و صفا کی صورت۔ دبلے پتلے، پیشانی پر تلک، اتنی بڑی لائبریری۔ اتنی اچھی لائبریری، ہر موضوع پر کتابیں جنہیں غالباً آج تک کسی نے کھول کر پڑھا نہ تھا۔ بہت سی کتابوں کے ورق بھی کاٹے نہیں گئے تھے۔ پوری لائبریری میں صرف دو بچے پڑھ رہے تھے۔ یہ سنگ مرمر کے مجسمے تھے اور ایک سنگ مرمر کی کتاب کھولے ہوئے اس پر جھکے ہوئے تھے۔ اور نجانے کتنے سالوں سے اسی طرح جھکے ہوئے اس کتاب کے اس صفحے کو پڑھ رہے تھے۔ یہ سنگ مرمر کے صفحے۔ یہ سنگ مرمر کے بت۔ یہ سنگ مرمر کے محل، لیکن ہم لوگ یہاں کیا کر رہے تھے۔ کیوں اس دیار غیر میں اجنبیوں کی طرح گھوم رہے تھے۔ وہ گھر جو اپنا نہ تھا۔ جس کے ہر سنگ مرمر کی رگ کا خون سفید ہو چکا تھا۔ سامنے مور ناچ رہا تھا۔ ایک کمرہ اشتراکیت کے موضوع سے متعلق تھا۔ یہاں ہزاروں کتابیں جمع تھیں۔ مصاحب ادیبوں کو اس طرح دیکھ رہے تھے۔ گویا یہ تماشہ ہوں اور وہ تماشائی۔ اُن کی نظریں گویا کہہ رہی تھیں "تمہارے ایسے سینکڑوں لوگ یہاں آتے ہیں اور دعوت کھا کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ یہاں ہم ادیبوں کو بلاتے ہیں۔ اور سرکس والوں اور مداریوں کو۔ اور مسخروں کو یہاں سیاح آتے ہیں۔ اور بھک منگے بھی۔ اور سیاست دان بھی۔ ہمارے راجہ صاحب سب کو دعوت پہ بلاتے ہیں۔

ہمارے راجہ صاحب بہت اچھے ہیں۔ لیکن اُن کے اچھا ہونے سے آپ لوگ اچھے نہیں ہو سکتے۔ سردار صاحب آپ کی قمیص پھٹی ہوئی ہے۔ آپ کی شیروانی کا بٹن غائب ہے سبطے میاں۔ فردوس صاحب آپ نے یہ جھولا کیسے لٹکا رکھا ہے۔ مہندر بھائی آپ نے سر پہ یہ جنگل سا کیا اُگا رکھا ہے۔ کرشن چندر صاحب آپ کی پتلون پر دس پیوند ہیں۔ آپ لوگ یہاں کیا کھا کر ترقی پسندی کا دعویٰ کریں گے؟"

سامنے مور ناچ رہا تھا۔

ایک صاحب جو غالباً راجہ صاحب کے وزیر معلوم ہوتے تھے بولے "سرکار کا عجائب گھر بھی دیکھئے گا۔" سرکار کا عجائب گھر! اس وقت تو یہ سارا محل عجائب گھر معلوم ہو رہا تھا جس میں نمونے کے طور پر ترقی پسند ادیب مختلف کمروں میں رکھ دیئے گئے تھے۔ اس بانکدانی میں سجاد ظہیر، ڈاکٹر تارا چند اور ملک راج آنند قید تھے۔ اس کمرے میں سردار اور عادل رشید۔ سبطے حسن اور رفعت سروش محبوس تھے۔ اس شیشے کی الماری کے قریب کرشن چندر، مدن گوپال اور فراق گورکھپوری ایستادہ تھے۔ فراق صاحب کے چہرے پر غیض و غضب کے آثار نمایاں تھے۔ اور اُن کی گول گول پتلیاں حیرت و استعجاب میں ڈوب کر ادھر اُدھر مجذوبانہ انداز میں تک رہی تھیں۔ ایں۔ ہم لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ ہم دعوت کھانے

آئے ہیں یا اپنا خون پینے آئے ہیں۔

فراق بولے۔ بلند آواز میں "بھئی میں تو چلتا ہوں" یہ کہہ کر وہ چلے۔

"ٹھہریئے۔ ٹھہریئے" وزیر نے کہا "وہ راجہ صاحب کا عجائب گھر"

"اچھا صاحب" فراق صاحب نے رمان کر کہا "چلئے! وہ بھی ہو جائے"

ایک کمرے میں پتھر کے بت۔ ایک کمرے میں دیوتاؤں کے بت۔ پتھر کے نہیں دھات کے۔ ایک کمرہ میں آصفیہ خاندان کے خطوط جو راجہ صاحب کے بزرگوں کو لکھے گئے تھے۔ راجہ صاحب کے بچوں کے خطوط جو انہوں نے اُردو میں لکھے تھے۔ یہ خطوط شاید اُردو سے محبت کے ثبوت میں تھے

ایک کمرے میں مختلف تصاویر۔

وزیر نے کہا۔ "مجھے وہ تصویر بہت پسند ہے۔"

کوئی خاص بات اس تصویر میں نہ تھی۔ ایک خوبصورت عورت کی تصویر تھی۔ جس نے ایک سپید ساڑی پہن رکھی تھی۔ اس طرح کہ ساڑی کے اندر عورت تقریباً ننگی نظر آتی تھی۔ کمر کے خم میں گاگر سنہری تھی۔

"بے حد پسند ہے مجھے" وزیر کے ہونٹ کھلے تھے۔ اُسکے وہ موٹے موٹے کھلے کھلے بدصورت ہونٹ!

سامنے مور ناچ رہا تھا۔

"میں جا رہا ہوں بھئی کرشن" فراق نے جھلا کے کہا۔

"ٹھہریئے۔ ٹھہریئے"۔ وزیر نے گھبرا کے کہا "چائے پی کے جائیے"۔

"ہوں" فراق صاحب نے جھلا کے کہا اور باغیچہ میں جا کے چائے پینے لگے۔

چائے پینے کے بعد راجہ صاحب کے ساتھ ترقی پسند ادیبوں کا فوٹو کھینچا گیا۔ دائیں طرف سجاد ظہیر بائیں طرف کرشن چندر اور کرسیوں پر دوسرے ادیب اور بہت سے ادیب مصاحبوں کی طرح پیچھے کھڑے تھے۔ سردار اور سبطے اور دوسرے انقلابی ادیب۔

"میں حاضر ہوں سرکار" فوٹو گرافر نے کہا۔

راجہ صاحب نے اشارہ کیا۔ اور فوٹو لے لیا گیا۔

فراق کے بدن میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ لیکن اب فوٹو لے لیا گیا تھا۔ فوٹو بہت ضروری تھا۔ فوٹو سے راجہ صاحب کی ترقی پسندی تو

کیا ظاہر ہوتی تھی اپنی ذلت پسندی کی انتہا ہو گئی تھی۔ سردار نے کہا "اگر مجھے معلوم ہوتا" سبطے بولا "انقلاب کے دوران میں جاگیردار ایسے ایسے کئی فوٹو پیش کر کے اپنے آپ کو اشتراکیت کا علمبردار ثابت کریں گے۔ اور ان باتوں سے کیا ہوتا ہے" قدوس صہبائی بولے "فوراً گردن ناپ دی جائے گی" "مگر ایسا ہوا کیوں؟" مدن گوپال چیخے "ہم یہاں آئے کیوں"

فراق بولے "اگر کوئی میرے ساتھ چلتا ہے تو چلے۔ ورنہ میں تو ابھی چلا"

"ٹھہریئے۔ ٹھہریئے" وزیر نے چلا کر کہا "پان اور عطر حاضر ہے"

سونے کا عطردان اور چاندی کا پاندان اور پان کھلا کے اور عطر لگا کے اور ہاتھ میں ایک گلدستہ تھما کے ادیبوں کو رخصت کر دیا گیا۔ چلتے وقت یہ محسوس ہو رہا تھا گویا کسی نے منہ پر تھوک دیا ہے۔ پیشانی پر کیچڑ مل دی ہے اور روح میں غلاظت کے انبار لگا دیئے ہیں۔ ہر شخص الّو کا پٹھا معلوم ہو رہا تھا۔

سامنے مور ناچ رہا تھا۔

واپس قیام گاہ پہنچ گئے۔ تو دیکھا سامنے صحن میں جگر حیدرآبادی کھڑے کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ "کہیئے صاحب۔ راجہ صاحب کی دعوت سے فارغ ہو گئے"

اس کے بعد ہنسے۔ ہونٹ لال۔ مسوڑھے لال۔ دانت لال۔ زعفرانی رنگ چہرے پر یہ رستا ہوا سرخ زخم جی میں آیا گلا گھونٹ دیا جائے۔ سردار نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لیں اور اپنے آپ پر بیحد جبر کر کے بولے۔ بندۂ خدا بتا تو دیا ہوتا۔ کہاں دعوت ہے۔ ہمیں کیا معلوم یہ شامراج رامراج جی کون ہیں۔ ہم تو سمجھے تھے کوئی ادب نواز صاحب ہیں۔"

"ادب نواز تو وہ ہیں ورنہ آپ کو بلاتے کیوں"

"یہ تو ٹھیک ہے مگر ــــ مگر، یہ راجہ، یہ نواب، یہ یار جنگ بہادر تم سمجھو گے نہیں" جگر گھوم گئے۔ میلنج کی طرف جاتے ہوئے بولے "آپ کے لئے شام کے کھانے کا انتظام کرنے جا رہا ہوں۔ شام کے کھانے سے پہلے اردو مجلس کے یہاں سے تمام مندوبین کو بلاوا آیا ہے۔ جانا ہو گا"

وہ مڑ کر گھوم گئے۔ فراق نے انہیں معاف نہیں کیا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں گھماتے ہوئے بولے "یار عجب آدمی ہے۔ یہ ہیں گھنٹے سرپولا

رہتا ہے۔ جب دیکھو قیام گاہ میں حاضر ہے۔ یہ شخص سوتا نہیں۔ کھاتا نہیں۔ پیتا نہیں۔ جب دیکھو اِدھر سے اُدھر۔ اُدھر سے اِدھر گھومتا رہتا ہے۔ اسے کیا ہوا ہے؟"

اس کے بعد خود ہی حیران اور ششدر کھڑے رہ گئے۔ دیر کے بعد سبطے سے مخاطب ہوئے "کچھ سمجھ میں نہیں آتا —۔ آؤ بھئی تمہیں کچھ رباعیاں سنائیں"

"آپ چلیے۔ میں ابھی آتا ہوں" سبطے نے کہا۔

بعد میں سبطے نے کرشن کو بھی گھسیٹنا چاہا "چلو۔ رباعیاں سنو تم بھی۔ کمبخت رباعی بہت اچھی کہتا ہے۔"

عادل رشید   پتلون کی کریز درست کرتے ہوئے بولے "بہت بڑا شاعر ہے"

سبطے نے کہا "اس کی شاعری ہندستانی کلچر کی معراج ہے"

کرشن چندر نے کہا "میں نہیں جاؤں گا سننے اس وقت"

لہجے میں معذرت سے زیادہ تلخی تھی۔ حسد اور رشک اور ایک عجیب گڑابا۔ حریفانہ رقابت کہ ہائے میں شاعر کیوں نہیں۔ یہ ہر محفل میں شاعر کیوں چھا جاتا ہے۔ لڑکیوں افسانہ سنتے ہی لوگوں کو جماہیاں آنے لگتی ہیں۔ کاش میرا افسانہ فراق کی رباعی کی طرح خوبصورت ہوتا . . . . .

(۷)

شام اور رات کے بیچ کے وقفے کی دھندلی اُداسی ادیبوں کی پھیکی پھیکی اکتائی ہوئی' تھکی ہوئی صورتیں میرزا فرحت اللہ بیگ کے وسیع و عریض برامدے کے باہر بلطوں کا بے ہنگم خرام۔ اردو مجلس میں چائے اور مشاعرے کا بندوبست۔ شاعروں کی آوازیں اور چینی کے پیالوں میں چلتے ہوئے چمچے اور سرکیوں کے پیچھے پردہ پوش خواتین کی کڑی تنقید۔

"ہائیں — یہ کرشن چندر ہیں"

"کون وہ ٹھنگنے سے . . . . اری وہ"

"کرشن چندر نہیں چندر چندر معلوم ہوتے ہیں"

قہقہہ۔

کرشن چندر کا کھانسنا۔ وہ کھانسی گویا کہہ رہی ہو۔ دیکھیے ہم بھی سُن رہے ہیں۔

عادل رشید اس طرح بیٹھے ہوئے تھے گویا میر مشاعرہ وہی تھے۔

قدوس صہبائی۔ گویا ابھی چوتھے درویش کا سرگذشت سناکے اُٹھ رہے ہوں۔

فضا میں اُجلے پن کے باوجود تیرگی۔ عرصۂ زماں میں حال کے باوجود ماضی کا دھندلکا۔ محبت کے باوجود اک کربناک کھنچاؤ جیسے رگیں ٹوٹ رہی ہوں۔ جیسے دو زمانے۔ دو نسلیں اور دو زاویہ ہائے نگاہ ایک دوسرے کے قریب آنے کی ناکام کوشش کر رہے ہوں۔ جیسے اندھیرا اجالے میں اور ماضی مستقبل میں۔ اور موت' زندگی میں اپنا عکس ڈھونڈ رہی ہو۔

کیفی نے اپنی نظم مرثیہ خوانوں کے انداز میں سنائی۔

خاموشی۔ گہرا سناٹا۔

ایک پیر و مرشد نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا "آپ شاعر ہیں"

پھر خاموشی۔ لوگ اس جملے کی اہمیت پر غور کر رہے ہیں۔

سب مؤدب بیٹھے ہوئے ہیں گویا کسی ایٹم بم کا انتظار کر رہے ہیں۔

پھر کسی نے کہا۔ مرزا صاحب آپ کچھ سنائیے۔

مرزا صاحب سنانے لگے۔ "جمنا کا کنارہ"

سرکیوں کے پیچھے کسی نے کہا "کِنارہ نہیں کَنارہ کہیے"

تہذیب اور کلچر موت کے زہراب میں گرفتار ہوں۔ لیکن گرامر نہیں بدل سکتی۔ زندگی بدل جائے۔ لیکن زبان کی ہیئت نہیں بدل سکتی۔ زمان و مکان میں تغیر کی نمو ہو سکتی ہے۔ ملک و ملت اور افراد و کردار کی ہیئت میں' اطوار و گفتار میں' ان کی سماجی' سیاسی' شعوری زندگی میں انقلاب آسکتا ہے۔ لیکن زبان میں کوئی تغیر ممکن نہیں۔ وہ موت کی طرح اور خدا کے آخری حکم کی طرح قطعی ہے۔

اے لسانی مقابر کو پوجنے والی مخلوق' سر جھکائے مؤدب بیٹھی رہ۔ اس کی فکر نہ کر کہ سر سے طوفان گزرا جا رہا ہے۔ قائزر کی بیش قیمت چائے دانیوں سے ابلتی ہوئی چائے انڈیل۔ صحن میں آہستہ خرام' کڑکڑاتی ہوئی بدصورت بطخوں کو دیکھ اور سُن۔ جمنا کا کِنارہ . . . . . نہیں . . . . . نہیں . . . . . جمنا کا کَنارہ . . . . . معاف کیجیے گا۔

کرشن چندر نے جھک کر نظر کے کان میں کہا "خودکشی کیلئے کونسی جگہ بہتر رہے گی۔"

نظر نے بہت سوچ بچار کے بعد کہا "ایکا جی کا ہوٹل"

" تو چلو پھر وہیں "

آخر کانفرنس ختم ہو گئی۔ سبطے نے فنِ صحافت پر اپنا مقالہ بھی پڑھ لیا۔ کسی شخص نے اُسے ٹوکا نہیں۔ سرور نے اقبال کے رجعت پسند نقادوں کو آڑے ہاتھوں لیا۔ کسی نے اس کے پیٹ میں چھُرا نہیں بھونکا۔ ڈاکٹر تاراچند نے اُردو کا شجرۂ نسب دو ہزار سال کے پُرانے ہندوستان کی تہذیب سے جا ملایا۔ کسی ہندو مہاسبھائی نے اُف تک نہ کی۔ لیکن جب کانفرنس ختم ہونے کے بعد مخدوم نے آہستہ سے کہا "بھئی، وہ ریلوے کے مزدور تم لوگوں کو اپنے جلسے میں بُلانا چاہتے ہیں۔" تو بہت سے لوگ زکام اور پیچش اور بخار سے بیمار پڑ گئے۔ جگر صاحب نے بڑی مستعدی سے لوگوں کے بستر باندھنا شروع کر دیئے کچھ لوگ بازار میں خرید و فروخت کرنے کیلئے چلے گئے۔ کچھ لوگ بی، ای، این کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے اسٹیشن سے جے پور کے ٹکٹ لانے کے لئے چلے گئے۔ کچھ لوگ بیمار بن کر بستر پر دراز ہو گئے۔ مزدوروں کے جلسے کیلئے صرف کیفی، سردار اور ساحر بچے۔

مخدوم نے تعارف کرایا۔ یہ کیفی ہیں

انقلاب زندہ باد

یہ سردار ہیں —— انقلاب زندہ باد

یہ ساحر لدھیانوی ہیں

انقلاب زندہ باد

سٹیشنوں پر کام کرنے والے لوگ، سانولے کالے لوگ، موٹے موٹے چہروں کھُردرے ہاتھ پاؤں والے لوگ، بدصورت لوگ۔ غلیظ لباس پہننے والے لوگ۔ بُرا کھانا کھانے والے لوگ۔ لوگ جو نہ "واللہ" کہہ سکتے تھے نہ "مکرر ارشاد"، نہ "ہیہے کیا شعر ہُوا ہے"۔ لوگ جن کے آداب ان کی زندگیوں کی طرح کھُردرے تھے۔ اُن کے لباس کی طرح وحشی تھے۔ اور اُن کے اعتقاد کی طرح مضبوط تھے۔ یہ لوگ خوبصورت الفاظ میں شاعروں کی تعریف نہیں کر سکتے تھے۔ یہ لوگ جو خاموش تھے۔ اور سُن رہے تھے۔ اور مکرر ارشاد نہ کہنے کے باوجود اُن کے چہروں کی آب اور اُن کی آنکھوں کی چمک، اور اُن کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گویا کہہ رہی تھی۔ ہم خوش ہیں۔ کیونکہ تم ہمارے ہو۔ ہم میں سے ایک ہو۔ ہماری خوشیوں اور غمیوں کے گیت گاتے ہو۔ اور اپنے الفاظ کی حسین تصویروں میں ہمارے دُکھ کا مداوا ڈھونڈتے ہو۔ تم ہماری برادری میں سے ہو۔ اُن انسانوں کی عظیم برادری میں سے جہاں کسی انسان کا حق دوسرے انسان کے حق پر فائق نہیں سمجھا جاتا۔ آؤ۔ آؤ۔ ہم تمہارا استقبال کرتے ہیں۔ چمکتی ہوئی آنکھوں سے۔ خاموش کانپتے ہوئے ہونٹوں سے اور بھینچی مضبوط مٹھیوں سے۔ خوش آمدید ساتھیو۔ اب تک تم ویرانے میں گھومتے رہے۔ آج تم گھر میں آئے ہو۔ ہمارے پاس حریری پردے نہیں ننگی دیواریں ہیں۔ سونے کے پلنگ نہیں پتھر کا فرش ہے۔ ہماری جیبیں خالی ہیں۔ لیکن دل آنسوؤں سے معمور ہیں۔ محبت کے آنسو۔ شفقت کے آنسو۔ رفاقت کے آنسو! ...... آؤ ...... آؤ ...... ساتھیو!

ساحر لدھیانوی کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ شعر کہتے کہتے رُک گیا۔ اور اس کی نمناک آنکھوں میں جیسے سارا مجمع ناچ گیا۔ اور اُسے ایسا محسوس ہُوا جیسے وہ اپنے گھر میں بیٹھا ہُوا اپنے عزیزوں سے گلے مل رہا ہو۔ یہ اس کی ماں تھی۔ یہ بھائی۔ یہ بہن۔ یہ بچپن کا محبوب ساتھی ...... آؤ ...... آؤ ...... ساتھیو!

اب وہ لوگ فارغ ہو کر حیدرآباد کے سٹیشن پر پہنچ گئے تھے ریلوے کے مزدوروں نے تھرڈ کا ایک چھوٹا سا ڈبہ اُن کے لئے وقف کرا دیا تھا۔ تاکہ انہیں دورانِ سفر میں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ اب اِس کمرے میں اُن کا سامان رکھا جا رہا تھا۔ سٹیشن کا پلیٹ فارم تھرڈ کلاس کی مخلوق سے اٹا ہُوا تھا۔ اور غلیظ بستروں اور زنگ آلود سیاہ ٹرنکوں۔ بدبودار ٹوکروں اور کھانچیوں سے ایک غلیظ مال گودام کی صورت میں مبدل ہو چکا تھا۔ جالی دار ٹوکریوں میں مرغیاں کُڑکُڑا رہی تھیں اور اُن کے قریب سیاہ فام گھاٹنیں اپنے کمر کے گرد لپٹی ہوئی مرہٹی ساڑھی کے پلو سے جوئیں چُننے میں مصروف تھیں۔ اتنے میں زور سے ایک موٹر کے ہارن کی آواز کانوں میں آئی۔ اور ایک سیاہ رنگ سیڈان سٹیشن کے پلیٹ فارم پر جہاں موٹر گاڑیوں کا آنا ممنوع ہے چلتی ہوئی دکھائی دی۔ پوں۔ پوں۔ آگے سے ہٹ جاؤ۔ پوں۔ پوں ...... پولیس کے آدمی ہنٹر لئے ہوئے لوگوں کو پرے ہٹانے لگے۔ قلی اسباب راستے سے اُٹھانے لگے۔ راستہ صاف ہو گیا۔ پوں پوں۔ موٹر پلیٹ فارم پر چلتی گئی اور آخر رُک کر ایسے ڈبے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی جو کسی بڑے آدمی کا سپیشل سیلون معلوم ہوتا تھا۔

کاریں سے پہلے سنہری وردی میں ملبوس ایک اردلی اُترا۔ پھر اس نے کار کے دروازے کا پٹ کھولا اور جب تک پولیس کے لوگوں نے چاروں طرف سے گھیرا ڈال لیا اور پھر کوئی کچھ نہ دیکھ سکا کہ کیا ہے۔

"کیا ہے" ایک نے پوچھا۔

"سر سلطان بالقابہ کا سپیشل سیلون ہے۔"

"سر سلطان احمد جو وائسرائے کی کونسل کے ممبر ہیں؟"

"جی ہاں وہی"

"یہاں حیدرآباد میں کیا کرنے آئے تھے؟"

"آپ کس عزیز کی شادی میں یہاں آئے تھے۔ وہ دلہن کمپارٹمنٹ سے اور یہ باہر کیا رکھا ہوا ہے۔ دیکھتے نہیں ہو۔ یہ جہیز کا سامان ہی تو ہے۔

مُرغی کے بدبودار ٹوکروں۔ اور غلیظ جام سے بھرے ہوئے کھانچوں اور زنگ آلود مٹکوں سے نظریں پھسلتی ہوئی اُس ساز و سامان پر پڑیں۔ جہاں چاندی کے برتن پڑے تھے۔ اور اخروٹ کی بیش قیمت چیزیں اور رو پہلے پایوں والے پلنگ۔ اور صراحیاں جن پر طلائی آب و رنگ تھا اور پھر نظریں وہاں سے پھسلتی ہوئی جو پائی چیختی ہوئی مٹیالی کالی سلو لی غلیظ گھاٹیوں کے جسموں کو اندازِ تنفر دیکھتی ہوئی اُس کھڑکی کے باہر جا کر رُک گئیں۔ جہاں ریشمی پردہ لہرا رہا تھا۔ آگے مت جاؤ۔ ریشمی پردہ کہہ رہا تھا۔ آگے مت جاؤ۔ یہ ریشم کی دیوار ہے۔ اس دیوار کے ادھر تمہاری دنیا ہے۔ غریبی کی کیچڑ میں کلبلاتی ہوئی مخلوق۔ ریشم کی دیوار کے اُس طرف دوسری دُنیا ہے۔ جس کی ہر سانس میں آسودہ تعیش کا عطر ہے۔ ہر تبسم میں کامران امنگوں کی شراب ہے۔ ہر لَے میں فتح کا مغرور نغمہ ہے اور ان دونوں دُنیاؤں کے بیچ میں ایک پتلی شفاف سی ریشم کی دیوار ہے۔ اتنی پتلی اور ایسی شفاف کہ لوگ آر پار دیکھ سکتے ہیں۔ اس دُنیا کے لوگ اُس دُنیا کے لوگوں کو اور اُس دنیا کے لوگ اِس دنیا کے لوگوں کو اجنبی نگاہوں سے۔ دشمن نگاہوں۔ نفرت کی نگاہوں سے تک رہے ہیں۔ تک رہے ہیں۔ دیکھ رہے ہیں۔ ڈر رہے ہیں لیکن کوئی اِدھر سے اُدھر یا اُدھر سے اِدھر نہیں آتا۔ کوئی اس پتلے شفاف سے پردے کو ہاتھ کے ایک ہی جھٹکے سے چاک کرنے کی ہمت نہیں کرتا۔

آؤ۔ آؤ۔ ساتھیو یہ دیکھو یہ سر سلطان احمد کا سپیشل سیلون ہے۔

وہ تمہارا تھرڈ کلاس کا ڈبہ ہے۔ یہ اُن کا سنہری وردی میں ملبوس بیرا ہے وہ بیٹھے ہوئے کالروں والا علی سردار جعفری ہے۔ یہ اخروٹ کا میز ہے۔ جس پر کشمیر کے کاریگروں نے حسین پچی کاری کی ہے۔ وہ رفعت سروش کا بستر ہے۔ جس میں دس جگہ پیوند لگے ہیں۔ یہ طلائی صراحی ہے۔ وہ تانبے کا لوٹا ہے۔ یہ کمخواب کی رضائی ہے۔ وہ کھدر کی اوڑھنی ہے۔

یہ موت ہے۔	وہ زندگی ہے
یہ ماضی ہے	وہ مستقبل ہے
یہ اندھیرا ہے	وہ اُجالا ہے

دیکھو دیکھو۔ وہ دیوار ٹوٹ گئی۔ موت زندگی سے، ماضی مستقبل اور رات سحر سے گلے مل رہی ہے۔ لیکن نہیں دیوار کہاں ٹوٹی ہے یہ تو گاڑی چل رہی ہے۔ آہستہ آہستہ لوگ الوداع کہہ رہے ہیں۔ مسلم ضیائی کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ ابراہیم جلیس کے رخساروں کے گڑھے اور گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔ نظر کے بال اور بکھر گئے ہیں۔ اور نشتر جاتی کی محبوب نگاہیں کہہ رہی ہیں۔

"ہم شرمندہ ہیں۔ بیحد شرمندہ ہیں۔ نجانے کیوں"

گاڑی چل رہی ہے۔

جگر صاحب ہاتھ ہلا کر جلیس سے کہہ رہے ہیں۔ "میں بہت جلد گاؤں سے لوٹ آؤں گا۔ اور چھوٹی بہن کو ساتھ لیتا آؤں گا۔ ضرور لیتا آؤں گا۔ فکر نہ کرنا۔ اچھا ہے۔ اپنے مہمانوں کے ساتھ جا رہا ہوں۔ تھوڑی دور ساتھ رہے گا۔ میرا خیال ہے اب وہ اچھی ہو گئی ہو گی چھوٹی بہن . . . ."

گاڑی چل رہی ہے۔

سورج ڈوبتا جا رہا ہے۔

سورج ڈوب گیا۔

حیدرآباد غائب ہو گیا۔

گاڑی پھر بھی آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ گویا ان بھک منگوں کا منہ چڑا رہی تھی جو پلیٹ فارم کے کنارے کنارے اور بعد میں ریل کی پٹری کے کنارے کنارے بھاگ رہے تھے۔ سگنل مینوں کے کیبن سور کے چھوٹے چھوٹے ڈربوں کی طرح سطح زمین سے اوپر اُٹھے ہوئے تھے۔ گاڑی آگے چلی جا رہی تھی لیکن

انجن نے ابھی اپنی رفتار تیز نہیں کی تھی۔ کیونکہ وہ ابھی ابھی گودام سے کوئلہ اور نل سے پانی لے کر فارغ ہوا تھا اور ایک تازہ دم حقّے کی طرح گڑگڑا رہا تھا۔ بھکارن چلا رہے تھے۔ بابو صاحب پیسہ۔ بابو صاحب پیسہ۔ گاڑی شہر سے باہر میدان میں آ گئی تھی۔ سٹیشن کی عمارت بہت دور پیچھے رہ گئی تھی۔ اور اب سطح مرتفع پر گارے کی بنی ہوئی جھونپڑیاں نظر آ رہی [illegible] ہوئی بھینسیں

میدان میں [illegible] پاس چر رہے تھے۔ اور اتنی دور سے وہ بھی بھینسوں کے بچے معلوم ہوتے تھے۔ جوہڑوں میں بدبودار غلیظ گدلا سبز پانی ٹھہرا ہوا تھا۔ اور کہیں کہیں جھاڑیوں میں لوگ رفع حاجت کے لئے گاڑی کی طرف پیٹھ کئے بیٹھے تھے۔ بھک منگوں کی آواز بار بار کانوں میں آ رہی تھی۔ بابو صاحب پیسہ۔ بدھ کے وقت میں بھی یہی ہندوستان تھا۔ یہی غلیظ جوہڑ۔ یہی گارے کی جھونپڑیاں یہی بھک منگے۔ اشوک کے عہد میں بھی یہی ہندوستان تھا۔ اکبر کے عہد میں بھی یہی۔ اور آج دو سو سال کی انگریزی حکومت کے بعد بھی لوگ اسی طرح گاڑی کی طرف پیٹھ کئے بیٹھے تھے۔

آئے۔ آئے۔ کہیں سے آئے۔ وہ زندگی کی بیدار افق۔ اس ہلکن منجمد بے حس دنیا میں اس گہری اتھاہ تیرگی میں آئے۔ کہیں سے آئے وہ نور کی کرن وہ صبح کی سرخ لکیر، محبوب کے پائل کی ناچتی ہوئی آواز آئے کہیں سے آئے۔ اور تاروں بھری افشاں کی طرح چمک کر ہندوستان کے ماتھے پر جگمگائے ....

پھر گاڑی تیز چلنے لگی۔ اندھیرا بڑھتا گیا۔ تاریکیاں شبنمی لبادے اوڑھ کر چاروں طرف چھا گئیں۔ دل کسی نامعلوم خوف اور اداسی سے معمور ہو گئے۔ سب چُپ تھے۔ صرف جگر اک ملتجیانہ تبسم سے ادیبوں کی طرف دیکھ کر کہہ رہا تھا۔

"میں اپنے گاؤں جا رہا ہوں۔"

سب خاموش رہے۔

"میری بہن بیمار ہے۔"

کوئی نہیں بولا۔

"مجھے اپنی بہن سے بڑی محبت ہے۔ مجھے اپنے گھر میں بہن ہی سب سے پیاری ہے۔ ہماری ایک ہی بہن ہے۔ اور ایک عرصے سے بیمار ہے، لیکن میں اُسے چند وجوہات سے اب تک حیدرآباد نہ لا سکا۔"

چُپ چاپ۔ . . گاڑی چلتی رہی۔

"میں اُسے حیدرآباد لے آؤں گا۔ ڈاکٹر اجنگیا سے اُس کا علاج کراؤں گا۔ ڈاکٹر نائیڈو کو بھی دکھاؤں گا۔ میں نے دو سو روپیہ اس کی بیماری کے علاج کیلئے بچا کے رکھا ہے۔

ہم دونوں کچے امرود توڑ کر کھایا کرتے تھے۔ میں اس کے لئے لچھمن کے گھر سے املی چُرا کے لایا کرتا تھا۔ اُسے میٹھے بیر بہت پسند ہیں......"

وہ اپنی یادوں میں کھو گیا۔ سب لوگ چپ رہے۔

ہولے ہولے کیفی گنگنانے لگا۔ اپنی محزون محبت کا گیت۔ وہ گیت جس میں اُس نے اپنے کھلتے ہوئے سینے کی آرزوئیں اپنی امید دھنسی ہوئی آنکھوں کا نور اور اپنے زرد چہرے کی حسرتوں کی راکھ کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ وہ ہولے ہولے گا رہا تھا۔ جیسے وہ اپنے دل کے بچے کو لوری دے رہا ہو۔ وہ خود اپنے لئے گا رہا تھا۔ صرف اپنے لئے۔ لیکن اس ڈبے میں کون تھا۔ جس نے اُس گیت کو اپنے لئے نہیں سمجھا۔ اس کے ہر شعر میں، ہر مصرعے میں، ہر لفظ میں، اپنے عشق کی جھلک، اپنی ناکامی کی تصویر اور اپنے محبوب کی تنویر نظر نہیں آئی۔ جیسے تصور میں کوئی مسکرا اٹھا۔ کسی نے انگڑائی لی۔ کہیں سے پائل بج اٹھی اور پھر نغمہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا.........

اک گرانبار افسردگی بوجھل غبار بن کر سانس روکنے لگی اور پھر ساحر اپنے چیچک زدہ چہرے کے داغوں کو سہلاتا ہوا اپنی سیٹ پر جھک گیا۔ اور اپنے ہاتھ ٹھوڑی پر رکھے ان نغموں کا ذکر کرنے لگا۔ جو اُس نے اپنے محبوب کے پیار کی خاطر لکھے تھے۔ وہ نغمے جنکی پنہائیوں میں اُس کی زندگی کی بہاروں کے سرچشمے اُبلتے تھے۔ اور جس کے زعفران رنگ کھیتوں میں اُس کی مست آرزوؤں کی مہک تھی۔ ہولے ہولے، آہستہ آہستہ، شرماتے ہوئے، مجرمانہ انداز میں وہ گا رہا تھا۔ گاڑی جتنی تیز تھی گیت اتنا ہی ہولے تھا۔ کہیں کوئی سُن نہ لے اُس کے پیار کا گیت۔ اس کی محبت کی شکست، اس کی زندگی کی موت لیکن کون اس وقت ساحر نہ تھا۔ یہ نغمے کس نے ہاؤ اووں نہ بیچے تھے۔ کس نے کیفی کی طرح اپنے سینے پر غم کی بھاری سِل نہ باندھی تھی جس کے بوجھ سے سینہ یوں چور چور ہو گیا تھا۔ کس نے غم جاناں کی منزل سے گذر کر غم...

کو اپنا یاد تھا کہ کون تھا جو زخمی ہو رہ چکا تھا۔ محروم نہ رہ چکا تھا۔ شکستہ دل نہ رہ چکا تھا.....

یکایک جگر نے آہستہ سے کہا۔ آہستہ سے جیسے وہ اپنے الفاظ کو چوم رہا ہو۔ "وہ ہر روز سٹیشن پر ملنے آیا کرتی تھی ......" پھر چپ ہو گیا — سب یادوں میں کھو گئے۔

کسی نے کچھ نہیں کہا۔ مگر شاید سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں آدمی ایک خاموش گویائی کے طلسم سے مجبور ہو کر داستاں بیان کر رہے تھے۔ اپنا نوحہ۔ اپنی مسرتیں۔ اپنی آرزوئیں۔ اپنی حسرتیں جو وہ تھے۔ جو وہ بننا چاہتے تھے، سپنے جو ادھورے رہ گئے۔ خوبصورتی جیسے ہونٹ چوم نہ سکے۔ کسی گم شدہ ماضی کی حسرت، کسی نامعلوم مستقبل کی آرزو اور پھر کشمکش حیات کا دہکتا ہوا شعلہ، تھا۔ اب بھی ہے۔ اب ہوگا۔ ضرور ہوگا...... ضرور......

سب یادوں میں کھو گئے۔ اور پھر آنکھیں بند کر کے سپنے دیکھنے لگے۔

(۹)

یکایک کرشن چندر کی آنکھ کھلی۔ گاڑی ایک چھوٹے سے سٹیشن پر کھڑی تھی۔ جگر صاحب بستر لپیٹ رہے تھے۔ اور سٹیشن پر جانے والے تھے۔ بستر لپیٹ کر انہوں نے سوئے ہوئے ادیبوں کی طرف دیکھا اور یکایک کرشن چندر پر اُن کی نظر پڑ گئی۔ اور جگر نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ کرشن چندر نے دیکھا کہ جگر رو رہے ہیں۔

"جگر" کرشن چندر نے کہا۔

جگر نے منہ موڑتے ہوئے کہا۔ "چھوٹی بہن مر گئی"

کسی نے کرشن چندر کا دل پکڑ لیا۔ وہ کچھ کہہ نہ سکا۔

"میری چھوٹی بہن مر گئی ہے۔ اب میں اُسے گاؤں سے لانے جا رہا ہوں۔ میں نے اُس کے علاج کیلئے دو سو روپے بچائے ہیں۔" اس کی آواز گھبرائی ہوئی تھی۔ اور اس کے لہجے میں نیم دیوانگی تھی۔

وہ چپ چاپ سٹیشن پر اتر گیا۔ پلیٹ فارم پر اُس کے عزیز کھڑے تھے۔ یکایک ایک سنہری وردی میں ملبوس اردلی وہاں سے گذرا۔ اس کے ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا۔ اور وہ سر سلطان احمد کے سپیشل سیلون کی جانب جا رہا تھا۔ جگر نے جلدی میں اُس سے ٹھوکر کھائی۔ اور تھوڑا سا دودھ چھلک کر باہر گیا۔

"دیکھ کر نہیں چلتے ہیں آپ؟" اردلی نے چنگھاڑ کر کہا۔

گاڑی نے سیٹی دی۔

جگر نے آنسو پونچھ کر کہا۔ "خدا حافظ"

کرشن چندر اُسے خدا حافظ بھی نہ کہہ سکا۔ گاڑی چلنے لگی۔

ساحر لدھیانوی کرشن چندر کے قریب سیٹ پر لیٹے تھے۔ کرشن چندر نے آہستہ سے کہا "ساحر — ساحر"

ساحر نے اُسی طرح لیٹے لیٹے کہا "میں خوب جانتا ہوں اس شخص کو — یہ ابراہیم جلیس کا بھائی ہے"

کرشن چندر نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا — "تم جانتے ہو اس کی چھوٹی بہن مر گئی ہے۔"

"ہاں میں سن رہا تھا" ساحر نے نپے تلے لہجے میں جو ہر قسم کے جذبات سے عاری معلوم ہوتا تھا کہا "میں جانتا ہوں۔ اس کی بہن مر گئی ہے۔ اس کی ایک ہی بہن تھی۔ سارے گھر میں اُسے وہی سب سے پیاری تھی۔ لیکن اتنی محبت کے باوجود وہ اُس کا علاج اب تک حیدرآباد میں نہ کرا سکا۔ کیونکہ اب تک وہ دو سو روپے اکٹھے نہ کر سکا تھا۔"

"مگر" — کرشن چندر نے کہنا چاہا۔ لیکن ساحر نے اُسے بولنے نہیں دیا۔

"اور جب اس نے دو سو روپے اکٹھے کر لئے تو یہ کانفرنس آ گئی اور اس نے یہ روپے کانفرنس کے لئے دیدیئے۔ اور اس نے گاؤں گاؤں گھوم کر مخدوم کے ساتھ ہر جگہ جا کر چندہ اکٹھا کیا۔ کسانوں سے۔ مزدوروں سے۔ طلباء سے۔ غریب لوگوں سے چندہ جمع کیا تاکہ کلچر زندہ رہے۔ اس کی بہن مر جائے۔ لیکن تہذیب زندہ رہے۔ تمدن زندہ رہے۔ فنکار کا خیال زندہ رہے۔ اس کی بہن اچھی خوراک اور مناسب دوا نہ ملنے سے سسک سسک کر جان دے دے۔ لیکن کتاب زندہ رہے۔ زبان زندہ رہے، قوم کی روح زندہ رہے۔ اس کی پیاری پیاری، املی کھانے والی، امرود توڑ توڑ کر چرا کر کھانے والی۔ اس کے بچپن کی ساتھی بہن مر جائے۔ لیکن کالیداس زندہ رہے، غالب زندہ رہے اقبال زندہ رہے۔ پریم چند زندہ رہے۔ موت اس کی بہن کے ہونٹوں کو یخ بستہ کر دے۔ اور اس کی آنکھوں کو بے نور کر دے لیکن زندگی اور اس کا زندہ ادب اپنے نور سے اور اپنی حرارت سے اور اپنے ایمان سے لاکھوں

دلوں کو روشن کر دے"

"مگر ..... "کرشن نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن ساحر اب بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔ بہت سے ادیب جاگ اٹھے تھے۔

"کانفرنس کامیاب رہی مگر اس کا ذہن مر گیا۔ کانفرنس کے دوران میں جگر کو اپنی بہن کی شدید علالت کے تین تار آئے۔ لیکن وہ اُسے ملنے نہیں گیا۔ چپ چاپ کانفرنس کا کام کرتا رہا۔ جب پہلا تار آیا تو اُس وقت تم اپنا مقالہ پڑھ رہے تھے۔ جب دوسرا تار آیا اُس وقت تم پریم چند۔ وحابیٹی کے مہمان بن کر ڈنر کھا رہے تھے۔ جب تیسرا تار آیا تھا۔ تم لوگ، راجہ شلعراج کے ہاں مدعو تھے۔"

"ساحر" کرشن چندر زور سے چلایا۔ جیسے کسی نے اس کے دل میں آہنی کیل گاڑ دی ہو۔ اور پھر جیسے اُس کیل سے لہو کی سرخ دھار پھوٹ نکلی کسی نے جان سے پیاری ہمشیرہ کی زندگی کا لہو دے کر ادب کو زندہ کر دیا تھا۔ لہو چاروں طرف بہہ رہا تھا۔ اور اس میں طلائی صراحیاں اور اخروٹ کے میز اور نقرئی پلنگ ڈوب رہے تھے۔ حریری پردے سرک گئے تھے۔ اور وہ دیوار ٹوٹ گئی تھی۔ جس نے انسان اور انسان کے مابین امتیاز پیدا کر دیا تھا۔ چاروں مینار سرنگوں تھے۔ اور تیز دوڑتی ہوئی سیاہ سیڈان سیاہ فام گھاٹیوں کے آگے سربسجود تھی۔ یہ لوگ اکیلے تھے کیسے تھے۔ احساس کمتری اور خود غرضی کے شکار تھے لیکن سب مل کے وہ جیسے کچھ اور ہو گئے تھے۔ کسی نئی ہمت، کسی نئی قوت، کسی نئی عظمت سے سرشار ہو گئے تھے۔ جیسے ملکے ان کی برائیاں دب گئی تھیں۔ اور اچھائیاں اُبھر آئی تھیں۔ ساحر اب چُپ تھا۔ لیکن اس کا سینہ کسی انجان طوفان سے رستاخیز تھا۔ اُس نے کنکھیوں سے اپنے رفیقوں کی طرف دیکھا۔ کوئی ایسا نہ تھا جس کی آنکھیں پُرنم نہ ہوں۔ نم اور دور۔ بہت دور جیسے وہ ماضی اور حال اور مستقبل کے پرے جا کر بھی کچھ تلاش کر رہی ہوں۔ کچھ ڈھونڈ رہی ہوں۔ کچھ پا رہی ہوں۔

وامق آہستہ سے گانے لگا۔

پورب دیس میں ڈگی باجے بھوکا ہے بنگال
بھوکا ہے بنگال
رے ساتھی

یہ بھوک کے بنگال کا گیت تھا۔ اداس دلوں کا گیت تھا۔ مرتی ہوئی روحوں کا گیت تھا۔ لیکن اس وقت نجانے اس گیت میں کونسی طاقت آگئی تھی۔ کہ یہ گیت موت کا گیت نہیں زندگی کا نغمہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کی لے میں اداسی کی جھلک نہیں اک کامران تبسم کی گونج تھی۔ اس کی پہنائی میں یاس و حسرت نہیں اک پُر امید للکار کی گونج سنائی دیتی تھی۔ جیسے اس گیت کا سویا سویا مدھم نوحہ کسی کے خون سے جاگ اُٹھا تھا۔ اور اک بے خطر لغاوتی طوفانی انداز میں کہہ رہا تھا۔

پورب دیس میں ڈگی باجے
ڈگ ... ڈگ .... ڈگ .... ڈگی باج رہی تھی۔ پورب دیس ہی میں نہیں۔ پورب۔ اُتر۔ دکھن۔ پچھم۔ ہندوستان کی چاروں کھونٹوں میں یہ ڈگی باج رہی تھی۔ ہندوستان کا وہ کون گوشہ ہے جو بنگال نہیں!

وامق کے گاتے گاتے یکایک وہ سب یکدم اکٹھے پوری قوت سے گانے لگے۔

پورب دیس میں ڈگی باجے بھوکا ہے بنگال رے ساتھی
بھوکا ہے بنگال
رے ساتھی

ساتھی۔ یہ ڈگی سن رے۔ یہ خطرے کی ڈگی ... اک غیر مختتم للکار۔
اک مبہم پکار۔ آؤ۔ آؤ۔ ساتھی

ساتھی جو بھوکے تھے ساتھی۔ جو بد قوت تھے، ساتھی جو جیل کی سختیوں کے آثار لئے ہوئے تھے۔ ساتھی جو لہتھڑی ہوئی ناکام آرزوؤں کے مزار تھے ساتھی جو درد کی تفسیر تھے اب یکایک اٹھ کر اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ اور اپنی روح کی پوری قوت سے گانے لگے۔ خود ہی گا رہے تھے اور خود ہی سن رہے تھے۔ اک نیا گیت، اک نیا خیال، اک نئی آواز، اک نیا تبسم جیسے ادھ کھلی کلی یکایک کچھ سوچ کے مسکرا اُٹھے ......

باہر گاڑی بھاگی جا رہی تھی۔ اندر سکون تھا۔ باہر چاروں طرف اند(ھیرا) تھا۔ لیکن گاڑی کے اندر روشنی تھی۔ باہر راستہ تاریک اور دشوار گزار تھا لیکن اندر منزل معلوم ہو چکی تھی۔

اختر حسین رائے پوری

کافرستان کی شہزادی!

(افغانستان کے مشرق کی طرف ایک علاقہ ہے جو پہلے کافرستان کہلاتا تھا۔ تھوڑی مدت ہوئی کہ یہاں کے باشندے مسلمان ہو گئے اور اب یہ صوبہ نورستان کہلانے لگا۔ اسی علاقہ کا ایک کونہ چترال ریاست میں دھنس آیا ہے اور وادیٔ بمبریت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے مجھے تین سال پہلے چترال جانے اور چند دن اس وادی میں گزارنے کا موقعہ ملا تھا۔ یہ افسانہ انہیں ایام کی یادگار ہے۔ افسانہ کے کردار اصلی مگر واقعات فرضی ہیں۔)

الاؤ کی آگ سسکتی سنسناتی اور تھمتی ہوئی اوپر لپکی اور اس کی چنگاریاں جگنوؤں کی طرح ہرے بھرے پیڑوں میں چمکنے اور بجھنے لگیں۔ جب لکڑی کے سب کندلے آگ کی گرفت میں آ گئے۔ تو ایک آتش مینار ننگے میدان کی کوکھ سے نکل کر تن گیا اور یوں بلند ہوتا گیا گویا زمین کے اندر سے کوئی اسے اوپر دھکیل رہا ہو۔ گھنے گھنے چناروں کے جھرمٹ کو چیر کر اس کی تمتمائی ہوئی آنچ دور دور پھیل گئی۔ اور اس سے بھی بہت دور اس نقارہ کی دھم دھم پھیلتی گئی جیسے دو نوجوان مارخور کے سینگوں سے پیٹ رہے تھے وہ ہندوکش کی اونچی اونچی چوٹیوں سے ٹکرا کر ہر طرف بکھر گئی۔ وہ چوٹیاں جو کافرستان کی اس حسین وادیٔ بمبریت کے چاروں طرف قلعہ کی طرح لپٹی ہوئی تھیں۔ پہاڑی نالا اپنے پانی کی صفائی پر اتراتا ہوا بے معنی شور مچاتا اپنی راہ بہا جا رہا تھا۔

برف پوش پہاڑ جن کی چوٹیوں نے دھوپ کا منہ کبھی نہ دیکھا تھا مگر چاندنی میں جاگ کر اپنے اردگرد لہلہاتی ہوئی بہار کو تھرائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے۔ بہار جس کا جادو رات کو بھی نہ سویا تھا۔ اور جس کے زور سے ہر پیڑ پودا رکے پیڑ اپنے کھردرے بدن میں سے نئی نئی کونپلیں نکال رہے تھے۔

الاؤ سے ہٹ کر چنار کے نیچے کمبل اوڑھے چپ چاپ بیٹھا ہوا بوڑھا ایسا لگتا تھا کہ اس نے شب قدر کی برفانی چوٹی پر یوں اٹکا ہوا پایا ہو یا اسے آسمان پر ٹانگ دیا گیا ہو۔ اور چھاگلوں کی جھنکار پر اسے جنگلی بلیوں کے ناچ کا گمان ہوا۔

ایک ایک دو دو کر کے کافر زن و مرد آتے گئے۔ اور ایک پہر رات بیتے ابھی خاصی بھیڑ لگ گئی۔ مرد اونی لبادہ میں ملبوس ہاتھ میں بلم یا بھالا لئے ہوئے۔ عورتوں کے لبادے کمر پر پٹکے سے کسے ہوئے اور ان کے سر اونی رومالوں سے ڈھکے ہوئے جن پر رنگ برنگے پتھر جڑے ہوئے تھے۔ گورے گورے پیر جنگلی مہندی سے خون ناب بڑی بڑی آنکھوں کے گرد سیاہ سا حلقہ جو بکرے کے سینگ کی لیپ سے بنایا گیا تھا۔ تندرستی اور جوانی سے ڈبڈبائے ہوئے جسم تنگ قباؤں میں تلملا رہے تھے۔ اور وہ سب اپنے جنگلوں کی پھول پتیوں کی طرح حسین اور معصوم تھیں۔

جب سب جمع ہو گئے تو ملک شاہ جو ان سب کا بزرگ اور جاہ و جلال میں کسی یہودی پیغمبر سے کم نہ تھا اٹھا اور ایک مشعل لئے ہوئے قبرستان کی طرف گیا جو اس میدان کے پاس ہی تھا۔ عورتیں منہ موڑ کر ایک کونے میں کھڑی ہو گئیں اور مردوں نے نقارے کی چوب پر ہو ہو کا نعرہ بلند کیا۔ عورتوں نے دھیمے سروں اور یکساں آواز میں کوئی گیت شروع کیا۔ ذرا دیر میں ملک شاہ لکڑی کا ایک بت کاندھے پر اٹھائے ہوئے آیا اور اس بت کو دیکھتے ہی سب زن و مرد سجدہ میں گر پڑے مرد ہوا میں بلم ہلاتے ہوئے ہو ہو کرتے آگ کا طواف کرنے لگے اور عورتوں نے اپنے گیت کی لے تیز کر دی۔ وہ بت جس کا نام ایشان تھا چنار کے تنے کا ٹیکا لگا کر بٹھلا دیا گیا۔

یک بیک چھاگلوں کے گھنگرو ایک ساتھ مرتعش ہوئے سارے بلم بجلیوں کی طرح ہوا میں لپکے۔ نقارہ جلدی جلدی غضب ناک اژدھے کی طرح سانس لینے لگا۔ الاؤ کے چاروں طرف مردوں کے

پیر دھما دھم زمین کو کوٹنے لگے۔ لیکن عورتوں نے آہستہ سے زمین کو ٹھوکر لگائی گویا اس کا بوسہ لے رہی ہوں۔ ... بوڑھوں نے جو ایشان دیوتا کے پجاری معلوم ہوتے تھے۔ جھوم جھوم کر ایک ترانہ گانا شروع کیا۔ دیکھتے دیکھتے ان سب نے اپنے اوپر ایک ایسی وجدانی اور ہیجانی کیفیت طاری کر لی گویا وہ ابھی اپنی قدیم روایت کی تجدید کر کے انسانوں کو آگ میں زندہ جلا دینگے اور پھر ان کی کھوپڑیوں کے ہار بنا کر پہن لیں گے۔ ذرا دیر کے لئے مسافر مبہوت رہ گیا۔ اور اسے یقین نہ آیا کہ وہ افغانستان کی سرحد پر مہذب دنیا سے کالے کوسوں دور ان وحشی کافروں کا مہمان ہے۔ جو ناچنے والا تھا۔ جب تک وہ گھڑی بھر کے لئے دیوتا کے آگے زمین بوس ہوتا۔ اور پھولوں کی شراب کی مشک میں منہ لگا کر دوبارہ اس ہنگامہ میں شامل ہو جاتا تھا۔ رقص کی لے کے ساتھ ساتھ آگ کی لو بھڑکتی گئی اور ہو ہو کے وحشیانہ نعرے پہاڑوں سے ٹکرا کر شور قیامت کی طرح فضا میں گونج اٹھے۔

مسافر مشرق و مغرب کے بہت سے ناچ دیکھ چکا تھا۔ لیکن کسی ناچ میں اس نے یہ وارفتگی، یہ قوت اور یہ وحشیانہ مسرت نہ دیکھی تھی۔ وہ سب بہار کے دیوتا ایشان کے اشارہ پر مرنے مارنے کو تیار تھے۔ اور ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنے جذبہ عقیدت کو کس طرح ظاہر کریں۔ رات میں ٹھنڈ سمائی ہوئی تھی لیکن وہ سب پسینہ میں شرابور تھے۔ اور لڑکیوں کے دلربا چہروں پر گویا موتیوں کی جھالر لٹکی ہوئی تھی۔

ملک شاہ نے مسافر کو بتایا کہ یہ دیوتاؤں کا ملک ہے کوئی کہتا ہے کہ کافر سکندر اعظم کے بچھڑے ہوئے سپاہیوں کی اولاد ہیں اور کوئی انہیں قدیم آریاؤں کا نام لیوا بتاتا ہے لیکن دراصل وہ دیوتاؤں کے ... ہیں۔ ... وہ ... بستے ہیں۔ انہوں نے تاریخ کی ... افغانوں کے قبیلوں کو گذرتے دیکھا ہے۔ بڑی بڑی سلطنتوں اور تہذیبوں کو بنتے بگڑتے دیکھا ہے۔ لیکن ان انقلابوں کا ان پر اتنا ہی کم اثر ہوا جتنا ان پہاڑوں پر۔

اس گفتگو کے دوران میں ایک دوشیزہ صف سے نکل کر ایشان دیوتا کے آگے آ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے زمین کی مٹی اٹھا کر آنکھوں پر لگائی پھر تالی بجا کر ہاتھ ہوا میں پھیلا دئے۔ اور سارے مجمع کی تالیوں کی گونج پر اس نے ناچنا شروع کیا۔ وہ اپنے دیوتا کو رجھانے کے لئے ناچ رہی تھی۔ اور اس کا ناچ گویا قدرت کا خاموش شکریہ تھا کہ اسے حسین بنایا۔ گردن سے لیکر ٹخنے تک اس کا جسم ایک لبادہ میں چھپا ہوا تھا لیکن ناچ کے دوران میں وہ یوں مچلا گویا ابھی عریاں ہو جائے گا۔ اور پھلوں میں چھپی ہوئی اس کی انگلیاں تیروں کی نوک کی طرح ہوا میں تھرتھرائیں۔ اس کے سڈول پیر کبھی ڈگمگائے کبھی تھرکے اور کبھی کسمسائے۔ اپنی چوٹی میں سے اس نے سرخ پھولوں کا ایک گچھا نکالا۔ اور اسے ہتھیلی میں لئے دیوتا کی نذر کو چلی۔ آہستہ آہستہ اس کے قدم اٹھے پائلوں نے ہیبت کے مارے سانس روک لیا۔ لیکن پھول بت کے آگے رکھ کر وہ خوشی سے اچھلی اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ اور وہ پھرتی سے ہاتھ پاؤں یوں نچانے لگی گویا تتلی کی طرح ابھی اڑ جائے گی۔ اور اسی وقت ایک خوش رو نوجوان بلم ہلاتا ہوا اس کی طرف لپکا۔ اپنے سر اور بازوؤں کو اس نے ہری بھری ٹہنیوں سے ڈھک رکھا تھا۔ اسکے پر وقار انداز سے مسافر سمجھ گیا کہ یہ ایشان دیوتا کا پارٹ ادا کر رہا ہے اب دونوں گل بہنیاں کر کے ایک گت پر مزے میں ناچنے لگے اور سب نے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ان کا گھیرا کر لیا۔

مسافر کے رہنما ملنگ نے چپکے سے کہا۔ جانتے ہو یہ جام ثروہ (حسینہ) کون ہے؟ یہ ملک شاہ کی نواسی گلون ہے۔ اس بہار میں وہ بالغ ہوئی ہے اور اپنی جوانی کا صدقہ اتارنے کے لئے ناچ رہی ہے۔ لیکن اس کا ساتھی ملک شاہ کے دشمن نامدار کا غلام گاش ہے۔ صدیوں سے گاش کا گھرانہ نامدار کے گھر غلامی کرتا آیا ہے۔ یہ دل میں لاکھ ایک دوسرے کو چاہیں لیکن سب کے دیکھتے انہیں اس محبت کا اظہار نہ کرنا چاہیئے۔

ملنگ وادئ بمبیرت کا فلسفی تھا۔ اپنے کانوں میں ... ململ کا پھٹا ہوا شلوکہ پہنے پرانی وضع کی بندوق بارود کے ... پیٹھ پر لادے وہ ایک عجیب و غریب شخصیت کا مالک تھا۔ وہ ... کا بھاٹ، سرپنچ اور مشیر سب کچھ تھا۔ اب بہار میں جب کافر ... چرانے کے لئے جنگلوں میں چھوڑ دیں گے تو ملنگ ان کی حفاظت کرے گا۔ بمبیرت اور افغانستان کے درمیان ... کے سوا اور کوئی ... اور اکثر افغان ... کو پکڑ لے جاتے تھے۔

ب نوز نے وہ ملنگ سے ان کی مڈبھیڑ ہوا کرتی تھی۔

ملنگ کی چلم میں گانجا تھا یا چرس یا تمباکو۔ مسافر کے لئے یہ معلوم کرنا مشکل تھا۔ لیکن ملنگ تابڑ توڑ اس کے کش لگا رہا تھا اور کھانستے ہوئے بیچ بیچ میں اپنی لال لال آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے پانی کو میلی آستینوں سے پونچھ پونچھ کر مسافر سے کہنے لگا "یہ کمبخت گاش آپ اپنی جان کا لاگو ہے۔ ملک شاہ کافروں کا پجاری ہے۔ اس کی نواسی سے یہ غلام زادہ شادی نہیں کر سکتا جب تک کوئی دس گھوڑے پچاس گائیں اور سو بکریاں نہ لائے گلون سے بیاہ کیسے کر سکتا ہے۔ لیکن گاش کے سوا کوئی اس چھوکری کی آنکھوں میں جچتا بھی تو نہیں۔ نوروز کو وادی کی سب جوان لڑکیاں مارا دیوتا کے مندر کے آگے آ بیٹھتی ہیں۔ کنوارے آتے ہیں اور جو جسے پسند ہو اپنی جائداد کی تفصیل سناتے ہیں۔ یہاں سونے روپے کی کوئی قدر نہیں زمین اور مویشی ہی اصل جائداد ہے۔ اگر کوئی لڑکی کسی کا ہاتھ پکڑ لے تو سمجھو کہ منگنی ہو گئی پچھلے نوروز کو کئی کنوارے گلون سے شادی کرنے کو آئے۔ مگر اس نے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اسے تو گاش کے سوا کوئی بھاتا ہی نہیں۔"

ملنگ ٹھیک کہتا تھا۔ کیونکہ وہ دونوں سدھ بدھ بھول کر یوں ناچ رہے تھے گویا وہاں اور کوئی تھا ہی نہیں۔ ان کی آنکھیں باتیں کر رہی تھیں اور ان کے جسم ایک دوسرے کی پیاس میں تڑپ رہے تھے۔ لیکن اور سب کی آنکھوں میں غصہ جھلک رہا تھا۔ دیوتا اور مہمان کی موجودگی کی وجہ سے وہ مجبوراً خاموش تھے۔

بہت رات بیتے وہ ناچ ختم ہوا۔ اور مسافر اپنی چارپائی پر لیٹے لیٹے کان سے اس دامی گیت کے اس بول کو نکال پھینکنے کی ناکام کوشش کرتا رہا جس کا مطلب تھا۔ کہ "ہائے بہار بھی نہ رہے گی اور مسافر بھی چلا جائے گا"

رقص کے دوران میں وہ ٹکٹکی باندھے گلون کو تاکتا رہا تھا۔ رقص کے دوران میں وہ کبھی پھول کی طرح کھلی کبھی ناگن کی طرح لہرائی کبھی اس پہاڑی ندی کی طرح گنگنائی۔ اور مسافر اسے دیکھتا رہا دیکھتا رہا۔ گلون نے بھی ایک نگاہ [illegible] دیکھا تھا۔ اپنی سہیلی ممکی کو [illegible] وہ مسکرائی تھی [illegible] انگلیوں کے بیچ سے دیدے دکھا کر مسیتی کا اشارہ بھی کیا تھا۔

ملنگ نے مسافر کو جھنجھوڑا تو اس کی آنکھ کھلی۔ دھوپ پھیل چکی تھی اور ملنگ کے ٹوٹے ہوئے دانتوں میں ہنسی پھیل رہی تھی کھیل چکے تم مارخور کا شکار۔ اٹھو بہت سو چکے۔" ایک لمحہ مسافر کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کہاں تھا کسی کافر کے مکان کی بالائی منزل میں وہ ٹھہرایا گیا تھا کہ جس کے بیچ ایک جھلا جو بیک وقت انگیٹھی تندور اور لیمپ کا کام دیتا تھا۔ اور نیچے اترنے کے لئے لکڑی کی اٹھاؤ سیڑھی جو بوقت ضرورت اوپر کھینچی جا سکتی تھی تاکہ مکین دشمنوں یا ڈاکوؤں سے محفوظ رہیں۔

عورتیں گھروں یا کھیتوں میں کام کر رہی تھیں اور مرد شکار کھیلنے پھل توڑنے یا شہد جمع کرنے باہر نکل گئے تھے۔ رات کو جب یہ لوٹیں گے تو عورتیں پاؤں دھلا کر انہیں کھانا دیں گی لیکن شہد گھی اور پنیر کو خود ہاتھ نہ لگائیں گی۔ یہ نعمتیں صرف مرد کے لئے مخصوص ہیں کیونکہ اسی کی ذات پاک دیوتاؤں کی مظہر ہے۔

مسافر کی آنکھیں ادھر ادھر کسی کو ڈھونڈتی رہیں۔ اس نے ایک کرب سی محسوس کی جس میں درد کا شائبہ بھی نہیں مگر خفیف سا احساس ضرور تھا اور چلتے چلتے اس نے گاش کو دیکھا جو ایک آنگن میں بیٹھا مٹی کے برتن بنا رہا تھا۔ کس پھرتی سے وہ گیلی مٹی کے برتنوں کو اپنے ہاتھ میں نچا تا اور پھر ان سے پیالی یا صراحی بنا کر دھوپ میں رکھتا جا تا تھا۔ مسافر کو دیکھ کر اس کی روشن آنکھیں مسکرائیں۔ اور وہ رات کی بچھڑی ہوئی محبت کی یاد میں گم ہو گیا۔

ملنگ تیز قدم چل رہا تھا۔ اور چلتے چلتے کبھی پتوں پر پڑی ہوئی اوس کو غور سے دیکھ کر کہتا کہ ادھر سے لومڑی گئی ہے۔ اور کبھی ٹیلوں پر بنی ہوئی قبروں کی طرف اشارہ کر کے کہتا کہ ان میں ہمارے اجداد سو رہے ہیں۔ جب کوئی کافر مرتا ہے تو لاش کے ساتھ اس کے کپڑے زیور اور گہنے دفن کر دیتے ہیں۔ پہلے تو کوئی انہیں ہاتھ بھی نہ لگاتا تھا لیکن جب سے لال کافر مسلمان ہوئے ہیں یہ قبریں محفوظ نہیں ہیں۔

ملنگ مارخور کی دھن میں ایک سوکھے ہوئے نالے کے پتھروں پر اچھلتا کودتا چلا جاتا تھا۔ پھر کسی چیز کا خیال آتے ہی وہ بولا۔ مسافر بابو

جمیں ایسا مارخور ملے جس کی ناف میں منکا چھپا ہوا ہو۔ منکا الفی تک کے زہر کو پل بھر میں چوس لیتا ہے۔ اسے دکھلا کر تو راجہ کی بیٹی کو بھی موہ سکتا ہے۔"

یک بیک اس کی آنکھوں میں شرارت آئی اور وہ خود بخود کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ رات کو میں تیری آنکھوں کو تاڑ رہا تھا۔ گلون کو تو نے پسند کیا کیوں؟ ہاں؟"

افروٹ کے پیڑ کی چھاؤں میں دونوں بیٹھ گئے۔ مسافر نے سگریٹ اور ملنگ نے چلم سلگائی۔ ملنگ کہنے لگا "اس میں کوئی ہرج نہیں۔ مہمان ہماری بیٹی کو پسند کر لے تو اس میں ہماری عزت ہے۔ دس گھوڑوں پچاس گایوں اور سو بکریوں کے دام یہاں پھر سات سو روپے سے زیادہ نہ ہونگے۔ تو گلون کو بیاہ کر یہیں بس جا۔ تجھے ہم مفت میں یہ جنگل اور پہاڑ دے دینگے۔" اس نے دوبارہ شریر نگاہوں سے مسافر کو گھورا۔

"نہیں ملنگ۔ گلون اور اس کا دیس حسین سہی۔ مگر نہ میں انکے لئے ہوں اور نہ وہ میرے لئے۔"

ملنگ لوہا لینے کے لئے جھوٹ موٹ جھنجلا کر بولا۔ "ہوں۔ میں جانتا ہوں نہ تیرا دیس ایسا حسین ہے اور نہ وہاں گلون جیسی عورتیں ملتی ہیں۔"

ملنگ اسے چھیڑتا گیا۔ "پشاور تک تو میں بھی جا چکا ہوں میں جانتا ہوں کہ تو اونچے مکانوں اور صاف سڑکوں کو پسند کرتا ہے۔ لیکن کیا ان کے ساتھ گندی گلیاں اور تنگ جھونپڑیاں نہیں ہیں۔ تیرے دیس میں عورتیں یا تو شادی کر کے پردہ کی اوٹ میں بچے جنا کرتی ہیں اور یا دام لے کر یلبلے دام طوائفیں بن جاتی ہیں۔ تو ہماری بیٹیوں کے مرتبہ کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

مسافر کی خاموشی کے باوجود ملنگ سمجھ گیا کہ اس کے دل میں کیا ہے وہ ان کافروں کو وحشی سمجھتا ہے ان کے رسوم پر ہنستا ہے۔ انکی رہن سہن کو حقارت سے دیکھتا ہے۔ اس احساس سے ملنگ کے باطن میں سوئی ہوئی سینکڑوں دیوتاؤں کی ہزاروں سال پرانی روح بھر پڑی اور وہ معہ احل بگڑ کر بولا۔ تجھے اپنی ریلوں موٹروں اور ہوائی جہازوں کا گھمنڈ ہے۔ انہیں دیکھے بغیر تو زندہ نہیں رہ سکتا۔ پہاڑوں ندیوں اور جنگلوں سے دور تجھے

زیادہ بھلے لگتے ہیں۔ انہیں تو اپنی تہذیب اور تمدن سے تعبیر کرتا ہے۔ اور یہ تو کہہ کہ اس ترقی کی قیمت تو کس طرح ادا کرتا ہے۔ ایوان کے پوسٹ ما کے پاس ایک اخبار آتا ہے۔ ہر مہینہ میں نمک اور چائے خریدنے وہاں جاتا ہوں تو وہ اخبار پڑھکر مجھے سناتا ہے۔ اس میں لڑائی قحط گداگری اور بیکاری کی خبروں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن تیری روح ایسی خبیث ہے کہ انکے تماشے بغیر اسے سکون نہیں مل سکتا۔"

ملنگ ابھی جانے کیا کیا کہتا لیکن اسی وقت داہنی طرف سرسراہٹ سی ہوئی دونوں ایک پیڑ کی آڑ میں دبک گئے اور انہوں نے دیکھا کہ ایک چٹان پر کھر جوڑے ایک مارخور کھڑا ہوا ہے۔ اسکے پرپیچ اور لمبے لمبے سینگ بڑے بھلے لگتے ہیں اور وہ اپنی بھری بھری گردن اٹھائے سورج کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اپنی ریشمی ڈاڑھی کو وہ رہ رہ کر ہلاتا ہے۔ گویا منبر پر کھڑا وعظ دے رہا ہو۔ اور اسکے حساس نتھنے پھڑک پھڑک کر اسے فضا کی ہر تبدیلی کی خبر دے رہے ہیں۔ مسافر کی انگلی بندوق کی لبلبی کی طرف بڑھی۔ مگر مارخور اچانک ایک چٹان سے اچھل کر دوسری پر اور وہاں سے تیسری پر پہنچا۔ وہ اسی طرح چٹانوں پہ چوکڑیاں بھرتا گیا۔ اور جب بندوق دغی تو حیرانی سے ایک بار پیچھے دیکھکر پہاڑ کی ایک دراڑ میں گھسا اور غائب ہوگیا۔ کچھ دیر گولی کی آواز کبھی یہاں اور کبھی وہاں گونجی۔ مینڈھوں نے کرید رنگی کرخت صدائیں بلند کر کے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اور ایک دو شاہین اپنے گھونسلوں کو چھوڑ کر ہوا میں اڑنے لگے۔

× × ×

لوٹتے وقت مسافر نے گلون کو دیکھا۔ وہ چراگاہ میں بیٹھی ہوئی ہنے کتے کے بالوں میں پنسو ٹٹول رہی تھی۔ کتے نے اس کی انگلیوں کے مس کی لذت کو بخوبی دل نشین کرنے کی غرض سے آنکھیں بند کر لی تھیں کبھی کبھی اس کی کھال سکڑ جاتی۔ اور اس کی دھیمی دھیمی غراہٹ میں مسرت کا اظہار تھا۔ بکریاں اور گائیں ادھر ادھر چر رہی تھیں۔ اور بیچ بیچ میں وہ گلون کی طرف اطمینان کرنے کے لئے دیکھ لیتی تھیں۔ کہ وہ اپنی جگہ پر ہے یا نہیں۔

مسافر سے اس کی آنکھیں چار ہوئیں اور وہ ہونٹوں پر غیر محسوس سی مسکراہٹ لاکر ایڑیوں سے گھاس کے تنکوں کو لوٹنے لگی۔

اس نے اپنی بولی میں سلام کیا اور اس کی چھیڑ چھاڑ کا جواب ایک میٹھی جھڑکی میں دیا۔ مسافر نے اسکی جھکی ہوئی چتونوں کو اپنے قدموں کا تعاقب کرتے پایا اور اس احساس سے اس کی ٹانگوں میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔

پہاڑی نالے کے ٹھنڈے پانی کو انگلیوں سے ٹھوکتے ہوئے وہ سوچ میں پڑ گیا کیسی عجیب بات ہے کہ وہ اس وادی کو ایک خواب سمجھتا ہے۔ وہ اس میں سے گذر کر پھر اپنی تنگ اور تاریک دنیا میں چلا جانا چاہتا ہے۔ جہاں بدصورتی اور ریاکاری کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ کیا کثافت اور غلاظت میں بھی کوئی لذت ہوتی ہے جو زہر کی طرح انسان کے رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے اور وہ گوبریلوں اور تل بیٹوں کی طرح اسی مٹی میں اگتا اور اسی میں زندہ رہ سکتا ہے۔ کیا اذیت پسندی اس نام نہاد تہذیب کا ایک لازمی حصہ ہے۔ اور جب تک ہم جسمانی اور روحانی ہلاکت کا نظارہ نہ کریں ہمیں چین نہیں مل سکتا۔ اگر ایسا نہیں ہے تو مسافر کو اس وادی میں بسنے کا خیال ناگوار کیوں ہے۔ وہ اپنی ذہنی کیفیت کے تجزیہ کی کوشش کرنے لگا۔ بچپن میں جنگل کا راجہ بننے اور جنگل کی پری سے عشق کرنے کا خیال کسقدر دلچسپ تھا لیکن آج وہ خیال ممکن الحصول تھا۔ تو وہ جھجک کیوں رہا تھا۔ اس مہذب دنیا سے اسے لینا کیا تھا انسانوں سے دکھ درد کے سوا اسے ملا کیا تھا۔ وہاں کی روٹیوں میں جسمانی اور اخلاقی امراض کے جراثیم تھے۔ اور وہ سب اسیر تھے۔ آپ اپنی خودی کے اسیر۔

ممکن ہے یہی بات ہو۔ اور یا یہ ہو کہ مسافر محض بظاہر ان کا فرون کا سا آدمی تھا۔ دراصل ان کے مابین دو ہزار سال کا فرق تھا۔ یہ فرق حواس کو محسوس نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ وقت کی روانی کو محسوس کرنے کی صلاحیت حواس میں نہیں۔ البتہ حواس سے پرے جسم کے نہ خانوں میں مدفون نامعلوم طاقتیں وقت کے اسرار سے واقف ہیں۔

مسافر صرف یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ ان سے مختلف ہے۔ وہ گلون کے ساتھ ہمیشہ نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ اگر گلون کی عمر سولہ سال ہے تو اسکی اپنی عمر دو ہزار سولہ سال! اور نہ وہ ان پہاڑوں میں رہ سکتا ہے کیونکہ اگر اسکی اپنی عمر تیس سال ہے تو انکی دو لاکھ تیس سال۔

* * *

کل صبح مسافر واپس چلا جائے گا۔ ابھی ابھی اس نے اپنے میزبانوں سے رخصت لی ہے اور ان کی مہربانی کا شکریہ انگوٹھیوں، بٹوؤں اور رنگین رومالوں کی صورت میں ادا کیا ہے۔ اپنا سامان بند کرتے ہوئے وہ سوچتا ہے کہ ان کا بوجھ زیادہ تھا یا میرے دل کا۔

گلون کی تصویر وہ اپنے دماغ سے نہیں نکال سکتا لیکن وہ اسے اس سرزمین سے الگ بھی نہیں کرنا چاہتا۔ وہ تازندگی اس خیال سے اطمینان حاصل کرنا چاہتا ہے۔ کہ وہ سدا بہار پھول کی طرح اپنی وادی میں مہک رہی ہے اور کسی مشاطہ نے اسکے گیسو نہیں سنوارے ہیں۔ وقت اگر کہیں ملے تو اس سے وہ کہنا چاہتا ہے کہ مرتے دم تک اسے جوان رہنے دے۔

چارپائی پر بیٹھے بیٹھے وہ سوچتا ہے کہ جب موم بتی خود بخود بجھ جائیگی تو میں لیٹ جاؤنگا۔ اور عین اس وقت جب موم بتی کی لو بھڑک کر بجھنے کے قریب ہوتی ہے دروازہ اپنی چول پہ چرچراتا ہے۔ ملنگ ہانپتا ہوا چوکھٹ پر کھڑا ہے۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔

"مسافر" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "وہ لوگ گاش کو قتل کر رہے ہیں۔" مسافر اچھل پڑا۔ اور اسی وقت موم بتی بجھ گئی۔

"شام کو وہ گلون سے ملنے کھیت پر گیا۔ سلمٰی اپنے دوستوں کے ساتھ ان دونوں کی تاک میں تھا۔ دونوں پکڑے گئے۔ اب قبرستان کے سامنے مارا دیوتا کے حضور میں پنچایت اسے مروا دینے کے لئے جمع ہوئی ہے۔"

مسافر کے جسم کا لہو خشک ہو گیا۔ اور اس کے ہر روئیں نے پکار کر کہا کہ بھاگو۔ ملنگ نے اسکا بازو پکڑ لیا۔ "مسافر تو گاش کی جان بچا سکتا ہے۔" اور مسافر کو وہ باہر کی طرف کھینچنے لگا۔

قبرستان کے مقابل چناروں کے جھرمٹ میں آگ جل رہی تھی لیکن اسمیں کل رات کا سا جوش و خروش نہ تھا۔ اداس اداس اور بجھی بجھی سی آگ۔ اسکی پھیکی سی روشنی مارا دیوتا کے اونچے پورے چوبی بت پر پڑ رہی تھی۔ جو قبرستان کے پھاٹک پر مُردوں کی حفاظت کر رہا تھا۔ اس کے روبرو بوڑھے کافر ادب سے دوزانو بیٹھے ہوئے تھے بیچ میں ایک شہتیر نصب تھا جس سے گاش بندھا ہوا تھا۔ پاس ایک زخمی بکرا پڑا ہوا دہشت انگیز آواز میں کراہ رہا تھا معلوم ہوتا تھا اسے گھائل

کرکے چھوڑ دیا گیا تھا۔ بیچ بیچ میں گلون کا ناکام عاشق سلمی زمین سے چلو بھر خون اٹھا کر کاش پر چھڑک دیتا تھا۔ مارادیوتا کے آگے گلون اور سلمی لیٹی ہوئی تھی اور جب بکرے کی چیخ بند ہو جاتی تو گلون کی سسکیوں کی آواز سنائی دینے لگتی تھی۔

ذرا دور پر ملنگ نے مسافر کو روکا اور کہا "یہ ناچ ہماری رسم ہے۔ کوئی غیر اس میں شامل نہیں ہو سکتا۔ تو بھی چھپ کر تماشہ دیکھ۔ اور جب ملک شاہ دیوتا کو مخاطب کرے تو اس کے پاس جا اور کاش کی جان کی امان مانگ۔"

دیر تک بکرا تڑپتا اور کراہتا رہا۔ سلمی اس کے خون کے چھینٹے کاش پر چھڑکتا رہا۔ گلون خاموش ہو گئی اور عجب نہیں کہ اس نے تھکے ہوئے بدن کو ایسی حالت میں نیند آ گئی ہو۔ ملک شاہ زیرِ لب کوئی دعا یا منت جپتا رہا۔ اتنے میں بکرا آخری بار چلایا اور تڑپ کر مر گیا۔ اسی وقت سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور مارا مارا کی صداؤں سے ہوا تھرا اٹھی۔ سلمی کسی پیڑ کی اوٹ میں چھپی ہوئی کھوپڑیوں کی مالا اٹھا لایا ۔۔۔ وہ کھوپڑیاں جو اس کے اجداد نے دشمنوں کے مردہ اجسام میں سے نکالی تھیں۔ یہ ہار گلے میں ڈال کر سلمی نیزہ ہلاتے ہوئے کاش کی طرف جھپٹا اور پھر دیوانہ وار مرگھٹ کے بھوت کی طرح ناچنے لگا۔ اس کے نیزے کے اشارہ پر کبھی گلون ڈر کے مارے چلاتی اور ایک آدھ مرتبہ تو کاش بھی زخمی بکرے کی طرح چیخ پڑا۔ باقی سب لوگ ہو ہو ہو اور مارا مارا کی آواز پر گویا اس ناچ پر تال دینے لگے۔

مسافر اس خیال سے سہم گیا کہ کہیں نیزہ کاش کے بدن میں چبھ نہ جائے لیکن ملنگ نے اسے تسلی دی۔ ابھی ملک شاہ نے مارا دیوتا کی اجازت نہیں لی ہے ملنگ نے سمجھایا کہ ان کا جرم بڑا سنگین ہے۔ ایک تو منگنی سے پہلے ان کا نہانا ہے، ملنا پھر دوسرے قبیلے کی لڑکی اور یہ غلام زادہ۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے اپنی وعدہ گاہ عین اس مقام کو بنایا جہاں مارا دیوتا ان کے گناہ دیکھ سکتا تھا۔

ملک شاہ کے ہاتھ اٹھاتے ہی رقص بند ہو گیا۔ اور موت کا سا سناٹا چھا گیا۔ ابھی ملک شاہ اپنے دیوتا سے مخاطب ہوا ہی تھا کہ اسے کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ وہ چونک پڑا اور حیرانی سے ملنگ سے پوچھا کہ مہمان چاہتا کیا ہے۔

مہمان نے مارا دیوتا کے قدموں کی خاک اٹھا کر آنکھوں کو لگائی اور گلون کی ملتجی نگاہوں نے اس کے کانپتے ہوئے دل کو ہمت دی۔

وہ بولا "کل میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ اور میرا دیس اتنا دور ہے۔ کہ شاید پھر کبھی نہ آسکوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان چند دنوں کی یاد میرے دل میں ہمیشہ رہے۔ اور اس یاد میں صرف احسان اور مسرت ہو ۔۔۔ غم کی کوئی کھٹک نہ ہو" ۔۔۔ وہ جانتا تھا کہ آخری الفاظ جھوٹ ہیں کیونکہ جس مسرت میں غم کی جھلک نہ ہو وہ یاد کیسے رہ سکتی ہے۔ ملک شاہ نے جواب دیا "ملنگ مہمان سے پوچھو کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ مہمان کی خوشنودی ہمارے مذہب کا آئین ہے۔"

"میں چاہتا ہوں کہ کاش کی جان بخشی دی جائے۔"

ہر شخص اپنی اپنی جگہ بھنا اٹھا۔ اور ان کی بھن بھناہٹ میں مخالفت صاف عیاں تھی لیکن ملک شاہ کے حکم سے سب خاموش ہو گئے۔ اور وہ دیوتا کے آگے جھوم جھوم کر اپنی زبان میں دیر تک کچھ کہتا رہا۔ کبھی وہ اپنے کان دیوتا کے لبوں کی طرف لاتا گویا اس کی آواز سن رہا ہو کبھی اس کی منت کرتا کبھی چپ ہو جاتا۔ آخر کار وہ اٹھ کھڑا ہوا اور سب لوگ دوبارہ مارا مارا کہتے ہوئے سجدہ ریز ہو گئے۔

ملک شاہ نے پیغمبرانہ شان سے ہر لفظ تول تول کر کہنا شروع کیا۔ "اس غلام کی سزا موت کے سوا کچھ نہیں ۔۔۔ لیکن ۔۔۔ اس لیکن پر سلمی اور اس کے حامیوں کے چہرے اتر گئے ۔۔۔ لیکن مہمان نے اپنے قیام کے دوران میں صرف ایک خواہش ظاہر کی ہے۔ اور اسے رد کرنا ہمارے آئین کے خلاف ہے۔"

ملنگ نے خوشی کا نعرہ لگایا اور جلدی جلدی کاش کے بند کھولنے لگا۔ "ٹھہرو" ملک شاہ کی بوڑھی آواز کڑکی۔ "کاش آئندہ ہماری وادی میں نہ رہ سکیگا۔ مہمان قیمت ادا کر کے اسے خرید لے پھر چاہے اسے چھوڑ دے یا پاس رکھے۔"

کاش کو زہر آلود نگاہوں سے اس نے گھور کر تاکید کی "اگر تم نے کبھی اس وادی میں قدم رکھنے کی جرأت بھی کی تو یاد رکھو کہ مارا دیوتا کے ۔۔۔ میں زندہ چن دیئے جاؤ گے۔"

پھر اس نے سرد مہری سے گلون کی طرف دیکھا جو ۔۔۔ کی طرح اب تک زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ بوڑھے کے اشارے پر ۔۔۔ کسی نے اس پر ۔۔۔ وقت تھی۔

"مگر تو سلمی سے بیاہ کر لے تو دیوتا تیرے گناہوں کو معاف کر دیں گے"
گلوں کا آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ پتھر کی طرح سخت پڑ گیا اور اس نے سر کی جنبش سے انکار کر دیا۔
"کاش کے علاوہ تجھے اور کوئی کافر پسند ہے؟"
گلوں کے منہ سے صاف آواز نکلی "نہیں"
"تو جانتی ہے کہ دیوتا کے آگے انکار کرنے کے بعد تو عمر بھر کسی مرد کے ساتھ نہ رہ سکے گی؟"
گلوں کی گردن نے اشارہ کیا کہ ہاں میں انجام کو جانتی ہوں۔
"تو پھر مجھے کچھ نہیں کہنا ہے"
دفعتاً ملنگ نے جھک کر ملک شاہ کے کان میں کچھ کہا اور بڈھے نے ذرا حیرت سے مہمان کو گھور کر لڑکی سے سوال کیا "مہمان اگر یہیں رہ جائے تو تو اسے پسند کرے گی؟"

مسافر کا دل بلیوں اچھل پڑا۔ اور اسے ایسا لگا کہ یہ لمحہ ہزاروں سال کی دوری طے کر رہا ہے۔ اور اس کی روح میں پنہاں تہذیب کی زنجیریں یوں منتشر ہو رہی ہیں جیسے زلزلہ میں سینکڑوں ہزاروں سال پرانی عمارتیں ایک آن میں برباد ہو جاتی ہیں۔ اور وہ حیران رہ گیا کہ اپنی قسمت کا وہ آپ مختار نہیں۔ بلکہ اس کی ملکہ یہ لڑکی ہے جو ابھی لکڑی کے ایک بے زبان بت کے آگے سجدہ میں پڑی سسک رہی تھی۔

گلوں نے گھڑی بھر مسافر کو اداسی سے دیکھا۔ اسکی معصوم آنکھوں نے اجنبی سے کچھ پوچھا۔

مگر اس کی گردن دائیں بائیں ہلی —— اور اس کے کانپتے ہوئے ہونٹوں نے کہا —— "نہیں"

—— × —— × —— × ——

پرکاش دھن

جبر و اختیار

کردار

متحرک پنکھا۔
پہلا ساکت پنکھا
دوسرا ساکت پنکھا
کاغذ کا پرزہ
چند "ماٹوز"
دیواریں۔ میز۔ کرسیاں۔ بنچ وغیرہ

[کالج کا ایک خالی کمرہ فلسفے کے پروفیسر نے ابھی ابھی قضا و قدر کے مسئلہ پر اپنا لیکچر ختم کیا ہے۔ وہ اور ان کی کلاس کے دو درجن طالبعلم جا چکے ہیں اب کمرے میں یا تو بنچ اور کرسیاں ہیں۔ یا بجلی کے تین پنکھے۔ ان میں سے دو بند ہیں۔ تیسرا تیزی سے چل رہا ہے۔ گویا ایک بیکلی ہے جو اسے اس طرح سرگرداں رہنے پر مجبور کر رہی ہے۔ فضا کی خامشی کو یا تو پنکھے کی باقاعدہ اور تھکا دینے والی سرسر توڑ رہی ہے۔ یا کاغذ کے اس چھوٹے سے ٹکڑے کی مسلسل پھڑ پھڑ جس کا ایک سرا بنچ کی درز میں پھنسا ہوا ہے اور جو پنکھے کی تیز ہوا میں اڑ جانے کے لئے پھڑ پھڑا رہا ہے۔ کبھی کبھی پنکھے کی مسلسل اور باقاعدہ سرسر میں یکایک ایک کرخت اور لمبی چیخ کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ گویا اس کی چولیں ڈھیلی ہوتی جا رہی ہوں۔ اور اس کے چاروں پر علیحدہ ہو کر فضا میں تیزی سے تیرتے ہوئے دیواروں سے ٹکرا جائیں گے۔ پھر یہ شور دفعتاً بند ہو جاتا ہے۔ گویا پنکھے کے درد کی شدت میں کمی ہو گئی ہو۔ دیواروں پر موٹے موٹے حروف میں "ماٹوز" لگے ہوئے ہیں۔ مثلاً "انسان اپنی تقدیر کا خود خالق ہے!" "خودی کو کر بلند۔۔۔ ۔۔ "خدا پر بھروسہ رکھو۔ اور نیکی کرو" "عمل ہی راہِ نجات ہے!" پنکھے کی تیز ہوا میں کپڑے کے یہ ماٹو لرز رہے ہیں۔ مگر دیواروں نے انہیں مضبوطی سے جکڑ رکھا ہے۔

دفعتاً یوں معلوم ہوتا ہے۔ گویا پنکھے کی سرسر بتدریج بلند ہوتی جا رہی ہے پھر آہستہ آہستہ اس آواز میں معانی پیدا ہونے لگتے ہیں۔ گویا پنکھا کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہو۔ رفتہ رفتہ الفاظ صاف ہوتے جاتے ہیں]

متحرک پنکھا۔ یہ میرا فرض ہے۔ میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ مجھے ایسا کرنا چاہیئے۔ یہ میرا فرض ہے۔ میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں — ایسا چاہیئے۔ یہ میرا فرض ہے۔ میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ مجھے ایسا چاہیئے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

آواز میں شدت اور سرعت پیدا ہو رہی ہے۔ الفاظ بلند ہوتے جا رہے ہیں۔ اور تیز تنفس مریض کی آواز کی طرح جس کی کیفیت ہذیانی بخار کی شدت کے ساتھ ساتھ بڑھتی جائے۔ ایسا معلوم ہے۔ گویا پنکھا پاگل ہو گیا ہو آخر کار یہ شدت عروج پر پہنچ کر دفعتاً بند ہو جاتی ہے۔ گویا مریض نڈھال ہو کر بستر پر گر گیا ہو۔ اور اب اس میں بکنے جھکنے کی تاب باقی نہ ہو۔

رفتہ رفتہ فضا میں ایک گنگناہٹ سی بلند ہوتی ہے۔ گویا اسی پنکھے کی آواز ہے مگر اب وہ اعتدال میں ٹھہراؤ ہے۔ گویا مریض ہوش میں آ گیا ہو۔]

متحرک پنکھا۔ زندگی! زندگی عمل کا نام ہے۔ انتھک عمل کا — سعیٔ مسلسل کشمکش لازوال جہادِ پیہم۔ ان کے بغیر زندگی ہے کیا! آخر کار وہ رازِ سربستہ مجھ پر وا ہو گیا جس نے اتنی مدت مجھے پریشان رکھا۔ اب بھی میری راتیں بیقرار ہونگی۔ اور میرے دن بیتاب۔ اب بھی میری زندگی میں خلش ہوگی۔ تڑپ ہوگی جستجو ہوگی۔ مگر اب

نہ ہوگی۔ اب میری تڑپ اور خلش راہ گم کردہ مسافر کی تڑپ اور خلش نہ ہوگی ب میری جستجو تے منزل دہوگی۔ اب میری راہ معین ہے میری منزل مخصوص ہے بے یقینی اور بے عملی کی وہ کرب انگیز اذیت جس نے میرے ہر پیچ اور ہر تار کی قوت سلب کر رکھی تھی۔ اب دور ہو چکی۔ اب راتوں کی تاریکی میں جب کائنات سو رہی ہوگی۔ میرا دماغ مجھ سے بار بار یہ نہ پوچھے گا۔ کہ مقصدِ حیات کیا ہے۔ اب میں سمجھ گیا ہوں کہ حیات جاودانہ سعی جاودانہ کا دوسرا نام ہے۔ ایک پنکھے کا فرض مذہبی حرکت ہے۔ کبھی نہ رکنے والی حرکت۔

وقفہ۔ کچھ دیر کے لئے کمرے میں پھر وہی سکوت چھا جاتا ہے۔ البتہ پنکھے کی سرسر بدستور ہے۔ اور کاغذ کے پرزے کی پھٹ پھٹ بڑھ گئی ہے۔ گویا وہ اپنے تئیں پنکھے کے چنگل سے آزاد کرانے کے لئے اور بھی بیتاب ہو رہا ہے۔ بنچ کرسیاں اور میز خاموش ہیں۔ شاید پنکھے کی تفسیرِ حیات پر غور کر رہے ہیں۔ دیواروں پر کپڑے کے ٹکڑے اب بھی اسی طرح لرز رہے ہیں۔ اور ساکت دیواریں اب بھی انہیں مضبوطی سے جکڑے ہوئے ہیں۔]

متحرک پنکھا۔ آہ اس زندگی میں کس قدر تسکین ہے کس قدر مسرت ہے مقصدِ حیات کا علم ہو۔ تو حیات کس قدر شیریں ہو جاتی ہے! ادائیگیِ فرض میں کتنا حظ ہے کس قدر راحت! برسوں کی روحانی کشمکش و دو کے بعد یہ قدر شیریں ہیں میری خودی بیدار ہو چکی ہے۔ اور میں اپنے اندر ال طاقت کا احساس کر رہا ہوں۔ ایک بے پناہ قوت کا بحرِ بے پایاں موجزن ہے۔ اب میرے ارادے مستحکم ہیں۔ اب میری زندگی [illegible] ہیں۔

الفاظ کمرے کی دیواروں، بنچوں، کرسیوں اور میزوں پر بکھر جاتے ہیں پنکھے [illegible] پرزے اور کپڑے کے ٹکڑے ہر چیز مبہوت و ساکت ہے۔ [illegible] اضطراری لرزشیں [illegible] جنونانہ پھٹ پھٹ [illegible] مسلسل [illegible] شاید چند لمحوں کے لئے ایک [illegible] میں جذب ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ [illegible] کی آواز بلند ہوتی ہے۔

[illegible] اسی گردشِ مدام کا نام زندگی ہے حیف ہے [illegible] نہ کہے۔ لعنت ہے ہر اس وجود پر۔ جو جامد و ساکت ہے۔ اور لعنت ہے ہر اس فرد پر جو متحرک نہیں۔ کائنات کا ہر ذرہ مظہر ہے۔ کہ حرکت ہی قانونِ قدرت ہے۔ وسعتِ عالم میں کونسی شے ہے جس میں حرکت نہیں۔ اس لئے کیا ہم پر کہ اشرف المخلوقات ہیں یہ فرض نہیں کہ ہماری زندگی ایک کاوش لامتناہی ہو؟ دنیا بھر کی تمام مخلوق ہمارے مقابلہ میں حقیر ہے۔ ہم پنکھوں میں وہ جذبۂ بے پناہ موجود ہے جس کا منبع خود حرکتِ اعظم کی ذاتِ خاص ہے۔ یہ ہمارا حصہ تھا کہ ہمیں یہ عطیۂ خاص تفویض کیا گیا۔ پس کیا واجب ہے کہ ہم ان حقیر اور بے مایہ بنچوں اور کرسیوں کی طرح بے حس و حرکت رہیں؟

آواز اب پھر بتدریج بلند ہوتی جا رہی ہے۔ اب اس کا انداز سرگوشیانہ نہیں خطیبانہ ہے لہجہ میں تحکم ہے۔ گو جو کچھ کہا جا رہا ہے اس کی صداقت میں کلام نہیں۔ وہی حرف آخر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی اس تقریر کا مخاطب بھی ہے۔ آواز پھر بلند ہوتی ہے۔

متحرک پنکھا۔ اے حریصِ لذتِ جمود! اے ننگِ حرکت و کاوش! کو بادل در دوسیاہ مخلوقِ حرکتِ اعظم۔ یہ استغراق سکوت کہاں تک؟ یہ محویتِ عدم خوابیدگی تا چند؟ کب تک تو اسطرح کاہل و بے کار رہے گا؟ کہاں تک تو حکمِ الٰہی کی سرتابی کرے گا؟ بارہا میں نے تجھے دعوتِ عمل دی۔ اور بار بار تو نے اسے رد کیا۔ بار بار میری آواز جہادِ عظیم کے لئے بلند ہوئی۔ اور بار بار اسکی گونج تشنۂ حرفِ بیعت ہو کر واپس آئی۔ تیرے پیچ اس قدر ڈھیلے ہو گئے ہیں۔ اور تیرے تار اس قدر مردہ کہ میرا نعرۂ حق تجھ میں جنبشِ عمل نہیں لاسکتا۔ میری زبان میں وہ اثر ہے کہ پہاڑوں کے سینے شق ہو جائیں۔ دریا ہیبت سے اپنے رخ بدل دیں۔ اور وسعتِ افلاک خوف و ہراس سے اپنے تئیں سمیٹ لے۔ مگر صد حیف اے نامرد! کہ تیرے پروں نے جنبش نہ کی۔ اور تیرے بدن کا ایک تار تک نہ پھڑکا۔ میری وہ گرمیِ گفتار جس کی حدت سے دنیا بھر کے ریگ زاروں کی ریت تک پگھل سکتی ہے۔ تیرے سینے کی ایک دھڑکن تک کو نہ گرما سکی۔ اب بھی وقت ہے۔ اٹھ۔ کمرِ ہمت باندھ۔ اور سرگرمِ کار ہو۔

آواز تھمتی ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے گویا ہزاروں بجلیوں نے ابھی ابھی کڑکنا بند کیا ہے۔ اب کے سکوت میں بھی ایک حدت ہے۔ ایک ارتعاش چند لمحوں کے لئے [illegible]

تک دب چکی ہے۔ گویا وہ اس کڑک سے مرعوب ہو کر بے دست و پا ہو گیا ہو۔ یا بنج کی گرفت متوقع سعیِ عمل کی پیشقدمی کے لئے اس پر اور بھی سخت ہو گئی ہو۔ پھر ہوا میں سرگوشی سی بلند ہوتی ہے۔ گویا کوئی نیند سے جاگ رہا ہو۔

پہلا ساکت پنکھا ۔ واللہ کیا مزے کی نیند تھی جس سے آپ نے مجھے یوں بیدردی سے بیدار کر دیا۔ اب میں آپ سے گلہ بھی کروں۔ تو کیسے ؟ آپ تو ماشاءاللہ جوشِ عمل سے پسینہ پسینہ ہوئے جاتے ہیں۔ ذرا دم تو لیجئے۔

آواز میں لوچ ہے تمسخر آمیز متانت ہے۔ اور ایک ہلکی سی تھکن۔ دیوار پر لگے ہوئے ماٹوز کی ہلکی سی لرزشوں کی طرح نحیف و نزار۔ چنانچہ جب آواز بند ہو جاتی ہے۔ تو ماٹوز کی لرزش اسی کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ پھر اس ارتعاش پر ایک بھدی۔ کرخت آواز غالب آجاتی ہے۔ کاغذ کے پرزے کی سی پھٹ پھٹ کی آواز۔

دوسرا ساکت پنکھا ۔ خواہ مخواہ چلائے جا رہا ہے کمبخت جیسے اسکے باوا کا راج ہی تو ہے۔

آواز بند ہو جاتی ہے۔ گویا بادل کڑکا۔ اور خاموش ہو گیا۔

متحرک پنکھا ۔ حرکتِ اعظم کی لعنت ہو تم پر۔ اور تمہاری حیاتِ بے معنی پر۔ تم گم کردہ صراطِ مستقیم ہو۔ مجھے کہ محوِ عمل تکمیلِ مقصدِ حیات ہے چند روزہ . . . . بدل

پہلا ساکت پنکھا ۔ خدا را ذرا تھمیئے۔ آپ بولتے ہیں۔ تو میں ڈر جاتا ہوں کہ خدانخواستہ کہیں کوئی ترکیب ختم کر لینے سے پہلے آپکا دم گھٹ کر نہ رہ جائے۔ اور کوئی اضافت کہیں جان لیوا ثابت نہ ہو جائے۔

متحرک پنکھا ۔ اے لعین۔ تو راہِ حق میں تمسخر و تضحیک سے کام لیتا ہے۔ حرکتِ اعظم کا قہر یقیناً تجھ پر نازل ہو گا۔ اور تو دونو جہانوں میں راندا جائیگا۔ میری طرف دیکھ مجھ میں تو اس ربِ عظیم کی بے پناہ قوتیں کارفرما دیکھے گا۔ جو تحریکِ اعظم ہے۔ حرکتِ اعظم ہے۔ کیا تو نہیں دیکھتا۔ کہ عمل ہی زندگی کی ابتدا ہے۔ اور عمل ہی انتہا۔ کہ حرکت زندگی ہے۔ اور جمود موت۔ بس ثابت ہے۔ کہ عمل تجھ پر فرض ہے۔ مگر تو ہے۔ کہ اپنے وسیع اور باوقار پر پھیلائے پڑا ہے۔ اور انہیں حرکت میں نہیں لاتا۔ کیا تو محسوس نہیں کرتا کہ تیری زندگی عمل کے بغیر بے معنی ہے۔ آخر تیری زیست کا مقصد کیا ہے ؟

پہلا ساکت پنکھا ۔ دیکھئے نا۔ آپ پھر بیدم ہوئے جاتے ہیں۔ ذرا سنبھل کر بات کیجئے۔ اور ہاں۔ یہ عمل کا لفظ۔ جسے آپ بار بار استعمال کرتے ہیں۔ ذرا وضاحت طلب ہے۔ آخر وہ عمل ہے کیا جس کی آپ مجھے بار بار ترغیب دیئے جا رہے ہیں ؟۔ گھومنا ہمیشہ کے لئے گھومنا ہمیشہ کیلئے ایک ہی محور کے گرد گھومنا !۔ شاید آپ اسی کو "عمل" کہتے ہیں کیا آپ محسوس نہیں کرتے کہ ہمارے عمل کا دائرہ بہت محدود ہے۔ اور ہماری تخلیق کے دن ہی اس امر کا آخری اور ناطق فیصلہ کر دیا گیا تھا۔ کہ ہم کس قسم کے عمل کے مجاز ہیں ؟ اگر فی الواقع ایسا ہے۔ تو اس بے معنی عمل سے حاصل ! اگر زندگی میں کوئی معنی ہے۔ تو یقیناً اس امن و سکون کی وجہ سے۔ جو مجھے حاصل ہے آپ ایک خاص عمل کے لئے مجبور ہیں۔ میں کلیتاً آزاد ہوں۔

متحرک پنکھا ۔ تو گویا تو فلسفی ہے۔ اور اپنی خرد کو ارشاداتِ محرکِ اعظم سے بالاتر تصور کرتا ہے۔ سن اے گردیدۂ فہم و ادراک ! کہ جس خرد پر تو نازاں ہے۔ وہ تجھے دوزخ کی پستیوں کی طرف لے جائیگی۔ تیرا ذہن قال و اقوال کی الجھنوں میں گرفتار ہے۔ اور تیری آنکھیں اس حقیقت کی طرف بند ہیں جس کا نور شعاعِ مہر کی طرح تاباں ہے۔ تو کہتا ہے۔ کہ عمل بے معنی ہے۔ محدود ہے۔ ناپائیدار ہے۔ لیکن تو نہیں جانتا۔ کہ محرکِ اعظم نے ہم میں وہ بے پناہ قوتیں پنہاں کی ہیں۔ اور ہمیں وہ کوہ شکن ارادے عطا فرمائے ہیں کہ عالمِ امکان کی ہر چیز ان کے سامنے ہیچ ہے۔ محرکِ اعظم نے عمل کی تمام راہیں تجھ پر کھولی ہیں۔ صرف اختیارِ جزا اپنے ہاتھوں میں رکھا ہے۔ کیا تو نہیں جانتا۔ کہ تیرا اختیار صرف ادائیگیِ فرض تک ہے۔ اور اس کے صلہ کی خواہش تجھ پر حرام کر دی گئی ہے ! پس اے فلسفی۔ اٹھ۔ اور جزا کی تمنا بھی چھوڑ کر عمل کی جانب راغب ہو۔ کیونکہ بموجب فرمانِ محرکِ اعظم ہر بندے کا فرض ہے۔ کہ اس بے نہایتی ادوار میں اپنا معین فرض انجام دے جس کی ابتدا محرکِ اعظم نے کی ہے۔

پہلا ساکت پنکھا ۔ سبحان اللہ۔ اپنی بے بضاعتی کی کیا اعلےٰ تفسیر جناب نے اپنی زبانِ مبارک سے فرمائی۔ کیا آپ کے فلسفۂ عمل کی بنیادیں فی الواقع اس قدر کمزور ہیں کہ آپ اپنا اختیار عمل تک ہی محدود رکھتے ہیں اور اس کے نتائج کسی موہوم طاقت کے سپرد کر دیتے ہیں ؟ تو نتیجۂ عمل حاصل ؟ آپ پنکھے ہیں۔ یا محض ایک مشین ؟ آخر آپ میں اور کا . . .

اُس پرندے میں، جو پنجے کے چنگل میں پھڑپھڑا رہا ہے۔ فرق ہی کیا ہے؟" مجھے کسی ایسی موہوم طاقت کی ہستی سے ہی انکار ہے۔ میرا یہ نظریہ ہے۔ کہ نظامِ عالم چند ازلی اور ابدی قوانین پر قائم ہے جن کی تشکیل میں ہماری ہستی یا نیستی اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ ان قوانین میں ذرہ بھر تبدیلی کی گنجائش نہیں۔ اور اس لئے میرے ہر عمل کا ماحصل معین ہے۔ ایک خاص عمل کا ہمیشہ ایک خاص معین نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی موہوم ہستی مطلق موجود بھی ہے تو وہ بھی ان معین نتائج میں ردوبدل کرنے کی مجاز نہیں۔ گر مجھے عمل سے کد ہے۔ تو اس لئے نہیں کہ مجھے اس کے نتائج کے بارے میں کسی کی مداخلت کا ڈر ہے۔ بلکہ اس لئے کہ میرے عمل کا دائرۂ انتخاب بہت محدود ہے۔ جب قوانین قدرت نے مجھے یہ اختیار دیا ہے۔ کہ میں ساکن رہوں۔ یا حرکت کروں۔ تو وہ مجھے اس امر پر کیوں مجبور کرتے ہیں۔ کہ میں ایک ہی سمت حرکت کروں؟ اور پھر جب میری ساری مساعی کا انجام آخر کار یہی ہوتا ہے کہ نظام عالم جیسا ہے۔ ویسا ہی رہے گا۔ تو مجھے اس مجنونانہ عمل سے حاصل؟

متحرک پنکھا۔ عمل اپنا حاصل آپ ہے۔

پہلا ساکت پنکھا۔ آپ کے لئے شاید ایسا عمل کوئی دلچسپی رکھتا ہو میں ایسے عمل کو بے معنی سمجھتا ہوں۔ آپ نے کبھی یہ بھی سوچا ہے۔ کہ آخر اس بے معنی عمل کے باعث آپ کونسی فضیلت حاصل کریں گے؟ کیا اس گردش مدام سے آپ کا جی نہیں گھبراتا؟ کیا آپ یہ نہیں سوچتے۔ کبھی نہیں سوچتے کہ آخر۔ جب آپ اس طرح گھومتے گھومتے اپنا ہر ہر پرزہ گھسا بیٹھیں گے۔ تو بھی آپ میں اور مجھ میں کیا فرق ہو گا۔ سوائے اس کے کہ میں مقابلتاً تروتازہ ہونگا۔ اور آپ پر قبل از وقت بڑھاپا آ جائے گا۔

متحرک پنکھا۔ تو خود اپنے استدلال میں پھنس کر رہ گیا ہے۔ تجھے کیا معلوم کہ جب میں یوں ادائیگی فرض میں سرگرم ہوں۔ تو مجھے کس حظ کا احساس ہوتا ہے۔ ایک بار حرکت کر۔ اور پھر دیکھ۔ کہ تیری زندگی کس قدر پُرلطف ہو جاتی ہے۔

پہلا ساکت پنکھا۔ یقیناً آپ اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں۔

متحرک پنکھا۔ آہ میں تجھے کیسے بتاؤں کہ تیری زندگی کسقدر بے معنی ہے۔ میں تجھے کیسے سمجھاؤں۔ کہ تو اس قعرِ مذلت میں پڑا ہے جہاں تجھے دیکھ کر میرا دل جلتا ہے۔ کاش محرکِ اعظم تجھے آنکھیں بخشتا۔ کاش تو یہ جان سکتا۔ کہ عمل بے معنی نہیں۔ حرکت لاحاصل نہیں۔ یہ کیسے ہو۔ کہ میں تیرے ذہن کی تاریکیاں دور کر سکوں۔ اور تجھ پر ظاہر کر سکوں۔ کہ اگر تو عمل کرے گا۔ تو خود ربِ عظیم کی ساری قوتیں تیرے شامل حال ہونگی۔

پہلا ساکت پنکھا۔ معاف کیجئے۔ آپ کی جذباتیت کا مجھ پر اثر نہ ہو گا آئیے اگر آپ فی الواقع میری ذہنی الجھنیں دور کرنا چاہتے ہیں۔ تو اس امر کا کوئی بیّن ثبوت بہم پہنچایئے۔ آپ کی ساری کوششوں کے باوجود آپ میں اتنی طاقت بھی تو نہیں کہ آپ کاغذ کے اس بے بس و لاچار پرزے کو، جو آزادی کے لئے پھڑپھڑا رہا ہے۔ اس ظالم پنج کے پنجے سے رہا کرا سکیں . . . .

دفعتاً کاغذ کا پرزہ پنج کی گرفت سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اور پنکھے کی ہوا میں چکر کاٹتا ہوا آخر دیوار کے ساتھ چپک جاتا ہے۔ پھر وہاں سے بھی رہا ہو کر ایک جست کے ساتھ پنکھے کی ہوا کی پہنچ سے باہر فرش پر گر پڑتا ہے۔ کچھ دیر کے لئے کمرے میں کامل سکوت طاری ہو جاتا ہے متحرک پنکھا بھی گویا فرطِ استعجاب سے دم بخود ہے۔ پھر چند لمحات کے بعد متحرک پنکھے کی کڑک سنائی دیتی ہے۔

متحرک پنکھا۔ دیکھ اے منکرِ ہستی محرکِ اعظم! اگر دیدۂ حق شناس بینا ہو۔ اور سن لے پیرو مسلکِ جمود۔ اگر گوشِ حق نیوش باز ہو۔ کہ تیرے حلق سے تیرے کلمات نکل بھی نہ پائے تھے۔ اور تیرے الفاظِ استشہاد کی گونج ابھی ڈوبی بھی نہ تھی۔ کہ محرکِ اعظم کے دستِ قاہر و مقتدر نے حرکت کی۔ اور اپنی شمشیرِ ہیبت و اجلال سے تیرے دلائلِ باطلہ کی صفوف کو یکسر قلم کر دیا۔ کیا یہ شہادتِ بیّنہ و علامتِ صریح بھی تیری نیند کا نشہ اتارنے کو کافی ہے؟ تو یاد رکھ کہ تو مٹا دیا جائے گا۔ اور تیرے عظیم الشان اور مضبوط پر، جن کے سہارے تو کھڑا ہے۔ تجھ سے چھین لئے جائیں گے۔ تیرے پیچ اس قدر کس دیئے جائیں گے۔ کہ تو کرب و اذیت سے چیخے گا۔ پس اے فیلسوف! خشوع و خضوع اور انقطاع و قنوت سے مصروفِ رقصِ الٰہی ہو۔ اور دل و جان سے تحریکِ اعظم کا مطیع و منقاد بن!

فضا پر پھر خاموشی چھا جاتی ہے۔ اس قدر گہری خاموشی کہ ماحول کی نامعلوم سی لرزشیں بھی بلند آہنگ معلوم ہوتی ہیں۔

پھر تھوڑے سے وقفہ کے بعد دوسرے ساکت پنکھے کی کرخت اور بھاری آواز سنائی دیتی ہے۔ آواز میں اب وہ درشتی نہیں جس کا اظہار پہلی بار کیا گیا تھا۔ اس میں اب گھبراہٹ ہے۔ دہشت ہے۔ استعجاب ہے عجز ہے۔

دوسرا ساکت پنکھا۔ اے حرکت اعظم میں گناہ گار ہوں میرے گناہ بخش دے۔ اب تک میں مدہوش رہا۔ میں نے تجھے نہ پہچانا۔ میں گنہگار ہوں۔ مجھے بخش دے۔

پہلا ساکت پنکھا۔ مبارک ہو جناب۔ آپ کا بے پناہ استدلال ایک گمراہ کو راہ راست پر لے آیا۔ اسے اپنے سایۂ عاطفت میں لیجئے۔ اسکے گناہ بخش دیجئے۔ اب اس کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ وہ پرزۂ کاغذ جو اس کے اور محرکِ اعظم کے درمیان پردہ کی طرح حائل تھا۔ اور جس نے محرک اعظم کی ہستی جلیل کو اس کی آنکھوں سے اوجھل کر رکھا تھا۔ اب ہٹ گیا ہے۔ اب اسے کائنات کے ہر ذرے میں وہ ربِ عظیم نظر آ رہا ہے۔ جو محرکِ اعظم ہے۔ حرکت اعظم ہے۔ تحریکِ اعظم ہے!

آوازیں اب بھی وہی تمسخر آمیز متانت ہے۔ وہی ٹھہراؤ۔ وہی لوچ۔ مگر اب اس میں ایک احساس ناکامی کی آمیزش ہو چکی ہے۔ ہلکی سی تھکن اب گہری ہو گئی ہے۔ اور لہجہ گویا کہہ رہا ہے "کیا حاصل؟" پھر جب متحرک پنکھے کی آواز گونجتی ہے تو اس کا فاتحانہ انداز اس آواز کے ساتھ ایک عجیب تقابل پیش کرتا ہے۔

متحرک پنکھا۔ یقیناً تیری عقل پر محرک اعظم کی حکمتوں نے پردہ ڈال رکھا ہے۔ یقیناً تیری آنکھیں بند ہیں۔ اور تیرے کان بہرے کر دیئے گئے ہیں۔ تو نے محرکِ اعظم سے اس کی ہستی کا ثبوت مانگا تھا۔ تو نے عمل کو بے معنی ثابت کرنے کی دلیل دی تھی۔ چنانچہ حرکتِ اعظم نے مجھے وہ طاقت بخشی۔ کہ ایک معجزے کے ذریعے میں نے تیری دلیل رد کر دی جس کی آنکھیں تھیں۔ اس نے حرکتِ جلیل المرتبت کو پہچان لیا۔ جس کے کان تھے۔ اس نے محرکِ اعظم کے رقصِ جاودانی کی آواز سن لی۔ یقیناً محرکِ اعظم نے اسے اپنے دامن میں پناہ دی۔ اور یقیناً تو ہدفِ پیکانِ عذابِ الٰہی بنا دیا گیا۔

پہلا ساکت پنکھا۔ مرحبا! اے عالمِ باعمل پنکھے۔ مرحبا!

دوسرا ساکت پنکھا۔ تم بھی ایک ہی ڈھیٹ ہو۔ شرم نہیں آتی؟ ہو اب نہیں سوجھتا تو مذاق کی ٹھانی ہے۔ تمہیں ملے تو کیا عقلند ہم اپنے عمل سے ایک پرزۂ کاغذ تک کو رہا نہیں کرا سکتے۔ بولو۔ وہ پرزہ رہا ہوا یا نہیں؟ پھر اب اور کیا ثبوت درکار ہے؟

پہلا ساکت پنکھا۔ مگر اس امر کا کیا ثبوت ہے۔ کہ پرزۂ کاغذ کی رہائی کے لئے انہیں کا عمل ذمہ دار ہے؟

دوسرا ساکت پنکھا۔ اس کے ثبوت کی کیا ضرورت ہے؟ کیا یہ بات کم ثبوت ہے۔ کہ ادھر تم نے منہ سے بات نکالی۔ ادھر پوری کر دی گئی؟ تمہیں بتاؤ۔ ایسا کیوں ہوا؟

پہلا ساکت پنکھا۔ اتفاق۔ محض اتفاق میں نے زندگی کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ اس فرش سے لیکر چھت تک کوئی چیز ایسی نہیں جس کی ساخت اور ماہیت سے میں واقف نہیں۔ اپنے جسم سے لیکر ایک حقیر اور بے حس و حرکت کرسی تک ہر شے پر حاوی قوانین میں نے دریافت کئے ہیں۔ میرے مشاہدے اور تجربے کا حاصل یہ ہے۔ کہ قوانین قدرت یقیناً ہمارے نظریوں کے پیش نظر نہیں بنائے گئے۔ ہم رہیں یا نہ رہیں۔ یہ ہمیشہ رہیں گے ہم چاہیں یا نہ چاہیں یہ نہ بدلیں گے۔ پھر میں یہ کیسے مان لوں۔ کہ یہ پرزۂ کاغذ محض اس لئے رہا کر دیا گیا۔ کہ اس فعل سے کسی کے نظریئے کی حمایت مقصود تھی؟

دوسرا پنکھا۔ عجیب الو پنکھے ہو۔ کیا جو تم جانتے ہو۔ اور مانتے ہو۔ وہی ٹھیک ہے؟ چاہے اُسکے خلاف ثبوت بھی مل جائے؟

پہلا ساکت پنکھا۔ آپ میرا مطلب نہیں سمجھے۔ دیکھئے تاکہ دو امور کا اتفاقیہ طور پر ایک بار ایک ہی وقت پر نمودار ہو جانا ہمیں کوئی نتیجہ اخذ کر دینے کا اہل نہیں بناتا۔ اس اتفاقی امر کی جو تاویل آپ کر رہے ہیں۔ کیا وہ محض ایک خوش فہمی کی پیدا کردہ نہیں؟ کیا یہ ہماری احمقانہ جسارت نہیں کہ ہم یہ سمجھ لیں۔ کہ یہ تمام نظام محض ہمارے نظریات کی درستی یا نادرستی ظاہر کرنے کے لئے تعمیر کیا گیا ہے؟ اور ہماری خواہشات کے احترام کی خاطر اس میں رد و بدل کیا جا سکتا ہے۔ میں کہتا ہوں پرزۂ کاغذ کی رہائی چند ایسے قوانین کے عمل کے باعث ہوئی جن کا، بالواسطہ نہ تو ہماری مساعی سے تعلق ہے۔ نہ خواہشات سے۔ اگر ہے۔ تو آیئے۔ اپنے پیر و مرشد سے کہیئے وہ ایک اور معجزہ دکھائیں۔ اور پرزۂ کاغذ کو بعینہٖ اسی حالت میں واپس بھیج دیں جس میں وہ پہلے گرفتار تھا۔

دوسرا ساکت پنکھا۔ خدا جانے کیا بکے جا رہے ہو۔ تم نے جو ثبوت مانگا تھا وہ تمہیں مل گیا اب اور مانگو گے تو وہ بھی مل جائے گا۔

متحرک پنکھا۔ اے حق شناس! تو ابھی ان معاملات میں مبتدی ہے تو نہیں جانتا اس فیلسوف کے دلائل باطلہ تیرے حق میں کس درجہ خطرناک ہیں۔ پس تجھ پر واجب ہے۔ کہ ملعون کے اقوال فاسدہ کی طرف متوجہ نہ ہو۔ ں کے گمراہ کن اور ایمان سوز الفاظ سننے کی نسبت تیرے لئے بہتر ہوگا۔ ر پگھلا ہوا سیسہ تیرے کانوں میں ڈال دیا جائے۔ یاد رکھو۔ کہ ہر لفظ جو اس کے منہ سے نکلتا ہے۔ اپنے اندر دوزخ کی آگ کی ایک کبھی نہ بجھنے والی بھٹی رکھتا ہے۔ جو تجھے تا ابد جلاتی رہے گی۔ تو اپنی نجات کا ذمہ دار خود ہے عمل ہی ذریعۂ نجات ہے۔ اسلئے سرگرم عمل ہو۔

پہلا ساکت پنکھا۔ ہاں ہاں۔ دوست۔ اب سرگرم عمل ہو کمرے کی دیواریں مضطرب ہیں۔ میز اور کرسیاں پسینہ میں شرابور ہیں سارا عالم انتظار میں ہے۔ تو کیوں پس و پیش کر رہا ہے؟

دوسرا ساکت پنکھا۔ دیکھو بھئی تم بہت بڑھ بڑھ کر باتیں بناتے ہو۔

متحرک پنکھا۔ تو پھر اس لعین کی طرف متوجہ ہوا! یہ وہ مخلوق ہے جس کے لئے راہ عمل بند کر دی گئی۔ ممکن نہیں۔ کہ اسکے قلب تیرہ و تار میں ایک شعاع نور الٰہی کا گذر تک ہو سکے۔ خوف تادیب نار جہنم بھی اسے اس کی خوابیدگی اغراض سے بیدار نہیں کر سکتی۔ پس واجب ہے۔ کہ تو اس کی طرف متوجہ نہ ہو۔ اور وہ رقص جاودانی شروع کر جو تجھے محرک اعظم کا محبوب بنا دے گا۔

وقفہ۔ کمرے میں مکمل خاموشی ہے۔ البتہ متحرک پنکھے کی سرسر مجنونانہ شدت اختیار کر رہی ہے۔ شاید یہ اس کے احساسِ فتحمندی کا نتیجہ ہے۔ پہلا ساکت پنکھا خاموش ہے۔ دوسرا ساکت پنکھا شاید حرکت کرنے کی کوشش میں ہے۔

پھر کچھ دیر بعد فضا میں ایک گہری اور لمبی آہ بھر جاتی ہے۔

جو رفتہ رفتہ ایک اندوہناک اور یاس انگیز پکار بن جاتی ہے۔

دوسرا ساکت پنکھا۔ یا پیر و مرشد! یہ کیا ہے۔ کہ میں چلنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اور چل نہیں سکتا۔ میں کس تیزی سے گھوما کرتا تھا مگر آج مجھے کیا ہو گیا ہے۔ کہ میرے پیچ مجھے سہارا نہیں دیتے۔ میرے "کابلے" اس قدر کس چکے ہیں۔ کہ مجھے حرکت کرنے نہیں دیتے ہیں جس قدر حرکت کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ خود کو بے بس و لاچار پاتا ہوں۔ المدد الغیاث!

وقفہ۔ جس میں متحرک پنکھے کی سرسر اور مالٹوز کی ہلکی لرزشیں دوسرے ساکت پنکھے کی ناکامی عمل پر طنز سا معلوم پڑتی ہیں۔

پہلا ساکت پنکھا۔ واللہ آپ لوگ از حد دلچسپ پنکھے ہیں۔ پیر و مرشد فرماتے ہیں۔ حرکت کرو۔ سعادتمند مرید جواب دیتے ہیں۔ کوشش کرتا ہوں۔ مگر حرکت نہیں کر سکتا! گویا آپ کو اپنی حرکت پر بھی اختیار نہیں!

دوسرا ساکت پنکھا۔ میری ساری روح حرکت کے لئے کوشاں ہے مگر آہ! میں کس قدر بے بس ہوں۔ کس قدر لاچار! کتنا مجبور! شاید محرک اعظم کا یہ منشا نہیں۔ کہ میں حرکت کروں۔

پہلا ساکت پنکھا۔ کیوں اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہو! تم اپنی حرکات میں مختارِ مطلق ہو۔ تم کسی بھی لحہ حرکت کر سکتے ہو۔ مگر اصل بات یہ ہے۔ کہ تم حرکت کرنا نہیں چاہتے۔ تمہارے تحت الشعور میں حرکت کے خلاف ایک زبردست فطری جذبہ موجود ہے۔ کیونکہ حرکت غیر فطری ہے۔ اور جمود فطری۔ تمہارا شعور تمہارے تحت الشعور اور لاشعور کی اس فطری خواہش کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور یہی باعث ہے کہ تم حرکت نہیں کرتے۔

دوسرا ساکت پنکھا۔ کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ اپنی خواہشات کو میں زیادہ جانتا ہوں۔ یا تم؟ اس وقت میری سرشت کا ہر ذرہ حرکت کا خواہشمند ہے۔ لیکن شاید محرک اعظم کی رضا نہیں۔

پہلا ساکت پنکھا۔ اپنی سرشت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ اسکے لئے یقیناً تمہیں کسی تجربہ کار ماہر نفسیات کی خدمات درکار ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ تمہارا تحت الشعور غیر معمولی طور پر پیچیدہ ہے۔ تم جسے اپنی کمزوری پر محمول کر رہے ہو۔ دراصل وہی تمہاری ذہنی صحت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ . . . .

متحرک پنکھا۔ اے مجسمۂ کذب و ریا۔ اور اے سرچشمۂ نظریات باطلہ! اپنی تقریر طولانی بند کر۔ تو ان آثار و علائم کی تفسیر و تاویل واقعی کے قطعاً

نااہل ہے۔ یقیناً یہ عذاب محرک اعظم نے اُسے اس گناہ کی پاداش میں دیا ہے۔ جس کا مرتکب یہ تیری دلائل فاسدہ سننے کے باعث ہوا۔ حرکت ہمارا شعار ہے۔ حرکت قانونِ قدرت ہے۔ حرکت رضائے الٰہی ہے۔ خود حرکت اعظم کی ذاتِ خاص ایک رقصِ جاودانی ہے۔ پس یہ کیسے ممکن ہے۔ کہ یہ حرکت نہ کر سکے؟

پہلا ساکت پنکھا۔ تو پھر بتلایئے۔ یہ حرکت کیوں نہیں کر سکتا! سوائے اس نفسیاتی حل کے۔ جو میں نے ابھی ابھی پیش کیا ہے۔ آپ کونسا حل پیش کر سکتے ہیں؟

متحرک پنکھا۔ یقیناً اس کی خودی ابھی کلیتاً بیدار نہیں ہوئی۔ ورنہ ایسا کیوں ہے۔ کہ یہ حرکت نہیں کر سکتا؟

پہلا ساکت پنکھا۔ اس لئے کہ حرکت غیر فطری ہے۔ اور جمود فطری۔

متحرک پنکھا۔ ہرگز نہیں۔ حرکت فطری ہے۔ اور جمود غیر فطری۔ کیا تو دیکھتا نہیں۔ کہ میں جس کی خودی بیدار ہے۔ کس طرح حرکتِ جاودانی میں مصروف ہوں۔ کیا تو سمجھتا ہے۔ کہ اب دنیا کی کوئی بھی طاقت اس رقص الحرکت عظمیٰ کو بند کر سکتی ہے؟ قسم ہے محرکِ جلیل المرتبت کی۔ کہ تمام پہاڑوں کی چوٹیاں۔ تمام آسمانوں کی بجلیاں۔ ساری دنیاؤں کے زلزلے۔ اور سمندروں کا سارا پانی بھی میرے رشتۂ عمل کو منقطع . . . .

ایک غیبی ہاتھ نے بڑھ کر "سوئچ" بند کر دیا ہے۔ آواز بتدریج مدھم ہوتی جا رہی ہے۔ حتیٰ کہ جب پنکھا رک جاتا ہے۔ تو وہ اپنی بات ختم کئے بغیر ہی خاموش ہو جاتا ہے۔ دیواروں کے ماٹوز آخری بار متحرک کر رہ جاتے ہیں۔

باہر کسی کے بھاری بوٹوں کی چاپ چند لمحوں کے لئے سنائی دیتی رہتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ مدھم ہوتے ہوتے آخر گم ہو جاتی ہے۔

کمرے پر ایک گہری خاموشی چھا جاتی ہے۔ مگر فضا میں اب بھی ایک حدت ہے۔ ایک ارتعاش۔

جاوید اقبال

اشک و لہو

منظر :- (کسی مفرور جوڑے نے سرائے کے ایک غلیظ کمرے میں پناہ لی ہے۔ چارپائی پر ایک نوجوان کمبل اوڑھے گہری نیند سو رہا ہے۔ سامنے کھڑکی میں اُس کی ہمنوا لڑکی کھڑی عجیب انداز میں آسمان کو تک رہی ہے۔

رات کا ایک حصّہ گذر چکا ہے۔ گاؤں کے سب چراغ بُجھا دیئے گئے ہیں۔ کمرے میں ہر طرف اندھیرا ہے، صرف چاند اور ستاروں کی ماندسی شعاعیں کھڑکی کے رستہ کمرے میں داخل ہو رہی ہیں۔ باقی چہار اطراف قبرستان ایسی خاموشی ہے۔

جب پردہ اُٹھتا ہے تو کچھ لمحوں کے لئے وقفہ رہتا ہے، پھر کھڑکی میں کھڑی لڑکی اچانک مڑتی ہے اور اُس کے منہ سے دہشت ناک چیخ نکل جاتی ہے)

نوجوان :- (ایکدم چونکتے ہوئے) کون ——— ؟! یہ کس کی چیخ تھی ؟!!

لڑکی :- (ایک عجیب بے بسی کے عالم میں) میں نہیں جانتی۔

نوجوان :- تمہارا چہرہ کیوں اُتر گیا ہے ؟!

لڑکی :- مجھے اپنے ماں باپ یاد آ رہے ہیں۔

نوجوان :- تمہیں اس کھڑکی کے قریب نہ جانا چاہیئے تھا۔ کیا تم آسمان کو دیکھ رہی تھیں ؟!

لڑکی :- ہاں ———

نوجوان :- میں نے تمہیں کہا تھا آسمان ابر آلود ہے، تم کچھ نہ دیکھ سکو گی۔

لڑکی :- تم نے جھوٹ کہا تھا۔

نوجوان :- کیا مطلب ؟!!

لڑکی :- مطلع صاف ہے اور میں نے کچھ دیکھ لیا ہے ———

نوجوان :- کیا دیکھا تم نے ؟!

لڑکی :- میں نہیں کہہ سکتی۔

نوجوان :- مگر تم اس قدر آہستہ کیوں بول رہی ہو ؟!

لڑکی :- کوئی سن رہا ہے۔

نوجوان :- آخر تم اٹھیں کب ؟!

لڑکی :- نجانے کب میں تمہاری آغوش سے نکلی ——— لیکن میں نے محسوس کیا جیسے میں آسمان کی اُن لاتعداد آنکھوں کے درمیان جا کھڑی

ہوئی ہوں اور دور، قوسِ نمامہِ نورز در بادلوں کے پیچھے چھپ کر مجھے اشاروں سے بلا رہا ہے۔ ہوائیں مدہوش سورما ہی بنگر میں انہیں خوابوں میں کبھی کبھار بڑبڑاتے سن لیتی ہوں —— ستارے میرے اس قدر قریب تھے کہ میرا دل چاہا اُن دمکتے جواہرات کے خوشوں کو توڑ کر اپنی جھولی میں ڈال لوں ——

نوجوان :- ہاں، تو پھر ——

لڑکی :- پھر —— جب میں نے انہیں توڑنے کیلئے اپنا ہاتھ بڑھایا تو کوئی گرم سی شے میری انگلیوں سے چھو گئی - یہ .... یہ ایک قطرہ تھا، ایک آنسو —— جو کسی ستارے کی آنکھ سے گرا تھا۔ میں نے ٹھنڈی آہ بھری اور اپنا ہاتھ کھینچ لیا —— پھر معاً ہی میری نگاہیں اُس چاند پر پڑیں —— اُس چاند پر، جو کسی دیو کے میلے سے غمیدہ دانت کی مانند، کسی یخ بستہ نعش کی مڑی ہوئی اُنگلی کی طرح، مجھے گھور رہا تھا —— وہ ایک دم نیچے اُترا اور میں خوف سے سمٹ گئی - وہ مڑی ہوئی خنجر کی طرح میری طرف بڑھا اور لمحہ بلمحہ میرے نزدیک ہوتا گیا، جیسے کہ میرے سینہ میں پیوست ہو گیا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ میں درد و کرب سے چیخوں، وہ پلٹا —— اور اپنے پیچھے خون کی ایک طویل لکیر چھوڑتا ہوا، اپنی ازلی جگہ پر جا معلق ہوا ——

نوجوان :- میرا خیال ہے تم چاند کو لگاتار تکتی رہی ہو ——

لڑکی :- تم خود دیکھ کر اپنی تسلی کر لو —— وہاں، اُس صنوبر کے ٹنڈ منڈ درخت سے ذرا اوپر، وہ لٹک رہا ہے۔ کیا تمہیں اس پر میرے خون کے دھبے نظر نہیں آتے ؟!!

نوجوان :- شائد اسے گہن لگا ہو۔

لڑکی :- تم پھر جھوٹ کہہ رہے ہو۔

نوجوان :- میرے قریب آؤ، مجھے اپنا ہاتھ دو ——

لڑکی :- کاش میں تمہارے ساتھ نہ آتی۔ کاش میں اپنے ماں باپ کو نہ چھوڑتی۔ آخر تم میرے کون ہوتے ہو۔

نوجوان :- تم نے ضرور کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے۔ خدارا لیٹ جاؤ، تھوڑا سا آرام کر لو۔ تم بہت تھکی ہوئی معلوم ہوتی ہو۔ میں تمہارے سرہانے بیٹھوں گا۔ اور تمہیں ایک ایسی لڑکی کی داستان سناؤں گا۔ جو کسی شہزادے کے ساتھ بھاگ نکلی تھی۔ اور پھر کبھی واپس نہ آئی تھی ——

راجندر سنگھ بیدی

ماسوا

بغلی کمرے سے ہنسی کی آواز آئی۔

میں بدستور اپنا کام کرتا گیا اگرچہ جیتی بی بی بھی برابر ہنسی گئی۔ جیتی کا کیا تھا، وہ تو ہنستی ہی رہتی تھی۔ ... ایک عام بات جس پر کوئی مسکرانا بھی گوارا نہ کرے، جیتی کے لئے بڑا مزیدار لطیفہ ہوتی تھی —— دیکھیے جی، آپ چھتری پر لٹکا ہوا ہے یا نہیں، اور یہ چھتری نہیں آدمی ہے —— جی! اور جیتی کو ہم پڑھے لکھوں کے سلجھے ہوئے "مزاج" نے "خراب" نہیں کیا تھا۔

جیتی بی بی کے ہنسنے کی آواز میرے لئے غیر متعلق شور ہو کر رہ گئی تھی۔ متعلق اور غیر متعلق شور میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ مثلاً میں ایک دوست کے نام خط لکھ رہا ہوں جس میں مجھے ایک بدگمانی کو دور کرنا ہے، نہیں، خط اور بات رہنے دیجئے، شاید اس سے میرا مفہوم واضح نہ ہو سکے۔ فرض کیجئے میں ایک نظم لکھ رہا ہوں۔ چاند تاروں کے متعلق ایک نظم، جو ہمارے شاعر اکثر لکھا کرتے ہیں اور جس میں دھندلکے، اجنبی، ان گنت، مبہم، بے نام خلا وغیرہ کے سوا کچھ اور بھی ہوتا ہے۔ لیکن پڑوس کے سردار فتح سنگھ "سونہ" ٹوپیاں والے کیرتن سوہلا پڑھنا شروع کر دیتے ہیں —— گگن میں تھال روی چند دیپک بنے، تارکا منڈل جنک موتی، تو اگلے ہی لمحے سارا آکاش ایک وسیع و عریض تھال کی صورت میں سامنے آ جاتا ہے جس میں چاند اور سورج دیئے بن جاتے ہیں اور تارے ان گنت موتیوں کی طرح خلا میں پڑے نظر آنے لگتے ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ایسے ہی وسیع و عریض پیمانے پر بھو کھنڈن کی آرتی اتر رہی ہے اور پون کا جھونکا چنور دھوپ کلیان کی صورت میں ہل رہا ہے ... اب اتنی حسین منظر کشی کے بعد چاند تاروں کے متعلق کوئی کیا لکھے گا؟ برخلاف اس کے سامنے کے سروس اسٹیشن سے دن رات کاریں دھونے کا شور سنائی دیتا ہے اور مستری بجلی کے فوارے کے ساتھ فحش کلامی بھی کرتا ہے۔ لیکن میں لکھ سکتا ہوں۔ پڑھ سکتا ہوں، سوچ سکتا ہوں۔ بلکہ ایسا شور مجھے زندگی کا قرب، ایک قسم کے تحفظ کا احساس اور —— نظم اس کے سوا دیتا ہے اور یوں غیر متعلق شور میرے لئے ممد و معاون ثابت ہو جاتا ہے۔

لیکن آہستہ آہستہ جیتی کا شور متعلق ہو رہا تھا —— کس کا دیا کھاتی ہوں —— ان کا؟ اور پھر ایک بڈھے کی نامانوس آواز آئی۔ ہمارے گھر میں یہ دوسرا بوڑھا کون ہو سکتا تھا۔ یہ جیتی کے والد کی آواز نہ تھی۔ وہ ہمارے ملیون بازار میں آتے تھے۔ لیکن کبھی کبھار، اور وہ بھی قدامت پسند ہونے کی وجہ سے اپنی بیٹی کے گھر کا کچھ نہ کھاتے۔ اگر کہیں زبردستی کوئی سنگترے کی پھانک منہ میں ڈال دے تو پورے سنگترے کی قیمت رکھ دیتے اور ہمیں یوں معلوم ہوتا جیسے ابھی خاصی تجارت ہوئی ہے اور پھر جب وہ اپنے گن آنند کو ڈانٹتے ہوتے اور بچوں کو آیا کی گود میں دیکھتے تو ان کی آنکھوں میں پانی آ جاتا اور وہ پیار کا کوئی شبد کہے بغیر چل دیتے۔ آخر اس کی ضرورت ہی کیا تھی جب اپنا آپ بچوں کی صورت میں سکھی ہو جاتا ہے تو پھر موت پر کیوں نہ کوئی شادیانے بجائے ... لیکن وہ بڈھا کوئی اور تھا۔ ورنہ بابوجی، میرے سسر ایسے بلغمی مزاج کے نہ تھے اور نہ یوں ہنستے تھے جیسے کوئی آواز نکل کر ایک تھیلے میں گم ہو جاتی ہے۔ پھر جیتی کی آواز آئی —— ان کا دیا کھاتی ہوں، نہیں تو مجھے پہلے ہی پتہ تھا —— "چپ! اور جاؤ"۔

... اور ہنسی ......

میں اپنے کام کو ڈالتے ہوئے بغلی کمرے کی طرف چل دیا۔ کمرے تک جانے کی نوبت بھی نہ آئی۔ دونوں کمروں کے درمیان غسل خانے کے سامنے چھتا ہوا ایک چھوٹا سا برامدہ تھا جو زمین سے دو تین فٹ اونچا تھا۔ اس کی سیڑھیوں پر ایک بوڑھا آدمی بیٹھا تھا اور اس کے سامنے لوہے کی ایک کرسی پر، جس پر مشکل سے کوئی بچہ بیٹھ سکے، جیتی بیٹھی اپنا ہاتھ اس بوڑھے کو دکھا رہی تھی۔ بوڑھے کا رنگ سرخ

تھا اور اس کے سر پہ بے احتیاطی سے بندھی ہوئی گیروی پگڑی سے مطابقت رکھتا تھا۔ اس کی داڑھی مونچھیں سفید ہونا چاہئے تھیں، لیکن کثیف سے تیل کے استعمال نے انہیں میلا بنا دیا تھا۔ . . . "بیٹا سنو مت تمہارا ہاتھ پل جاتا ہے"۔ ـــــ وہ کہہ رہا تھا اور ایک حقیر سے وقفے کے بعد سر کو جھٹکا دیتا تاکہ پگڑی پیچھے نہ گر جائے۔ سر سے پاؤں تک جوگی ہونے کے باوجود اس کی شکل سادھوؤں اور سپیروں سے یکسر علیحدہ تھی اس میں کوئی ایسی بے نیازی نہ تھی اور نہ ہی تکرارِ طلب۔ دودھ دھارن ہونے کے باعث وہ دودھ ہی پر گزارہ کر لیتا تھا۔ وہ خوش تھا ـــــ خوش کل کائنات کا باپ بن کر جیتی کا ہاتھ تھامے ہوئے۔

"یہ مارس کا گرڈل ہے"۔ وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہہ رہا تھا "یہ ریکھا جو ادھر جاتی ہے۔ اس کا مطلب ہے تم ٹریول بھی کرو گی"۔ "کدھر جاؤں گی؟" جیتی پوچھ رہی تھی اور وہ کہہ رہا تھا "سمندر کا سفر نہیں، یوں کچھ جاترا معلوم ہوتی ہے"۔

میں نے کہا ـــــ "جیتی، تم اتنا شور مچا رہی ہو کہ میں . . . . ."

ابھی میں نے فقرہ بھی مکمل نہیں کیا تھا کہ جیتی منہ پھلا کر روٹھ چکی تھی . . . "تمہیں تو میں ہڈیوں کے بولنے کی آواز بھی روک دے گی۔ اس وقت تک وہ بوڑھا رمال، اور پامسٹ میری انگلی پکڑ کر مارس کے گرڈل پر رکھ چکا تھا۔

مانتا ہوں، ہمارے سماج میں خاوند کا کھوج فوراً چل جاتا ہے لیکن جس آسانی سے وہ بڈھا مجھے جیتی کا شوہر سمجھ گیا تھا۔ یہ بات میرے لئے کافی حیران کن تھی اور پھر وہ یوں باتیں کرنے لگا گویا مجھے برسوں سے جانتا ہے وہ فوراً میرے ساتھ ایک رشتے میں داخل ہو چکا تھا۔ اس بات کو جانے بغیر کہ میرے باوا کے باوا کا باوا . . . . . اس کا بھی باوا تھا۔ یہاں کچھ عقل گم ہو جاتی ہے۔ ورنہ مجھے یہ کیوں معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی بھی عورت میری بیوی ہوتی تو اس کی وضع قطع جیتی ایسی ہوتی۔ دس برس ہوئے مجھے باوجی کا داماد بنے ہوئے۔ لیکن جب سے باوجی پیدا ہوئے میں ان کا داماد تھا

تو مارس کے گرڈل کا مطلب تھا کہ کام کرو گے اور کھاؤ گے۔ میں نے کہا: "اگر یہ گرڈل جیتی کے ہاتھ میں ہے تو اس نے دو تین نوکر رکھے ہوئے ہیں۔ جی پر حکومت کرتی ہے اور خود پلنگ پر بیٹھ کر موزے بنتی ہے۔ اپنے خاندان کے لوگوں کے موزے ختم ہو جاتے ہیں تو اڑوس پڑوس کے شروع کر دیتی ہے"۔ جیتی بول اٹھی: "نوکر تو نام ہی کے ہیں نا۔ سارا دن ان سے مغز کھپائی ہوتی ہے۔ کوئی کام اپنے آپ بھی کرتے ہیں؟" ـــــ تو یہ تھی گرڈل کی تشریح اور پھر موزے! . . . . اگر اس کے ہاتھ کی ریکھا ہاتھ کے ساتھ پڑھی جائے تب کہیں وضاحت ہوتی تھی۔

لیکن جیتی خوش تھی ـــــ خوش! اس بڈھے کی طرح۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے اتنا ہی قریب تھے۔ جتنا میں ان سے پرے تھا۔ میں ہر روز آسمان سے زمین پر آتا تھا۔ یہ لوگ تھوڑا بہت بھی آسمان کی طرف جاتے تو بجد خوش ہوتے۔ لیکن میرا آسمان بتدریج اونچا ہو رہا تھا۔ جیتی کے لئے یہ بات پریشان کن نہ تھی کہ وہ میری محنت کا کھاتی ہے۔ عورت اور کمائی کچھ طوالفوں ایسی بات معلوم ہوتی تھی۔ باوجود اس بات کے کہ میرے غلاموں کا حلقہ وسیع ہوتا تھا۔ مجھے یہ بات اچھی نہ لگی۔ لیکن یوں اچھا نہ لگنے میں جو اچھا لگتا ہے۔ اس نخوت کا کوئی کیا کرے"۔

تو بڈھے نے جتنی باتیں بتائیں وہ ایسی تھیں کہ ہم ان پر یقین کرنا پسند کرتے تھے۔ کہیں تھوڑا بہت ردّ و بدل ہوتا تھا لیکن وہ ہمیں پریشان کرنے کے لئے کافی نہ تھا۔ مثلاً یہ کہ دوی وار کے دن جو ہم کالی گائے لائے ہیں۔ یہ پھلے گی نہیں۔ شاید اسی لئے بچھڑا مر گیا تھا اور سوالکو والے کیوبہ سے گائے کا ایک تھن ہمیشہ کیلئے بند ہو گیا تھا لیکن ایسی بات کو صرف ایک اتفاق کہہ کر ٹالا جا سکتا ہے اور انسان صاف کہہ سکتا ہے۔ اس کا قسمت سے کوئی سمبندھ نہیں۔ البتہ دوسری بات جو تشویشناک ہو سکتی تھی۔ وہ یہ تھی کہ بوک بڑا ہو کر ہمیں تنگ کرے گا۔ سو ابھی آٹھ دس سال پڑے تھے۔ بوک کے بڑا ہونے میں۔

برخلاف اس کے ہمارے حق میں کتنی باتیں تھیں۔ قسمت کی لکیر اور دماغ کی ریکھا کو کاٹتی ہوئی شہادت کی انگلی کی طرف جھکتی تھی۔ وہاں زحل کی ایک "پہاڑی" تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ زندگی بھر ہمیں معاش کی فکر نہ ہو گی اور آخری عمر میں راج دربار میں "ڈراماں" پائیں گے۔ یہ بات بھی مجھے اچھی نہ لگی، خیر . . . . دروازے پر ہلکی سی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ باوجی کی چھڑی کی آواز تھی۔ انہی کا انداز تھا کہ دروازے کے شیشوں پر چھڑی سے ہلکی ہلکی ضربیں لگاتے اور کسی کا نام پکارنے کی

بہانے ایک سسکتی ہوئی آواز میں ہری او . . . و . . . و . . . م کہتے

آج باؤجی نے پگڑی بھی ایسی باندھی تھی جس پر شلوک لکھے تھے۔ ان کی گڑیاں ہردوار میں بنتی تھیں اور ان کے ایک پڑے میں بیٹھے چنے بھنے ہوئے چاول پرشاد کے طور پر بٹتے تھے۔ آج چھڑی بھی مختلف تھی۔ یہ چھڑی لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔ جس پر پھوڑے ہی پھوڑے نظر آتے تھے۔ یہ چھڑی گھر میں سے سانپ بھگانے کا لاجواب نسخہ تھی۔ جینتی اپنے پوجا پاٹ کی طرف متوجہ ہوئی اور بڈھا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گویا وہ پیسے نہیں لے گا۔ البتہ اخبار والے اور کوئلے والے کی طرح مقررہ تاریخ پر بل چکانے آئے گا لیکن میں کچھ نقدی اس کی مٹھی میں تھما چکا تھا۔

"یہ میں نہیں لوں گا بیٹا!" اس نے کہا

"کیوں بابا، کیوں نہیں لوگے؟"

بڈھے نے اپنی رمل اور وہ کتاب جس پر ہندی کے بے شمار زائچے بنے ہوئے تھے۔ اٹھائی۔ اسے جھاڑا، چوما، آنکھوں اور سر سے لگایا اور اپنی جھولی میں رکھ لیا۔ اس وقت تک اس کے چہرے سے خوشی زائل ہو چکی تھی اور اداسی کے تاثرات نظر آنے لگے تھے۔ وہ بوڑھا ان لوگوں میں سے تھا جو خوشی کے وقت خوش اور غمی کے وقت غمگین ہوتے ہیں ایک دن میں دس بار ہنستے اور پانچ چھ بار رو بھی دیتے ہیں اور ایک ہی اثر کو اپنے چہرے پر مستقل نہیں ہونے دیتے۔ بڈھے نے کہا "بیٹا! میں پیسے نہیں لوں گا، جو خبر میں تمہیں سنانا چاہتا ہوں وہ اچھی نہیں ہے ــــ ہات دکھاؤ"

جینتی کے والد اس اثنا میں بڑے اطمینان کے ساتھ کشمیری آسن پر براجمان ہو چکے تھے۔ جینتی انہیں بابا کی باتیں سنا کر ہنس رہی تھی۔ بڈھے نے مفاہمت کے انداز سے اس کی طرف دیکھا اور ایک قہقہہ کہیں تھیلی میں گم ہو کر رہ گیا۔ پھر بوڑھے نے سنجیدہ سا منہ بناتے ہوئے کہا "بیٹا! برا نہیں مانو گے، اداس تو نہیں ہو گے؟" میں نے کہا "بابا، جتنا میں اداس نظر آتا ہوں، اس سے زیادہ اور کیا ہوں گا؟" . . . "نہیں نہیں" بڈھا ہنسا . . . قریب باؤجی لوگ کی باتیں سن کر اس سے لاڈ کر رہے تھے . . . باہر جو دروازہ اندرونی صحن میں کھلتا تھا۔ جولیاں والے سردار کی آواز اس میں سے ہو کر آ رہی تھی۔ وہ گا رہے تھے ــــ لال رنگ

تس کو لگا ــ ـ لال رنگ اسے لگتا ہے جو بہت خوش نصیب ہوتا ہے۔ یہ دوسرے مصرع کا مضمون تھا۔ لیکن بڈھے نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا "یہ جینتی کیسی عورت ہیں چپکے سے چل دے گی"

میں نے گھبرا کر کہا۔ کیا؟

بڈھے نے نقدی میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا "جینتی بہت دیر جیتی نہ رہے گی اور . . ."

"اور؟"

"اور تمہاری دوسری شادی ہو گی!"

یوں تو میں بھی اس بات کو مان لیتا ہوں جس کے لئے میں نے دام دیئے ہوں۔ لیکن سب سے زیادہ اس بات کا قائل ہوتا ہوں جس کے لئے کوئی دام قبول نہ کرے۔ کوئی آدمی چیز دے اور چل دے تو یہ چل دینا ہمیں کتنا مرتبیا معلوم ہوتا ہے ــــ جولیاں والے کی آواز نے مجھے جھنجھلا دیا تھا۔ بوڑھے کی بتائی ہوئی خبر "لال رنگ" نہ ہو سکتی تھی۔ لیکن میں اپنے کام کو چھوڑ کر سروس اسٹیشن کے سامنے بوڑھے کو جاتے دیکھتا رہا۔ اس کی بغلوں اور اس کی چھاتی پر خاصی چربی ہونے کے باعث بوڑھے کے بازو بہنگی کے انداز میں چل رہے تھے۔ وہ کھڑا رہتا تو میں کچھ بھی محسوس نہ کرتا۔ لیکن اس نے بات کہی اور چلدیا . . . . . وہ سرخ اور سفید، بھاری بھر کم آدمی اس قدر زندہ تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے موت کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ لیکن اب اس کی چھوڑی ہوئی خالی جگہ شمشان کی طرح بھائیں بھائیں کر رہی تھی ــ وہ چلا گیا اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس کے بوجھ سے دبی ہوئی سیمنٹ کی سیڑھیاں آہستہ آہستہ اپنی سطح پر آ رہی ہیں۔ کوئی تیز لانچ پانی سے گزر جائے تو پانی میں ایک گھاؤ سا پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح مجھے اس بوڑھے کے پیچھے ایک گھاؤ سا نظر آ رہا تھا اور ارد گرد کی فضا اس گھاؤ کو پاٹنے کے لئے چاروں طرف سے امنڈتی دکھائی دیتی تھی

آج سروس اسٹیشن خاموش تھا۔ مسلمان ہونے کی وجہ سے سروس اسٹیشن کا مالک جمعہ کے دن دکان بند رکھتا تھا۔ سو آج وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ چند آوارہ کتے ایک مریل سے کتے کو دھکیلتے ہوئے کاروں کے پلیٹ فارم کے نیچے خالی جگہ میں گھس گئے تھے اور اسی دم چلے بھی گئے

تو گویا وہاں فقط اس سروس الیکشن کی عمارت کھڑی تھی جس کے پیچھے سیو بیر کا اکیلا درخت، پچھلے روز کی بارش میں دُھلا ہوا، اپنی سرسبزی سے آنکھوں میں کھبا ہوتا تھا۔ بائیں طرف جنگلے کے پیچھے ہوا بھرنے والی موٹر نظر آ رہی تھی اور اس پہ ایئر یعنی ہوا کے حروف انگریزی میں اتنے موٹے لکھے ہوئے تھے کہ ان کے لکھے ہونے میں خواہ مخواہ شک پیدا ہوتا تھا . . .

بوڑھے نے بات کہی اور چل دیا . . . . وہ ابھی تک بازار میں اس جگہ پہنچا تھا، جہاں زنگر بزاز اور ان کے شاگرد مل کر پگڑیاں باندھ رہے تھے۔ بوڑھا دم بھر کے لئے سامنے کے پیچھے اوجھل ہو گیا۔ لیکن اسی دم پھر سامنے آ گیا۔ ابھی وہ یکے سے بچنے کے لئے گلی کی پناہ میں گیا ہی تھا کہ دو بچے لڑتے ہوئے بوڑھے سے بھڑ گئے۔ بوڑھے کی پگڑی پیچھے کی طرف سرک گئی۔ جسے اس نے ٹھیک کیا اور بچوں کو جھکا کر آگے چل دیا ——— آخر اسے نظروں سے اوجھل ہونا تھا سو وہ ہو گیا۔

رسوئی سے پلیٹ کے گرنے کی آواز آئی۔ شاید آپا کے ہاتھ سے گری تھی۔ چونکہ اسے اکثر بے احتیاطی کے باعث ڈانٹ پڑتی۔ اسلئے اس کے لئے اس کے ہاتھ کانپتے رہتے تھے۔ نوکروں کے کوارٹروں میں جو تیل کا لمپ جلایا جاتا تھا۔ اس کی چمنی وہ تین چار بار پھوڑ چکی تھی۔ لیکن یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے جنتی نے پھر اپنے اس کا پلیٹ توڑنے کا قصور معاف کر دیا ہے۔ کاش پہلی بار جب اس سے چیز ٹوٹی تھی۔ اس وقت کوئی اس کے گناہ کو معاف کر دیتا تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی . . . . ہری اوم کی آواز کے ساتھ باوجی کے پیٹ سے ایک خاص قسم کی آواز نکلی جو پیٹ کے یکسر خالی ہونے پہ پیدا ہوتی ہے یا بہت کھا لینے کے بعد سننے میں آتی ہے۔ ساتھ ہی پتہ چلا کہ مجھے پکارا جا رہا ہے۔

میں نے کہا "جی، آپ مجھے بلا رہے ہیں؟"

"ہاں بھاگیرتھ، بات سنیو" ——— جیسے میرے اپنے اندر سے آواز آئی "جنتی کو کہو ورزش کیا کرے۔"

"ورزش کیا کرے؟ وہ تو پہلے ہی گھر کے کام کاج تلے دبی ہوئی ہے۔"

"گھر کا کام کاج تو نوکر کریں۔"

"لیکن باجی ——— نوکر بھی بھلا اپنے آپ کام کرتے ہیں۔ جب تک بیوی خود ہاتھ پاؤں نہ ہلائے، کون جان مارتا ہے۔ جو یہ سب پنکھے جھلکورے ذرینے سے دھرے ہوئے ہیں۔ نوکر نے دھرے ہیں؟ ننگا سر لگ کر صوفے کی پشت میلی ہو جائے کیا مجال جو نوکر کہیں۔ اس پہ کپڑا ڈال دیں یا اسے پکڑ کر دھو ڈالیں"

"تو یہ دھونے دھلانے کا کام کون کرتا ہے؟"

"جنتی۔"

"یہ تو اچھی بات ہے، بیٹا، اصل ورزش تو یہی ہے۔ نا کہ بنا مطلب ماپتے پھرنا شہر کی گلیاں سیر کے بہانے!"

"عورت کے لئے سب سے اچھی ورزش گھر کا کام کاج ہے جس سے اس کا شریر گٹھا رہتا ہے اور وہ بیمار نہیں ہوتی۔ کپڑے دھونے سے بازوؤں اور چھاتی میں طاقت آتی ہے۔ کام نہ کیا تو موٹی ہو جائیگی۔"

جنتی کو پتہ چلا تو وہ بدستور ہنستی ہوئی باہر آئی ——— "باؤجی آپ بھی حد ہیں۔ آپ کو پتا ہے۔ میری طرف داری کریں۔ آپ اُلٹا مجھے کام کرنے کے لئے کہتے ہیں تو میں کام نہیں کرتی؟ سارا دن سینا، پرونا کتر بیونت کے علاوہ کپڑے دھونا، حتّے کہ برتن بھی مجھے ہی مانجھنا پڑتے ہیں۔ گو آنند کی تو یہ کوشش ہوتی ہے، ذرا بی بی آنکھ ادھر کرے اور وہ جھٹ سے سارے جھوٹے برتن گرم پانی میں ڈال دے۔ سابُن نہیں اور جھاڑ پونچھ کر برتنی پر لگا دے۔"

"تو خود کام کرتی ہے، یہ سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی" ——— باوجی کہہ رہے تھے۔ لیکن ایک بات سے انہیں بھی اتفاق تھا کہ جنتی کو برتن نہیں صاف کرنے چاہئیں۔ وہ بہو بیٹی سے سر دبوانے، جوتا اٹھوانے، چلم بھروانے اور ایسے نیچ کام کروانے کے خلاف تھے۔ نہ اپنا میلا کپڑا کسی بہو بیٹی کو دیتے نہ ان کا اپنے بدن سے چھونے دیتے۔ کہتے تھے۔ ضروری ضروری کپڑے آپ دھونے چاہئیں اور جو بہت ہو جائیں تو ایک کی جگہ دو دھوبی لگائے جائیں۔ ایک کو دوسرے کے اوپر لگایا جائے تو یہ لوگ آپس میں لڑتے ہیں اور مالک سکھی ہو جاتا ہے ———

خوب اُبھری تھی!

جینتی نے اُنگلیوں سے پُرس کی مانگ بناتے ہوئے کہا: "وہ دیکھا وہاں آیا تمہارا کبھی ہاتھ۔ ہاتھ میں لکھا ہے۔ کام کرو گی تو کھاؤ گی"

"نہ کرو گی تو بھاگیہ تمہیں کیا کچھ نہ دے گا۔" باؤجی نے میری وکالت کی۔

جیسے کچھ دیر روشنی کی طرف دیکھتے رہنے سے ہر چیز پر ایک لال نیلا اور کالا سا دھبہ نظر آتا ہے اور نگاہ کے ساتھ ساتھ حرکت کرتا ہے۔ آج اُن اس بڑھاپے کی روشن باتوں نے یوگی، جینتی اور باؤجی کے چہرے کو ایک منحوس رنگ دھبے کے پیچھے چھپا دیا تھا۔ کبھی کبھی جینتی کی شکل صاف نظر آتی۔ وہ کتنی بھولی دکھائی دیتی تھی — اچھی بیٹی، اچھی بیوی، اچھی ماں ... وہ ہنستی رہتی تھی۔ میں نے اُس کی ہنسی کو کچلنے کی بہت کوشش کی۔ اس کی مسکراہٹوں کا جواب میں نے تیوریوں سے دیا اور ہنسی کا جواب خفگی سے لیکن وہ ہنستی رہی۔ کیا موت اس ہنسی کو کچل دے گی؟ ... وہ بوڑھا سال میرے دل کے تالاب میں ایک وزنی پتھر پھینک کر چلا گیا تھا اور مجھے معلوم ہوتا تھا جیسے کثرتِ تلاطم سے میرے دل کے کنارے — دل کے اندر گر رہے ہیں۔

"گن آنند — ارے او گن آنند"۔ میں نے اپنے آپ سے بچنے کے لئے آواز دی

"جی ہوا!"

گن آنند ایسے ہی بولا کرتا تھا — "جی ہو" میں نے کہا "جی ہو کے بچے، باؤجی کے لئے حقہ ڈال دے۔" جواب میں پھر "جی ہو" کی آواز آئی۔ اس اثنا میں باؤجی اپنی جیب سے تمباکو نکال چکے تھے اور میری طرف بڑھا رہے تھے۔ پڑوسیوں کا موزہ، جینتی کی سلائیوں پر لمبا ہوتا جا رہا تھا۔ جب وہ تیسری سلائی ڈالتی اور دایاں اور بایاں ہاتھ اکٹھا جھٹکتی تو ساتھ ہی اس کے پتلے، نمدار ہونٹ سمٹ جاتے۔ میری نگاہوں کے قریب سے کہیں ایک کرن اس کے ہونٹوں پر پہنچ کر پھیل جاتی — اُس وقت وہ باؤجی کی طرف اشارہ کرتی اور میں جھپ جاتا۔ پہلے میں جینتی بیٹی کو دیکھ رہا تھا۔ پھر جینتی ماں کو دیکھنے لگا — اب میرے سامنے جینتی تھی — عورت! ... میری نگاہیں اس کے خوبصورت جسم اس کے بت کی پیمائش کرتی ہوئی کولہوں پر آ رکیں۔ درزی نے بانات میں سے دو دو ریشے کھینچ کر ایک نے قریب قمیص کو کس دیا تھا اور جینتی کے اوپر اور نیچے کے جسم کی حد بڑی صفائی سے باندھ دی تھی۔ درمیان کا جسم کپڑے کے نیچے یوں معلوم ہو رہا تھا گویا ایک بھوری سی جلی آگ کے پاس سے اٹھ رہی ہے اور کمر کے ... کے جسم سے اوپر اٹھا کر کھڑی اکڑ رہی ہے ... اور اس کے بعد یوں نظر آنے لگا جیسے بہت بڑے پینسٹھ والی ستار پڑی ہے۔ شاید ستار کو عورت کے جسم کی مناسبت سے بنایا گیا ہے ....

اس وقت تک گن آنند باؤجی کے لئے حقہ ڈال چکا تھا بلکہ باؤجی بھی تمباکو چلم میں پھینک چکے تھے۔ جینتی میری نگاہوں کی تاب نہ لا کر شرما گئی تھی۔ بیٹی اور ماں کی صورت میں جو وقار جینتی کے چہرے پر ہوتا ہے ویسا ہی وقار عورت ہونے پر بھی قائم رہتا۔ بلکہ وہ کبھی یوں سر اٹھاتی جیسے کہہ رہی ہو — میں ہوں! لیکن میں اپنی نگاہوں کی فحاشی سے اکثر اُسے اس کے مغلوب ہونے کا یقین دلا دیتا۔ اس وقت وہ نہایت بے بس ہوتی اور میں اور جیسے ہتھیاروں کی مدد سے وہ شخصی لڑائی جیت لیتا۔ وہ قاعدے کی لڑائی میں عورت سے کون کبھی جیتا ہے؟

میں اپنے کمرے میں چلا گیا اور نئے سرے سے اپنے دوست کی بدگمانی دور کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے اس کے نام ایک بے سر و پا لمبا چوڑا خط لکھا۔ کیونکہ میں اس کی دوستی کی قدر کرتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ محض اس بات پر مجھ سے ناراض ہو جائے کہ میں نے ایک معمولی سی پارٹی میں اس کا تعارف عورتوں سے نہیں کروایا۔ میں جانتا ہوں وہ اس محفل میں محض چائے پینے کی غرض سے نہیں بلایا گیا تھا اور مجھے عورتوں کے علاوہ اس شام کے دیہان کے ساتھ بھی اُسے ملانا چاہیے تھا لیکن قصہ یہ تھا کہ میں تو مہمانوں کے سواگت میں لگا ہوا تھا اور یہ تعارف کا کام کسی دوسرے کے سپرد تھا یا شاید میں نے اپنے دوست کو بہت اپنا بھی سمجھ لیا تھا اور اس لئے بنا جانے بوجھے مجھ سے یہ غلطی ہوئی ...

لیکن میں بہت دیر تک اس خط کے متعلق سوچ بھی نہ سکا۔ اس وقت شام ہو چکی تھی اور دائیں طرف کے مکان میں اوپر کے فلیٹ پر روشنی اور سائے آپس میں گھل مل گئے تھے۔ کمروں میں ابھی بتیاں نہیں جلی تھیں فقط کچھ دوپٹے ادھر ادھر حرکت کرتے نظر آ رہے تھے۔ سامنے سڑک پر

پاس کہیں سے بتی جلی اور پھر بجھ گئی۔ معلوم ہوتا تھا۔ بجلی کمپنی والوں نے آزمائشی طور پر ان قمقموں کو روشن کیا ہے۔ میں جیتی کے متعلق سوچنے لگا۔ نہیں مجھے دوسری شادی کسی قیمت پر منظور نہ تھی۔

میں نے قلم کو میز پر رکھا اور آرام کرسی پر اکڑوں بیٹھ کر دونوں گھٹنوں کو اپنے ہی بازوؤں پر بھینچ لیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی کنگلی کمپنی سے تنخواہ لینے کے لئے بیٹھا ہوا ہے۔ میری ٹھوڑی بڑے آرام سے گھٹنوں پر ٹکی ہوئی تھی۔ یہ بات نہیں کہ اس ٹھوڑی کو اٹھانے پھرنا مجھے بوجھل معلوم ہو رہا تھا۔ بلکہ بات یہ تھی کہ اس طور بیٹھنے سے میں ما فیہا سے بے خبر سوچ سکتا تھا۔ اپنا بچہ میں دنیا جہان کی باتیں سوچنے لگا۔ اس دنیا جہان کی باتیں جن سے جیتی متعلق تھی۔

شادی کے بعد پانچ چھ سال تو ہم نے ایک دوسرے کو سمجھنے میں لگا دیے ..... میری ماں مر چکی تھی۔ اس لئے مجھ میں خواہ مخواہ یہ احساس پیدا ہو گیا کہ جیتی میرے یتیم بہن بھائیوں کو اپنی طرح نہ رکھے گی۔ مجھے وہ شدید اختلاف کا دن یاد ہے جب جیتی نے میرے بہن بھائیوں کی بجائے مجھے اچھا کھانا دیا۔ میری ہدایات کے عدم پابندی اور میرے اتنا لی غصے میں بہت سا برتن باہر پھینک دیے۔

جہاں مجھ کبھی اس قدر شدید اختلاف ہوتا تھا جیتی وہیں جایا کرتی تھی حالانکہ اسے وہاں نہیں جانا چاہئے تھا۔ میرا تجربہ ہے کہ جب کوئی عورت بہت "پتی پتا" ہو جاتی ہے اور شادی کے بعد خلاف کوئی شکایت کرے تو شوہر مزید بیہودہ باتیں کرتا ہے۔ دراصل بات کو بیہودہ نہیں سمجھتا۔ اچھا یا برا دونوں اضافی چیزیں ہیں تو بھی۔ برخلاف اس کے جب عورت شور مچاتی ہے اور محلے والوں کو اکٹھا کر لیتی ہے اور نام نہاد شرافت سے سہمی نہیں رہتی تو مرد زیادہ سے زیادہ ایک دو بار ایسا شور برپا ہوتے دیکھتا ہے۔ اس کے بعد وہ راہ راست پر آجاتا ہے۔ ہر انسان میں جھگڑے سے بچنے کی قدرتی خواہش ہوتی ہے۔ اس امتحان کے بعد اگر کوئی مرد نہ لوٹا تو پھر اس کا کوئی علاج نہیں سوائے اس کے کہ وہ خود ہی شرمندہ ہو جائے۔ اس دن بھی محلے کے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ عورتیں اور مرد۔ انہوں نے مل کر مجھے شرمسار کیا ——— اور میں خود ہی آکر شرف پرستی کے ساتھ لایا

"بات یہ ہے یہ جو تمہاری عورتوں کو خراب کرتی ہیں۔" وہ کہنے لگیں۔ "جیتی نے اگر تمہیں اچھا کھانا دیا ہے تو بہت اچھا کیا ہے یہ تو ایک اچھی عورت کی صفات میں سے ہے۔" جیتی کہہ رہی تھی۔ "گھر بھر میں مرد ہمیشہ سب سے اچھا کھاتا اور سب سے اچھا پہنتا ہے۔ اس کے بعد کسی کی باری آتی ہے۔ میں اپنے بچے کو وہ کھانا نہیں دیتی جو آپ کو دیتی ہوں ——— ہاں اگر میرے اپنے بچے اور تمہارے بہن بھائیوں کے کھانے میں فرق ہو تو مجھے چوٹی سے پکڑ لو.....

اس وقت جب میں یہ باتیں سوچ رہا تھا تو بیرونی جھونپڑی کے زمین پر بیٹھنے کی آوازیں آئیں۔ معلوم ہوا بابو جی اپنے ہاں جا رہے تھے اور ان کی کھڑاؤں ایک باقاعدہ حقارت کے ساتھ زمین پر پڑ رہی تھی۔ جاتے جاتے میری ادھم کی آواز کانوں میں پڑی۔ اس وقت وہ اکیلے نہیں جا رہے تھے بلکہ یوگ کو بھی اس کے ننھیال لے جا رہے تھے۔ کمرے کا پٹ آہستہ سے کھلا اور آواز آئی ——— "بھاگیہ جیتی بیٹیا! میں جا رہا ہوں"۔

میں نے وہیں سے آواز کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا ... "پھر کب آؤ گے، باؤ جی؟"

"اب جیتی کو کہو نا دو تین مہینے ہمارے ہاں چلی آئے"۔

"اب بھی تو آپ ہی کے ہاں ہے"۔

"نہیں۔ میرا مطلب ہے" ... بابو جی کہہ رہے تھے ——— "میں اس سال وشنو دیوی جا رہا ہوں جیتی بھی میرے ساتھ چلی جائے"۔

"اچھا، باؤ جی ——— ابھی راستہ کھلنے میں دیر ہے۔ سوچ لیں گے ——— پرنام"۔

یوگ نے دروازے سے منہ نکال کر مجھے لکڑی کا انجن دکھایا۔ یہ غالباً بابو جی لائے تھے۔ انجن دکھاتے ہی وہ اونچی آواز میں ہنس کر اپنے نانا کے ساتھ ہو لیا۔ میں کرسی میں ذرا سا ہلا تو اسے خیال آیا کہ میں اسے ننھیال نہیں جانے دوں گا۔ اس لئے وہ فوراً بھاگ گیا ———

جیتی ایک خداداد ذہن کی مالک تھی۔ وہ معمولی سی ہندی جانتی تھی اور بس۔ اسے کسی طور بھی پڑھے لکھے ہونا نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے باوجود میں کبھی اسے انگریزی فلم دیکھنے کے لئے لے جاتا تو وہ فلم کی ... سمجھ جاتی۔ جزوی تفاصیل اور گفتگو کے متعلق وہ لغزش کھا جاتی ہو۔ لیکن جیتی کا مفہوم اور کہانی کے مرکزی خیال تک پہنچنے میں اسے کبھی دیر نہ لگتی۔ بلکہ جب کبھی ... ذہانت کے مطابق ...

اور اس سے پوچھتا ——— اب کیا ہوا؟ تو وہ چند ہی لفظوں میں تسلسل قائم کر دیتی . . . . لیکن ان خوبیوں کے باوجود جیتی میں چند شدید نقائص تھے مثلاً یہ کہ وہ کسی کی بات پوری نہ سنتی تھی۔ درمیان میں بول اٹھتی۔ دوسرے یہ کہ وہ جھوٹ کو بالکل برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ فوراً دو ٹوک بات منہ پر کہہ دیتی کہ یہ جھوٹ ہے۔ حالانکہ یہ اخلاق کے منافی ہے ——— جھوٹ اس کی برداشت سے باہر تھا۔ اس لئے رشتے دار اس سے ناراض رہتے تھے۔ وہ لاگ لپیٹ کے ساتھ بات کرتے تھے لیکن جیتی انہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی ———

میری عادت ہے نئے حالات کا مقابلہ کرنے سے جی چراتا ہوں۔ شاید مجھے اپنے کرایہ دار سے کرایہ مانگنا پڑے تو میں اس سے نہیں مانگوں گا۔ تاوقتیکہ وہ مجھے خود نہ دے دے یا کوئی ایسی بات کرنے سے احتراز کروں گا جس سے میرے دل کا امن و امان تباہ ہو جائے۔ لیکن ایسے میں جیتی عین مقام پر پہنچ کر دو ٹوک فیصلہ کر دیتی ہے۔ جہاں میں امن و امان کے متعلق سوچتے رہنے سے اپنے دل کا سکون کھو بیٹھتا ہوں۔ وہاں وہ جھگڑا کر کے ایک مستقل قسم کے سکون کی بنیاد رکھ دیتی ہے۔ جیتی میرا مرد ہے اور میں اس کی عورت ہوں! . . . . اور میں کیسے برداشت کر سکوں گا کہ یہ عورت مر جائے اور میں دوسری شادی کر لوں

سردار فتح سنگھ حویلیاں والے دروازے میں نمودار ہوئے اور میرے خیالات کا سلسلہ تھوڑی دیر کے لئے منقطع ہو گیا۔ ان کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا جو ڈاکیہ غلطی سے ان کے برآمدے میں پھینک گیا تھا۔ میں نے کہا ——— "شکریہ سردار صاحب!" سردار صاحب جواب میں مسکرا دیئے اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولے۔ گویا کوئی بات اتفاقاً یاد آ گئی ہو ——— "آج ... رخصت لی کیا؟" میں نے کہا "نہیں سردار جی! آج میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے" . . . . "اچھا، اچھا ——— ہا ہا اچھا" ——— اور سردار صاحب چلے گئے۔ جیتی وہاں ہوتی تو فوراً کہہ دیتی کہ وسکی والی بات سردار صاحب کو اتفاقاً نہیں آئی بلکہ وہ کچھ دیر پہلے ضرور اس کے متعلق سوچ رہے ہوں گے۔ گذشتہ بارش کے روز سے انہوں نے ابر سے خوب فائدہ اٹھایا تھا اور آسمان پر ادھر ادھر کہیں کہیں بادل نظر آتے تھے جنہیں سردار صاحب اپنے تخیل ہی میں یکجا کر رہے تھے۔ شام کے وقت دھند آسمان سے نیچے اتر آئی تھی اور سڑک پر بجلی کی بتیاں . . . محدود . . . روشن کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکتی تھیں۔ سرو، شیشم اور ... کے درخت دو بلند قامت سایوں کی صورت میں نظر آ رہے تھے۔

مجھے خیال آیا کہ اگر جیتی میری جگہ ہوتی تو وہ اس لفافے کو بھی محض مجھ تک آنے کا ایک بہانہ سمجھتی۔ یہاں پہنچ کر جیتی سے مجھے اختلاف ہو جاتا ہے اور میں اسے شرافت نہیں سمجھتا۔ اوّل تو کوئی وجہ نہیں کہ کسی کو ثبوت کے بغیر مجرم سمجھا جائے اور بالفرض اگر ایسی بات حویلیاں والے سردار کے دل میں تھی بھی تو یہ ایک معمولی کمزوری ہے۔ جسے کسی انسان کو جتا دینا نہیں چاہئے . . . . .

میں نے لفافہ کھولا۔ کلدیپ کی چٹھی تھی۔ میں ابھی ابھی جو خط لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ اسی کے نام تھا۔ اسی کی ایک غلط فہمی کو دور کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے یہ خط لکھ کر میرے ساتھ ہمیشہ کے لئے تعلق توڑ لیا تھا۔ میرا کلیجہ میرے منہ کو آ رہا تھا۔ میں نے بآواز بلند کہا ——— "گنگا نند" جواب آیا "جی ہاں" لیکن میں اپنے چائے پینے کے ارادے کو زبان پر نہ لا سکا کہ ابھی ابھی کمبخت کام کر کے ہٹے ہوں گے اور پھر خدا جانے بیٹھے بھی ہیں یا نہیں ——— آخر انسان کے بچے ہیں۔ انہیں دو گھڑی تو آرام کرنا چاہئے۔

لیکن دروازہ آہستہ سے کھلا اور مجھے ... مجسم کھڑا نظر آیا۔ میں نے اس کشمکش کو اتنی توجہ کے قابل نہ سمجھا اور میں نے کہا "بھئی اگر چائے کی ایک پیالی مل جائے تو . . . ." گنگا نند نے کہا "بی بی تو پہلے پیالے بنا رہی ہے"۔ میں نے کہا ——— "اچھا، اچھا ———!"

اور پھر وہی خط۔ آخر اس شخص نے میری زندگی سے نکل جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مجھے ایک دھچکا لگا۔ پھر میں نے کہا۔ چلو اچھا یہ بھی قصہ پاک ہوا۔ ہر روز یہ آدمی میرا وقت ضائع کیا کرتا تھا۔ اگرچہ باتیں بڑے کام کی کرتا تھا۔ لیکن آدمی کہی ہوئی باتوں سے کب سیکھتا ہے۔ جب تک اسے خود تجربہ نہ ہو۔ وہ کب کسی چیز کا قائل ہوتا ہے۔

کلدیپ جیتی کی طرح خداداد ذہن کا مالک تھا اور پھر اس پر پڑھا لکھا آدمی۔ مجھے وہ دن یاد آئے۔ جب میں انگیٹھی کے پاس بیٹھ کر اس کے ساتھ گھنٹوں باتیں کیا کرتا تھا۔ کلدیپ اخلاق کا مجسمہ

تھا۔ لیکن اس معمولی سی بات پر اُس نے مجھے الوداع کہنا مناسب سمجھا ۔۔۔

ایک دن میں نے اُسے کہا: کوئی آدمی اگر دیر سے بول رہا ہو اور تمہیں پتہ چل جائے کہ وہ مرزا رودرخ کوئی سے کام لے رہا ہے تو کیا تم اسے ٹوک دوگے ؟"

کلدیپ نے کہا: موقع کی بات ہے۔

ظاہر ہے امیسے من میں اس وقت یہی چھتی ہی تھی۔ چنانچہ میں نے اپنے ایک بوڑھے دوست کا ایک قصہ سنایا۔ میں نے کہا: رفیق ہے نام میرا دوست وہ ایک دن قصہ سنا رہا تھا کہ میں اپنے ایک دوست کے ہاں جایا کرتا تھا۔ اگرچہ یہ بات مخرب الاخلاق نظر آتی ہے۔ لیکن بابا دل ہی تو ہے ——— اس دوست کی بہن سے میری محبت ہو گئی۔ میں نے کہا: جی ہاں ——— ممکن تو ہے۔ رفیق کہنے لگا ——— یہ سری نگر کا واقعہ ہے، میرا دوست ایسے مکان میں رہتا تھا۔ جس کا دروازہ دریائے جہلم کی طرف کھلتا تھا ———

میں نے کلدیپ کو صاف صاف کہدیا کہ رفیق کے گزشتہ اطوار کی بنا پر میں نے یہیں سے اُس کی داستان پر شک کرنا شروع کر دیا۔ وہ حکایت میں حقائق کا رنگ دینا چاہتا تھا اور اُس کی خواہش تھی کہ اس میں رومانی کیفیات بھی پیدا کرے۔ اگر ہم دسکی کا گھونٹ پی لیتے تو یہ واقعہ ضرور شام کے وقت ہوتا جبکہ سورج جہلم پر غروب ہو رہا ہوتا ہے اور اُس کی شعلہ باری پانی پر آہستہ آہستہ مدھم ہوتی نظر آتی ہے ۔۔۔ یہی جگہ تھی جہاں کلدیپ نے مجھے ٹوک دیا اور کلدیپ کا زاویۂ نگاہ بھی وہی تھا جو میرا تھا۔ اس بنا پر اُس کی داستان میں شک کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا تھا۔ یہ صرف جغرافیہ غنڈہ گردی تھی۔ بہرحال، رفیق نے اپنی بات کو جاری رکھا اور بولا ———

ایک دن سری نگر کالج میں پڑھتا تھا اور مجھے یقین تھا کہ کنیز نشو ۔۔۔

یہ اُس لڑکی کا نام تھا ۔۔۔ سورج دیکھنے کی غرض ۔۔۔ گیا ہوگا ۔۔۔ وہیں پر رونق بلیوارڈ پر جانے کا بہت شوقین تھا۔ بلکہ میں نے اسے امیرا کدل کے پل پر جاتے بھی دیکھا۔ میں نے کہا ۔۔۔ بڑا سنہری موقعہ ہے اظہارِ محبت کا۔ میں اپنی تمام ہمت کو جمع کر رہا تھا ۔۔۔ اس کے سامنے اپنے دل کا ماجرا کہہ سناؤں گا ۔۔۔۔۔ میں ۔۔۔ آہستہ آہستہ کنیز کے ۔۔۔ پہنچا ۔۔۔ جب میں سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ میں بوسے بہتا ہوا جیسے میں پہنچا۔ کھڑکی دریا کی طرف کھلی ہوئی تھی اور کمرے کے اندر سے کنیز مجھے کھڑکی پر کھڑی نظر آئی ———

اس وقت سورج ڈوب رہا تھا ——— اور بغیر وسکی کے رفیق نے سورج کو غروب کر دیا۔ چنانچہ سورج غروب ہو رہا تھا اور اس کی سنہری شعاعوں نے کھڑکی میں کھڑی کنیز کے بالوں کو طلائی سنہری لگا دی تھی۔ گویا سچ مچ "سنہری" موقع تھا اور کنیز کی پیاری پیاری شکل روشنی کے خلاف دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھی۔ میں دبے پاؤں آگے بڑھا اور آخر کھڑکی پر پہنچ کر میں نے اُسے ایک دم بازوؤں میں لے لیا اور اس کا منہ چوم لیا ——— لیکن میں گھبرا کر الگ ہو گیا۔ وہ کنیز نہیں اُس کی ماں تھی!

ہم دونوں دیر تک ہنستے رہے پہلے رفیق اور میں اور بعد میں کلدیپ اور میں۔ ایک دو باتیں غور طلب تھیں۔ وہ یہ کہ کہانی کے آخر میں یکدم ایسا پلٹا۔ داستان گوئی کے فن کے اعتبار سے بہت پرانی بات ہو چکی تھی۔ لیکن رفیق بوڑھا ہو چکا تھا اور زمانے کی دوڑ سے پیچھے رہ گیا تھا۔ دوسرے اپنی تمام داستانوں میں رفیق نے محبت میں اپنے آپ کو کامران ہوتا کبھی نہیں دکھایا تھا۔ محبت بڑے دلچسپ انداز میں شروع ہوتی تھی اور بس یونہی ختم ہو جاتی تھی۔ بسا اوقات ناکامی پر اپنی داستان کو ناکامی پر ختم کرنا رفیق کا فن تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اہلِ بینش فوراً اعتراض کریں گے کہ تمہارے ایسی شکل کے آدمی سے کون لڑکی محبت کر سکتی ہے۔ اس لئے وہ حدود کے اندر رہنا چاہتا تھا ——— کاش کوئی لڑکی اس سے محبت کرتی تو وہ زندگی میں سچ کے سوا اور کچھ نہ کہتا

کلدیپ نے پوچھا ——— "پھر تم نے اُسے ٹوک دیا ؟"

میں نے کہا: "نہیں۔ اُس کے ساتھ جی بھر کر ہنس لینے کے بعد میں نے بھی اُسے ایک جھوٹی کہانی سُنا دی۔" اُس وقت کلدیپ کھڑا ہو گیا۔ اُس نے میرے ساتھ پُرجوش مصافحہ کیا اور بولا۔ "بھاگیرتھ، تم بہت بڑے آدمی ہو" اور میں نیچے حیران ہو کر دیکھنے لگا ۔۔۔

میں اس تعریف سے مزید لطف اٹھانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا: ——— "اخلاق کے لئے بہت عالی ظرفی کی ضرورت ہے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ دسترخوان پر اگر مہمان سالن گرا دے تو میزبان کا یہ فرض نہیں کہ وہ کہے ——— نہیں، نہیں کوئی بات نہیں ——— بلکہ اسے یوں ظاہر کرنا چاہئے جیسے اس نے دیکھا ہی نہیں"

کلدیپ نے مجھے بتایا ۔۔۔ ایسے انسان بھی دیکھے ہیں جو ۔۔۔

بی تھوڑا سا سالن گرا دیتے ہیں۔ کرنل فاکس میرا دوست تھا۔ اُس کے ہاتھ کھانا کھاتے ہوئے میرے ہاتھ سے چمچ گر گیا۔ میں نے اُسی وقت دیکھا اُس کی بیوی کا میز کے نیچے اپنا چمچ گرا چکی تھی: ... پھر کلدیپ نے ایک اور داستان سُنائی: پرشیا میں پرنس آف ویلز نے ہندوستانی فوجیوں کے ساتھ کھانا اسی انداز میں کھایا جس میں فوجی کھا رہے تھے۔ حالانکہ کھانا ... ی تھا اور ہندی فوجیوں کو اسے کھانے کا سلیقہ نہ آتا تھا ———

ایسا دوست، کلدیپ میری زندگی سے نکل گیا! کتنا خوش ذوق آدمی تھا۔ لیکن کیا معمولی سی بات پہ ناراض ہو جانا بھی اُس کی خوش ذوقی کی علامت ہے؟ کیا یہ غنڈہ گردی نہیں ہے کہ جو شخص پہلے ہی اپنے آپ کو مجرم تصور کرتا ہو۔ اس کو بتایا جائے کہ وہ مجرم ہے .... اچھا وہ میری زندگی سے نکل گیا ہے تو نکل جائے۔ اس کا انداز ہمیشہ ناصحانہ ہوتا تھا۔ وہ ہمیشہ مجھے یہ بتانے کی کوشش کیا کرتا تھا کہ مہمانوں کے سامنے پھل چیر کر نہیں رکھنے چاہئیں۔ پھل ضائع بھی ہوتے ہیں اور یہ طریقہ بھی نہیں ہے۔ یوں بھی مہمان اپنی مرضی سے جو چاہتا ہے کھاتا ہے اور دُوسرا بھی تھوڑا کھاتا ہے۔ ——— لیکن جس مہمان کو میں اصرار سے کھلانا چاہوں۔ اُس کا کیا کروں میں کلدیپ کی باتوں کو سُن لیتا۔ مجھے اپنے آپ کو کم عقل، کوتاہ بین ماننے میں بھی عذر نہ ہوتا تھا۔ میں ہمیشہ ثانوی درجہ حاصل کر کے خوش ہوتا تھا اور اس میں مجھے زیادہ راحت اور تسکین ملتی تھی ———

کلدیپ چلا گیا ہے تو میں خورشید کو اپنا دوست بنا لوں گا۔ وہ اچھا آدمی ہے۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو اتنا اچھا نہیں سمجھتا۔ ذہنی اعتبار سے وہ اتنا بلند نہیں۔ لیکن جب وہ میرے سامنے تھوڑی سی پی کر بہک جاتا ہے تو مجھے اچھی طرح پتہ چلتا ہے کہ پینا بُری چیز ہے۔ کلدیپ کی مدلل باتوں سے بلکہ پتہ نہیں چل سکتا

کیا کلدیپ ایسے دوست کے چلے جانے سے زندگی کا کھیل رک جاتا ہے۔ نہ ... میں سولہ برس کا تھا جب میرے والد فوت ہوئے تھے اُس وقت دُنیا مجھے اپنی آنکھوں میں اندھیر نظر آتی تھی۔ میں سمجھتا تھا سب کچھ ختم ہو گیا، سب کچھ۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے میں ایک گہری کھائی کے کنارے ... اور دیکھنے سے کنارے ... معلوم ہوتے ہیں اور جیسے میں پیچھے ... کے لئے دفن ہو جاؤں گا ... میں ... [illegible] ... تھا!

... دو رہا تھا۔ بدرو کے کناروں کی کچی مٹی کو اپنے دل کے ساتھ لگاتا تھا تو کہیں تسکین ہوتی تھی۔ ... ایک گھٹن تھی ——— گھٹن جو سارے جسم کا احاطہ کئے ہوئے تھی .... اُس وقت مجھے خیال آیا کیا اس کے بعد میرا زندہ رہنا ناممکن ہو جائے گا ——— یہ میرا ہنسنا کھیلنا ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائے گا؟ میں بدرو کے کنارے سے اُٹھا اور غسل خانے میں چلا گیا وہاں میں نے ہنسنے کی کوشش کی۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ میں ہنس بھی سکتا ہوں ——— میں ہنس رہا تھا اور ساتھ کے کمرے میں میرے والد کی لاش پڑی تھی ......

اس کے بعد میری شادی ہو گئی اور بیوی بچے مجھے والد سے زیادہ عزیز معلوم ہونے لگے۔ میں نے عاطفت کے لئے اپنے سسر کو قبول کر لیا اب میں ہنستا ہوں، کھیلتا ہوں اور قریب قریب اپنے والد کو بھول چکا ہوں بلکہ ان کی زندگی میں مجھے اتنی آزادی نہ تھی۔ اب میں جو چاہتا ہوں کرتا ہوں، مجھے کوئی روکنے والا نہیں۔ ایسے جیسے میں کلدیپ سے علیحدہ ہو کر مشکیک سرور رہا ہوں اور اگر جنتی بھنتی کھیتی چلی جائے ——— نہیں نہیں! ......

اس وقت تک رات پڑ چکی تھی اور کھانا تیار ہو چکا تھا۔ گن آنند آیا اور پرمیشری نوکرانی جو برتن توڑا کرتی تھی، گھبرا گھبرا کر ادھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ اُنہیں سانس لینے تک کی فرصت نہ تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے گھر میں بہت سے مہمان آئے ہوئے ہیں۔ حالانکہ بابوجی آئے اور یوگ کو بھی ساتھ لیتے گئے۔ جس کے دم سے گھر کی رونق تھی اور جو ہر لحظہ کوئی نیا قضیہ کھڑا کئے رہتا تھا۔

اُس وقت میرا بھی جی چاہنے لگا کہ تھوڑی سی پی لوں اور شمشان کی سی خاموشی میں کچھ ارتعاش پیدا کر دوں۔ پتاجی کی موت پر آنسو بہاؤں اور کلدیپ کی فاتحہ خوانی کروں۔ سارے بدن میں متواتر سوچتے رہنے سے جو تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اسے آسودہ کرنے کو جی چاہتا تھا۔ ... اس وقت ... کی تیاریاں کر رہے تھے اور ... کی آواز ... [illegible] ... ——— کیسی ... [illegible] ... آدمی ... سبھا ... [illegible] ...... [illegible]

صرف آوازیں غیر متعلق شور ہو کر میرے تخیل کی معاون ہو گئیں ـــــ میں سوچتا رہا ـــــ سوچتا رہا۔ . . . . اُس کرسی میں دبکا ہوا۔ اور ابھی تک کھانے کے لئے مجھے آواز نہیں دی گئی تھی . . . .

اگر میری دوسری شادی ہو بھی جاتے تو میں زندگی کو استوار کرنے سے پہلے اتنی کشمکش نہیں کر سکتا۔ دراصل میں اتنا تھکا ہوا ہوں کہ اب دوسری شادی کا متحمل ہی نہیں ہو سکتا . . . . .

لیکن یہ آسان بات ہے۔ آخر شادی کسی پڑھی لکھی لڑکی سے ہو گی جو ہر بات کو ہمدردی کے نقطۂ نظر سے دیکھے گی . . . . وُہ پلنگ پر بیٹھی ہے ایک مدراسی دھوتی پہنے جس کا کنارہ بہت چوڑا اور سیاہ ہے اور یہ پتہ نہیں چلتا۔ اس کے بال کہاں سے شروع ہوتے ہیں اور ساری کا پلو کہاں ختم ہوتا ہے۔ دھوتی کی زمین مٹیالی ہے اور اس پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تین تین حلقے نظر آتے ہیں۔ اوپر کا حلقہ سیاہ جو پلو سے مطابقت رکھتا ہے، درمیان کا زرد، اُس کے اندر کا سفید، پھر نیلا اور آخر میں دھوتی کی زمین اُبھری ہوئی ہے . . . . .

وُہ خاموش ہے گنواروں کی طرح نہیں ہنستی اور نہ جھوٹ کو اتنا بُرا سمجھتی ہے۔ شاید جو سمجھتی ہو لیکن کہتی نہیں۔ بڑی خاموشی سے مسکرائے جاتی ہے . . . . .

میں اُس سے کہہ رہا ہوں ـــــ "میں جیون کی اس دوڑ میں تھک گیا ہوں سکھداں، میں شاید تمہارے ارمانوں کو پورا نہ کر سکوں۔ لیکن میں تمہیں محبت اور سکھ دے سکتا ہوں۔ ایسی محبت نہیں جو شعلہ جوالہ ہو۔ ہاں البتہ ایک دھیمی دھیمی آنچ جس میں محبت پختہ بھی ہوتی ہے اور خوش ذائقہ بھی۔ . . . . . تمہیں دو یتیم بچے بھی سنبھالنا ہوں گے اور ان سب باتوں کے جواب میں وُہ شرما کر سر ہلا دیتی ہے۔ گویا اسے سب کچھ منظور ہے!

وُہ کہہ رہی ہے ـــــ "میرا خیال ہے، تمہارے دوستوں کو کھانے پہ بلاؤں"

"ہاں بلاؤ سکھداں، یہ تم نے میرے من کی بات کہہ دی"ـــــ اور ہم ایک فہرست مرتب کرنے لگتے ہیں۔

دوست آتے ہیں، کھانا کھاتے ہیں۔ امریکن سینڈ ٹافی میز پر رکھی جاتی ہے اور میرے دوست اسے سٹینڈ پر سے اُٹھا کر کھاتے ہیں اس خیال میں کہ کوئی چھلکا اتارنے کی ضرورت نہیں لیکن وُہ نہیں جانتے۔ وُہ ٹافی اسٹینڈ سمیت اُٹھائی جاتی ہے اور اسے منہ میں ڈال کر اسٹینڈ رکھ دیا جاتا ہے۔ میں سراسیمہ ہو کر ادھر اُدھر دیکھتا ہوں۔ سکھداں سب کچھ جانتے ہوئے بھی میرے دوستوں کی طرح غلط طریقے سے ٹافی کھاتی ہے . . . . .

اس کے بعد مجھے جانگلوسی ہنسی سنائی دی۔ میرا ماحول اس وقت اس قدر پُرسکون تھا کہ میں جیتی کی ہنسی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ دراصل . . . . دراصل میں چاہ رہا تھا کہ یہ ہنسی ختم ہو جائے . . . . مجھے کھانے کے لئے آواز دی گئی۔ میں اُٹھا جبکہ مجھے اپنی نگاہوں کے اُفق پر وُہ بوڑھا رمّال اپنے بازو ہلاتا ہوا گذرتا نظر آنے لگا۔

ـــــ راجندر سنگھ بیدی کی کتابیں ـــــ

دانہ و دام بیدی، حیات انسانی کی گہرائیوں میں اُتر کر دیکھتے ہیں اور جو کچھ محسوس کرتے ہیں۔ اس کو اس کامیابی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ کہ پڑھنے والا مصنف ہی کی شدتِ احساس کے ساتھ حقائق کا جائزہ لینے لگتا ہے۔ "دانہ و دام"۔ انہیں حقائق اور انہی تجزیوں کا مجموعہ ہے۔

قیمت دو روپے

گرہن "گرہن" ـــــ راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ جس نے اُس کے فن اور آرٹ پہ ادبیت کی مہر ثبت کر دی تھیں۔ وُہ فن اور نقطۂ نظر کے اعتبار سے ایک مکمل ادیب ہے "گرہن" میں وُہ اپنے عروج پر پہنچا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

قیمت:۔ دو روپے آٹھ آنے۔

زیرِ طبع کتابیں:۔ مریض (ایک ناول)
رخشندہ (ڈراموں کا مجموعہ)

مکتبہ اُردو لاہور

عصمت شاہد لطیف

معائنہ

اسکول کے بکھرتے ہوئے شیرازے کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹنے کی کوشش میں وہ بالکل پاگل ہو گئی۔ دوپہر کو جو لڑکیوں کے گھروں سے کھانا آتا اس میں سے ایک آدھ آدھ روٹی چپڑاسنیں نکال کر اڑا جاتیں۔ باقی میں استانیاں حصہ لگاتیں۔ بیچاری بچیاں بھوکی مرتیں۔ پہلے تو چپڑاسنوں نے سنی ان سنی کر دی پھر جو سختی کی گئی تو ایک اور چال چلی۔ لڑکیوں سے کہہ دیا "خبردار جو پورا کھانا کھایا، ہمارا حصہ ضرور چھوڑنا" لیکن یہ بات بھی زیادہ دن نہ چھپ سکی اور ایک دن چپڑاسنوں کے مظالم کی پھر کسی نے شکایت کی۔ باز پرس پر چپڑاسنوں نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

"کیا کریں مس صاحب چھ روپیہ اور تین بچے ایک اپاہج ماں اور نکھٹو بھائی کیسے گذر ہو۔ یہ اللہ ملا پیٹ بھی نہیں مارا جاتا۔"

"جیسے تیسے تو ہم پڑھا رہے ہیں اپنی بچیوں کو اپنے ہی پیٹ کو نہیں تو ان چپڑاسنوں کا کہاں سے کلا گرم کریں" لڑکیوں کے والدین نے دہائی مچائی "بیس روپے میں مکان کا کرایہ اور اپنا اور چار بندوں کا کھانا کپڑا کیسے پورا کریں" استانیاں چیخیں۔ شمن کو ایسا معلوم ہوا اسکول نہیں کسی لنگر خانے میں کھڑی ہے۔ دنیا نہیں بھوکے ننگوں کا ایک مستقل یتیم خانہ ہے جہاں اوپر سے لے کر نیچے تک ہر ایک بدحال ہے اس نے دونوں چپڑاسنوں کو اپنے پاس سے دو دو روپیہ دینا شروع کئے۔ جب کبھی ممکن ہوتا استانیوں کی دعوت کر دیتی۔ ہر ماہ دو چار غریب لڑکیوں کی فیس بھی ادا کر دیتی۔ مگر اسے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ جتنا جتنا وہ پیٹ بھرنے کی کوشش کرتی بھوک بڑھتی ہی جاتی۔ ایک فقیر کو پیسہ دے دو تو دس اور ٹوٹ پڑتے ہیں جو نہ دو تو بعض شوقین مزاج گالیوں پر بھی اتر آتے ہیں۔ غرض اس دریا دلی کے بدلے میں بجائے بزرگی کے جوتیاں ملیں۔ ہر جمعرات کو چپڑاسنیں محلے ٹولے میں بھیک بھی مانگ لاتیں استانیاں نہ بیچاری بھیک مانگنے کی ہمت اور نہ عمر بھر کی

کے پیشے کے ناتے گھر نہ بار سوائے اسکولوں کی خیرات کے اور کیا وسیلہ زندگی گذارنے کا ہوتا۔ ہر وقت ایسے برتتیں جیسے قصائی سے کھسکے۔

مگر منیزہ بیگم بالکل چنگیزی پالیسی کی قائل تھیں۔ باوجود کوششوں کے انہوں نے لڑکیوں کو ایک لفظ بھی پڑھا کر نہ دیا۔ بس ہر وقت بیٹھی منیجر صاحب کے لئے کشیدہ کاری کا جال تیار کیا کرتیں۔ شمن نے ان کی رپورٹ میں شکایت کی مگر وہ رپورٹ انسپکٹرس کے پاس بھیجنے سے پہلے منیجر صاحب نظر ثانی کو رکھ گئے اور ان کی شکایت ہی گول مال کر دی۔ منیزہ بیگم شدت سے حاوی ہوتی گئیں۔ شمن کا پلہ اٹھتا دیکھ کر وہ استانیوں پر قابو جما بیٹھیں۔ بحالی اور ترقی کی کامیاب سفارشیں ہونے لگیں۔ آموں کی چٹنی کے ساتھ انہوں نے اسکول کی بھی چٹنی بنانی شروع کر دی۔ شمن کو معلوم بھی نہ ہوا اور وہ منیجر کی آڑ لے کر اس کی پیٹھ میں ڈنک مارنے لگیں۔ اس کے ملنے جلنے والوں کی رپورٹ پہنچائی اور منیجر صاحب قوم پرستی پر تل گئے۔ اس کے لباس اور طرز رہائش سے انہیں شریف خاندانوں کی لڑکیوں کا اسکول سے ہٹ جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ وہ ذرا ذرا سی بات کی خبر پا جاتے۔ کے بجے اٹھتی ہے کب سوتی ہے کیا کھاتی ہے اور کیوں کھاتی ہے۔

"کس نے کہا آپ سے" وہ حیرت زدہ ہو کر پوچھتی۔

"مجھے ہر بات کی خبر رکھنا پڑتی ہے صاحب" وہ نہایت پر اسرار مسکراہٹ چہرے پر طاری کر کے کہتے، گویا اسکول کے منیجر کو سی۔ آئی۔ ڈی کا کام بھی کرنا پڑتا ہے۔ "مجھے عوام کے قومی جذبہ کو ابھار کر چندہ جمع کرنا ہے لہٰذا استانیوں کا چال چلن ....."

لفظ چال چلن پر شمن جل کر رہ گئی۔ پتا نہیں لوگ چال چلن کو کیا سمجھتے ہیں۔ چال چلن بھی کوئی مقدس مقبرہ ہے کہ اس کے آگے ماتھا ٹیک کر نجات کی امیدیں لگا بیٹھیں۔ اگر ایک استانی زمانے بھر کی آوارہ ہے مگر کام ٹھیک کرتی ہے تو اس مقدس مٹی کی بنی ہوئی معلمہ سے ہزار درجہ غنیمت ہے جو خود تو مجسم نیک چلن ہے مگر لڑکیوں کا حال اور مستقبل تباہ کرنے میں مصروف ہے

"دیکھئے صاحب سنا ہے لڑکیوں کے پاس چٹھیاں آتی ہیں۔"

"کیسی چٹھیاں؟" شمن نے ضبط سے کام لیا۔

"اجی یہی خرافات پرچے، فنڈے بھیجتے ہیں۔ آپ ایک کام کیجئے۔ ایسی سب لڑکیوں کو جن کے پاس خطوط آتے ہیں جمع کر کے انہیں ڈانٹیے۔"

"مگر یہ کیسے معلوم ہو کہ چٹھیاں کس کے پاس آتی ہیں۔ پکڑی جائیں جب نا!"

"تو صاحب پکڑ لیجئے۔" گویا چٹھیاں بھی کبوتر ہیں کہ چھاپا مار کر پکڑ لی جائیں۔ دوسرے یہ چڑی ماری تجربے سے آتی ہے۔ ایسے خط ڈاک سے نہیں آتے بلکہ لڑکیاں ہی ایک دوسرے کی مدد کرتی ہیں۔ اپنے بھائی بندوں کی پرچہ بازیاں جاری کرنا ایک عام بات ہے۔ بیس روپیہ پانے والی استانیاں اور چھ روپیہ میں گذر کرنے پر مجبور چپراسنیں اگر پان تمباکو کا خرچ اس پرچہ بازی سے نہ نکالیں تو اور کیا کریں۔ اگر لڑکیوں کو ڈانٹو تو والدین چڑھ دوڑتے ہیں۔ پھر ان کی معصوم بچیاں یہ ہتھکنڈے کیا جانیں۔ اور ان معصوم بچیوں کا پکڑنا بھی معمولی کام نہیں حد درجہ کی ہوشیار ہوتی ہیں کم از کم وہ گروہ جو یہ شغل کرتی ہیں معصوم نہیں ہوتے۔ ہزاروں چالیں چل کر خط لائے جاتے ہیں۔ عموماً تو لڑکی کی طرف سے لڑکی کے نام ہوتے ہیں۔ جن پر بازپرس کرنے کے لئے غیب دان ہونا پڑتا ہے۔

ساتھ ہی امتحان آ گئے تھے۔ نگرانی اس چالاکی سے کہ لڑکیاں ایک دوسرے کی نقل نہ کر سکیں کا یہاں نگرانا اور پھر سارے دن چوکیداری کرنا انسپکشن کا زمانہ بھی آ گیا۔ اب یہ دیکھنا کہ سارے رجسٹر جھوٹی سچی کیسی بھی فضول معلومات سے پُر ہیں یا نہیں لائبریری کی کتابوں اور کشیدہ کاری کے نام سے روپیہ نکال کر جو منیجر صاحب نے اپنی ساس کا قرضہ اتار دیا اس رقم کی لیپا پوتی میں کون سے گر استعمال کئے جائیں۔ منیجر صاحب بھی کچھ کمتر سے رہ گئے۔

"اچھا صاحب یہ کیجئے کہ لکھ دیجئے رجسٹر میں ..... کہ گملے اور پھولوں کے بیج خریدے گئے۔" چلئے چھٹی ہوئی۔ رائے دینے لگے۔

"مگر ہیں کہاں گملے اور بیج۔ انسپکٹرس نے معائنہ کیا تو؟"

"کہہ دیجئے گا کچھ بچیوں نے توڑ ڈالے اور کچھ تیرا جنگلی کے اثر سے کہہ کر خالی ٹوٹے گملے منگوا لوں گا۔ باغ عام میں بہت بیکار پڑے ہیں۔ کچھ میرے یہاں ہیں وہ بھیج دوں گا۔ اور آپ ..... آپ نے بھی تو کچھ لگا رکھے ہیں؟"

"اپنے تو میں نے تقسیم کر دیئے کون چھٹیوں میں رکھوالی کرتا۔"

"اے لیجئے غضب کر دیا آپ نے تو ..... خیر کوئی مضائقہ نہیں۔"

"اور بیج؟"

"اوہ، لکھ دیجئے اُگے نہیں، خراب تھے اور یہ کمبخت ہوتے بھی ہیں گھنے گھنائے، واہیات کہئیے تو میں کچھ پنساری کے یہاں سے منگوا دوں۔"

"مگر یہ پورے روپیہ کا تو حساب نہ ہوا۔"

"کچھ بننے کاڑھنے کا سامان میں مکان سے بھجوا دوں گا۔"

"بہت اچھا۔"

"اور کچھ کتابیں بک اسٹال سے منگائے دیتا ہوں، خراب نہ ہونے پائیں نہایت احتیاط سے واپس کرتا ہوں گی۔ کچھ چائے پانی کا انتظام؟"

"وہ تو خیر ہو جائے گا، مگر وہ بورڈنگ، اُس کا کیا ہوگا اس کے لئے باقاعدہ رقم ملتی ہے۔"

"آپ فکر نہ کیجئے ایسا ہے کہ اس کا تو میں نے پہلے سے انتظام کر لیا ہے۔ وہ جو مشرقی بازو کے تین کمرے ہیں اس میں پندرہ بیس چار پائیاں ڈلوا دوں گا ..... بستروں کا بھی انتظام گھروں سے کر دیں گی۔ کچھ فاضل چادریں اور تکئے ہوں تو آپ دے دیجئے گا۔"

"مگر یہ تو سراسر دھوکا دینا ہے اس طرح فریب دے کر انسپکٹرس کی نظروں میں کیا وقعت رہ جائے گی۔ اگر اُسے کسی طرح پتہ چل گیا۔"

"اب صاحب پتہ چلنے کی کوئی راہ تو ہے نہیں سوائے ..... خیر ..... آپ اسکول کی مائی باپ ہیں، مجھے امید ہے کہ اسکول کی بہتری کیلئے آپ کو خود فکر لگی رہتی ہے۔ کیا کیا جائے۔ مجبوری ہے۔ یہ دیکھئے آپ کو اگر گورنمنٹ سے گرانٹ لینی ہے تو سبھی کچھ کرنا پڑے گا۔ آپ پریشان نہ ہوں میں سب کچھ بھگت لوں گا۔ بس جس وقت آئیں تو آپ .....

ارے ہاں وہ نظم؟"

"نظم؟"

"جی ہاں نظم ..... تیار کی آپنے؟"

"میں نے؟ کیوں؟"

"لیجئے صاحب! ابھی وہی انسپکٹرس کی شان میں ..... بھئی بھولی

گیا۔ دیکھئے جب وہ آکر بیٹھ جائیں تو کسی پیاری سی بچی سے گلے میں ہار ڈلوا دیجئے گا۔ عمدہ صاف کپڑے ہوں۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب کی فوراً ٹھیک رہے گی، میں اسے صبح ہی سے بلوا لوں گا۔"

"مگر وہ تو یہاں پڑھتی نہیں۔"

"ارجی سب چلتا ہے، کوئی نام بہ نام تھوڑی ایک ایک لڑکی دیکھی جاتی ہے۔ آپ یہ کیجئے گا کہ صبح سے بلوا لیجئے گا...... ہاں"

"جیسی آپ کی مرضی!"

"اور ہاں پھر ہار وغیرہ پہنا کر لڑکیوں سے نظم ..... چہ لاحول ولا قوۃ آپ نے نظم تو تیار نہیں فرمائی۔"

"میں نے عرض کیا نا کہ مجھے نظم لکھنی نہیں آتی۔"

"چہ تو یہ ایسی مشکل ہی کیا ہے، پچھلی مرتبہ رضیہ بیگم نے بنا دی تھی، اگر مل جائے تو وہی چلا دیجئے، دو چار لفظوں کا ہیر پھیر کرنا ہوگا.... ورنہ ٹھہریئے میں ہی کچھ سوچوں گا۔" اور وہ چہرے پر شاعرانہ جذبات طاری کرنے کی کوشش کرنے لگے "ایں؟ ہیں؟" "نہیں سوجھ ہی گئی۔" وہ دیکھئے پاس جو قومی ہائی اسکول ہے۔ اس میں جو جلسے ہوتے رہتے ہیں۔ وہاں ہزاروں نظمیں پڑی ہیں۔ منگوا نا ہوں۔ ہیں .... ایے ننھے ..... او ..... سالے .... اوہ معاف کیجئے گا ...... دیکھ بے ذرا مسعود صاحب کے پاس تو جا ایک کرکہنا منیجر صاحب نے سلام کہا ہے اور نظمیں مانگی ہیں۔"

"نجمیں؟"

"ابے ہاں گدھے۔ کہیں ..... چہ الو ہے تو ..... معاف کیجئے گا .... خیر میں خود ہی لے آؤں گا .... اور کل تک پہنچ جائے گی آپ اس میں ردّ و بدل کروا لیجئے گا۔ اسکول میں ایک دن پہلے سے سجوا دوں گا۔ اور امتحان پیر سے شروع کروا دیجئے گا ..... اس روز پرچہ رکھ دیجئے گا۔" انسپکٹرس کو اردو نہیں آتی تھی تعلیمی انسپکشن سے بچنے کی یہی ایک صورت تھی۔

انسپکٹرس کی آمد کی خوشی میں پاس پڑوس کے جتنے گملے تھے آگئے کسی میں پودینہ تو کسی میں ہری مرچیں مگر برآمدہ ہرا بھرا ہوگیا۔ کتب فروشں سے دس روپیہ کرایہ طے کر چار پانچ سو کتابیں بھیج دیں۔ اتنا دیکھنے کی کسے فرصت یا فکر تھی کہ اس میں زیادہ تعداد ایسی کتابوں کی تھی جو لڑکیاں چھوڑ کسی کے بھی پڑھنے کے قابل نہ تھیں زیادہ تر سستے بازاری ناول "میاں بیوی" ..... "شادی کی راتیں" اور مستند کوک شاستر تھے جنہیں بڑی شان سے الماری میں چن دیا گیا ساتھ ساتھ ادھر ادھر کا کوڑا جمع کر دیا گیا۔ پہلے پرانے میگزین جنتریاں ٹیلی فون ڈائریاں اور پرانی فہرستیں نہایت صفائی سے کاغذ چڑھا کر ایسے مقام پر رکھ دی گئی تھیں جہاں سے دیکھنے والا کتاب کی ضخامت سے گھبرا کر رہ جائے نیز اس کاغذ چڑھانے والی چال کو سلیقہ سمجھے کواڑوں اور کھرچی ہوئی نیچوں پر تیل اور پانی چھڑ اگیا۔ جگہ جگہ تصویریں اور کیلنڈر وغیرہ چپکا کر دیواروں کی مفلسی پر پیوند لگائے گئے۔ لڑکیوں سے کہہ دیا تھا کہ صاف اور ثابت کپڑے پہن کر آنا تو وہ بڑی کے جوڑے نکال کر پہن آئیں۔ جھانجن چوڑیوں کی جھنکار سے اسکول اندر سبھا کا اکھاڑا بن گیا۔

ایک اور ہوشیاری کی گئی وہ یہ کہ امتحان کی کاپیوں پہ آدھا آدھا پرچہ استانیوں نے بورڈ پر لکھ کر پہلے سے کروا دیا تاکہ اگر انسپکٹرس لڑکیوں کی قابلیت کا اندازہ لگانے پہ بضد ہوں اور کسی کو ساتھ لے آئیں تو اُن میں ادیب فاضل کی لیاقت کے جوابات حل کئے ہوئے پائیں۔ ان انسپکٹرسوں کے سارے ہتھکنڈوں سے اسکول والوں کو واقف رہنا پڑتا ہے۔ کوئی چال اُن کی نہیں چل سکتی۔

اس کے علاوہ میزوں اور الماریوں میں "لڑکیوں کی کشیدہ کاری" کے نام سے کچھ بازار سے خریدی ہوئی چیزیں اور کچھ مانگے تانگے کے جہیزوں کے میز پوش پاندانوں کے کوز سلمہ کا بنا ہوا تاج محل اور قریب قریب سارے نمونے رضیہ بیگم کے کاڑھے ہوئے "سویٹ ڈریم" اور "گڈ نائٹ" سجا دیئے گئے۔ اُن میں سے بعض چیزیں تو مشین کی بنی ہوئی اور بیرونجات کی صنعت گری کا نمونہ تھیں مگر ایسے پینتروں سے یہ سب سامان رکھا گیا کہ صرف چیزوں کی تعداد بڑھا رہا تھا مگر پہنچ سے دور تھا۔ یہی نہیں بلکہ کچھ نامکمل چیزیں بھی تھیں جو پاس کے اسکول سے منگا کر سجا دی گئی تھیں۔

بورڈنگ بھی لیس تھا۔ چارپائیوں پر خالی غلافوں میں الا بلا ٹھونس

کر ٹکٹے لگا دیئے گئے۔ اُوپر سے چادریں اور پلنگ پوش ڈال دیئے گئے۔ پاس دو چار میزوں پر کتابیں سجا دی گئیں۔ یعنے کمرے سج گئے۔ رہیں لڑکیاں تو وہ تین چار کلاسوں سے چن کر مقرر کر دیں کہ جب انہیں بلا یا جائے تو حاضر ہوکر انسپکٹرس کو سلام کریں۔

خدا خدا کرکے برات کی طرح زور شور سے انسپکٹریس آ تریں گیٹ کے پاس جہاں ملا، چوڑا خوش آمدید اور جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ مینجر ہیڈمسٹرس نے مع چپراسی اور دو عیسائی استانیوں کے خوش آمدید کہا۔ یہ انسپکٹرس بھی دنیائے تعلیم میں خدا کا سا درجہ رکھتی ہیں۔ جو شان لاٹ صاحب کی سو ان کی۔ ان کا کام صرف دھوم دھڑکے سے آنا اور ڈانٹ ڈپٹ کرنا ہے۔

"یہ جالا کیوں؟ .... یہ اینٹ کیسی؟ ...... یہ گڑھا کس لئے؟" اب ان سے کوئی پوچھے سال میں دو مرتبہ اگر آئیں اور جالے اور گڑھوں میں پھنس گئیں تو کونسی قیامت آ گئی۔ سیدھی طرح آؤ، ہار پھول پہنو، تعریفی نظمیں سنو تازہ تازہ پھل اور مٹھائیاں بھینٹ کے لئے منگا رکھی ہیں وہ چکھو کچھ تمہارے ساتھ چپکے سے باندھ کر گھر پہنچا دیں گے۔ وہاں اطمینان سے چکھنا۔ بس اس سے زیادہ دخل در معقولات کی فہرست میں داخل! کیا فائدہ بُری رپورٹ سے چیف انسپکٹرس کب کب آتی ہے اور کتنی دیر کو آتی ہے۔ اس سرسری معائنے کی سرسری .... ہی رپورٹ ہو، ورنہ خواہ مخواہ تمہارا ہی حلقہ بدنام ہو جائے گا۔ اوّل تو ہم ہندوستانی ہیں بد انتظام، دھوکا جعلسازی ہمارا پیدائشی حق، دوسرے ہمارا شمار پست اقوام میں ہے۔ اب تو چڑی اور دُلّو دُلّو! تم بیکار مغز پاشی کر رہی ہو۔ تمہاری بلا سے جو رسیدوں پر جعلی دستخط ہیں جو مینجر صاحب نے خود اُلٹے ہاتھ سے کر لئے ہیں۔ اور فرضی انگوٹھے تنخواہ کے رجسٹر میں لڑکیوں اور چپڑاسنوں سے لگوائے ہیں۔ تم کیوں پڑتی ہو ان جھگڑوں میں۔

اس پر بھی جو تم نہ مانیں تو مقامی قومی اخبار کے ذریعہ تمہارے چال چلن، خفیہ رشتوں اور ہیر پھیر کا پول کھول کر رکھ دیا جائے گا۔ تم فرقہ پرست الگ مشہور کر دی جاؤ گی۔ زیادہ نہیں چار پانچ روپے کا خرچ ہے۔ سحر البیان ایڈیٹر تمہاری سات پشتوں تک کی دھجیاں بکھیر کر پھینک دیں گے۔ ہم جو جانفشانی تم کو دے رہے ہیں یہ لے کر اپنے افسروں کے سامنے رکھ دو۔ اس معائنے کے اچھے شکریہ کے انعام میں جو ہم یہ چاندی کا بکس علاوہ مٹھائی کے دے رہے ہیں، اس میں سے کچھ اپنے افسر کے بکس میں پہنچا دو۔

سپرنٹنڈنٹ صاحبہ کی نواسی کے ہاتھوں ہار پھول پہن کر انسپکٹرس نے ذرا ٹیڑھا راستہ اختیار کیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" پیار سے پوچھا۔

"اُوں، ہٹ!" لاڈلی نواسی نے جواب دیا اور مینجر صاحب کی روح قبض۔

"اوہو ہو ..... شرماتی ہے ...... بولو ...... بیٹی نام بتاؤ ...... بولو۔" بیچارے مدد کر دوڑے اصل میں وہ خود بچی کا نام بھول گئے تھے۔

"وحیدہ!" کسی نے سہارا دیا۔

"کس کلاس میں پڑھتی ہو وحیدہ!"

"بولو ... بولو بیٹی وحیدہ ..... یُج ..... ہاں ڈرو مت ..... ڈرتی کیوں ہو۔" حالانکہ بچی نہایت گستاخی سے انسپکٹرس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھور رہی تھی۔ اور ادھر مارے خوف کے دراصل مینجر صاحب پسینے ہوئے جا رہے تھے۔ مگر بچی ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"ابھی یونہی آتی ہے۔ کلاس ولاس میں تو کچھ نہیں ..... شیخ جی آدمی کی لڑکی ہے یہ اسکول آتی ہے تو عوام کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔"

مینجر کو تمام گُر یاد تھے۔ چائے اور ناشتے سے صاف انکار! یا خدا! ضرور کسی نے کان بھر دیئے ہیں۔ گذشتہ سال جو انسپکٹرس آئی تھی بیچاری کتنی اچھی تھی۔ مزے سے بیٹھی نظم سُن سُن کر گائے کی طرح جگالی کرتی رہی۔ پر یہ تو پوری دہ تھی۔"

"ہیں، ہیں، ہیں، آپ کو پسند ہوں تو بنگلے پر پہنچوا دوں ..... جی ....." مینجر اپنے سوکھے ہاتھوں کو دھونے کی نقل میں ایک دوسرے کے گرد لپیٹنے لگے۔

"یہ چنگی کے گملے ہیں!" صاف تاڑ گئی۔

"ہیں! ..... چنگی واللہ! ......" مینجر صاحب مصنوعی حیرت

اور خوف کے مارے مجلے مجلے سے اور بھی زرد اور نڈھال ہو گئے اور بوکھلاہٹ چھپانے کو گملے کے پھندے میں لگے ہوئے نمبر کو بغور پڑھنے لگے۔ کمبخت چپراسی نمبر مٹانا بھول گیا!

"اوہ! جی ہاں چنگی کے تو ہیں ہی" وہ اطمینان کا سانس بھر کر بولے۔ "سکتر صاحب نے امداد کے طور پر عطا فرمائے ہیں۔" لیجئے ایک مد اور رجسٹر سے کم ہو گئی۔ دوسری مفت کی رہی۔

شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ نہ جانے کس پُراسرار طریقے سے رجسٹر میں گملوں کی مد کے آگے لکھا تھا۔ ابھی آئے نہیں ادائیگی پیشگی ہو گئی۔ مگر انسپکٹرس تو آج خون پینے کے منصوبے گانٹھ کر آئی تھی۔

"یہ گملے کافی سے زیادہ ہیں، اور ضرورت نہیں — روپیہ واپس لے لیا جائے۔" اُس نے گملوں کی باڑ پر چھری پھیر دی۔

یہ ہوتا ہے کہ اگر پہلے ہی وار میں انسپکٹرس کو گھیر کر بدحواس کر دو تو بھیگی بلی کی طرح ہر بات پر میاؤں کروا لو۔ اگر ہاتھ اوچھا پڑا اور نکل گئی چھلکی سے، تو بس مست ہاتھی کی طرح گرجتی برستی سب چیزوں کو روند کر کھلیان کر دے گی اور یہ نئی انسپکٹرس تو بالکل تازی گھوڑے کی طرح چاروں سمت ٹاپیں ڈالنے لگی۔ مگر منیجر صاحب بڑے بڑے جن بھلا چکے تھے۔ نہ جانے کدھر سے کتابیں اُڑا دیں کچھ رہ گئیں۔ وہ ایسی کہ وہ قیمت کا اندازہ ہی نہ کر سکی، دست کاری اس نے باوجود شدت سے التجا کرنے کے نہ دیکھی۔ امتحان کا وار بھی کچھ اوچھا پڑا۔ پہلے تو دو چار کا پیالہ دیکھیں منشی سے کھُسر پُسر کی پھر کہہ دیا کہ چونکہ امتحان ہونا ہے۔ تعلیمی معائنہ پھر ہو گا۔ کس دن؟ یہ مقرر نہیں، بے کہے گولہ آن گرے گا۔

اس کے بعد اُس نے قطعی ہلاکو والی پالیسی اختیار کی۔ بجائے لڑکیوں کے فی الحال استانیوں کا امتحان لے لیا جائے تو خوب ہے۔ منیجر صاحب کے پیروں تلے کی زمین سرک گئی۔ اور سر پر مصیبت ٹوٹ پڑی۔ مارے بوکھلاہٹ کے بدکے ہوئے اونٹ کی طرح چاروں طرف دوڑنے لگے۔ اس گھبراہٹ میں کئی گملے جو سجاوٹ کے خیال سے نہایت خطرناک جگہوں پہ نازک سے سہارے سے ٹکا دیئے تھے پھسل پڑے اور "میل کم" مع تمام بانسوں اور تختوں کے اُن پر سے پچھاڑ ہو گیا۔

رضیہ بیگم کو پیٹ کی خرابی کا پرانا مرض اُبھر آیا اور وہ نڈھال ہو کر اپنی پلنگڑی پر جا پڑیں۔ دوسری استانیاں بھی از سر نو راہ شدہ ہو گئیں۔ صرف عیسائی استانیاں پھنسیں مگر وہ عیسائی تھیں بھی غنیمت۔

اسی عرصہ میں گھبر گھار کے منیجر صاحب نظم خوانی کے لئے لڑکیاں بلا لائے شاید ڈھول تاشے سے معاملے کی تریڑ کا کچھ کم ہو جائے۔ کہتے ہیں موسیقیت میں بلا کی طاقت اور جادو ہے بجھی ہوئی شمعیں جل اُٹھتی ہیں۔ بدمست ہاتھی اتھا تھئیک دیتے ہیں۔ مگر غضب ہو گیا۔ نظم کے بند بغیر تبدیلی کئے لڑکیوں کے سپرد کر دیئے گئے۔ اور تعلیمی جلوس کا ہاتھی اپنے بدلے صوبے کے کمشنر کی شان میں نظم سن کر اور بھی بدمست ہو گیا۔ مگر بجائے غصہ ہونے کے وہ بڑے زور زور سے قہقہے لگانے لگی۔ منیجر صاحب جواب تک بے قابو ٹانگوں کو صرف قوت متخیلہ کے ذریعہ روکے ہوئے تھے بے طرح لرزنے لگے اور خود بھی بدحواس ہو کر ہنسنے لگے۔

"کوئی دوسری چیز گاؤ" رسانیت سے حکم ملا۔

"ہاں ہاں کوئی دوسری چیز سناؤ ..... وہ گاؤ لب پہ آتی ہے ..... چلو کمبخت منہ کیا دیکھ رہی ہو ...... شروع کرو" منیجر صاحب لڑکیوں کی صف کے آگے پیچھے دوڑ دوڑ کر ہدایات دینے لگے "گاؤ..... ہاں ..... لب پہ؟" مگر لڑکیاں مبہوت اور شرمائی ہوئی ایک دوسرے کی پیٹھ میں گھسنے کی کوشش کرتی رہیں۔

"یہ ..... یہ دیکھئے مس صاحب میں تو ہار گیا ان سے، آپ کو نہیں معلوم، آپ نہیں جانتیں ہماری قوم کس قدر پستی میں گری ہوئی ہے یہ سب غریب اور نچلے طبقے کی بچیاں ہیں جن کے گھروں میں کوئی الف کے نام بے نہیں جانتا۔ میں تو تھک گیا سمجھاتے سمجھاتے۔ اوہ ...... ارے خدا کے واسطے ....." لڑکیوں نے اُن کی رقت آمیز آواز سے ڈر کر "لب پہ آتی ہے" شروع کی۔ مگر باوجود کوششوں کے کچھ بھی لب پہ نہ لا سکیں۔

"اچھا وہی گاؤ، سارے جہاں سے اچھا ..... چلو شروع کرو۔"

بڑے جوش سے ایک لڑکی نے پنچم سر کو گھسیٹ کر تار سُر کی لے پہ گلے کی آخری جھنجھناہٹ ختم کر دی۔ سُر بہت اُونچا تھا۔ ایسا معلوم ہوا چیل انڈا چھوڑ کر اُڑی اور منٹلا کر دالبی گر پڑی۔ پھر لاکھ

خوشامدوں کے بعد ایک دوسرے کے کہنیاں مار کر منہ پٹھوں میں ناکیں چھپا کر ایک لڑکی نے از سرِ نو تان کھینچی اور کھرج سروں میں ہندوستان کے سارے جہاں سے اچھے ہونے کا عملی ثبوت دینا شروع کیا۔ دم بولا اُٹھا۔

"بس کرو۔" انسپکٹرس اُٹھ کر چلنے لگی۔ دل شکستہ اور شرمندہ لڑکیاں چوٹ کھائی ہرنیوں کی طرح بنچوں میں اُلجھتی گرتی جا لگیں۔

"ہم جانتے ہیں آپ کا یہ اسکول کیا ہے اور کیوں قائم ہے لیکن ہمیں جان بوجھ کر پست اقوام کے ساتھ رعایت کرنی پڑتی ہے۔ سرکار کی یہی پالیسی ہے۔ ورنہ یہ اسکول دو دن بھی قائم رہنے کا حقدار نہیں۔" رپورٹ پر اس نے "اطمینان بخش" لکھ کر حقارت سے کہا۔ اور مینجر صاحب نے کھل کر سانس لی۔ . . . . خیر سے بلا ٹلی اور بُری نہیں ٹلی۔ جلدی سے انہوں نے گلاب جامنوں کی پوٹلی سنبھال لی۔ جو انسپکٹرس نے چھوئی بھی نہیں تھی۔

"اجی یہ اُجڈ کیا جانیں ان نعمتوں کا مزہ!" انہوں نے پیار بھری نظروں سے مٹھائی کو دیکھا اور چل دیئے۔

شمن سارا دن کچھ مردہ دل رہی۔ رعایت؟ آخر کیوں؟ ان نچلے لوگوں کے ساتھ ہر ایک کو دیا ہی سوجھتی ہے کمزور ہیں جاہل ہیں ناکارہ ہیں اسلئے خیرات کے حقدار ہیں۔ تو پھر ان پست قوموں کو دنیا پر سیاہ اور عفونت پھیلائے رکھنے کا حق ہی کیا ہے۔ کیوں نہیں انہیں بھی ملک کے پیڑ کی جڑ میں لگے ہوئے خطرناک کیڑے کی طرح سپرٹ ڈال کر جلا دیتے۔ یوں نیچا رکھ کر اور پستی میں گراتے جانا تو سراسر حماقت ہے۔ کہتے ہیں۔ اگر بھاری طوفان اور آندھیاں آئیں تو وہ سارے کوڑے کرکٹ کا خاتمہ کر جاتی ہیں۔ یا خدا تو پھر یہاں طوفان کب اُٹھے گا۔ جو ساری پستیوں کو کچے رنگ کی طرح بہا کر کیچڑ کے ساتھ بہا لے جائے گا . . . . . . پھر لوگ یہ پستی کو اور پستی کی طرف دھکیلنا تو چھوڑ دیں گے۔

("ٹیڑھی لکیر کا" ایک باب)

احمد ندیم قاسمی

ہیروشیما سے پہلے۔ ہیروشیما کے بعد

لوگ کہتے تھے شمشیر خان وقت سے پہلے بوڑھا ہو گیا ہے۔ اس کی رنگین طبیعت کا تقاضا بھی تھا کہ اس کا چہرہ روشن اور اس کی داڑھی سیاہ رہے، لیکن کچھ دنوں سے اس پر بڑھاپا اچانک برف کی طرح گرنا شروع ہوا، اور اس کے سر کے بالوں اور داڑھی مونچھوں کو کھچڑی بنا گیا۔ بڑھاپے کی یہ آسیبی سفیدی اس کے لباس پر بھی اثر انداز ہوئی۔ بنارسی پگڑیوں، ریشمی لنگیوں اور بوسکی کے کرتے، اور ڈھیلے ڈھالے چوغوں کی جگہ ململ کے ٹخنوں سے بالشت بھر اونچے تہمدوں اور کھدر کی کسی کسائی بنگالی قمیصوں نے لے لی۔ چہرے کی لالی نچڑ گئی، اور آنکھوں کے کناروں پر مکڑیوں نے تانیں پسار دیں۔ اس انقلاب کے باوجود بچوں سے لیکر بوڑھوں تک اور کنواریوں سے لے کر بیواؤں تک اس کی چھیڑ چھاڑ بدستور جاری رہی بلکہ کچھ زیادہ ہی شدت اختیار کر گئی، جب وہ گلی کے موڑ پر تیزی سے گزرتے ہوئے کسی نوجوان پر پھبتی کستا "ارے بھئی! وہ تو گھونگھٹ پر جا چکی"۔ یا چوپال کی پرلی طرف قبرستان کے ایک ویران گوشے میں کسی گبرو کو تکتا دیکھ کر پکار اٹھتا "آج گاڑی لیٹ معلوم ہوتی ہے"۔ تو لوگ بے اختیار ہنستے، اور خود شمشیر کے قہقہے ان سب سے بلند ہوتے۔ مگر ہر روز کوئی اسی کی دکھتی رگ کو چھیڑ دیتا "شمشیر چچا۔ جانے کیا بات ہے کہ پہلے تم ہنستے تھے تو یوں لگتا تھا جیسے کٹورے بج رہے ہوں، اور اب تم ہنستے ہو تو یوں لگتا ہے جیسے چٹانیں لڑھک رہی ہوں پربت پر سے، اور پھر نہ تمہاری آنکھیں چمکتی ہیں، نہ چہرہ دمکتا ہے، تم ہنستے ہو تو تمہارے پچکے ہوئے ہونٹوں سے خون رسنے لگتا ہے، تمہارے ماتھے کی لکیریں گہری ہو جاتی ہیں، آخر کیا بپتا پڑی ہمارے چچا پر کہ دنوں میں بجھ کر رہ گیا!"

پربت کی چوٹی پر سے لڑھکتی ہوئی چٹانوں کا تانتا بندھ جاتا۔ اور وہ کہتا "یعنی مطلب یہ ہے تمہارا کہ ہم بوڑھے سرے سے ہنسنا ہی چھوڑ دیں، اور یہ نعمت بھی تم نوجوانوں کو سونپ دیں۔ کیوں بھئی؟ ہم نے کیا بگاڑا ہے تمہارا؟ ہم نے تمہیں سپرد کر رکھی ہیں محبتیں، اور راتوں کی ملاقاتیں اور تنہائیوں کے گیت اور لال چہرے اور لو دیتی ہتھیلیاں۔ اب یہ ہنسی بھی چھین رہے ہو کہ ہم بیچ بیچ کے بے حیا بن کر رہ جائیں۔ واہ! ۔۔۔ اور بھئی، یہ ایک کان سے عطر کی پھریری نکال کر تمہیں بھی تو سنگھاؤں، کہتے ہیں جس نے حنا کا عطر نہیں سونگھا، اسے ماں نے ابھی جنا ہی نہیں!"
—— اور چٹانوں کا ایک اور ریلا گڑگڑاتا ہوا امڈ پڑتا:

لیکن لوگوں کا اندازہ غلط نہ تھا، اگرچہ وہ اس کی وجہ نہیں جانتے تھے۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ اپنے بیٹے دلیر خاں کی شادی پر اس نے محض دکھاوے کی خاطر جو دھوم مچائی تھی۔ اور اس نے چاندی کے زیوروں کے جو انبار لگا دیے تھے۔ وہ درحقیقت مہاجن کی بھرپور توجہ کا نتیجہ تھے۔ اور شہنائیوں اور گیتوں اور تہنیتوں کے ہنگامے کے بعد جب اس نے حالات کا جائزہ لیا تھا، تو ایک رات گھبرا کر پکار اٹھا تھا "دلیر خاں دیا بجھا دو بھئی۔ تیل خواہ مخواہ جل رہا ہے"!

ملحقہ کمرے کے دروازے کی روشن جھریاں، اچانک مٹ گئیں۔ اور اس نے لحاف لپیٹ کر سونے کی کوشش کرنا چاہی، مگر کروٹوں کے بہت سے دائرے بنانے کے بعد وہ اٹھ بیٹھا۔ اسے اندھیرے سے ہول آنے لگا، طاق پر سے دیاسلائی کی ڈبیا اٹھا کر اس نے چراغ جلایا تو ملحقہ کمرے سے آواز آئی "کیا بات ہے ابا؟" —— اور وہ جھنجھلا کر بولا۔ "ارے ابھی تک جاگ رہے ہو تم لوگ؟" —— اور اس نے دیا بجھا کر پھر لحاف کی پناہ ڈھونڈی۔

بار بار اس کے دماغ کو اس احساس کی ان گنت سوئیاں کریدنے لگتیں، کہ وہ اپنی اچھی خاصی پونجی کو برباد کرنے کے علاوہ تین ہزار کا مقروض ہے، اور اب اس کا بیٹا نوجوان ہے، اس کی شادی بھی ہو چکی ہے، اب اس کے بچے ہونے لگیں گے، اخراجات بڑھتے جائیں گے، اور زمینیں اجڑتی جائیں گی۔ پہلے سمندر کے پانیوں سے اس کی زمینوں پر ہر سال زندگی کی تازہ تہیں پھیل جاتی تھیں، ان لوگوں پر اسے بہت ترس آتا

تھا جن کی زمینیں دریا سے دور تھیں، جو ہمیشہ بارشوں کے محتاج رہتے تھے، بارشوں کے لئے مسجدوں میں دعائیں مانگتے تھے، غریبوں میں گڑ اور گھنگھنیاں بانٹتے تھے، نفل پڑھتے تھے، اور پھر مایوس ہو کر گالیاں دینے لگتے تھے، لیکن اب سندھ سے ایک بہت بڑی نہر نکالی جا رہی تھی، اور دریا سمٹ اور سمٹ کر بہت دُور بھورے پہاڑوں کے قدموں میں رینگ رہا تھا، بچی بچی شور زمینوں پر جب وہ مٹر کا اِکا دُکا پودا دیکھتا، اور ڈھور ڈنگر ان دور دور تک بکھرے ہوئے پودوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے، تو وہ بہت دکھی ہو جاتا۔ زمینیں روز بروز بگڑتی اور اجڑتی جا رہی تھیں، اور سندھ کا پانی ان وسیع قطعوں کے صدیوں کے سوکھے سڑے معدوں میں غرق ہو رہا تھا، جن پر نوابوں اور جاگیرداروں کا قبضہ تھا، اور جو ان قطعوں سے بیگانہ رہ کر بھی پہلے سے نہایت شاداب ریاستوں کے مالک تھے۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا" اُس نے ایک روز ذیلدار سے کہا تھا۔ "کچھ پتے نہیں پڑتا کہ ایک ہزار غریب کسانوں کی زمینوں کو اجاڑ کر صرف ایک زمیندار کی آسودگی کا سامان کیوں ہو رہا ہے، بھئی یہ بات عجیب الٹی سی ہے، خدا کی ان نعمتوں میں تو ہر انسان برابر کا حصہ دار ہے، دریا کے پانیوں پر بھی کبھی کسی کا قبضہ ہوا ہے بھئی ذیلدار؟"

ذیلدار ورثے میں پائی ہوئی نیاز مندی کا مظاہرہ کرتا "شمشیر خاں سرکار جو چاہے کرے، چاہے تو قطعوں میں دریا بہا دے، چاہے تو بھرے بھرے کھیتوں میں آگ لگا دے، ایسی باتیں یوں کھل کر نہ کیا کرو، سرکار کو پتہ چلا تو دھر لئے جاؤ گے۔ اور بھئی خدا اور سرکار پر کون انگلی اٹھائے۔"

"مگر دریا کے پانی پر کسی کا اجارا تھوڑا ہے"۔ وہ حیران ہو کر کہتا۔

"سرکار چاہے تو ہوا پر بھی لگان لگا دے" ذیلدار حسبِ عادت سرکار کی وکالت کرتا۔

اور پھر شمشیر خاں کے دماغ میں خوش مزاجی کی رَو چلنے لگتی "ہوا پر بھی لگان؟ بھئی سچ مچ اگر سرکار ہوا پر بھی لگان لگا دے، تو عجیب ڈھلک پھڑک شروع ہو جائے، ہر چوپال واویلا مچا رہے، ارے بھئی کیا ہوا؟ کیسا شور ہے؟ — کچھ نہیں بھئی، اِدھر اس گھر میں ہوا ختم ہو گئی ہے، سارے گھر والے تڑپ رہے ہیں، ایک آنسو کے نوٹ دے کر میراثی کو شہر بھجوایا ہے کہ سرکار سے ہوا کے کنستر خرید لائے — آگے آگے بھاگے، اور پھر ذیلدار، ایک بات کہوں، یہ سامنے دادا شہباز بیٹھا ہے نا۔ ہوا پر لگان لگے تو سب سے پہلے یہی دم توڑے گا بچارا۔"

"کیوں؟" کوئی سوال کرتا۔

"ایک تو غریب ہے، صبح کی بگھاری ہوئی دال دوسرے دن شام تک چلتی ہے، اور پھر دمہ کا مریض ہے، اِدھر ہوا بند ہوئی، اُدھر دادا شہباز انا للہ ہوئے، کیوں دادا؟"

دادا شہباز چشتر جو بڑھاپے کے آخری نقطے کو چھونے کے باوجود سچی بات اور مذاق سے باز نہ آتا تھا۔ پوپلے مُنہ کو کھجا کر کہتا "ہم تو بھئی مٹکا بھر لیں گے ہوا سے، اور چھپا دیں گے اُسے کوڑے کے ڈھیر میں، جب بھی ہوا نہ ملی، تو کوڑا ہٹایا، مٹکے پر سے ڈھکنا کھسکایا، پھیپھڑے بھر لئے، اور پھر مٹکا بند، تجھے ایک بوند بھی دیں تو نام بدل ڈالنا، لکھوا رکھ دینا، ہاں۔"

قہقہے پڑتے، تمباکو کے دھوئیں اٹھتے، کھانسیوں کے پٹاخے چھوٹتے، شمشیر ہر کسی پر پھبتی کستا "ابے آرام سے کھانس، ایسی کھانسی بھی کیا جیسے اونٹ کا گھٹنا ٹوٹے" — "ابے حقہ اِدھر گھما، جونک کی طرح لپٹ جاتا ہے اس سے" — "ابے سنبھل کر بیٹھ، تو نے تو دکان کھول رکھی ہے!" — مگر جب وہ گھر آتا، تو تھلتھلاتے ہوئے پیٹ والا مہاجن دوہری ٹھوڑی میں تہرے بل ڈال کر اُس کے کمرے میں کسی جھری کے رستے آ نکلتا، اور اندھیرے میں سوکھے سڑے پنجے اُس کی طرف لپکتے، اور ملحقہ کمرے کی روشن جھریاں بل کھا کر سانپوں کی طرح رینگنے لگتیں۔ "دیا بجھا دو ویر" وہ پکار اٹھتا "تیل ضائع ہو رہا ہے" — اپنی ہی آواز سن کر وہ چونک اٹھتا، آدھی رات کو اٹھ کر صندوق کھولتا کہ شاید کسی کونے میں کپڑے کی کسی سلوٹ میں کوئی نوٹ اٹک کر رہ گیا ہو، اور پھر لحاف کی پناہ گاہ میں گھس جاتا — صبح کو اٹھتا تو اس کی کنپٹیوں پر بالوں کا ایک اور گچھا بھوسلا رنگ اختیار کر چکا ہوتا۔

"یعنی ہم بوڑھے ہو رہے ہیں" اُس نے ایک روز سوچا، اور بنارسی پگڑی اتار کر پلنگ پر پٹخ دی، اس کے بعد ہر روز سفیدی ٹوکرا کی جگہ لیتی گئی۔ اور لوگ حیران ہونے لگے، کہ شمشیر پر بڑھاپا اچانک پہاڑ

طرح کیسے ٹوٹ پڑا۔

ایک روز پٹواری نے چوپال پہ آکر خبر دی کہ انگریز نے جرمن کے خلاف لڑائی کا اعلان کر دیا ہے، کمزور قوموں کی حفاظت کیلئے۔ ـــــ شمشیر کی آنکھیں چمک اٹھیں، خلافِ معمول اتنے بڑے واقعہ پر خیال آرائی نہ کی، مگر چپ چاپ بیٹھا رہا، چہرے پر کئی رنگ آئے گئے، اور پھر آگئے، آخر شام کو ٹہلتا ہوا گھر آیا، اور دلیر کو الگ لے جاکر کہا "لام چھڑ گئی، تو نے اس روز کہا تھا نا کہ انگریزوں کا چھتری والا وزیر خواہ مخواہ جرمن کو راضی کرنے کی دوڑ دھوپ کر رہا ہے، تو نے ٹھیک ہی کہا تھا، شکر ہے تو نے پڑھ لکھ لیا، ورنہ ہم ان پڑھ لوگ تو ساری عمر اندھیر نگری میں بسر کر دیتے ہیں۔ تو بات یہ ہے دلیر بیٹا ـــــ"

اس نے ہزار چاہا، کہ اعصاب کو قابو میں رکھے، اس کا رنگ نہ بدلے اس کے ہونٹ نہ کانپیں، اس کی بھویں نہ لرزیں، مگر اس وقت اس کی ذاتی غرض نے شفقتِ پدری کے خلاف لڑائی کا اعلان کر دیا تھا۔ ایک دم رک کر وہ سیدھا ہو بیٹھا، اور پھر یوں بولا جیسے اس نے ساری عبارت برسوں سے رٹ رکھی تھی، "بات یہ ہے دلیر بیٹا کہ پچھلی لام میں جو پڑھا لکھا نوجوان فوج میں بھرتی ہوا، وہ واپس آکر تحصیلدار اور صاحب ضلع اور کپتان پولس بنا۔ ایسے بھی کئی منصف میں نے دیکھے ہیں، جو بات کرتے تھے، تو یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے فوج کو حملہ کا حکم دے رہے ہوں۔ ـــ تو اب میرے خیال میں اللہ کا نام لے اور بھرتی ہو جا۔ موت سے ڈرنا جوانمردوں کا کام نہیں، یہ گھڑی تو مقرر ہے ٹالے ٹل نہیں سکتی، جنگ کے طوفان سے لاکھوں بچ کر نکل آتے ہیں، اور یہاں کئی ڈھور کیا خربوزہ کھا کر یا چربی کا حلوہ ٹھونس کر یا ویسے ہی بیٹھے بٹھائے ہنستے کھیلتے دم توڑ دیتے ہیں، چل چلاؤ تو لگا ہی رہتا ہے، تو پھر میرے بیٹے، میں چاہتا ہوں، کہ جب تو لام سے واپس آئے تو بہت بڑا افسر بن کر آئے، لوگ تیرا نام لیں تو میں فخر سے اکڑ جاؤں، یقین جانو، اس طرح میرے سفید ہوتے ہوئے بال پھر سے کالے ہونے لگیں گے، دل کا اطمینان سب سے بڑا خضاب ہے"۔

دلیر خاں فوجی سپاہیوں کے کھڑکھڑاتے ہوئے تہمد، دو گھوڑا بوسکی کی قمیص، بنارسی پگڑیاں اور پھر عطر کی پھریریاں اور انگلیوں میں ناچتا ہوا ایک سا بید، کلائی پر گھڑی، اور ان سب پر مستزاد فوں فاں اور ٹھاٹھ باٹھ ـــــ غرض ہر بات سے متاثر تھا، اور یہ تاثرات اس وقت بہت گہرے ہو جاتے تھے، جب گاؤں کی ہر اٹھتی جوانی عطر کی خوشبو اور انگریزی قسم کی لسواری مٹھائیوں کے چکر میں آکر محض فوجیوں ہی کا اجارہ بن چکی تھی، ساتھ ہی اُسے اپنے باپ کے قبل از وقت بڑھاپے کا بھی علم تھا، اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ رات کو گھر میں دیر تک چراغ جلانے کی ممانعت کیوں ہے!

مگر ابھی شاداں کے ناخنوں پر حنا کی ہلکی ہلکی لالی مٹنے نہیں پائی تھی، اگرچہ اس نے شادی کے دس روز بعد ہی سارے گھر کا کام سنبھال لیا، اور نئی نویلی سہاگنوں کے پرانے رواجوں کے برعکس گھر کی جھاڑ پونچھ کے علاوہ تالاب سے سب گھر والوں کے کپڑے تک دھلاتی تھی، لیکن آخر وہ ابھی دلہن تھی، اس کی چوڑیوں کے چھناکے میں ترنم تھا، اس کی آواز کی نرمی میں تازہ غزل کی طراری مترنم دھڑکنیں سی پیدا کرتی تھی، وہ قدم اٹھاتی تھی، تو یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے دوسرا قدم زمین پر نہیں آئے گا، ہوا میں پڑے گا، اور وہ اوپر ابھر جائے گی، اور ابھرتی چلی جائے گی۔ اس کی لانبی آنکھوں کو سرمے کی لکیر ابھی تک نیم خوابی کا خمار بخشے جا رہی تھی۔ شرماتے وقت ابھی تک اس کا دایاں ابرو اوپر اٹھ کر کمان کا سا خم کھا جاتا تھا۔ اور گوری ٹھوڑی کی گولائی حباب کی طرح کپکپا اٹھتی تھی، دلیر خاں کے نزدیک اتنے بڑے سرمائے کو کھلا چھوڑ دینا بزدلی تھی۔ لیکن جب اعلانِ جنگ کے ساتھ ہی گاؤں نوجوانوں سے خالی ہونا شروع ہوا، اور چند لوگوں نے اس کی ہچکچاہٹ پر پھبتیاں بھی کسیں، تو وہ ایک صبح کو اپنے باپ سے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی دعائیں لیتا اور شاداں کے سلگتے ہوئے لبوں کے گہرے گوشوں کا آبِ حیات پیتا گاؤں سے رخصت ہو گیا۔

دلیر خاں کے جاتے ہی گھر خالی خالی نظر آنے لگا۔ شاداں بھی اداس رہنے لگی، ہر وقت پڑی کھاٹ توڑ رہی ہے، برتنوں میں چڑیاں ناچ رہی ہیں، آنگن میں کوؤں نے ادھم مچا رکھا ہے، سلیقے اور سگھڑاپے کا سارا سحر ٹوٹ گیا، زیور اترنے لگے۔ ریشمی لہنگے کا کنارا زمین پہ گھسٹتے گھسٹتے بے رنگ ہو گیا، آنکھوں میں بھولے سے سرمہ پڑتا بھی، تو دن ڈھلے تک بہ جاتا، شمشیر اُسے دلاسہ دینے کی کوشش کرتا۔ مگر جانتا تھا، کہ جوانی

ہی محبت عبادت کی حیثیت رکھتی ہے، اور پھر شاداں تو ویسے بھی بیمار ہے۔ اُسے بہت زیادہ کام نہیں کرنا چاہئیے، ـــــ لیکن یہ اداسی، یہ آنسو یہ جماہیاں ـــ "شاداں بیٹی، یہ بڑا شگون ہے، جو الھڑ دول کا کوئی دل نہیں ہوتا۔ وہ عمر بھر نکھٹو بن کر گھر میں پڑے نہیں رہ سکتے، خدا کے لئے ہنس کھیل مسکرا ـــ سنتی ہے شاداں بیٹی؟"

شاداں شمشیر کی طرف یوں دیکھتی جیسے کہہ رہی ہے "ٹھیک ہے ہنسنا کھیلنا بڑی اچھی باتیں ہیں، مگر کس سے ہنسوں؟ کس کے ساتھ کھیلوں؟ بوڑھے چچا، تم کیا جانو ـــــ تم کیا جانو؟"

شمشیر سب کچھ جانتا تھا، وہ ہر ہفتے دلیر کے خط کا جھوٹ تراشتا "آج پھر خط آیا ہے" وہ کہتا "یہ لکھتا ہے، شاداں سے کہئیے کہ میرے لئے دعا کیا کرے۔ اداس نہ رہے، گرج کڑک اور دھواں دھار طوفانوں کے بعد مطلع صاف بھی ہو جاتا ہے، سورج بھی چمکتا ہے، ہری بھری گھاس بھی اُگتی ہے" ـــ شاداں کو کبھی کبھی شک گذرتا کہ چچا جھوٹ بول رہا ہے، آخر اُس نے چھ مہینے تو دلیر کے ساتھ گذارے تھے، اور وہ جانتی تھی کہ دلیر بڑا پاس سہی، پر اُسے ایسی باتیں قطعی نہیں آتیں، اُسے تو مابئے، ڈھولے، ٹپے اور دوہے کے سوا اور کچھ معلوم نہیں، یہ تو بڑی دانائی کی باتیں ہیں۔

اِدھر شمشیر کے ذہن میں شمشیر اور دلیر کے وزن پر کئی نام گھوم گئے تھے، مگر ان سب میں شیر خاں اُسے کچھ ایسا بھایا، کہ وقت سے پہلے ہی گاؤں بھر میں اعلان کر دیا۔

"اور اگر لڑکی ہوئی؟" کسی نے پوچھا،

"تو شیرنی"، شمشیر نے جواب دیا۔

"میں کہتا ہوں اگر نہ لڑکا ہوا نہ لڑکی ہوئی؟ تو؟" دادا شہباز شمشیر کے پوپلے منہ پر گول مول مسکراہٹ ناچنے لگی۔

"عورتیں لڑکا لڑکی کے سوا اور بھی کچھ جنتی ہیں کیا؟"

"ہاں ظالم"

"کیا؟"

"یہی لنگور، گیدڑ، بندر"

لوگ سنجیدہ ہو گئے، کیونکہ موضوع عام نہیں تھا۔ بلکہ خاص شاداں سے متعلق تھا، اور شہباز حسب عادت زیادتی پہ اُتر آیا تھا مگر شمشیر نے کہا "بھئی چچا، مذاق کا کوئی رنگ روپ بھی تو ہونا چاہئیے" یہ کہا، کہ ڈھیلا کھینچ مارا اور کہا "ہم مذاق کر رہے تھے،"

"منشی جی سے پوچھ لو" دادا شہباز بارکب ماننا تھا۔ "امرتسر میں ایک عورت نے بندر جنا ہے، زندہ ہے، ہسپتال میں ہے، ماں کا دودھ پیتا ہے، البتہ دم ذرا چھوٹی ہے۔"

دادا شہباز کا مذاق برداشت کی حد سے باہر ہو چلا تھا، مگر شمشیر کو وہ دن نہیں بھولے تھے، جب اُس نے دادا شہباز کی ایک موٹی تازی شرمیلی بہو کے پیٹ کو تھپتھپا کر کہا تھا "خضر کی عمر اور سکندر کا بخت پاؤ۔ اب آ بھی جاؤ نا۔"

اور جب بچہ پیدا ہوا، تو وہ سچ مچ شیر ہی نکلا۔ بڑے بڑے ہاتھ پاؤں، موٹا سر، گول چہرہ، گورا رنگ ـــ "ہے دادا شہباز" مارے خوشی کے اُس کے گلے سے اکٹھی آٹھ دس آوازیں نکل گئیں "سنتے ہو؟ شیر پیدا ہوا ہے شیر"

"سچ سچ سچ" دادا شہباز نے ہمدردی کی "ہائے ہائے ہائے انسان کے گھر میں حیوان، تیرے کھیل نیارے ہیں رے مولا، لڑکی ہی ہوتی۔ پر یہ شیر، یہ دم والا شیر، شمشیر، میں تمہارے کسی کام آ سکتا ہوں؟"

بوڑھے کو بازو سے پکڑ کر گھر لے آیا، تماشا دکھایا، اور پھر اُس کے منہ میں مصری کی ڈلی ٹھونس کر بولا "سیدھی طرح مبارک دے۔ ورنہ دو بڑی ڈلی سے باچھیں چیر ڈالوں گا۔"

شہباز چوکنے والا کب تھا۔ مصری کو ایک طرف کے جبڑے میں سنبھال کر بولا "ہم سولہ سترہ روپے کے بدلے فرانس کے میدانوں میں جانیں دینے جا نکلے تھے، مصری کی ڈلی کے بدلے باچھیں چیری گئیں، تو مارے نیارے ہیں ہمارے، جانہیں دیتے مبارک" ـــــ اور پھر سنجیدہ ہو کر اس نے شمشیر پر مبارک بادوں کی بوچھار کر دی،

دلیر ابھی جھانسی ہی میں تھا، کہ اُسے باپ بن جانے کی اطلاع ملی۔ فوراً ریشمی کپڑوں کی ایک گٹھڑی پارسل بھجوا دی، ادھر شاداں کو ہنسنے کھیلنے کا بہانہ ہاتھ آ گیا۔ اُدھر شمشیر کے چہرے کی جھریاں مسرت کی لہروں میں مٹنے لگیں، اور اس کی جس مزاح تیز ہونے لگی، اب اُسے ہر مہینے بیٹے کی طرف

سے بیس روپے مل جاتے تھے"، اور وہ ہر روز مہاجن کی دکان کے سامنے سے گذرتے ہوئے کہتا تھا "بس ایک سال چاچا، ایک ایک کوڑی چکا دوں گا، پر دیکھیو، وہ جو تم پچاس کے پانسو اور ہزار کے دس ہزار بنا لیتے ہو نا؟ وہ جادو کا کھیل مجھے نہ دکھانا، میں مداریوں سے نفرت کرتا ہوں"۔

مہاجن ہنستا، یہ ہنسی پہلے تو اس کی چندھی آنکھوں میں چمکتی، پھر گالوں کے ابھار میں ہونٹوں کا شگاف پیدا ہوتا اور پیٹ نیم بسمل مرغے کی طرح تڑپنے لگتا، پیٹ کے کافی دیر تک تڑپنے کے بعد اس کے حلق میں گڑگڑاہٹ پیدا ہوتی، سانسوں میں کشتیاں ہوتیں، اور قہقہہ، کھانسی، چھینک اور چیخ کا ایک مرکب بن بن کر اس کے نتھنوں اور ہونٹوں سے ایک دھماکے کی طرح ابل پڑتا، اور پھر ایک زہرہ گداز ڈکار کے بعد مہاجن کہتا "بڑے پاپی ہو تم"

شمشیر خاں اکثر کہا کرتا تھا کہ مہاجن کا قہقہہ سب سے پہلے اس کے معدے میں بیدار ہوتا ہے، چربی کی ایک تہ سے سر نکال کر ادھر ادھر دیکھتا ہے، ابھرتا ہے، مگر جب ٹھوڑی تک پہنچتا ہے تو بھٹک جاتا ہے، ایک حصہ نتھنوں؛ دوسرا منہ کے رستے باہر نکلتا ہے، تیسرا حصہ ٹھوڑی کی گدگدی آرام گاہ میں لیٹ رہتا ہے، اور جب مہاجن ہنس چکتا ہے، تو یہ بقیہ حصہ ڈکار بن جاتا ہے۔

بہت کم لوگ جانتے تھے، کہ مہاجن کے قہقہے کی طرح اس کی زندگی کا ہر پہلو اور اس کی ہر حرکت ایک طویل عمل کی عادی بن چکی تھی، لال لانبی پوتھیوں کے کاغذوں میں سیاہ روشنائی کی ننھی ننھی بندیاں کئی گھروں کی تباہی کی ضامن تھیں، اور ہر رات کڑوے تیل کی روشنی میں ان بندیوں میں اضافہ ہی ہوتا رہتا تھا۔ اور پھر وہ نہایت سبک سے چاقو کی گھرچنی اور وہ گھسا ہوا موم اور "ہرے رام ہرے رام"۔

ایک روز شمشیر کو دلیر کا خط ملا، کہ اگرچہ وہ ننھے شیر خاں کو دیکھنے کے لئے حد سے زیادہ بیتاب ہے، مگر سرکاری حکم کے مطابق وہ کسی نامعلوم مقام کو جانے کے لئے آج کل کراچی میں ہے، وہاں سے باقاعدہ خط لکھتا رہے گا۔ چند روز کے بعد شمشیر کو معلوم ہوا، کہ دلیر سمندر پار جا چکا ہے، اور اپنی تین چوتھائی تنخواہ اس کے نام لکھوا گیا ہے، شمشیر کا مقصد پورا ہو رہا تھا، لیکن وہ پٹواری سے ہٹلر کی فاتحانہ یلغاروں کے قصے ہر روز سنتا تھا۔ اور ان لوگوں پر اسے بہت رحم آتا تھا۔ جو اس گرجتی گونجتی اور بجلی کی سی تیزی سے بڑھتی ہوئی فوج کے مقابلہ پر ڈٹے ہوئے ہیں "کچھ سنا شمشیر خاں"۔ ایک روز پٹواری نے اسے ایک خبر سنائی "دس دن ہوئے میں نے تجھے بتایا تھا، کہ جرمن دنیا کے سب سے خوبصورت شہر پیرس میں داخل ہو گئے، اب آج کی خبر ہے کہ فرانس نے جرمنی کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے"۔

"دس دن میں سارے ملک فرانس پر قبضہ" شمشیر بولا "حلوے کی طرح نگل گیا کمبخت"۔

"فرانس ہے بھی حلوہ" دادا شہباز چہکا "میٹھا میٹھا، تر و تازہ، رنگ برنگا"۔

اچانک شمشیر سیدھا بیٹھ گیا "یہ فرانس کہیں دور ہے ماسٹر جی، کراچی سے کوئی جہاز اگر ۱۱ جون کو چلے تو ۲۲ جون تک فرانس پہنچ سکتا ہے کیا؟"

اسے تسلی دی گئی، کہ دلیر ابھی فرانس نہیں پہنچ سکا ہوگا۔ مگر اب ہر روز پٹواری اسے ایک وحشتناک خبر سناتا، اور اس کے چہرے پر جھریاں پھر سے ابھرنے لگتیں "انگلستان پر ہر روز تڑاتڑ حملے ہو رہے ہیں، مکان جل رہے ہیں، عمارتیں گر رہی ہیں، ملبے کے نیچے سے عورتوں اور بوڑھوں، بچوں کی لاشیں، اور خون کے چھینٹے، انگریزوں کے خون کے چھینٹے، ہمارے حاکم کے خون کے چھینٹے"۔

"بھئی، سمجھ میں نہیں آتی یہ بات" ایک سادہ دہقان نے حقے کیلئے تمباکو مسلتے ہوئے کہا "انگریز بھی مرتے ہیں کیا؟"

شمشیر کو جی بہلانے کے لئے ایک موضوع ہاتھ آ گیا "نہیں نہیں میرے عزیز، انگریز کہاں مرتا ہے، انگریز تو قطب صاحب کی لاٹھ ہے، ساگوان کا شہتیر ہے، فولاد کا ڈھانچہ ہے، میرے بھائی، انگریز بھی تو ہم جیسا انسان ہے، فرق صرف اتنا ہے، کہ وہ گورا ہے اور ہم ذرا سانولے ہیں، اس کے پاس جہاز ہیں، ہمارے پاس اونٹ، اس کے پاس بندوقیں ہیں، ہمارے پاس لاٹھیاں، اس کے پاس کپڑے کی مشینیں ہیں اور ہمارے پاس بوستان جولاہے کی کھڈی، جس میں اس کا ننھا بچہ گر کر اللہ میاں

کے ہاں سدھار گیا تھا بے چارا۔ اور پھر انگریز کے پاس جو چل ہے اور ہمارے پاس دادا شہباز، جو آدھے کا ڈھلائی موڑ کاٹتا ہے تو ایک قدم پہ پندرہ بار کھانستا ہے، اور جن کی بیگم بھر زمین میں سرکاری سڑک گزرنے والی ہے "

اور پھر پٹواری نے روز ایک تازہ پھڑکتی ہوئی خبر سنانا شروع کی۔

" آج گاندھی جی نے ہر انگریز سے اپیل کی ہے، کہ وہ جرمنوں پر اپنا دروازہ کھلا چھوڑ دے، اور ان سے کسی قسم کا لین دین نہ کرے، جرمن خود ہی تنگ آ کر واپس جرمنی چلے جائیں گے "

واہ رے میرے ملنگ سائیں، تیری دور بلائیں " شمشیر حاشیہ آرائی کرتا، " دشمن کو ایک چٹکی تک نہ لو، تو پھر دشمنی کا ہے کی! دروازہ کیوں کھلا چھوڑ دو، لٹھ کیوں نہ جاؤ تالو پر کہ بھر کس نکل جائے، ہائے، کتنا جی چاہتا ہے کہ گاندھی جی چرخے کی تکلی پر سوت کاتنے کی جگہ اس سے کسی دشمن کی آنکھ نکال لیتے "

" دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی " دادا شہباز نے کہا " اور ادھر سے حکم ملتا ہے، کھڈیاں بناؤ "

بات معقول تھی، مگر وہ شمشیر ہی کیا جو دادا شہباز کی بات نہ ٹوکے۔

" تم نے یہ بال کڑکتی دھوپ میں سفید کئے ہیں دادا۔ ہو سکتا ہے کھڈیوں کے بہانے مورچے بنوائے جا رہے ہوں "

" اور یہ دروازے کھلے چھوڑ دو ؟ "

" یعنی اندر آتے ہی دبوچ لو "

" اور یہ چرخہ چلاؤ ؟ "

" یعنی چرخہ چلاتے ہوئے کسی سے چل جائے تو تکلی چبھو دو، ہتھی دے مارو گلے پر "

" لٹھ کیوں نہ دے مارو کھوپڑی پر ؟ "

" اس طرح دشمن خفا ہو جاتا ہے نا بھولے دادا —— ہاں تو منشی جی کوئی اور خبر ؟ "

" انگلستان نے فرانس کے بیڑے پر قبضہ کر لیا ہے، زبردستی "

" یعنی گاندھی جی کی نصیحت نہیں مانی! "

چوپال پر گپوں اور قہقہوں کے ہجوم میں وہ بہت حد تک بہلانے

شمشیر کے روپ میں اجاگر ہو جاتا، مگر گھر لوٹتے ہی اس کا ضمیر اس کے چٹکیاں لیتا، دلیر کو جنگ پر بھیجنے کا مقصد اس کے سامنے آتا، تو وہ اپنے آپ کو نہایت کمینہ، ذلیل اور خود غرض محسوس کرتا، پریشان ہو کر اندھیرے میں آوارہ پھرتا رہتا، اور جب کہیں چین میسر نہ آتا، تو صندوق کھول کر دلیر کا بھیجا ہوا روپیہ گننے لگتا!

انہیں دنوں دلیر کا خط آیا، کہ وہ اب مصر میں ہے، اور خوب مزے میں ہے، اور مصری اذان بڑی سریلی ہوتی ہے اور مصری لوگ بڑے اچھے ہوتے ہیں، اور ہم روز تماشے دیکھتے ہیں، سیریں کرتے ہیں۔ اور —— " یعنی جنگ کا ذکر تک نہ تھا۔ شاداں نے یہ سنا، تو شمشیر کو اچھالتی ہوئی صحن میں بھاگ گئی، اور شمشیر خط کو دوبارہ اور سہ بارہ پڑھوانے کیلئے پٹوار خانے کے چکر کاٹنے لگا۔

—— " اٹلی نے سمالی لینڈ پر حملہ کر دیا " ایک دن پٹواری نے خبر سنائی۔

" سمالی لینڈ مصر کے قریب ہی ہے "

" ارے! "

—— " ایک ہزار جرمن ہوائی جہازوں نے انگلستان پر حملہ کیا "

" خدا کی پناہ - یعنی ٹڈی دل ہوائی جہازوں کا! "

—— " اٹلی نے مصر پر حملہ کر دیا "

" —— "

گاؤں والوں کی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا، کہ انہوں نے شمشیر کی آنکھوں میں آنسو دیکھے، وہ چپ چاپ چوپال پر سے اٹھ کر گھر کو چل دیا، اپنے کمرے میں آ کر اس نے صندوق کھولا، اور دلیر کی کمائی کو فرش پر بکھیر کر بچوں کی طرح رونے لگا۔ وہاں سے اٹھ کر دھم سے پلنگ میں گر پڑا، شاداں بھاگی آئی، تو شمشیر بولا " نہ جانے اب تک کیا کچھ ہو چکا ہو گا، دعا کر بیٹی، دعاؤں کا تانتا باندھ دے، اتنی دعائیں مانگ کہ اللہ میاں کے دربار میں شور مچ جائے، رو رو کر، بلک بلک کر، سسک سسک کر دعائیں مانگ، دلیر کی زندگی کے لئے دعائیں مانگ، اور مجھ پر لعنتیں بھیج، کہ میں نے قرض اتارنے کے لالچ میں اپنے اکلوتے لعل کو آگ کی بھٹی میں جھونک دیا، یہ نہ سوچا کہ میں اجڑ جاؤں گا، یہ نہ سوچا کہ شاداں میری اچھی بیٹی کا سہاگ ابھی نیا نویلا ہے، یہ نہ سوچا کہ —— "

اس کا گلا رندھ گیا، اور سر تکیے پر رکھ کر رونے لگا۔

شاداں چلی گئی۔ شیر کو فرش پر بٹھا کر شمشیر کی پیٹھ پر دونوں ہاتھ رکھ کر بولی: "میرے چچا! کچھ بتاؤ تو سہی آخر کیا ہوا؟ کچھ تو کہو"

شمشیر نے بازو سے اپنی آنکھوں کو چھپا کر کہا: "دلیر مصر میں ہے اور مصر پر اٹلی نے حملہ کر دیا ہے اب وہاں جہاز بم برسا رہے ہوں گے، توپیں چل رہی ہوں گی، بندوقوں کی تڑ تڑ اور گرد و غبار اور دھواں اور دھائیں دھائیں ——— میرا نازوں سے پالا دلیر، میری حرص کا شکار دلیر، میرے دلیر، میرے ———" وہ پھر رونے لگا۔

چھ مہینے تک شمشیر اور شاداں کے آنسو خشک نہ ہوئے اور دعائیں بند نہ ہوئیں، مزاروں پر دیئے جلے، بھکاریوں میں گڑ بانٹا گیا، بکرے قربان ہوئے، دونوں ایسے حواس باختہ ہو گئے، کہ رات کو گھر میں دیا تک نہ جلتا اور اگر جلتا تو جلتا ہی رہتا، کپڑے میل سے اٹ جاتے تو یونہی رسماً تھوڑا صابن کر کے الگنی پر ڈال دیئے جاتے، شیر بیمار پڑتا تو کسی آتی جاتی بڑھیا سے دوا پوچھ لی جاتی۔ چوپال پر پٹواری سے لوگ نئی خبروں کا تقاضا کرتے تو وہ کہتا۔ "بھئی نئی خبریں تو بہت ہیں، پر اگر چچا شمشیر نہ ہو، تو بات کا سارا مزا کرکرا ہو جاتا ہے، اسے آنے دو"——— مگر شمشیر کو اب چوپال پر بیٹھ کر گپیں ہانکنے کی فرصت ہی کہاں تھی، وہ نوجوان تک اداس ہو گئے تھے۔ جن پر نہایت کڑی مگر شگفتہ تنقید کر کے وہ قہقہوں کا طوفان مچا دیتا تھا۔

چھ مہینے کے بعد اسے دلیر کا خط ملا، کہ لڑائی میں اس کے کندھے پر معمولی سے زخم آئے تھے، اور اب وہ تندرست ہو کر عنقریب "انڈیا" آنے والا ہے۔

"انڈیا؟" اس نے پٹواری سے پوچھا،

"ہاں۔ یعنی ہندوستان"

"یہ انگریزی ہے؟"

"ہاں"

"یعنی دلیر اب انگریزی بھی جانتا ہے؟"

"یہی معلوم ہوتا ہے"

"اری شاداں بیٹی" وہ گھر آ کر پکارا "کچھ سنا؟ دلیر انگریزی بھی بولنے لگا اور اب واپس آ رہا ہے، اور دیکھ۔ وہ مرغی پھر رہی ہے نا۔ وہ گوری سی، بانجھ کمبخت، جو بڑے نخروں کے ساتھ تین مہینے بعد ایک ذرا سا انڈا بر آمد کرتی ہے، اسے ذبح کرا لے، اور ساتھ ہی گو رکھ کی دکان سے خوشی چاول لے آ۔ اور دیکھ، بڑے مٹکے میں جو گڑ پڑا ہے نا، وہ بچوں میں بانٹ دے ——— ہاں" ——— باہر گلی میں آ کر وہ خواہ مخواہ ایک نوجوان کے پیچھے پڑ گیا: "ارے طرے باز! ارے بائیں مڑتے ہوئے دائیں دیکھنے والے، بات سن۔ پگڑی کو اتنی کلف نہیں لگانی چاہئے کہ اچھی خاصی ملائم ململ ٹین کا پترہ بن کر رہ جائے!"

شمشیر پھر چوپال کی رونق بن گیا، "جنگ کی کوئی نئی خبر؟" اس نے پٹواری کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "کوئی تر و تازہ خبر ہو بھئی، ننھے ننھے گاؤں اور چھوٹی موٹی کھاڑیاں اور تل بھر کے جزیرے، اب تو بہت ہو چکیں یہ باتیں، کوئی ایسی خبر سناؤ منشی جی، کہ اوسانوں کو ٹھکانہ ملے"

داد شہباز ایک بڈھے سے کسی بلغم توڑ نسخے کے اجزا پوچھ رہا تھا، یکایک چونکا۔ ور کھسک کر شمشیر کے سامنے آ گیا۔ کیا کہا میاں شمشیر؟ ہائے ہائے ہائے، انسان بھی کتنا طوطا چشم ہے قرآن کی قسم ——— ارے تمہارا دلیر مصر میں تھا تو تم وہاں کے ہر ٹیلے کی خبر سنتے تھے، اور اب تمہارا دلیر مصر سے واپس آ رہا ہے، تو تم ننھے منے گاؤں اور چھوٹی موٹی کھاڑیوں کا ذکر ہی نہیں سنو گے؟ کوئی بہت بڑی خبر سنو گے تم؟ تو بھئی جنگ کی بہت بڑی خبر تو یہی ہوتی ہے نا جس میں ان گنت انسان کھیت رہیں، اور میاں شمشیر، جو جوان تمہیں بہت بڑی خبر سنانے کیلئے جانیں دیں گے، ان کے بھی تو باپ ہوں گے، ان کی بھی نئی نویلیاں بیویاں ہوں گی، اور معصوم بچے اور پیارے دوست اور ہمدرد رشتہ دار، ان کی امیدیں اور ان کے حوصلے، چاہے وہ جرمن ہوں چاہے انگریز چاہے ہندوستانی، میں انسانوں کی بات کر رہا ہوں"

شمشیر کا چہرہ ایک خوفناک ندامت آمیز سنجیدگی کے ہالے میں گھر گیا۔ مٹی ہوئی جھریاں پھر سے ابھر آئیں، پہلو بدلا، اور سر پر ہاتھ پھیر کر شہباز کی طرف دیکھا "تم ٹھیک کہتے ہو چچا" ——— اس کی آواز کھوکھلی تھی، اور پچ رہی تھی، اور اس میں گھبراہٹ کے آثار چڑھاؤ تھے۔ "میں نے تو ویسے ہی بات کی تھی، کہ ——— بات یہ ہے دلوا کر تم

ٹھیک کہتے ہو۔"

"میں نے غلط بات کب کہی ہے ؟" شہباز الجھ رہا تھا۔

"صرف اب " شمشیر موضوع کو بدلنا چاہتا تھا۔

لوگ ہنس پڑے

"میرا مطلب ہے: میں نے کبھی نہیں کہی ——"

"سچ بات "۔ شمشیر نے دادا شہباز کا فقرہ پورا کر دیا، اور چوپال قہقہوں سے گونج اٹھی،

مگر شہباز اپنے احساسات کی تلخی سے ابھی تک پیچھا نہیں چھڑا سکا تھا، بولا "تم مجھ سے بہت چھوٹے ہو۔ شمشیر اور تم نے مجھ سے کم دنیا دیکھی ہے، پچھلی لام کو ان آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں، سینکڑوں جرمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اور سچ کہتا ہوں۔ دشمن کی ہر لاش سے میرے دل کا ایک ٹکڑا چپک کر رہ گیا۔ اندھیری گرجتی دہاڑتی راتوں میں مردہ جسموں سے ٹھوکریں کھائیں، اور ٹھوکر کھا کر گرا بھی تو لاشوں پر۔ کسی کی انتڑیاں باہر پڑی ہیں، کسی کا بھیجا چٹان پر بکھر گیا ہے، کسی کی ٹانگیں غائب ہیں، کوئی مرنا چاہتا ہے اور مر نہیں سکتا۔ کوئی جینا چاہتا ہے مگر جی نہیں سکتا، میں نے ایک روز ایک لاش دیکھی، جرمن سپاہی تھا، اتنا خوبصورت کہ مورت چھاپ لینے کو جی چاہے، میں نے اس کی جیبیں ٹٹولیں، تو اندر سے سنہری بالوں کا ایک گچھا نکلا۔ اور کسی پھول کی چند سوکھی پتیاں، اور ایک مڑی تڑی تصویر —— ایک لڑکی کی —— جس کی آنکھیں اتنی گمبھیر تھیں قرآن کی قسم، کہ جہان ڈوب جائے، اور اس کی آنکھیں جیسے پوچھ رہی تھیں۔

"سچ سچ کیا تم واپس نہیں آؤ گے ؟" میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، توپوں کی دھائیں دھائیں اور دھوئیں اور دھول کی اس دنیا میں میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، میں نے یہ تینوں چیزیں اس کی جیب میں ڈال دیں، اس کے چہرے کو دیکھتا رہا اور میاں شمشیر، میری بات سننا، میں سچ کہتا ہوں میں چیخ کر پیچھے ہٹ گیا، اس کے منہ سے اچانک چند مکھیاں نکلیں، اور اس کے نیلے ہونٹوں اور ننھی ننھی سنہری مونچھوں پر بیٹھ کر بسنانے لگیں —— یہ نوجوان بھی تو دنیا کو بہت بڑی خبر سنانے کے لئے مرا —— اور میں نے ان تمام خونوں کے بدلے سات روپے پنشن پائی۔

—— یہ سات ٹھیکریاں —— یہ سات لعنتیں ——" دادا شہباز کی آواز بھرا گئی، اور وہ لاٹھی سنبھالتا چوپال پر سے اتر گیا۔

"دادا" شمشیر نے اسے پکارا۔

وہ بغیر مڑے بولا "میں پاگل ہو جاؤں گا، مجھے جانے دو۔"

"دادا" شمشیر ننھے بچے کی طرح پکارا، اور پھر سر جھکا کر بیٹھ گیا ایک مجرم کی طرح، شرمندہ اور نڈھال — جیسے دنیا کی ساری جنگوں کا ذمہ دار صرف وہی ہو۔

صبح کو اٹھا، تو شاداں کے چہرے پر غیر معمولی تازگی دیکھ کر اس کا احساسِ مسرت پھر سے جاگ اٹھا، اور جرمن سپاہیوں کی لاشیں ایک طرف سرک گئیں، "دلیر آ رہا ہے "—— "دلیر مصر سے بخیریت واپس آ رہا ہے "—— اس کی ذاتی تسلی کے لئے یہی خیال کافی تھا، اور دادا شہباز کی بھرائی ہوئی آواز اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں —— اور میں پاگل ہو جاؤں گا "—— بڑھاپا کتنا ذکی الحس ہوتا ہے، اس نے سوچا،

بڑھاپا کتنا ذکی الحس ہوتا ہے، اس نے ایک مرتبہ پھر سوچا یعنی دلیر آ رہا ہے، تو اگر واپس بھی تو جائے گا۔ اور واپس لاہور یا دلی تو نہیں جائے گا، جنگ پر ہی جائے گا۔ اور جنگ سے انسان ایک مرتبہ بچ نکلے، تو اس کا یہ مطلب تو نہیں، کہ ہمیشہ بچتا چلا جائے۔

دادا شہباز۔ قتلے کر ڈالوں تیری زہریلی زبان کے —— بات کیا تھی اور تو نے کہاں پہنچا دی !

اس نے بہت کوشش کی کہ مسکرائے، قہقہے لگائے، بھنبھلا کسے، مگر اس کے ذہن پر اچانک ایک خوبصورت چہرہ ابھرتا، اور یہ نیلے ہونٹوں اور سنہری مونچھوں پر مکھیاں بھنبھناتیں، اور کلیجے میں کرچ سے سنگین پیوست ہو جاتی اور انتڑیاں باہر ابل پڑتیں —— وہ شاداں سے کہتا "بیٹی کوئی بات سناؤ "—— مگر وہ مسکرا کر باز کاٹنے لگتی۔

"ارے بھئی کوئی بات سناؤ" وہ گلی کے نکڑ پر بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہتا،

"دلیر کب آئے گا ؟ " سوال کا جواب سوال ہی میں ملتا۔

"دادا مگر کی بات سناؤ" اُس نے چرکے لگانے والے شہباز سے بہم کی انتہا کی،

"بات؟" بڈھے نے پوچھا "یعنی کوئی بہت بڑی طرح؟"

اور شمشیر کے جی میں آئی کہ ہڈیوں کے اِس ڈھانچے کو توڑ مروڑ کر جوہڑ میں پھینک آئے۔

چند روز بعد اُسے دلیر کا خط ملا، کہ وہ گھر نہیں آئے گا۔ کراچی ... اترتے ہی اُس کی رجمنٹ رنگون چلی گئی ہے اور رنگون سے سنگاپور ... نے کا مقصد ہے۔

"دلیر نہیں آرہا" ایک دھماکے کی طرح یہ الفاظ اُس کے لبوں سے نکلے، اور شاداں جو مسالہ رگڑ رہی تھی، دم بخود ہو کر دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی،

"دلیر نہیں آرہا، وہ رنگون جا رہا ہے" اُس نے دادا شہباز کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے چوپال پر اعلان کیا۔

"بہت بڑی خبر ہے بھئی" دادا شہباز کی لے ابھی نہیں ٹوٹی تھی،

شمشیر بگڑ گیا "دیکھو دادا۔ بہت لحاظ کیا تمہارا۔ تم چند دنوں سے ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے ہو، یہ اچھی بات نہیں ہے، تمہارے سفید بالوں کی عزت کرتا ہوں ورنہ ——" اور وہ غصے سے کانپتا ہوا چوپال پر سے اُٹھ آیا،

پٹواری نے آواز دی "جنگ میں یونہی ہوتا ہے چچا"

اور شمشیر نے پلٹ کر پٹواری کی طرف یوں دیکھا، جیسے بس چلے تو اُس کی کھوپڑی ادھیڑ کر رکھ دے،

لیکن اُسی روز ایک شہباز یا پٹواری کیا، وہ سارے گاؤں سے بگڑ گیا، شاداں تک کو گھرک دیا "دبے کی زبان ہوتی تو شاید یہ مرچیں اثر کرتیں، مگر اب تو گلے سے ناف تک جلتا ہوا تیل رکھ دیا ہے تمہارے سالن نے —— بڈھوں کو جان سے مارنے کے اور بھی تو طریقے ہیں لنگر جا ... کنپٹی پر۔ کلہاڑی دے مارو ماتھے پر —— ... جاؤ، میں نہیں کھاؤں گا"

مگر آہستہ آہستہ وہ سنبھل گیا، اس کا بیٹا رنگون میں تھا، اور اُس کے خیال میں یہ ناممکن تھا کہ جنگ مغرب سے ہٹ کر ہزاروں میل کی الٹی قلند بھرے اور مشرق کے مرغزاروں میں ناچنے لگے "مشرق میں کیا پڑا ہے" پٹواری نے کہا تھا "مشرق کے لئے دوسرے بم اور توپیں تھوڑی ہیں کہ اب یہ تکلف بھی کیا جائے!"

"ایک جاپان ہے" دادا شہباز نے جہاندیدہ سیاستدان کے سے انداز میں کہا تھا "سو کمبخت پھانے گئی یا ادھ بگڑے گی گیا، برسوں سے سر پیچ رہا ہے پر یہ انگریز ابھی تک اس کے مقابلے میں ڈٹے ہوئے ہیں۔ اور بھئی جاپانی مال تو تم جانتے ہی ہو۔ جاپانی کھلونے، ادھر بچے کے ہاتھ میں آئے ادھر دانت نکال بیٹھے، اور جاپانی ریشم کے کپڑے۔ ایک تاگہ ٹوٹ آئے تو سمجھو سارا تانا بانا اشارے کا منتظر ہے۔ ان کے جہاز بھی تو ٹین کے بنے ہوتے ہیں، اور ان کے سپاہی ٹھنگنے، ناٹے، ہم لوں جا کر ان کی کھوپڑی پہ تھپڑ مارو تو زمین میں دھنس جائیں"

"نہیں نہیں" پٹواری نے دادا شہباز کو ٹوکا تھا "یہ بات تو نہیں دادا۔ مگر جنگ ابھی ادھر نہیں آئے گی۔ جنگ زندہ لوگ لڑتے ہیں لاشوں نے بھی کبھی لڑائیاں کی ہیں بھولے بادشاہو"۔

ادھر دلیر کے خط پر خط آرہے تھے، رنگون کے پگوڈے، برما کے جنگل، ناریل اور کیلے، اور —— "ہم بڑے مزے میں ہیں، رنگون برما کی جنت ہے، جنگ نہ ہوتی تو میں شاداں، شیرا اور آپ کو یہاں بلا لیتا"

شمشیر پٹواری کے پاس دوڑا آیا "کیا رنگون میں بھی جنگ ہو رہی ہے منشی جی؟"

پٹواری نے کان پر قلم دھر کر کہا "یہ جنگ کہاں نہیں ہو رہی چچا" جنگ صرف توپ بندوق کی تو محتاج نہیں، بھوک کی بھی تو جنگ ہوتی ہے، غلامی کی بھی جنگ ہوتی ہے، افلاس کی بھی جنگ ہوتی ہے، جنگ ہر جگہ ہو رہی ہے، رنگون میں بھی ہو رہی ہے، ہمارے گاؤں میں بھی ہو رہی ہے، یہ ازلی و ابدی جنگ ہے، یہ جنگ جو کبھی ختم نہ ہوگی۔ یہ جنگ جو دریا سے نہریں نکالتی ہے، جو سرسبز کھیتوں میں سے سڑکیں گزارتی ہے، جو پانی پر لگان لگاتی ہے، جو پولیس کے سپاہی کو فرد کے اختیارات بخشتی ہے، جو غریبوں کے گھروں میں جوئیں ڈالتی ہے، جو امیروں کے ریشم سے گھٹیا کی صحت میں پروان چڑھتی ہے، تم ہر روز جنگ جنگ

پکارتے ہو، جنگ ہر جگہ جاری ہے، ہماری زندگی خود ایک جنگ ہے"

"مگر جنگیں ختم بھی تو ہوتی ہیں"

"نہیں، کئی ایسی جنگیں بھی ہیں جو قیامت تک جاری رہیں گی، اب یہ جنگ ختم نہ ہوگی تو ایک نئی جنگ آدھمکے گی۔ وہ امن کی جنگ ہوگی، امن قائم کرنے کیلئے تجارت کی جنگ ہوگی، تجارت بڑھانے کے لئے سمندری راستوں کی جنگ ہوگی۔ ان کے عقب میں انسان کے پیدائشی حقوق کی جنگ ہوگی، اور جب یہ جنگ ہوگی ——— جب یہ جنگ ہوگی ———"

اور پٹواری نے کان پر سے قلم اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا اور بولا "کھتونی کہاں گئی؟"

چند روز کے بعد اس نے پٹواری سے خبر سنی "جاپان نے امریکہ پر حملہ کر دیا" اور پھر اتنے ہی روز بعد اسے معلوم ہوا کہ جاپان نے سنگاپور لے لیا۔

مگر دلیر تو رنگون میں تھا، اور رنگون سنگاپور سے بہت دور ہے، گھر آکر اس نے شیر کو اٹھایا، اور صحن میں ٹہلنے لگا "تیرا ابا رنگون میں ہے اور جنگ ہو رہی ہے سنگاپور میں، اور سنگاپور بہت دور ہے رنگون سے"۔ بچے نے ناک پر ہاتھ رگڑ کر دادا کے بال پکڑ لئے، اور جب بڑی مشکل سے اس نے بچے کی گرفت ڈھیلی کی، تو بچہ رونے لگا، شاداں بھاگی آئی، اور وہ رو رہی تھی، اس کی آنکھوں کے ڈوروں میں خون تھا۔ اس کے گالوں میں خون تھا۔ اس کے ہونٹوں پر خون تھا۔ اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا۔ شمشیر نے محسوس کیا کہ ساری کائنات پر انسانی خون کے چھینٹے بکھر گئے ہیں، لاشیں پہیوں تلے چیخ رہی ہیں۔ کھوپڑیاں فضا میں اڑتی پھر رہی ہیں، کسی آسیبی ہاتھ نے افق پر سے لپک کر کھیتوں کی ہریاول کو نچوڑ لیا ہے، اور ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے جس میں تازہ خون کی بو ہے، سڑتی ہوئی نعشوں کی بو ہے، جھلسے ہوئے چمڑے کی بو ہے۔

"دیا جلاؤ" وہ پکارا

کچھ دیر تک انتظار کرنے کے بعد وہ بھڑک کر اٹھا، اور صحن میں جا کر چنگھاڑا "شاداں میں بک رہا ہوں، دیا جلاؤ"

وہ اس وحشتناک خاموشی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا، دانت بھینچ کر چلایا "دیا جلاؤ شاداں مجھے اندھیرا نگل جائے گا"

دروازے پر کسی کی دستک ہوئی "کون ہے؟" وہ اسی شدت سے پکارا۔ اور دروازے تک گیا۔ مہاجن کی ٹھوڑی جھینپٹے میں تسبیح کی طرح لٹک رہی تھی "اب کے تم نے قسط نہیں دی"

"نہیں دوں گا قسطیں" شمشیر نے کواڑ پر گھونسا جما کر کہا "کب تک دیتا رہوں گا قسطیں، میں نے تمہاری قسطوں کے لئے اپنا بچہ موت کے منہ میں ڈال دیا، اپنے آنگن کی رونق لٹا دی، اپنی روح کو نچوڑ کر تیری پیاس بجھانی چاہی، پر تیری پیاس نہیں بجھے گی، تو نے میرے دلیر کو رڑکا۔ اب تو میرے شیر کو بھی چبا لے گا ——— جا نہیں دیتا قسطیں، بتا لے جا کر اپنے ہونزوں سوتوں کو ——— نالش کر دے ———"

پیچھے سے شاداں نے آکر اسے کھینچ لیا "آپ کس سے بول رہے ہیں سیٹھ تو چلا گیا"

"دیا کیوں نہیں جلایا تم نے؟"

"جلایا ہے"

"کہاں جلایا ہے؟ کدھر جلایا ہے؟ جلایا ہوتا تو ———" مگر دیا جل رہا تھا، اور دیئے کی روشنی میں شاداں کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ خود شمشیر کا سارا وجود جل رہا تھا، وہ دھم سے بستر پر جا گرا، بہت دیر کے بعد کروٹ بدلی، اٹھ بیٹھا، سر کو دبایا۔ اور ہولے سے بولا "شاداں بیٹی، ذرا ادھر آکر دیا بجھا دے، تیل ضائع ہو رہا ہے خواہ مخواہ"۔

دلیر کی خاموشی اور خطرناک ثابت ہوئی، قسم قسم کے وسوسے شمشیر کو پریشان کرنے لگے، شاداں گھلتے گھلتے کانٹا ہو گئی، اس کا دودھ خشک ہو چلا تھا، پڑوس کے دھوبیوں سے وہ بکری کا دودھ خرید لاتی تھی۔ مگر شیر ہمک ہمک کر ماں کے سینے سے چمٹ جاتا، ادھر پٹواری نت نئی اور خطرناک خبریں سنانے لگا۔ دادا شہباز شمشیر کو بہلانے کی کوشش کرتا، مگر شمشیر مری ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ ٹال جاتا، ہر روز مدرسے جاتا۔ جب ماسٹر جی ڈاک کھولتے تو وہ بت بنا ایک طرف کھڑا رہتا ——— "تمہارا خط نہیں آیا چچا" ماسٹر جی کہتے، اور وہ سر جھکائے گھر کو پلٹ آتا۔

ہر صبح کو مدرسے میں سارا گاؤں جمع ہوتا تھا۔ سب اپنے اپنے بیٹوں، بھتیجوں، نواسوں اور پوتوں کے خط لینے آتے، اور دکھوں کی گٹھڑیاں

اٹھا کر واپس جاتے، اور پھر ایک دن اچانک ڈاک کے بھرے بھرے تھیلے میں سے سرکاری خطوط کا ایک ڈھیر سا برآمد ہوا، ایک خط شمشیر کے نام بھی تھا۔ اُسے سرکار نے اطلاع دی تھی، کہ دلیر جاپانیوں کا قیدی ہو چکا ہے،

خط کھلتے جاتے تھے، اور آنکھیں بھیگتی جاتی تھیں، اچانک ایک طرف ایک بوڑھے نے چشاخ سے اپنی گنجی کھوپڑی پر ہاتھ مار کر کہا "میں اجڑ گیا" —— اور پھر ہر طرف سسکیاں اور فریادیں اور شیون —— ڈاکخانہ ماتم کدہ بن گیا، کوئی جنگ میں مارا گیا تھا، کسی کا کچھ پتہ ہی نہیں تھا، کوئی جاپانی قیدی تھا —— آن کی آن میں گاؤں کے بہت سے گھروں میں واویلا مچ گیا، چھاتیاں کوٹی جانے لگیں، بال نوچے جانے لگے، گلیوں میں بھگدڑ مچ گئی، "جنگ ہر جگہ ہے" شمشیر کے کانوں میں شوری کے الفاظ گونج رہے تھے۔

"شاداں۔ شاداں" اور صحن کے کونے میں بیٹھی ہوئی شاداں نے سر اٹھایا، اس کی آنکھیں سوج رہی تھیں اور کھلے بال زمین کو چھو رہے تھے۔ "میں سن چکی ہوں" اُس نے بلکتے ہوئے کہا،

"شیر کہاں ہے؟" شمشیر نے پوچھا،

"پڑا ہوگا کہیں" شاداں گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگی۔

شیر اندر کمرے میں ایک کھٹولے کے نیچے لڑھکتا پھر رہا تھا۔ اسی نے مُنہ میں مٹی تھی، اور بالوں میں تنکے اٹک گئے تھے، شمشیر نے اُسے اُٹھایا، چوما، چوم چوم کر اُسے نڈھال کر دیا، اور پھر اُسے شاداں کے پاس بٹھا کر بولا "یہ سب میرا کیا دھرا ہے، مجھ بڈھے کا، مجھ خناس کا، بیٹے کو یوں جنگ میں بھیجا جیسے جہاد کا حکم مل چکا ہے، —— میں —— میں —— " مگر اُس نے اچانک محسوس کیا کہ یہ مقام اور یہ موقعہ ایسی باتوں کا نہیں، پلٹ کر اپنے پلنگ پر آیا، وہاں سے اٹھ کر مرحوم نوجوانوں کے والدین کے پاس جا نکلا۔ ایک گھر میں اُسے پٹواری مل گیا۔ بولا "بڑا افسوس ہوا چچا"!

شمشیر نے ہاتھ اٹھا کر انگلیوں کو ایسا چکر سا دیا، جیسے کہہ رہا ہے "قسمت"

"تم جب اپنے کلیجوں کے ٹکڑوں کو جنگ کی بھٹی میں جھونک رہے تھے، تو تمہیں یہ کسی نے نہ بتایا کہ —— " اُس وقت ذیلدار فاتحہ خوانی کے لئے آ نکلا۔ اور پٹواری دبک کر دیوار سے لگ گیا،

جاپان کی فاتحانہ یلغار برق رفتاری سے بڑھ رہی تھی، اِدھر جرمنی نے اتحادیوں کے چھکے چھڑا دیئے تھے۔ مگر اب گاؤں والے بالکل بے حس تھے، جیسے جنگ کے ساتھ اُن کی ساری دلچسپی اور وابستگی اُن کے بیٹوں اور پوتوں کی وجہ سے تھی، اور جب وہ کٹ مرے، یا قیدی ہو گئے تو جنگ ختم ہو گئی، باہر چراگاہوں میں ریوڑ چرنے جاتے، تو ان کے پیچھے بوڑھے بوڑھے گڈریے ہوتے۔ کھانستے اور ہانپتے ہوئے کھیتوں کی رکھوالی کرنے والیاں اپنے بھائیوں اور خاوندوں کی یاد میں دھیمے سروں میں گاتیں اور روتیں، چوپالوں پر الاؤ کے اردگرد دہقان چپ چاپ بیٹھے رہتے، گلیوں میں خاک اُڑتی، ٹھنڈی کنواری صبحوں کو بوڑھیوں کی سسکیاں اور کھانسیاں داغدار کر دیتیں، پھولتی ہوئی شفق کے کلیجے میں خرخراتے ہوئے گلے والے عمر رسیدہ مؤذن کی آواز برچھے کی طرح گھس جاتی۔ زندگی جیسے پاؤں گھسٹتی پھر رہی تھی، ماری ماری، خانماں برباد اور پریشاں حال، گھومتی اور چکراتی ہوئی اونچی لگروں پر رُکتی اور گہری کھاڑیوں میں ٹھٹکتی ہوئی —— لال گالوں اور چمکتی آنکھوں اور سریلے گیتوں کی تلاش میں —— مگر لال گالوں کو گدھ نوچ کر لے گئے تھے، چمکتی آنکھیں مصر کے ریگستانوں اور برما کے جنگلوں میں بجھ چکی تھیں اور سریلے گلوں کا رس صحرائی مکھیوں نے چوس لیا تھا، —— اور جنگ جاری تھی ——

عوام کی جنگ —— جمہوریت کی جنگ —— نوعِ انسان کی آزادی کی جنگ —— اور دریائے سندھ سے ایک بہت بڑی نہر نکالی جا رہی تھی، اور دادا شہباز کی ایک بیگھہ زمین پر سے پکی سڑک گذرنے والی تھی، اشیائے خوردنی نابود ہو رہی تھیں۔ ایک ہندوستانی نے ایک یورپین نازنین کے بوسے ہزاروں روپیہ کا چندہ جنگ میں دیا تھا، اور مہاجن شمشیر کے پیچھے سائے کی طرح لگ گیا تھا "تھوڑی سی رقم ہی تو باقی ہے، چکا دو، مجھے نیا دھندا شروع کرنا ہے" —— "نیا دھندا!" —— پٹواری نے کہا تھا "یعنی اناج کے ذخیرے اور ریزگاری کی تھیلیاں اور —— " —— "نہیں نہیں" مہاجن

نے ٹھوڑی کے بالوں میں سے میل کی مروڑیاں نکال کر کہا تھا "میں کانگریسی ہوں، میں ایسا نہیں کروں گا۔"

ہے شمشیر چچا ——— جیسے ہر گاؤں والا پکار رہا تھا ——— ارے کچھ بولو، کوئی پھبتی، کوئی مذاق، کوئی لطیفہ ——— کچھ سناؤ بھئی ورنہ ہماری روحیں بجھ جائیں گی۔ ہمیں نوجوان بھائی اور بھتیجے اور پوتے راتوں کی خاموشیوں میں آ آ کر ستاتے ہیں۔ لال لال آنکھیں نکال کر ہمیں اپنے پھٹے ہوئے پیٹ، کٹے ہوئے بازو اور ننگی ہوئی رانیں دکھاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں "مبارک ہو، مبارک ہو، مبارک ہو" ——— ہے شمشیر چچا کوئی بات سناؤ، ہمارے کانوں میں ہمارے عزیزوں کی کراہیں برمے کی طرح گھسی جا رہی ہیں، ہماری بیوہ بہنیں۔ ہماری لٹی ہوئی بیٹیاں، ہمارے کچلے ہوئے بچے! ——— شمشیر چچا، ہے شمشیر چچا!

مگر شمشیر چچا پر تو کوئی اور دُھن سوار تھی۔ وہ اب چپ چاپ رہنے لگا تھا۔ ہر روز ڈاکخانے میں جانا اُس کا معمول ہو گیا تھا، وہاں سے ناکام لوٹ کر وہ پٹواری کے پاس چند لمحے گزارتا اور پٹواری کے زرد سوکھے ہوئے چہرے میں دھنسی ہوئی بڑی بڑی بے رونق آنکھیں چمک اٹھتیں، "یہ جنگ کبھی ختم نہیں ہوگی، یہ جنگ کروڑوں کی آخری جنگ ہے، اس جنگ میں آدم کی اولاد جل بجھ کر بھسم ہو جائے گی، اور پھر اس راکھ سے ایک نئے آدم کی تعمیر ہوگی، جس کی اولاد صحیح انسان ثابت ہوگی، وہ ایک گھر کی آبادی کے لئے بیس گھر نہیں اجاڑے گی، وہ ایک انسان کو مونڈھا مہیا کرنے کے لئے سینکڑوں انسانوں کی ٹانگیں نہیں کاٹے گی، ساری دنیا کی پیداوار ساری دنیا کے باشندوں کی ملکیت ہوگی، اُس وقت، چچا شمشیر ——— صرف اُس وقت ——— صرف تبھی ———" اور وہ کان پر سے قلم اُٹھا کر کہتا "یہ کمبخت نبی کہاں گئی؟"

مہاجن کی دکان کے سامنے سے گزرتا تو مہاجن لجاجت سے کہتا "بھئی چکا دو نا باقی حساب، اب نیا دھندا شروع کرنا ہے، اور پھر اب تو تمہارا بیٹا قیدی ہے، اس کی ساری تنخواہ تمہارے نام آتی ہو گی"

اب تو تمہارا بیٹا قیدی ہے! ——— اب تو تمہاری قسمت جاگ اٹھی ——— اب تو تمہاری برسوں کی تمنا پوری ہوئی ——— اب تو تمہاری پانچوں گھی میں ہیں! ——— لعنت ہو، شمشیر کو ہر کوئی چڑا تا تھا، دادا شہباز بھی جو کہتا تھا "آ جائے گا، قیدیوں کو تو بڑے آرام سے رکھتے ہیں، دیر سویر آئے گا" ——— دادا شہباز اُس سے مذاق کرتا تھا!

آہستہ آہستہ گاؤں پر سکون چھاتا چلا گیا، مگر اس سکون میں زندگی کم تھی اور موت زیادہ، ہواؤں میں بیواؤں کی آہیں اور یتیموں کی کراہیں تھیں، کھیتوں کا رنگ زہر کی طرح کسیلا تھا، مویشی تک اداس نظر آتے تھے، ہر جمعرات کو چوپال سے پرے گاؤں کے قبرستان میں بزرگوں کی قبروں پر چراغوں کی قطاریں جلنے لگیں۔ ہر ماں، ہر بیوی اور ہر بہن جمعرات کو مٹی کے دیوں میں تیل بھر کر بزرگوں کے پاس جاتی، اُن کے سرہانے دیے رکھ کر دعائیں مانگتی ——— "میرا بیٹا واپس آئے، میرا مالک واپس آئے، میرا بھیا واپس آئے" ——— "کوئی واپس نہیں آئے گا" پٹواری نے کہا تھا "میں کہتا ہوں، تم جن بھائیوں اور بیٹوں کو واپس بلا رہی ہو وہ کبھی واپس نہیں آئیں گے، وہ مر چکے ہیں یا مر رہے ہیں، اُن کے ذہن مر چکے ہیں، اُن کے عقیدے مر چکے ہیں، اُن کے جسم شاید واپس آ جائیں، لیکن وہ اپنی روحوں کو وہیں دفن کر آئیں گے، اور اس لئے جب وہ واپس آئیں گے تو تمہارے بھائی اور بیٹے نہیں ہوں گے۔ وہ مغرب کے بیٹے ہوں گے اور جب میکسیکو میں کسی حبشی پر کوئی امریکی گولی چلائے گا، تو درد کے مارے وہ چلا اٹھیں گے، جب شنگھائی میں کوئی جاپانی کسی چینی کے تھپڑ مارے گا، تو وہ تلملا اٹھیں گے، جب دلی میں کوئی گورا کسی ہندوستانی کے بھیجے پر لات جمائے گا تو وہ تڑپ اٹھیں گے اور پکار اٹھیں گے، اور اُن کی پکار ہندوستان سے نکل کر لندن کے قلعوں سے ٹکرائے گی۔ واشنگٹن کے محلوں میں گونجے گی، روس کے ———"

"میرے خیال میں یہ پٹواری یا تو بم بنانے لگے گا۔ یا قید ہو جائے گا" ذیلدار نے ایک روز تنگ آکر کہا تھا۔

پٹواری کی باتیں پرسکون تالاب کی سطح پر گرتے ہوئے ننھے ننھے

سنگریزوں کی مانند تھیں، لہروں کے دائرے اپنے محیط وسیع کرتے ہوئے پھیلنے لگتے اور مٹ جاتے، اور پھر تالاب سو جاتا — ایک سال گذر گیا۔ دو سال گذر گئے، کبھی کبھی یورپ کے محاذ سے کسی نوجوان کی موت کی خبر آتی، تو اس تالاب میں چٹان سی گر پڑتی، تالاب تھلملا کر رہ جاتا، لہریں دیر تک اس کی سطح پر ناچتی رہتیں، اور پھر سکون چھا جاتا۔ — سکون، جو ہر انجام کا آغاز ہے،

ٹھیک ہی تو ہے، وہ بیراگیں جی کے پریشان بال، خشک ہونٹ اور چھلکتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر کائنات بھی سسکیاں لینے لگتی تھی۔ وہ بہنیں جن کی چیخ پکار کا خلوص غیر فانی اور ابدی معلوم ہوتا تھا — اب تنجنوں میں چرخے گھماتیں، چہلیں کرتیں، قہقہے لگاتیں، ٹھوکے دیتیں اور کہتیں "تیری اوڑھنی کا رنگ تو بالکل نئے نئے خون کا سا ہے بہن نندی" — "اور تیری لونگ، اتنی اچھی ناک پر اتنی بھونڈی لونگ، جیسے مصری کی ڈلی پر مکوڑا چپک کر رہ جائے" — ناکوں، آنکھوں، بالوں اور اوڑھنیوں کے گورکھ دھندے میں گھری ہوئی یہ بیویاں اور بہنیں مصر کی ریتوں اور برما کی پتاوریں میں گلی ہوئی ہڈیوں کو فراموش کر چکی تھیں، صرف ماؤں کی محبت زندہ تھی، یہ ابدیت سے بھی گہری اور لامحدود محبت، جو انقلاب کا نام نہیں جانتی، جو خدا کی طرح اٹل ہے، — اندھیری شاموں میں جب یہ بوڑھی مائیں پلو تلے دیئے چھپا کر بزرگوں کی قبروں پر جاتیں، اور جب مقبروں پر بجھے ہوئے دیئے، جو اب تعداد میں بہت کم رہ گئے تھے، ہوا کے جھونکوں میں اپنی آتشیں زبانیں تھرتھراتے اور قریب بیٹھی ہوئی ماؤں کے فق چہروں میں دھنسی ہوئی آنکھیں شہاب ثاقب کی طرح چمک اٹھتیں تو شمشیر جس کی خاموشی اس عرصہ میں آوارگی کی صورت اختیار کر چکی تھی، لپک کر گھر آتا، اور ننھے شیر کو پاس بٹھا کر شاداں سے کہتا "بیٹا آج جمعرات ہے، دیا تو جلا دیا ہوتا مزار پر، کون جانے اسی تیل کے صدقے خدا ہمارے گھروندے کو پھر سے روشن کر دے" — تو شاداں انگڑائیوں کا تانتا باندھ کر اٹھتی۔ اور کہتی "بہت دیئے جلائے چچا، اور پھر دئیے بجھ جاتے ہیں تو تیل مجاور الٹ کر لے جاتے ہیں، دیئے جلانے سے کیا ہوگا!"

شمشیر کے لئے دلیر کی زندگی اب اتنی تشویشناک نہیں رہی تھی، جتنا شاداں کا تغیر۔ دلیر کی قید کے پہلے ہی سال کے آخری مہینوں میں اُس کے دبلے پتلے جسم میں تازہ خون دوڑنے لگا تھا۔ صبح سویرے بناؤ سنگار میں کتنی دیر لگا دیتی، بہترین لباس پہنتی، شیر کو گھر کرتی، اور پڑوس میں دھوبیوں کے گھر چلی جاتی، ہر مہینے دلیر کی تنخواہ سے دس روپے شمشیر سے بھر آئے لیتی "مجھے بھی زندہ رہنا ہے"۔ وہ کہتی "جہاں کائنات شیطان کی کائنات بنتا چلا جائے تو میرا کیا بس، میرا بھی تو حق ہے"

شمشیر چپ چاپ دس روپے ہر مہینے اس کے حوالے کر دیتا، وہ جانتا تھا، کہ جنگ میں صرف جانیں ہی نہیں، آبروئیں اور عزتیں بھی ملیامیٹ ہو جاتی ہیں۔

"سنبھلو، سنبھلو" دادا شہباز کہا کرتا تھا "سنبھلو شمشیر، ہوش کرو، آخر دوسروں کے بیٹے بھی تو قیدی ہیں"!

مگر شمشیر کو سنبھلنے کی توفیق ہی کہاں تھی۔ وہ ہمیشہ کے لئے ڈگمگا چکا تھا، اُس لٹو کی طرح جو فرش پر گرتا ہے تو ایک جگہ قرار نہیں پا سکتا۔ اُس کی نوک کو جیسے زمین کے اندر سے کوئی چیز اچھال کر پرے پھینک دیتی ہے، اسے کوئی مرکز نہیں ملتا۔ کوئی منزل میسر نہیں آتی، سنبھلنے کے لئے فرصت چاہئے، اور شمشیر کے پاس بہت کم فرصت تھی، مہینے میں محاذ جنگ سے ایک دو موتوں کی خبر آ جاتی، تو وہ فاتحہ خوانی کے لئے چلا جاتا، لوگ امن کے لئے قرآن مجید کے ختم کرتے، تو اُن میں شامل ہو جاتا، اور جب پلٹتا تو پٹواری کہتا "امن؟ امن تو صرف ایک لفظ ہے، امن جنگ کا دوسرا نام ہے، اور امن کی جنگ اصلی جنگ سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے، بنگال کا قحط کیا تھا؟ یہ امن کی جنگ تھی، یہ ہر چیز کی گرانی۔ یہ امن کی جنگ ہے، یہ اغوا اور زنا کے نت نئے شوشے، یہ امن کی جنگ ہے، — امن! تم امن کیلئے دعائیں مانگتے ہو؟ حالانکہ تم دو صدیوں سے امن کے مزے لوٹ رہے ہو، دو صدیوں سے تم اس چپ چاپ جنگ میں مبتلا ہو، ایسی جنگ جو تم محسوس نہیں کر سکتے، ایسی جنگ جو تمہارا خون نہیں بہاتی، صرف تمہارے دماغ اور دل کو نچوڑ کر گلے ہوئے چیتھڑے کی طرح پرے پھینک دیتی ہے — ارے یہ کھتونی کہاں گئی؟"

مگر اب جنگ کی تازہ خبریں حوصلہ افزا ثابت ہو رہی تھیں اور شمشیر پٹواری سے بحث کرنے لگا تھا "ارے بھئی امریکی فوج جزیرۂ جاپان پر اتر آئی ہے نا ــــ جنگ کو ختم سمجھو"۔

"یہ نئی جنگ کی ابتدا ہے" وہ کھتونی کو گھٹنے تلے رکھ کر کہتا،

"روسی برلن میں گھس گئے"

"یہ نئی جنگ کی ابتدا ہے"

"مسولینی کو سولی پر چڑھا دیا گیا"

"یہ نئی جنگ کی ابتدا ہے"

"یورپ میں جنگ ختم ہو گئی"

"اب نئی جنگ شروع ہو گی"

"جاپان کے شہر ہیروشیما پر ایک نیا بم گرایا گیا ــ ایٹم بم ــ ذیلدار کہہ رہا تھا"

"مجھے معلوم ہے"

اُس روز شمشیر کی آنکھیں چمک اُٹھیں، اور ہونٹوں کی پپڑیاں اچٹ کر گر گئیں، مدت کے بعد اُس نے پھبتی اور مذاق کی طرف توجہ دی۔ "بڑی دیر کے بعد نظر آئے ہو بھئی" اُس نے ایک نوجوان سے کہا "سُناؤ، آج کل کونسی گھاس کاٹ رکھی ہے؟"

اور پھر "ابے سنبھل کر قدم اُٹھا۔ یوں چل رہا ہے جیسے تہمد کھل گیا ہو تیرا"

ایٹم بم کی خوشی میں اُس روز اُس نے ایک بڑھیا پر بھی حملہ کر دیا "لہنگا سنبھال خالہ، بلاوا دے رہا ہے"

بڑھیا پلٹ کر کھڑی ہو گئی، اور پھر رو دی "تم سچے ہو شمشیر۔ تمہارا دلیر واپس آجائے گا نا۔ اور میرا احمد ــــ وہ ادھر تین سال ہوئے مصر میں ــــ" اور وہ روتی ہوئی وہیں بیٹھ گئی۔ "تم مجھ سے مذاق کرتے ہو؟ کیوں نہ کرو، تمہارا بیٹا جو واپس آ رہا ہے، اور میرا بیٹا ــــ میرا بیٹا ــــ" سر پر ہاتھ رکھ کر وہ اٹھی، اور اپنے بیٹے کے ماتم کو تازہ کرتی ساری گلی کو چونکاتی چل دی۔

"ارے" شمشیر نے گلی میں جمع ہوتے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھا اُن کے چہروں پر غم اور غصہ کے آثار تھے، اور وہ سب نفرت سے شمشیر کو گھور رہے تھے "ارے!" شمشیر نے دوبارہ کہا، اور سر کو دونوں ہاتھوں میں دبا کر وہیں بیٹھ گیا، اور بہت دیر تک بیٹھا رہا۔

رات کو چوپال پر لوگ اکٹھے ہوئے، تو ذیلدار نے ایٹم بم کا ذکر چھیڑ دیا "اس کی طاقت پانچ لاکھ ساٹھ ہزار من بارود کے برابر ہوتی ہے، جب ہیروشیما پر بم گرا، تو جو لوگ باہر تھے، وہ وہیں دم توڑ بیٹھے اور جو اندر تھے وہ مارے حبس کے تڑپ پھڑک کر رہ گئے، لاشوں کے چہرے تک نہیں پہچانے جا سکتے، بم گرا تو سات آٹھ میل اونچا دھوئیں کا مینار اُبھر آیا، ہیروشیما بالکل مٹ چکا ہے، پچاس ہزار سے زیادہ جاپانی مر چکے ہیں، ہزاروں ہسپتالوں میں ہیں، ہزاروں کا کچھ پتہ ہی نہیں۔ بس اب جنگ کو ختم سمجھو"۔

"ہت تیری نکٹے ناٹے کی" ایک دہقان بولا "کیسے گرجتا دھاڑتا بڑھا تھا، اور کیسے دبوچا انگریز نے"

"نہیں نہیں۔ امریکہ نے" اعتراض ہوا۔

"ابے نہیں۔ انگریز نے"

"امریکہ نے"

"انگریز نے"

"سارے عالمِ انسانیت کی بدبختی اور بدطینتی نے" پٹواری بولا۔ اور سب اُس کی طرف متوجہ ہو گئے "جنگ میں زہریلی گیس استعمال کرنا منع ہے، مگر زہریلی گیس سے ہزار درجہ خطرناک ایٹم بم استعمال کرنا، جائز ہے، بھئی بڑے پھکیلے ہیں جنگی اصول۔ اُس وقت جب ہٹلر نے گیس چھوڑنے کی دھمکی دی تھی تو کانفرنس بلائی جانے لگیں، کمیٹیاں ہونے لگیں۔ اور اب ــــ یہ ایٹم بم ــــ"

ذیلدار کڑک کر بولا "منشی، بکواس بند کر!"

"میں کہتا ہوں" پٹواری تو جیسے دیوانہ ہو گیا تھا "یہ ایٹم بم کوئی نئی چیز تو نہیں، ہم ہندوستانیوں کے لئے تو ایٹم بم کوئی عجوبہ نہیں، بنگال میں کس ایٹم بم نے قحط ڈالا۔ آسام میں کس ایٹم بم نے لڑکیوں کی جوانیاں لوٹیں، راجپوتانہ اور پنجاب میں کس ایٹم بم نے بیواؤں اور یتیموں کی فوج پیدا کر دی؟ ہندوستان پر تو پچھلی دو صدیوں سے ایٹم بموں کی بارش جاری ہے، اور تم منہ کھولے ہیروشیما کے

"ایٹم بم کی باتیں یوں سُن رہے ہو، جیسے تمہارے لئے جنت کا دروازہ کھُل گیا ——— ایٹم بم کی خبریں تم اخباروں میں کیوں پڑھتے ہو۔ قطب دین سے پوچھو، لال بیگ سے پوچھو، نور خاں سے پوچھو، چچا شمشیر سے پوچھو ——— اور ——— "

"بکواس بند کرو میں کہتا ہوں" ذیلدار گرجا۔ اور پٹواری تھر تھر کانپتا چوپال پر سے اٹھ کر چلا گیا۔

"منشی پاگل ہو جائے گا" ایک شخص نے رائے ظاہر کی۔

مگر ذیلدار کی غضبناک خاموشی کا تقاضا تھا، کہ حاضرین بھی خاموش رہیں، کڑی نگاہوں کی گھرکی نے اس اصول توڑنے والے کو کپکپا کر رکھ دیا تھا۔

اب تو نت نئی چٹپٹی خبروں کا تانا بندھ گیا۔

"برطانیہ میں چھ سال کے بعد سب لوگوں نے صحیح معنوں میں چھٹی منائی، جنگ ختم ہو رہی ہے۔

"روس نے جاپان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا"

موئے کو مارے شاہ مدار ——— جنگ ختم ہو جائے گی۔

"جاپان نے ہتھیار ڈال دیئے"

اللہ بس باقی ہوس ——— جنگ ختم ہو گئی،

جنگ ختم ہو گئی ——— جنگ ختم ہو گئی ——— پتلیاں چمک اُٹھیں، گالوں پر گلال پھر گئے، قیدی اور عدم پتہ بیٹوں کی مائیں لاٹھیاں ٹیکتی گلیوں میں آ گئیں۔

"سچ مچ؟ ——— سچ مچ؟"

"ہاں ہاں۔ جنگ ختم ہو گئی، جنگ بالکل ختم ہو گئی۔ اب جنگ نہیں ہو گی۔ اب جنگ بالکل نہیں ہو گی"

"سچ مچ؟ ——— سچ مچ؟"

اتنی بڑی سچائی پر ایمان لانے کے لئے بھی تو شیر کا کلیجہ چاہیئے۔

"جنگ ختم ہو گئی شاداں بیٹی" شمشیر گھر جا کر چلّایا، اور شیر کو اٹھا کر اس پر بوسوں کی بوچھار کر دی،

"سچ مچ؟" ——— مگر شاداں کے اس استعجاب میں مسرت کے بجائے صرف حیرت تھی،

"ارے کوئی یقین نہیں کرتا۔ شیر بیٹا، تیرا ابا اب واپس آ جائیگا۔

"سچ؟" ننھے نے بڑی بڑی گول گول آنکھیں پھاڑ کر دادا کو گھورا!

"کیا لائے دا؟"

"تمہاری سواری کا گھوڑا۔ عید کے لئے کپڑے اور ٹوپیاں اور بوٹ اور چھڑی اور ——— "

"بتائے"

"ہاں ہاں بتائے، اور پھلجھڑیاں اور ——— "

"خاک لائے گا" شاداں نے بگڑ کر کہا۔

"کیوں؟" جیسے شاداں نے بوڑھے کا منہ نوچ لیا تھا،

"تنخواہ تو ساری مہاجن ہضم کر گیا، وہ تو اپنی جان بچا کر بھی لائے تو شکر کرو خدا کا" اور اس نے نقرئی چوڑیوں کی گھنگھریاں چھنکائیں اور شیر کو گھسیٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئی،

کانٹوں کا وہ گچھا جو شیر کی قید اور شاداں کی سرد مہری نے اس کے حلق میں ٹھونس رکھا تھا، اچھل کر جیسے اس کے دماغ میں کرونے لگا، مگر اب جنگ ختم ہو چکی تھی، اور اندر ہی اندر گھلنے سے یہی بہتر تھا۔ کہ دلیر کی راہ دیکھی جائے،

دو تین ہفتے بعد اُسے معلوم ہوا، کہ انگریزوں نے سنگاپور پر دوبارہ قبضہ کر لیا ہے، اور پھر آہستہ آہستہ خبریں آنے لگیں، کہ قیدیوں کے جہاز ہندوستان آ رہے ہیں، "دامن کوہ کے ایک گاؤں کا نوجوان جو سنگاپور میں جاپان کا قیدی رہا، گھر واپس آ چکا ہے" اُس نے ایک روز ہرکارے کی زبانی سُنا، اور اُسی روز ایک ننھی سی بقچی کاندھے پر لٹکا کر اسی گاؤں کی راہ لی، گاؤں والوں نے بھی اپنے اپنے عزیزوں کے نام اور نمبر لکھ کر دیئے، اور وہ ایک ذمہ دارانہ حیثیت سے، بالکل پرانے بادشاہوں کے ایلچیوں کی طرح پہاڑ کے دامن کی طرف چلا،

وہاں جا کر اُسے نو وارد سپاہی کی زبانی معلوم ہوا، کہ قیدی بےشمار تھے، اور انہیں ملایا اور جاوا اور دوسرے جزیروں میں بکھیر دیا گیا تھا، اس لئے وہ کوئی یقینی خبر نہیں دے سکتا تھا، مایوس ہو کر گھر کو پلٹا،

تھکا ماندہ کھانستا کھنکارتا جب وہ اپنے گاؤں سے ایک میل کے فاصلے پر پہنچا، تو اُس نے کچھ دور پٹواری کو اپنی طرف آتا دیکھا، پہلے تو

کا ایک جمگھٹ بہت پرے چپ چاپ کھڑا پٹواری کی طرف دیکھ رہا تھا،
سورج غروب ہونا چاہتا تھا: مگر جیسے شمشیر کے گاؤں میں پہنچ جانے کا منتظر کھڑا تھا۔ دھوپ پیلی پڑ گئی تھی، درختوں کے پتے اداس اور نڈھال ہو کر جھک گئے تھے کھیتوں پر مردنی کا عالم تھا، ٹھکانوں کو چلتے ہوئے پرندوں کی آوازوں میں شیون تھا، پگڈنڈی کے لہراتے ہوئے زریں فیتے پر ایک گدھا دھول میں نہا رہا تھا،

"واپس آ گئے چچا؟" پٹواری نے پوچھا،

"ہاں۔ واپس آ گیا ہوں۔ نامراد" شمشیر نے کہا۔ "مگر تم کہاں چلے؟"

"میں یہاں سے جا رہا ہوں، ہمیشہ کے لئے"

"کیوں؟ خیریت تو ہے نا؟"

"خیریت؟" پٹواری کے ہونٹوں پر ایک عجیب زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھر وہیں چمٹ کر رہ گئی۔ "خیریت امن کی طرح بے معنی لفظ ہے، امن کے لفظ سے معنی نچوڑنے کے لئے ماسکو میں مولوٹاف، برنز اور بیون کی کانفرنس ہونے والی ہے۔ اور تمہیں خیریت کا مطلب سمجھانے کے لئے وہ مجمع تمہارا منتظر کھڑا ہے، جاؤ بابا۔ تم جو ہر کسی کا مذاق اڑاتے تھے، تم جو بڑی بڑی خبریں سننے کے شوقین تھے، تم جو ہنسنے ہنسانے کے سوا اور کچھ جانتے ہی نہ تھے، جاؤ، وہاں اُس مجمع میں دادا شہباز سے پوچھو کہ خیریت کیا چیز ہے، اور پھر اپنے گھر جانا، وہاں کہیں طاق پر تمہارے بیٹے کا تار پڑا ہوگا۔ وہ آ رہا ہے۔"

"دلیر آ رہا ہے؟" شمشیر یکلخت چینک کر پٹواری سے لپٹ گیا، مگر وہ لوہے کی لاٹھ کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہا، اور اسی خوفناک سنجیدگی سے بولا۔ "ہاں، واپس آ رہا ہے تمہارا دلیر، سو تم تار اٹھا کر شیر کو پکارنا جسے کل صبح اُس کی ماں نے دلیر کا تار ملنے کے بعد لاہور کے کسی یتیم خانے کے سپرد کے حوالے کر دیا ہے۔"

"تار ملنے کے بعد؟"

"اور پھر پکارنا۔ شاداں۔ شاداں بیٹی۔ تمہاری وہ شاداں بیٹی جو شاید ہیروشیما پر ایٹم بم گرائے جانے کی منتظر تھی، جرات کو تمہارے پڑوسی دھوبی کے ساتھ بھاگ گئی ہے جنوں کی طرف"

"کیا کہہ رہے ہو؟"

"اور پھر تجوری کھول کر وہ روپیہ گننا جو تم نے جنگ کی برکت سے کمایا۔ تمہیں امن اور خیریت کے تمام معانی از بر ہو جائیں گے۔"

وہ شمشیر کے مردہ ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں دبا کر پلٹا، اور پگڈنڈی پر ہو لیا، سورج دریا کے پرے کنارے پر پھیلی ہوئی پہاڑیوں میں ڈوب چکا تھا۔ شفق نے پٹواری کے سفید لباس میں آگ سی لگا دی۔ وہ ایک شعلہ سا بن گیا ۔۔۔ دھرتی کے کلیجے میں سے نکلتا ہوا شعلہ ۔۔۔ رواں دواں ۔۔۔ رواں دواں ۔۔۔ اور پھر یہ شعلہ بجھنے لگا۔ دھوئیں کا ایک بونا سا بن گیا۔ مشرقی افق کی دھند میں گھلتا ہوا یہ سایہ بڑھتا گیا، پھیلتا گیا۔ ناپید ہوتا گیا ۔۔۔ اور پھر اُسی افق سے چاند بن کر ابھرا، کھلکھلاتا ہوا، ہنستا ہوا ۔۔۔ جیسے مغرب میں مہکے ہوئے سورج کے تعاقب میں ہے!

علی عباس حسینی

برف کی سل

ہمسائی کے ہاں شادی تھی۔ "بڑی آپا" کہنے والی انور بیاہی جا رہی تھی۔ گھر میں سینکڑوں عورتیں موجود تھیں ——— بوڑھی، جوان، شادی شدہ، بن بیاہی، خوبصورت، بدصورت، آدمی کا بچہ! — ہر ایک کے چہرے پر ہنسی کھیلتی تھی۔ ہر ایک خوش دکھائی دیتی تھی۔ مگر کوئی جمیلہ کی طرح بے آپے نہ تھی۔

نہ جانے کیوں آج وہ بوکھلا سی گئی تھی۔ نہ جانے کیوں اس کا دل گا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں رہ رہ کے اس کے جسم بھر میں ایک مترنم سی لہر دوڑ جاتی تھی۔ جیسے کوئی اس کے سازِ زندگی کو بار بار چھیڑتا تھا۔ جیسے کوئی اسے بار بار گدگداتا تھا۔ جیسے کوئی بار بار چٹکیاں لیتا تھا ——— وہ اپنی رگوں میں گرم خون کی روانی محسوس کرتی تھی، جلتا ہوا، ابلتا ہوا، جوش مارتا ہوا! اس کا جی چاہتا تھا کسی طرح یہ خون بہہ نکلے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ گھر بھر میں اچکتی پھرے، تھرکتی پھرے، گاتی پھرے، ہنستی پھرے! ۔ وہ ایک جگہ ذرا دیر بیٹھتی، پہلو بدلتی، مسکراتی، کھڑی ہو جاتی، انگڑائی لیتی، آگے بڑھ جاتی۔ وہ ایک تتلی تھی، نازک، حسین، دلربا۔ مگر بلا کی بےچین! کسی پھول پر جم کر نہ بیٹھنے والی! کسی غنچے پر نہ ٹھہرنے والی!

ڈومنیاں گا رہی تھیں، بوڑھی پھٹی آواز سے، بےسرے پن سے "آیا بنا رے! آیا بنا رے" کی رٹ لگائے ہوئے تھیں۔ جوان کی آواز میں رس تھا۔ تو اس کی آنکھوں میں بھی مدہوشی تھی۔ کالی سیاہ پتلیاں، بڑے بڑے دیدے، دنبالہ دار سرمہ لگا ہوا، ہونٹوں پر پان کی دھڑی جمی ہوئی، چست انگیا میں بوٹی بوٹی پھڑکتی ہوئی۔ اس پر شرارتیں کہ توبہ ہی بھلی! وہ کولھے مٹکاتی، ہاتھ چمکاتی، آنکھیں مارتی اور کسی نہ کسی کی فرمائش پر اس کی رشتہ دار کو ننگی ننگی گالیاں گا گا کر سنا دیتی ——— جمیلہ کو یہ فحش مذاق، شادی بیاہ کی یہ گندی گالیاں کبھی نہ بھائی تھیں۔ لیکن آج یہ گالیاں شراب کی طرح تلخ ہونے پر بھی سرور انگیز تھیں۔ وہ یہ بھول جاتی کہ اس کا دوپٹہ سرک کر کہاں سے کہاں پہنچا۔ وہ یہ بھی بھول جاتی کہ پاس کوئی بڑا کھڑا ہے یا بیٹھا، وہ بار بار ہنستی، تال دیتی اور انگڑائیاں لیتی!۔

ناک چوٹی گرفتار حسنیٰ کو اس نے کبھی اچھا نہ سمجھا تھا۔ اس کی کنجی آنکھیں، اس کے گھنگھریالے بال، اس کا شبنمی رنگ، جمیلہ کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ مگر آج وہی حسنیٰ سرخ ساری میں بیر بہوٹی بنی ہوئی ایسی پیاری معلوم ہوتی تھی کہ جی چاہتا تھا اسے کلیجہ میں بھر لو۔ جیسے جمیلہ کے دل میں سوائے محبت کے کسی جذبے کی گنجائش ہی نہ رہ گئی ہو۔ جیسے اس نے اس راز کو پا لیا ہو جو حسنیٰ کو گھنٹوں سنگار کرنے پر مجبور کرتا تھا ——— سپاہی کا ہنر ہے اپنے اسلحہ کو صاف اور تیز رکھنا، ادیب کا ہنر ہے اپنے قلم کی نوک پلک دیکھتے رہنا، اور عورت کا ہنر ہے اپنے کو ہر آن حسین تر بناتے رہنا! ——— حسنیٰ اس کے سوا اور کیا کرتی تھی؟ وہ اپنے کو کسی کے پیش کش کے قابل بناتی تھی۔ پیش کش! ۔ ہاں ہاں پیش کش ہی میں عورت کی فتح ہے! جیت ہے! حکومت ہے! اکڑنے، اترانے، چنگھاڑنے والے مرد پر حکومت! ——— اور اس نے پھر انگڑائی لی ———

اس موئے دولہے کو آج کیا ہوا ہے؟ جب دیکھو سر سے کھسکا جا رہا ہے! آہنہ، ہوگا! کون دیکھتا ہے؟ سب عورتیں ہی عورتیں تو ہیں۔ اور سب خوش، اپنے کو بھولی ہوئی، مگر میری طرح کوئی بے آپے نہیں، شاید دلہن ہو چلو دیکھیں۔ گیلی پٹی لپٹائی، سمٹی سمٹائی بیٹھی ہے، خون کا منجمد قطرہ! ....

بخورات سے رُندھا اور لبا ہوا کمرہ، شنجرفی گھونگھٹ میں سے جھلکتا ہوا شہابی چہرہ، عطر عروس کی لپٹ، حنائی ہاتھوں سے چھوٹا سا سلام! جمیلہ نے بلائیں لینے کی جگہ دلہن کو گود میں سمیٹ کر پیار کر لیا۔ انور نے شرما کر احتجاج کی "بڑی آپا!" اس تخاطب نے سارا مزہ کرکرا کر دیا۔ نوج یہ ہندوستانی رشتے! قدم قدم پر چھوٹے بڑے کا خیال۔ آدمی کس سے بولے، کس سے ہنسے؟۔ اس نے جھنجھلا کر کہا "بھاڑ میں جائیں بڑی آپا!" اور باہر چلی آئی۔

گھر بھر میں بجلی کی روشنی، دالانوں میں، کمروں میں بیرونی کمرے ضبط

کے ٹھٹ، صحن میں شامیانے کے نیچے محفل کی تیاریاں، شامیانے کے پیچھے سے جھانکتا ہوا چودھویں کا چاند۔ اس نے میرِ کامل کی طرف دیکھ کر دونوں ہاتھ بلند کیے، انگلیوں میں انگلیاں پھنسائیں اور پھر انگڑائی لی پھر ہاتھ نیچے لاتے ہوئے خود ہی مسکرا کر گنگنانے لگی۔ "اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حسن!"

میزبان بی بی نے پکار کر کہا "اری جمیلہ بیگم! کچھ مہمانوں کا بھی خیال ہے؟ سب کو پان پتہ مل رہا ہے؟" —— بڑی محبت تھی اس کی تھکی ہوئی بوڑھی آواز میں۔ اور اپنانے کا انداز تو دیکھو۔ خود اسے بھی میزبانی میں داخل کر لیا۔ اب چاہے رات بھر اسے پان کا ٹکڑا نہ ملے، ایک کھیل اڑ کر حلق میں نہ جائے۔ مگر وہ شکایت کر ہی نہیں سکتی۔ وہی تو منتظم ہے۔ اسی کی لڑکی اسی کی عزیزہ اسی کی بہن کا تو بیاہ ہے! —— وہ دوپٹہ درست کرتی ہوئی ہنس کر بولی۔ "جی ہاں، آپ ادھر سے بےفکر رہیں۔ سب کو ساری چیزیں پہنچ رہی ہیں"۔

حسنیٰ نے چپکے سے بغل میں کھڑے ہو کر کہا "تو پھر مجھے پان کھلواؤ نا!"

جمیلہ نے حسنیٰ کے اس طرح خاموشی سے پاس آنے پر کوئی تعجب نہ محسوس کیا۔ وہ تو بڑی دیر سے جمیلہ کے پاس ہی تھی۔ پیش کش بنی ہوئی! اس نے حسنیٰ کو بڑی محبت سے دیکھا کیسی چھوٹ پڑ رہی تھی چاند کی اس کے گورے گورے گالوں پر! اس نے حسنیٰ کے لپ اسٹک سے لال ہونٹوں پر اپنے گلے کی انگلی ماری۔ پھر اس کی صراحی دار گردن میں بانہہ آویزاں کر کے کہا "وہ چاند تمہیں آنکھیں مار رہا ہے حسنیٰ!"

حسنیٰ نے جمیلہ کے اس فقرے کے جواب میں اسے صرف مسکرا کر دیکھا اس مسکراہٹ میں غضب کی ہمدردی دیگانگت تھی۔ جمیلہ کو ایسا محسوس ہوا۔ جیسے حسنیٰ کے دل میں بھی وہی جذبات انبساط موجزن ہیں جو اسے دیر سے گرمائے ہوئے تھے۔ جمیلہ نے ایک رکتی ہوئی ٹھنڈی سانس لی۔ یہ اٹکتی، کھٹکتی، سینہ میں چبھن سی پیدا کرتی ہوئی سانس "افسردگی، اضمحلال" یا افسوس کے اظہار کا ذریعہ نہ تھی۔ بلکہ یہ مسرت کے جامِ لبریز کی ایک لہر تھی۔ چھلک جانے والی، چھلکا دینے والی ایک کیفیت! جیسے سبک قدم صبا کلیوں کو کھلاتی چل رہی ہو، جیسے آنکھیں لڑانے والا چاند دل میں اُتر آیا ہو —— !

حسنیٰ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ پھر سرگوشی کے انداز میں شعر پڑھا۔

کس کے چہرے کا حیرتی ہے ماہ ؟ جملہ تن ایک دیدۂ وا ہے !

جمیلہ نے ایک پھسلتی نظر ماہِ چہاردہم پر ڈالی۔ پھر حسنیٰ کے مہوش چہرے پر آنکھیں جمالیں۔ دفعتہً اس کے ہاں ایک عجیب سی خواہش پیدا ہو گئی۔ ایک مردانہ خواہش! حسنیٰ کے شباب و حسن کو لوٹ لینے والی خواہش! وکاش میں مرد ہوتی! "اس نے ایک کھٹکتی ہوئی سانس لیکر سوچا۔ اس نے حسنیٰ کی گردن میں پڑی ہوئی بانہہ پر اپنا بوجھ بڑھا دیا۔ حسنیٰ اس کی طرف جھکنے لگی۔ شاخِ باردار کی طرح جھکنے لگی ....

"بی بی، اچھے میاں بڑی دیر سے آپ کے لئے بلک رہے ہیں"۔

جمیلہ نے حسنیٰ کے بچّے کی کھلائی کو رقیب کی نظروں سے دیکھا کہاں آ گئی یہ مردار اپنے اچھے میاں کو لے کر۔ مگر جب حسنیٰ اس کی بانہہ اپنی گردن سے آہستہ سے الگ کر کے پھول سے بچّے کی طرف پلٹی تو جمیلہ نے ماں بیٹے دونوں کے چہروں پر ایک ایسی چمک دیکھی جو دل میں تیر و نشتر کی طرح پیوست ہو گئی۔ اسے دفعتہً محسوس ہوا کہ اس کی خوشی نامکمل ہے، اس کی محبت ناقص ہے۔ وہ اب تک بے ثمر ہے! ——

اس کی نظروں میں ساس نندوں کا شکایت بھرا چہرہ پھر گیا۔ پانچواں سال تھا اس کی شادی کو، مگر "ایک چوہیا" بھی وہ اب تک نہ جن سکی تھی۔ نہ میاں کو آج تک اس کی فکر ہوئی تھی، نہ اسے پروا۔ وہ تو ضبطِ تولید کے قائل تھے، اور خود جمیلہ "تخلیق" کی تکالیف سے ترساں تھی۔ وہ محبت کے روحانی پہلو، اس کے اغراق "اس کی مثالیت کی قائل تھی، لیکن اس طیب وطاہر جذبے میں بہیمانہ افعال و حرکات کا اشتراک، اسے صدمہ جو کریہہ معلوم ہوتا تھا۔ اس میں جذبۂ مقاومت اُبھار دیتا تھا۔ لیکن آج اچھے میاں اور حسنیٰ کے چہروں کی چمک نے اسے محسوس کرا دیا کہ تولید میں "خالقیت" ہے۔ عورت کا ربانی فریضہ! —— اس کے جسم میں لرزش سی پیدا ہو گئی، جیسے اس نے کوئی قصور کیا ہے، جیسے وہ کسی چوری میں پکڑی گئی ہے، جیسے بھری برادری اسے سبک نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ جیسے وہ سچ مچ عورت اور مرد کی درمیانی جنس ہے!

اُس نے پلٹ کر حسنیٰ کی بھری گود کو دیکھا۔ اسے جمیلہ کی موجودگی کا احساس تک نہ تھا۔ وہ اچھے میاں کو سینے سے چمٹائے آنکھیں بند کئے جھوم رہی تھی۔ بچّہ ماں کے گال پر گال رکھے ننھے ننھے ہاتھوں سے

چاند کو بار ا تھا جمیلہ کو محسوس ہوا جیسے وہ پتلی پتلی انگلیاں اس کے سینے کو چیرتی ہوئی دل میں دھنس آئیں اور اسے مسلنے لگیں ـــــ وہ کچھ شرمائی کچھ مرجھائی سی وہاں سے چلی، قدرے بدحواس ہو چلی۔ درمیان میں ایک پانچ برس کی بچی سے ٹکرائی۔ چونکی، تو دیکھا کھڑی ہوئی منزل کے لئے دوسرا سنگ میل ہے اس نے بسورتی ہوئی بچی کو جلدی سے گود میں اٹھا لیا گھبرا گھبرا کر منہ چوما اسے چاند دکھایا، بہلانے کے لئے گا گا کر سنایا:۔

چندا ماما دور کے لڈو بنائے بور کے
لڈو گیا ٹوٹ چندا گیا روٹھ

بچی ہنس دی "کہاں روٹھا ہے: ہنس تو رہا ہے"۔ جمیلہ نے پیار کر کے ٹھنڈی سانس لی۔ "روٹھا نہ ہوتا تو ہمارے پاس کیوں نہ آتا؟" ـــــ بچی کو گود سے اتار کر آگے بڑھ گئی۔ دل میں آیا چلو گھر چلیں۔ خیال آیا بی بیاں صحنک میں ڈھونڈیں گی۔ اُنہہ! بہت سی سہاگنیں ہیں، شادی کا بھرا گھر ہے۔ کس کو اتنا دھیان کہ بن بچوں والی جمیلہ غائب ہے۔ بن بچوں والی ـــــ بانجھ! ـــــ ہائے اللہ کہیں ایسا ہی تو نہیں ہے؟ ـــــ ایک ہوک سی اٹھی۔ وہ تلملا گئی۔ اُن سے کہوں گی ڈاکٹرنی کو دکھاؤ، حکیم کو بلاؤ ـــــ مگر ـــــ مگر بڑی ہی بے شرمی ہے! ـــــ اس کے قدم اور جلدی جلدی اٹھنے لگے۔ وہ جلدی سے ہمسائی کی کوٹھی اور اپنے بنگلے کے درمیانی دروازے میں سے نکل گئی۔

بنگلہ اندھیرا تھا۔ نوکر چاکر، ماما دائیاں، میاں، سب ہی تو آج شادی کے گھر میں ہاتھ بٹانے، برات اُتارنے، مہمانوں کی خاطر تواضع کرنے میں مشغول تھے۔ اسی لئے اسے یہ پرانا گھر اجنبی سا معلوم ہوا۔ مگر وہ زیادہ نہ جھجکی۔ وہ سیدھے اپنے کمرے میں چلی گئی، اس نے بٹن دبا کر روشنی کی۔ وہ اپنی سنگار میز کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اس نے قد آدم آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔ چوڑی پیشانی پر سیاہ چمکتی ہوئی زلفیں، پتلی جھکی ہوئی بھوؤں کے نیچے دو سیاہ چمکتی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں۔ اُن میں سرخ سرخ ڈورے۔ پتلی چھوٹی ناک، میانہ دہانہ، ٹھوڑی کے ٹھیک بیچ میں ایک ہلکا سا گڑھا اور اس میں ایک چھوٹا سا سیاہ تل ـــــ اسے خود ہی اپنی صورت پر پیار آ گیا۔ وہ مسکرائی۔ اُس نے اپنی پتلی کمر پر دونوں ہاتھ رکھے اور زبان نکال کر خود اپنی صورت کا منہ چڑا دیا! ـــــ پھر وہ زور سے ہنسی

اور اسی طرح ہنستی میاں کے دفتر میں گئی۔ اس نے ان کی میز پر رکھے ہوئے ٹیلیفون کا "ریسیور" اٹھایا، ہمسائی کے مردانے کا نمبر بتایا اور انتظار کرنے لگی۔ کسی نے وہاں سے "ہیلو" کہا۔ اس نے کہا "محتشم صاحب کو ٹیلیفون پر بھیجو۔"

اس کا دل دھڑکنے لگا۔ بڑی بے حیائی ہے۔ وہ دل میں کیا سمجھیں گے۔ ہاتھ کانپنے لگا۔ اس نے "ریسیور" میز پر رکھ دیا۔ اس کا جی چاہا وہ یہاں سے بھاگ جائے۔ آخر آج اسے ہو کیا گیا ہے؟ وہ کیوں بوکھلائی بوکھلائی سی ہے؟ آخر میاں سے کیا کہے گی؟ اس کے نتھنوں پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے جھلکنے لگے۔ اس نے 'ریسیور' اٹھایا کہ اسے چپکے سے ٹیلیفون کے "ٹرنسمیٹر" پر رکھ کر گفتگو کا موقع ہی نہ دے۔ لیکن اُس کے اٹھاتے ہی آواز آئی۔ ان کی پیاری آواز ـــ "ہیلو"۔ گھبرا کر بول اٹھی "ذرا ـــ ذرا یہاں آئیے کام ہے!"

"اچھا آپ ہیں! ابھی آیا سرکار!"

اب کیا کیا جائے؟ اب تو راہ فرار بھی مسدود ہو گئی! وہ تھوڑی دیر کھڑی کھڑی کانپی۔ پھر دفتر کی روشنی بجھا کر اپنے کمرے میں آئی۔ دو مسہریوں پر سپید سپید چادریں، پائینتی ریشمی دلائیاں، سرہانے دو دو تکیئے۔ ایک طرف اس کی سنگار میز۔ اس پر آرائش و زیبائش کے سامان میں مشرق و مغرب کی آمیزش۔ کنگھا، برش، پاؤڈر، کریم، سینٹ، عطر، سرمہ، چاندی کا گلوری دان، کچھ انگوٹھیاں۔ دوسری جانب ان کی میز، اس پر مردانے برش اور کنگھے کے ساتھ ساتھ ایک جوڑی ڈمبل ـــ

"کس قدر خوبصورت ہے ان کا جسم! تیس برس کے قریب عمر مگر بوٹی بوٹی کسی ہوئی۔ پھرتی، قوت اور مردانگی کا نمونہ! جب ہی تو بڑے گھمنڈ سے کہتے تھے "تمہاری جسمانی خوبصورتی بچہ نہ ہونے ہی تک ہے، پیاری بنو!" ـــــ اور میرے شرمانے اور دوپٹہ میں منہ چھپانے پر کس طرح ہنستے ہیں۔ "مغنی کہتی ہے۔ حجاب نوعروساں دو بر شوہر نمی ماند۔ اگر ماند شبے ماند شب دیگر نمی ماند!" اور تم ہو کہ اب تک چھوئی موئی بنی ہو! لجا مُو! جھینپو!" ـــــ اور آج کیا کہیں گے وہ؟ انہیں کی بات سچ ہوئی! میں اُن سے برابر لڑی کہ ہر عورت فطرتاً رنڈی نہیں

ہوتی۔ وہ کہتے "تم اپنا ذکر نہ کرو۔ تم عورت نہیں ہو، تم تو قطبین کی نہ پگھلنے والی برف کی شِل ہو، ہاتھی دانت کی مورتی ہو، سنگ مرمر کی پری ہو!" ـــــ ہائے اللہ یہ مجھے کیا ہو گیا کہ میں نے ان کو خود سے بلا لیا۔ وہ چاہے میرے دکھانے کو کتنا ہی خوش ہوں، لیکن دل میں ضرور کہیں گے "نکلی جمیلہ بھی رنڈی ہی!" ۔ اور وہ اپنی مخصوص ہنسی ہنسیں گے، وہی جس کا ہر قہقہہ کہتا ہے "تمہارا میاں کبھی غلط بات کہتا ہی نہیں بنو! ـــ وہ عورت کی رگ رگ پہچانتا ہے، بی بنو!" ـــــ اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔ جیسے کوئی سچ مچ وہاں کھڑا ہے، جیسے کوئی سچ مچ اسے جھینپتے دیکھ رہا ہے۔ وہ اسی طرح کھڑی کھڑی رہی۔ ایک بار جھرجھری سی محسوس ہوا کہ اس میں قوت مقاومت نہیں رہ گئی اور اب بات اس کی برداشت سے باہر ہو گئی۔ اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹا کے آہٹ پر کان لگائے، کہیں وہ آتو نہیں رہے ہیں! ـــ اس نے جلدی سے روشنی گل کی اور لمبے لمبے قدم رکھتی، مڑ مڑ کر دیکھتی، ـــ ہمسائی کی کوٹھی میں چلی گئی ـــ

دیوار تو درمیان تھی ہی۔ بس اپنی پھلواڑی طے کی اور ان کے صحن میں ہولی۔ لیکن اتنی راہ اس گھبراہٹ سے گذری کہ ہمسائی کے ہاں پہنچتے پہنچتے وہ ہانپنے لگی۔ دل دھڑک رہا تھا اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ہمسائی کی شکایت اور سہیلیوں کے طعنوں کا جواب وہ بڑی مشکل سے رک رک کر دے سکی۔ جب ذرا دم ٹھکانے ہوا تو ان انوکھے جذبات و خیالات کو بھلانے کے لئے وہ کام پر پل پڑی۔ اس نے ساری بیویوں کو کھانا کھلایا، پان پہ پان بنا کے دیئے، دلھن کو سنوارا، دولھا کے اندر آنے پر رسمیں کرائیں، اور تاروں کی چھاؤں میں الٰہ کو سسرال رخصت کر کے وہ گھر پلٹی ـــ تھکی ہوئی چور، افسردہ و مضمحل، بابل کے پُر حسرت گیت کی کھٹک دل میں لئے ہوئے ـــــ

پھیکی چاندنی اب بھی پھیلی تھی۔ پھولوں پر شبنم کے موتی جھلک رہے تھے، ہوا میں خنکی کے ساتھ ساتھ ایک خوشبو دار مستی تھی، آس پاس کے درختوں سے چڑیوں کے چہچہانے کی آواز کانوں میں ایک خوشگوار جھنجھناہٹ پیدا کر دیتی تھی ـــــ اس نے انگڑائی لی۔ رگوں کے ٹوٹنے کی آواز کے ساتھ ساتھ ایک غنچے کے چٹخنے کی آواز بھی سنائی دی۔ پلٹ کر دیکھا تو گلاب کی ایک کلی کھل رہی تھی۔ وہ کھلکھلا اٹھی۔

"ہو گئیں کیاریاں ہری ہری جیسے کہ رت پلٹ چلی، بکھان پہ مسکرا دیا، ہنسنے لگی کلی کلی!" رُت پلٹ چلی۔ رُت پلٹ چلی۔ اس نے دوبارہ دہرایا۔ اس کا اضمحلال غائب ہو گیا۔ اس کے دل میں تمام وہی جذبات عود کر آئے جو ٹیلیفون کرنے سے پہلے موجزن تھے۔ اس کا بے ساختہ جی چاہا وہ میاں کو جگا کر کھینچ لائے۔ "چلو پھولوں کا کھلنا دیکھو، گلوں کے کٹوروں میں شبنم کے موتی دیکھو، اور رات کی دن سے ہم آغوشی دیکھو ـــــ"

اس کے قدم تیز ہو گئے، اس کا تنفس تیز ہو گیا، اس کی گردن آگے بڑھ گئی، گویا وہ اپنے میاں کی طرف اسی طرح کھنچی جا رہی تھی۔ جیسے فولاد مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے۔ دالان میں پہلے میاں کے دفتر کا کمرہ ملتا تھا۔ اس نے اپنی سانس کو قابو میں کرنے کے لئے اسے کھول کر جھانکا۔ اسے یقین تھا۔ یہاں کوئی نہ ہو گا۔ "وہ" اپنی مسہری پر دراز آرام کرتے ہوں گے۔ لیکن صبح کے دھندلکے میں کوئی مخملی قالین پر پڑا ہوا معلوم ہوا۔ اسے تعجب سا ہوا۔ اس نے اندر ہاتھ بڑھا کر سوئچ دبا دی ـــ

اس کی جوان ماما رمضانی بے خبر سوئی تھی۔ لٹیں چھٹکی ہوئی، کپڑے بے ترتیب، لٹے ہوئے مسافر کی بے پروائی! جمیلہ نے جھنجھلا کر سوچا "اس مالزادی کو یہاں لیٹنے کی کس نے اجازت دی!" اس نے اِدھر اُدھر نظر ڈالی۔ میاں کا ایک موزہ میز پر رکھا تھا، ایک نیچے گرا تھا، کالی شیروانی رمضانی کے سرہانے فرش پر پڑی تھی، اور وہ بلبل والے حمام میں لہرا لہرا کے گا رہے تھے ـــ

"داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی، اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے!"

سنگ مرمر کی پری نے "چیخ روکنے کے لئے" اپنے ہی ہاتھ سے اپنا منہ بند کر لیا۔

ابراہیم جلیس

لڑائی

• کنگسوے سے بارکس تک گلبرٹ کو راستے میں کئی عورتیں ملیں۔ اچھی صورتوں والی اور لآویز جسموں والی، خوش رنگ لباسوں والی عورتیں، لیکن اُس نے کسی کی طرف نظر بھر کر نہیں دیکھا۔ تیز تیز قدم اُٹھاتا چلا جا رہا تھا۔ سُورج کی تیز چمک سے اس کا غصّہ سے تمتایا ہوا چہرہ اور بھی لال بھبو کا ہوا جا رہا تھا۔ ایک مس فلورا سے جھگڑا ہو جانے پر وُہ یوں محسوس کر رہا تھا۔ جیسے دنیا کی ساری عورتوں سے اس کی چل گئی ہے۔

بارکس کے پھاٹک پر ایک ٹرک گھر گھراتی ہوئی اسٹارٹ ہو رہی تھی — اسٹرنگ پر واٹسن ——— گلبرٹ کا ہم وطن اور ہم راز دوست جھکا ہوا تھا۔ گلبرٹ کے تمتماتے چہرے، اکڑے تیور اور کھنچے ابرو دیکھ کر وُہ مسکراتا ہوا ٹرک سے اُترا اور بولا۔ معلوم ہوتا ہے کہ فلورا سے آج پھر تمہارا جھگڑا ہو گیا ہے یار بڑے جھگڑالو عاشق ہو تم ———"

گلبرٹ نے پتلون کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ٹھونس کر جسم اکڑاتے ہوئے کہا۔ "فکن ڈیم مس فلو ———"

واٹسن گلبرٹ کی رگ رگ سے واقف تھا۔ شاید گلبرٹ بھی اپنے بارے میں اتنے صحیح معلومات نہیں رکھتا تھا۔ جتنے کہ واٹسن کو معلوم تھے۔ واٹسن کی عادت تھی کہ وُہ جس سے ملتا تھا اس کو صرف دیکھتا ہی نہیں تھا۔ بلکہ باضابطہ طور پر اس کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ گلبرٹ تو اس کا چوبیس گھنٹوں کا ساتھی تھا۔ اس لئے اس نے گلبرٹ کے کندھے پر زور سے ہاتھ مار کر کہا۔ "تو آؤ ——— کسی بار میں چل کر غم غلط کریں۔ یہ کسی سپاہی کے شایانِ شان نہیں کہ وُہ اتوار کی تعطیل یوں مُنہ لبسورتے گزار دے۔ مُنہ لبسورنے کے لئے تو اور چھ دن پڑے ہیں۔"

گلبرٹ اس وقت کہیں نہیں جانا چاہتا تھا۔ آرام سے بستر پر لیٹے یا مسز کینوس کی آرام کرسی پر بیٹھے سگار پیتے ہوئے جارج سے انتقام لینے کے طریقے سوچنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے مُنہ بناتے ہوئے کہا۔ "نہیں بس ——— فکن میں کہیں نہیں آؤں گا۔"

واٹسن ایسے موقعوں پر گلبرٹ کو اُدھ منا تا سمجھاتا نہیں تھا۔ بلکہ اسے پکڑ کر سینے سے لگا لیتا۔ گلبرٹ وقتی طور پر اس پر برس پڑتا اور دو ایک گھونسے بھی لگا دیتا لیکن گھونسوں کی تعداد جیسے جیسے بڑھتی جاتی واٹسن کی ہنسی بھی کھنکھنانے لگتی۔ حتیٰ کہ گلبرٹ بھی کھسیانے لگتا اور بات ختم ہو جاتی . . . . اور بات ختم ہو گئی۔

گلبرٹ واٹسن کی پہلو والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ٹرک گھر گھراتی ہوئی چل نکلی۔ بارکس کے منچلے سپاہیوں کا گیت . . . . چک چک چک ——— بوم چک . . . . بوم چک ——— مدھم ہوتا ہوتا مر گیا۔ اور پلاٹنا اسٹریٹ کے چوراہے سے شہر کا شور بلند ہوا ——— گُم۔ گُم۔ ایک بے مفہوم بے معنی شور جیسے لاتعداد مکھیوں کی بھنبھناہٹ ——— جو ٹرک کی گھر گھراہٹ پر بھی بھاری تھی۔

ڈبلیو۔ اے۔ سی ہوسٹل کے پھاٹک پر دس بارہ "پیٹی کوٹ سولجرس" کھڑی ہوئی تھیں۔ واٹسن نے شرارتاً انہیں سلام کرتے ہوئے گلبرٹ کی کمر میں کہنی ماری اور بولا۔ "ہاں اب سناؤ کیا ہوا ———"

گلبرٹ نے جیب سے سگریٹ کیس نکالتے ہوئے کہا۔ "ہوتا کیا ہے ——— فکن وُہ سالا جارج ——— میں اسے جان سے مار دوں گا۔ وُہ میرے ہر راستے میں روڑا بن کر آ جاتا ہے۔"

واٹسن عادتاً مسکرانے کے بجائے کچھ سنجیدہ ہو گیا اور "ہوُں" کہہ کر ٹرک کی رفتار تیز کر دی۔ سڑک سنسان تھی۔ کبھی کبھار کوئی اچھی شکل وصورت اور اچھے لباس والی عورت بھی نظر آ جاتی تھی۔ ورنہ جتنی عورتیں فٹ پاتھ پر چل پھر رہی تھیں۔ نچلے طبقے کی نچلی قسم کے رنگ والی۔ بے ڈھنگی خالص ہندوستانی ——— پیلی پیلی تیز دھوپ سیمنٹ روڈ پر پڑی چندھیا رہی تھی۔ دونوں خاموش تھے ——— جارج! جارج!! وُہ نہ صرف گلبرٹ کے راستے کا بلکہ واٹسن کے راستے کا بھی روڑا تھا۔ وُہ امریکن تھا۔ گلبرٹ اور واٹسن دونوں انگریز ———

یا جارج صرف ایک روڑا تھا اور گلبرٹ اور واٹسن صرف راہگیر ——— جارج کی بدولت گلبرٹ اور واٹسن کو کیسی کیسی خفتیں اور ہزیمتیں اُٹھانی پڑی تھیں۔ سڑکوں پر، ہوٹلوں میں، تانگہ اسٹانڈز پر، شراب خانوں میں، ناچ گھروں میں، دوکانوں میں، ہیر کٹنگ سیلونس میں، فوٹو اسٹوڈیوز میں، رنڈیوں کے کوٹھوں پر، سوسائیٹی کی لڑکیوں میں . . . . گلبرٹ نے واٹسن سے یا واٹسن نے گلبرٹ سے کہا ہو یا نہ کہا ہو۔ مگر دونوں اچھی طرح جانتے تھے کہ جارج کی موجودگی میں واٹسن کو بھی وہی زک اُٹھانی پڑتی تھی جو کہ گلبرٹ کو ——— پرسوں شام واٹسن چینی بار میں شراب پینے گیا تھا۔ اتفاق سے جارج اور واٹسن ایک ہی میز پر بیٹھے تھے۔ لیکن بیرہ جس تیزی اور مستعدی سے جارج کے آرڈرس کی تعمیل کر رہا تھا۔ اتنی ہی کاہلی اور بے دلی سے واٹسن کے آرڈرس سنتا تھا۔ حالانکہ اس دن واٹسن نے بیرے کو جارج سے تگنی زیادہ بخشیش دی تھی۔ بیرے نے خوش ہو کر خاص انداز میں اسے سلام تو کیا لیکن اس کی مسکراہٹ علانیہ طور پر کہہ رہی تھی ——— صاحب ہر فرائی ڈے گڈ فرائی ڈے تو نہیں ہوتا۔ تم نے آج اتنی بخشیش دی۔ کل کہاں دوگے جارج صاحب تو روزانہ اتنی بخشش دیتا ہے کہ ایک دن کی تنخواہ سے زیادہ پیسے مل جاتے ہیں۔

ٹرک موڑوں پر مڑتی، سنسان سڑک پر تیز دوڑتی، بھیڑ بھاڑ میں سست رفتار ہوتی چلی جا رہی تھی۔ گلبرٹ نے واٹسن کو اس طرح خاموش دیکھ کر پوچھا۔ "تم کیا سوچ رہے ہو ——— فکن بتاؤ ہمیں کہاں جانا ہے؟"

واٹسن نے جواب دیا۔ اتوار کے دن پروگرام بنا کر سیر کرنا صریح حماقت ہے۔ ارے کہیں چلیں گے ——— جہاں جی چاہا ——— جہاں جی چاہا!!

گلبرٹ نے منہ لٹکاتے ہوئے کہا "مگر تمہاری یہ فکن خاموشی مجھے مطلق پسند نہیں۔ کچھ باتیں کرو۔"

واٹسن نے مسکرا کر پوچھا "کیا باتیں کریں ——— ! تم ہی بتاؤ کچھ"

گلبرٹ کے ذہن پر جیسے ابھی تک جارج ہی سوار تھا۔ اسے جارج کے علاوہ اور کوئی موضوع ہی نہ ملتا تھا۔ اسی لئے اس نے پھر اسی کو باتوں کا موضوع بنا ڈالا۔ "یار واٹسن ——— کل اس الّو جارج نے پھر میری بے عزتی کر دی۔ میں ناچ گھر جانا چاہتا تھا۔ تانگے کو پانچ روپے میں ہائیر کیا۔ سمجھے پانچ روپے میں صرف دو فرلانگ کے لئے ——— لیکن نہ جانے آسمان پھٹ پڑا یا زمین تڑخ اٹھی اور جارج نازل ہو گیا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی سالے تانگے والے نے تانگہ اسی کی طرف بڑھا دیا۔ اور بغیر کرائے کی بات چیت کئے جارج تانگے میں بیٹھ گیا۔ اور مجھے ایسی طنزیہ اور حقیر نظروں سے دیکھتا رہا۔ کہ جی چاہتا تھا کہ وسکی کے چاروں پگ کا نشہ ایک ہی گھونسے میں بھر کر اس کے جبڑوں پر اتار دوں۔ لیکن . . . .

واٹسن نے بات کاٹی۔ لیکن یہ تو کوئی بڑی ہتک نہیں۔ تین چار روز پہلے گرین کیفے" میں میرے ساتھ ایلیفنٹ برج کی ایک چھوکری ساتھ تھی۔ میں اسے" اوما آف دی ساؤتھ سیز" دکھانے پلازا لیجانے والا تھا۔ میں نے اسے چار ہی بجے سے انگیج کر لیا تھا۔ ٹیکسی میں شہر کی ساری سڑکیں گھما ڈالیں۔ گرین میں ڈنر کھلایا۔ اور جب ہم شمپین کے خُم لنڈھا رہے تھے ——— اور جب ہم شمپین کے خُم لنڈھا رہے تھے !! ۔ گلبرٹ نے جملہ دہرایا۔ اور جب تم شمپین کے خم لنڈھا رہے تھے ——— ؟

واٹسن نے کہا۔

ہاں جب ہم شمپین کے خم لنڈھا رہے تھے ——— وہ ——— وہ سالا جارج آ موجود ہوا۔ اور وہ ندیدی چھوکری ایک منٹ کی اجازت لے کر اس سے ملنے چلی گئی۔ میں نے ایک منٹ، دو منٹ، تین منٹ، ساٹھ منٹ انتظار کیا ——— شمپین کے خُم کے خُم لنڈھاتا رہا مگر . . .

گلبرٹ نے اس کی بات اچک لی۔

مگر یہ بھی کوئی بڑی ہتک نہیں۔ تمہاری اس ہتک کا کسی کو بھی پتہ نہ چلا ہوگا۔ اس کیفے میں جتنے آدمی بیٹھے تھے سبھوں نے یہ سمجھا ہوگا۔ کہ تم نے اس لڑکی کو صرف ڈنر کی دعوت دی تھی۔ اب یہ کرو کہ وہ لڑکی جہاں بھی ملے اس سے انتقام لو۔ ایک روپیہ دیئے بغیر اسے پورے چوبیس گھنٹے انگیج کر لو۔"

واٹسن نے کہا۔

یار۔ تم انتقام کی کہہ رہے ہو۔ میں تو اب اس لڑکی سے آنکھ ملا کر بھی بات نہیں کر سکتا۔ یہ پیسوں کی بھوکی چھوکریاں اسی کو طاقتور مرد سمجھتی ہیں۔ جس کی پاکٹ میں زیادہ دام ہوں۔ اور پھر وہ ایک چھوکری ہے۔ اور ہماری تہذیب بیہودہ ہے۔ اس تہذیب میں تو ایک آوارہ کی ذلیل سی ذلیل عورت تک کی عزت کرنی پڑتی ہے۔ میں "لیڈیز فرسٹ" کے اخلاق سے تنگ آگیا ہوں۔

"عورت پہلے آگئی تہذیب پیچھے رہ گئی ——— مجھ پر لعنت ہو" گلبرٹ نے جھینپی ہوئی مسکراہٹ میں اپنی آہنی ران پھاڑتے ہوئے کہا۔ "تو پھر جارج سے انتقام لو ———"

واٹسن نے چوراہے پر کھڑے ہوئے ٹریفک کے سپاہی کے اُٹھے ہوئے ہاتھوں کا نوٹس لئے بغیر غلط سائیڈ پر ٹرک موڑ دی اور ہنس پڑا۔ جیسے چوراہے پر ٹریفک کا سپاہی نہیں کھڑا تھا بلکہ جارج کھڑا تھا۔ اور واٹسن نے اپنا انتقام پورا کر لیا تھا۔ یہ انتقام ذلیل قسم کا تھا۔ مگر ہنسی نے دونوں کے دلوں کو تھوڑی دیر کے لئے ہلکا اور شگفتہ بنا دیا تھا۔ واٹسن نے کہا۔

"جیمس اسٹریٹ کے ایک ہیر کٹنگ سیلون میں جارج سے میں نے انتقام لے لیا ہوتا مگر عین وقت پر وہ مل گئی تھی وہ ——— یار وہ کیا نام ہے اُس کا ———؟ وہی جس کے بائیں گال پر ایک ننھا سا سیاہ تل ہے"

گلبرٹ نے پوچھا ——— "کون میریا ———؟"

واٹسن نے کہا ——— نہیں یار وہ جو الگزینڈرا بار کی دوسری منزل پر رہتی ہے۔ اُس کا نام شاید "الیف" سے شروع ہوتا ہے؟

گلبرٹ نے کہا ——— "فریڈا ——— !!"

واٹسن نے کہا ——— ہاں ہاں فریڈا ——— پیاری فریڈا ——— وہ بال ڈریس کروانے وہاں آگئی تھی۔ مگر مجھے دیکھ کر اپنا مرمریں ہاتھ میری بغل میں اُڑس کر سینٹی شو چلنے پر اصرار کرنے لگی۔ اس وقت اس کے ہونٹوں پر کچھ ایسا شہوت رنگ لپ اسٹک چڑھا ہوا تھا۔ کہ میں بالکل ہی بھول گیا کہ وہاں جارج موجود ہے اور اس سے مجھے انتقام لینا ہے۔ انہیں بھی ہوتی ہوئی جسم کی ساری طاقت میں نے فریڈا کی بانہہ کو اپنی بغل میں نہایت گرمجوشی سے دبانے میں صرف کر دی۔ اور ....

گلبرٹ آگے بولا۔

"اور میں بھی اسی سیلون میں جارج کو جہنم بنا دیتا۔ اور اس سیلون والے کی بیوی کو بیوہ بنا دیتا۔ اصل میں وہ سیلون والا ہے بڑا بدتمیز۔ میں آدھ گھنٹے سے سیلون میں بیٹھا انتظار کر رہا تھا کہ اب کوئی کرسی خالی ہو اور میں شیو بنوا لوں۔ لیکن جونہی پھر آدھمکا یعنی وہی جارج ——— اس وقت ایک کرسی خالی ہوئی اور سیلون والے نے وہ کرسی جارج کے حوالے کر دی۔ میں اس سے اُلجھ پڑا کہ میں آدھ گھنٹے سے انتظار کر رہا تھا تو سالے نے کوئی جواب ہی نہ دیا۔ اگر اس وقت یہاں تین چار فکن ہندوستانی اور حبشی سپاہی نہ ہوتے تو میں دونوں کو موت کی آگ میں جھونک دیتا۔"

واٹسن نے کہا ———

"تم نے بہت اچھا کیا۔ گلبرٹ جو اُن حبشی اور ہندوستانی سپاہیوں کے سامنے جارج سے کچھ نہ کہا۔ جارج ہمارا رقیب ——— ہمارے کاروبار کا رقیب ہے تو کیا ہوا۔ بھٹی ہے تو وہ اونچی نسل کا۔ یعنی ہماری تمہاری نسل کا۔ اگر تم اس وقت اس سے لڑ پڑتے تو نیچی نسل اور ذلیل رنگ کے حبشیوں اور ہندوستانیوں کے سامنے رنگ و نسل کی ساری عزت کرکری ہو جاتی۔"

گلبرٹ تائید میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ٹرک ایک چھوٹے سے خوبصورت مکان کے پھاٹک پر رُکی۔ برآمدے کے کھمبوں کے ساتھ عشق پیچاں کی بیلیں لپٹی ہوئی تھیں۔ برآمدے کے بیچوں بیچ ایک تپائی رکھی ہوئی تھی۔ جس پر سبز رنگ کا ٹیبل کلاتھ پڑا ہوا تھا۔ تپائی کے اطراف پیلی پیلی چمکدار بید کی چار کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک کرسی پر فلورا کالی کالی بُندکیوں والا پیلا فراک پہنے اپنی ایک ننگی پنڈلی تپائی پر ٹکائے کوئی واہیات سا شہوت انگیز ناول پڑھ رہی تھی۔

ٹرک کی آواز سُن کر اور گلبرٹ اور واٹسن کو دیکھ کر مسکراتی ہوئی پھاٹک تک آئی۔ باہر ٹرک سڑک کے کنارے اپنی دونوں بجھی بجھی آنکھوں سے سامنے خلاء میں گھورتی چپ چاپ کھڑی تھی۔

پچیس تیس منٹ بعد گلبرٹ، واٹسن اور فلورا باہر نکلے۔ فلورا نے نارنجی اور گہرے اُودے رنگوں کے دلآویز امتزاج والا فراک پہنا

پہنا ہوا تھا۔ فراک کا وہ حصہ جو ساڑھے چار بالشت گول کر کے نیچے سے سپید سپید مرمریں گھٹنوں تک پھیلا ہوا تھا گہرے اودے رنگ کا تھا۔ کمر کے اوپر سے فراک کا رنگ نارنجی تھا۔ جو اس کی گٹھیلی نوکیلی چھاتیوں پر خوب پھنس کر آیا تھا۔ پیچھے پیٹھ پر چوتڑ کے برابر چھ بٹن لگے ہوئے تھے۔ بٹنوں کے لگ جانے کی وجہ سے فراک پر ایسی خفیف سی جھریاں ریڑھ کی ہڈی کے ساتھ چمٹ گئی تھیں جیسے یہی جھریاں دیکھنے والے مردوں کی ریڑھ کی ہڈی میں جنسی ارتعاش بن کر اُتر جاتی ہیں۔ فلورا کے بال سنہرے تھے اور پریشان پریشان ——— اُودے اُودے اسٹریپس والے سینڈل میں اپنے سپید سپید پاؤں اُٹھاتی، کولہے مٹکاتی، گلبرٹ اور واٹسن کے بیچ میں چل رہی تھی۔ گلبرٹ کے ہونٹوں پر ایک ظفرمند مسکراہٹ تھی اور واٹسن کے ہونٹ "نار ماشیر پر" کا گایا ہوا بوڑھا گیت سیٹی کی آواز میں اگل رہے تھے۔ ٹرک کو وہیں چھوڑ کر وہ کنگسوے کی طرف پیدل ہی چلنے لگے۔ بوڑھی ٹرک اپنی موٹے مدھم شیشوں والی آنکھوں سے فلورا کے پھلکتے کولہے اور تھرکتی پنڈلیاں بڑی دور تک دیکھتی رہی اور دیر تک سوچتی رہی۔

چلتے چلتے فلورا نے چونک کر گلبرٹ سے پوچھا "اگر راستے میں جارج مل جائے تو ——— ؟"

گلبرٹ نے پوری انگریزی نخوت کا مظاہرہ کیا۔ "لیکن ہم ڈارلنگ ——— میں اس کے سارے پیسے لوٹا دوں گا۔ ڈونٹ وری ——— کتنے پیسے دیئے تھے اس نے تم کو ——— ؟"

فلورا نے کہا۔ "ساٹھ روپے ———"

گلبرٹ نے جیب سے منی پرس نکال کر اسے دکھاتے ہوئے پوچھا۔

"بس صرف ساٹھ روپے ——— لیکن ——— میں اس کو دوگنے دام بھی دے سکتا ہوں۔ تم فکر نہ کرو پیاری ——— !" اور پھر پرس اس نے اپنی جیب میں رکھ لی۔ خالص انگریزی انداز میں ——— بالکل اُسی طرح جس طرح اٹلانٹک چارٹر پاس ہونے کے بعد ایک محفوظ مقام پر رکھ دیا گیا۔

وکٹوری بار پہنچ کر تینوں نے خوب شراب پی۔ واٹسن ابھی تک نار ماشیر پر کا بوڑھا گیت سیٹی کی دھن میں گا رہا تھا۔ گلبرٹ اور فلورا شہوت آمیز محبت کی باتیں کرتے رہے۔ اسی اثنا میں جارج بھی وکٹوری بار میں داخل ہوا۔ فلورا کو دیکھ کر مسکراتا ہوا اس کے قریب آیا۔ وہ دونوں تعیوف کے چہرے فق ہو گئے کہ کہیں فلورا پھر جارج کے ساتھ نہ چلی جائے کہیں ——— !! کہیں فلورا .... !!

فلورا نے جارج کے قریب آتے ہی کہا ——— میں نے تمہارا بڑی دیر تک انتظار کیا ڈارلنگ مگر ......

جارج نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ——— فکر کی بات نہیں۔ میں خود بھی آج صبح سے بہت مصروف تھا۔ اچھا کل ......

ابھی جارج نے پوری بات کہی بھی نہ تھی کہ گلبرٹ نے جیب سے منی پرس نکالا کہ کہیں جارج فلورا کو کل کے لئے پھر انگیج نہ کر لے۔ پرس کو میز پر رکھتے ہوئے کہا ———

جارج یہ رہے تمہارے ساٹھ روپے جو تم نے فلورا کو دیئے تھے۔ اب فلورا میری ہے۔ اب فلورا ہمیشہ کے لئے میری رہے گی۔"

جارج نے پہلے تو اپنی مسکراتی آنکھیں گلبرٹ کی شعلہ بار آنکھوں سے ملا دیں اور پھر مسکراتے ہوئے ہونٹوں سے بولا۔

مبارک ہو گلبرٹ ——— فلورا اب ہمیشہ تمہاری ہی رہے گی۔ مائی فرینڈ گلبرٹ ———

اور اس نے نکاح پڑھانے والے پادری کی طرح دونوں ہاتھ اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "مقدس خدا سے دُعا ہے کہ تم دونوں پر یسوع مسیح کی رحمتیں ہمیشہ نازل ہوتی رہیں"

گلبرٹ اور واٹسن رقیب کی اس زہریلی ہنسی کو برداشت کر رہے تھے۔ جارج گلبرٹ کی کرسی کے پیچھے آیا اور جھک کر اپنی دونوں ہتھیلیاں گلبرٹ کے کندھے پر رکھ دیں۔ اور بڑے پیار سے اُس کے تمتماتے ہوئے گال تھپکتے ہوئے بولا۔

مائی ڈیر فرینڈ ——— تم بہت جذباتی ہو۔ ابھی بہت نو عمر ہو نا ——— ! عورت کے بارے میں بہت سنجیدگی کی ضرورت ہوتی ہے ——— خیر سیکھ ہی جاؤ گے ——— فلورا ہی سکھا دے گی کسی دن ——— ہاں اچھا ——— کل تم تینوں کنگسوے کے چوک پر ضرور ———

ٹھیک ساڑھے چھ بجے شام۔ برٹش اسٹینڈرڈ ٹائم —— کل ڈوروتھی سے میری شادی ہوگی۔"

گلبرٹ اور واٹسن نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

ڈوروتھی ——!

ڈوروتھی ——!!

اور جارج ڈوروتھی کو جو ہوٹل کے باہر کار میں بیٹھی تھی بلانے کے لئے چلا گیا۔ جارج پھر جیتا —— امریکہ پھر جیتا —— گلبرٹ اور واٹسن آخری بار ہزیمت خوردہ رقیبوں کی طرح ایک دوسرے کے بجھے بجھے چہروں کو دیکھنے لگے مگر ان کی نظریں کہیں اور تھیں —— کسی بہت ہی چمکیلے چہرے کی زد میں —— ڈوروتھی کے چاندنی پھوٹتی ہوئی کرنوں سے اُلجھی ہوئی۔

ڈوروتھی کیپٹن باربرا کی اکلوتی لڑکی تھی۔ اور ساری چھاؤنی کی اکلوتی خوبصورتی —— اور "یورپین بلڈ" تھا اس کے جسم میں۔ بارکس کے سپاہی ڈوروتھی کے لئے پاگل تھے۔ لیکن ڈوروتھی سوائے گلبرٹ کے کسی کو بھی میٹھی مسکراہٹ اور ملائم نظروں سے نہیں دیکھتی تھی۔ اس نے ڈریم لینڈ کے پارک میں کئی سپید سہانی شامیں گلبرٹ کے ساتھ گزاری تھیں۔ گلبرٹ نے اس کے قرمزی ہونٹوں کو کئی بار چوما تھا۔ اس کی ایک قدم پر ایک بل کھانے والی کمر کے گرد اپنے لمبے چوڑے بازو کے گھیرے ڈالے تھے۔ وہ ڈوروتھی —— وہی ڈوروتھی .... وہی ڈوروتھی جارج کے پہلو میں سمٹی سمٹی اپنی ملائم نظروں میٹھی مسکراہٹ اور شیریں اداؤں کے ساتھ بار کے سرخ قمقموں کے سُرخ اجالے میں بجلی کی طرح چمکی اور بار میں بیٹھے ہوئے سارے سپاہی اپنے اپنے جام اور اپنے اپنے دل تھام کر رہ گئے۔ جارج نے جان بوجھ کر ڈوروتھی کا گلبرٹ سے تعارف کرایا۔ لیکن گلبرٹ نے میز پر کہنیاں ٹیک کر اپنے بھورے بالوں والا سر ہتھیلیوں میں تھام لیا۔ کچھ دیر چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اور معاً اٹھا —— اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا بار کے سرخ اجالے سے باہر نکلا۔ اور اندھیرے میں روپوش ہوگیا۔

(۲)

بہت دنوں بعد گلبرٹ ایک بار پھر اُجالے میں جیمس اسٹریٹ پر سگار کا دھواں اڑاتا تھکے تھکے قدموں سے چلتا نظر آیا —— اکیلا۔ گلبرٹ کے ہم راز اور غمگسار دوست واٹسن کی بدلی جنوب کی کسی دوسری چھاؤنی میں ہو گئی۔ اور گلبرٹ سکندر آباد کی سڑکوں پر اکیلا رہ گیا۔ دن بھر سڑکوں پر مارا مارا پھرتا۔ دکانوں میں بے مقصد گھستا، چیزوں کو الٹ پلٹ کر کے دیکھتا، باہر نکل آتا، ہوٹلوں میں جاتا، بغیر کسی خواہش کے خوب شراب پیتا۔ بدصورت سے بدصورت لڑکیوں کا تعاقب کرتا۔ سینما گھروں میں جاتا۔ یہ معلوم کئے بغیر کہ کونسی پکچر چل رہی ہے ٹکٹ خرید لیتا اور جا بیٹھتا۔ بسا اوقات انٹرول سے پہلے ہی بارکس چلا جاتا۔ بارکس میں اپنی مخصوص سبز کینوس کی آرام کرسی پر گھنٹوں بیٹھا چپ چاپ سگار پیتا رہتا۔ اتوار کے اتوار فلورا کے گھر جاتا۔ اس کے ہونٹ خریدتا، چوستا چومتا مگر اسے وہ مزا میسر ہی نہ آتا تھا جس کے لئے اس کے سارے حواس پیاسے ہو رہے تھے۔

انہی دنوں فلورا کا سگا بھائی پال پنجاب کی کسی چھاؤنی سے بدل کر سکندر آباد چھاؤنی آگیا۔ گلبرٹ کو پال کے روپ میں اس کا اپنا پیارا دوست واٹسن مل گیا۔ پال اور واٹسن کے عادات میں (شکل و صورت اور رنگ و نسل سے قطع نظر) ایسی حیرت ناک مشابہت تھی۔ کہ کئی بار گلبرٹ نے پال سے کہہ بھی دیا۔

"یار سکندر آباد اب پھر سکندر آباد ہوگیا ہے"۔

پال کے لئے یہ جملہ بظاہر بے مطلب اور بے معنی تھا۔ لیکن گلبرٹ اس سے کہتا "معنی پوچھ کر مزہ کرکرا نہ کرو۔ مجھے لطف اندوز ہونے دو۔ میں بڑے طویل عرصے سے بے مزہ زندگی گزار رہا تھا"

گلبرٹ پال کے ساتھ بڑی بے تکلفی کے ساتھ گھومتا رہتا تھا اور گلبرٹ کے بعض یورپین نسل کے دوستوں کو تعجب ہو رہا تھا اور بُرا بھی معلوم ہوتا تھا کہ گلبرٹ اتنی اونچی نسل کا انسان ہو کر ایک اینگلو انڈین لڑکے کے ساتھ یوں بے تکلف ہو گیا ہے اور جنہیں گلبرٹ اور فلورا کے داستانِ معاشقہ کا علم تھا۔ وہ تو اور بھی چڑے ہوئے تھے کہ گلبرٹ اعلیٰ نسل کے سرخ سُرخ خون میں ہندوستانی لہو کی سیاہی مائل سُرخی کی آمیزش

رہا ہے۔

اور خود پال کو بھی گلبرٹ کی یہ بے تکلفی مطلق پسند نہیں تھی لڑائی شروع ہونے سے اب تک وہ کئی چھاؤنیوں میں رہ کر آیا تھا۔ اور اپنی آنکھوں سے اپنی سیاہ چمڑی کی درگت دیکھی تھی۔ ہزاروں واقعات میں سے ایک نمایاں واقعہ ...... ایرڈروم کا بھی تھا جس میں پال کی اتنی بڑی ہتک ہوئی تھی کہ اس کی اور کالنس کی باضابطہ باکسنگ ہو گئی تھی پال اور کالنس ایک ہی ہوائی جہاز سے اُترے تھے ایرڈروم سے چھاؤنی کو جو لاری سپاہیوں کو لیجاتی تھی۔ اس کا ڈرائیور ایک یورپی نسل کا گورا تھا۔ پال کا رینک کالنس سے اونچا تھا۔ لیکن ڈرائیور نے اگلی سیٹ پال کو اس لئے نہیں دی تھی کہ وہ اینگلو انڈین ہے۔ کالا ہے۔ نیچ ہے۔ وہ ——۔ پال کا ڈرائیور سے جھگڑا بھی ہو گیا مگر رینک پر کلر بار ہمیشہ سے بھاری رہا ہے۔ تمدن کی تاریخ کے پاس اس کے ان گنت ثبوت موجود تھے۔ اور پال نے کوفت دُور کرنے کے لئے ایک سگریٹ سلگا ئی تھی۔

اب یہاں سکندر آباد میں پال اور گلبرٹ ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملائے گھومتے لیکن پال کو ایسا محسوس ہوتا جیسے بیچ میں ایک دیوار رنگ حائل ہے جو بظاہر نہیں دکھائی دیتی البتہ شراب خانوں، ہوٹلوں کے بیرے، دوکانوں کے سیلس مین، ٹیکسی ڈرائیور، تانگے والے، بوٹ پالش والے، باربر، بھیک بخشیش مانگنے والے لونڈوں کو صاف نظر آ جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ یہ لوگ پال کی موجودگی کے باوجود گلبرٹ کو گھیر لیتے تھے۔ سلام کرتے، گڑگڑاتے تھے۔ اور پال اپنے آپ کو اکیلا شرمندہ اور بے وجود محسوس کرتا تھا۔ اسی لئے پال اکثر گلبرٹ سے کترانے کی کوشش کرتا تھا لیکن گلبرٹ اسے خود ہی کبھی نہ چھوڑتا تھا۔ پال اس کو گلبرٹ کی بے تعصب ذہنیت سمجھتا تھا۔ لیکن گلبرٹ کی ذہنیت کبھی بے تعصب نہیں تھی۔ وہ شائد اس لئے پال سے اتنا زیادہ قریب ہو گیا تھا۔ کہ پال کے پیکر میں اس کو اپنا ہمراز و راز دان نظر آتا تھا۔

سولہ اگست ۴۵ء کی شام الگزینڈرا بار میں سارے سپاہیوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کسی نشے میں دُھت رقاصہ کی طرح ناچ رہی تھی۔ ہونٹوں کے مسام مسام سے چنچل خوشی ابل رہی تھی۔ بار کا آرکسٹرا فتح کے سریلے نغمے بکھیر رہا تھا۔ آرکسٹرا کی آواز جب کچھ دھیمی ہو جاتی تو ایسا محسوس ہوتا جیسے جرمنی اور جاپان ایک ساتھ رو رہے ہیں۔ اُن کے جھنڈے زمین پر گر گئے ہیں۔ آنسو پونچھنے کے لئے کپڑا بھی باقی نہیں رہا۔

گلبرٹ اس وقت جانے کہاں سیر گشت کر رہا تھا۔ بار میں پال اکیلا ہی بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا۔ جب وہ کہیں نظر نہ آیا۔ تو وہ گھر لوٹا۔ تاکہ آنٹی سے کہہ آئے کہ وہ آج رات وکٹری ڈانس میں شامل ہونے جا رہا ہے۔ اور رات بڑی دیر سے لوٹے گا۔ وہ انتظار نہ کریں۔

آنٹی جیسے پال کا ہی انتظار کر رہی تھی۔ پال کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس نے آبدیدہ ہو کر بھرّائی ہوئی آواز میں پال سے کچھ کہا اور پال کی انگلیوں سے سگریٹ چھوٹ کر فرش پر گر پڑی۔ اور چہرے کی آب اڑ گئی۔

بڑی دیر تک دونوں پاؤں پھیلائے اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے کھڑے رہے، وہ شعلہ بار نظروں سے اندھیرے میں جانے کیا دیکھ رہا۔ اندر کمرے میں فلورا سارے گھر والوں سے منہ چھپائے بلانکٹ میں دبکی پڑی تھی۔ اسی اثنا میں باہر کا پھاٹک چرچراتا ہوا کھلا۔ گلبرٹ اندر آیا اور پوچھا۔ "تم کہاں گم ہو گئے تھے پال —— میں تمہیں بہت ڈھونڈتا رہا۔ آج اس نکمن بال میں چلو گے یا نہیں۔"

پال کی پلکوں میں آنکھیں نہیں تھیں بلکہ دو سُرخ سُرخ شرارے تھے۔ وہ چپ چاپ گلبرٹ کو دیکھتا رہا —— گلبرٹ نے حیرت سے پوچھا۔

"تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو —— ؟"

پال تین چار لمحے پھر خاموش رہا۔ اور بہت غراتی ہوئی آواز میں بولا۔

"گلبرٹ ...... اب تمہیں فلورا سے شادی کرنی پڑے گی"

گلبرٹ نے پال کے چہرے کا بدلا ہوا رنگ، اکرنت بیچے اور بوڑھی آنٹی کی آنکھوں میں آنسو اور شعلے بیک وقت لپکتے دیکھ کر ٹالنے کی خاطر کہہ دیا۔

"ارے ہو جائے گی فکمن شادی —— مگر اب تو ڈانس میں چلو——"

پال نے آواز میں زیادہ تلخی اور غراہٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"نہیں ——— تم یہاں سے اس وقت تک نہیں جا سکتے جب تک کہ فلورا سے شادی کرنے کا تحریری وعدہ نہ دو —— ورنہ ———"

اب گلبرٹ سٹپٹا گیا۔ اور بولا۔

کیوں شادی کروں ——— ! میں تو شادی شدہ ہوں۔ وہاں یارک شائر میں میری بیوی میری واپسی کا انتظار کر رہی ہے۔ اب تو لڑائی ختم ہو گئی ہے اور . . . . . .

پال چیخا۔———

نہیں۔ لڑائی ابھی کہاں ختم ہوئی۔ ابھی لڑائی جاری ہے۔ اب تمہیں اور مجھے لڑنا ہے۔ اب ہزاروں گلبرٹوں اور ہزاروں پالوں کو لڑنا ہے۔ لکھو اس کاغذ پر۔———

گلبرٹ نے کاغذ لیکر تپائی پر رکھ دیا۔ اور خود بھی غصیلی آواز میں بولا۔

"نہیں لکھوں گا ——— کیوں لکھوں آخر ——— ! میں لیکن ایک اینگلو انڈین لڑکی سے ہرگز شادی نہیں کر سکتا۔"

پال نے گلبرٹ کی قمیص پکڑ لی اور گرج کر کہنے لگا۔

"تمہیں شادی کرنی ہوگی۔ تم ہی نے فلورا کو ورغلایا ہے ———"

گلبرٹ نے قمیص چھڑاتے ہوئے جواب دیا۔

میں کہتا ہوں میں ہرگز ہرگز شادی نہیں کروں گا۔ مجھے اس کے حمل سے کوئی واسطہ نہیں۔ کوئی تعلق نہیں۔

پال غصے کی زیادتی سے جیسے پاگل ہو گیا اور اس نے دہاڑتی آواز میں چیختے ہوئے گلبرٹ کے جسم پر مکے اور گھونسے لگانے شروع کر دیے جیسے صدیوں کی بنیادوں پر کھڑی ہوئی رنگ و نسل کی مضبوط دیوار کو توڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔

باہر اندھیرے میں فتح کے پھریرے لہرا رہے تھے۔ جنگ ختم ہو چکی تھی۔ لڑائی جاری تھی۔

دھرم پرکاش آنند

دلِ ناتواں

یہ تمہاری جستجوئے حُسن خود فریبی ہے۔ یہ ناحق کی آشفتہ سری تمہاری شکست کا آئینہ ہے۔

میں کافی ہاؤس کے ایک کونے میں بیٹھا بُوند بُوند کرکے زہر کو پیتا اور سوچتا ہوں کہ دفتر کا سارا کام چھوڑ کر آج پھر کافی ہاؤس کیوں چلا آیا ہوں۔ یہ کافی بُخار کی دوا کی طرح کڑوی اور بدمزہ ہے۔ میرے دماغ میں خشکی سی پھیلنے لگی ہے۔ لیکن میں برابر پیے جا رہا ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ناحق کی بے خوابی کا سامنا ہوگا۔

اکیلا بیٹھتا ہوں۔ نہیں۔ بالکل اکیلا نہیں۔ راؤ ہے، گوپال ہے، کبھی کبھی وینکٹ بھی آبیٹھتا ہے۔ اور تب میں بُوند بُوند نہیں، گھونٹ گھونٹ کافی پینے لگتا ہوں۔ کڑوی، بدمزہ، خشک کافی۔

اور میں راؤ سے پوچھتا ہوں "راؤ تم شادی کیوں نہیں کرتے؟"

راؤ ایک بنک میں ملازم ہے، اچھی تنخواہ پاتا ہے۔ بتیس تینتیس سال کی عمر کا ہے۔ کنوارا ہے۔

"راؤ یہ نہ کہو کہ تمہیں بیوی نہیں ملتی۔ تم چاہو تو کل ہی شادی رچالو۔ لیکن تم اُن لوگوں میں سے ہو جو لڑکی کے تصوّر سے تو محبت کرتے ہیں۔ لیکن لڑکی کے وجود سے لرزاں رہتے ہیں۔ تم بیوی کو نہیں، اپنے آپ کو ڈھونڈ رہے ہو۔ تم اسے کبھی نہیں ڈھونڈ پاؤ گے۔ تمہاری شادی کبھی نہیں ہوگی۔ . . . . وہ دیکھو ایک اور لڑکی کافی ہاؤس میں داخل ہوئی ہے۔ دروازے پر رُک گئی ہے۔ گوپال گہری نظروں سے اُس کے دلکش جسمانی نشیب و فراز کو دیکھ رہا ہے۔ اور وہ یہ دیکھ رہی ہے کہ جس کو وہ ڈھونڈنے آئی ہے۔ وہ کافی ہاؤس میں ہے کہ نہیں۔

گوپال، اُدھر مت دیکھو۔ دوست، اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر کسی بھرے ہوئے جسم والی لڑکی سے محبت کرنی ہے تو تمہیں ایسی بہت سی لڑکیاں مل جائیں گی۔ اُدمی سے ملے ہو؟ اُس کے جسم کا نکھار دیکھا ہے؟ ہاں، تم کچھ دن تو اُس کی محبت میں مبتلا رہے ہو۔ لیکن [illegible] معلوم تھا تم لوٹ آؤ گے۔ اُدمی کا تمہیں تین چار ملاقاتوں تک [illegible] رہنا۔ بہت کافی ہے۔ دلکش جسمانی نشیب و فراز کے باوجود اُدمی تمہیں اچھی نہیں۔ بچے گی بھی نہیں۔ اُس میں کچھ خامیاں ہیں۔ ملاقات کے [illegible] بعد تمہیں ہر ایک لڑکی میں کچھ خامیاں نظر آنے لگتی ہیں۔ اُن خامیوں [illegible] بیان کروگے؟ کیا کروگے بیان کرکے۔ تم گھوم پھر کر پھر اسی میز پر [illegible] گے۔ اور گھونٹ گھونٹ کرکے کڑوی کافی پیو گے۔ اور کہو گے "کوئی [illegible] صورت لڑکی نہیں ملتی۔" تم لڑکی کے رنگین تصور کو لڑکی کے مادی وجود میں ڈھونڈتے ہو۔ اس کا نتیجہ سوائے ناامیدی کے اور کیا ہوگا۔

راؤ۔ یہ بات بات پر اپنے خیالات کا جائزہ لینے کی عادت تمہارے لئے بہت بُری ہے۔ تم ہر وقت اپنے آپ سے پوچھتے رہتے ہو کہ [illegible] کیوں ہوا؟ تم اپنی شکست کی وجہ جنسی بھوک میں ڈھونڈتے ہو۔ تمہارا خیال ہے کہ اگر تمہاری زندگی میں کچھ ایسی لڑکیاں آئی ہوتیں جنھوں نے اپنے جسم کو تمہارے حوالے کر دیا ہوتا تو تمہاری دماغی کیفیت [illegible] ہوتی۔ اور تم اتنے پریشان نہ پھرتے۔ لیکن یہ تم اس لئے کہتے ہو کہ تم نے ابھی تک کسی لڑکی کے جسم کو چھوا تک نہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ تم [illegible] اور تمہاری بیماری کا واحد علاج عورت کی صحبت ہے۔ لیکن میری [illegible] مانو۔ تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ سرطار ہے ہو تم؟ یہی کہنا چاہتے ہو نا کہ میں غلطی پر ہوں۔ یہی کہنا چاہتے ہو نا کہ تم اگر کسی عورت کے پاس سے بھی ہو کر گزر جاؤ تو تمہارے جسم میں ایک خوش کن سنسنی اور تمہارے دل [illegible] ایک میٹھی ہلچل پیدا ہو جاتی ہے۔ کیا پھر گندا سے کافی ہاؤس میں ملاقات کی بات سُنانے لگے ہو؟ وینکٹ، راؤ پھر پُرانی کہانی لے بیٹھا ہے [illegible] سنا لینے دو۔ بیمار کی دوا تو ہمارے پاس نہیں ہے لیکن یہ واقعہ سنا دینے سے اس کے دل کو تھوڑی سی تسکین ضرور مل جاتی ہے۔ راؤ، تم نے کہانی

ابھی شروع بھی نہیں کی، اور تمہارا منہ لال ہونے لگا۔ تمہیں آدمی کس نے بنایا ہے تم کچی مٹی کے گھڑے ہو جو پانی کے مس سے بکھر جاتا ہے۔ طوفان کا مقابلہ کیا کرے گا۔ سُناؤ، سُناؤ، ہم سُن رہے ہیں۔ ہاں تو ہم سبھی میز کے گرد بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ وہی باتیں ہو رہی تھیں جو ہمیشہ ہوا کرتی ہیں۔ وینکٹ جس کا چہرہ اُس کے بالوں کے رنگ سے بھی زیادہ سیاہ ہے، کہہ رہا تھا۔ یار کوئی آرٹ سرکل بنائیں یا کوئی میوزک سوسائٹی قائم کریں۔ میں اپنے آپ کو بحیثیت پبلسٹی انچارج پیش کرتا ہوں۔ لیکن پبلسٹی کے اس شاہکار کو کالج کی لڑکیوں تک کون پہنچائے گا؟ گوپال، تم یہ کام کروگے؟ گوپال بھلا کیوں کرنے لگا؟ اُسے کیا پڑی ہے کہ دوسروں کی دوستی کے لئے لڑکیاں مہیا کرتا پھرے؟ خود اس کی بہت سی دوست ہیں۔ ممبئی میں پہلے پہل اُس کی دوستی ایک مرہٹی لڑکی سے ہوئی تھی۔ وہ بی۔ اے میں پڑھتی تھی۔ پہلی ملاقات میں گوپال نے اُس کے چہرے کی تعریف کی۔ اس سے کہا تمہاری شکل مجھے لاہور کی ایک لڑکی کی یاد دلاتی ہے جو اکثر سویرے میرے گھر پر آکر میری کتابوں کو بڑے قرینے سے میز پر سجا دیا کرتی تھی۔ میں ایک اخبار کا ایڈیٹر ہوں۔ دوسری ملاقات میں گوپال نے اُس لڑکی کے جسم کی تعریف کی، اور کہا کہ میں ممبئی میں اکیلا ہوں، بالکل اکیلا، اپنے اکیلے پن کو مٹانے کے لئے میں شراب پینے لگا ہوں۔ اور یہ کہہ کر اپنے چہرے پر ایک بڑا غریبانہ سا جذبہ لاکر سگرٹ سُلگانے لگا۔ لڑکی اُس کے جُھکے ہوئے چہرے کو دیکھتی رہی۔ شاید سوچ رہی تھی کہ کس جذبے کو اپنے دل میں جگہ دے۔ گوپال سگرٹ کا کش لگاتا ہوا کرسی میں آرام سے بیٹھ گیا۔ چھت کی طرف دیکھتا ہوا دھوئیں کے دائرے بنانے لگا۔ اور اس کا بایاں ہاتھ لڑکی کے ہاتھ کو ڈھونڈ کر اُسے آہستہ آہستہ سہلانے لگا۔ تیسری ملاقات میں گوپال اس لڑکی کو اپنے گھر لے گیا۔ اور کہنے لگا۔ "تمہیں دیکھ کر مجھے کچھ ہو جاتا ہے۔ میرے دماغ میں کھلبلی سی مچ جاتی ہے۔ میں اور بھی بہت سی لڑکیوں سے ملا ہوں لیکن ایسا اثر مجھ پر پہلے کبھی نہیں ہوا۔ تمہاری قربت میں میں اپنے آپ کو بھولنے لگتا ہوں۔" اور یہ کہہ کر گوپال نے لڑکی کی اُس شرافت کو چھین لیا جس کو لڑکی اتنی دیر سے محفوظ رکھتی چلی آئی تھی، جس پر اُس کے ماں باپ کو ناز تھا۔ جس پر سماج اس کو ایک اچھے گھرانے کی بیٹی کے نام سے یاد کرتی تھی۔ لڑکی نے کہا۔ "تم وحشی ہو۔ جانور ہو۔ کمینے ہو۔" اور لڑکی چلی گئی۔ لیکن دس پندرہ دن کے بعد خود ہی گوپال کو ٹیلیفون پر کہنے لگی۔ "کیوں ناراض ہو گیا؟ بہت دن سے ملاقات نہیں ہوئی۔ کب ملوگے؟" اور تب آہستہ آہستہ گوپال نے اُس لڑکی کی معرفت اُس کی کئی سہیلیوں سے دوستی پیدا کر لی۔ اور اب وینکٹ آرٹ سرکل بنانے کے متعلق سوچ رہا ہے۔ گوپال کی مدد لینا چاہتا ہے۔ گوپال اپنی خوش قسمتی کیوں بانٹے؟ اس کا جواب ٹھیک ہی تو تھا "ہوش کی دوا کرو دوست، تمہارے تو بیوی ہے، بچے ہیں۔" اس سے کیا ہوتا ہے۔ بچے ہونا خوش قسمتی کی نشانی تھوڑے ہی ہے۔ یہ تو شادی کا لازمی نتیجہ ہے۔ اور جس عورت سے شادی کی جائے۔ اُس سے محبت ہو بھی سکتی ہے۔ نہیں بھی ہو سکتی۔ اور محبت تو قناعت کا دوسرا نام ہے۔ اس کا سب جواب یہی ہے کہ مجھے میری چیز مل گئی، میں اسی میں رچ جانا چاہتا ہوں۔ مست ہو جانا چاہتا ہوں۔ میرے لئے اس کے پرے کچھ نہیں۔ لیکن وینکٹ کیسے قناعت کرے، ایک وینکٹ ہی کیوں، کوئی بھی کیسے قناعت کرے۔ اصل میں تو آدمی کی شخصیت کے اظہار کا سنگِ بنیاد خود غرضی ہے۔ میں جس دھن میں مست ہوں، میری خوشی کے لئے مجھے اُس وقت اُس دھن کا، اُس ذہنی یا دلی کیفیت کا عکس ملنا چاہئے۔ آدمی کی ذہنی کیفیتیں تو دن کے پہروں کی طرح ہیں۔ جن میں مختلف راگ چاہئیں۔ ایک صورت تو ایک ہی کیفیت کو پورا کرتی ہے۔ اور ایک ہی ضرورت کو۔ وہ بہت سی کیفیتوں کو پورا کیا کرتی تھی۔ محبت کے پہلے جوش میں۔ پر اُس وقت دلہن ایک عورت تو نہیں ہوتی۔ زمین و آسمان کی سب عورتوں کا مرکب ہوتی ہے۔ ایک ماحول ہوتا ہے۔ جو آدمی کی رگ رگ میں سرایت کر جاتا ہے۔ لیکن جو ایک عورت ہے وہ کب تک ساری عورتوں کا مرکب بنی رہ سکتی ہے۔ اکثر لوگوں کو یہ بات شادی کے کچھ ہی مہینوں بعد معلوم ہو جاتی ہے۔ اکثر کو کئی برس بعد۔ اور تب جو زندگی کے دوسرے جھنجھٹوں میں اُلجھ کر نہیں رہ گئے انہیں پھر دوسری عورتوں کی تلاش شروع ہو جاتی ہے، دوسری دُھنوں کے عکس کی۔ وینکٹ، تمہارے دانت مصنوعی ہیں، لیکن تمہارا جواب بڑا معقول تھا۔ "ہاں، تم نے کہا تھا، بیوی ہے، بچے ہیں اور ...... اور حسرتیں ہیں۔" وہ دیکھو کون آئی ہیں۔ باتیں بند کرو بھئی، ذرا دیکھ لینے

دو۔ دروازے میں دو لڑکیاں کھڑی ہیں۔ اُن کی نگاہیں اِدھر اُدھر کچھ ڈھونڈ رہی ہیں۔ وہ مسکرانے لگیں۔ ایک میز خالی نظر آئی ہے۔ سانولی کو نہیں دوسری کو دیکھو۔ سر کا ایک مبہم سا جھٹکا، ہونٹوں پر ایک دلنواز مسکراہٹ، بازو کے سہارے چھاتی سے لگی ہوئی کتابوں پر ذرا سا دباؤ، ہاتھ میں تھمے ہوئے بیگ کی ہلکی سی جنبش، اور وہ خالی میز کی طرف بڑھی اپنی سانولی سہیلی کے ساتھ۔ راؤ تمہارے لبوں میں تھما ہوا سگریٹ لرزنے لگا ہے۔ راؤ، تمہارے ہاتھ کانپنے لگے ہیں، یہ دیکھو، دیا سلائی بجھی جا رہی ہے۔ ہاتھ کو مضبوط رکھو نہیں تو سگریٹ نہیں سلگے گا۔ تمہاری تو آواز میں بھی تھرتھراہٹ ہے۔ ذرا اونچا بولو دوست: ان لڑکیوں میں سے ایک کو جانتے ہو؟ کس کو؟ وہ جس کی دونوں چوٹیاں کندھوں پر سے ہوتی ہوئی اُن بازوؤں کو چوم رہی ہیں جنہوں نے کتابوں کو تھام رکھا ہے؟ اُس کو جس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک ہے جیسے کسی نے آئینے کی مدد سے سورج کا عکس ڈال دیا ہو؟ اُس کو جس کے گالوں میں مسکراتے وقت دو دلنواز چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑ جاتے ہیں؟ بڑے خوش قسمت ہو کم بخت۔ گندا؟ کیا پیارا نام ہے۔ مطلب کیا ہے اس کا؟ ایک سفید پھول جو مغربی گھاٹ کے پہاڑوں پر اُگتا ہے؟ دیکھو وہ تمہاری طرف دیکھ رہی ہے۔ مسکراؤ، گدھے کہیں کے مسکراؤ۔ اچھا رہنے دو۔ وہ تمہاری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ اُس کی نگاہیں دور کھڑے ہوئے بیرے کو اپنی طرف مخاطب کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ جاؤ اُس سے مل لو۔ باتوں باتوں میں اُسے کل یا پرسوں کے لئے اپنے ساتھ کافی پینے کی دعوت دے آنا۔ نہیں، خدا کی قسم ہم میں سے کوئی بھی تمہاری باتوں میں خلل انداز نہیں ہوگا۔ ہاں، ایک بات ہم جب کسی خالی میز کی تلاش کرتے ہوئے وہاں سے گزریں تو ہمیں دیکھ کر مسکرا دینا جیسے تم نے ہمیں پہچان لیا ہو۔ اُس وقت ہم کنکھیوں سے گندا کو دیکھ رہے ہوں گے۔ تمہاری نظروں کا تعاقب کرتی ہوئی وہ بھی ایک اُڑتی ہوئی نگاہ ہم پر ڈالے گی۔ ہمیں معلوم ہے کہ جس وقت وہ ہمیں دیکھے گی ہماری نگاہیں اُس پر سے ہٹ کر خلاء میں کھو جائیں گی۔ لیکن اُسے یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ ہم تمہارے دوست ہیں۔ گوپال، تم زیر لب مسکرانے لگے! دوست، تم ہماری باتوں کو بیوقوفانہ سمجھتے ہو نا! پر تمہیں معلوم ہے کہ گندا کا ہمیں ایک نگاہ دیکھ لینے سے کیا فائدہ ہے؟ ہمیں محسوس ہونے لگے گا کہ ہم اُس سے ایک قدم نزدیک آ گئے ہیں۔ ہم اب کافی ہاؤس میں آنے والی عام بھیڑ کے ا۔ نہیں رہے۔ بلکہ کسی غیر مرئی زنجیر سے کھنچ کر ایک ایسے مخصوص حلقے کے ممبر بن گئے ہیں جس کے ایک کارکن کی گندا سے جان پہچان ہے۔ اور اس طرح گندا کو قریب سے نہ جانتے ہوئے بھی اُس میں اور ہم میں ایک اپناپن سا پیدا ہو جائے گا۔

راؤ، تم گندا کے پاس جانے لگے ہو؟ آج تو بڑی ہمت دکھا رہے ہو بھئی۔ اچھا جاؤ۔ جاؤ۔ جاؤ۔ وینکٹ، یہ راؤ کیا آج کچھ پی کر آیا ہے کہ اتنی دلیری دکھا رہا ہے۔ وینکٹ، راؤ اب پرلے کونے میں کیا جھانک رہا ہے؟ جانتا ہے کہ اُس کونے میں اس کی جان پہچان کا کوئی فرد موجود نہیں۔ لیکن پھر بھی جھانک رہا ہے۔ شاید کچھ تو اپنے آپ کو دھوکا دینا چاہتا ہے اور کچھ باقی لوگوں کو۔ کہ وہ واقعی کسی کی تلاش میں ہے۔ خدا خدا کرکے اب اُس میز کی طرف چلا تو ہے جہاں وہ دو لڑکیاں بیٹھی ہیں۔ بھئی واہ، وہاں تو وہ رُکا ہی نہیں۔ ہوا میں مُنہ اُٹھائے خلاء میں آنکھیں گاڑے دروازے پر پہنچ گیا ہے۔ اب جھانک جھانک کر باہر دیکھ رہا ہے۔ شاید اب کسی کے انتظار کا بہانہ کر رہا ہے۔ کبھی کبھی کنکھیوں سے گندا کی طرف بھی دیکھ لیتا ہے کہ کہیں وہ تو اس کی طرف نہیں دیکھ رہی۔ بار بار کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھتا ہے۔ پھر باہر جھانکتا ہے، پھر گھڑی کی طرف دیکھتا ہے اور سر ہلاتا ہے جیسے کہہ رہا ہو کہ اب آنے والا نہیں آئے گا۔ اب تک راؤ نے اپنے دل کو تسلّی دے لی ہے کہ اب وہ اپنی شرافت کھوئے بغیر گندا سے بات چیت کر سکتا ہے۔ اُس کی میز کے پاس سے ہو کر گزرتے ہوئے وہ یکایک ٹھہر جائے گا۔ اور حیران کن لہجہ میں کہے گا "ہیلو، آج تم کافی ہاؤس میں کہاں؟" تب وہ اپنی گھڑی کی طرف دیکھے گا۔ اور بڑبڑائے گا "کہتا تھا ڈیڑھ بجے آؤں گا۔ پونے دو ہونے کو آئے، کم بخت ابھی تک آیا ہی نہیں"۔ آخرکار۔ آخرکار وہ گندا کے پاس پہنچ ہی گیا۔ گندا مسکرائی ہے۔ اُس کی سہیلی نے بھی سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا ہے۔ اور راؤ کے مُنہ سے بات بھی نہیں نکلی۔ اُس

کا چہرہ سُرخ ہو اُٹھا ہے۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ میز پر ٹیک دیئے ہیں اور تھوڑا سا آگے کو جُھک گیا ہے۔ اُس کے ایک ہاتھ میں سگریٹ ہے۔ سگریٹ کا دُھواں کانپتا ہُوا ہوا میں اُٹھ رہا ہے، ضرور اُس کا سارا جسم کانپ رہا ہوگا۔ وُہ کبھی ایک پاؤں کے پنجے پر زور ڈال کر کھڑا ہوتا ہے، کبھی دُوسرے پر۔ اُس نے جیب سے رُومال نکالا ہے اور ہتھیلی کو پونچھنے لگا ہے۔ ضرور اُسے پسینہ آ رہا ہوگا۔ آخر حوصلہ کرکے کانپتی ہوئی آواز میں اُس نے پُوچھ ہی لیا ہے "تمہارے والد صاحب بمبئی ہی میں ہیں کیا؟" "ہاں" کُندا نے جواب دیا ہے۔ "بہت دن سے اُن سے ملنے کا اتفاق نہیں ہُوا۔ غالباً اِس اتوار کو ان سے ملنے آؤں گا۔" کُندا مُسکرائی ہے۔ اُس کے گالوں کے دلنواز گڑھے اور گہرے ہو گئے ہیں۔ وُہ کہہ رہی ہے "میں والد صاحب سے کہہ دُوں گی۔" بس اور کچھ نہیں۔ راؤ اور کچھ نہیں بولا۔ اُس سے اور کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ اُس نے کُندا کو اگلے دن یا اُس سے اگلے دن اپنے ساتھ چائے پینے کی دعوت بھی نہیں دی۔ اُس نے ٹھیک طرح سے اُس کی طرف دیکھا ہی نہیں۔ اُس کا بدن کانپتا رہا۔ اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی رہی۔ اُس کی آواز لرزتی رہی۔ وُہ واپس آ گیا۔ اب اُس کے ماتھے پر پسینہ ہے۔ اُس کا چہرہ لال ہے۔ اُس کے لب خشک ہیں اور اُن پر ایک شکستہ سی مسکراہٹ ہے۔ اُس کا جسم گرم ہے۔

"بھئی اِس سارے قصّے کا مطلب کیا ہے۔ آخر تم ثابت کیا کرنا چاہتے ہو۔ کولھو کے بیل کی طرح ایک ہی مرکز پر اُسی زمین کو گھسے جا رہے ہو۔"

میں کچھ نہیں ثابت کرنا چاہتا۔ ہم سب یہاں بیٹھے ہیں۔ ہم سب ایک ہی لڑکی کو کافی ہاؤس کے اندر آتا دیکھتے ہیں۔ لیکن اِسی حقیقت کی بنا پر ہمارے زاویۂ نظر مختلف ہو جاتے ہیں۔ اِسی لئے مجھے کافی ہاؤس پسند ہے۔ اس میں نہ صرف خوبصورت لڑکیاں ہی آتی ہیں۔ بلکہ اُن کا یہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کے دل و دماغ پر کیا اثر ہوتا ہے۔ مجھے اُس کا تجزیہ کرنے کا بھی موقع ملتا ہے۔ وینکٹ، گوپال، راؤ، میں، ہم سب صرف ایک ایک شخص نہیں، ہم نمونے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک سماج کے کسی خاص فرقے کے نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتا ہے۔ وینکٹ تاجر ہے۔ پندرہ سال ہوئے وُہ تیس روپے ماہوار پر ایک دفتر میں ٹائپ کرنیکے کام پر ملازم تھا۔ آج وُہ اپنا مالک آپ ہے۔ بمبئی میں اشتہار بازی کی ایک مشہور کمپنی اُس کے ہاتھ میں ہے۔ مہینے میں دس ہزار کی آمدنی اُس کے لئے معمولی بات ہے۔ تیس روپیہ ماہوار سے دس ہزار روپیہ ماہوار اور پندرہ سال کا عرصہ۔ تیس سے پچاس ہوئے ہوں گے۔ پچاس سے سو، سو سے ہزار۔ قدم قدم پر وینکٹ نے سوچا ہوگا۔ کہ اور زیادہ پیسے بنانے کا کونسا طریقہ ہے۔ اُس کا جو تخیل تھا، جو دماغ تھا۔ اُن کو اُس نے اپنے پر قابو نہیں پانے دیا بلکہ اُن کو اپنا خدمت گار بنا کر رکھا۔ وُہ زندگی کی دوسری اصلیتوں سے ہم آہنگ ہو گیا ہے۔ اُس کے لئے راگنیوں کا راگ، شاعروں کی شاعری، مصوّروں کے شاہکار خبطی لوگوں کے ڈھیلے دماغوں کا نتیجہ ہیں جو بذاتِ خود کوئی خوبصورت چیز نہیں صرف اُس جیسے ٹھوس آدمیوں کا بیکار وقت میں دل بہلانے کا ایک ذریعہ ہیں۔ وینکٹ چیز کو دیکھتے ہی اُس کی اپنی زندگی میں وقعت کو پہچان لیتا ہے، وُہ کسی قسم کی غیر مادی رنگینیوں کو اپنی آنکھوں پر پردہ نہیں ڈالنے دیتا۔ اُس نے عورت کی ہستی کا بھی نچوڑ نکال کر رکھ دیا ہے۔ اُس کے لئے عورت گوشت کا ایک دلکش تودہ ہے جس کے جسم کے اُتار چڑھاؤ سے، جس کی شخصیت کے مخصوص اندازِ اظہار سے دل میں ایک عجیب سنسنی پیدا ہوتی ہے۔ اُس گوشت کے دلکش تودے کو چھونے کو جی چاہتا ہے۔ یہ لمس آدمی کے جسم میں ایک طوفان اور دماغ میں ایک ہیجان پیدا کر دیتا ہے، ایک طوفان جس سے آنکھیں چمکنے لگتی ہیں، نتھنے پھڑکنے لگتے ہیں، جسم سے آگ کے شرارے چھوٹنے لگتے ہیں، ایک ہیجان جس میں دُنیا کی سُدھ بُدھ کھو جاتی ہے، جس میں قوسِ قزح کی رنگینی، بجلیوں کی کڑک، بھونچال کے دھچکے، سب کچھ خلط ملط ہو کر شامل ہیں۔ اور پھر آدمی اُس گوشت کے تودے کو بازوؤں میں بھینچتا ہے اور اپنا بناتا ہے، اور پھر اُس عورت کی، اُس گوشت کے دلکش تودے کی نوعیت ختم ہو جاتی ہے اور وُہ اصلیت کا پیروکار پھر اپنے اصلی اور ٹھوس کاموں میں مشغول ہو جاتا ہے۔ وینکٹ کے لئے عورت کی خوبصورتی کی تعریف بھی وہی ہے جو شاعروں کی شاعری کی، یعنی بیکار وقت میں دل بہلانے کا ذریعہ۔

کیوں وینکٹ، ٹھیک ہے نا؟ تمہارے لئے عورت کی خوبصورتی کو پرکھنے کی کسوٹی اُس تک رسائی کا امکان ہے جس کو نہیں پایا جا سکتا۔ نہیں خریدا جا سکتا (میرا مطلب ضروری طور پر پیسوں سے نہیں) وہی زیادہ خوبصورت ہے۔ لیکن اُس کے پانے کی ناکام کوشش میں تم اپنا وقت کھونے والے نہیں۔ وہ گوپال ایسے خوبصورتی کے پجاریوں کے، اپنا وقت اور دماغ ضائع کرنے کے ذریعے ہیں۔ تم تو "نو نقد نہ تیرہ ادھار" پر یقین رکھتے ہو۔ جو مل گئی، جیسی مل گئی، جہاں مل گئی، اگر آسانی سے مل گئی تو وہی بھلی۔

گوپال، تم مسکرانا نہ چھوڑ دو گے؟ تم نے بھی کبھی اپنے آپ کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے؟ تم اپنے آپ کو دوسروں سے بہت مختلف سمجھتے ہو۔ لاکھوں میں ایک، عام آدمیوں سے بہت اونچے، بہت پرے۔ اگر میری مسکراہٹ بھی اُتنی معنی خیز ہو سکتی جتنی کہ تمہاری (اگرچہ زیادہ پائپ پینے سے تمہارے دانت زرد ہو گئے ہیں) تو میں تمہارے بھولے پن پر ضرور مسکرا دیتا۔ کہ باقی سب کو ٹھیک سمجھنے والے تم اپنے آپ کو ٹھیک نہیں سمجھ سکے۔ تم لاکھوں میں ایک نہیں ہو، لاکھوں جیسے ایک ہو۔ تم بھی سماج کے ایک مخصوص فرقے کے اُتنے ہی نمائندہ نمونے ہو جتنا کہ وینکٹ۔ تمہاری قسمت میں بھٹکنا لکھا ہے۔ تم ذہنی تسکین سے ہمیشہ اُتنا ہی دُور رہو گے، جتنا کہ اب ہو۔ تم کبھی برازیل جانے کی سوچتے ہو کبھی نیوزی لینڈ۔ لیکن اگر تم سائبیریا بھی چلے جاؤ تو وہاں پہنچ کر تم اُس سے بھی پرے جانا چاہو گے۔ تم تصور کو حقیقت میں بدلنا چاہتے ہو۔ تخیل کو اصلیت سے ہم آہنگ کرنا چاہتے ہو، لیکن یہ نہیں ہو سکتا۔ تصور اور حقیقت دو مختلف چیزیں ہیں۔ اگر تم تصور کو حقیقت کا جامہ پہناؤ گے تو تمہیں نا اُمیدی ہو گی۔ کیونکہ تصور حقیقت بن کر حقیقت کی طرح ہی غیر دلچسپ ہو جائے گا۔ تم آسمان کو چھونے کے منصوبے باندھتے ہو۔ لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ تم اگر اُڑ کر آسمان تک پہنچ گئے تو آسمان بھی سوائے پانی اور ہوا کے اور کچھ نہیں ہو گا، اور اُس آسمان کے پرے تمہیں ایک اور آسمان نظر آئے گا۔ آخر سراب کے سہارے نخلستان کی تلاش میں کب تک ریگستان کی صحرا نوردی کرتے رہو گے۔

یا تو وینکٹ کی طرح تخیل کو حقیقت کا غلام بنا لو اور سمجھ لو کہ اصلیت تخیل کی آخری عملی منزل ہے، یا پھر یہ جان لو کہ اصلیت تصور کی پہلی سیڑھی ہے۔ جس کی آخری سیڑھی پہنچ سے بہت پرے ہے۔ لیکن خیر چھوڑو تم تو خوبصورتی کو پکڑ لینا چاہتے ہو۔ مرمریں باہوں پر سر رکھ کر سونا چاہتے ہو۔ نرم، لمبے بالوں سے کھیلنا چاہتے ہو۔ شدتِ جذبہ سے کانپتی ٹھوڑی کو ہاتھوں میں لیکر اس کی چمکتی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا چاہتے ہو، تر رخ ابھرے ہوئے مدار ہونٹوں سے اپنے ہونٹ پیوست کرنا چاہتے ہو۔ یہ سب کچھ ممکن ہے اور تم یہ سب کچھ کرتے ہو، لیکن یہ کرتے ہی تم اُس دوشیزہ سے دُور ہونے لگتے ہو۔ تمہارا ذہن کہتا ہے اِن مرمریں باہوں سے بھی زیادہ مرمریں باہیں ہو سکتی ہیں۔ ان بالوں سے بھی زیادہ خوبصورت لمبے بال ہو سکتے ہیں، اِن آنکھوں سے بھی زیادہ خوبصورت آنکھیں، اِن ہونٹوں سے بھی زیادہ بھرے ہوئے ہونٹ۔ اور تب تم اِس نئی دوشیزہ کی تلاش میں کھو جاتے ہو۔ اور جب وہ مل جائے تو تمہیں پھر محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس سے پرے اس سے بھی زیادہ خوبصورت ایک اور دوشیزہ ہے اور تم اپنی اس جستجوئے تسکین کو کچھ پُر اُمید بنانے کیلئے شراب کا سہارا لینے لگے ہو۔ تمہاری دوپہر کافی ہاؤس میں کٹتی ہے۔ لیکن شام کو تمہارا بسیرا میخانے میں ہوتا ہے، میرا مطلب ساقی اور جام والے میخانے سے نہیں بلکہ ڈِنشا، ڈِنشا اینڈ کمپنی کی شراب کی دکان سے ہے جہاں نہ ساقی ہے نہ جام، صرف تمہارے اشاروں پر ناچنے والا بیرا ہے جو بہ حیثیت ایک مرد تمہاری طلبی کو اُس وقت پرکھتا ہے جب تم "وائٹ ہارس" وسکی یا "ڈائیگرز" رم پی کر اس کو انعام دینے لگتے ہو۔ پی کر کچھ نا اُمیدی کم ہوتی ہے۔ کچھ سکون ملتا ہے، کچھ اُمید بندھتی ہے کہ اب جو لڑکی ملے گی وہ خوبصورتی کا مکمل مجسمہ ہو گی۔ اور دل کو ڈھارس بندھتی ہے کہ اب تمہاری جستجوئے تسکین کی آخری منزل قریب ہے۔ پر دوست، اتنی لڑکیوں سے ہم صحبت ہونے کے بعد بھی تم ابھی تک تلاشِ حُسن میں سرگرداں ہو۔ تمہارا علاج ڈِنشا، ڈِنشا اینڈ کمپنی کا شراب خانہ ہی ہے یا وہاں سے جھومتے نکلنے کے بعد کسی سڑک کا کنارہ ——

رُک جاؤ، رُک جاؤ، اپنے اس نفسیاتی تجزیہ کو ذرا دم لینے دو۔ راؤ کی خوبصورت دوست نے سر اور ہاتھ کی ایک ہم آہنگ جنبش سے بالوں کی ایک چوٹی کو پیچھے پیٹھ پر ڈال دیا ہے۔ اب وہ اپنی سہیلی سے کچھ کہہ رہی ہے۔ شاید پوچھ رہی ہے کھانے کو کچھ اور تو نہیں چاہئے) اب وہ بائیں ہاتھ سے بیرے کو بل لانے کے لئے اشارہ کر رہی ہے۔ کیوں

دینکٹ، اگر تمہیں کُندا کی سہیلی مل جائے (ذرا سانولی ضرور ہے) تو کیسی رہے!

گوپال، تم اپنی معنی خیز مسکراہٹ (تمہارے دانت پیلے ہی سہی) کے ذریعے ابھی اُس خوبصورت لڑکی کی طرف نہ دیکھو جس کے گالوں میں بات کرتے وقت چھوٹے چھوٹے دلنواز گڑھے پڑ جاتے ہیں۔ جانتے ہیں راؤ ابھی اُس سے باتیں کر کے آیا ہے۔ راؤ اُس کے باپ کو جانتا ہے۔

راؤ، کیا کہنے ہیں تمہاری دلیری کے۔ تم سب خوبصورت لڑکیوں کے باپوں کو جانتے ہو۔ تم اُن میں سے ہو جو سوال کا حل سوال کو نظرانداز کرنے میں ڈھونڈتے ہیں۔ تم ہمیشہ یہی کہتے رہو گے میں رما کے باپ کو جانتا ہوں۔ میں کرشنا کے بھائی کو پہچانتا ہوں، کملا کے چچا سے میری واقفیت ہے۔ لیکن میں رما اور کرشنا اور کملا کے ساتھ "نمستے، نمستے" سے آگے کبھی نہیں بڑھا۔ راؤ، تم کبھی آگے بڑھو گے بھی نہیں، تم نے تصور اور اصلیت کے درمیان ایک بڑی اونچی دیوار تعمیر کر رکھی ہے۔ تم کئی بار تصور کے پروں پر اُڑ کر دیوار کے اس طرف، جھانکتے ہو جدھر اصلیت ہے اور کھائی کی گہرائی دیکھ کر تمہارا دل کانپ کانپ اُٹھتا ہے۔ تم جھانکنے تک سے ڈرتے ہو، کودو گے خاک۔ تم عورت کو ایک مادی وجود سمجھتے ہوئے ہچکچاتے ہو۔ تمہارے لئے عورت ڈر کی چیز ہے۔ تم اپنی خود اعتمادی کھو بیٹھے ہو۔ تم اپنے سے ہمیشہ یہی سوال پوچھتے رہتے ہو کیا مجھے کوئی عورت پسند کر سکتی ہے؟ اگر میں کسی عورت سے کوئی مذاق کروں تو کیا وہ میرے مُنہ پر تھپڑ تو نہیں کھینچ مارے گی۔ اور اگر بھولے سے کسی کو مجھ سے عشق ہو بھی گیا تو میرا کوئی دوست اُسے مجھ سے چھین کر تو نہیں لے جائے گا۔ تم دل ہی دل میں لڑکیوں سے ملنے کے ارادے باندھتے رہتے ہو۔ اُن کو قابو میں رکھنے کے طریقے سوچتے رہتے ہو۔ اپنی کشش بڑھانے کیلئے اپنے اندازِ بیان کو، اپنے جذبات کے اظہار کو ایک مخصوص ڈھنگ میں ادا کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہو لیکن وقت آنے پر ہمت ہار دیتے ہو کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ایسا نہ ہو جائے۔ تم سب سے بدقسمت ہو کیونکہ تمہارے اس ڈر نے تمہیں زندگی کی تھوڑی سی خوشی حاصل کرنے سے بھی روک رکھا ہے۔ وینکٹ کو دیکھو، اُس کے مادی نقطۂ نظر سے تمہیں اتفاق نہ سہی لیکن زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے کم سے کم اُس نے ایک خاص راستہ تو اختیار کیا ہوا ہے۔ وہ عورت کو ایک مادی چیز سمجھتا ہے، خالص مادی چیز۔ شاعروں نے، فلسفیوں نے، ادیبوں نے عورت کے اردگرد جو رنگین، غیر مادی اور دلچسپ صفات کا ایک ہالہ سا بنا رکھا ہے، اُس کی وینکٹ کے نزدیک کوئی وقعت نہیں۔ وہ جب ایسی شاعرانہ گفتگو سُنتا ہے تو چپکے سے مُسکرا دیتا ہے۔ اور سوچتا ہے کہ یہ عورت جس کی بابت اتنی رنگین بیانی کی جا رہی ہے اگر میرے بازوؤں میں نہ آئی تو کسی اور مرد کے بازوؤں کی زینت ہوگی۔ وہ خلاء میں نہیں تیرے گی اور نہ ہی شاعروں کی تمام شاعری اُس دوسرے مرد کو اُس عورت سے وہی فائدہ اُٹھانے سے روکے گی۔ جو میں اُن عورتوں سے اُٹھاتا ہوں جو مجھے مل سکتی ہیں۔ اسی طرح اگرچہ گوپال کی زندگی میں کافی تلخی، کافی ناکامی، کافی محرومی ہے۔ تو بھی وہ اپنے حال میں مست ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ جو راستہ اُس نے اختیار کر رکھا ہے۔ اُس کا انجام سوائے تلخی اور ناکامی کے اور کچھ نہیں لیکن کم سے کم اُس کا راستہ معین تو ہے۔ اور جب وہ اُن سنگِ میلوں کو دیکھتا ہے۔ جن کی مدد سے وہ اُس راستے پر بڑھتا ہے تو کچھ وقت کے لئے اُس کی زندگی بڑی ہری بھری ہو اُٹھتی ہے۔ اُس میں پھر بھرے بھرے ہونٹ، اور دلنواز مسکراہٹیں اور بکھرے گیسو اور چمکتی آنکھیں گھومنے لگتی ہیں۔ لیکن اُس کی شکست اُس کی فتح ہی میں پنہاں ہے۔ کیونکہ وہ ہر سنگِ میل کو منزل سمجھنے لگتا ہے اور جب سنگِ میل پر پہنچتا ہے۔ تو یکایک محسوس کرتا ہے کہ منزل ابھی اور آگے ہے۔ لیکن راؤ تمہاری نہ کوئی ابتدا ہے۔ نہ انتہا۔ تم تجربہ شروع ہی نہیں کرتے۔ اسلئے تم اپنی فتح اور شکست دونوں ہی سے ناآشنا ہو۔ تم آدمی نہیں، شترمرغ ہو جو ریت میں سر چھپا کر دُنیا کی رنگینیوں اور مصیبتوں دونوں ہی سے بے بہرہ ہو جاتا ہے ——

پر بھلے آدمی تم کون سے تیس مار خاں ہو۔ تم نے کون سے قلعے فتح کر لئے ہیں۔ آتی جاتی لڑکیوں کو تو تم بھی ایسے دیکھتے ہو۔ جیسے مجنوں کے بعد عشق تمہارے ہی ورثے میں آیا ہے۔

ہاں عاشق تو ہوں، لیکن نہ وینکٹ جیسا، نہ گوپال جیسا، راؤ کی

طرح بزدل بھی نہیں ہوں۔ میرے لئے عورت نہ تو صرف گوشت کا لوتھڑا ہے اور نہ مجھے یہ خیال ہے کہ اب جس عورت سے میری جان پہچان ہوگی۔ وہ خوبصورتی کا مکمل مجسمہ ہے۔ میں تو عورت کو عورت بھی سمجھتا ہوں اور ایک خوبصورت شے بھی۔ عورت کو عورت سمجھ کر میں نے بھی اُس سے کئی بار رابطہ بڑھایا ہے۔ لیکن میں نے یہ خیال اپنے آپ پر کبھی غالب نہیں ہونے دیا کہ میں نے اس عورت کو پا کر خوبصورتی کے مجسمہ کو پا لیا ہے۔ کافی عرصہ پہلے میں بھی گوپال کی طرح ہر خوبصورت لڑکی کے پیچھے پڑا کرتا تھا۔ لیکن جب میں نے دیکھا کہ اُس خوبصورت شے کو پا کر بھی خوبصورتی کی ہوس نہیں جاتی۔ تو میں نے جان لیا کہ کسی چیز کی خوبصورتی اُس کے نہ پانے ہی میں ہے۔ میں نے اپنی ناامیدی کو شراب کے گلاس میں غرق نہیں کیا۔ میں نے اپنے دل سے کہا کہ تلاشِ حسن تو جستجوئے آفاق ہے۔ اس کی ابتدا مجھ سے ہے۔ اس کی انتہا کوئی نہیں۔ اور اس لئے اب جب میں عورتوں کی خوبصورتی کی تعریف کرتا ہوں تو اس لئے نہیں کہ میں انہیں پا سکوں۔ بلکہ اس لئے کہ اِس تعریف سے مجھے خوشی ملتی ہے۔ میری تلاشِ حسن کو شہ ملتی ہے، مجھے قدرت کی تخلیق کی داد دینے کا موقعہ ملتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ قدرت کی سب سے خوبصورت تخلیق عورت ہے۔ اور اِس سے بھی بڑھ کر قدرت کی تخلیق مرد ہے جو اس خوبصورتی کی داد دے سکتا ہے۔ کل کائنات خوبصورت ہے۔ سمندر کا ساحل سے ہمیشہ ٹکراتے رہنا، سوتے ہوئے مکانوں پر چھٹکتی ہوئی چاندنی، زور سے برستی ہوئی بارش کی ٹپ ٹپ، سونے میں ہوا سے ہلتے ہوئے پتوں کی سرسراہٹ۔ کتنی خوبصورتی ہے ان میں، عورت کی خوبصورتی کائنات کی اِس خوبصورتی کی زنجیر کی ایک اور کڑی ہی تو ہے۔ عورت کا حسن کتنا متحرک اور نرالا ہے۔ اُس کا رنگ لمحہ بہ لمحہ بدلتا رہتا ہے۔ اسی لئے اس خوبصورتی کی کوئی تھاہ نہیں، کوئی کنارہ نہیں، کوئی منزل نہیں۔ میں تو اب عورت سے پیار نہیں کرتا، عورت کے اظہارِ حسن سے پیار کرتا ہوں یا یوں کہو کہ یکبارگی ہی بہت سی عورتوں سے پیار کرتا ہوں۔ کیونکہ کسی ایک عورت کا حسن مکمل نہیں۔ میں عورت کو نہیں پکڑتا اُس کے حسن کی یاد دِل میں رکھ لیتا ہوں۔

اِسی لئے کھوئے کھوئے رہتے ہو شاید!

ہاں، میری زندگی نہ ختم ہونے والا ایک تجسس ہے۔ ہمیشہ تلاشِ حسن میں سرگرداں رہتا ہوں۔ اِسی لئے چاہوں نہ چاہوں راہ چلتی ہر لڑکی کو دیکھنے کے لئے میری نگاہ بے ساختہ اُوپر اٹھ جاتی ہے۔ اگر اُس کی پیٹھ میری طرف ہے تو دِل ہی دل میں اُس کے بال بنانے کے انداز کا جائزہ لیتا ہوں۔ جوڑا بنا رکھا ہے اُس نے؟ پنجابی انداز میں؟ مراٹھی انداز میں؟ گجراتی انداز میں؟ کتنی خوبصورتی ہے گجراتی لڑکیوں کے بال بنانے کے انداز میں۔ ایجنٹا کی تصویروں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ وہ بالوں کو کس کر جوڑے کی لپیٹ میں نہیں لے لیتیں گویا اُن سے دشمنی ہو۔ وہ بالوں کو بھی جسم کا ایک ذی حس حصّہ سمجھتی ہیں اور اس پیار سے اُن کو جوڑے کی شکل میں گوندھتی ہیں کہ بال اور جوڑا دونوں میں جان ڈال دیتی ہیں۔ اظہارِ خوبصورتی کی کتنی سمجھ ہے ان کو۔ بالوں کو گردن کی پشت تک کچھ ڈھیلا ڈھیلا چھوڑ دیتی ہیں اور جہاں گردن اور کندھے ملتے ہیں وہاں بالوں کو کچھ اس صفائی سے جُوڑے کی شکل میں سمیٹتی ہیں جیسے کوئی سانپ کُنڈلی مارے بیٹھا ہو۔ اور جب بات کرتے وقت اُن کا سر دائیں بائیں یا آگے پیچھے ہلتا ہے تو گردن کی پشت پر کا جُوڑا اِدھر اُدھر سرکتا ہے۔ اور بذاتِ خود باتیں کرتا معلوم ہوتا ہے۔ یا پھر کوئی ایسی لڑکی نظر آ جاتی ہے۔ جس نے بالوں کی دو چوٹیاں کر رکھی ہیں۔ کتنے لمبے بال ہیں اِس کے۔ دونوں چوٹیوں کے سرے گھٹنوں کو چھو رہے ہیں، ڈھیلا ڈھیلا گوندھا ہے بالوں کو، اور سروں کے پاس تو اُن کو بالکل سرکش ہی رہنے دیا ہے، اُن کے سرے پیارے گول چھلے سے بن گئے ہیں۔ کتنی شفقت اور محنت سے اِس نے بالوں کے سروں کو یوں گول کیا ہوگا! یا پھر اگر کوئی ایسی لڑکی سامنے سے آ رہی ہو تو اُس کی مستانہ چال کو دیکھتا ہوں۔ اُس کی پیشانی پر بکھری ہوئی پریشان زُلف کو دیکھتا ہوں جسے وہ اپنی اُنگلیوں کے نازک لمس سے سر پر پیچھے کرتی ہے۔ لیکن جو سرکش ہی اُسی تیزی سے پھر پیشانی پر لٹک آتی ہے۔ آنکھوں کی مسرت خیز چمک کو دیکھتا ہوں، ہونٹوں پر کھلتی ہوئی مسکراہٹ کو دیکھتا ہوں، ساڑھی کی فنی لپیٹ سے نمایاں تر ہوتے ہوئے جسم کے دلآویز خطوط کو دیکھتا ہوں اور پھر......

ہاں ہاں اور پھر......

...... اور پھر کبھی کبھار کسی کو بلا لیتا ہوں۔

کسی خوبصورتی کی دیوی کو؟ کسی مجسمۂ حسن کو؟

نہیں، خوبصورتی کا خواب میرے دماغ سے باہر کوئی ہستی نہیں رکھتا۔ اصلیت خوبصورت نہیں ہے۔ اُس پر خوبصورتی کا خول میں چڑھاتا ہوں۔ خوبصورتی کی مُورت میرے تخیل کے رنگین گوشوں سے باہر قدم رکھتے ہی ناپید ہو جاتی ہے۔ میں عورت کو خوبصورت اس لئے کہتا ہوں کیونکہ وہ میری خوبصورتی کی پیاس کو اور بھی بڑھاتی ہے لیکن کوئی بھی عورت میرے خوابوں کی تعبیر نہیں کیونکہ کسی ایک عورت کا حسن مکمل نہیں۔

تو پھر کس کو بلاتے ہو؟

کسی کو بھی، جو خوبصورتی میرے تخیل میں ہے اُس کی جھلک۔ صرف جھلک۔ مجھے کسی لڑکی میں مل جاتی ہے۔ میں اُس جھلک کو وسعت دیتا ہوں۔ قطرے کو سمندر بنا لیتا ہوں اور اُس کے خیال میں کھو جاتا ہوں۔ کچھ وقت کے لئے اُس کی اور خامیاں میری نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ دل میں یکبارگی ایک طوفان سا اُٹھتا ہے۔ اُس لڑکی سے ملنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ حوصلہ کرتا ہوں اور لڑکی کو بُلا لیتا ہوں۔

اب سمجھے۔ پچھلے ہفتے جس لڑکی کو کافی ہاؤس میں لئے بیٹھے تھے وہ بھی خوبصورتی کی ایک جھلک تھی!

ہاں، اُس لڑکی سے ملاقات کی بھی ایک کہانی ہے۔ میں پچھلے سال اگست کے مہینے میں پُونا سے بمبئی آرہا تھا۔ گاڑی میں بھیڑ بہت تھی۔ سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں بھی جگہ بہت مشکل سے ملی۔ ایک کونے میں دبک کر بیٹھنا پڑا۔ اُس کونے میں غسل خانہ تھا۔ غسل خانے کا دروازہ اچھی طرح بند نہ ہوتا تھا۔ ہلکی ہلکی بدبو سے دماغ پراگندہ ہو رہا تھا۔ سوچا اس ڈبے میں سے نکل بھاگوں۔ اُٹھنے ہی لگا تھا کہ پرلے کونے میں بیٹھی ہوئی ایک لڑکی پر نظر پڑی۔ وہ کتاب پڑھنے میں مشغول تھی۔ اُس کا سر کتاب پر جھکا ہوا تھا۔ اُس کے سر کے آدھے بال دُھوپ میں چمک رہے تھے۔ اُس نے بالوں کی دو موٹی چوٹیاں کی ہوئی تھیں جو اُس کے دونوں کندھوں پر سے ہوتی ہوئی اُس کی گود میں جا کر ایک ہو گئی تھیں۔ میرے دماغ میں اُس کے بالوں کی خوبصورتی سرایت کر گئی۔

میں اپنے کونے کی گندی فضا بھول گیا۔ اور لڑکی کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس کے بالوں کی خوبصورتی کو اپنے اندر جذب کرتا رہا۔ بالوں پر دھوپ کی چمک سے جو ایک مسرت خیز کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اُس کے لئے تشبیہیں ڈھونڈتا رہا ——

کچھ دیر بعد لڑکی کے پاس بیٹھے ہوئے آدمی نے (جو غالباً اُس کا باپ تھا) اُسے کچھ کہا۔ لڑکی نے کتاب پر سے نظر اُٹھائی۔ چاروں طرف دیکھا۔ بالوں کی چوٹیوں پر ہاتھ پھیر کر اُنہیں پیچھے سے دبایا۔ مسکرائی اور پھر سر جھکا کر پڑھنے میں مشغول ہو گئی۔ مجھے اُس کی مسکراہٹ بہت بھلی لگی۔ اب جب میں اس واقعے پر غور کرتا ہوں تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ اُس لڑکی کے چہرے میں کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ جسے غیر معمولی کہا جا سکے یا جو خاص جاذبِ نظر ہو۔ لیکن اُس وقت میں اُس کی خوبصورتی کا جائزہ اُس کے بالوں کی خوبصورتی سے لے رہا تھا۔ جو واقعی خوبصورت تھے۔ اور اس لئے اُس وقت مجھے اُس کا چہرہ، اُس کے خد و خال بہت دلآویز معلوم ہوئے۔ میں اس انتظار میں بیٹھا رہا کہ کب وہ سر اُٹھائے اور مسکرائے۔

اُنہی دنوں میں ایک رسالے کے لئے ایک کہانی لکھ رہا تھا۔ اس لڑکی کا اُس کہانی سے ذرہ کا بھی تعلق نہیں تھا۔ لیکن یہ لڑکی میرے دماغ پر کچھ اس طرح چھا گئی تھی۔ کہ میں نے کہانی میں اُس کے بالوں کی تعریف میں دو تین صفحے لکھے اور بے محل ہوتے ہوئے بھی اُن کو اُس کہانی میں جڑ دیا۔ وقت پا کر میں اُس لڑکی کو بھول گیا۔ صرف اُس کے بالوں کی خوبصورتی کی یاد ذہن کے کسی گوشے میں گھر بنا کر رہ گئی۔

قریباً ایک سال بعد پچھلے ہفتے میں نے اُسی لڑکی کو کافی ہاؤس میں بیٹھے دیکھا۔ وہ ایک لڑکے کے ساتھ بیٹھی کافی پی رہی تھی۔ راؤ اُس دن کافی ہاؤس میں نہ تم تھے، نہ دینکٹ۔ صرف گوپال ایک کونے میں بیٹھا پائپ پی رہا تھا۔ اور کافی ہاؤس میں داخل ہوتی ہوئی لڑکیوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں بھی گوپال کے پاس بیٹھ گیا۔ کافی پیتے پیتے میں نے کئی بار اُس لڑکی کی طرف دیکھا۔ اُس لڑکی کی نظریں بھی دو تین بار مجھ پر پڑیں تھوڑی دیر بعد وہ اور اُس کا ساتھی اُٹھ کر چلے گئے اور میں گوپال سے باتیں کرنے میں محو ہو گیا۔

جب میں کافی ہاؤس سے باہر نکلا تو دیکھا کہ وہی لڑکی سامنے بس سٹینڈ پر کھڑی بس کا انتظار کر رہی ہے۔ معاً میں نے سوچا کہ وہ وہاں کھڑی نہ معلوم کب تک بس کا انتظار کرتی رہے گی کیوں نہ اُسے اپنی موٹر میں بٹھا کر اُس کی منزل تک پہنچا دوں۔

بس سٹینڈ پر پہنچ کر میں نے موٹر روک دی اور اُس کا دروازہ کھولتے ہوئے دریافت کیا "آپ کو کہاں جانا ہے"؟ اُس نے جگہ کا نام بتا دیا۔ میں بھی اُدھر ہی جا رہا تھا۔ نہ جا رہا ہوتا تو بھی ضرور کہہ دیتا کہ اُدھر ہی جا رہا ہوں۔ وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے میری بغلی سیٹ پر بیٹھ گئی اور اس جرأت کیلئے معذرت پیش کرتی ہوئی بولی "آج کل بس کے لئے گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا ہے اور مجھے آج گھر جلدی پہنچنا ہے۔" میں نے بات چلانے کے لئے کہا "میں آپ کو ایک بار پہلے بھی مل چکا ہوں"۔ اور وہ بولی "مجھے بھی کچھ کچھ یاد پڑتا ہے"۔ میں نے کہا "میں یاد دلائے دیتا ہوں۔ پچھلے سال اگست کی بات ہے۔ ریل گاڑی میں، پُونا سے بمبئی آتے ہوئے"۔ اور وہ کہنے لگی "ٹھیک ہے۔ اُس ڈبے میں کچھ چینی لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ اور بہت شور و غل تھا"۔ اور میں نے کہا "آپ ایک کونے میں بیٹھی ہوئی کتاب پڑھ رہی تھیں۔ اور آپ نے اپنے بالوں کی دو چوٹیاں کی ہوئی تھیں۔ اور آپ کے بالوں پر سورج چمک رہا تھا جس سے آپ کے بال سنہری معلوم ہو رہے تھے۔ میں اُن بالوں کی خوبصورتی کو دیکھ رہا تھا۔ آپ پڑھنے میں محو تھیں۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ آپ کے بال دھوپ میں سنہری لگتے ہیں آپ کی مسکراہٹ بھی ضرور صبح کی نرم دھوپ کی طرح خوشگوار ہوگی"۔ وہ ذرا سی مسکرائی اور سامنے سڑک کی طرف دیکھتی ہوئی کہنے لگی "یاد نہیں پڑتا میں اُس وقت کونسی کتاب پڑھ رہی تھی۔ گجراتی کی تھی یا انگریزی کی؟" میں نے کہا "پچھلے سال آپ کو دیکھنے کے بعد میں نے آپ کا ایک کہانی میں ذکر کیا تھا۔ اور وہ کہانی بڑی مقبول ہوئی۔ یہ سب آپ ہی کی بدولت تھا۔ مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے"۔ وہ لڑکی صرف مسکراتی رہی۔ اُس کی منزل قریب آ رہی تھی۔ میں نے کہا "اگر آپ کو کوئی عذر نہ ہو تو کل کافی ہاؤس میں میرے ساتھ کافی پیجیئے"۔ اور اُس نے جواب دیا "میں وعدہ تو نہیں کرتی کیونکہ عام طور پر ہم چار پانچ سہیلیاں کالج سے چھٹی ملنے پر اکٹھی ہی کہیں چائے پینے بیٹھ جاتی ہیں۔ اور میں اُن کو چھوڑ کر آ نہیں سکتی۔ لیکن میں کوشش ضرور کروں گی"۔

اگلے دن وہ مجھے کافی ہاؤس میں ملی۔ یہ بات تم سب کو معلوم ہے جب وینکٹ اور راؤ میرے پاس بیٹھنے لگے تھے۔ تو میں نے کہا تھا "میں آج اکیلا بیٹھنا چاہتا ہوں مجھے کسی کا انتظار ہے۔ راؤ تم کانپنے لگے تھے اور تم نے اپنے آپ کو سنبھالنے کے لئے ایک سگریٹ سلگا لیا تھا۔ وینکٹ تم میری پیٹھ پر ہاتھ مار کر بولے تھے "ہمیں بھی یاد رکھنا"۔

وقت مقررہ کے پانچ منٹ بعد وہ لڑکی کافی ہاؤس میں داخل ہوئی دروازے پر رُک کر اپنی گردن کو لمبا کر کے، کسی کو ڈھونڈنے لگی۔ اُس کی نظر مجھ پر پڑی اور اُس کے پتلے ہونٹ ایک ہلکے تبسم کے زیر اثر تھوڑے سے کھل گئے۔ میں نے بیرے کو کافی لانے کے لئے کہا۔ وہ کہنے لگی "معاف کیجئے مجھے تھوڑی سی دیر ہو گئی"، اور وہ پھر اپنے پتلے ہونٹوں سے مسکرائی۔ میں نے اُس لڑکی سے پوچھا "آپ کا نام کیا ہے" اور وہ بولی "پدما"۔ میں نے کہا "بڑا پیارا نام ہے۔ پدم "کنول" کو کہتے ہیں۔ تم کنول ہو"۔ اُس نے مسکرا کر جواب دیا "پدم کنول کو کہتے ہیں لیکن میرا نام پدما ہے اور پدما لکشمی کو کہتے ہیں مجھے اپنا نام بالکل پسند نہیں۔ کاش میرا نام اُرملا، یا اُوشا، یا سرودا ہوتا"۔ اور میں نے کہا "اپنا نام کسی کو اچھا نہیں لگتا۔ لیکن پدما واقعی بڑا پیارا نام ہے"۔ وہ چپ رہی اور اپنے بائیں ہاتھ کے ناخنوں کو دیکھنے لگی۔ اور میں نے دیکھا کہ اُس کی ہتھیلیوں پر حنا کی صندلی تحریر ہے۔ میں بڑا حیران ہوا کیونکہ میرا خیال تھا کہ آج کل کی پڑھی لکھی لڑکیاں حنا ایسی دیسی آرائش چیزیں پسند نہیں کرتیں۔ اُن کی پسند غازہ اور پاؤڈر اور لپ سٹک ہیں۔ پھر میں نے سوچا کہ یہ بمبئی ہے اور بمبئی میں سب کچھ ممکن ہے۔ اور میں نے کہا "پدما میں نے تمہارے بالوں سے متاثر ہو کر کچھ لکھا تھا۔ سنو گی"؟ وہ بولی "میری پرورش بمبئی میں ہوئی ہے۔ میری زبان اُردو نہیں۔ پھر بھی میں سمجھنے کی کوشش کروں گی"۔ اور میں نے پڑھنا شروع کیا۔ جب میں کہانی میں لڑکی کے بالوں کی تعریف کر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ پدما اپنے سر پر ہاتھ پھیر رہی ہے۔ اُس نے اپنے بالوں کی دونوں چوٹیوں کو جو اُس کی پیٹھ پر لٹک رہی تھیں پیار سے پکڑ کر آگے کر لیا ہے اور اب وہ اُس کے کندھوں پر سے ہوتی ہوئی اُس کی آغوش کو چوم رہی ہیں اور وہ اُنہیں پیار سے تھپتھپا رہی ہے۔ اور اب اُس نے ایک چوٹی کے

سرے کو ہاتھوں میں لے کر اُسے کھول ڈالا ہے۔اور اُسے انجانے طور پر پھوہڑ ہنے لگی ہے۔ اور میں نے کہا کیا کسی اور نے کبھی تمہارے بالوں کی تعریف نہیں کی اور اُس نے چوٹی کے سرے کو شفقت سے گوندھتے ہوئے کہا۔ معلوم نہیں" ....

جب وہ چلی گئی تو وینکٹ نے پیچھے سے آکر میرے کندھے پر ہاتھ مارا اور کہا " آج تو چڑیا کو پھانس لیا"۔ وینکٹ برا نہ مانتا۔ اُس وقت میں انتہائی کوشش کے باوجود بھی تمہارے لئے اپنی آنکھوں کی نفرت کو نہ چھپا سکا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا۔ گویا کسی نے پوجا کے پھولوں پر تھوک دیا ہو۔ تم چپکے سے کھسک گئے تھے۔

" پھر تمہاری پدما کبھی بار کانی ہاؤس میں آتی ہے۔ اُس دن کے بعد تمہیں اُس کے ساتھ تو نہیں دیکھا۔"

میں پھر اُس سے ملا بھی نہیں۔ میں گوپال ہوتا اگر پال تمہارے دانت بہت پیلے ہیں۔ دوست مباکو پینا کم کردو، تو پہلے اگلے دن ملتا اور پھر اُس سے اگلے دن۔ جب تک کہ اُس کی خوبصورتی سے سیر ہو کر اُس سے مایوس نہ ہو جاتا۔ لیکن مجھے پدما کی خواہش نہیں، اُس کے بالوں کی خوبصورتی درکار ہے۔ اور وہ میں دُور سے دیکھ لیتا ہوں۔

" نزدیک سے شاید اور بھی بہتر ہو۔"

نہیں اُس کے بالوں میں تو جو ہے سو ہے ان کی اصلی خوبصورتی میرے تخیل میں ہے۔ اور تصور بُعد میں ہے۔ قرب میں حقیقت ہے۔ اور حقیقت میں مایوسی ہے۔

عجیب آدمی ہو۔

ہاں، بہت عجیب ———

ممتاز مفتی

احسان علی

کیسی رنگیلی طبیعت تھی احسان علی کی۔ محلے میں کون تھا جو اُن کی باتوں سے محظوظ نہ ہوتا تھا۔ اگر وہ محلے کی ڈیوڑھی میں جا پہنچتے۔ جہاں بوڑھوں کی محفل لگی ہوتی۔ تو کھانسی کی آوازوں کی بجائے قہقہے گونجنے لگتے۔ چوگان میں بیٹھی ہوئی عورتوں کے پاس سے گزرتے تو وہاں دبی دبی کھی کھی کا شور بلند ہوتا محلے کے کنویں کے پاس جا کھڑے ہوتے تو لڑکوں کے کھیل میں نئی روح دوڑ جاتی۔

جوان لڑکیاں انہیں دیکھ کر گھونگھٹ تلے آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتیں اور پھر ایک طرف سے نکل جانے کی کوشش کرتیں۔ ٹھیار عورتیں دیکھ پاتیں تو ان کے گالوں میں گڑھے پڑ جاتے۔ خواہ مخواہ جی چاہتا کہ کوئی بات کریں۔ بوڑھی عورتیں قہقہہ مار کر ہنس پڑتیں۔ مثلاً اس روز احسان علی کو چوگان میں کھڑا دیکھ کر ایک بولی۔ یہاں کھڑے ہو کر کسے تاڑ رہے ہو احسان علی؟"

"یہ سامنے عورتوں کا جھرمٹ جو لگا ہے۔ نہ جانے کس محلے سے آئی ہیں۔" دوسری نے دور کھڑی عورتوں کی طرف اشارہ کیا۔

"اے ہے اب تو اپنے حمید کیلئے دیکھا کرو۔" بھابی کہنے لگی "اللہ رکھے جوان ہو گیا ہے۔"

"اور تو کیا اپنے لئے دیکھ رہا ہوں بھابی"۔ احسان علی مسکرایا۔

اس بات پر ایک معنی خیز طنزیہ قہقہہ بلند ہوا۔ احسان علی ہنس کر بولا۔ "دنیا کسی صورت میں راضی نہیں ہوتی۔ چاچی اپنے لئے دیکھو تو لوگ گھورتے ہیں۔ کسی کے لئے دیکھو تو طعنہ دیتے ہیں مذاق اڑاتے ہیں"۔۔۔۔۔ جواب دینے میں احسان علی کو کمال حاصل تھا۔ ایسا جواب دیتے کہ سن کر مزہ آ جاتا۔۔۔۔۔ شاداں نے یہ سن کر چاچی کو اشارہ کیا اور مصنوعی سنجیدگی سے کہنے لگی۔ "چاچی اس عمر میں اوروں کے لئے دیکھنا ہی رہ جاتا ہے نا"

احسان علی نے آہ بھری۔ بولے "کاش کہ تم ہی سمجھتیں شاداں"

"اتنی عمر ہو چکی ہے چچا پر تمہیں سمجھ نہ آئی۔" شاداں مسکرائی۔۔۔۔۔ "ابھی دیکھنے کی ہوس نہیں مٹی"۔

"اچھا شاداں ایمان سے کہنا" وہ سنجیدگی سے بولے "کبھی تمہیں میلی آنکھ سے دیکھا ہے؟"

"ہائیں چچا"۔ شاداں ہونٹ پہ انگلی رکھ کر بیٹھ گئی۔ "میں تو تمہاری بیٹی کی طرح ہوں"۔

"یہ بھی ٹھیک ہے"۔ وہ ہنسے "جب جوانی ڈھل گئی تو چچا جی سلام کہتی ہوں۔ لیکن جب جوان تھی۔ تو بوجی پاس نہ پھٹکتی تھی کبھو۔ کیوں بھابی جھوٹ کہتا ہوں میں؟"

اس بات پر سب ہنس پڑیں اور احسان علی وہاں سے سرک گئے۔

ان کے جانے کے بعد بھابی نے کہا۔ "توبہ ہے احسان علی اور بات کرنے سے چوکے۔"

چاچی بولی "ساری عمر تو عورتوں کو تاڑنے میں کٹ گئی اب تو باتیں ہی باتیں ہیں۔"

"نے بہن" شاداں نے مسکراتے ہوئے کہا "رب کو منظور ہی گیا ہے۔ اب بھی تو عورت کو دیکھ کر منہ سے رال ٹپکتی ہے۔"

"لیکن شاداں" بھابی نے کہا "شاباش ہے اس کو۔ کبھی محلے کی لڑکی کو میلی آنکھ سے نہیں دیکھا۔"

"یہ تو میں مانتی ہوں"۔ شاداں نے ان جانے میں آہ بھری۔

"یہ صفت بھی کسی کسی میں ہوتی ہے"۔ چاچی نے کہا۔

جب محلے والیوں کی یہ بات احسان علی نے پہلی بار سن پائی تو بولے "اتنا بھروسہ بھی نہ کرنا مجھ پر شاداں"

"کیوں" چاچی نے ہنس کر کہا "یہ کیا جھوٹ ہے۔ تمہاری یہ صفت واقعی خوب ہے۔ میں تو منہ پہ کہوں گی احسان علی۔"

"او چاچی یہ صفت نہ ہوتی ان میں تو ہمارا محلے میں رہنا مشکل ہو جاتا" شاداں بولی۔

احسان علی کھلکھلا کر ہنس پڑے اور بولے "چاچی کہتے ہیں ایک دفعہ ایک بلی کوئیں میں گر گئی۔ باہر نکلنے کیلئے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے۔ پھر بولی نہیں آج کی رات یہیں بسر کریں گے۔"

"یہ بلی کا واقعہ کیا ہوا۔" چاچی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہماری سمجھ میں تو نہیں آیا۔" شاداں بولی۔

"بس تو چھوڑو اس بات کو۔" بھابی نے کہا۔ "احسان علی کی بات کریدنے سے فائدہ کیا؟"

احسان علی اس دوران میں ہنستے رہے پھر بولے "چاچی یہ میری صفت نہیں یہ تو محلے والیوں کی خوبی ہے بیچاری ایسی بنی ہیں کہ خواہ مخواہ ماں بہن کہنے کو جی چاہتا ہے۔ کیوں شاداں؟"

"ہائے اللہ۔ سنا تم نے چاچی؟" شاداں چلائی۔

"کبھی بھی ہو اس کی بات؟" بھابی مسکرائی۔

"سب سمجھتی ہوں۔" چاچی نے ہنس کر کہا۔

"خدا کا ہزار ہزار شکر ہے۔" شاداں بولی "کہ محلے والیاں ایسی ہیں۔ پر میں پوچھتی ہوں چچا اگر محلے میں کوئی ایسی ویسی ہوتی تو کیا واقعی ریجھ جاتے اُس پر؟"

"تم اُس کی باتیں سنو۔" بھابی نے کہا۔

"تو یہ کیسی باتیں بناتا رہتا ہے۔" چاچی ہنسی۔

"کسی محلے والی پر ریجھتے تو اک بار مزہ چکھا دیتی تمہیں چچا" شاداں آنکھیں چمکا کر بولی۔ "جوتا دکھا دیتی میاں کو۔ کیوں بھابی؟"

"واہ" احسان علی مسکرائے "شاداں جس نے جوتا دکھا دیا سمجھو بات پکی کر دی۔"

"ہائے میں مرگئی۔" شاداں نے دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیا۔

"احسان علی تجھ پر خدا کی سنوار" چاچی نے ہاتھ چلایا۔ اور احسان علی ہنستے ہنستے آگے نکل گئے۔ اُن کی عادت تھی کہ محفل پر اپنا رنگ جما کر چلے جایا کرتے۔

اگرچہ محلے والیاں اکیلے میں احسان علی کی گذشتہ زندگی پر ناک بھوں چڑھایا کرتیں اور ان کی فطری کمزوری پر مذاق اڑاتیں۔ لیکن جب وہ سامنے آجاتے تو نہ جانے کیوں ان کی آنکھوں میں چمک لہرا جاتی اور وہ خواہ مخواہ ہنس پڑتیں۔ جوان لڑکیاں تو اب بھی بچا بچا کر نکلنے کی کوشش کرتیں۔

جب احسان علی جوان تھے ان دنوں تو کسی عورت کا ان کے قریب سے گزر جانا بے حد مشکل تھا۔ خواہ مخواہ دل دھک دھک کرنے لگتا ماتھے پر پسینہ آجاتا۔ دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام لیتی "ہائے میں مرگئی یہ تو اپنا احسان علی ہے۔" ان دنوں بوڑھی عورتیں بھی مشکوک نگاہوں سے گھورتی تھیں۔ محلے کے مرد تو اب بھی انہیں دیکھ کر تیوری چڑھا لیتے۔ البتہ جب وہ کوئی دلچسپ بات کرتے تو وہ ہنسنے لگتے۔ اور یوں ہم کلام ہوتے جیسے اپنی فراخدلی کی وجہ سے ان کے گذشتہ گناہ معاف کر دیئے ہوں۔ لیکن احسان علی کی غیر حاضری میں وہ اکثر کہا کرتے "بوڑھا ہوگیا ہے لیکن ابھی ہدایت نہیں ہوئی۔ ہدایت تو اللہ میاں کی طرف سے ہوتی ہے۔ جنہیں نہ ہو انہیں کبھی نہیں ہوتی۔"

"حرامکاری کی لت کبھی جاتی ہے۔ بابا جی"

"ہاں بھئی یہ تو سچ ہے۔"

"دیکھ لو اتنی عمر ہو چکی ہے۔ باتوں میں کوئی فرق آیا ہے؟ وہی چھیڑ خانی — لاحول ولا قوۃ۔"

بات بھی سچی تھی اگرچہ احسان علی پچاس برس سے زیادہ ہو چکے تھے۔ لیکن وہی منڈی ہوئی داڑھی متبسم آنکھیں اور چھیڑ دینے والی باتیں۔ ان کی روح ویسے ہی جوان تھی۔ بچوں کو گلی ڈنڈا کھیلتے ہوئے دیکھتے تو وہیں کھڑے ہو جاتے۔ واہ واہ کرنے لگتے کھلاڑی کو داد دینے لگتے یا امپائر بن کر کھڑے ہو جاتے۔ لڑکے انہیں کھیل میں حصہ لینے پر مجبور کرتے۔ تالیاں بجاتے شور مچاتے "چچا جی ہمارے آؤٹ نہیں گے۔" "نہیں ہمارے۔" ایک ہنگامہ بپا ہو جاتا۔ کھڑکیوں سے محلے والیاں جھانکنے لگتیں۔ "لو دیکھ لو احسان علی گلی ڈنڈا کھیل رہے ہیں۔" چق کی اوٹ میں سے آواز آتی۔ "بھائی جی کیا پھر سے جوان ہونے کا ارادہ ہے۔" سبز جنگلے سے شاداں سر نکالتی "ابھی تو اللہ رکھے پہلی جوانی ہی ختم نہیں ہوئی۔" شاہ نشین سے چاچی بولتی۔ "تو یہ شاداں تو بھی کسی کو چین لینے نہیں دیتی۔ شکر کر کہ احسان علی کا دھیان اور کھیلوں سے ہٹا ہے۔ گلی ڈنڈا کھیلنے میں کیا عیب ہے۔" مسجد سے آتا جاتا کوئی محلہ دار انہیں دیکھ کر ہنستا "کب تک اس لڑکیوں لڑکوں کے کھیل میں لگے رہو گے۔"

اب خدا کو بھی یاد کر لیا کرو۔" احسان علی ہنس کر گنگناتے "وقت پیری گرگ ظالم می شود پرہیزگار۔" دوسرا آ کر کہتا "دنیاداری کی غلاظت سے اکتائے نہیں ابھی؟ صوم و صلوٰۃ کی پاکیزگی کو کیا جانو۔" احسان علی کہتے "باباجی غلاظت کا احساس ہو تو پاکیزگی کی آرزو پیدا ہوتی ہے نا۔" "تم میں احساس نہیں کیا؟" باباجی پوچھتے اور وہ جواب دیتے "احساس تو ہے پر غلاظت بھی ہو۔" اس بات پر کوئی لاحول پڑھ دیتا اور وہ ہنستے "لو بھائی جی اب تو شیطان بھی آ گیا۔" اور وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔

احسان علی کے آنے سے پہلے محلہ کیسا ویران دکھائی دیتا تھا۔ اگرچہ موسم سرما میں دوپہر کے قریب محلے والیاں چوگان میں اکٹھی ہو کر ازار بند بُنا کرتی تھیں۔ دوپہر کے قریب جب چوگان میں دھوپ آتی تو چوکیاں بچھ جاتیں۔ مٹی کی ہنڈیاں رکھ دی جاتیں جن میں تیلیوں کے مٹھے بھرے ہوتے۔ بارہ بجے کھانے پینے سے فارغ ہو کر عورتیں وہاں جمع ہونا شروع ہو جاتیں۔ ایک بجے تک اچھا خاصہ میلا لگ جاتا۔ ہاتھ چلتے تو لگے تیلیوں سے پھسلتے ہوئے عجیب آوازیں پیدا کرتے۔ تیلیاں ٹکراتیں۔ ازار بند بنتے ہوئے کسی کی بات چھڑ جاتی۔ گلے ہوتے شکائتیں کی جاتیں۔ ایک دوسرے پر آوازے کسے جاتے۔ مگر قہقہے کی آواز نہ آتی۔

ادھر ڈیوڑھی میں مسئلے مسائل کی بات گرم رہتی۔ شریعت کے احکام بار بار دہرائے جاتے۔ حدیثوں کے حوالے دیئے جاتے۔ اولیا کرام کی حکایات سنائی جاتیں۔ ہنگامہ تو رہتا تھا۔ مگر اس میں مزاح کی شیرینی نام کو نہ ہوتی۔ عورتوں کے مسلسل جھگڑوں اور مردوں کی خشک بحثوں کی وجہ سے وہ مسلسل شور محلہ کو اور بھی ویران کر دیتا۔ پھر احسان علی پنشن لے کر محلے میں آ بسے ان کے آنے کے بعد محلے کا رنگ بدل گیا۔ جب عورتیں ایک دوسرے کے گلے شکوے کرنے میں مصروف ہوتیں تو احسان علی آ نکلتے اور آتے ہی ایسی بات کرتے کہ سبھی ہنس پڑتیں اور محفل کا رنگ ہی بدل جاتا۔ طعنے اور تمسخر کی جگہ مذہبی مذاق شروع ہو جاتے۔ آپس میں جھگڑتی ہوئی عورتیں مل کر احسان علی کے خلاف محاذ قائم کر لیتیں اور محلے کے چوگان میں قہقہے گونجنے لگتے۔ محلے کے بزرگ خشک مسائل چھوڑ کر احسان علی کے چٹکلے سننے لگتے۔ بات بات پر لاحول پڑھنے والے بڈھے لاحول پڑھنا بھول جاتے۔ لیکن پھر بھی عادت سے مجبور ہو کر

کوئی نہ کوئی لاحول پڑھ دیتا۔ اس پر احسان علی کھلکھلا کر ہنس پڑتے۔ "بھائی جی کیا آپ کو بات بات پر لاحول پڑھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں جب تک شیطان کا خطرہ لاحق نہ ہو لاحول کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔" احسان علی کو لاحول سے چڑ تھی چڑ۔ ہاں تو واقعی احسان علی کے آنے پر محلے میں ایک نئی روح دوڑ گئی تھی۔

پھر ـــــ ایک روز ایک انوکھا واقعہ ہوا۔

چوگان میں عورتیں حسب معمول جمع تھیں۔ نئی روشنی کے نوجوانوں کی بات چل رہی تھی کہ شاداں نے دور سے احسان علی کو آتے دیکھ لیا۔ چاچی کو اشارہ کر کے باآواز بلند بولی "چاچی خدا جھوٹ نہ بلائے۔ آجکل تو چھوٹے چھوٹے لڑکے بھی چچا احسان علی بنے ہوئے ہیں۔ راہ چلتی لڑکی کو تاڑتے ہیں۔"

"ہائے ہائے" چچی نے شاداں کا اشارہ سمجھے بغیر کہا "تم تو خوامخواہ اُس بیچارے ــــــ"

شاداں نے پھر سے اشارہ دہرایا۔ جسے دیکھ کر چچی کا غصہ مسکراہٹ میں بدل گیا۔

"آج کل کے مردوں کی کیا پوچھتی ہو چچی" شاداں نے پھر سے بات شروع کی "بال کھچڑی ہو جاتے ہیں پر عورتوں کو تاڑنے کی لت نہیں جاتی۔"

"ہاں شاداں" چچی نے منہ بنا کر کہا "زمانہ ہی ایسا آیا ہے۔"

اس کے بعد مجمع پر خاموشی چھا گئی ہر کوئی احسان علی کی بات سُننے کی منتظر تھی۔ اگرچہ وہ سب یوں بیٹھ گئی تھیں۔ جیسے انہیں احسان علی کے آنے کی خبر ہی نہ ہو۔

احسان علی آئے اور چپ چاپ اُن کے پاس سے گزر گئے۔

اُنہوں نے انہیں جاتے ہوئے دیکھا اور حیران ہو گئیں۔

"اللہ خیر کرے آج احسان علی کو کیا ہوا ہے" چاچی زیر لب بولی۔

"میں تو آپ حیران ہوں" شاداں ہاتھ ملنے لگی "اے ہے احسان علی اور چپ چاپ پاس سے گزر جائے۔"

"میں کہتی ہوں ضرور کوئی بات ہے" بھابی نے انگلی ہلاتے ہوئے کہا۔

"کبھی گھر سے لٹکے تو نہیں آئے تھے" شاداں نے پوچھا۔

"اُف ——" چاچی نے ہونٹ پر انگلی رکھ کر کہا۔ "جس وقت نواب بی بی سے لڑا۔ اس وقت تو اور بھی چپکا ہوا ہوتا ہے۔ کیوں بھابی یاد ہے کل کیسے ہنس ہنس کر گھر کی لڑائی کی بات سُنا رہا تھا؟"

"ہاں" بھابی مسکرائی "جیسے لڑائی نہ ہوئی تماشہ ہوا۔"

"اس کا کیا ہے" چاچی بولی "اس کے لئے تو ہر بات تماشہ ہے۔ چاہے موت کی ہو یا بیاہ کی"

"ہائے چاچی کیسی اچھی طبیعت ہے احسان علی کی۔ کبھی ماتھے پر تیوری نہیں دیکھی۔ ایمان سے رنگیلا ہے رنگیلا۔"

"یہی کہتی ہوں مزید آج کی بات ہے" بھابی ہونٹ پر ہاتھ رکھ کر سوچنے لگی۔

شاداں ازار بند لپیٹتے ہوئے بولی "چلو تو چل کر نواب بی بی سے پوچھیں"۔

"ارے ہے مو جوڑے تو چڑھا لینے دے" بھابی نے کہا۔

"مرنہ۔ مو جوڑے اتنا وبہ بھی کیا" اُس نے اُٹھ کر بھابی کے ازار بند کو زبردستی لپیٹ دیا۔

پہلے تو وہ نواب بی بی سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں پھر چاچی نے بات چھیڑی۔ کہنے لگی "خیر تو ہے۔ احسان علی کو کیا ہے آج؟"

"ابھی اچھے بھلے باہر گئے ہیں" نواب بی بی نے جواب دیا۔

"وہ تو ہم نے بھی دیکھا تھا اسے باہر جاتے ہوئے" بھابی نے کہا۔

"میں نے تو بلکہ انہیں چھیڑنے کی خاطر کچھ کہا بھی تھا" شاداں بولی "میں نے کہا چلو دو گھڑی کا مذاق ہی رہے گا۔ پر انہیں یوں چپ چاپ دیکھ کر میں تو حیران رہ گئی۔ کہیں میری بات کا بُرا ہی نہ مان لیا ہو۔ تو بہ میں نے بات ہی کیوں کی؟"

"اونہوں" نواب بی بی نے کہا "بُرا ماننے والا نہیں وہ۔"

"کسی فکر میں پڑا تھا۔ جبھی پاس سے گزر گیا" چاچی نے کہا۔

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے" نواب بی بی نے کہا "اپنے حمید کا خط آیا ہے آج۔ لڑکے نے اپنی شادی کے بارے میں لکھا ہے۔"

"ہائیں میں مر گئی" شاداں چلائی "آپ اپنی شادی کیلئے لکھا ہے کیا، تو یہ کیا زمانہ آیا ہے؟"

"اس میں حرج ہی کیا ہے" چاچی بولی "اللہ رکھے جوان لڑکا ہے آپ کماتا ہے۔ لکھ دیا تو کونسی قیامت آگئی؟"

"میں جانوں احسان علی کو دیر نہیں کرنی چاہئے اس بات میں۔"

"اونہوں انہیں خیال ہوتا اس بات کا تو یہاں تک نوبت ہی نہ آتی۔ میں تو کب سے کہہ رہی تھی کہ لڑکے کو نامزد کر دو لیکن اُن کے اپنے چاؤ بھی ختم ہوں۔ اتنی عمر ہو چکی ہے۔ لیکن ابھی ہوس نہیں گئی۔"

"نہ بہن" چاچی بولی "مجھ سے تو آپ انہوں نے کئی بار کہا ہے۔ کہ چاچی جہاں لڑکا کہے گا۔ اس کی شادی کر دیں گے۔ اللہ اللہ خیر سلا آجکل یہ کام لڑکے کی مرضی بغیر نہیں ہوتے۔ بات بھی سچی ہے۔"

"یہ بات ہے" نواب بی بی بولی "تو اب کیوں سر پیٹ کر باہر نکل گیا ہے۔ لڑکے نے اپنی بیوی تلاش کر لی ہے تو ——"

"اپنی بیوی آپ تلاش کر لی ہے؟" شاداں چلائی

"سچ؟" بھابی ران پہ ہاتھ مار کر بولی۔

"ہاں بھابی" نواب بی بی بولی "پہلے تو اُسے اپنی مرضی کی بیوی تلاش کرنے کی پٹی پڑھاتے رہے اور اب اُس نے اپنی بیوی کا چناؤ کر لیا ہے تو میاں گرم ہو رہے ہیں"

"کون ہے وہ؟" چاچی نے پوچھا۔

"مجھے کیا معلوم۔ اسکول میں اُستانی ہے۔ لڑکے نے فوٹو بھی بھیجی ہے اس کی۔"

"ہم بھی تو دیکھیں" شاداں نے منت کی۔

نواب بی بی اُٹھ بیٹھی اور میز کی دراز میں سے فوٹو لے آئی۔

"ہائے چاچی یہ تو میم ہے میم" شاداں خوشی سے پھولی نہ سمائی۔

"ارے ہے" چاچی بولی "ایسی ہی تو ہوتی ہیں یہ اسکول والیاں۔"

"تو یہ کیسی بنی ٹھنی بیٹھی ہے" بھابی ہنسی

"کتنی خوبصورت ہے" شاداں بولی "احسان علی کو ایسی خوب صورت بہو کہاں سے مل سکتی تھی۔"

عین اُس وقت احسان علی آ گئے شاداں کی بات سُن کر وہ گھبرا گئے۔ ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے پھر کمرے سے باہر جانے لگے۔ لیکن شاداں کب چھوڑنے والی تھی انہیں "مبارک ہو چچا" وہ بولی "نئی بہو مبارک ہو۔ محلے کی لڑکیاں تو تمہیں پسند نہیں تھیں۔ اللہ رکھے

نسکے نے یہ مشکل بھی آسان کر دی۔"

ایک ساعت کیلئے احسان علی کا منہ فق ہوگیا لیکن جلد ہی وہ سنبھل کر غصے میں بولے "وہ تو بیوقوف ہے بیوقوف اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ خوبصورت لڑکیاں دیکھنے کیلئے ہوتی ہیں بیاہنے کیلئے نہیں۔ بھلا دیکھو تو اس لڑکی کا اس گھر میں گزارہ ہو سکتا ہے کیا؟"

"کیوں اس کو کیا ہے" شاداں بولی "دیکھو تو کتنی خوبصورت ہے۔"

"یہی تو مصیبت ہے" وہ سر کھجاتے ہوئے بولے۔

"آپ جو ساری عمر خوبصورت لڑکیوں کے پیچھے پیچھے پھرتے رہے ہو احسان علی۔ اب کیا لڑکے کا جی نہیں چاہتا" بھابی بولی۔

"پیچھے پیچھے ہی پھرتا رہا ہوں نا بیاہ کر تو نہیں لایا کسی کو۔ یہ دیکھو وہ یہ حمید کی ماں بیٹھی ہے" وہ جوش میں بولے "دیکھ لو کیا ناک نقشہ ہے۔"

"کیوں نواب بی بی کو کیا ہے" چاچی ہنسی۔

"میں کب کہتا ہوں کہ کچھ ہے۔ اگر کچھ ہوتا تو کیا میرے چولہے پر بیٹھ کر برتن مانجھتی رہتی؟"

"آخر حمید کا بھی تو جی چاہتا ہے کہ خوبصورت لڑکی ہو اس میں حرج ہی کیا ہے۔" شاداں مسکرائی۔

"میں کب کہتا ہوں کہ جی نہ چاہے لیکن چاچی یہ تیتریاں تو یارانہ لگانے کیلئے ہوتی ہیں۔ بیاہنے کیلئے نہیں۔"

"ہائیں" شاداں نے ناک پر انگلی رکھ لی "احسان علی تم نے تو حد کر دی۔"

"کوئی محلے کی بیاہ لیتا پھر چاہے جہاں مرضی ہوتی یارانے لگاتا پھرتا۔" احسان علی اپنی ہی دھن میں کہے گئے۔

"توبہ میری، احسان علی تم تو بات کہتے ہوئے کسی کا لحاظ نہیں کرتے" چاچی بولی۔

"ذرا سے دیکھو نا خدا" احسان علی نے پھر تصویر اُن کے سامنے رکھ دی "یہ آنکھیں!! راہ چلتے کو روکتی ہیں یا نہیں۔ توبہ آنکھ بھر کے دیکھا نہیں جاتا۔"

"اے ہے دیکھا کیوں نہیں جاتا بھلی اچھی تو ہے۔" شاداں مسکرائی۔

"مرد کی آنکھ سے دیکھو تو معلوم ہو نا" احسان علی ٹکٹکی باندھ کر اُسے دیکھنے لگے۔

"اپنی بہو کے بارے میں کہہ رہے ہو" چاچی ہنسی

"بہو تو جب بنے گی تب دیکھا جائے گا۔ چاچی ویسے بات کر رہا ہوں آخر مجھے بھی تو اسی گھر میں رہنا ہے" وہ مسکرائے۔

اس بات پر نواب بی بی کی بھی ہنسی نکل گئی بولی "ان کی تو عادت ہی ایسی ہے جو منہ میں آیا کہہ دیا۔"

ان کے چلے جانے کے بعد احسان علی پھر اُسی طرح گم سم ہوگئے۔ حمید کی ماں نے کئی بار بات چھیڑنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے خیالات میں گم تھے۔ دفعتاً وہ اُٹھ بیٹھے "حمید کی ماں مجھے آپ جا کر اس سے ملنا چاہئے ایسا نہ ہو کہ معاملہ ہاتھ سے نکل جائے۔ سوٹ کیس میں دو جوڑے رکھ دے میں صبح پہلی گاڑی سے ہی چلا جاؤں۔"

حمید کے پاس پہنچ کر پہلے تو انہوں نے باتوں ہی باتوں میں اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ چٹکلے سنائے۔ اپنے تجربہ اور مشاہدہ کو پیش کرنے کیلئے آپ بیتیاں بیان کیں لیکن جب حمید نے کسی بات کا جواب نہ دیا تو وہ دلیلوں پر اُتر آئے۔ لیکن اس پر بھی حمید خاموش رہا تو انہوں نے اسے دھمکانا شروع کر دیا۔ جلد ہی دھمکیوں نے منتوں کی شکل اختیار کر لی۔ اس پر حمید بولا "ابا جی میں مجبور ہوں میں نسرین سے بیاہ کرنے پر مجبور ہوں۔" اس وقت احسان علی کو باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کوئی ڈوبتا سہارا لینے کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہو۔ دفعتاً وہ پھر جلال میں آگئے بولے "اچھا بیشک بیاہ لاؤ اُسے لیکن وہ ہمارے یہاں کبھی نہ آئے گی کبھی نہیں۔ ہم اس سے کبھی نہ ملیں گے۔" اس پر حمید اُٹھ بیٹھا بولا "آپ کی مرضی" "لیکن اس لڑکی کو بیاہنے پر تم اس قدر مصر کیوں ہو؟" انہوں نے پوچھا "میں مجبور ہوں ابا جی" حمید نے کہا "ہماری شادی ہو چکی ہے۔" "ہو چکی ہے؟" وہ دھڑام سے صوفے پر گر گئے "ہو چکی ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" "یہ حقیقت ہے" حمید نے سنجیدگی سے کہا "اس بات کو ایک ہفتہ ہو چکا ہے۔"

"ایک ہفتہ؟" انہوں نے پیشانی سے پسینہ پونچھا "یہ بات ہے تو پھر جھگڑا ہی کیا ہوا" وہ دفعتاً ہنس پڑے لیکن اُن کی ہنسی بہت کھسیانی تھی۔ حمید اُٹھ بیٹھا اور ساتھ والے دروازے کو کھٹکھٹانے لگا "ایں!

احسان علی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا "تم تو کہتے تھے۔ یہ کمرہ پردے والوں سے متعلق ہے۔" "اور کیا کہتا آپا جی" حمید مسکرایا اور پھر آواز بلند کی "نسرین۔ آ جاؤ آپا تم سے ملنا چاہتے ہیں۔" "اوہ!" احسان علی کے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی "تو یہ بات ہے۔"

نسرین بڑے پُر وقار انداز سے کمرے میں داخل ہوئی "سلام عرض کرتی ہوں۔" مسیحی آواز کمرے میں گونجی وہ ایک ساعت کیلئے وہ سامنے تکی ہوئی تصویر کو گھورتے رہے پھر دفعتاً انہیں احساس ہوا کہ انہیں جواب میں کچھ کہنا چاہئے "بیٹھئے۔ تشریف رکھیے۔ تشریف رکھئے" وہ گھبرا کر بولے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ وہ اسی صوفے کے دوسرے سرے پر بیٹھ گئی ہے۔ گھبرا کر اُٹھ بیٹھے۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں جو ہونا تھا ہو چکا۔ "فضول۔" "ہاں بھئی" وہ حمید سے مخاطب ہوئے "تم انہیں محلے میں لاؤ نا۔ تمہیں وہاں آنا ہی پڑے گا۔ تمہاری ماں تمہاری راہ دیکھ رہی ہے۔" "سچ!" حمید بولا "کیا واقعی آپ چاہتے ہیں کہ ہم گھر آئیں؟" "اور تو کیا مذاق کر رہا ہوں میں۔ تمہیں چھٹی لینی چاہئے۔ ہاں۔" "چھٹی تو میں نے پہلے ہی سے لے رکھی ہے" حمید مسکرایا۔ "تو پھر یہاں کیا کر رہے ہو۔ کیا حماقت ہے" انہوں نے مسکرانے کی کوشش کی "کل ہی پہنچ جاؤ وہاں۔ اچھا میں اب جاتا ہوں۔ نسرین کو ساتھ لانا۔ سمجھے؟"

جس وقت حمید اور نسرین محلے میں داخل ہوئے وہ سب چوکنا سی تھیں۔ نسرین نے کالا ریشمیں برقعہ اتارا۔ ایک ساعت کے لئے وہ جھجک گئیں ———— رسمی سلام ہوئے۔ دعائیں دی گئیں۔ سر پر ہاتھ پھیرے گئے۔ جب دلہن اپنے گھر چلی گئی تو نکتہ چینی ہونے لگی۔ ایک بولی "ایسے بہن دلہن کا ہمارے ساتھ کیا میل"۔ شاداں بولی "کیوں ہم کیا کم ہیں کسی سے" تیسری نے کہا۔ "مُنہ پر اللہ مارا پوڈر دو دو انگل چڑھا ہوا ہے۔" چوتھی نے کہا۔ "دیکھنے تو چودھویں کا چاند ہے۔ احسان علی کا گھر تو منور ہو گیا؟" "ہاں بہن" شاداں نے آہ بھر کر کہا "اُسے محلے والیاں پسند تھیں"۔ شاداں نے سر اُٹھایا تو سامنے احسان علی کھڑے تھے۔ بھابی بولی "سنا احسان علی شاداں کیا کہہ رہی ہے۔" "لاحول ولا قوۃ" احسان علی کے منہ سے ساختہ نکل گیا۔ شاداں کب چھوڑنے والی تھی انہیں بولی "لو چاچی آج تو چچا کے مُنہ سے بھی لاحول سن لیا۔ احسان علی کو دفعتاً اس کا احساس ہوا تو لگے سرکنے وہاں سے۔ شاداں نے بڑھ کر ہاتھ سے پکڑ لیا بولی "اب کہاں جاتے ہو میں تو گن گن کے بدلے لوں گی۔ چچی ہنسی بولی "کیسی مبارک دلہن آئی ہے کہ احسان علی کے منہ سے عربی کے لفظ نکلے"۔ "ہم چاچی" شاداں چلائی "ان سے بھلا پوچھو تو آج لاحول پڑھنے کی کیا ضرورت پڑی ہے انہیں" "ہائے ہے شاداں" بھابی بولی "کیا کہہ رہی ہے تو؟" "ٹھیک تو کہہ رہی ہوں"۔ شاداں چمکی "اس روز میں نے لاحول پڑھا تو احسان علی نے کس قدر شرمندہ کیا تھا۔ مجھے کہنے لگے جب لاحول پڑھا جائے تو شیطان کچھ دور نہیں ہوتا۔" "اب تو اسے ہونے بھی دے گی یا نہیں" چاچی چڑ کر کہنے لگی "گھر جو آئی ہے اور تو نے اسے یہاں پکڑ رکھا ہے۔"

اسی شام کو جب دولہا دلہن اپنے کمرے میں چلے گئے تو شاداں نے حسب معمول ازراہ مذاق چچا سے کہا "خیر سے دلہن گھر میں آئی ہے تمہیں تو شکرانہ کے نفل ادا کرنے چاہئیں احسان علی"۔ جب کبھی شاداں انہیں مذاق سے نفل یا نماز ادا کرنے کو کہا کرتی تو احسان علی جواب میں کوئی نہ کوئی فقرہ چست کر دیا کرتے لیکن اس روز وہ بولے "سچ ———— اچھا شاداں تو بھی کیا کہے گی کہ چچا نے کبھی میری بات نہیں مانی۔ آج تو تیری بات پوری ہی کر دیتے ہیں"۔ یہ کہہ کر وہ حمام کے پاس جا بیٹھے۔ اور وضو کرنے لگے پہلے تو سمجھتی رہی کہ مذاق کر رہے ہیں لیکن جب وہ جائے نماز پر کھڑے ہو گئے تو شاداں حیران رہ گئی۔

اگلے روز تمام محلے میں بات مشہور ہو چکی تھی۔ کہ احسان علی نے نفل پڑھے۔

"سچ" چچی بولی۔

"کیا واقعی" بھابی نے دونوں ہاتھوں سے سینہ سنبھال لیا ————

"نہیں نہیں میں نہیں مانتی"۔

"تمہاری قسم" شاداں نے ہاتھ چلا کر کہا۔

"مبارک قدم ہے دلہن کا" چاچی بولی "کہ احسان علی مصلے پر کھڑے ہوئے"۔

محلے کی ڈیوڑھی تک بات پہنچی تو اس پہ بحث ہونے لگی۔

"ابھی ہدایت کے لئے وقت مقرر ہے۔"

"میں کہتا ہوں شکر کرو کہ اس نٹ کھٹ نے سجدہ کیا۔"

"آخر کب تک نہ کرتا سجدہ"

احسان علی کو آتے دیکھ کر ایک بولا۔ "آخر آ گئے نا راہ راست پر۔"

"ہاں بھئی اب تو چھپ چھپ کے نفل پڑھے جاتے ہیں۔"

"احسان علی تو کہا کرتا تھا۔ جب غلاظت کا احساس ہو تو ـــــــ"

"آ گئے نا عورتوں کی باتوں میں" احسان علی نے ہنسنے کی کوشش کی "کون ہے بابا جی جو عورت کی بات میں نہیں آتا۔ سب مجھ سے ہیں۔"

"لیکن اس میں بُرا کیا ہے" بابا جی نے کہا "ہمیں تو بلکہ خوشی ہے کہ تم نے سجدہ کیا۔"

دو دن تو احسان علی کے گھر میں ہنگامہ رہا۔ عورتیں آتی جاتی رہیں۔ محلے کے کمین میراثی ڈوم اور بھانڈ بدھائی دینے کیلئے آ موجود ہوئے پھر تیسرے دن جب انہیں فراغت ہوئی تو نواب بی بی نے کہا "اب کیا دلہن کیلئے چار ایک جوڑوں کا انتظام بھی نہ کرو گے۔ اور محلے والے انہیں تو دلیمہ کی دعوت دینی ہوگی۔"

پہلے تو احسان علی شہر جا کر چیزیں خریدنے کیلئے تیار نہ تھے پھر جب انہوں نے دیکھا کہ نواب بی بی کے ساتھ حمید جانے کو تیار ہو گیا ہے تو وہ گھبرا گئے "بولے حمید کا جانا ٹھیک نہیں۔ دولہا کو دلہن سے علیحدہ کرنا مناسب نہیں۔" "تو پھر ہمارے ساتھ کون جائے گا؟" نواب بی بی نے چڑ کر پوچھا "تو میں ہی چلا جاتا ہوں۔" وہ بولے۔ اس بات پر حمید کہنے لگا "میرے جانے میں کیا حرج ہے ابا جی۔ آپ جو گھر ہیں۔ نسرین اکیلی تو نہ رہے گی۔" احسان علی نے اصرار کیا تو وہ بولا "آپ جا کر نہ جانے کیا کیا اُٹھا لائیں گے۔" "اوہ یہ بات ہے۔" احسان علی نے اطمینان کا سانس لیا۔ "تو دلہن کو بھی ساتھ لے جاؤ۔" اس بات پر نواب بی بی چلائی۔ "لے ہے نئی دولہن کو ساتھ ساتھ لئے پھریں۔ لوگ کیا کہیں گے۔" احسان علی خاموش ہو گئے۔ اور حمید اپنی والدہ کو ساتھ لے کر دو روز کیلئے شہر چلا گیا۔

پہلے روز تو وہ باہر نکل گئے۔ چوگان میں بیٹھی عورتوں کے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ پھر ڈیوڑھی میں جا بیٹھے۔ لیکن جلد ہی وہاں بھی نئی دلہن احسان کے نفلوں کی بات چھڑ گئی۔ وہ بہانے بہانے وہاں سے سرک آئے۔ بچوں نے انہیں گزرتے ہوئے دیکھا اور گے شور مچانے۔ ایک ساعت کیلئے وہ حسب معمول وہاں کھڑے رہے پھر دفعتاً کوئی خیال آیا۔ اس کھڑکی کی طرف دیکھا جو نسرین کے کمرے سے اس طرف کھلتی تھی۔ اس خیال پر وہ پھر چوگان میں آ کھڑے ہوئے چوگان میں شاداں نے انہیں پکڑ لیا اور لگی مذاق کرنے لیکن اس روز انہیں کوئی بات نہ سوجھتی تھی۔ بار بار اوپر کھڑکی کی طرف دیکھتے اور پریشان ہو جاتے۔

شام کو جب وہ گھر پہنچے تو نسرین مسکراتی ہوئی انہیں ملی۔ بولی "رات کیلئے کیا بناؤں؟" "جو تم چاہو۔" وہ گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ نسرین انہیں کی چارپائی پر بیٹھ گئی تو وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھے۔ "اوہ" ـــــ اُن کے مُنہ سے بے ساختہ نکل گیا نسرین چونک پڑی "کیا چاہئے آپ کو؟" "میں تو بھول ہی گیا۔" وہ اپنی ہی دھن میں بولے "کیا؟" نسرین نے پوچھا "کچھ نہیں کچھ نہیں۔" وہ بڑبڑائے "میرا مطلب ہے۔" انہیں خود سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اُن کا مطلب کیا ہے اور وہ اس قدر مضطرب کیوں ہیں۔ اُن کی گھبرائی ہوئی نظریں جائے نماز پر جا پڑیں۔ اطمینان کا سانس لیا جیسے ڈوبتے کو سہارا مل گیا ہو "میرا مطلب ہے" وہ بولے "مغرب کی نماز کا وقت تو جا رہا ہے۔" انہیں وضو کرتے دیکھ کر نسرین نے جائے نماز بچھا دی۔ اور آپ اس کے پاس ہی کرسی پر بیٹھ کر سویٹر بننے لگی۔ وضو سے فارغ ہو کر وہ جائے نماز پر آ کھڑے ہوئے ابھی نیت باندھنے ہی لگے تھے کہ پیچھے سے خوشبو کا ایک لپٹا آیا۔ مڑ کر دیکھا۔ نسرین بیٹھی کچھ بُن رہی تھی۔ وہ پھر بڑبڑانے لگے "میرا مطلب ہے۔ یعنی ابھی تو وقت ہے۔ کافی وقت ہے ابھی یہ پاس ہی تو مسجد ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے جوتا پہنا اور پیشتر اس کے کہ نسرین کچھ کہے باہر نکل گئے۔ اس کے بعد انہیں پتہ نہیں کہ کیا ہوا۔ وہ بھاگے بھاگے چوگان سے نکل گئے۔ کھیلتے ہوئے بچوں کو دیکھے بغیر آگے چلے گئے۔ ڈیوڑھی خالی پڑی تھی۔ وہاں انہیں ہوش آیا۔ سوچنے لگے۔ پھر نہ جانے وہ مسجد کے دروازے پر کیسے پہنچ گئے۔ دروازے میں احسان علی کو دیکھ کر نمازی والے اُن کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ایک بولا "اُن کو بھلا نہ جانئے جو صبح گیا گھر واپس آوے شام" دوسرا کہنے لگا۔ "آخر کبھی نہ کبھی غلاظت کا احساس ہو ہی جاتا ہے۔" یہ سُن کر دفعتاً وہ مڑے جیسے وہاں سے بھاگ جانا

چاہتے ہیں " میں اس وقت بابا جی آ گئے۔ احسان علی کو پکڑ لیا " اگر واپس نہیں جا یا کہتے احسان علی " وہ انہیں گھسیٹ کر مسجد میں لے آئے۔

اس واقعے پر انہیں اطمینان سا ہو گیا بیٹے " یہ دیکھو میں تو نہیں گیا لایا جا رہا ہوں " "چلو یونہی سہی " بابا جی نے کہا " تیسرا پہلا " آخر کوئی نہ کوئی بہانہ یا وسیلہ بن ہی جاتا ہے۔ نئی بہو کے وہ قدم کر دعا دو بھئی " پوتے نے کہا " وہ کہاں احسان علی کہاں مسجد " اگر مسجد کا امام وقت تنگ سمجھ کر کھڑا نہ ہو جاتا تو نہ جانے کیا کیا باتیں ہوتیں اس وقت۔

رات کو کھانے کے بعد نسرین نے انہیں کے کمرے میں اپنا بستر جما دیا۔ اور پھر آپ چارپائی پر بیٹھ کر اطمینان سے سویٹر بننے لگی۔ حقہ پیتے ہوئے وہ کچھ سوچنے کی کوشش کرتے رہے لیکن بار بار نگاہیں ادھر اُدھر بھٹکنے لگتیں۔ سامنے فرش پر نسرین کی خوبصورت سرخ چپل اُن کی آنکھوں تلے ناچتی۔ کمرہ خوشبو سے بھرا ہوا تھا۔ اُف وہ بار بار اپنی ناک سکیڑتے کیسی واہیات بوتھی " ہاں وہ میری کتاب " وہ آپ ہی آپ گنگنائے " کتاب " نسرین کی آواز کمرے میں گونجی " میں دیتی ہوں آپ کی کتاب " " نہیں نہیں " وہ چلائے " میں خود لے لوں گا۔ " وہ اٹھ بیٹھے لیکن نسرین پہلے ہی الماری تک پہنچ چکی تھی۔ لاحول ولا قوۃ بے اختیار ان کے منہ سے نکل گیا۔ وہ رہی رُک گئے جیسے آگے بڑھنے سے ڈرتے ہوں " وہ نیلی وہ بائیں طرف، والی " وہ چلائے ——— " وہاں رکھ دو " انہوں نے دور سے چارپائی کی طرف اشارہ کیا ——— " وہاں "

ان کی آنکھوں تلے کتاب کے لفظ ناچنے لگے۔ حاشیہ سرک سرک کر دائیں سے بائیں طرف جا پہنچتا اور پھر بائیں سے دائیں چلنا شروع کر دیتا۔ لفظوں کی قطاریں چلنے لگتیں اور پھر دفعتاً ایک جگہ ڈھیر ہو جاتیں ——— دور محلے والیاں ڈھولک بجا رہی تھیں۔ سامنے نسرین کس انداز میں بیٹھی تھی۔ کیا واہیات طریقے سے بیٹھی ہے انہوں نے سوچا کیا نمائشی انداز ہیں۔ اور وہ پھر جھینپ سے گیا پھتے نالی کی ماں نہیں آئی " وہ گویا کتاب سے پوچھنے لگے " کوئی کام ہے کیا ؟ " نسرین نے پوچھا " نہیں نہیں " وہ گھبرا گئے " ویسے وہ سونے کو تو آ لے کی نا لیاں "

" اس کی کیا ضرورت ہے " نسرین بولی " میں جو ہوں " " اوہ " وہ از سر نو گھبرا گئے۔

" میں جو ہوں میں جو ہوں " دور محلے والیاں ڈھولک کے ساتھ گا رہی تھیں ——— " اوہ گیارہ بج گئے " انہوں نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا " ابھی تو گیارہ ہی بجے ہیں " نسرین نے جواب دیا " وقت ہی نہیں گزرتا "

" وقت ہی نہیں گزرتا وقت ہی نہیں گزرتا " گھڑی کراہنے لگی۔

وہ اٹھ بیٹھے اور بے خبری میں حمام کے سامنے بیٹھ کر وضو کرنے لگے۔

رات کو وہ گھبرا کر اُٹھے۔ کمرے میں چھوٹی سی بتی جل رہی تھی۔ چاروں طرف عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے نسرین سوئی ہوئی تھی۔ دو چھوٹے چھوٹے پاؤں رضائی سے باہر نکلے ہوئے تھے " چھینی چھینی " کسی نے تمسخر سے ان کے کان میں کہا۔ سرہانے پر کالے بالوں کا ڈھیر لگا تھا۔ سرہانے تلے پتلی پتلی انگلیاں پڑی تھیں جن پر روغن چمک رہا تھا " فضول " انہوں نے منہ بنایا۔ اٹھ بیٹھے اور باہر نکل گئے صحن میں چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ دور محلے والیاں گا رہی تھیں ——— بال کوری لیے بکھیرے کاٹ ——— نہ جانے کیوں انہوں نے محسوس کیا جیسے اُن کی زندگی کی تمام رنگینی ختم ہو چکی تھی۔

اندر آ کر وہ سوچنے لگے " ابھی تو دو بجے ہیں " " وقت گزرتا ہی نہیں۔ وقت گزرتا ہی نہیں " گھڑی چلانے لگی۔

جائے نماز کو دیکھ کر انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ انہوں نے سوچا۔ حمید نے کس قدر فحش غلطی کی ہے بیوقوف۔ انہوں نے نسرین کی طرف دیکھ کر سوچا اور پھر ان جانے میں جائے نماز پر کھڑے ہو گئے۔ اس وقت انہیں نماز گویا یاد ہی نہ تھی میرے اللہ میرے اللہ دل سے آوازیں آ رہی تھیں جی چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر رو دیں رکوع کے بغیر وہ سجدے میں گر گئے۔

میں اس وقت شاداں چاچی کے ساتھ کوٹھے سے نیچے اتری " چپ " شاداں زیر لب بولی " وہ سو رہے ہوں گے۔ آج تو چچا احسان سے وہ مذاق کر کے رہوں گی۔ کیا یاد کریں گے " چاچی ہنس پڑی بولی " تجھے بھی تو ہر وقت شرارتیں ہی سوجھتی ہیں " " لو وہ کیا یاد کرتے ہیں میرا " شاداں نے کہا۔

" ہائیں " انہیں سجدے میں پڑے دیکھ کر شاداں نے اپنا سینہ سنبھالا " میں مر گئی یہاں تو تہجد ادا کیا جا رہا ہے " " نہ جانے بہو نے کیا جادو کر دیا ہے "

" سچ " چاچی نے ہونٹ پر انگلی رکھ لی " اور یہ دیکھو دلہن سو رہی ہے جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو "

احسان علی چونک کر اٹھ بیٹھے۔ ان کے گال آنسوؤں سے تر تھے " ہائے میرے اللہ " شاداں نے پھر اپنے آپ کو سنبھالا۔ احسان علی نے انہیں دیکھا تو دفعتاً منہ ڈھیلا پڑ گیا۔ چہرہ بوڑھا ہو گیا جیسے یکلخت وہ بوڑھے ہو گئے ہوں " احسان علی " شاداں نے چیخ سی ماری۔

احسان علی نے منہ پھیر لیا۔ ایک ہچکی نکل گئی اور وہ سجدے میں گر پڑے۔ انہوں نے محسوس کیا گویا چینی کا نازک سا کھلونا ریزہ ریزہ ہو کر ڈھیر ہو گیا ہو۔

ہاجرہ مسرور

ایک بچّی

اس دن شام ہی سے پھوار پڑ رہی تھی اور بس مجھے خواہ مخواہ ہی تو اُلجھن ہو رہی تھی۔ اُدھر چند سال سے اکثر یہی حالت رہتی اُگھٹی گھٹی، دبی دبی بیزاری اور اُلجھن سی ـــ اس پر شام ہی سے ہلکی ہلکی پھوار ـــ مجھے ہلکی ہلکی، دبی دبی کیفیتوں سے جانے کیوں نفرت سی ہونے لگی ہے۔ کہتے ہیں کہ جھما جھم بارش ہو تو سارا پانی مکانوں کی چھتوں سے ندی نالے کی طرح بہہ کر نکل جاتا ہے۔ لیکن یہ ہلکی ہلکی پھوار تو ایسے غضب کی ہوتی ہے۔ کہ ٹکڑے ٹکڑے مکان بھی ڈھ جاتے ہیں اس سے ـــ لاکھ کوشش کرنے کے باوجود میں اُلجھتی ہی چلی جا رہی تھی ـــ جتنی لمبی عمر ہو اتنی ہی لمبی اُلجھنیں۔ سوئی میں لمبا تاگا ڈال کر سینے تو بار بار گتھیاں پڑ جاتی ہیں۔ میں بھی تو تیتیس سال کے تاگے بھگ ہو رہی تھی ـــ ہے رے!

میرے سرہانے کی کھلی ہوئی کھڑکی سے سرد اور یخ ہوا خاموشی سے داخل ہو رہی تھی۔ اس پر بھی دماغ میں گویا انگیٹھی سی دہک رہی تھی ـــ

رات کا ابتدائی حصہ تھا لیکن میری گلی میں انسان تو انسان کتے تک گم سُم ہو چکے تھے اور مجھے اس وقت یہ سکوت ہمیشہ سے زیادہ گھل رہا تھا۔ اس گلی کے مکان میں رہ کر تو یوں معلوم ہوتا کہ میں بھی وہی کہانیوں والی شہزادی ہوں جسے اُس کے باپ نے ناراض ہو کر جنگل کے قلعے میں قید کروا دیا تھا۔

لمبے چوڑے کمرے میں برابر برابر سلیقے سے بچھے ہوئے پلنگوں پر میری ماں اور پانچوں بہنیں لحافوں میں گھسی گٹھڑیاں بنی ہوئی پڑی تھیں ـــ چُپ چاپ، لحافوں تلے ڈھیر، جیسے میری طرح ان سب کو بھی کوئی اُلجھن گھیرے ہوئے ہو۔

ـــــــــــــــ ایک کمرے میں برابر برابر پڑے ہوئے پلنگ ـــ جیسے ہم سب قیدی ہوں، جنرل وارڈ کے مریض یا کسی یتیم خانے کے یتیم ـــ

"بھئی اللہ ـــ بھئی اللہ ـــ" میرے سر میں دھمک سی ہونے لگی اور جیسے میرے اندر ہی اندر کوئی اُبل کر گھٹنے لگا۔ بھئی اللہ! سب سو گئے، سب لحافوں تلے دفن ہو گئے ـــ کوئی بھی نہیں بولتا۔ کیا سب کے سب حلق تک کھانا ٹھونس کر بیٹھے ہیں جو ہوں ہاں تک کرنے کی سکت نہیں رہی ـــ کھائیں گے نہیں تو اور کیا کریں گے یہ لوگ؟ گویا میری کمائی ہے بھی تو حرام کی۔ دن بھر ڈیڑھ سو روپلی کے لئے میں اپنا بھیجا کورڑہ مغز لڑکیوں سے چٹی کروں اور یہ سب اُو نگھیں منہ سے حلق تک بھر کے ـــ اور وہ چچا جان بھی تو نہیں آئے ابھی تک سیاہ ہوئے؟ یہ بھی تو کچھ کم خود غرض نہیں ہیں۔ بیچارے اپنے بڑے بھائی کے مرنے کے بعد ان کی بیوہ اور بچوں کی سرپرستی کر رہے ہیں۔ باتوں کے چٹخارے مکانوں کے خوار۔ آئیں گے گیارہ بجے باہر سے۔ کون اُٹھ کر دروازہ کھولے گا۔ بڑے آئے چچا جان بڑا لطیفہ ہماری برائے نام جائیداد کے حساب کتاب میں بھی گڑبڑ کرتے ہوں گے جبھی تو راتوں کو باہر رہتے ہیں۔ بڑھاپے میں جانے کہاں چھچھوندروں کی طرح چھپلتے پھرتے ہیں۔ چچی جان کو مرے ہوئے تیس سال ہو گئے۔ جبھی سے یہ رنڈوے ہیں۔ کہتے ہیں انہیں مرحومہ سے عشق ہے۔ ہاں بھئی ہوگا "مرحومہ سے عشق"۔ ورنہ روایت ہے کہ چچی جان زندگی بھر ان کے عشق کی لگام اپنی طرف موڑنے کی کوشش کرتی رہیں۔ مگر بھئی ہندوستانی مردہ پرست ہیں۔ مرحومہ سے عشق ہو جانا کچھ عجب بھی نہیں جبھی تو اس سوگ میں راتوں کو باہر رہتے ہیں ـــ میں بھی مر جاؤں گی تو سب مجھے چاہنے لگیں گے۔ کیا لڑکی تھی کہ عمر بھر شادی نہ کی اور باپ کے بعد گھر سنبھال لیا ـــ بھئی اللہ! اس زندگی سے تو بہتر ہے کہ مر جاؤں جلدی ـــ مگر ابھی تو اُٹھ کر دروازہ کھولنا ہے ـــ اللہ کرے مر جائیں چچا جان۔

اور میری اُلجھن بڑھتی ہی گئی۔ رونانہ کی یکرنگی اور بے کیفی کا احساس جیسے چبھنے لگا ـــ یہی برابر برابر پڑے ہوئے پلنگ اور میری جوان بہنیں اور بوڑھی ماں ـــ جی میں آیا کہ سب کے پلنگ گھسیٹ کر گڈمڈ کر دوں۔ میز پر رکھے ہوئے لیمپ پر اپنا تکیہ کھینچ ماروں اور میز کے نیچے بیٹھی ہوئی پالتو بلی کو اُٹھا کر کھڑکی سے نیچے گلی کے سرخ سرخ فرش پر دے ماروں تاکہ وہ اتنے زور سے چیختی ہوئی بھاگے کہ دور تک گلی کا سناٹا درہم برہم ہو جائے ـــ میری بہنیں مجھے دیوانہ سمجھ کر چیخیں مارنے لگیں اور میری اماں، اپنی جیتا صفت بیٹی کو ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر اپنا سینہ کوٹ لیں۔

مگر میں نے سوچا کہ یہ تو ایک بالکل فضول سی حرکت ہوگی کیونکہ اس کے بعد پھر یہی گھر ہوگا اور یہی سب کچھ ـــ بس ایک ذرا سا ہنگامہ۔ آزادی کا اتفاق جیسے الیکشن کے کرتب، جیسے نٹوں کا کھیل! جیسے ....

"بِسْمِ اللہ —— " میرے اندر پھر کوئی پاؤں ٹپک کر ٹھنکا میں نے بیزار ہو کر کروٹ بدلی اور میرے سر کے نیچے صبح کا اخبار کھڑکھڑایا —— میں نے اسے اٹھا کر پلنگ کے نیچے پھینک دیا۔ اخبار پڑھتے پڑھتے بھی تھک گئی " پاکستان —— اکھنڈ ہندوستان —— زندہ باد برطانوی ہندوستان " میری اُلجھن نے ایک نئی راہ سُجھائی۔ جی میں آیا کہ بے تحاشا برطانوی ہندوستان زندہ باد کے نعرے لگاؤں تاکہ میرے پڑوس میں بسے ہُوئے مختلف سیاسی عقاید کے لوگ ایک دم چونک پڑیں اور مجھے بھر بھر گالیاں دینے لگیں۔ کتنی خوشی کی بات ہوگی ایک بار تو سب کے دل پر ایک سی چوٹ لگے۔ ایک ہی درد اُٹھے ایک مشترکہ جذبہ پیدا ہو؟ —— اور میں اپنا نعرہ بلند اور بلند کرتی جاؤں۔ سڑکوں پر گلیوں میں، شہروں شہروں —— یہاں تک کہ گاندھی جی کو اپنے اکھنڈ ہندوستان اور مسٹر جناح کو اپنے پاکستان کی ایک نمایاں اور ٹھوس شکل نظر آجائے۔ برطانوی ہندوستان زندہ باد! مگر میری توبہ! میں کر ہی کیا سکتی ہوں سوائے بستر میں لیٹ کر رات گئے تک اُلجھنے کے، میری زندگی میں کوئی انقلاب نہیں ہوگا۔ خارجی نہ داخلی۔ دن بھر لڑکیوں کو پڑھاؤ —— ہندوستانیوں کے متعصبانہ غرشنے سہو۔ میری ہیڈ مسٹرس سیاست کی ابجد سے ناواقف ہونے کے باوجود خالص اکھنڈ ہندوستانی ہیں۔ مسلمان استانیوں کی خفیہ پاکستانی میٹنگوں میں شرکت کرو جن میں ہندوؤں کے کفر سے نفرت کا اظہار کیا جاتا ہے اور وہ میٹنگیں جو پانی پلانے والی مہترانی تک کو دیکھ کر خندہ پیشانی سے منتشر کر دی جاتی ہیں —— گھر آؤ تو ایک ایک کی سنو، ایک ایک کو سناؤ۔ رات کو پڑے پڑے بھول بھلیوں میں بھٹکو —— مہینے کی پہلی کو مٹھی بھر تنخواہ، لون مرچ اور آٹا دال کے حسابات کی نذر کرتے ہُوئے گرم کوٹ کی تمنا اگلے مہینے پر ملتوی کرتے جاؤ —— لعنت ہے۔

گیارہ بارہ بجے چچا جان آ بیٹھے اپنے پلنگ پر اپنڈ اینڈ کر ہماری سرپرستی کرنے کو تو اس لئے اُٹھ کر دروازہ کھول دو۔ چچا جان بقول خود خدا سے ڈرتے ہیں اس لئے ہماری سرپرستی کے لئے حاضر ہوتے ہیں —— اور حکومت برطانیہ کو مہذب ملکوں کے طعنوں کا ڈر ہے اس لئے نیم وحشی ہندوستان کو نہیں چھوڑ سکتی کہ کہیں یہ ملک چھوڑ کے زمانے کی طرف نہ لوٹ جائے۔ کانگریس اور مسلم لیگ الیکشن کے دانت پر چوٹیں لڑانے جُتے ہیں۔ میں اور میری بہنیں خواہ مخواہ ایک چُندے سے چھوکرے کے لئے سوچ سوچ کر مری جا رہی ہیں۔ وہ چھُندا سا چھوکرا جسے محبت کرنا نہیں آتی اور جس کی منگنی میرے رشتے کے خان بہادر ماموں کی اوھیڑ عمر صاحبزادی سے ہو چکی ہے —— میں نے دل شکستہ ہو کر صوبہ بنگال کے ایک ہائی اسکول میں ہیڈ معلمہ کی جگہ کے لئے عرضی دے دی ہے اور میری بہن نے بجائے خودکشی کرنے کے ایک مقامی اسکول میں معلمہ بننا گوارا کر لیا ہے حالانکہ وہ ملازمت کو عورت کی توہین تصور کرتی ہے۔ عجیب مذاق ہے یہ دنیا —— اللہ کرے ساری دنیا میں ایسی بارش ہو جس میں ایٹم بموں کی جھڑیاں لگ جائیں —— مگر جانے امریکہ اور برطانیہ کے دو گدھوں نے ایٹم بم کے راز سے اللہ میاں کو واقف بھی ہونے دیا ہے؟

میرے سر کے اندر دھک دھک سی ہونے لگی۔ نہ جانے یہ دل اس قدر پاؤں چلا کیوں ہے؟ کبھی کہیں دھک دھک ہو رہی ہے کبھی کہیں —— میں نے اپنا سر اُٹھا کر تکیوں پر دے مارا۔

" پنہیاں بھرت بھرت میں ہاری، ہر موری بہنیاں پرانی " گلی سے جیسے کوئی نشے میں لہکتا ہُوا گزرا مست اور بے پروا۔ اور مجھے بھی یُوں لگا جیسے میری بانہیں بھی تھک گئی ہیں بیکار سینے پر پڑے پڑے —— پہلو میں بے قدری سے رکھے رکھے اور سر پر ہالہ بناتے بناتے —— چولہے میں جائیں یہ بیہودہ خیالات ١

ہاں تو پھر اے اللہ میاں میری عرضی بنگال میں منظور کرا دو۔ بس وہاں پہنچ کر اپنی موجودہ ماتحتی کا ردِ عمل خوب دل لگا کر کیا کروں گی۔ مچھلی اور چاول کو ملا کر معتدل بنائی ہوئی غذا کا استعمال کیا کروں گی اور فرصت کے اوقات میں صرف روحانیات پر کتابیں پڑھا کروں گی۔ اللہ کرے میری عرضی منظور ہو جائے۔

کھٹ کھٹ کھٹ —— دروازے کی زنجیر کھڑکھڑائی جانے لگی —— کنجی بولے ہولے کھڑکانا، ہو ماجرو دھیرے دھیرے آنا۔ میرے دل میں میرا مردود پھر تلملایا۔ مگر دروازہ تو چچا جان کھٹکھٹا رہے ہیں۔ اللہ کرے کسی دن ہمارے ہاں ڈاکہ پڑے اور لمبے تڑنگے ڈاکو اس گھر کی سب عورتوں کو زبردستی اُٹھا کر لے جائیں۔

کھٹ کھٹ ——

نوجوانی کی نیند آ گئی نیضو کو۔ اور کوئی بھی نہیں اُٹھتا۔ نہ اُٹھے۔ میں بھی نہیں اُٹھنے کی۔ چاہے سردی سے اکڑ کر دم نکل جائے ان کا میری جُوتی کی نوک سے —— اور گھنٹوں میں آدھی آدھی رات تک۔

کھٹ کھٹ ——

شرم نہیں آتی کنواری بھتیجیوں کا آدھا درجن رکھے ہوئے ملنے کہاں بتاتی پھرتی نہیں؟

فیضو کو شاید رحم آگیا۔

"جاگ رہی ہو نا منا ―― ہاں ابھی رات بھی کتنی گئی ہے۔" چچا جان نے میرے پلنگ کے قریب آکر کہا۔

"ہوں! ――" میں نے جواب دیا۔

"لو یہ مٹھائی۔" انہوں نے دو مال کی پوٹلی میرے لحاف پر پھینک دی اور سب لحافوں میں کھلبلی سی مچ گئی۔ "بچیوں میں بانٹ دو۔" وہ اور کروٹ اکڑنے لگے۔

بستروں سے سر بلند ہوئے، جیسے واقعی سب بچیاں ہی تو ہوں۔

"ادھر لاؤ کیا ہے حضرت آپا جانی! ―― "تقاضہ ہوا تو مجھے غصہ آگیا اس چھچھورے پن پہ۔ میں نے پوٹلی اماں کے لحاف پر اچھال دی۔

"کیا بخارات دماغ کو چڑھ گئے آپا جانی؟" ساجدہ نے ایک بے تکا سا قہقہہ نکالا۔

"نہیں تو کوئی بات نہیں ――" میں نے اپنی تلخی کو دبا کر کہا۔ میں کبھی کبھی ان سب سے دبنے لگتی ہوں ―― مٹھائی کے حصے بخرے ہونے لگے اور میں نے لحاف منہ پر ڈال لیا۔ میری الجھن اس چاؤں بھاؤں میں اور بھی بڑھ گئی ―― اور میں نے طے کر لیا کہ بنگال ضرور جاؤں گی۔ بنگال کا جادو مجھ پر نہیں چل سکے گا۔ سنا ہے۔ بنگال کے مرد تو اتنے بزدل ہوتے ہیں۔ کہ اپنے ہاں کی مشہور اور مقبول پیداوار "بنگال کے جادو" پر بھی بڑی آسانی سے غیر بنگالیوں کا قبضہ گوارا کر لیتے ہیں۔ "ہونہہ! میری چوٹی تو بہت چھوٹی ہے۔ مجھے کیا ڈر ہے؟ بس اطمینان سے مچھلی بھات کھاؤں گی ―― اور ―― بنگال کا غذائی قحط تو ختم بھی ہو چکا۔

"ایک بچی ملی گی ―― تم میں سے کوئی؟" چچا جان نے پوچھا۔ میں ایک دم بستر سے اُبل پڑی اور میری طرح میری سب بہنیں بھی۔ مگر اماں کو جیسے مٹھائی کھاتے کھاتے اونگھ سی آگئی۔

"دھان رنگی ردھن گوری سی گلو سن مجھ سے ہر روز پوچھ جاتی ہے۔"

جی! ―― جی! ہم سب نے کورس میں کہا۔

"کسی کال کے مارے بنگالی کی اولاد؟" اماں نے پوری طرح برا مانتے ہوئے سوال کیا۔

"ارے نہیں بھابی! ان کنگلوں کی اولاد لے کر کیا کرنا ہے ――" چچا جان کی عزت پر جیسے حرف آگیا۔

"واہ آپ قحط کی وجہ سے ہی بنگالیوں کو یہ بھتیجی [illegible] لایا ہوا ہے۔" زہرا بالکل پنڈت نہرو کے انداز میں گرجی۔

"مگر جناب کال کے مارے لوگوں کی بے [illegible] فائدہ اٹھا کر ان کے لال چھین لینا بھی تو انسانیت کی توہین ہے۔" ناظمہ [illegible] جیسی سنجیدگی کے ساتھ ہائی اسکول کی طالبہ ہونے کا فخر ہے۔ بھن بھنائی۔

"اور بھوکے ماں باپ کی گود میں ایک بوند دودھ کے لئے دم توڑتے ہوئے بچے دیکھتے رہنا میں انسانیت ہے۔" ساجدہ بے تکے پن سے ہنس کر چلائی۔ بیچاری کو اپنے پھیلے ہوئے دہانے کی ہنسی بہت عزیز ہے۔

سب کے سب زور سے ہنس پڑیں جیسے لطیفہ ہی تو ہو گیا ہو۔

"لاحول ولا ――" چچا جان کی بیٹھی ہوئی آواز نے سب کو خاموش کر دیا۔ "تم لوگ تو ہر موقعے پر اپنا اپنا تصنیف کردہ فلسفہ جھاڑنے لگتی ہو۔"

ساجدہ ہنسنے لگی۔ ناظمہ نے گھٹنے ٹکا کر جھومنا مناسب سمجھا۔ ناظمہ کو اپنے بکھرے ہوئے بالوں میں گرہ دینا یاد آگیا۔ باقیوں نے محض مسکرانے پر اکتفا کی ―― اور میں سوچنے لگی۔ کہ "ایک بچہ ―― ایک بچہ مچل جائے تو ――" میری نسائیت کی گود میں ممتا ہمکنے لگی۔ "ارے! میں جھینپ سی گئی ―― "وحشت ―― خان بہادر کا داماد بن کر ست ہے چند کہیں کا۔ میں تجھ سے کہیں بلند ہوں، میں غیر کی اولاد کو بھی اپنا سکتی ہوں ――" کھسیانی بلی کھمبے پر جھپٹی۔

باہر بارش کی ہلکی ہلکی پھواریں ننھی ننھی بوندیوں میں تبدیل ہو گئیں اور سائبان پر جیسے کوئی گیت گنگنانے لگا۔

"وہ بچی شریف کی اولاد ہے سمجھیں تم لوگ!" چچا جان نے دو دو اور سفارش کی

"تمہاری ہی شرافت کا تو تعجب نہیں ہے میاں۔" اماں نے ہنس کر چھیڑا اور بھتیجیاں کھلکھلا اٹھیں۔ میرے دل میں جیسے سمندر کے کھاری پانی کی ایک لہر سر اٹھا کر لپکی کہ کہیں یہ بچی وہ چچا جان کی عیاشت کا پھل تو نہیں؟

"خدا کی قسم آپ تو مذاق کرتی ہیں بھابی جان! اور اپنا سفید بالوں سے ڈھکا ہوا سر جھکا کر شرمائے ساجدہ مجھے اس قدر بے تکے لگے۔ "کہیں بچہ شرما گئے" ناظمہ نے پوچھا۔

"کس کی بچی ہے وہ۔ کہاں ملی چچا جان! ――"

"ایک غریب آدمی کی۔ اس کی بیوی کا انتقال حال ہی میں ہوا ہے۔ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا چھوڑا ہے اس نے ―― وہ دھوتی کی تھ بیٹھی ہے

[illegible]

نہیں [illegible] ہے کہاں بچی کو سنبھالتا پھرے۔
بڑی [illegible] کی جہیز [illegible] جس کا —"

"[illegible] —" اماں کی حسرت زبان پر آ گئی۔ "صرف آدھی درجن لڑکیاں [illegible] ایک بھی نہیں۔"

"[illegible] — اس کی نسل چلے گی اس سے۔" انہوں نے کاروباری انداز میں ایسا جواب مجھے دیا۔ اور میں سوچنے لگی کہ پاکستان اور انگلینڈ ہندوستان کے جھگڑوں میں پڑنے کی بجائے ہمارے لیڈر اس مسئلے کا حل کیوں نہیں کرتے کہ نسل لڑکی چلاتی ہے یا لڑکا؟ کیونکہ پاکستان اور انگلینڈ ہندوستان کا بنیادی تعلق براہِ راست اسی مسئلے سے ہے۔

"تو پھر لڑکی لے کر کیا کرنی ہے اور پھر وہ دودھ پیتی بچی —؟" اماں کی دلچسپی ختم سی ہو گئی۔

"بڑی لڑکی بھی دے گی اس کے ساتھ؟" ناظمہ نے بقول خود "غور یاتے" (غور کرتے ہوئے) ہوئے سوال کیا۔

"نہیں پلی پلائی بچی نہیں دے گا وہ، چار دن بعد اسے گھر میں پکے پکائے کھانے کی امید تھی۔" انہوں نے جواب دیا۔

"تو پھر کیا فائدہ، جب تک بچی کے ساتھ بڑی لڑکی نہ ملے، جو کم از کم بچی کا گو موت تو کر ہی لے گی۔ چند دن بعد دیکھ نہیں تو گود میں ٹانگے ٹانگے پھرے گی اسے۔ چھوڑئیے کون برسوں کی مصیبت مول لے۔" ناظمہ نے لیٹ کر رضائی گردن تک اوڑھ لی۔

"میں لوں گی۔" ناظمہ کے مقابلے میں اپنی آواز مجھے کتنی بھلی لگی اور ناظمہ نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو۔ کہ کوئی زیادہ ذرا سی بچی پالنے کرتیا ہے۔ جس نے کبھو اپنی چھوٹی بہنوں کو گود میں اٹھانے کی زحمت بھی نہ کی تھی۔

"میں بھی لے سکتی ہوں۔ کیا قیمت ہو گی؟" ناظمہ پر ضد سوار ہو گئی۔

"تھو ہے، انسان کی قیمت ادا کریں گی آپ بیسویں صدی!" میں نے جل کر کہا۔

"چپ رہو ناظمہ! آپا جان کے نزدیک انسان کی کوئی قیمت نہیں —
— ساجدہ نے اپنے مخصوص بے تکے پن میں ہنستے ہوئے کہا۔ اور میرے جی میں آئی کہ اٹھ کر دو دو تھپڑ لگاؤں ان لڑکیوں کے — جھوٹی ہو کر —!
میری ساری آزاد خیالی اور ترقی پسندی بے جان سی ہونے لگی۔

"اس بچی کو پال لو، بس یہی قیمت مقرر کی ہے اس کے باپ نے۔" تو چچا جان نے دو قول کا حق ادا کیا۔

"اے اللہ ہمارا ملک! اللہ کرے یہاں بھی اشتراکی نظام قائم ہو جائے جلدی سے —" فاطمہ کی آواز بھرا گئی۔ "بیچارے بچے اور ان کے والدین —"
اسے اشتراکیت پر عبور رکھنے کا دعویٰ ہر وقت اکسایا کرتا تھا۔

"اور تمہارا سر —" زہرا کی قنوطیت گویا ہوئی۔ "ہندوستان میں کچھ بھی نہیں ہو گا۔ بس بڑی بڑی شوکو اور اپنے اندر ایک کمیونسٹ کو سلا کے جاؤ۔"

"آپ کل صبح بچی کو مجھے دکھا دیجئے۔ میں اس کی پرورش کروں گی۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں اعلان کیا — میں نے سوچ لیا تھا کہ بنگال جا رہی ہوں پینتیس کے لگ بھگ ہوں شادی کرنا نہیں یا یوں کہو کہ شادی کرے گا ہی کون ایسی چڑیا سے۔ یہ بچی مل جائے تو مستقل کنوارے رہنے کی شاندار وجہ پیش کر دیا کروں گی — اور پھر میرے لئے بھی زندہ رہنے کا کوئی مقصد ہو جائے گا —

باہر بارش تیز ہوتی جا رہی تھی۔

"کیا کرو گی بچی لے کر؟ تمہارے لئے اتنی بہت سی بہنیں کیا کم ہیں پالنے کے لئے۔" اماں نے میری دوڑتی ہوئی گاڑی کے آگے ایک پتھر اٹکا دیا۔

"جی!" مجھے رونا سا آ گیا۔ "میری بہنیں — میں انہیں پالتی رہوں، چاہے یہ سب مجھے جوتی کی نوک پر بھی نہ رکھیں۔ میں کسی سے کوئی گلہ نہیں کرتی۔ مگر یہ ضرور چاہتی ہوں کہ کوئی میرا بھی ہو — میرا اپنا۔ مجھے اس پر بالکل اختیار ہو۔ میں چاہتی ہوں — میں چاہتی ہوں۔" میری آواز بھرانے لگی۔ آنکھیں جل اٹھیں اور کنپٹیاں دل کی طرح دھڑکنے لگیں۔

"ملکیت کا جنون انسانیت کو تباہی کے غار میں دھکیل کر رہے گا۔" فاطمہ جوش کے ساتھ بولی۔ "آپ بچی کو اس لئے پالیں گی کہ اس پر آپ کو پورا اختیار ہو — مارکس کہتا ہے —"

"چپ رہو مارکس کی نانی —" زہرا بڑبڑائی۔ "آپا جان ہمیں پڑھا دیتی ہیں اسی لئے اب ہمیں ذلیل سمجھنے لگی ہیں۔ ہماری بدنصیبی اس سے پہلے کہ ہم کسی لائق ہوتے ابا مر گئے۔ خیر اطمینان رکھئے ہم اپنا بوجھ نہیں رہنے دیں گے آپ پر —"

"اپنی چونچ بند کیجئے مستقبل کی داستان جی۔" ناظمہ ابھری زہرا پر۔

"بھئی اللہ! میرا جی چاہا اپنا سر پھوڑ لوں —" میری حالت کا عکس کو

فدانہ نہیں [illegible] سے کسی کو ہمدردی نہیں [illegible] کسی سے بھی اپنا دُکھ درد نہیں کہہ سکتی اور اگر کہوں تو سب مجھے نکو بنا بیٹھے ہیں — یہ ہے میری وقعت —"

[illegible] سے رونا چاہتی تھی۔

"تو پھر ——" ناظمہ نے کروٹ بدل لی۔ میرا جی چاہا اسی وقت خودکشی کر لوں۔

"تو پھوپھی!" ناظمہ نے اصل موضوع کو پکڑا۔ "آپ کل ضرور اسے دیکھ لیجئے آپا جان۔"

"ہاں کل اسے لے آؤں گا۔ بڑا ثواب ہوگا اسے پال کر، دستوں کی بیماری میں مبتلا ہے، علاج ہو گیا تو ٹھیک ہو جائے گی —" چچا جان بولے۔

"عذاب ہو جائے گی لڑکی — جو بھی لے اپنی ذمہ داری پہ لے۔ مجھ سے سب بچوں کی چھیچھا لیدر نہ ہوگی۔ صاف بات ہے۔" اماں نے پھر ایک پہاڑ ڈھانے کی کوشش کی۔ "میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم میں سے کوئی اسے نہیں پال سکے گا، بڑے دل گردے کا کام ہے بچے پالنا۔ ابھی تم لوگوں کو شعور ہی کتنا ہے۔"

"اماں جان! آپ کے ہاں آپا جان کوئی چودہ سال کی عمر میں پیدا ہوئی تھیں نا؟" ناظمہ ایسے موقعوں پہ ہمیشہ زہر چھڑکتی۔ اماں تپ کر چپ ہو گئیں۔

"اگر وہ خوبصورت ہو تو آپ ضرور لے لیجئے۔" ساجدہ ہنستے ہوئے بولی — "گھر بھلا لگے گا بچے سے۔"

"اس کے باپ سے پکے اسٹامپ پر لکھوا لیجئے گا۔ کہ اس نے ہمیشہ کے لئے دے دی۔ اب اس کا کوئی اختیار نہیں رہا —" ناظمہ بولی۔

"اچھا اچھا آتو جانے دو۔ لڑکی ذات ہے چار دن میں بڑھ کر اس لائق ہو جائیگی کہ گھر کے کام کاج کر دیا کرے گی۔ آپا جان کے پاؤں دبا دیا کریگی" — زہرا بولی۔

"ہاں بڑھاپے میں کچھ تو سہارا ہوگا اُن کا۔" ناظمہ نے کہا۔

"لعنت ہے سب پہ۔ ایک معصوم بچی کے لئے غلامی کا جال بُن رہی ہیں۔ اس سے تو مر جائے وہ —" فاطمہ چلائی۔

"اپنی اپنی رائیں محفوظ رکھئے آپ لوگ —" مجھے ایک دم تاؤ آ گیا "تمیز بھی ہے بات کہنے کی — چچا جان! صبح بچی کو ضرور لے آیئے۔" میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"اچھی بات ہے۔ اب سو جاؤ سب۔ بات [illegible] چچا جان نے لحاف سے منہ ڈھک لیا اور کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ باہر بارش کا شور بڑھ رہا تھا۔

"میاؤں — میاؤں —" پالتو بلی میرے پلنگ کے نیچے گھوم گھوم کر گویا اظہار خیال کرنے لگی۔ میں نے اپنا جسم تکیوں پہ گرا دیا — ٹھنڈی سی ایک لہر سی میرے جسم میں دوڑ گئی۔

ایک ننھی سی بچی ہنستی کھیلتی، ہاتھ پاؤں مارتی میرے احساسات پہ چھانے جا رہی تھی — زندگی کی تمام محرومیاں اور ناکامیاں جو کانٹوں کی طرح کھٹک رہی تھیں ذہن میں یوں دب گئیں جیسے تھیں ہی نہیں۔

میری ہنسیا مکدم بجنے لگی۔

میں اسے لے کر بنگال چلی جاؤں گی — ایک آیا رکھ لوں گی تاکہ وہ دن بھر اُسے اُٹھائے اسکول میں میرے سامنے رہے۔ اسکول سے واپس آ کر بس بچی ہی کے کاموں میں لگ جایا کروں گی۔ اسے اچھی طرح نہلا دھلا کر خوبصورت سلے ہوئے کپڑے پہناؤں گی، کنگھی کروں گی۔ اور پھر صفائی سے دودھ بنا کر اپنے ہاتھوں سے پلاؤں گی۔ میں خود بنگالی عورتوں کی طرح ایک ہلکی سی دھوتی میں اپنا پورا جسم لپیٹ کر، بال کھول کر، ٹھنڈی ٹھنڈی زمین پہ بیٹھ کر اسے جھولا جھلایا کروں گی — رات کو اپنے پہلو میں لٹا کر لوری دیا کروں گی۔ "آ جا ری نندیا تو آجا ذرا بٹیا کو میری سُلا جا ذرا۔" وہ میرے سینے سے لگی آنکھیں جھپکا جھپکا کر مسکراتی ہوئی سو جائے گی — زلف بنگال کی سی سیاہ راتوں میں جب میں کوئی خواب دیکھ کر چونکوں گی تو میں تنہا نہیں ہونگی بلکہ وہ میرے سینے سے لگی ننھی ننھی سانسیں لے رہی ہوگی آہ میرے اللہ!

اور پھر میری ننھی تھوڑے دنوں بعد بولنے لگے گی۔ میری باتیں سمجھنے لگے گی — میں ہنسوں گی تو وہ قہقہے لگائے گی۔ میں روؤں گی تو وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے میرے آنسو پونچھے گی۔ جب کبھی کچھ سوچ کر میں سو جایا کروں گی۔ تو وہ میرے چہرے کو اپنے نرم نرم ہاتھوں میں دبا کر اپنی فکرمند آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال کر، وجہ پوچھا کریگی — پھر میں اسے اپنے سینے سے بھینچ لیا کروں گی — میری ننھی! میری بچی! — کتاب اُٹھا لاؤ میں تمہیں پڑھاؤں گی اور میری ننھی نہایت ذہانت سے فرفر اپنا سبق پڑھ ڈالا کرے گی — اللہ! میری ننھی مجھے مل جائے —"

[illegible] سنو جی تم لوگ! میں نے [illegible] مکان چاہا" میں بچی صرف اس لئے رہی ہوں کہ اسے اپنی بچی سمجھوں، سمجھیں تم لوگ! خواہ وہ کالی کلوٹی ہو — خواہ اس [illegible] باورچی خانے میں بکھرے ہوئے جھوٹے برتنوں کی طرح ہو — میں اس بچی کو [illegible] پالوں گی — میں اسے اپنے ساتھ بنگال لے جاؤں گی — میری زندگی اس کے لئے وقف ہے" میرے مکان کے کنگرے آسمان کو چھونے لگے: ہوں — ہوں! میری چھوٹی بہنیں اس طرح ہوں ہوں کرنے لگیں جیسے میں کہانی ہی تو کہہ رہی تھی۔

"تم لوگ کیا سمجھتی ہو؟ کیا میں اتنی قربانی نہیں کر سکتی اس بچی کے لئے" مجھے غصہ آ گیا۔

"ہیرا — ہیرا!" ساجدہ نے تالیاں بجائیں۔

"بدتمیز کہیں کی — کمینی! — " میری زبان مارے تاؤ کے اینٹھ کر رہ گئی۔

"ناہید!" اماں نے پکارا

"کہئے!" میں نے شمشیر بکف انداز میں جواب دیا۔

"بچی سے محبت کرو گی، اس کے لئے زندگی وقف کر دو گی تو دنیا کیا کہے گی؟"

— اماں نے بزرگانہ لہجے میں پوچھا۔

"کیا کہے گی دنیا — میں پروا نہیں کرتی۔"

"یہی کہ تمہاری حرامی بچی ہے۔ پڑھی لکھی لڑکیوں کا نام پہلے ہی بدنام ہے۔"

اڑاڑا دھم — میرا مکان ڈھینے لگا۔

ریل چھوٹ گئی۔ میں خالی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی اور کانوں میں انجن سنسنا رہا تھا۔

میں چپ ہو گئی۔ میں اسے اپنی بچی سمجھوں گی اور کہوں گی — لیکن کوئی اور کہے گا تو — کوئی اور یہی سمجھے گا تو — میں تو ڈوب کر مر جاؤں گی۔ میرے کنوارپنے پر تو خواہ مخواہ کلنک لگ جائے گا۔ "ممکن ہے بنگال میں کوئی میرا چاہنے والا منتظر ہو، ممکن ہے — مگر یہ حرامی بچی کا ٹیکا دیکھ کر کس میں ہمت ہے کہ مجھ سے شادی کرے؟" شادی کی دبائی ہوئی خواہش نے بھرپور وار کیا۔

"ہمیں اللہ — ہمیں اللہ — " میں پھر الجھنے لگی۔

باہر پھوار گر رہی تھی —

عزیز احمد

مدن سینا اور صدیاں

تب ویتال نے کہا:۔

——————— "مہاراج! اگلے زمانے میں ایک راجہ تھا جس کا نام ویریا باہو تھا۔ اننگ پورہ اُس کی راجدھانی تھی۔ اور دور دور کے راجے اُس کو راج دیتے تھے۔ سات سمندر پار کے سوداگر چھوٹے چھوٹے جہازوں میں بیٹھ کر بھارت ورش میں آتے، اور اُس کی راجدھانی سے موتی، مسالے، ہیرے، اور نہ جانے کیا کیا خرید لے جاتے۔ بیوپار کی برکت سے اننگ پورہ کے ویش بہت امیر ہونے لگے۔ اور اننگ پورہ کے ویش سوداگروں کے مکان روپ اور صفائی میں دوسرے ملکوں کے راجوں کی ڈیوڑھیوں کا مقابلہ کرنے لگے۔ انہیں ویش امیر سوداگروں میں سے ایک کا نام ارتھادت تھا۔ اُس کے ایک بیٹا تھا انمول ہیرے جیسا، جس کا نام دھن دت تھا۔ ایک بیٹی تھی جو دوسری تمام لڑکیوں میں یوں دمکتی جیسے کوئلے میں سچا موتی۔ اِس کا نام مدن سینا تھا۔

ارتھادت اپنے بیٹے دھن دت کو ساتھ لے کر سمندر کنارے کے کسی شہر کو چلا جاتا تھا جہاں افریقہ اور روم دیس کے سوداگر مال خریدنے آتے تھے۔ اُس کی بیٹی مدن سینا اپنی سکھیوں، سہیلیوں کے ساتھ باغ میں کھیلا کرتی۔

ساون کا مہینہ آیا۔ مدن سینا اور اُس کی سکھیاں جھولتی اور گاتی جاتی تھیں۔ آکاش بادل کی رضائی اوڑھے ہلکی ہلکی پھوار برسا رہا تھا۔ مدن سینا اور اُس کی سکھیاں پنچھیوں کی طرح چہچہا رہی تھیں۔ اتنے میں ہوا کا ایک جھونکا آیا اور بڑی بڑی بوندیں درختوں سے گرنے لگیں۔ کسی کے قدموں کی چاپ سُنائی دی اور دھرم دت کو پاس کھڑا دیکھ کر مدن سینا کی ایک سکھی بول اُٹھی۔ "تیرا دوست یہاں نہیں۔ وہ تو اپنے پتاجی کے ساتھ سمندر کنارے کے شہر کو گیا ہے۔"

مدن سینا نے دیکھا کہ دھرم دت اُسے برابر گھور رہا ہے۔ شرم سے اُس نے گھونگھٹ کاڑھ لیا۔ دھرم دت اُسی طرح گم سم کھڑا رہا جیسے وہ اندھا، گونگا یا بہرا ہے۔ بیچارا کیا کرتا۔ اتنی دیر میں پریم کے تیروں نے اُس کی سمجھ بوجھ کو چھلنی کر دیا تھا۔ وہ سوداگر بچہ بھلا کیا جانتا تھا کہ اُس کے دوست دھن دت کی بہن مدن سینا جوان ہو کر ایسی سندر نکلے گی۔ وہ ایک پاگل کی طرح مدن سینا کو گھور ہی رہا تھا کہ مدن سینا اور اس کی سکھیاں چڑیوں کی طرح آپس میں چہچہائیں، کھلکھلائیں، اور مچھلیوں کی طرح پھر سے اُڑ کر مدن سینا سمیت مکان میں کہیں غائب ہو گئیں۔

جب دھرم دت کی آنکھوں نے مدن سینا کو اوجھل پایا تو اُس کے دل کو بڑا دھچکا لگا۔ گم سم وہ اپنے گھر واپس پہنچا۔ اور صبح تک چاندنی کی کرنوں کے زخم سہتا۔ چاندنی کے بھالے کھاتا — بچھونے پر کروٹیں بدلتا رہا۔

تڑکے تڑکے اُٹھ کے وہ سیدھا ارتھادت کے باغ کی طرف چلا۔ اب بھی آسمان سے ہلکی ہلکی پھوار برس رہی تھی اور پتیوں کے کٹوروں میں پانی اور اوس میں امتیاز مشکل تھا۔ ابھی اننگ پورے سے رات کے اندھیرے کا بادل اُٹھنے نہیں پایا تھا۔ باغ میں مدن سینا اکیلی تھی۔ بالوں کے لئے پھول چُننے آئی ہو گی۔ اُس کی سہیلیاں معلوم نہیں اپنے اپنے گھروں میں تھیں یا ابھی مدن سینا ہی کے یہاں پڑی سو رہی تھیں شاید اوس اور صبح کاذب کے پانی کی بوندوں اور ہوا کی بھینی بھینی خوشبو اور پتوں میں گرگٹوں کی سرسراہٹ سے انہیں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اُن کے ہرے ابھی جاگنے نہیں پائے تھے یا شاید جاگ جاگ کے سو گئے تھے۔

اکیلی مدن سینا نے پھول توڑنے میں پھر پیروں کی چاپ سُنی اور اُس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اور پھر اُس نے کسی کو چھلانگ لگاتے دیکھا اور کانٹوں کی باڑھ سرسرا کے رہ گئی۔

پھر مدن سینا نے دھرم دت کو اپنے پاس کھڑا پایا۔ اس طرح کہ گویا وہ اسے اپنے ہاتھوں میں جکڑ لے گا۔ اور خوف سے اُس کا جسم کپکپانے لگا۔ اس

اس افسانے کی لڑی میں مدن سینا کا قصہ کتھا سرت ساگر سے، اور ڈوری گن کا چاسر کے فرینکلن کے قصے سے ماخوذ ہے۔ اس سلسلے کے مرکزی خیال کے ارتقا اور نشو و نما کو ظاہر کرنے کے لئے اِن دونوں قصوں کی ضرورت تھی۔ باقی تمام حصے طبعزاد ہیں۔

کے ہاتھوں سے شبنم اور پانی سے دُھلے پھول گر گئے۔ اور بارش کی ہلکی ٹھنڈی پھواریں بھی اُس کی مانگ کے نیچے پیشانی پر پسینے کے گرم گرم قطرے نمودار ہونے سے نہ روک سکیں۔ اُس نے چیخنا چاہا مگر چیخ نہ سکی۔ اس ڈر کے مارے کہ اُس کی ماں سیاں یہاں آ کر اسے اس نوجوان کے پاس اس وقت دیکھیں گی تو اُسے نیردوش نہ سمجھیں گی۔ اور کیا اُس کی سکھیاں اُسے یہ کہہ کے بدنام نہ کریں گی کہ وہ خود بڑی رات گئے یا اتنے تڑکے دھرم دت سے ملنے آئی ہوگی۔

اتنے میں دھرم دت کے ہاتھ جو اُسے بھینچنے کے لئے اُٹھ رہے تھے، نیچے گر گئے۔ دھرم دت اُس کے چرنوں میں گر پڑا۔ "مدن سینا تو میری نہ ہوئی تو میں مر جاؤں گا۔"

مدن سینا نے اُس سے کہا۔ "دھرم دت یہ آج تجھے کیا ہو گیا۔ تجھے معلوم ہے میں کنواری ہوں اور میرے پتا نے میری منگنی ایک دوسرے دیش کے سوداگر سمدردت سے کی ہے۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں اُس سے میرا بیاہ ہونے والا ہے۔"

دھرم دت زمین سے اُٹھ کھڑا ہوا اور دانتوں سے اپنا ہونٹ کاٹ کے اُس نے کہا۔ "جو ہونا ہے ہو جائے۔ تیرے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔" اُس کے ہاتھ پھر اُٹھے۔ مدن سینا کو بھینچنے کے لئے۔ اور وہ خوف سے تھر تھر کانپنے لگی۔ کہیں یہ زبردستی نہ کرے۔ بدنامی کے ڈر سے وہ چلا بھی نہیں سکتی تھی۔ اُس نے جلدی سے پیچھے ہٹ کر کہا۔

"سُن تو۔ پہلے میرا بیاہ تو ہو جانے دے۔ میرے پتا کی تمنا تو پوری ہو جائے کہ وہ مجھ کنواری کو دُلہن بنتی دیکھیں۔ پھر میں تیرے پاس ضرور آؤں گی کیونکہ تیرے پریم نے میرے دل کو موہ لیا ہے۔" یہ کہہ کر وہ دونوں ہاتھوں سے اُسے روکتی ہوئی اور پیچھے ہٹی۔

واستہ روک کے دھرم دت نے کہا۔ "میں ایسی عورت سے پریم نہیں کر سکتا جو پہلے کسی اور مرد سے ہم آغوش ہو چکی ہو۔"

اور مدن سینا نے ڈر کر کہا۔ "اچھا تو میں بیاہ ہوتے ہی فوراً تمہارے پاس آؤں گی اور اس کے بعد اپنے پتی کے پاس جاؤں گی۔"

اِس پر بھی دھرم دت نے اُس کا ہاتھ پکڑ ہی لیا اور اُس وقت تک نہیں چھوڑا جب تک مدن سینا نے بھگوان کی قسم کھا کے اپنے وعدے کی توثیق نہیں کی۔ تب اُس نے اُس کا ہاتھ چھوڑا اور چھلانگ مار کے کانٹوں کی باڑ کود گیا۔

پانی کی پھوار رُک گئی تھی۔ مدن سینا کا دل جو دھک دھک کر رہا تھا اب بیٹھنے لگا۔ وہ بہت اُداس اُداس گھر کے اندر گئی۔

جب بیاہ کا دن آیا اور سب رسمیں پوری ہو چکیں تو مدن سینا اپنے پتی سمدردت کے گھر گئی۔ خوشیوں میں دن گذرا اور جب اکیلے میں اُس کے پتی نے اُسے اپنے آغوش میں جکڑنا چاہا تو وہ تڑپ کے نکل گئی اور دھیرے دھیرے روتے اور آنسو پونچھتے ہوئے سر جھکا کر اُس نے کہا — "میرے پتی، میرے بالم، میرے ناتھ، میں تجھے اپنی جان سے زیادہ چاہتی ہوں۔ لیکن مجھ جو کہتا ہے سُن اُٹھ اور وعدہ کر کہ تو مجھے سزا نہیں دے گا۔ تاکہ میں جو کہنا چاہتی ہوں، تجھ سے کہہ سکوں۔"

جب سمدردت قسم کھا چکا تو مدن سینا نے چند روز پہلے جب اُس کے والد اور بھائی سفر پر تھے۔ دھرم دت کے باڑھ پھاندنے کے آنے اور بارش کی ہلکی پھوار اور شبنم اور آنسوؤں کی کہانی اُسے سنائی۔ اور آخر میں اُس سے کہا۔ "میرے ساجن اب تو بتا، اب میں کیا کروں، میں تو اُس پاپی سے بچن ہار چکی۔"

سمدردت قسم تو کھا ہی چکا تھا۔ نہ وہ اُسے سزا دے سکتا تھا نہ اُسے روک سکتا تھا۔ اُس نے مدن سینا کو اجازت دے دی کہ اپنا قول پورا کرنے کو جہاں اُس کا جی چاہے جائے۔

وہ اُٹھی، اور اپنے پتی کے گھر سے باہر چلی گئی۔

اُس رات کو آسمان پر گہرے بادل چھائے تھے۔ مگر بجلی نہیں چمک رہی تھی کہ اگر پورے کی سڑک پر کوئی چور ڈاکو گھات لگائے بیٹھا ہو تو نظر آ جائے یا کوئی کالا یا چتکبرا سانپ کہیں کنڈلی مارے بیٹھا ہو تو پاؤں پڑنے سے پہلے ہی راہی کو خبر ہو جائے۔

مدن سینا اِس اندھیرے کی وجہ سے اپنے جیون سے اور بھی بے پرواہ ہو کر دھرم دت کے گھر کی طرف جا رہی تھی کہ بڑ کے ایک موٹے تنے کے پیچھے سے لپک کے ایک ہٹے کٹے ڈاکو نے اُسے دبوچ لیا۔ نہ وہ اُسے چھوڑنا چاہتا تھا نہ اُس کے زیوروں کو۔ اُس کے آگے ہاتھ جوڑ کے دیش سوداگر کی لڑکی نے دھرم دت سے اپنے وعدے، شوہر کی اجازت اور سب واقعات بیان کئے اور آخر میں منت کر کے کہا۔ "ڈاکوؤں کے راجہ بس مجھے گھنٹہ بھر کے لئے چھوڑ دو۔ میں اپنا قول پورا کر لوں۔ اُس کے بعد میں یہیں واپس آؤں گی۔ جیسا سلوک

تمہارا جی چاہے کرنا اور تم کوئی چند [illegible] اپنا بچن پورا کروں گی۔"

ڈاکو نے یہ سُن کر اُسے جانے کی اجازت دے دی۔ اور وہ سیدھی دھرم دت کے گھر پہنچی۔ جو اتنے دنوں سے اُس کے عشق اور اُس کی تمنا میں بے چین تھا لیکن اُسے اپنے گھر میں دیکھ کر اچنبھے سے اُسے سکتہ ہو گیا۔ پھر اُس نے پوچھا۔

"تم یہاں کیسے آنے پائیں؟"

مدن سینا نے اپنی اور اپنے بالم کی گفتگو اس کے سامنے دہرائی تو دھرم دت جو اُس کے سوا کسی اور کو کبھی چاہ نہ سکتا تھا کہنے لگا "تم نے تو اپنا بچن پورا کیا لیکن تم جو کسی دوسرے کی پتنی ہو میرے کس کام کی ہو جس طرح تم آئی ہو ویسی ہی چلی جاؤ کوئی تمہیں دیکھنے نہ پائے" ایک آنکھ سے ہنستی اور دوسری سے روتی مدن سینا اُسی راستے واپس ہوئی۔ لیکن اُس نے ڈاکو سے بھی بچن ہارا تھا اور اُس بڑ کے سامنے اُس ڈاکو سے ملنا تھا۔ بڑ کے پاس پہنچتے پہنچتے اُس کا دل بیٹھنے لگا۔

بڑ کی آڑ سے ڈاکو کلہاڑی لئے پھر دھم سے سامنے آ کودا۔ اُسے مدن سینا کے آنے کی تو آشا نہیں تھی۔ مگر وہ دوسرے امیر راہگیروں کو لوٹنے کا انتظار کر ہی رہا تھا۔ مدن سینا کو اتنی جلدی واپس آتے دیکھ کر اُس نے کہا "کیوں کیا ہوا؟"

اور مدن سینا نے یہ قصہ بیان کیا کہ دھرم دت نے ہاتھ لگائے بغیر ہی اُسے چھوڑ دیا۔ اس پر اس ڈاکو نے اُسے کہا، جو اب تک اپنی کلہاڑی سے درخت کی لکڑی کی طرح ہزاروں کے سر توڑ چکا تھا "تیری سچائی سے خوش ہو کے میں بھی تجھے چھوڑتا ہوں۔ جا اپنے سونے چاندی اور عزت کے زیوروں سمیت اپنے گھر جا۔"

سمدردت جس کا دل پہاڑی ندی کی طرح سر پٹک رہا تھا۔ کواڑ پر ہلکی سی تھاپ کی آواز اور زیوروں کی چھنا چھن سُن کے اُٹھا۔ مدن سینا نے اُس کے چرنوں کو چھو کے جب سر اُٹھایا تو اُس کی آنکھوں میں جو آنسو چھلک رہے تھے۔ وہ رنج یا بیکسی کے نہیں خوشی اور پریم کے تھے۔ سمدردت سے اُس نے رات کی کہانی سنائی۔ کس طرح سچ اور اپنے بچن کے پاس کی وجہ سے دھرم دت اور ڈاکو دونوں کے دلوں میں بھگوان نے ترس اور رحم ڈالا۔ کس طرح وہ پاک اور اچھوتی اپنے ساجن، اپنے ناتھ کے پاس واپس آئی۔ سمدردت کو اپنے گھرانے کی آبرو بچنے سے زیادہ خوشی اس کی ہوئی کہ اُس نے ایسی سچی اور قول کی پکی استری پائی اور اُس کے بعد مرتے دم تک دونوں نے ہنسی خوشی دن گذارے۔

قصہ ختم کر کے ویتال نے مہاراج تری وی کرم سینا سے پوچھا "جے مہاراج کی۔ اب مہاراج یہ بتائیں کہ ان تینوں میں سب سے زیادہ فراخدلی سے کس نے کام لیا ـــ مدن سینا کے پتی نے یا دھرم دت نے یا ڈاکو نے؟"

تب مہاراج نے کچھ سوچ کے اُسے جواب دیا "ویتال جی ان تینوں میں سچ پوچھو تو دراصل فراخدل وہ ڈاکو ہی تھا۔ اُس کا پتی بھی اُسے کیسے جانے دیتا۔ جب کسی پتنی اور کسی مرد میں کسی قسم کا بندھن ہو تو کوئی شریف پتی اُسے کیسے روک سکتا ہے۔ دھرم دت اس لئے اُس سے دست بردار ہو گیا کہ وقت گذر جانے کی وجہ سے اُس کا عشق سرد ہو چکا تھا اور شاید وہ ڈرتا تھا کہ مدن سینا کا پتی دوسرے دن راجہ سے اُس کی شکایت نہ کر دے۔ لیکن ڈاکو، وہ بے اصول، بدمعاش، اندھیارے کا باسی، وہ سچ مچ فیاض اور فراخدل تھا کہ اُس نے ایسی خوبصورت عورت کو جواہرات سمیت چلے جانے دیا۔"

معلوم نہیں ویتال اب کہاں ہے۔ اور کس حال میں ہے۔ کشمیر کے کسی پہاڑ پر جہاں ناگر سے اس کی ملاقات ہوئی تھی، کوئی اور پہیلی لکھ رہا ہے یا شہروں اور دیہاتوں میں آوارہ پھر رہا ہے۔ ممکن ہے وہ کبھی شملہ گرام بھی گیا ہو۔ اور اُس نے مدن سینا کے اصولوں کو اہنسا اور ستیہ گرہ کے لقب سے سیاست پر چسپاں ہوتے دیکھا ہو۔ یہ صدیوں کا تانا بانا۔ سچائی کا تقاضا تو یہی ہے کہ غنیم حملہ کرنا چاہتا ہے تو گھر کے دروازے کھول دو۔ بھارت ماتا کی عصمت اور عزت کو ہاتھ لگائے بغیر وہ الٹے قدم واپس ہو جائے گا۔ اس کا کیا علاج کہ فاشسٹ شہنشاہیاں دھرم دت اور ڈاکو اتنی شریف بھی نہیں۔

اور معلوم نہیں ویتال بابو کو پتہ ہے یا نہیں کہ مدن سینا کی اولاد چار دانگ عالم میں پھیل چکی ہے۔ اُس کی اور سمدردت کی اولاد کا اثر یونان میں راجکماری تھود حماتساری کے فیصلوں پر بھی ہوا۔ بہار دانش، طوطی نامہ، داستان چہل وزیر اور معلوم نہیں کہاں کہاں پھرتے ہوئے اُس کے پوتے پڑپوتوں نے سنا ہے کہ گرین لینڈ جانے والے وائکنگ سیاحوں میں گھر کر اس نے چپستان کی پہاڑیوں کی بھی سیر کی۔ اسی خاندان کی ایک شاخ نے سائبیریا کے برفستانوں میں قیام کیا جہاں سے انہیں گذشتہ جنگ عظیم کے بعد نکال دیا گیا۔

(۲)

لیکن مہاراج تری وی کرم سینا نے اپنے قول فیصل میں یہ کیوں کہا تھا کہ جب کسی پتنی اور کسی اور مرد میں کسی قسم کا بندھن ہو تو کوئی شریف پتی اُسے کیسے

بدل سکتا ہے۔

کیا یہ جرم ہے جتا بخلاف سلسلہ اٹھ یا اس کہیں لانس تک پہنچتا ہے۔ ڈیوی دسلینگ حسبا بری آداب عشق میں اس کی تفسیر ملتی ہے۔ جب ملکہ اور خواتین ایک دربار عشق یا عدالت عشق ترتیب دیتی تھیں، جس میں عاشقوں کی بے وفائی اور معشوقاؤں کی جفا پر استغاثے ہوتے تھے۔ اور احکامات اور سزائیں دی جاتی تھیں۔

ایک خاتون الف کو مدن سینا کی طرح اپنے پتی ہی سے محبت تھی۔ یہ اور بات تھی کہ اس جاہلیت کے زمانے میں خاوند خداوند نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ نائٹ اپنی زندگی اور اپنی خدمت کو مذہب اور خواتین کی خدمت کے لئے یکساں وقف رکھتے تھے۔ بہرکیف اس خاتون الف پر دھرم دت کی طرح ایک مرد شریف کاؤنٹ بی عاشق تھا۔ عاشق اور معشوقہ کی بحث وحجت کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو دونوں حریفوں نے میری ملکہ شامپین سے فیصلہ چاہا اور اُس نے کئی خواتین کے مشورے سے یہ فیصلہ صادر کیا۔

"ہم اعلان کرتے ہیں اور ہم اسے امر طے شدہ سمجھتے ہیں کہ عشق ایسے دو افراد کے درمیان اپنی طاقتوں کا اثر نہیں ڈال سکتا جو ایک دوسرے سے منکوح ہوں۔ کیونکہ عشاق ایک دوسرے کو ہر چیز آزادی سے دیتے ہیں کسی جبر یا مجبوری سے نہیں۔ لیکن شادی شدہ جوڑے میں فریقین مجبور ہیں کہ بطور فرض ایک دوسرے کی خواہشیں پوری کریں۔ اور ایک دوسرے سے امر میں انکار نہ کریں . . . . ."

اس فیصلہ کی تاریخ یکم مئی ۱۱۷۴ء ہے۔

اس کے آٹھ یا نو سال بعد اس فیصلہ پر دو یہودیوں کارل مارکس اور اینگلز نے نظر ثانی کی۔ اُن کا فیصلہ یہ ہے:۔

"ہمارے بورژوا اپنے مزدوروں کی بیویوں اور بیٹیوں ہی پر اکتفا نہیں کرتے رنڈیوں کا تذکرہ ہی کیا، انہیں ایک دوسرے کی بیویوں کو پھسلانے میں انتہائی لطف آتا ہے۔"

(۴)

مجھ جیسے راوی پر کون اعتبار کرے گا ـــــ اور یوں بھی ہندوستانی مؤرخ ان کو کون سند کے قابل سمجھتا ہے ـــــ لیکن میرے خیال میں سمدروت اور مدن سینا کی اولاد اس طرح ولایت پہنچی ہوگی کہ جب شام اور مصر کی فتح کے بعد خسرو پرویز

قسطنطنیہ پر ایک طرف سے حملہ آور تھا اور اس کا حلیف وحشی اور قوم کا آقا (خاقان) یورپی جانب سے۔ اُس وقت خسرو پرویز کو صلح کے لئے جو تاوان جنگ بازنطینی قیصر نے پیش کیا۔ وہ ایک ہزار طلائی مہروں، ایک ہزار نقرئی مہروں، ایک ہزار ریشمی عباؤں، ایک ہزار گھوڑوں اور ایک ہزار کنواری لڑکیوں پر مشتمل تھا۔

ان ایک ہزار کنواریوں میں سیرا یا شیریں شامل نہیں تھی۔ مشرقی افسانہ نگاروں کے برخلاف مغربی مؤرخوں کو اس سے اتفاق نہیں کہ یہ سیرا یا شیریں بازنطینی قیصر موریس کی بیٹی تھی۔ لیکن وہ یہ ضرور مانتے ہیں کہ سیرا یا شیریں کسی مشہور اعلیٰ رومی گھرانے کی چشم و چراغ تھی۔ جس طرح اُس کے رومی نام سیرا کو بگاڑ کر ایرانی افسانہ نگاروں نے اُسے شیریں بنا دیا ـــــ اس لفظ میں ایرانی تصور حسن کی رُوح پنہاں ہے ـــــ اُسی طرح اُس کے شوہر شہنشاہ کو اُس کی زندگی ہی میں پرویز کا لقب ملا۔ جو ظاہر کرتا ہے کہ اُس کے مواضع حُسن میں ستاروں کی سی چمک بھری تھی۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ خسرو پرویز کو اپنی ملکہ شیریں سے جس قدر عشق تھا، ملکہ اُسی والہانہ عشق سے اُس کا جواب نہ دے سکتی تھی۔ اب مدن سینا، دھرم دت اور سمدروت کے مثلث نے یہ شکل اختیار کی۔

مدن سینا	شیریں
سمدروت	خسرو پرویز
دھرم دت	فرہاد

فرق اتنا تھا کہ مدن سینا کو اپنے شوہر ہی سے محبت تھی۔ لیکن شیریں کا دل اپنے حسین شوہر شہنشاہ کا نہیں۔ ایک کمین دکمتر مزدور کا غلام ہو چکا تھا یہاں تیشہ اور جوئے شیر اور کوہ کنی کا قصہ دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن مدن سینا کی طرح شیریں نے بھی وصل کا وعدہ کیا تھا سمدروت کی طرح خسرو پرویز نے اس وعدے کی توثیق کی بہ صد اپنے وعدے پر اس لئے قائم رہا کہ اُس وقت عورت خانگی جائیداد نہیں بننے پائی تھی۔ لیکن شیریں اور فرہاد دونوں ایرانی شاہان شاہ کی رعایا اور اس کی ملکیت تھے۔ یہ اور بات تھی کہ وہ شیریں کے جسم کا مالک تھا۔ اُس کے دل کا مالک نہ بن سکا۔ لیکن اُس نے سمدروت کے برخلاف وعدہ پیمانہ ہونے دیا۔ "گرسنہ مزدور طرب گاہِ رقیب" نے کم ظرفی سے اپنی جان دے دی۔ شیریں کا دل اور زیادہ ٹوٹ گیا۔ خسرو پرویز کو اس وعدہ شکنی اور کامل فتح کے بعد اتنی بھی مسرت

اور اتنا بھی اطمینان نصیب نہ ہو سکا جتنا عربی صوبوں کی فتح کے بعد۔ اس نے اُن ہزار بازنطینی کنواریوں سے معلوم نہیں کس طرح دل بہلایا۔ اور دل بہلا بھی رہا تھا کہ اسکندرون کی خلیج پر ہرقلیس اعظم کی فوجیں اتریں ـــــ رُومی شہنشاہ کے پیشرو نے شیریں اور ایک ہزار کنواریوں کو ایرانی کے سپرد کیا تھا۔ ہرقلیس نے تُرک خاں کو اپنی خوبصورت بیٹی بھینٹ چڑھانے کا وعدہ کیا۔ دست گِرد کے قلعہ میں اپنی بے شمار خواصوں اور عورتوں کو جن کی تعداد تین ہزار تھی ـــــ چھوڑ کر خسرو پرویز بھاگ نکلا اور پھر ایک تاریک بُرج میں اُس کے ساتھ اُس کے انسانیت ناشناس بیٹے نے وہی سلوک کیا جو اکثر تاریخ میں ہوتا آیا ہے۔ ہرقلیس ممکن ہے کہ اُن ہزار رومی لڑکیوں کو چھڑا لایا ہو۔ جو اب کنواریاں نہ رہی تھیں ممکن ہے جب بازنطینی شہنشاہ زیتون کی شاخوں، اور بے شمار چراغوں میں گھرا ہوا قسطنطنیہ واپس ہوا تو اُس کے جلوس میں ہزارہا ایرانی دوشیزائیں ہوں ممکن ہے اس سلسلے میں ایران کے پڑوسی راج اننگ پورہ کے تاجروں کی بیٹیاں بھی ہوں اور اس طرح مدن سینا کی اولاد قسطنطنیہ پہنچی ہو۔

جب بازنطینی شہنشاہ ہرقلیس قسطنطنیہ میں ایران سے مصر و شام کے صوبوں کو واپس چھین لینے کی خوشیاں منا رہا تھا تو شام کے ایک گمنام گاؤں پر عرب کے ایک غیر معروف شہر مدینہ کے باشندوں سے اُس کے فوجیوں کی کچھ جھڑپیں ہوئیں۔ اس واقعہ کو ہرقلیس نے اس وقت اتنی ہی اہمیت دی جتنی اُس نے اور ایرانی شاہان شاہ نے عربی پیغمبر کی چٹھیوں کو دی تھی۔

لیکن بہت جلد نخلستان کی فوجیں مرو سے لے کر مصر تک چھا گئیں جو صوبے ہرقلیس نے ایرانیوں سے واپس چھینے تھے۔ عربوں نے فتح کر لئے۔ یہاں تک کہ حضرت ابوایوب انصاری کے پرچم کو صرف یونانی آتش روک سکی۔ اور یونانی آتش کے زیر سایہ مدن سینا کی اولاد قسطنطنیہ میں پروان چڑھی اور یہاں سے بسلسلۂ تجارت بڑھتی ہوئی مغربی یورپ تک پہنچی جنوبی فرانس میں اس نے مائی سے اثبات کو باقی رکھا۔ لاطینی مصنفوں سے اس کا حال لوکا پیوا اور چاسر نے سنا۔

لیکن جس طرح دیتال نے مہاراج تری وی کرم سینا سے پوچھا تھا میں آپ سے پوچھتا ہوں: سب سے زیادہ کم ظرف کون تھا، خسرو پرویز؟ یا شیرُو؟ یا نسرہاد؟

چاسر کے فرینکلن یعنی چودھویں صدی عیسوی کے اہلِ زمیندار نے جو غلام تو نہ تھا مگر عالی خاندان اور شریف النسل بھی نہ ہوتا تھا۔ کچھ اس قسم کا قصہ بیان کیا۔

آرموریکا میں جس کو بری طینی بھی کہتے ہیں۔ مدن سینا کی اولاد میں ایک خاتون تھی جس کا نام ڈوری گن تھا۔ اسی ملک میں ایک نائٹ بھی تھا ملک کے شریف ترین طبقے کا نمائندہ۔ اس کا نام آروے راگس تھا۔ اُسے اس خاتون سے عشق تھا اور وہ بیحد زحمت اُٹھاتا اور کوشاں رہتا۔ کہ بہترین طریقے پر اس خاتون کی خدمت کر سکے۔ اپنی خاتون کو خوش کرنے کے لئے اُس نے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیئے، بڑی بڑی مہمیں سر کیں۔ تب کہیں جا کر وہ ڈوری گن کو جیت سکا۔ بالآخر اس کی قابلیت و شہامت کو اس خاتون نے اپنے شایانِ شان پایا۔ خاص طور پر اُس کے عجز اور اُس کی تابعداری کی وجہ سے اُس کی خدمت اور اس کی درخواست پر اُس نے ایسا ترحم کا جذبہ محسوس کیا کہ اُس نے اُسے اپنا شوہر اور اپنا آقا بنایا۔ آروے راگس نے خود اپنی مرضی سے یہ قسم کھائی کہ وہ ایک نائٹ کی طرح اپنی خاتون کی خواہش کے خلاف کبھی اپنا حکم چلانے کی کوشش نہ کرے گا۔ کبھی رشک و حسد کا اظہار نہ کرے گا۔ ہمیشہ اُس کی اطاعت کرے گا۔ ہر بات میں اُس کی مرضی کا پابند رہے گا۔ بالکل اُسی طرح جیسے کوئی عاشق اپنی معشوقہ کی مرضی کا پابند ہوتا ہے۔

ڈوری گن نے بڑے انکسار سے اُس کا شکریہ ادا کیا: "جناب جس طرح مجھے آپ نے اپنی مردانہ شرافت سے اس قدر حکومت بخشی ہے۔ اُسی طرح میں بھی اس کا وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کی خادمہ اور سچی بیوی رہوں گی۔ اس کا میں آپ سے پکا عہد کرتی ہوں"۔

دوست اور عشاق ایک دوسرے کی تابعداری کرتے ہیں۔ محبت ایک فریق کے استبداد اور دوسرے کی غلامی کو برداشت نہیں کر سکتی۔ جب استبداد آتا ہے تو عشق کا دیوتا اپنے پر پھڑپھڑاتا ہے اور یہ جا، وہ جا، رخصت۔ ہر چیز کی طرح محبت کی روح بھی آزاد ہے۔ فطرتاً عورتیں بھی غلامی نہیں، آزادی چاہتی ہیں ـــــ (اقبال نے زمرد کے گلوبند کی ایک ہی کہی) ـــــ اور مرد بھی۔

یہ معاہدہ سیدھا سادہ مگر کتنا عاقلانہ تھا۔ خاتون کو اپنا شوہر کیا ملا بیک وقت آقا بھی ملا اور خادم بھی۔ محبت میں غلام اور عشق میں آقا۔ نائٹ کو آقائی بھی ملی اور خدمت بھی۔ خدمت؟ نہیں اس سے زیادہ تو آقائی ہی کیونکہ اُسے بیوی بھی ملی اور محبوبہ بھی۔

کامیاب نہ ہوا اس کا انجام چینل ہوائٹ کا فرض تھا۔ اس فرض کا انجام دینے آرے لیس
انگلستان کے کنبھے میں گیا جسے برطانیہ بھی کہتے ہیں کتاب کہتی ہے کہ یہاں اُسے دو سال لگ گئے
اس درمیان میں اُس کی بیوی ڈوری گن اُسے اپنے دل کی زندگی کی طرح چاہتی رہی اُس
کے فراق میں دن کو آہیں بھرتی، تڑپتی، راتوں کو جاگتی نالہ و زاری کرتی فاقے کھینچتی۔
آنسو ٹپکتے کبھی کبھی آتے کبھی وہ بریطینی کے ساحل پر کھڑی ہو کے اُس کے
جہاز کا انتظار کرتی اور چٹانوں کو دیکھ دیکھ کر ہول کھاتی اس ڈر سے دعائیں مانگتی کہ کہیں اُس
کے شوہر اُس کے محبوب کا جہاز بھی اِن چٹانوں سے ٹکرا کے پاش پاش نہ ہو جائے۔ خدایا تو دیکھتا
ہی ہے کہ کتنے انسانوں کو یہ چٹانیں غارت کرتی ہیں لاکھوں انسانوں کی جانیں اِن چٹانوں نے چھینی ہیں
کیا ایسے انسانوں کا جیتے رہنا ضروری ہے جو تیری صنعتوں میں تیرے شاہکار سمجھے جاتے ہیں جنہیں تو نے اپنی شبیہ
مطابق بنایا ہے ــــــ بہت کم وہ خوش ہوتی یا ہنستی بولتی مگر منی کی چھ تاریخ کو اپنی سہیلیوں کے جبر
سے وہ ایک ناچ میں گئی۔ اس ناچ میں ڈوری گن کے ساتھ ایک اسکوائر ناچ رہا تھا ــــــ اسکوائر
یعنی قرون وسطیٰ کا بڑا زمیندار، لیکن کسی نائٹ کا محض ہمراہی یا اردلی اور اُس کی خاتون کی متابعت
کرنے والا ایسا ہمرکاب یا ملتفت ــــــ تازگی اور آراستگی میں شمالی یورپ کے مئی کے مہینہ کا جیسا۔ اس کا
نام آرے لیس تھا۔ ناچنے اور گیت گانے میں عدیم المثال تھا۔ نوجوان تھا مضبوط تھا صالح تھا
امیر تھا اور عقلمند تھا۔ لوگ اُسے پسند کرتے تھے اور اُس کی قدر
کرتے۔ اس زندہ دل اسکوائر کو دنیا میں سب سے زیادہ ڈوری گن سے محبت
تھی۔ اس حال میں اُسے دو سال سے زیادہ ہو گئے تھے لیکن اُس نے اپنا
دردِ دل کسی سے نہ کہا تھا۔ نا اُمیدی اُس پر غالب تھی۔ زبان سے کچھ کہہ نہیں
سکتا تھا ــــــ صرف اپنے گیتوں میں وہ اپنے دل کا دُکھ کچھ نہ کچھ نچوڑ لیتا۔ عام
انداز میں واسوخت لکھتا۔ یہ بتاتا کہ وہ عشق میں گرفتار ہے اور کوئی اُسے نہیں
چاہتا۔ گیتیں، نغمے، نظمیں، واسوختیں لکھتا، اور بتاتا کہ وہ اپنے غم کا اظہار
نہیں کر سکتا مگر وہ اس طرح عذاب بھگت رہا ہے جیسے دوزخ میں کوئی خبیث
روح صدائے بازگشت کی طرح اُس کی قسمت میں بھی موت لکھی ہے۔

لیکن اس ناچ کے موقعہ پر اُس نے ہمت کر کے ڈوری گن سے حال
دل کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ میری ساری خدمت بیکار ہے۔ میرا دل پارہ پارہ
ہو رہا ہے۔ خاتون میرے رنج اور درد پر رحم کیجئے۔ کیونکہ آپ کا ایک لفظ
مجھے جلا یا مار سکتا ہے۔"

وہ آرے لیس کی طرف دیکھنے لگی۔ "اس سے پہلے میں نہیں سمجھ
سکی تھی کہ تمہارا مطلب کیا ہے لیکن آرے لیس اب میں تمہاری خواہش کو
سمجھ گئی۔ اُس خدا کی قسم جس نے مجھے روح اور جان دی میں کبھی اور کی
بیوی ہوتے ہوئے میں بیوفائی نہیں کر سکتی۔" پھر اُس نے مذاق میں کہا۔ "آرے
لیس، اُس خدائے بلند و برتر کی قسم جو اوپر ہے چونکہ میں دیکھتی ہوں کہ تم اس
قدر گڑگڑا کر التجا کر رہے ہو۔ اس لئے سنو کہ اُسی دن میں تمہاری معشوقہ ہونگی۔
جس دن بریطینی کے ساحل کی یہ دیو ہیکل چٹانیں جن سے ٹکرا ٹکرا کے جہاز
اور کشتیاں پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ ساحل سے ہٹ جائیں گی۔ ایک ایک
پتھر ہٹ جائے گا۔ اُس دن میں وعدہ کرتی ہوں میں تمہاری معشوقہ بنوں گی۔"

اس سے زیادہ ناممکن اور کیا چیز ہو سکتی۔ فرہاد کو پہاڑ کاٹنے کی جو شرط
پیش کی گئی تھی۔ اُسے انسان کی محنت پورا تو کر سکتی تھی۔ وہی شرط یہاں پیش کی
گئی لیکن وہ اگر کٹھن تھی تو یہ ناممکن۔

آرے لیس اپنے گھر واپس گیا۔ اُسے یقین آگیا کہ اب موت سے بچنا
مشکل ہے۔ اپنے دل کو اُس نے سرد ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ سورج کے دیوتا
سے اُس نے گڑگڑا گڑگڑا کر دعا مانگی کہ کسی معجزے کے ذریعے یہ چٹانیں ہٹ
جائیں۔ دعائیں پوری نہ ہوئیں اور ڈوری گن کا شوہر گھر واپس آگیا۔ اپنے
نوجوان اور شریف و باعزت نائٹ کو دوبارہ پا کے وہ پھولے نہ سماتی تھی۔

جادو اور طلسمات، انسان عاقل کی عقل سے زیادہ پرانے ہیں
شاید مشرق میں چل نکلے، پھر مغرب میں کچھ ایسے مقبول ہوئے کہ جون آف
آرک کی جان اس الزام میں گئی اور اس الزام میں اٹھارویں صدی میں کیسانووا
کو ایسی سخت قید بھگتنی پڑی کہ اس سے اُس کا نکل بھاگنا، انسان کی قوتِ ارادی
اور اُس کے جذبۂ آزادی کا معجزہ ہے۔ کسی لاطینی مصنف کے دماغ نے جو مشرقی
داستانوں سے سرشار تھے۔ من سینا کے ڈاکو کو جرائنگ پرہ کی ایک سڑک
پر پڑے کے پیچھے چھپ کے راہگیروں کو لوٹا کرتا تھا۔ ایک جادوگر راہب بنا دیا
یہ راہب جو جادوگر بھی تھا، اور فلسفی بھی، آرے لیس اور اُس کے بھائی کو مشرقی
طلسمات کے تماشے دکھلانے لگا۔ جیسے کٹھ پتلی کا کھیل۔ بازوں سے چھوٹے
چھوٹے پرندوں کا شکار، شکاری کتوں سے ہرنوں کی ڈاروں کی ڈاروں کا
شکار۔ اور اُس نے اپنی شعبدہ کاری سے آرے لیس کو ڈوری گن کے ساتھ
خود اپنے آپ کو ناچتا دکھایا۔ اور بالآخر ایک ہزار پونڈ کے معاوضے میں اُس
نے بریطینی کی ساری چٹانیں غائب کرنے کا ذمہ لیا۔

اور قرونِ وسطیٰ میں جادو کا جو زور تھا۔ اُس زور سے چٹانیں غائب ہو

گئیں۔ لب جوئیں نرم نرم خراماں خراماں پھیلتی پھیلتی بری طینی کے ساحل تک آجاتیں۔ پہاڑوں سے سر ٹکراتیں، چٹانوں سے پٹک کر بھاگ نہ نکلتیں۔

جادوگر نے وہی کام کر دکھایا جو فرہاد جیسے پتھر پھوڑنے والے کے تیشے نے کیا تھا۔

آرتے لیس نے ڈوری گن کو اُس کا وعدہ یاد دلایا۔ اپنے دردِ عشق کا ذکر کیا۔ اُسے سمجھایا کہ اب بھی وہ اپنا وعدہ پورا نہ کرے تو وہ اُس کی بیگناہ موت کی ذمہ دار ہوگی۔ اپنے باغ کو اُس نے ملنے کا مقام تجویز کیا۔

وہ رخصت ہوگیا، تو وہ حیران کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اُس کے چہرے پر خون کے ایک قطرے کے آثار بھی نہ تھے۔ ایک دو روز روتی آہ و زاری کرتی رہی۔ اس طرح غش کھا کھا جاتی کہ دیکھنے والوں کو دکھ ہوتا۔ لیکن کسی سے اُس نے کہا نہیں کہ اُس کی حالت غیر کیوں ہے۔ کیونکہ اُس کا شوہر دو تین دن کے لئے باہر گیا ہوا تھا۔ اکیلے میں وہ قسمت کا گلہ کرتی جس نے اُس کے لئے یہ جال پھیلایا تھا جس سے نکلنے کا موت یا بے عزتی کے سوا اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ پھر بھی وہ سمجھتی کہ جسم کی بے حرمتی سے تو موت ہی اچھی ہے۔ اس سے پہلے بھی تو شریف بیویوں اور کنواریوں نے اپنے جسم کو پامالی سے بچانے کے لئے اپنی جانیں لے لی ہیں۔

ایک دو روز وہ یہی سوچتی رہی یہاں تک کہ اُس کا قابل عزت نائٹ آرتے راگس گھر واپس آیا اور اسے زار زار روتے دیکھ کے اس کا سبب پوچھا، تو وہ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بالآخر اُس نے آرتے لیس سے اپنی شرط کا ذکر کیا۔ جس کا پورا ہونا ناممکن تھا۔ مگر جو پوری ہوگئی اور اپنے وعدے کا ذکر کیا۔

اس کے شوہر نے اپنے چہرے کو بشاش بنا کے دوستانہ الفاظ میں اُسے سمجھایا "کہ قول پورا کرنے سے بڑھ کے انسان کا کوئی اور فرض نہیں" پھر وہ بھی بے اختیار رونے لگا اور اُس نے کہا اور کسی سے اس واقعہ کا ذکر نہ کرنا تاکہ میں اس طرح اپنا رنج برداشت کرسکوں اور تم بھی اپنے چہرے سے تکدر ظاہر نہ ہونے دینا۔ تاکہ لوگ اس کا سبب نہ تاڑ جائیں"۔ پھر اُس نے اپنے ایک اسکوائر اور ایک خادمہ کو حکم دیا۔ کہ ڈوری گن کو فلاں مقام پر پہنچا آئیں۔

بازار ہی میں آرتے لیس ملا اور ڈوری گن سے پوچھا کہ کہاں جا رہی ہے۔ اُس نے جواب دیا "افسوس۔ تمہارے باغ کو، جہاں تم نے بلایا تھا اور جہاں اپنا وعدہ پورا کرنے کے لئے جانے کا میرے شوہر نے حکم دیا ہے"۔

اس واقعہ پر آرتے لیس کو سخت حیرت ہوئی اور اُسے بڑا ترس آیا — اُس پر بھی کیونکہ وہ اس طرح گریہ وزاری کر رہی تھی۔ اور قابل عزت نائٹ آرتے راگس پر بھی جس نے اُسے اپنا وعدہ پورا کرنے کے لئے کہا تھا۔ تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد اُس نے فیصلہ کیا کہ اپنی ہوس پر قائم رہنا بڑی کمینگی ہوگی۔ فیاضی اور شرافت کے خلاف بڑا سخت جرم ہوگا۔ اس نے اُس خاتون کو اُس کا ہارا ہوا قول معاف کر دیا۔ اور کہا "اسکوائر نائٹ کا ادنیٰ بھی شرافت کا فرض اُسی طرح بے جھجک ادا کرسکتا ہے جیسے کوئی نائٹ"۔

جادوگر راہب کو اُس نے پانچ سو پونڈ لے جاکے دیئے۔ اور باقی رقم کے لئے مہلت مانگی۔ جادوگر کے پوچھنے پر آرتے لیس نے کہا کہ اُس کی محبوبہ اُس کے باغ تک آئی مگر اُس کی نہ ہوئی۔ آرتے راگس نے اپنی شرافت سے گوارا کر لیا۔ کہ خواہ صدمہ اور کوفت سے اُسے موت ہی کیوں نہ آئے وہ اپنی بیوی کو بدعہدی کا مرتکب نہیں ہونے دیگا۔ اور جب اس نے خود ڈوری گن کو اس قدر مغموم دیکھا تو اُس نے اُسے بغیر چھوئے ہوئے باغ سے واپس جانے کی اجازت دی۔

جادوگر راہب نے اُسے ہزار پونڈ معاف کر دیئے۔ اور کہا ایک راہب بھی تم لوگوں کی طرح شرافت کے کام کرسکتا ہے۔

چاسر کے فرینکلن نے دیتال کی طرح پوچھا "آقاؤ قبل اس کے کہ ہم آگے بڑھیں، بتاؤ ان میں سب سے زیادہ شریف اور فیاض کون تھا؟" اس قسم کے سوال قرون وسطیٰ میں اکثر پوچھے جاتے تھے۔ اور سوالاتِ عشق کہلاتے تھے۔

کلاس میں ایک لڑکی نے اُٹھ کے پروفیسر کو جواب دیا "میرے خیال میں ڈوری گن سب سے زیادہ فیاض تھی۔ وہ خودکشی کرسکتی تھی، لیکن اس طرح اُس کا وعدہ پورا نہ ہوتا"۔

سب ہنسنے لگے۔

(۴)

جس شب دلگیر پیلس میں ہسپانیہ کے مظلومین کی امداد کے لئے ناچ اور تفریح کا جلسہ تھا۔ اُس شام کو پانی زور سے برس رہا تھا۔ مالا بار ہل کی

سڑکیں ڈھلوانوں پر موٹر کے ٹائروں کو پھسلا پھسلا کے گویا نیچے گرا رہی تھیں رگھبیر پیلیس سے کوئی ایک فرلانگ اِدھر اُدھر موٹروں کا ایسا ہجوم تھا کہ راستہ ملنا ہی مشکل تھا۔ مجبوراً سر سمدر نے اپنے شوفر سے کہا:" اگر گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی تو ہم یہیں اُتر جاتے ہیں۔ کیوں ڈارلنگ۔"

جواں سال لیڈی سمدر نے بے بسی سے اپنی سفید ساڑھی اور اس کے کامدانی کام اور نفیس فارسی بورڈر کی طرف دیکھا۔ یہاں سے رگھبیر پیلیس تک فرلانگ بھر کا فاصلہ طے کرنے میں سر سمدر کے شارک اسکن کے جاکٹ پر اگر کوئی دھبہ آ جائے تو کوئی خیال بھی نہ کرے گا، لیکن اس ساڑی پر سوئی کی نوک کے برابر بھی کوئی داغ لگ جائے۔ تو اُس کی شام کرکری ہو جائیگی۔

" میں سمجھتی ہوں اُترنا ہی پڑے گا۔ اس طرح تو گھنٹہ بھر سے پہلے راستہ نہیں ملے گا۔"

ڈرائیور نے بڑی مشکل سے اس قدر دروازہ کھولنے میں کامیابی حاصل کی کہ چندرما ـــ یہ لیڈی سمدر کا نام تھا ـــ بمشکل اپنی ساڑی کو اپنے جسم سے لپٹا کے اُتر سکی۔ اور پھر موٹروں کی بھیڑ میں آدمیوں اور ڈگارڈوں سے دامن بچاتی ہوئی اپنے شوہر کے ساتھ وہ رگھبیر پیلیس کے پورٹی کو تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔ پورٹیکو ہی میں مسز سنگھ کھڑی تھی۔

وہ مسکرا کے اِن دونوں کی طرف بڑھی " شام بخیر چندرا۔ آپ اچھے تو ہیں سر سمدر۔ آپ کو کہاں اُترنا پڑا ـــ ایک فرلانگ ـــ ہاہا" اس کا موٹا جسم، سر کے مصنوعی گھنگھریالے بال، نچلا چوڑا ہونٹ؛ اور اور نگ آبادی ہمرو کا کوٹ" سب اسی ہنسی میں لہرائے۔" چندرا ڈارلنگ وشواش نگر کے تینوں راجکمار اس میز پر ہیں ـ تینوں جابیر، رگھبیر اور رگھوبیر۔ تینوں تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ خصوصاً رگھوبیر . . . اوہ ڈارلنگ جب سے اس نے تمہاری تصویر "آن لُکر" میں دیکھی ہے ـــ وہی جو ڈنکن نے کھینچی تھی۔ تب سے تمہارے متعلق بحران میں مبتلا ہے۔ قطعی طور پر بحران میں . . . اور آج تم بالکل جادو کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہو۔ ساحرہ سی ـــ کیوں سر سمدر . ڈارلنگ مجھ پر فرض ہے کہ تمہیں ان سب سے ملاؤں۔ اس طرف سر سمدر۔"

مسز نوشیرواں افراسیاب سے باتیں کرتے مڑ کر سر سمدر نے مسز سنگھ سے کہا:" ابھی ایک منٹ میں مسز سنگھ۔ آپ لوگ جائیں میں ابھی وہاں آتا ہوں۔"

مسز نوشیرواں نے ایک نوجوان یوروپین عورت کو دیکھ کر سلام کے لئے سر خم کیا۔ اُس کے ساتھ ایک گہرے سانولے رنگ کا ہندوستانی نوجوان تھا

"کون ہیں؟" سر سمدر نے پوچھا۔

" مسٹر اور مسز وحید امجد" مسز نوشیرواں نے اس گذرتے ہوئے جوڑے کا غائبانہ تعارف کراتے ہوئے کہا۔ یہ عورت آسٹرین ہے . . . . کئی رجواڑوں میں پیانو بجانے کی تعلیم دے چکی ہے۔ اپنے شوہر کی تقدیر اس کی بنائی ہوئی ہے۔ اُس کا تشہیر و اشتہار کا کاروبار ہے اور اب یہ حالت ہے کہ میرین ڈرائیو میں دو سو روپے کے فلیٹ میں رہتا ہے۔ شادی سے پہلے مجھ سے ڈیڑھ سو کی نوکری مانگنے آیا تھا۔ . . . لیکن سمدر۔ کچھ پیو گے نہیں؟" اُس نے سمدر کا بازو پکڑ کے کہا:" آج دو بار ہیں۔ ایک اوپر اور ایک قطب شمالی والے کمرے میں۔ اور یہ قطب شمالی وغیرہ کمرہ دیکھنے کے قابل ہے۔ چلو۔"

اس برآمدے کے بعد ایک اور بڑا نیم برآمدہ سا تھا جس میں کہیں میک کا ناچ آرکسٹرا ٹانگو بجا رہا تھا اور کوئی چار سو جوڑے ناچ رہے تھے۔ روشنی اور ہسپانوی موسیقی کے سیلاب میں طرح طرح کے ہندوستانی اور یورپی زنانے لباس، کالے یا نیم سفید پوش مردوں کے ساتھ گھوم رہے تھے۔ گویا روشنی موسیقی کی صوتی حرکت اور انسانی جسم اور جنسوں کی کشش کی حرکت سب ایک زندگی کی مرکب حرکت میں ضم ہو رہی تھیں۔ میزوں کے درمیان سے جان پہچان والوں کو سر کے اشارے یا تبسم سے سلام کرتے یا جواب دیتے۔ کسی کسی میز پر ایک آدھ منٹ کے لئے ٹھہر کر کوئی بات کرتے ہوئے وہ بائیں طرف کے دروازے میں مڑے اور اس مشہور "قطب شمالی" والے کمرے میں پہنچے۔ جہاں ایرکنڈیشننگ کے ذریعہ اس قدر سردی کا انتظام کیا گیا تھا کہ رقص کے سانسوں اور موسیقی سے گرم کمرے سے نکل کے یہاں داخل ہونے پر یقیناً سردی معلوم ہوتی تھی۔ کمرے کی دیواروں پر اور دیواروں کے ساتھ ساتھ، اور فرش پر روئی کے گالوں اور سفید کاغذ کی کترن سے برف کی طرح طرح کی شکلیں تھیں، برفانی پہاڑ برفانی ٹیلے جما ہوا برف۔ برف کے جزیرے۔ ایک طرف ایک وھیل نما صوفا تھا۔ ایک طرف قطب شمالی کے ریچھ کی شکل کی ایک کرسی تھی۔ ایک اسکیمو خیمے کے نیچے شراب کی بوتلیں اور گلاس، طرح طرح کے مرکبات، طرح طرح کے جام تھے اور دو انگریز لڑکیاں اسکیمو کپڑے پہنے ساقی گری کر رہی تھیں۔" جون۔ میرے لئے

ایک گملٹ اور تم سمدر۔

"گملٹ" سر سمدر نے اختصار سے جواب دیا۔ "شکریہ۔"

کھلے ہوئے دروازے سے سر سمدر نے راجکماری کی میز کی طرف دیکھا۔ تین نیم ڈراویدی راجکمار۔ تینوں کا رنگ کالا سا، بال گھنگھریالے، تینوں ٹیل کوٹ پہنے۔ تینوں انگلستان کے پبلک اسکولوں کے پڑھے ہوئے ایٹن اور ہیرو اور پھر آکسفورڈ۔ ساتھ ہی ایک امریکن لکھ پتی، ہندوستان میں ایک امریکی موٹر کمپنی کا جنرل ڈائریکٹر اور ہوائی فوج کا ایک انگریز گروپ کیپٹن۔ بیرے کا ایک گروہ۔ اور کئی ... پارسی، مسلمان، ہندو میز پر وہسکی، سوڈے، برانڈی، جن، کاک ٹیل اور گملٹ کے گلاسوں کی شفاف چمک اور اس ہجوم میں گوروں کی سفید وردی کو اُس نے اُٹھتے دیکھا۔ میز کے دوسرے کنارے سے اُس کی اپنی بیوی چندرا ہنستی ہوئی اُٹھی۔ پھر وہ رقص کرنے والوں کے ہجوم میں رقص کے سیلاب میں غائب ہو گئے۔ اور سر سمدر نے اپنا گملٹ ختم کیا۔ محسوس کیا کہ اُس کے ادھیڑ اعصاب کو اس سے زیادہ تیز چیز کی ضرورت ہے۔ جوَن کی طرف مسکرا کر اُس نے کہا۔ "مس بریڈلے۔ ڈبل جن پلیز۔" جوَن نے پیسے لے کے ڈبل جن کا گلاس اُسے اور وہسکی سوڈا کا گلاس سر نوشیرواں کو دیا۔ قطب شمالی والے کمرے میں اُس سے چند قدم کے فاصلے پہ وصیل نرم صوفے پر مہاراجہ وشواس نگر شارک اسکن کا جیکٹ پہنے، بڑے انداز سے کاک ٹیل کا گلاس گھما گھما کے خورشید مقدس جی سے باتیں کر رہے تھے —— بوہرہ تاجر جو اپنے سسر کے سٹے کے روپیہ کی وجہ سے اب لکھ پتی بن گیا تھا۔ خان بہادر بن ہی چکا تھا۔ اور ابھی سے راجوں اور مہاراجوں سے اس طرح کندھے سے کندھا بھڑا کے ملنے کی کوشش کرتا تھا گویا وہ اُس کے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں۔ ریس کورس پر پانی کی طرح روپیہ خرچ کرتا۔ اُس کا اپنا اصطبل مہاراجہ مانڈو کے اصطبل سے کچھ کم نہیں تھا۔ اور اُس کا گھوڑا ذوالفقار دو سال سے برابر عرب ڈاربی جیت رہا تھا۔

سر نوشیرواں نے رازدارانہ انداز میں سر سمدر سے کہا۔ "اس بوڑھے کو دیکھو——"

"ہوں۔"

کھلے ہوئے دروازے سے پھر بوڑھے کو مزدور کی آغوش میں

ادھیڑ سر سمدر نے اپنی جوان بیوی کا جیتا جاگتا مسکراتا جسم دیکھا۔ موسیقی ختم ہوئی، دوبارہ شروع ہوئی۔ اب راجکمار رگھوبیر کے ساتھ اُس کی بیوی ناچنے کو اُٹھی۔ ٹم ٹم ٹن ٹن۔ من۔ من۔ ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔" قطب شمالی والے کمرے کے مصنوعی برفانی فرش پر سر سمدر کے پاؤں ... کا اندازہ کرنے لگے۔ بینڈ نے ایک جھرجھری لی، ہنسی، قہقہوں، ہم آغوش جسموں کی گفتگو کی رفتار، جن کے گلاس میں سما گئی۔ ایک انگریز لڑکی آرکسٹرا کے پاس کھڑی ہو کے ہسپانوی انداز میں، انگریزی لہجے کے ساتھ ایک ... "پوٹما" گانے لگی۔ رافائے لی جو" اور "جو" کا اور معلوم ہوتا تھا قیامت ... لائے گا۔

رگھوبیر کے جسم سے لپٹی ہوئی، آنکھوں سے آنکھیں بند ھی ہوئیں لیکن ٹانگیں —— متحرک اور جسم کے سارے ہیجان سے بے پروا اور بے تعلق —— مشین کی طرح، کوچ کرتی ہوئی فوجوں کی طرح، موسیقی کی پابندی کرتی ہوئی ٹانگیں اُلجھے بغیر، ذرا سی بھی غلطی کئے بغیر برابر رقص کر رہی تھیں۔ سر سمدر نے جلدی سے جن کا گلاس ختم کیا۔ مسکرا کے جوَن کا شکریہ ادا کیا۔ اور سر نوشیرواں سے پوچھا۔ "اوپر بھی ناچ ہو رہا ہے؟"

"ہاں مگر وہاں ذرا دوسرے درجے کے لوگ ہیں۔"

"تو بہت ہی دلچسپ ہوگا۔" سر سمدر نے کہا۔ اور اُس نے محسوس کیا کہ اگر وہ یہیں نیچے کے رقص کے کمرے میں ناچے گا۔ تو اُس کی بیوی کی آزادی میں خلل پڑے گا اور وہ پورا لطف نہ اُٹھا سکے گی۔

وہ سر نوشیرواں افراسیاب کو وہیں چھوڑ کے اپنے سیاہ پتلون کی جیب میں ایک ہاتھ ڈالے مسکراتا ہوا باہر نکلا۔ اُس کی بیوی چندرا رگھوبیر کے جسم سے دو انچ بھر دور ہٹ کے اُس کی طرف دیکھ کے مسکرائی۔ اس نے بھی مسکرا کے اُس کی مسکراہٹ کا جواب دیا۔ پھر باہر کے برآمدے کی بھیڑ سے ہوتا ہوا چوڑے چوبی زینے پر سیٹی بجاتا ہوا چڑھنے لگا۔

"دوسرے درجے" کے کچھ لوگ نیچے اُتر رہے تھے۔ ان دوسرے درجے میں مہاراجاؤں، اعلیٰ ترین حکام اور لکھ پتی کارخانوں کے مالکوں کے سوا سب ہی شامل تھے۔ جونیئر آئی۔ سی۔ ایس چھوٹے کارخانوں کے مالک، بڑے تاجر، فلم کمپنیوں کے ڈائریکٹر اور ہندوستانی پردۂ سیمیں کے درخشاں ستارے مہاراجاؤں کے کنٹرولر اور لے ڈی۔ سی۔ میجر اور اُن سے کم درجے کے

نرجی افسر

یورپ کا ناچ ہال بہت بڑا تھا اور کوئی ایک ہزار کے قریب لوگ اُس کے بے شمار ستونوں کے درمیان ناچ رہے تھے۔ چاروں طرف برآمدوں میں میزیں کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں اور سرمد واپس جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ مہاراجہ مانسرور کے ایک اے ڈی سی نے سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے اُسے دیکھ لیا۔ "ہلو مسٹر سرمد۔"

"اوہ۔ گڈ ایوننگ۔" سرمد نے جواب دیا۔ وہ اکثر مہاراجہ مانسرور کی پارٹیوں میں بلایا جا چکا تھا۔ "یہاں اُوپر تو تل رکھنے کی جگہ نہیں ہے۔"

"مسٹر سرمد اگر آپ جگہ تلاش کر رہے ہیں تو ہماری میز پر چلئے۔"

"ضرور شکریہ۔"

اِس اے ڈی سی کا نام آفریدی تھا۔ میز پر بمبئی کے ایک مشہور تاجر کا بیٹا اکرام بھائی۔ دو لڑکیوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آفریدی نے سرمد کا اُس سے اور دونوں لڑکیوں سے تعارف کرایا۔ ایک لڑکی کا نام اُس نے چھایا دیوی بتایا۔ یہ اینگلو انڈین تھی۔ لیکن بڑی ہی فیشن ایبل ساڑی پہنے۔ ایک زمانے میں فلمستان کی مشہور پری رہ چکی تھی۔ یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب ہندوستانی فلموں کی پریاں بالعموم اینگلو انڈین ہی ہوتی تھیں، اور بولتے فلم کا شمار نوادرات میں ہوتا تھا۔ پھر ان ستاروں پر زوال آیا۔ بہت کم باقی رہیں۔ زیادہ تر اِدھر اُدھر نکل گئیں۔ چھایا نے بھی اودھ کے ایک تعلقدار صاحب سے شادی کی۔ وہ پی کے اسے خوب ٹھوکتا تھا۔ تین چار سال بعد یہ طلاق لے کے آنکھ کھڑی ہوئی اور اب "غیر وابستگی" کے عالم میں بمبئی میں مقیم تھی۔ دوسری لڑکی شیریں پارسی تھی۔ موٹی، بھدی، پست قد اور بے ہنگم چہرے پر چوتھائی انچ غازے کی تہ جمی تھی۔ بالائی لب کے روئیں جو اس غازے کے بغیر شاید اچھی خاصی مونچھیں معلوم ہوتے، اب بھی غازے کی اِس دبیز تہ سے بغاوت پر آمادہ تھے۔

آفریدی نے سب کے لئے وسکی اور سوڈا منگوایا۔ سرمد نے چھایا سے ناچنے کی فرمائش کی۔ یہ وی آنا کا والٹس تھا۔ ہلکا، شیریں، تیز۔ اُس نے اپنے سینے کے مقابل چھایا کا نوجوان جسم محسوس کیا۔ بھرے بھرے بازو اور شانے۔ سینا بھی تنگ سخت۔ بال رنگے ہوئے مگر گھنے، اور گردن اور شانوں اور پُشت کو حسین سے حسین تر بناتے ہوئے، جسم گداز اور گٹھا ہُوا ہونٹ سرخ، آنکھیں چمکتی ہوئی اور بناتی ہوئی۔

"آپ بہت اچھا ناچتے ہیں مسٹر سرمد۔" چھایا نے اُس سے کہا اور اُس کے دانتوں اور اُس کی پلکوں نے مل کے جال پھینکا۔

"نہیں مجھے تو ناچنا کچھ یوں ہی سا آتا ہے۔ لیکن آپ بہت اچھا ناچتی ہیں جیسے کوئی پری ناچے۔" اس کلمۂ تحسین پر وہ ہنسی، اُس کا پورا جسم ہلا اور ہلتے ہی سینوں سے لے کر رانوں تک اُس کے چمٹے ہوئے گداز جسم کے تمام عضلات میں ہنسی اور گدگداہٹ کی سی جُنبش ہوئی۔ اِس جُنبش نے سرمد کے ادھیڑ جسم سے ٹکر کھائی۔ "آپ بہت خوبصورت ہیں۔ غیر معمولی جیسے گریٹا گاربو۔"

"ادہو" اُس نے کلّے پھلائے اور پھر ہنس کے کہا "یہ تو تعریف نہیں ہوئی مسٹر سرمد۔ گریٹا گاربو تو ہرگز خوبصورت نہیں۔"

"پھر آپ کسے خوبصورت سمجھتی ہیں؟"

"جون کرافرڈ۔ میرے خیال میں جون کرافرڈ بہت خوبصورت ہے۔"

"چھایا دیوی آپ اُس سے کہیں خوبصورت ہیں۔ آپ میں بڑی کشش، بڑی غیر معمولی دلفریبی ہے۔ بالکل کسی راجکماری کی سی"

وہ پھر ہنسی، پھر جسم کی ایک ایک رگ، ایک ایک عضو ہنسا، پھر اُس کی بوٹی بوٹی نے سرمد کو چھیڑا۔ "دیکھئے سرمد آپ نے پھر غلطی کی۔ راجکماریوں سے زیادہ تو ان کی ساریاں خوبصورت ہوتی ہیں۔"

"آپ کا ذہن ایسا ہی تیز ہے جتنی آپ کی صورت دلکش ہے۔ . . . چھایا دیوی آپ نے فلم کی زندگی کیوں چھوڑی۔ مجھے یقین ہے اب بھی آپ واپس جائیں تو بمبئی میں تو کوئی ایکٹرس آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔"

"وہ دن گذر چکے" چھایا نے کہا "اب اس مارکٹ میں میری ساکھ نہیں رہی۔ ہاں اگر مجھے کسی بڑے آدمی کی مدد مل سکے تو شاید ـــــ" اور اس کی بھوری آنکھوں نے سرمد کی آنکھوں کو چھیدنے کی پوری کوشش کی، اس کا جسم رقص کے آخری گھماؤ میں سرمد کے جسم سے اس قدر قریب آگیا کہ اس قربت کی تیزی نے وی آنا کے والٹس کے آخری گھماؤ کو دس درجہ اور زیادہ تیز کر دیا۔

میز کی طرف واپس آتے ہوئے اُس نے کہا "شکریہ چھایا دیوی . . . اس مسئلے کے متعلق پھر تفصیل سے بات چیت کریں گے۔ آپ دو ایک روز

میں مجھ سے آفس میں ملیں . . مجھ سے جو ہو سکے گا . . بمبئی کی تمام فلم ایکٹرسوں میں آپ . . . "

شیریں اکرام بھائی کی گود میں بیٹھی تھی۔ سر سمدر نے ویٹر سے اور وہسکی اور سوڈا اور خواتین کے لئے کاک ٹیل لانے کو کہا۔ آفریدی نیچے مہاراجہ کے پاس گیا تھا۔

شیریں نے اکرام بھائی کے کالر کو چھیڑتے ہوئے پوچھا "اس سیاہ پردے کے پیچھے کیا ہے۔ اور اُس نے دور ایک پردے کی طرف اشارہ کیا

سر سمدر نے جواب دیا "بڑا خواب بھیڑیا۔"

"اوہ" شیریں نے مصنوعی طور پر سہم کے کہا۔

آفریدی آ گیا۔ اور دوسرا ناچ لیمبتھ واک شروع ہوا۔ آفریدی نے چھایا اور اکرام بھائی نے شیریں کو سنبھالا۔ دونوں لڑکیوں نے سر سمدر سے معافی مانگی۔ اُس نے بھی اجازت چاہی وہ خود متوسط طبقے کی اس صحبت سے سیر ہو چکا تھا۔ چوڑے چوبی زینے اُتر کے پھر اُس نے نیچے کی رقص گاہ کا قصد کیا راستے میں کوموڈور نشے میں دُھت بحری فوج کے ایک اور افسر سے کاک ٹیل کا گلاس ہاتھ میں لئے کہہ رہا تھا "میرے خیال میں لیڈی سمدر بہت آسانی سے . . . "

سر سمدر کو دیکھ کر اُس کے ساتھی افسر نے کہا "ششش شش ش۔"

نشے میں جھوم کر کوموڈور نے کہا "ششش ش ش۔" اور دونوں دوسری طرف مڑ گئے۔ رقص گاہ کے ایک ستون کے قریب اُس کی بیوی رگھوبیر سے باتیں کر رہی تھی۔ لیکن اُس کی آنکھیں ایک نوجوان افسر کے چہرے پر جمی تھیں جو دور کھڑا ہوا اسی انگریز لڑکی سے باتیں کر رہا تھا جس نے کچھ دیر پہلے مائیکروفون پر فرانسیسی گیت گائے تھے۔ ایک ہندوستانی فوجی افسر چیکوسلاویکیہ کے سفارت خانے کے ایک افسر سے کہہ رہا تھا "یہ ٹیکسی ناچنے والی، وہ لڑکیاں جو دس روپیہ چندہ داخل کرنے پر آپ کے ساتھ ایک ناچ ناچتی ہیں ۔۔۔ یہ جو ادھر سیدھے ہاتھ کی طرف کھڑی ہے۔ مِس اسکرین۔ ڈورا اسکرین ذرا اُس کا جسم تو دیکھئے۔ مکمل . . اگر یہ تیار ہو جائے تو میں آج اُس سے شادی کر لوں۔" . . . سر سمدر نے اُس لڑکی کی طرف دیکھا۔ اونچا قد، دبیز جسم، سینے خوب اُبھرے ہوئے، اینگلو انڈین۔ وہ مسکرایا اُس نے اپنی بیوی کی طرف نگاہ ڈالی۔ وہ دبلا پتلا ناچ . . لیمبتھ واک

. . . . ناچنے والوں کے ہجوم میں اس نے اپنی بیوی کو دیکھا۔ ایک جھٹکے میں وہ رگھوبیر کے جسم پر آ گری، دونوں ہنسے، اور چمٹ گئے اور پھر ناچنے لگے۔

"تیتری میرے ہاتھوں کی بنائی ہوئی ہے۔" وہ تلخی سے مسکرایا۔ اور قطب شمالی والے کمرے کی طرف چلا۔ بوڑھا سر نوشیرواں افراسیاب اب بھی وہیں تھا۔ اور وہسکی پر وہسکی چڑھائے جا رہا تھا۔ "ہیلو سمدر! خوب لطف اُٹھا رہے ہو؟"

ناچ ختم ہوا! مائیکروفون پر کسی نے اعلان سنایا۔ "ہسپانیہ کے مظلوم پناہ گیروں کی امداد کے لئے لندن کے لارڈ میئر نے جو چندہ جمع کرنا شروع کیا ہے۔ اُس سلسلے میں ہم بمبئی سے بھی حتی الامکان مدد کر رہے ہیں۔ سب سے زیادہ مجھے اُن رضاکار خواتین کا شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے آج کے شو اور ناچ کو کامیاب بنانے کے لئے خاص طور پر محنت کی ہے۔ ان میں سب سے زیادہ تعریف کی مستحق مس ڈورا اسکرین ہیں۔ مس ڈورا اسکرین بارسلونا کی فتح کے وقت اسپین میں موجود تھیں۔ انہوں نے وہاں کے حالات اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ اُس شولری کے جذبے کے تحت جو نوجوانی اور انسان پرستی ہی کا حصہ ہے مس ڈورا اسکرین کے ایک پیار کا نیلام ہو گا . . " یہ کہہ کے وہ ہنسا۔ مجمع نے زور و شور سے تالیاں بجائیں۔ ہال میں مرد عورت سب سانس سادھے کھچا کھچ بھر گئے۔ جو پیچھے تھے وہ اسٹولوں پر کھڑے ہو گئے۔

مس اسکرین۔ ڈورا۔ سینے خوب اُبھرے ہوئے، دبیز جسم، اونچا قد۔ ذرا اُس کا جسم تو دیکھئے۔ مکمل۔ آرکسٹرا کے تخت پر مسکراتی کھڑی تھی، تبسم اور آنکھیں دونوں میں چمک تھی اور شاید شرم کی بھی ذرا سی جھلک ہو۔ پھر پیار کا نیلام ہوا۔ پچاس سے شروع۔ سو ہوا تو کپتانوں نے بولی بند کر دی۔ ہزار تک بڑے تاجر کارخانوں کے مالک بولیاں بولتے رہے۔ اُس کے بعد صرف کروڑ پتی اور مہاراجے باقی رہ گئے اور بالآخر مہاراجہ وشواش نگر نے چار ہزار چھ سو روپیہ میں مس ڈورا کا ایک بوسہ خرید ا۔ وہ مونچھوں پر تاؤ دیتے آگے بڑھے، اور بڑھائے گئے۔ اُن کی گھنی، خضاب لگی ہوئی مونچھوں نے ڈورا اسکرین کے لبوں کو ایک سیکنڈ کے دسویں حصے کے لئے چھوا۔ اور پھر حسینہ نے ہنس کے اپنا مُنہ ہٹا لیا۔ مہاراجہ کے تینوں بیٹے مہابیر، رگھبیر اور رگھوبیر، مجمع کے پیچھے آپس میں کچھ کہہ کے ہنسے اور ٹہلنے لگے۔

اور سمدر سوچنے لگا "کمو . . . نیلام کمو . . . کما . . . چار ہزار چھ سو

نہیں خریدے جاسکتے تھے۔ یا نیلام ہی ہونا تھا تو کسی اور چیز کا کیوں نہیں ہوا۔ پکاسو کی کسی تصویر کا نیلام ہو سکتا تھا۔ جو جمہوریت پسندوں کی طرف سے لڑ رہا ہے۔ یا کسی اور تصویر کا۔ کسی بلا کا نیلام ہو سکتا تھا۔ ایک عورت کے بوسے کا انعام کیوں؟ کیا وہ بھی تجارت کا مال ہے؟"

تجارت کے مال کا خیال آتے ہی سمدر کو اپنی بیوی چندرا کا خیال آیا۔ اپنی بنائی ہوئی تیتری کا۔ یہ پر پُرزے اُسی نے تو نکالے تھے۔ پروں کی جگہ ریشمی ساڑیاں سینکڑوں کی، ہزاروں کی ساڑیاں۔ پر نکل چکنے کے بعد اُڑنے سے کون روک سکتا ہے۔ اِدھر اُدھر اُس نے اپنی بیوی کو ڈھونڈھا۔ قطب شمالی والے کمرہ کے دروازے پر سگریٹ کے دھوئیں میں اُس کا چہرہ چُھپا ہوا تھا۔

آہستہ سے چندرا کے پاس جاکے اُس نے کہا "ڈارلنگ اب گھر چلوگی" چندرا مسکرانے لگی۔ چھایا کی طرح اُس کے دانتوں اور پلکوں سے مل کے جال بچھایا "اب تو کہیں جاکے پارٹی پُر لطف ہو رہی ہے۔ اور آپ ابھی سے چلنے کو کہتے ہیں"

"تو پھر ڈارلنگ مجھے اجازت دو۔ صبح سویرے مجھے بورڈ آف ڈائرکٹرز کی ایک مجلس میں جانا ہے اور بھی بہت سے کام ہیں۔ راجکمار رگھبیر سے کہنا وہ تمہیں گھر چھوڑ دیں"

آخری جملے کے طنز پر چندرا کے لبوں نے ذرا پیچ و تاب کھایا۔ مگر فوراً ہی سنبھل کے وہ مسکرانے لگی۔ اور اس کے ماتھے کی بندی کھِل سی گئی۔

"شکریہ۔ ڈارلنگ" اُس نے اپنے شوہر سے کہا۔

ناچ تو شاید دو ڈھائی بجے ختم ہو گیا ہوگا مگر صبح کے پانچ بجے کے قریب وہ گھر آئی۔ رگھبیر ہی کی موٹر میں گاڑی سے اُترنے کے بعد رگھبیر نے چندرا کے ہاتھ کو ایک طویل بوسہ دیا۔ پھر سمدر کھڑکی سے ہٹ آیا۔ اور سوتا بن کر مسہری پر لیٹا رہا۔ چندرا دبے پاؤں آئی ـــــ اُس کی مسہری کے قریب۔ ایک لمحہ تک وہ سوچتی رہی کہ اپنے سوتے ہوئے شوہر کو پیار کرے یا نہیں؛ پھر اُس کے چہرے پر تلخی کی سیاہی، اور اُس کے ہونٹوں پر ایک طنز آمیز بجلی پیدا ہوئی۔ اور وہ ساری کو فرش پر پھینک، اپنی مسہری پر لیٹ رہی۔

سات بجے سر سمدر اٹھے۔ اُن کی تیتری مسہری پر غافل پڑی سو رہی تھی۔ اس کے پر توڑنا کس قدر آسان تھا، پر چاندی ہی کے تو تھے۔ چاندی کا دروازہ بند کر دو۔ تیتری یا دو اس کے پر دونوں غائب۔ اور تیتری پھر کملا کیڑا بن جائے گی

ایک طلاق کے بعد دو سامنے میں اتنی آسانی نہ ہوگی۔ مگر انہیں چندرا پر بڑا ترس آیا۔ اُن کی بیوی مگر سِن میں اُن کی بیٹی کے برابر۔ اور وہ سوچنے لگے۔ کہ اُن کی بیٹی ہوتی تو کیا وہ اُس کے پر نوچتے۔ کیا وہ اُسے رُلا دیکھ سکتے۔ اپنے وکیل کے پاس جانے کا ارادہ اُنہوں نے ملتوی کر دیا۔

کپڑے بدلتے ہوئے وہ سوچنے لگے۔ ہم سب میں زیادہ فیاض کون ہے ـــ میں؛ جو مالک ہوں اور اپنی ملکیت پر جبر نہیں کرتا؛ یا ڈورا جس نے اپنا پیار بیچا؛ یا میری چندرا جس نے اپنی ریشمی آرام و آسائش کے لئے اپنے والدین کو اپنا جسم میرے ہاتھوں بیچ لینے دیا۔ وہ ہنسا۔ سماج کے اس کھنکھتے ہوئے راج میں کون فیاض ہے؛ کون فیاض رہ سکتا ہے؛ یہاں تو ہر طرف لین دین ہی لین دین ہے۔ یہاں شکر و شکایت اور گلہ شکوہ کیا؟

(۵)

رات کے ساڑھے سات بجے کے قریب صغیر اپنے چھوٹے سے فلیٹ کو واپس آیا۔ ماہم میں مچھلیوں کی بُو یہاں تک آتی تھی۔ مگر شہر میں فلیٹ مہنگے تھے۔ دروازہ مقفل تھا؛ جس کے معنی یہ تھے کہ ناصیدہ جہاں، اس کی بیوی ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ ابھی تک نہیں آئی تو کھانا کب پکے گا۔ قریب کے ایرانی ہوٹل کے کھانے کا نام سن کر اُسے اُبکائیاں آتی تھیں۔

ہندوستان میں اشتراکی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ پہلی قسم میں وہ لوگ ہیں جن میں سے صرف چند کو "قلب او کافر دماغش مومن است" کہا جاسکتا ہے۔ لیکن اس پہلی قسم کے زیادہ تر اشتراکی گورنمنٹ آف انڈیا یا صوبجاتی سرکاروں میں اچھے اچھے عہدوں پر فائز ہیں۔ ملک کے بہت سے ادیب، بہت سے شاعر، بہت سے اخبار نویس اسی قسم میں گنے جاسکتے ہیں۔ اگر وجہ جواز کی کمی تھی تو جون ۱۹۴۱ء سے وجہ جواز بھی مل گئی۔ اور اب یہ ممکن ہو گیا کہ کوئی مالا بار ہل بمبئی یا جوبلی ہل حیدرآباد یا مال لاہور یا کنگ ایڈورڈ روڈ نئی دہلی میں قیام کرے اور اشتراکی ہونے کا دعویٰ کرے۔ ان میں سے ممکن ہے۔ بعض ایسے ہوں۔ جنہیں اشتمالی تحریک سے تھوڑی بہت ذہنی ہمدردی ہو۔ مگر ایسا شاید ہی کوئی ہو جو وقت آنے پر اپنے فیشن ایبل پتے تک سے دست بردار ہونے کو تیار ہو۔ دوسری قسم کے اشتراکی وہ ہیں جو برسوں جیل بھگت چکے ہیں۔ مزدوروں کے ساتھ رہ کے انہیں کی خوراک کھا چکے ہیں۔ بیماریوں میں ایک خوراک دوا کے لئے ترس چکے ہیں۔ ایسے اشتراکیوں میں سے بہت سوں نے

کبھی سرکاری یا کسی اور آرام دہ ملازمت کی کوشش نہیں کی۔ جب موقع آیا تو اُس سے انکار کیا اور ۲۲ جون ۱۹۴۲ء کو اپنے لئے آرام طلبی یا جاہ طلبی کا بہانہ نہیں بنایا۔

صغیر اور اس کی بیوی ناصیدجہاں دونوں کا شمار اس دوسرے قسم کے اشتراکیوں میں تھا۔ وہ اگرچہ یوپی کا رہنے والا تھا لیکن عرصے سے بمبئی میں سُوت کے کارخانے کے مزدوروں کی تنظیم کرتا رہا تھا۔ اُس کی قابلیت اور اُس کی خوبیٔ تحریر کو دیکھ کر اب دو تین سال ہوئے ایک مقامی قومی اخبار میں اُسے ڈیڑھ سو روپیہ کی جگہ دی گئی تھی۔ جنگ کے زمانے میں اور وہ بھی بمبئی کی زندگی کے لئے ڈیڑھ سو روپیہ کیا ہوتے ہیں۔ لیکن اب وہ تنہائی اور ٹھوکروں کی زندگی سے تھک گیا تھا —— بیزار نہیں ہوا تھا۔ وقت پڑے تو وہ اب بھی ایک ادنیٰ سپاہی کی طرح اپنی خدمات پیش کرنے کو تیار تھا — لیکن دو سال کی جیل، خراب غذا، دن رات بیمار۔ مزدوروں کی قربت کی وجہ سے وہ تھک ضرور گیا تھا۔ اس نوکری نے اُسے دم لینے کی ذرا سی مہلت دی۔ اور قدرت نے اُسے ایک رفیق بھی عنایت کیا۔ یہ رفیق یا رفیقۂ حیات اُس کی بیوی ناصیدجہاں تھی۔ اس نے ایک متوسط طبقے کے بورژوا خاندان سے بغاوت کی تھی۔ تعلیم مکمل کئے بغیر چل کھڑی ہوئی تھی۔ آل انڈیا نرسس ایسوسی ایشن کی سرپرستی میں اس نے نرسنگ کی تربیت البتہ حاصل کر لی تھی اور اس کے سوا اسے لکھنے کا سلیقہ تھا۔ اردو افسانے اچھے خاصے لکھ لیتی تھی اور رسالوں سے کچھ نہ کچھ معاوضہ مل جاتا۔ افسانوں کے دو تین مجموعے بھی چھپ چکے تھے۔ جن سے یکمشت آمدنی ہو جاتی۔

صغیر سے ناصیدجہاں کی ملاقات دہلی میں نئے ادیبوں کے ایک جلسے میں ہوئی۔ ناصید کا پہلا عاشق اُس سے الگ ہو چکا تھا اور اُس کی یادگار اُس کا پہلا بچہ اس زندگی سے، اب وہ تیس سال کی تھی، لیکن اب بھی اُس کے کندنی جسم پر نندی اور جھُریاں نہیں چھنکنے نہ پائی تھیں۔ ہندوستانی لڑکیوں کے چہروں کی بے رونقی کے دو اسباب ہو کرتے ہیں۔ پہلے تو اس بے رونقی کا باعث تازہ اور صاف ہوا کی کمی تھی۔ بڑی حد تک یہ سبب اب بھی باقی ہے۔ لیکن ایک تھوڑی سی تعداد ایسی لڑکیوں کی بھی ہے —— خصوصاً بڑے شہروں میں —— جن کے نزدیک تازہ اور صاف ہوا کے استعمال کی واحد شکل یہ ہے کہ اُن کا چہرہ طرح طرح کے غازوں، لوشنوں، کریموں سے تھوپا اور رنگا جائے۔ تاکہ جب وہ ہوا کھانے نکلیں تو دائیں بائیں دونوں طرف چاہنے والوں کے جنازے نکل جائیں جس پارٹی میں وہ جائیں وہاں آدھے نوجوان تو دیکھتے ہی بیہوش ہو جائیں۔ اور باقی آدھے جو بیہوش نہ ہوں وہ سجدے میں گر پڑیں۔ ناصید نے پہلے سبب سے بغاوت کی تھی، اور دوسرے سے احتیاط برتی تھی۔

صغیر کے چہرے پر البتہ زردی تھی۔ تھکن کی، زخمی سپاہی کے رخساروں کی زردی۔ زردی جو اُس کے دُبلے رخساروں سے ہو کر اُس کی مونچھوں تک چلی گئی تھی۔ اس دُبلے لانبے چہرے پر مونچھیں کتنی دلچسپ معلوم ہوتی تھیں۔ دلچسپ لیکن مضحکہ خیز نہیں۔ کیونکہ صغیر کی آنکھیں اگرچہ اندر دھنس گئی تھیں۔ اُن میں اب بھی کشش تھی۔ اب بھی ایک طرح کی جاذبیت تھی۔ اُس کے دُبلے لانبے چہرے کے خدوخال میں اب بھی تناسب تھا۔ اُس کا سینہ بھی اندر کو دھنس رہا تھا۔ مگر ناصید جانتی تھی اس کا علاج کتنا آسان ہے۔ حیاتین الف اور د۔ اور سینہ کی مچھلیاں پھر اُبھر آئیں گی۔ اُسے خود اپنی تیس سال کی عمر کا احساس تھا۔ اُسے بھی رفاقت کی ضرورت تھی۔ اور چند ملاقاتوں کے بعد، چند روز ساتھ پھرنے کے بعد اُس نے صغیر کے لئے ایک طرح کی محبت محسوس کی۔ ایسی محبت جو والہانہ عشق کے مقابل اُنس سے زیادہ قریب تھی۔ ہمدردی، اُنس، رفاقت، دلسوزی انسانیت کی محبت —— اور اس طرح دونوں کی شادی ہو گئی۔ ناصید اپنے میاں کے ساتھ بمبئی گئی۔ جہاں اُسے ایک ہسپتال میں میٹرن کی جگہ مل گئی۔ اور اُس نے آہستہ آہستہ نرسوں کی تنظیم شروع کی۔

اُس روز صغیر نے اپنی کھادی کی شیروانی اتاری۔ کھادی کے کرتے اور پاجامے کو اُس نے بڑے چوکور آئینے میں دیکھا۔ جس میں ناصید، جو لبوں پر سرخی نہیں لگاتی تھی، اپنے گداز، بھرے ہوئے جسم، چوڑے صحت مند سینے اور اُس پر سادہ یونیفارم کی بہار دیکھ لیا کرتی تھی۔ خصوصیت سے وہ اپنے بالوں کا تماشا دیکھتی جو اُس کے گھٹنوں تک پہنچتے تھے۔ اور صغیر کو ان بالوں سے عشق تھا۔ آئینے میں اپنے کھدر کے لباس کو دیکھ کر صغیر کو ذرا سی کوفت ہوئی۔ چند متناسب جسموں پر تو بے شک کھدر اچھے سے اچھے کپڑے سے زیادہ کھلتا ہے۔ ورنہ عموماً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کسی پتیلے تکیئے اور کسی گاؤتکیے پر کسی نے موٹا جھوٹا غلاف چڑھا دیا ہو۔

اُس کے لکھنے کی میز پر ایک چٹھی تھی۔ "میں مقبول کے ساتھ سینما دیکھنے جا رہی ہوں۔ ممکن ہے مجھے واپسی میں دیر ہو۔ نعمت خانے میں کچھ سینڈوچ اور بسکٹ رکھے ہیں۔ ناصید"۔

صغیر اس حیثیت کو پڑھ کے سکتے کے عالم میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اُس کا دماغ اچھی طرح سمجھ نہیں سکا۔ اُس کی متاہل زندگی میں یہ پہلی بار تھی کہ اُس کی بیوی، اُس کے کسی دوست کے ساتھ سینما دیکھنے گئی تھی۔ اور شاید تنہا۔ کم از کم مقبول مادر ہی میں سیوا جی پارک کے قریب تنہا رہتا تھا۔ صغیر اپنے آپ سے حجت کرنے لگا۔ مجھے یہ فرض کر لینے کا کیا حق ہے کہ وہ مقبول کے ساتھ تنہا سینما گئی ہے۔ ممکن ہے اور بھی کئی لوگ ہوں۔

وہ اپنی میز پر بیٹھ کے کام کرنے لگا۔ آج کل وہ اس مبحث پر تحقیق کر رہا تھا کہ کیا مارکسیت مذہب کی غیر معاشی قدروں کو برداشت کر سکتی ہے۔ یہ شبہ اُس کے دل میں عرصے سے کھٹک رہا تھا۔ کہ مارکس معاشیین کا امام فلسفیانہ اسلحہ سے اچھی طرح مسلح نہیں تھا۔ مابعد الطبیعات پر اچھی طرح حاوی ہوئے بغیر فلسفے اور مذہب کو اُنہیں کے ہتھیاروں سے شکست دیئے بغیر مادیت ارتقا بالضد کوئی باقاعدہ فلسفیانہ نظام نہیں بن سکتی۔ وہ عملی نظام بن جائے لیکن فلسفیانہ نظام نہیں بن سکتی۔ مارکس کے بہت سے عقیدت مندوں نے اس قسم کا شک محسوس کیا تھا۔ مثلاً بازاروف، بوگدانوف، لونا چارسکی، برمن۔ ہل فونڈ، یوش کے وچ اور سوُدرو ف۔ انہی کے جواب میں لینن نے مادیت اور تجرباتی تنقید لکھی تھی۔ لیکن لینن کے دلائل سے صغیر کی تشفی نہیں ہو سکی تھی۔

وہ کام کرنے لگا۔ ساڑھے نو بجے۔ دس بجے۔ لیکن ناہید نہیں آئی۔ اب تک اُسے آجانا چاہیئے تھا۔ سینما زیادہ سے زیادہ ساڑھے آٹھ بجے ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ وہ لوگ فورٹ کے کسی سینما کو گئے ہوں۔ ممکن ہے بس ملنے میں دیر ہوئی ہو۔ اُس نے نعمت خانے سے سینڈوچ نکال کے کھائے۔ پھر کام کرنا چاہا۔ مگر ناہید کی ہنستی ہوئی صورت، اُس کے بھرے بھرے بارونق گال، اور سفید دانت، اُس کے چوڑے شانے، اُس کے جسم کی گرمی برابر حائل آ جاتے اوراق کو دھندلا کر دیتے۔ سطروں کا مطلب خبط کر دیتے۔ دماغ کی منطقی شاہراہیں طرح طرح کے روڑے اٹکاتے۔ استدلال کے سامنے یک لخت اعصابی پہاڑ، جذباتی خندقیں پیدا کر دیتے۔ ایک خلا پیدا ہو جاتا اور دل میں ایک طرح کا درد سا ہونے لگتا۔

پھر گیارہ بجے دادر کی طرف سے اور فورٹ سے معلوم نہیں کتنی بسیں آئیں اور سامنے کی سڑک پہ سے شور مچاتی گزر گئیں۔ اُس نے لینن کی کتاب اور اپنی نوٹ بک دونوں کو بند کیا اور ٹہلنے لگا۔ اب پہلی مرتبہ ایک عجیب طرح کا جذبہ اُبھرنے لگا۔ ایسا جذبہ جو اگر تکمیل کو پہنچے تو صدمہ کہلائے۔ لیکن اس ابتدائی درجے میں اُس کے لئے کوئی نام نہیں تھا۔ اس جذبے کے ساتھ ساتھ، اس کے متوازی ایک۔ اور جذبہ تھا، خلجان کا سا۔ اس کا نام متعین تھا۔ شک۔

اُس نے سگریٹ سلگایا، اور ٹہلنے لگا۔ سوچنے لگا کہ مجھے شک اور کسی قسم کے صدمے کا حق ہی کیا ہے۔ ناہید یا اُس کا جسم میری ملکیت تو ہے نہیں کیا اس مہاجنی تمدن سے پہلے بربریت کے سنہری دور میں تمام عورتیں، تمام مردوں اور تمام مرد تمام عورتوں کی ملکیت نہیں ہوتے تھے۔ ممکن ہے یہی قانون فطرت ہو۔ ممکن ہے "جوڑے دار" شادیاں قانونِ فطرت کی خلاف ورزی ہوں۔ تمدن کی صبح کاذب کے ساتھ ساتھ تو یہ شادیاں وجود میں آئی ہیں۔ پہلے مائیں بہنیں حرام ہوئیں، پھر قبیلے کی عورتیں حرام ہوئیں۔ پھر ایک مرد اور ایک عورت کی جوڑے دار شادیاں ہونے لگیں۔

اور وہ سوچتا رہا۔ قانونِ فطرت، لیکن انسان کا کام تو فطرت کے قانون کی پابندی نہیں، اُس کی تسخیر ہے۔ ہل اور ٹریکٹر، دوربینیں اور خوردبینیں سب قانونِ فطرت توڑنے کے لئے ہیں۔ زمین اور زندگی اور ستاروں پر انسان کے حکم چلانے کے لئے ہیں۔

ناہید۔ ناہید۔ ناہید ابھی تک نہیں آئی اور مقبول یقیناً خوبصورت ہے۔ چھ فیٹ دس انچ قد۔ پنجابی۔ سرخ و سفید۔ لڑکیوں کی حد تک تو وہ اسم بامسمّٰی ہے۔ سب کی سب اُس پر کیسے مرتی ہیں۔

پھر دوسرا سگریٹ پہلے سگریٹ ہی سے جلا کے اُس نے سوچنا شروع کیا۔ ناہید اور مقبول۔ لیکن ان جوڑے دار شادیوں میں صرف ایک شریک حیات کی پابندی عورتوں ہی پر لازم قرار دی گئی۔ عصمت کا مطالبہ صرف اُن سے کیا گیا۔ رہ گیا یہ نظریہ کہ عصمت کی قید عورتوں نے خود اپنے اوپر عاید کی ہے۔ اس کے معاشی وجود کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ممکن ہے اس میں کچھ اصلیت نکلے۔ جب عورت اس قدر قربانی پہ تیار ہو گئی تو مرد جو مویشیوں اور غلاموں کو اپنی خدمت اور مزدوری کے لئے استعمال کر رہا تھا۔ عورت کو بھی اپنی خادمہ کی طرح استعمال کرنے لگا۔ انسان قدیم کی سمجھ میں آگیا کہ بچے کی پیدائش میں باپ کا بھی کچھ حصہ ہوتا ہے۔ حقِ مادری اور قانونِ وراثت مادری کے خاتمے کے ساتھ ساتھ عورت کی جنس کو پوری معاشی اور عمرانی شکست ملی۔ کیا ناہید بھی میری کاس،

طرح کی باندی، اس طرح کی کنیز ہے۔ کیا اور سب آزادیوں کی طرح جنسی آزادی کا سوال خود بخود نہیں پیدا ہوتا۔ لاطینی لفظ "فیمولس" کے معنی گھریلو غلام کے ہیں اور فیمیلیا کے معنی غلاموں کی اُس کل تعداد کے ہیں۔ جو کسی ایک مرد کی ملکیت ہو۔ یہی لفظ فیمیلیا آج بھی اطالوی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

عورت کس لئے دوسرے مردوں کے پاس نہ جائے۔ اِسی لئے تاکہ وراثت پدری کی حد تک شک کا امکان باقی نہ رہے۔ میاں صغیر تمہارے باپ کا کونسا اثاثہ کونسی جائیداد ہے؟ رفتہ رفتہ عصمت کا یہ تخیل کم از کم مشرق میں اپنے معاشی پس منظر سے نکل کر مقصود بالذات بن گیا۔ عزت کو مال اور جان دونوں سے زیادہ اہمیت دی جانے لگی۔ ہم مشرقی ہمیشہ تصورات کے دیوانے رہے ہیں . . . . از بام خانہ تا بہ ثریا از آنِ من۔ مشرقی مرد تو ہمیشہ بام خانہ سے ثریا تک علم کلام، صاحبدلی، عزتِ نفس، عصمت تخیل کے ہوائی قلعے بناتے رہتے اور بام خانہ کے نیچے رہنے والی گھر والی کو انہوں نے ان خیالی محلوں کے پاس بھی نہ پھٹکنے دیا۔ امیر خسرو اپنی لڑکی کو دیوار کی طرف پُشت کر کے بیٹھے رہنے کی تعلیم دیتے رہے۔ کبھی کبھی مرد بھی ان ہوائی تصوروں سے نیچے اُتر آتے۔ اور مرد پرستی اور بہیمیت کے گندے دلدل میں ایسے غوطے لگاتے کہ حیرت ہوتی . . .

ابن یمین . . . اُس کا دیوان بڑی آب و تاب سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ صغیر اُس کے ورق اُلٹتا رہا اور صرف موعظت اور پند اور حق پرستی ہر ہر شعر سے ٹپکتا تھی۔ یہاں تک کہ وہ ایک غزل پر پہنچا۔ ایسی فحش غزل کہ میرزا کانی اور جعفر زٹلی شرما جائیں۔

ابن یمین کے دیوان سے اُس کے دماغ کی منطقی حرکت جو اُس کے جذباتی بے چینی سے برابر لڑ رہی تھی پھر اُسے گھریلو عورت کی طرف واپس لے آئی۔ اور صغیر نے سوچنا شروع کیا۔ قرونِ وسطیٰ بلکہ یونانِ قدیم کے ——— اور پھر الف لیلا کے وہ دو مشہور ڈرامائی کردار۔ چالاک عاشق اور بیوقوف شوہر وہ ڈرامہ جس کو انیگلز نے بڑی خوبصورتی سے اس ایک جُملے میں بیان کیا ہے۔ شوہروں نے بیویوں پر فتح پائی، لیکن ان شکست کھانے والیوں نے اپنی عالی ظرفی سے فاتحوں کے لئے تاج کا انتظام کر دیا۔ . . اور تاج؟ فرانسیسی اور سترہویں اور اٹھارویں صدی کے انگریزی ڈرامہ کا وہ سینگوں کا تاج۔ سینگوں کا تاج جو غریب شوہر کو تو نظر نہیں آتا۔ لیکن جسے اور سب دیکھ کے ہنستے ہیں۔ سینگوں کا تاج جس کے معنی یہ ہیں کہ اس بادشاہ کی ملکہ ہرجائی ہے۔ اِس بادشاہ کی ملکہ دوسرے سوال بلکہ عالم سے واقف ہے۔

اس رفتار تخیل سے ایک منٹ کے لئے صغیر کا جذبۂ رشک سارے داغی استدلال پر حاوی ہو گیا۔ آئینہ میں اُس نے اپنا چہرہ دیکھا جو لال ہو رہا تھا۔ اُس کے زرد چہرے کو لال ہونے کے مواقع بہت کم ملتے تھے۔ یہ سرخی زردی کی ضد نہیں، اُس کی انتہا تھی۔ آئینے میں اُسے اپنے سر پر کہیں سینگ نظر نہیں آئے۔ خدا کا شکر ہے۔ دُنیا، یہاں تک کہ ہندوستان۔ کم سے کم شہروں کا ہندوستان ——— قرونِ وسطیٰ کو صدیوں پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ ورنہ سینگوں کا اُگ آنا کچھ عجیب بات نہ ہوتی۔ اب ہنسنے والوں کے حربے دوسرے ہیں۔ زیادہ تر تو پیٹھ پیچھے بھونڈا مذاق کر کے جس میں جنسی فعل کی طرف بازاری اصطلاح میں اشارہ ہوتا ہے۔ ہنس لیتے ہیں اور معاملہ رفت گذشت ہو جاتا ہے۔ بعض خدا بیدردی سے بدنصیب شوہر کے سامنے بھی ذکر کر دیتے ہیں لیکن صاف صاف نہیں، اشارۃً اور طنزاً۔ اور یہ اس امر سے بالکل مطمئن کہ اُن کے اپنے گھر محفوظ ہیں۔ خدا مسخرے اپنے گھروں کی تو نبض دیکھیں۔

لیکن اسی درمیان میں انسان نے جنسی تعلق میں ایک ایسا ارتقائی جذبہ تخلیق کیا ہے۔ جسے کوئی اور حیوان نہیں جانتا۔ عشق کا جذبہ، والہانہ کشش کا جذبہ، ایک دوسرے کے لئے مکمل قربانی اور کامل ایثار کا جذبہ۔ اگر اُس کی اور ناہید کی شادی کی تہ میں یہ جذبہ کسی نہ کسی طرح پیدا ہو چکا ہے۔ تو دونوں فریقوں پر عصمت واجب آتی ہے۔ تب تو وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے ہیں اور دونوں میں سے کوئی کبھی اور کے لئے نہیں . . .

سینما کے بعد مقبول کے فلیٹ میں وہ انتظار کرتی رہی۔ یعنی اُس کا تحت الشعور انتظار کرتا رہا کہ وہ حسین نوجوان اُس کے سامنے صوفے پہ بیٹھا ہے۔ اب اُس کا ہاتھ اُس کے جسم سے مَس کرے گا۔ اب اُس کے لب، اُس کے اپنے لبوں کو طلب کریں گے اور ناہید خود اپنے آپ کو کوئی جواب نہ دے سکی، کوئی فیصلہ نہ کر سکی کہ اگر ہاتھ بڑھیں یا لب قریب آئیں تو وہ مزاحمت کرے یا نہیں، اور مزاحمت کرے تو کس قدر۔ وہ خود تو جانتی نہ تھی۔ شاید عین وقت پر وہ تصفیہ کر سکتی۔ کھانے کے بعد اس تنہائی میں اور سب طرح کی باتیں ہوئیں۔ کانفرنس کے کارندوں کے مزدوروں کی انجمن کے متعلق جس میں مقبول کام

کر رہا تھا۔ نہ صرف زندگی کے متعلق۔ جنگ اور معیار ادب پر تبصرے ہوئے۔ پھر شتبہ مذاق بھی ہوا اور مقبول نے ناہید کے حُسن کی تعریف بھی کی۔ لیکن عاشقی کی حقیقی بہت کوشش کی تو صرف آنکھوں میں۔

اور آنکھوں کا باہمی ربط ناقص سا تھا۔ ایک طرح کی جنسی کشش ضرور تھی۔ لیکن نگاہوں کا ربط جذب مطلق کا ربط نہیں تھا۔ مقبول کو اپنے دوست کا، اور ناہید کو اپنے شوہر کا لحاظ تھا۔ اور یہ لحاظ نہ بھی ہوتا، تب بھی نگاہوں میں صرف گگلی سی گرمی تھی، آگ نہ تھی اور بجلی کا تو کہیں دور دور پتہ نہ تھا۔ اس لئے نہ ہاتھوں نے ربط قائم کرنے کی کوشش کی، نہ لبوں نے۔

مگر نگاہوں کی یہ ہلکی سی کشش کیا تھی؟ اور اس سے عارضی لطف کیوں حاصل ہوا؟ یہ سوال ناہید نے مقبول کے فلیٹ سے واپس ہوتے ہوئے سوچا۔ غالباً اس قسم کی خفیف سی جنسی کشش جو جسمانی ربط کی طلبگار رہتی ایک طرح کا نفسیاتی سیفٹی والو ہے۔ ایک مرد سے والہانہ عشق کے بعد جذبات کی سیکھاو۔ دل کی خفیہ تمنائیں نکالنے کا ایک بے خطر ذریعہ۔ شاید اسی لئے مغربی تمدن کا حکم ہے کہ بیویاں اپنے شوہروں کے ساتھ رقص نہ کریں۔ دوسروں کے ساتھ ناچیں۔ اور دعوتوں کے میزوں پر اپنے شوہر کے ساتھ نہ بیٹھیں دوسرے مردوں کے پاس بیٹھیں۔ انہی رعایتوں سے شاید یورپ نے ازدواجی زندگی کی عصمت کو کامیاب بنانا چاہا۔ مطلق العنانی حکمرانی کے سوا یہی ایک صورت تھی۔

اب ساڑھے گیارہ ہو چکے تھے۔ وہ بس سے اُتر کر سیڑھیاں چڑھنے لگی تبھی سے یہ خیال اُسے پریشان کرنے لگا کہ کہیں صغیر کو شک نہ ہو۔ کہیں وہ کچھ اور نہ سمجھ رہا ہو۔ اس کے بعد پھر عشقیہ ازدواجی زندگی میں ایک کانٹا سا کھٹکنے لگے گا۔ اسی لئے شاید عورتوں نے شروع شروع میں عصمت کو اپنے اوپر لازم کر دیا تھا۔ پھر ناہید کو تعجب ہوا کہ کیوں وہ خود صغیر کے سامنے اپنی بریت پیش کرنا چاہتی ہے۔ اُسے یقین دلانا چاہتی ہے کہ وہ معصوم ہے اور وہ صرف اُسی کو چاہتی ہے۔ آخر وہ اُس کی ملکیت تو نہیں۔

اور صغیر نے زینوں پر اس کے قدموں کی چاپ پہچانی۔ دروازہ کھولا وہ ہنستی ہوئی کھری آنکھیں، اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے کچھ کہنا ہی چاہتی تھیں کہ وہ گداز گورے ہاتھ بڑھے اور ان ہاتھوں نے اس کے جسم کو گھیر لیا، وہ گداز نازک لبوں نے اُس کے لبوں پر مہر لگا دی اور یہ بوسہ بے لیس اتنا سچا، اتنا والہانہ تھا کہ فریقین میں سے کسی کو نہ کچھ پوچھنے کی ضرورت رہی۔ نہ جواب دینے کی۔

"پیارے تم نے وہ سینڈوچ کھائے۔ جلدی میں تمہارے لئے میں اور کچھ نہ بنا سکی۔ کہو تو ابھی انڈوں کا خاگینہ تل دوں؟"

تب دی تال نے پوچھا۔ "مہاراج آپ بتائیے اِن تینوں میں سب سے زیادہ فراخدل اور فیاض کون تھا؟ مقبول جس نے اپنے دوست کا لحاظ کیا، یا صغیر جس نے عورت کی ذات اور اُس کے حق کا لحاظ کیا؟"

مہاراج تری دی کرم سینا نے کہا۔ "دیتال! اس عجیب آنے والے زمانے کے لحاظ سے میں بھلا کیا تصفیہ کر سکتا ہوں کیونکہ تو کہتا ہے کہ اُس عجیب زمانے میں کشتیاں مچھلیوں کی طرح پانی کے اندر چلیں گی۔ اور مکان ہوا میں پنچھیوں کی طرح اُڑیں گے۔ اور لوہے کی نلیوں میں سے آگ نکلے گی۔ لیکن اس آگ کی بھٹی سے پگھل کر نکلنے کے بعد اگر انسان سچ مچ کھرا سونا بن جائے۔ اور ایسا واقعہ جیسا تو بیان کرتا ہے پیش آئے تو میں تو یہ کہوں گا کہ صغیر، ناہید اور مقبول تینوں برابر فیاض تھے۔ یا یہ کہ ان میں سے کوئی خاص طور پر فیاض اور فراخدل نہ تھا۔ ہر ایک اپنا اور دوسرے کا حق جانتا تھا۔ اور دل اور جسم کی محبت میں امتیاز کر سکتا تھا، ان دونوں کے فرق کو سمجھتا تھا۔"

"جے مہاراج کی" ویتال نے کہا اور خاموش ہو گیا۔

بلونت سنگھ

لمس

آدھی رات کے بعد گیدڑوں نے "ہوا ہو" کا شور مچانا شروع کیا تو کیا مجال رات بھر ایک لمحہ کو بھی زینب کی آنکھ لگی ہو۔ اسے اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں پہلے کی طرح ان کی کوئی مرغی نہ چوری ہو جائے۔ وہ انگریزی مرغی کھو کر اس کے دل کو کس قدر افسوس ہوا تھا۔ مرغیاں باہر ڈربے میں بند رہتی تھیں۔ اندر جگہ نہیں تھی۔ . . تاریک اور خاموش رات میں مرغی کی ذرا سی آواز بھی سنائی دیتی تو وہ کوہنوں پر ہاتھ رکھ کر ڈربے کی طرف چل دیتی۔

رات بھر جاگنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ صبح جب وہ بستر سے اٹھی تو اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ اس کا گھر چھوٹے سے قصبے کے ایک سرے پر تھا۔ کرایہ کا مکان بھی نہ تھا کہ بدل لیا جاتا۔ اپنا مکان بنوایا گیا تھا۔ ہر چند مکان میں جگہ بہت تنگ تھی۔ اور ان کا کنبہ مکان کی مناسبت سے بڑا ہی تھا۔ لیکن اسی میں گزارا کرنا لازمی تھا۔

اس کا خیال تھا کہ آج وہ دن بھر کے کام دھندوں سے وقت نکال کر جی بھر کر سوئے گی۔ اس کا شوہر بڑی نہر پر ٹھیکیداری کا کام کرتا تھا۔ گھر سے دو دو روز بلکہ اس سے بھی زیادہ غائب رہتا اور جب کبھی گھر آتا بھی تو ہوا کے گھوڑے پر سوار۔ ادھر آیا، اُدھر گھر کے سامان کو اوپر تلے کیا۔ کبھی بچوں سے پیار اور کبھی اس سے . . . اور پھر سائیکل اٹھائی اور غائب۔

سورج نکل آیا تھا۔ وہ چارپائی پر اُٹھ کر بیٹھ گئی اپنی سوجی ہوئی آنکھوں کو ملنے لگی۔ اور تو اور آج اس کا چھ سالہ حنیف بھی اس سے پہلے جاگ اُٹھا تھا۔ شاید وہ رویا ہو۔ اس نے اسے جگانے کی کوشش بھی کی ہو۔ لیکن اس کی سیانی بیٹی روشنک اگرچہ ابھی گیارہ سال کی بچی ہی تھی۔ لیکن ان معاملات میں بہت سمجھدار تھی۔ اس نے بھیا کا دل بہلائے رکھا ہوگا۔ تبھی تو بیچارا معصوم بچہ فرش ہی پر پھسکڑا مارے میٹھا بسکٹ کے خالی ڈبے میں گتے کے پہیے لگا کر گاڑی بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور روشنک اپنے بھیا کے قریب ہی بچھی ہوئی چٹائی پر پیٹ کے بل لیٹی کروشیے سے میز پوش کی جھالر بن رہی تھی۔ جب سے اس کا ایک لڑکا فوت ہوا تھا اسے اپنے بچوں سے اور بھی زیادہ محبت ہو گئی تھی۔

یوں بھی اُس کی آنکھیں خراب ہی تھیں۔ گرمیوں میں تو تھوڑی بہت سرخی اس کی آنکھوں میں ضرور دکھائی دیتی تھی۔ بعض اوقات دکھنے بھی لگتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ صبح اُٹھ کر پہلے وہ دوپٹے کے آنچل سے آنکھوں کے میل کو صاف کرتی تھی۔ اور آج وہ اپنی آنکھوں کو اچھی طرح صاف بھی نہ کر پائی تھی کہ ماں کا محبت بھرا دل اُمڈ آیا۔ "اللہ خیر . . . میں واری جاؤں۔" کہتی ہوئی وہ چارپائی سے اُٹھ بیٹھی اور اپنے بچوں کو باری باری اس نے خوب سا پیار کیا۔ آج اسے اپنے بچے بہت ہی پیارے دکھائی دے رہے تھے۔

سب سے پہلے اسے دہی بلونا تھا۔ سگھڑ عورتیں دہی بلونے کا کام تو تاروں کی چھاؤں ہی میں کر لیتی تھیں وہ خود بھی اسی طرح کیا کرتی تھی۔ لیکن آج اسے دیر ہو گئی تھی۔ چنانچہ جب دہی کی مٹکی کے قریب پیڑھی پر بیٹھی تو دل کو وہ اطمینان حاصل نہ تھا۔ اور پھر اب حنیف بھی اس کے گلے کا ہار ہو رہا تھا۔ بچے کو نہار منہ باسی روٹی پر مکھن رکھ کر کھانے کی عادت تھی۔ آج اتنی دیر ہو گئی تھی کہ بچارے سے بھوک برداشت نہ ہوتی تھی۔ وہ اسے پیار کر کے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑانا چاہتی تھی۔ لیکن وہ تھا کہ بس ٹھنکے جاتا تھا . . . وہ عجب مصیبت میں گرفتار تھی . . . ابھی کل تک اس کے گھر میں مہمان آئے ہوئے تھے۔ نہ معلوم کہاں کہاں کے رشتے دار آن ٹپکتے ہیں اگر کسی کے گھر میں قیام کرنا ہو تو یونہی دور کی رشتہ داریاں قائم کر کے انتہائی ڈھٹائی سے پاؤں جما لیتے ہیں۔ اپنے دکھ سکھ میں ان کی صورت دکھائی تک نہیں دیتی یوں بھی چلے آئیں تو خیر لیکن وہ اپنے بیمار عزیزوں کو بھی اُٹھا لاتے ہیں۔ ایک دن پہلے جو مہمان رخصت ہوئے تھے وہ بھی اپنی ایک چھوٹی سی بیمار بچی کو علاج کی غرض سے لے آئے تھے۔ اور پھر ان کا ہر قسم کا خرچ یہاں تک کہ ڈاکٹر کی فیس اور دواؤں کی قیمت بھی انہیں کے سر پڑی۔ اور اس پر قیامت یہ کہ ڈاکٹر نے جواب بھی دے دیا کہ لڑکی کا جانبر ہونا محال ہے۔ لیکن وہ لوگ اس وقت تک ان کے گھر سے نہیں ٹلے جب تک اُن کی بچی مر نہیں گئی۔ اندر والے جس کمرے میں بچی مری تھی، وہ اس کے فرش کو دھو ڈالنا چاہتی تھی، بلکہ وہ اس پلنگ کی نواڑ کو بھی دھلوا لینا چاہتی تھی۔ جس پر بیمار لڑکی پڑی رہتی تھی۔ ان سب باتوں

کر سوچ کر اسے عجب کراہت سی محسوس ہونے لگی . . . اللہ ہی سب کا مالک ہے . . . لیکن اوروں کے گھروں میں جا کر مرنا بھی ہی کی بات تو ہے . . . ان سب کاموں کے لئے بہت زیادہ وقت درکار تھا۔ ادھر حنیف تھا کہ بس روئے جا رہا تھا . . . پہلے تو چمکارتی پچکارتی رہی آخر زچ ہو کر اس نے زناٹے کا ایک تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔ بہن اسے اٹھا کر پرے لے گئی پھر وہ دودھ بلونے لگی اور بچے کی چیخوں کی آواز سن کر دوپٹے کے آنچل سے اپنے ہی آنسو پونچھنے لگی۔

خدا خدا کر کے دودھ بلویا ——— مکھن نکال کر لکڑی کے چوڑے دہانے والے برتن میں رکھا اور پھر آپ ہی آپ اس کی نظر اوپر اٹھ گئی۔ اس جگہ کوے بھی بہت زیادہ تھے۔ ہر وقت ان کی جھپٹوں کا ڈر لگا رہتا تھا چنانچہ اس نے چھت پر صحن کے آر پار بان کی رسیاں باندھ رکھی تھیں . . . لیکن اب اُس نے دیکھا کہ بچوں نے رسیاں کاٹ ڈالی تھیں۔ اس طرح کام میں سے کام نکل آتا تھا۔ اور ہر ادھورے کام کو دیکھ کر اس کا دل پریشان سا ہونے لگتا تھا۔ وہ یہ سوچ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھی کہ ساتھ والے مکان سے بوڑھی جلاہی کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ اُوپر پہنچی تو معلوم ہوا کہ منڈیر پر رکھا ہوا اُپلا پھسل کر اُس طرف رہنے والے جلاہوں کے گھر میں جا پڑا تھا۔ سڑیل مزاج دادی بیچاری ہی تھی اور بیچاری روشنک دم بخود کھڑی تھی۔

اتفاق کی بات حنیف کا ہاتھ لگنے سے ایک ہلکا پھلکا اپلا اُن کے صحن میں جا گرا تو کونسا قہر آ گیا۔ کوئی اینٹ پتھر تو نہیں کہ کسی کا سر پھٹ جاتا . . . . لیکن بڑھیا مفت میں اس قدر تڑخ گئی تھی۔ اس پر اسے بھی غصہ آ گیا اور اس نے بھی کھری کھری سنا ڈالیں۔ ادھر سے بڑھیا کی بہو بھی ساس کی حمایت میں گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے لگی۔ اس پر اسے اور طیش آیا۔ پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر اس قدر چیخی اور چلائی کہ گلا بیٹھ گیا بڑی مشکل سے جا کر کہیں امن قائم ہوا . . . اور وہ رسیاں باندھ کر نیچے آئی۔

روشنک کے اسکول جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ حنیف کی عادت تھی کہ وہ بھی بہن کے ساتھ ضرور جاتا تھا۔ عام طور پر بچے اسکول جانے سے کتراتے ہیں۔ حنیف پڑھائی کے قابل تو نہ تھا لیکن وہاں بچوں کے ساتھ کھیلنے کا شوق تو بس کھا جاتا تھا۔ اس نے جلدی سے توا چولہے پر رکھا۔ تاکہ بچوں کو کھلا پلا کر اسکول بھیجے اور بعد میں وہ باقی کاموں سے بھی نپٹ لے۔ پراٹھے پکتے اور کھانا کھاتے وقت بھی حنیف تھوڑی بہت چھین جھپٹ کرتا رہا۔ بہنیں بیچاری نیک ہی ہوتی ہیں۔ بھائیوں کی زیادتیاں چپ چاپ برداشت کر لیتی ہیں ادھر وہ خود بھی چپ تھی۔ حالانکہ حنیف کی چیخوں سے کانوں کے پردے پھٹے جاتے تھے۔ لیکن وہ اس خیال سے دل پر جبر کئے رہی کہ اب اگر اس نے بچے پر ہاتھ اٹھایا تو مفت میں گھنٹہ بھر رونا پڑ جائے گا۔ کھانا کھا کر اسکول تو چلا ہی جائے گا۔

ابھی بچے تیار ہو ہی رہے تھے کہ نینو کمہارن چھم چھم کرتی آن ٹپکی۔

نینو کمہارن قریب کے گاؤں میں رہتی تھی۔ ہفتے میں دو تین مرتبہ اپنے خاوند کے ساتھ گدھوں پر برتن لاد کر منڈی بیچ دینے جاتی اور جب لوٹتی تو اس کا خاوند تو گدھے ہانکتا ہوا اپنی سیل پرے گاؤں کو چلا جاتا لیکن وہ ان کے ہاں ضرور رک جاتی۔ وہ نئی نویلی دلہن تھی ابھی لال جوڑا بھی نہ اترا تھا۔ شادی سے پہلے اگرچہ ہاتھ پاؤں کی مضبوط تھی لیکن اس کا جسم کمزور تھا مگر شادی ہوتے ہی نہ معلوم اس پر کیا جادو ہو گیا کہ روز بروز اس کے جوبن میں چار چاند لگتے جا رہے تھے۔ کلے پھول رہے تھے۔ ان پر سرخی جھلک مارتی تھی۔ سارا جسم بھر گیا تھا۔ سانولا سلونا رنگ ایسا نکھرا کہ اب نیا ہی روپ نکل آیا اور ادھر وہ خود تھی کہ شادی سے پہلے تو وہ اچھی موٹی تازی تھی کیسے بھرے بھرے بازو اور کیا کاٹھ تھی اس کی۔ لیکن شادی کے بعد وہ روز بروز گھلنے لگی۔ کوئی ایسی فکر بھی نہ تھی۔ کھانے پینے کو خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ لیکن گال تھے کہ پچکے جا رہے تھے۔ آنکھوں کے نیچے گڑھے تھے کہ گہرے ہوتے جا رہے تھے، جسم تھا کہ اس میں پھرتی نام کو نہ رہی تھی۔

جب نینو چھم سے ان کے صحن میں داخل ہوئی تو سونی سونی فضا میں رونق دکھائی دینے لگی اور حنیف کا ایک پاؤں تو پائے کے پاس ہی تھا اور ایک باہر کہ وہ اسے دیکھتے ہی جیسے رسی تڑا کر بھاگا اور دوسرے لمحہ میں نینو کی گود میں تھا۔

نینو کی طبیعت کچھ ایسی تھی کہ کیا بچہ اور کیا بوڑھا جس نے ایک مرتبہ اس سے بات کر لی بس اسی کا ہو رہا۔ ہنسی تھی کہ پھوٹی پڑتی تھی۔ باتیں تھیں کہ پھول جھڑتے تھے۔ صورت تھی کہ دل میں کھبی جاتی تھی . . . انسان اس کی موہنی صورت بس دیکھا کرے۔ خد و خال تو خیر معمولی ہی تھے۔ لیکن چہرے کی رنگت اور صحت ایسی کہ بس جی ہی نہیں بھرتا تھا۔

اگر کبھی مصروف ہوتی اور ایسے میں کوئی ملنے کے لئے آجاتا تو دل میں بُرا مان جاتی تھی۔ ہزار کوشش کرنے کے باوجود سیدھے منہ بات نہ کر پاتی تھی۔ لیکن نینو کی آنکھوں میں نہ معلوم کیا جادو تھا کہ وہ جب بھی پہنچ جائے۔ اسے اس کی آمد پر ہمیشہ دلی مسرت ہوتی تھی۔ نینو نہ صرف صورت اور سیرت ہی کی اچھی تھی بلکہ وہ تھی بھی چلبلی اور کام کرنے والی۔ . . جب آتی کاموں میں ہاتھ بٹاتی۔ ذرہ برابر بھی تکلف نہ کرتی۔ اس لئے اس کا آنا مبارک ہی ہوتا تھا۔

روشنک اسکول کو چلدی۔ حنیف پٹ کر بیٹھا۔ نینو آئی ہوئی تھی اسے نینو سے بہت محبت تھی۔ بھلا وہ نینو کو چھوڑ کر اسکول کیوں جانے لگا۔ چنانچہ وہ نینو کی گود میں بیٹھا رہا۔ . . نینو کی شادی ہو چکی تھی لیکن اس کا لڑکپن نہ گیا تھا۔ اسے اس قسم کے کئی چھوٹے موٹے طریقے یاد تھے۔ جن سے وہ حنیف کو ہنسا کر خوش کر سکتی تھی . . . زینب نے سوچا چلو اگر نینو گھر کے کاموں میں اس کا ہاتھ نہ بھی بٹائے اور محض حنیف کا دل بہلائے رکھے تو بھی اسے کام کرنے میں آسانی ہو جائے گی۔ . . . لیکن نینو کی باتوں سے معلوم ہو گیا کہ آج وہ زیادہ دیر تک نہ رُکے گی۔ اس کا خاوند قصبے میں کسی دوست سے ملنے کے لئے گیا تھا۔ اس لئے وہ ادہر چلی آئی۔

اور واقعی تھوڑی دیر بعد نینو کے خاوند کی آواز سنائی دی اور نینو اس بات پر اظہارِ تاسف کرتی ہوئی رخصت ہو گئی کہ آج زیادہ دیر بیٹھنے کا موقع نہ ملا حنیف نینو کے گلے سے لپٹا ہوا باہر تک گیا اور پھر گدھے کی سواری کرنے کے بعد بڑی مشکل سے کہیں واپس آیا۔ . . . اور واپس آتے ہی لگا ماں کا آنچل تھام کر ٹھنٹھنانے۔ . . . ماں جس طرف جاتی وہ روتا ہوا اس کے ساتھ ہو لیتا ـــــ اس مرتبہ نینو کی آمد سے وہ گھاٹے میں رہی۔ اگر وہ نہ آتی تو کم از کم حنیف اسکول کو سدھارتا اور وہ مزے سے سارے کاموں سے نپٹ لیتی۔

باہر گونی میراسن کی بلند آواز سنائی دے رہی تھی۔ گونی بھی عجب باتونی عورت تھی۔ ادھر صبح ہوئی ادھر وہ آنچل سنبھالتی ہوئی گھر سے نکلی اور لٹو کی طرح سارے قصبے میں گھوم گئی۔ . . وہ عورت کیا تھی چلتا پھرتا اخبار تھی۔ اسے دیکھ کر عورتیں آٹے یا گوبر میں سنے ہوئے ہاتھ پھیلاتے اپنے اپنے گھر سے باہر آن کھڑی ہوتیں اور پھر گونی ناک پر انگلی رکھ کر اور بھنووں کو جنبش دے کر جو کوئی داستان چھیڑ دیتی تو بس اللہ دے اور بندہ لے۔ سننے والے کے کان پک جائیں لیکن خدا کی بندی کی زبان کو لگام کون دے۔ . . . اس کی آواز سنتے ہی زینب نے سوچا کہ کیوں نہ حنیف کو اس کے ہمراہ اسکول بھیج دے۔ لیکن گونی کو اندر بلانا ایک نئی مصیبت کو دعوت دینا تھا۔ . . . اور وہی بات ہوئی گونی اندر آئی اور اس نے ابھی قصبے کی اسٹاپ پریس خبریں ہی سنائی تھیں کہ زینب کے سر میں درد ہونے لگا۔ یک نہ شد دو شد۔ . . . کسی نہ کسی طرح اس نے حنیف کو گونی کے ساتھ روانہ کر کے آئی بلا ٹالی۔ لیکن گونی کے چلے جانے کے بعد وہ اس قدر تھک گئی کہ دم لینے کے لئے پیڑھی پر بیٹھ گئی۔

اس کا دل اُکھڑا اُکھڑا سا تھا۔ سر چکرا رہا تھا۔ دماغ پر غنودگی طاری تھی۔ جسم ٹوٹ رہا تھا۔ گونی نے آج ایک خبر کو بڑی اہمیت دی تھی۔ ان کے مکان سے تقریباً پچاس قدم پرے ایک بہت بڑی حویلی تھی۔ جس کی اُوپر والی منزل پر ایک چوڑی والا اپنے کنبے سمیت رہتا تھا۔ چوڑی والے کی بیوی بہت طرح دار اور بانکی تھی۔ پہلے پہل اس نے اسے پڑوس والوں کے ہاں کسی شادی کے موقعہ پر دیکھا تھا۔ بیگاں اس کا نام تھا۔ کیا موہنی صورت پائی تھی اس نے۔ اور ادہر اس کا خاوند تھا۔ کچھ عجیب سی صورت تھی اس شخص کی۔ بدصورت نہ سہی لیکن اس کی شخصیت میں ذرہ برابر بھی کشش نہ تھی۔ لیکن عورت ہزاروں میں ایک تھی۔ اس رات شادی کے موقعہ پر عورتوں نے مل جُل کر سوانگ رچایا۔ بیگاں نے مرد کا سوانگ بھرا۔ کیسی بے ڈول سی پگڑی باندھے اور ہاتھ میں موٹا سا سونٹا لئے وہ اینٹھتی ہوئی آگے بڑھی اس کی مصنوعی مونچھیں دوات کی روشنائی سے لکیریں کھینچ کر بنائی گئی تھیں جو بہت مضحکہ خیز نظر آ رہی تھیں۔ اور پھر اس کی چھاتیوں کا اُبھار۔ مرد کا سوانگ اور بھی زیادہ مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا۔ بھلا گونی میراسن سے چُپ کہاں رہا جاتا۔ ہانک لگائی۔ "حضور والا! پہلے انہیں تو سنبھالئے۔" عورتوں کی اس بے تکلف مجلس میں اس بات پر وہ قہقہے بلند ہوئے کہ دوہری ہو گئیں۔

ان دنوں وہ لوگ قصبے میں نئے نئے آئے تھے۔ بیگاں کی بے تکلفی کو اس کے اطوار پر محمول کیا گیا۔ لیکن رفتہ رفتہ کئی قسم کی افواہیں اُڑنے لگیں۔ چھوٹے سے قصبے میں اس قسم کی چٹپٹی باتیں چھپی ڈھکی رہ ہی نہ سکتی تھیں۔

خود اس نے دو تین مرتبہ غیر مردوں کو ان کے گھر میں گھستے ہوئے دیکھا تھا۔ زینب اللہ کے عذاب سے ڈرنے والی عورت تھی۔ ان باتوں پر یقین ہی نہ کر سکتی تھی۔ کیونکہ یہ بھی عین ممکن تھا کہ جو غیر مرد وہاں آتے ہوں وہ اس کے خاوند کے دوست ہوں۔ لیکن ایک روز گرمیوں کی دوپہر کو [illegible] اس بات

کا یقین کبھی نہ تھا . . . اس دن گھر پر کوئی نہ تھا۔ گرمیوں کے موسم میں وہ عموماً پچھلے کمرے میں گھسی رہتی تھی۔ کیونکہ یہ کمرہ نسبتاً سرد تھا اور وہاں سورج کی کرنیں سیدھی نہ پڑتی تھیں۔ وہ کسی کام سے اُٹھ کر باہر والے کمرے میں آئی کہ اتفاق سے اس کی نظر اُٹھی اور بیگاں کے مکان پر جم گئی۔ بیگاں کا خاوند دن بھر چوڑیاں بیچا کرتا تھا اور وہ خود گھر پر تنہا ہوتی تھی۔ ایسے وقت میں کسی مرد کا آنا شک سے خالی نہ ہو سکتا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس دن بیگاں نے بال دھو کر بکھیر رکھے تھے۔ چست قمیص پہن رکھی تھی . . . اور پھر کھڑکی میں سے کسی مرد کا جھپٹ کر بڑھتا ہوا ہاتھ دکھائی دیا۔ بیگاں قلانچ بھر کر ہنستی ہوئی پرے چلی گئی اور اس کی رنگین چندیا مرد کے ہاتھ میں رہ گئی۔ اس وقت بیگاں کے لمبے اور گھنے بال کیسے لہرائے تھے . . اور پھر بیگاں نے اپنے گھر کی کھلی کھڑکی بند کر دی . . اور آج گوری نے نئی خبر سنائی تھی۔ کہ کل رات بیگاں نئے تھانیدار بازخاں کے ہاں پہنچی ہوئی تھی۔ گوری نے کیسے گال پر انگلی رکھ کر کس قدر پُراسرار انداز میں یہ واقعہ بیان کیا۔ نیا تھانیدار دو ایک مرتبہ ان کے گھر کے آگے سے گزرا تھا۔ وہ ہٹا کٹا لمبا چوڑا طرّے باز شخص تھا . . . کیا ان عورتوں کو خدا کا بھی کچھ خوف نہیں اور دوزخ میں حرام کار عورتوں کو جو عبرتناک سزائیں دی جائیں گی . . . پھر وہ اپنے ذہن پر زور دے کر سوچنے لگی کہ فاحشہ عورتوں کو مرنے کے بعد کون کونسی اذیتیں دی جائیں گی۔

اب تو ایک بجنے کو تھا۔ وہ یونہی بیکار وقت گنوا رہی تھی ۔ اس نے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے اور ان پر زور دے کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اندر والے کمرے میں گئی اور پھیلے ہوئے سامان پر نگاہ ڈالی۔ چارپائیاں الٹی سیدھی کھڑی یا بچھی تھیں۔ بڑے پلنگ کے پایوں کے نیچے رکھی ہوئی اینٹیں ادھر ادھر کھسک گئی تھیں۔ کھونٹی پر لٹکا ہوا بڑا ترازو ایک طرف کو لٹک گیا تھا اور اس کے اوپر تلے رکھے ہوئے پلڑوں پر پڑے ہوئے لوہے کے باٹ کھسک کر نیچے گرنے ہی کو تھے۔ وہ رضائیاں اور گدے جو جگہ کی کمی کی وجہ سے چھت پر لگے ہوئے کنڈوں میں اڑا دیئے گئے تھے۔ ان پر دو دو انگل گرد جمی ہوئی تھی۔ مکڑیوں کے لمبے چوڑے جالے ادھر اُدھر کونوں میں لہلہا رہے تھے۔ اس کے دل کا بوجھ اور بھی بڑھ گیا۔ یہ سب کام کرنا تھا۔ اس نے بے دلی سے بانس کے سرے پر جھاڑو باندھی اور جالے صاف کرنے کے لئے اسے اُٹھایا۔ ادھر اتفاق سے اس نے پلنگ کا سہارا لیا تو اس کے پایوں تلے سے اینٹیں کھسک گئیں اور پلنگ دھم سے زمین پر آن رہا۔ اوپر سے روشنک کے کھلونوں کا ٹرنک کھسک کر گر پڑا اور کھلونے ادھر اُدھر بکھر گئے۔ اسی گڑبڑ میں بانس ہاتھوں سے چھوٹ گیا اور باٹ فرش پر لڑھک گئے۔ اسی افراتفری میں اُس نے زور سے بانس پیچھے ہٹایا تو وہ چھت پر لٹکی ہوئی رضائیوں سے جا ٹکرایا۔ وہ بھی جیسے اشارے کی منتظر تھیں دھما دھم اس کے سر پر گرنے لگیں . . . ایک مرتبہ تو یوں معلوم ہوا جیسے کمرے میں زلزلہ آ گیا ہو . . . اور جب یہ ہنگامہ ختم ہوا تو کمرے کی حالت اور بھی ابتر دکھائی دینے لگی۔ اب کام اور بھی بڑھ گیا تھا۔ اس نے چڑچڑے پن سے بانس پرے پھینک دیا۔ اور خود زور زور سے پاؤں مارتی ہوئی باہر والے کمرے میں چلی آئی۔

صبح ہی سے اس کی طبیعت مضمحل سی تھی۔ آج بسم اللہ ہی لڑائی سے ہوئی تھی۔ اس نے دوپٹہ اتارا۔ پسینہ پونچھا۔ دوپٹے کو رسی پر اُچھال دیا۔ اور پھر گردن سے قمیص اُٹھا کر دستی پنکھے سے ہوا کرنے لگی۔

کھڑکی میں سے سامنے کے مکانات کا ختم ہوتا ہوا سلسلہ دکھائی دے رہا تھا۔ صابن اور میل والا پانی بہہ کر کچی سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔ نیچے کی منزل والے غریب لوگوں کی کھٹمل بھری چارپائیاں دھوپ میں پڑی تھیں اور ان کے غلیظ کپڑے ہوا میں لہرا رہے تھے . . . اُوپر کی منزل پر کھڑکی میں سے بیگاں سر باہر نکالے کھڑی تھی۔ وہ ادھر اُدھر نظریں دوڑا رہی تھی۔ تیز چمکتی ہوئی دھوپ میں اس کا چہرہ کس قدر حسین دکھائی دے رہا تھا۔ موئی حرام کار روز بروز موٹی ہوتی جا رہی تھی اور گالوں کی سرخی بڑھتی جا رہی تھی۔ کیسی صاف شفاف سرمگیں آنکھیں تھیں اس کی . . . ہونٹ کیسے ترشے ہوئے تھے . . . اس کے بالوں کی ایک لٹ بار بار اس کے چہرے پر آن گرتی تھی جسے وہ ہر مرتبہ پیچھے ہٹا دیتی تھی . . . اس وقت اس کے ہونٹوں پر مسرت انگیز اطمینان کی مسکراہٹ کھیل رہی تھی . . .

زینب نے کھڑکی بند کر دی اور دوسری کھڑکی کھلی رہنے دی۔ جہاں سے اسے دور تک پھیلے ہوئے مناظر دکھائی دے رہے تھے۔ اس طرف کوئی مکان نہ تھا۔ ویران زمین کا بہت بڑا ٹکڑا حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا تھا۔ زمین بنجر تھی۔ اس پر کبھی کوئی فصل نہ اُگ سکتی تھی۔ اِکا دُکا رُوکھا سوکھا درخت کھڑا دکھائی دے جاتا یہ ہندوؤں کا مرگھٹ تھا۔ جس کے چاروں طرف پکی اینٹوں کی ایک پست سی دیوار کھینچ دی گئی تھی۔ چار دیواری کے اندر ایک کونے میں چھ کھڑکی والا

ایک کنواں تھا۔ دن کو تیز دھوپ کی وجہ سے ہوائیں بھننے سے اُڑتے ہوئے دکھائی دیا کرتے تھے یا رات کو مرگھٹ میں پڑے ہوئے لاشوں کے کنڈے پچنے اور چنگاریوں کی ایک پھلجھڑی آسمان کی طرف اُڑ جاتی۔ . . . .

اس کی آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں۔ اور پھر جیسے مکان کے باہر کی طرف دیوار کے ساتھ سائیکل رکھنے کی آواز آتی۔ کبھی کبھار اس کا خاوند اس طرف سے گذرتا ہوا چند گھڑیوں کے لئے اِدھر بھی آن نکلتا تھا۔ ہوا کے گھوڑے پر سوار . . . چوکھٹ کے اندر جیسے دھم سے پاؤں رکھنے کی آواز آتی۔ . اس کی ادھ کھلی سی آنکھیں دیوار میں سے کڑی ہوئی لکڑی کی سیدھی موٹی کھونٹی پر جم گئیں۔ جس کے نیچے تھیلا لٹکا ہوا تھا۔ . . . کیسا بے کیف سا منظر تھا اس نے جیسے آنکھیں پھیر لینے کے خیال سے سر ایک طرف کو ڈال دیا۔ اور اس طرح بغیر کسی خاص کوشش کے اس کی نظریں چلچلاتی ہوئی دھوپ میں پھیلی ہوئی بنجر زمین پر دوڑنے لگیں۔ . . . حسب معمول گرد اور سوکھے پتوں کا ایک بگولا اُٹھا اور ایک بڑے بھاری ستون کی طرح دھرتی کی چھاتی پر گھومنے لگا۔ اس قدر تیز گردش۔ . . جیسے دھرتی کے سینے کو پھاڑ کر نہ معلوم کس طرف کو نکل جائے گا۔ . . لیکن دھرتی خاموش اور بے حس تھی۔ وہ لاش کی طرح چُپ چاپ لیٹی تھی بگولا بڑی تندی کے ساتھ گھومتا ہوا پرے چلا چلتا کبھی نزدیک دکھائی دینے لگتا۔ اور کبھی یوں معلوم ہوتا جیسے زمین کے اندر ہی کہیں غائب ہو گیا ہو اور کبھی پھر جھوم کر اُٹھ کھڑا ہوتا۔ . . . وہی ستون کا ستون۔ . . اس قسم کے بگولے ہمیشہ اُٹھا کرتے تھے۔ اسی طرح تیزی اور تندی دکھا کر ختم ہو جاتے تھے۔ لیکن زمین ویسی کی ویسی رہ جاتی۔ اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوتی تھی۔ . . . یہ منظر کس قدر خشک، بے مزہ اور بے رنگ سا تھا۔ . . آہستہ آہستہ پاؤں کی چاپ رخصت ہوتی ہوئی معلوم ہوئی۔ . غالباً اس کا خاوند چلا گیا تھا۔ اس نے کھڑکی سے منہ پھیر کر کروٹ بدلی۔ . . اس کے جسم کا جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا۔ ہڈیاں جیسے پس کر رہ گئی تھیں۔ چھاتیاں جل رہی تھیں۔ ہوا گرم اور بوجھل تھی۔ دوپہر کے وقت کوئی کتا تک بھونکتا سنائی نہ دیتا تھا۔ صرف کہیں بہت دور کوئی شخص گنڈاسے سے چارا کاٹ رہا تھا۔ . . . .

مہندرناتھ

زینت

"کھڑکی کھول دو ؟" اُس نے میری طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ اور میرا جواب سنے بغیر اس نے کھڑکی کھول دی۔

کھڑکی کھلتے ہی ہوا کا ایک زبردست جھونکا آیا۔ اور ڈبے میں ایک عجیب ٹھنڈک سی پھیل گئی۔ باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ اُس نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ اور پھر کہنے لگا۔ میں ہلکی ہلکی بارش میں عجیب حظ سا محسوس کرتا ہوں۔ ہلکی، ملائم، بے آواز بارش۔ یہ ننھی ننھی بوندیں کتنی خوبصورتی سے ان سرسبز پتوں پر گر رہی ہیں۔ اور ہوا خوشی سے جھومتی ہوئی ان گرتے ہوئے پھولوں کو چوم رہی ہے۔ یہ سرسبز پتے، یہ سرخ پھول، کیا تمہیں پسند نہیں۔ آخر کیا چاہتے ہو تم ؟

"چائے پیو گے ۔ آج میں نے نیا ٹی سیٹ خریدا ہے۔ اس پیالے کی طرف دیکھو کتنا حسین اور خوبصورت ہے۔ میں پرانے پیالوں میں چائے نہیں پیتا۔ ہمیشہ دلفریب رنگین نئے پیالوں میں چائے پیتا ہوں۔ لو چائے پیو !

"چائے سے میرا جگر خراب ہو جائے گا۔"

"تو سگرٹ پیو، بالکل نیا تازہ۔ ایک کش تو لگاؤ۔ اگر خوشبو سے دماغ معطر نہ ہو جائے۔ تو پھر گلہ کرنا۔ ارے تم سگرٹ بھی نہ پیو گے۔ مجھے تو سگرٹوں سے محبت ہے۔ چائے کی پیالی سے محبت ہے۔ اور یا دھر تم ہو کہ عورتوں کی محبت میں سرگرداں نظر آتے ہو۔ عورتوں کے پیچھے مارے مارے پھرتے ہو۔ جہاں عورت نظر آئی وہیں جم گئے۔ خیر یہ رضائی اوڑھ لو۔ دیکھو کتنی پیاری ٹھنڈک ہے جسم میں آہستہ آہستہ سرایت کرتی ہے۔ بالکل شراب کے نشے کی طرح۔

مجھے اس رضائی سے محبت ہے۔ ہر چھ ماہ بعد رضائی کو بدل لیتا ہوں رات کے وقت جب سردی پاؤں سے بڑھتی ہوئی دماغ کی طرف جاتی ہے تو میں رضائی کو اپنے ارد گرد لپیٹ لیتا ہوں۔ کتنا سکون ملتا ہے اس نرم اور گرم رضائی میں۔ جیسے کسی حسین عورت کے گرم جسم سے لپٹا رہتا ہوں۔

رضائی عورت سے بدرجہا اچھی ہے۔ اسے نہایت آسانی سے ہر چھ مہینے کے بعد بدلا جا سکتا ہے۔ نئی بنوائی جا سکتی ہے لیکن دوست! عورت کو بدلنا اتنا آسان نہیں، زندگی بھر ایک ہی عورت سے شادی کر کے انسان کسی کام کا نہیں رہتا۔ صرف ایک بیوی کے لئے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ بیوی کے ناز نخرے برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ دن بھر شکوے شکایتیں، مار دھاڑ، بچوں کا شور، ایک غوغائے عظیم، ایک مسلسل جہنم۔ میاں! شادی کبھی نہ کرنا۔ ارے اس شادی میں نے بھی نہیں کی —— اور کبھی نہیں کروں گا ——

باہر اسی طرح بارش ہو رہی تھی۔ ننھی ننھی بوندیں، آہستہ آہستہ گر رہی تھیں۔ پتے اسی طرح سبز تھے۔ پھول بارش میں نہا رہے تھے۔ ایک کبوتر کھڑکی کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اور کرنے لگا غٹر غوں غٹر غوں

"میری طرف کیوں گھور گھور کر دیکھ رہے ہو۔ ارے ہٹاؤ اس کبوتر کو۔ یہ کیوں چلا رہا ہے۔ یہ بھی آئے عشق کرنے۔" اس نے تالی بجائی کبوتر ایک لمحہ کے لئے پھڑپھڑایا۔ اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

"کیا پوچھنا چاہتے ہو۔ ارے "زینت" —— کے متعلق کچھ پوچھنا چاہتے ہو۔ بڑے شریر ہو تم۔ میں خود اس قصے کو نہایت وضاحت سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ لوگوں نے میرے متعلق غلط افواہیں اڑا دی ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ زینت میری داشتہ تھی، کوئی کہتا ہے کہ میں زینت سے شادی کرنے والا تھا۔ لیکن زینت نے انکار کر دیا۔ کیونکہ میں ہندو تھا۔ کوئی کہتا ہے میں نے زینت اور عارف کے درمیان لڑائی کرائی۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ میں لوگوں کی پروا نہیں کرتا۔ لیکن تمہاری پروا ضرور کرتا ہوں۔ تم کافی ذہین اور سمجھدار ہو۔ اس دنیا میں ذہین آدمی بہت کم ملتے ہیں اس لئے تمہیں ہی راز کی باتیں بتاؤں گا ؟ یہ واقعہ میرے ذہن پر اس طرح حاوی ہو گیا ہے کہ میں اس کے بوجھ

تلے دب گیا ہوں میں اس بوجھ کو اتارنا چاہتا ہوں تاکہ میرا جی ہلکا ہو جائے ——— زینت کو تم نے کبھی اسٹوڈیو میں دیکھا ہوگا۔ مجھے اس کی آنکھیں پسند تھیں۔ اگر تم نے اسے غور سے دیکھا ہے تو تمہیں اس بات کا ضرور احساس ہوا ہوگا۔ کہ وہ خود اتنی خوبصورت نہ تھی جتنا شباب نے اُسے خوبصورت بنا دیا تھا۔ وہ اکثر اپنے خاوند کے ساتھ سٹوڈیو میں آتی۔ اُس کا خاوند ——— جو بالکل سوالی لگتا تھا۔ جونک کی طرح اس کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ اس کا خاوند کافی آوارہ اور اوباش قسم کا آدمی تھا۔ زینت کے خاوند کو علم تھا کہ اُسے اس سے اچھی بیوی کبھی نہ مل سکے گی۔ اسی لئے وہ زینت سے پل بھر جدا نہ ہوتا۔ زینت پر بہت سے لوگ فریفتہ تھے۔ سٹوڈیو کے کئی ایکٹر اُس پر جان دیتے تھے لیکن کسی کو ہمت نہ پڑتی تھی کہ آگے بڑھ کر اظہار محبت کر سکے۔ کبھی زینت کے خاوند سے ڈرتے تھے۔ خوف کھاتے تھے وہ جانتے تھے کہ اگر غلطی سے کسی نے زینت کے سامنے اظہار عشق کر دیا۔ تو اس کی لاش سڑک پر خون میں لتھڑی ہوئی ملے گی۔ شاید زینت خود بھی اپنے خاوند سے ڈرتی تھی۔ اُس کے ذہن پر ایک قسم کا جمود طاری تھا۔ اس کی باتوں، اس کی چال ڈھال، اس کی ہنسی، اس کی مسکراہٹ کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا جیسے وہ پرواز کے لئے تیار ہے۔ لیکن کس کے ساتھ ——— ؟ شاید ابھی تک اُس نے یہ فیصلہ نہ کیا تھا۔ زینت کا خاوند زینت کی خوب خاطر مدارت کرتا۔ اُسے اچھے اچھے کپڑے سلا کر دیتا۔ سٹوڈیو میں اس کا کھانا لاتا۔ اگر رات کو شوٹنگ ہوتی۔ تو وہ درخت کے نیچے بیٹھ کر زینت کا انتظار کرتا رہتا۔ اور جب شوٹنگ ختم ہوتی تو دونوں اکٹھے گھر جاتے۔ اگر وہ کبھی زینت کو کسی خوبصورت لڑکے سے بات چیت کرتے دیکھ لیتا تو اُس کا خون کھول اٹھتا۔ رات بھر زینت کو گالیاں دیتا رہتا۔ اور جیب سے پشاوری چاقو نکال کر کہتا۔

سالی اگر دوسرے سے عشق کیا تو اس چھرے سے پیٹ چیر دوں گا۔ ناک کاٹ لوں گا!

اور زینت چھرے کو دیکھ کر چپ ہو جاتی۔ چاقو دیکھ کر اُس کا دل دہل جاتا۔ اور وہ بستر میں منہ چھپا کر رونے لگتی۔

اسی دوران میں عارف سٹوڈیو میں نوکر ہوا۔ دیکھنے میں خوبصورت وجیہہ دلکش جوان لیکن جب باتیں کرنے لگتا تو ساری دلکشی جاتی رہتی ایسا محسوس ہوتا کہ اگر یہ شخص باتیں نہ کرے تو اچھا ہے۔ عارف خشک طبیعت کا آدمی تھا۔ وہ بہت کم باتیں کرتا ہنستا تو چپکے سے مسکراتا تو چپکے سے، بیٹھتا تو چپکے سے، مجھے اس کی چپ سے نفرت تھی۔ وہ انسان ہی کیا جو باتیں نہ کر سکے۔ جو دوسروں کو باتوں سے مرعوب نہ کر سکے؛ یوں تو عارف کافی ذہین اور عقلمند تھا لیکن اُس ذہانت کا کیا فائدہ جو دوسروں کو اپنی طرف نہ کھینچ سکے۔

مگر لڑکیوں کے معاملے میں عارف کافی خوش قسمت تھا۔ وہ زینت کی زندگی میں چپکے چپکے داخل ہوا۔ دونوں میں کسی ایک کو بھی معلوم نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور اُس کے بعد کیا ہوگا۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف کھنچے چلے آ رہے تھے۔ بدمست شرابیوں کی طرح ——— عارف میں ایک خوبی تھی کہ وہ خوب شراب پی سکتا تھا۔ کتنے ہی جام پی جاتا لیکن کم بخت بدمست نہ ہوتا۔ آپے سے باہر نہ ہوتا۔ شراب پی کر اُس کی ٹانگیں نہ لڑکھڑاتیں کسی کو گالیاں نہ دیتا۔ واہیات مذاق نہ کرتا۔ قے نہ کرتا بس جام پر جام چڑھائے جاتا۔ اور مجھے تم جانتے ہی ہو کہ دو جام پینے کے بعد گھر سے باہر دوڑنے لگتا ہوں۔ عورتوں کو چھیڑتا ہوں، مردوں سے لڑتا ہوں، پاؤں لڑکھڑانے لگتے ہیں۔ زبان میں لکنت آ جاتی ہے؛ اور اگر زیادہ پی لوں تو قے پر قے کرنے لگتا ہوں ——— تمہاری قسم۔ نہایت ہی بیوقوف اور ناکام شرابی ہوں ——— "عورت اور شراب" میرا مطلب ہے زینت اور شراب ——— دونوں اچھی چیزیں ہیں۔ مگر مجھے دونوں راس نہ آئیں۔ دونوں چیزیں، مجھے بدمست کر دیتی ہیں۔ شراب پی کر بہک جاتا ہوں، اور خوبصورت عورت دیکھ کر بھی ——— اور عارف! کم بخت عارف! خاموش عارف مجھ سے زینت چھین کر لے گیا یعنی زینت عارف کے پاس کیسے پہنچی ——— یہ بھی ایک دلچسپ قصہ ہے۔ ان دنوں ہم سب نے مل کر تہیہ کیا کہ ایک ڈرامہ اسٹیج کیا جائے۔ زینت کے خاوند کی منت سماجت کی اور بڑی مشکل سے زینت کو سٹیج پر کام کرنے کے لئے راضی کیا۔ اس ڈرامے میں، میں نے ہیرو کا پارٹ کیا۔ عارف

اور زینت نے بھی! ——— اس کھیل کے دوران میں عارف اور زینت ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ عارف نہایت خاموشی سے سگریٹ سلگاتا، اور دھوئیں کو ہوا میں چھوڑتے ہوئے زینت کی طرف دیکھنے لگتا۔ زینت چپ تھی، خاموش تھی لیکن تیار تھی۔ شاید بھاگنے کا وقت آگیا تھا۔ میں سب کچھ سمجھ گیا لیکن زینت کے خاوند کو اس بات کا علم تک نہ ہوا۔ شاید اُسے اپنے پشاوری چاقو پر ناز تھا لیکن زینت کے پر وہاں اس چاقو کے وار سے بہت آگے جا چکے تھے۔ زینت نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اب اپنے خاوند کے ساتھ نہیں رہے گی۔ اور عارف اس موقع کی تاک میں تھا کہ کب زینت اس کی آغوش میں آتی ہے ———

زینت کے خاوند اور عارف میں بہت فرق تھا۔ زینت کا خاوند اَن پڑھ، شرابی، اجڈ اور گنوار تھا لیکن عارف پڑھا لکھا، ذہین، خوبصورت اور ایک اچھے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ زینت عارف کی طرف کیوں راغب ہوئی؟ کیا یہ لیلیٰ مجنوں کی محبت تھی، یا شیریں فرہاد کی، [illegible] دوست! یہ لیلیٰ مجنوں کی محبت نہ تھی۔ زینت اپنے خاوند کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھی۔ وہ کسی ایسے آدمی کی تلاش میں تھی۔ جو اُسے ایک اچھا STATUS دے سکتا۔ جو اُسے اس گندی نالی سے نکال کر ایک اعلیٰ پائے کی ایکٹرس بنا سکتا۔ ابھی تک تو وہ چھوٹے موٹے پارٹ کرتی رہی تھی لیکن اب اُسے آگے بڑھنے کی تمنا تھی۔ زینت کی پرواز میں محبت تھی، جنون تھا لیکن یہ محبت محض عرشی نہ تھی ایک Calculated Step تھا آگے بڑھنے کا۔ زینت نچلے طبقے کو چھوڑ کر متوسط درجے میں آنا چاہتی تھی۔ جہاں جہالت کم ہے۔ لوگ پڑھے لکھے ہیں۔ روپیہ نچلے طبقے سے زیادہ ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں ——— اور یہ سب باتیں سوچ سمجھ کر ایک صبح زینت عارف کے مکان کی طرف چل دی ——— اور عارف نے چپکے سے زینت کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ عارف خوش تھا۔ یہ اس کے خاموش عشق کی پہلی فتح تھی۔ اور شاید میری آخری شکست تھی۔ میں اس ڈرامے میں کیا کرتا رہا۔ مجھ پر کیا گزری۔ زینت میری طرف کیوں مائل نہ ہوئی۔ اس کی وجہ میں نہیں جانتا لیکن مجھے اس بات کا بہت رنج ہوا کہ زینت عارف کے پاس کیوں چلی گئی۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا۔ اپنے آپ سے نفرت سی ہونے لگی تھی۔ اپنی صورت سے گھن آنے لگی تھی۔ اور دوست یار کہنے لگے تھے ———

"ارے کل کا لونڈا، وہ زینت کو اپنے گھر لے جائے۔ اور تم منہ دیکھتے رہ جاؤ۔ تمہارا اور عارف کا کیا مقابلہ۔ عارف تمہارے سامنے چھا رنگا ہے، چار۔ سالا بازی لے گیا اس بار تو۔"

اور یہ سب کچھ سن کر میں کڑھتا۔ اپنے آپ کو گالیاں دیتا۔ اور جب کچھ نہ بن پڑتا تو عارف زینت کو گالیاں دینے لگتا اور سوچتا عارف اور زینت میں کبھی نہ بن سکے گی۔ یہ چار دن کی چاندنی ——— اور پھر اندھیری رات۔ پھر دیکھنا دونوں آپس میں کس طرح لڑیں گے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جائیں گے ——— اور اس دوران میں کبھی کبھی عارف تھا۔ اس کے ساتھ اکثر زینت ہوتی۔ دونوں اکٹھے سیر کرنے جاتے۔ سنیما دیکھنے جاتے۔ بازار جاتے اور میں دن بھر کڑھتا رہتا اور اس کوشش میں سرگرداں رہتا۔ کہ کسی طرح ان دونوں میں اَن بن ہو جائے۔

کبھی کبھی مجھے اُمید بندھ جاتی کہ زینت کا خاوند عارف کو چاقو مار کر ضرور ہلاک کر دے گا۔ لیکن کافی عرصے تک زینت کا خاوند کہیں بھی نہ دکھائی دیا۔ ایک دن میں بازار سے گزر رہا تھا کہ زینت کا خاوند مل گیا اس کے منہ سے شراب کی بو آرہی تھی۔ اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں اس نے مجھے دیکھا اور وہیں رک گیا۔ جیب میں سے پشاوری چاقو نکالا اور ایک ہی جھٹکے سے چاقو کا پھل اندھیرے میں بجلی کی طرح کوند گیا۔

میں لپک کر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ پھر آگے بڑھا۔ اس کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے۔ میرے قریب آکر اُس نے کہا۔

"بابو! عارف کہاں ہے؟"

"مجھے کیا معلوم؟"

"سالا کہیں مل جائے تو پیٹ چیر دوں، کیا یہ شریفوں کے لچھن ہیں۔ اُلو کا پٹھا میری بیوی چھین کر لے گیا۔ شرم نہیں آئی اُس حرامزادے کو، بابو میں تو تمہارا لحاظ کرتا ہوں۔" آخری فقرہ سن کر میری جان میں جان آئی۔ "نہیں تو سالے کو کب کا مار دیا ہوتا۔ سالا

زینت کو کبھی نہ چھوڑوں گا۔ مجھے چھوڑ کر کہاں جائے گی۔ بابو میں موالی ہوں موالی، مجھے اپنی جان کس کی پروا نہیں۔ میں نے کیوں کے خون کر دیئے ہیں۔ لیکن پولیس کی جرأت نہیں پڑتی کہ میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ تمہاری قسم بابو! دونوں کو چیر پھاڑ کر رکھ دوں۔ لیکن تمہارا لحاظ کرتا ہوں۔"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اور کہا۔ گھبراؤ نہیں دوست! گھبراؤ نہیں۔ زینت تمہاری ہے اور تمہاری ہو کر رہے گی۔ عارف زینت سے شادی نہیں کرے گا۔ عارف کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ زینت کو کچھ دن اپنے پاس رکھے گا۔ اور پھر زینت بازاروں میں گھومتی ہوئی نظر آئے گی۔ تمہارے پاؤں چومے گی۔ اچھا یہ چاقو ذرا جیب میں ڈال لو۔ ارے مرد ہو کر عورت کے لئے روتے ہو۔

تم ایک نہیں سو عورتیں رکھ سکتے ہو۔ عورت کے لئے خون کرنا گناہ ہے۔ چودہ سالہ قید کا گناہ عظیم ہے۔ اور پھر تم جوان ہو، عورت تمہارے پاؤں کی جوتی ہے۔ فکر نہ کرو۔ زینت خود تمہارے پاس آئے گی۔ اور اگر وہ نہیں، تو کوئی اور آئے گی۔

" نہیں بابو! میں سالی کو ایسے نہیں چھوڑوں گا۔ جب تک روپے نہ دے گی طلاق نہ دوں گا۔"

" ٹھیک ہے، سو فیصدی درست کہتے ہو۔ طلاق نہ دینا جب تک تمہیں روپے نہ ملیں۔"

" سالی سمجھتی کیا ہے۔"

خوب سمجھتی ہے تمہیں، میں نے اپنے آپ سے کہا۔ سالا سود خور پٹھان ہی نکلا۔ چلے تھے چھرا مارنے۔ بات ٹھہری آ کر روپوں پر ———

زینت کے خاوند نے چاقو جیب میں ڈالا اور مجھے آداب کرتا ہوا اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

اُس دن سے مجھے زینت کے خاوند سے نفرت ہو گئی۔

زینت نے اپنے خاوند کو کچھ روپے دے کر طلاق لے لیا۔

اب زینت اور عارف اکٹھے رہتے تھے۔ عارف کو کافی عرصے کے بعد ایک حسین لڑکی ملی تھی۔ اس نے اس حسن کی شراب کو جی بھر کر پیا۔ زینت نے اپنے آپ کو عارف کے حوالے کر دیا۔ زینت خوش تھی عارف خوش تھا۔ اُس کی آغوش میں زینت تھی، خوبصورت، جوان رسیلی۔ وہ زینت سے عشق کر سکتا تھا۔ محبت کر سکتا تھا۔ اس کے سیاہ چمکیلے بالوں سے کھیل سکتا تھا۔ اُس کے رخساروں کو چوم سکتا تھا۔ بلکہ چومتا تھا۔ اس کے جسم سے پیار کرتا تھا۔ اس کے جسم کی لطیف خوشبو سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ اور سب کچھ کرتا تھا لیکن جب زینت نے شادی کے لئے کہا۔ تو عارف کا بنا بنایا گھروندا دھم سے نیچے آ پڑا۔

عارف زینت سے شادی کر لے؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ زینت اس سے پہلے ایک موالی کے گھر سات برس تک رہ چکی تھی۔ اور وہ ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اگر وہ زینت سے شادی کر لے، تو اُس کے ماں باپ کیا کہیں گے۔ عارف کو اپنے ماں باپ کا اتنا ڈر نہ تھا۔ دراصل وہ خود زینت سے شادی نہ کرنا چاہتا تھا۔ زینت اُس کے پاس رہ سکتی ہے۔ اس کے گھر میں رہ سکتی ہے۔ وہ اُسے ایک داشتہ بنا کر رکھ سکتا ہے لیکن بیوی بنا کر نہیں ———

اس سے پہلے عارف کئی گھاٹنوں سے ایسا تعلق قائم کر چکا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ وہ ہر گھاٹن کو اپنی بیوی بنا لیتا۔ گو زینت گھاٹنوں سے بدرجہا اچھی تھی لیکن اس موالی کی آغوش ——— ؟

توبہ! توبہ!! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کا ذہن یہ گوارا نہیں کر سکتا۔ لوگ کیا کہیں گے۔

" ارے۔ اس موالی کی بیوی کو گھر میں رکھ لیا۔"

" کیا عارف کو کسی شریف گھرانے کی لڑکی نہ مل سکتی تھی!"

" اجی! ان ایکٹروں کو ان باتوں کی کیا پروا۔"

" فلم انڈسٹری میں پڑھے لکھے نوجوان بھی آوارہ ہو جاتے ہیں۔"

عارف یہ طعنے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ نہ بچا وہ اس مفر دردی کو مول لینا چاہتا تھا۔ اس کے ذہن میں کبھی اس بات کا خیال ہی نہ آیا تھا۔ کہ زینت شادی کے لئے اپنے آپ کو یوں بیدھڑک پیش

رہے گی۔

اسی بات پر عارف اور زینت کی لڑائی ہو گئی۔ عارف نے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ اور زینت ایک ہوٹل میں چلی گئی۔

اس واقعہ کے بعد زینت میرے پاس آئی۔ میں خوش تھا، کہ زینت نے عارف کو چھوڑ دیا ہے۔ اور میں دوستوں کو اس لڑائی کے قصے سناتا۔ عارف دراصل کمینہ ہے۔ شرم نہیں آئی۔ زینت کو گھر سے نکالتے ہوئے میاں! تم ایک عورت سے عشق کرتے ہو، محبت کرتے ہو اور عورت سب کچھ تم پر نثار کرتی ہے۔ وہ اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر تمہارے پاس آتی ہے۔ تم ہر طریقے سے اس کے جسم سے لذت اخذ کرتے ہو۔ اور جب وہ شادی کے لئے کہتی ہے تو صاف انکار کر دیتے ہو؟ کہاں کی ہے یہ شرافت۔ سچ کہتا ہوں، عارف نہایت ہی ذلیل انسان ہے، اسے کبھی عارف نے ایک بار بھی زینت سے نہ کہا۔ کہ آؤ تمہیں ساڑھی خرید دوں کوئی نیا سینڈل منگوا دوں، سونے کی انگوٹھی لے دوں۔ یا کبھی کانوں کے آویزے ہی خرید کر دیتا۔ میں نے اتنا کم ظرف انسان کبھی نہیں دیکھا۔ مجھے ایسے لونڈوں سے نفرت ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ زینت میرے پاس آئی۔ بڑی گھبرائی ہوئی تھی بچاری۔ میں نے اُسے ڈھارس دی اور کہا۔

زینت، تم گھبراؤ نہیں۔ تمہیں جس چیز کی ضرورت ہو۔ مجھ سے لو۔ تم یہاں رہ سکتی ہو۔ لیکن تم میرے پاس کیا کرو گی رہ کر۔ وہ ہوٹل اچھا ہے۔ اُس میں رہو لیکن تم یہاں آ سکتی ہو۔ یہاں کھانا کھاؤ، مجھ سے باتیں کرو، ہنسو، کھیلو اور بھول جاؤ۔ عارف کو، وہ کمینہ ہے۔ تمہیں اس دنیا میں کئی عارف ملیں گے۔ جوان لڑکی کو دیکھ کر کس کا دل زور زور سے دھڑکنے نہیں لگتا۔ وہ مسکرا پڑی۔ اور پھر اس دن کے بعد وہ ہر روز میرے گھر آنے لگی۔ میں نے اُسے ریشمی ساڑھیاں خرید کر لے دیں۔ نئے سینڈل خرید کر دیئے۔ میں اُسے بازار لے گیا، سنیما لے گیا، وہ اکثر میرے ساتھ رہتی۔ میں جو کہتا اس پر عمل کرتی۔ کئی بار اُس نے میرا کھانا پکایا۔ ایک رات کا ذکر ہے۔ رات ٹھنڈی اور یخ بستہ تھی۔ وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کا ہاتھ اپنے سینے پر تھا۔ میں نے کہا۔ زینت۔ میرے قریب آؤ!

وہ میرے قریب آگئی۔

اس چارپائی پر بیٹھو۔

وہ چارپائی پر بیٹھ گئی

سینڈل اتار دو۔ اُس نے سینڈل اتار دیئے۔

رضائی اوڑھ لو۔ اُس نے رضائی اوڑھ لی۔

آرام سے لیٹ جاؤ۔ وہ آرام سے لیٹ گئی۔

اس کی ٹانگیں میری ٹانگوں کے ساتھ چھو رہی تھیں۔

میں نے کہا۔ اب بیٹھ جاؤ۔

اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

میں نے کہا۔ تم خوبصورت ہو۔

اور وہ مسکرانے لگی۔

میں نے کہا۔ زینت سے نہیں۔ بلکہ اپنے آپ سے۔ کہ وہ آج تمہارے پاس ہے، تمہارے قریب ہے، وہ اکیلی ہے۔ تم اکیلے ہو۔ باہر گھُپ اندھیری رات ہے۔ ہوا ٹھنڈی اور یخ بستہ ہے۔ زینت خوبصورت ہے، جوان ہے، اس کی کمر میں لچک ہے۔ باہوں میں گداز ہے۔ خون میں گرمی ہے۔ جسم میں حدت ہے۔ آنکھوں میں شراب ہے۔ وہ تمہاری ہر بات مانتی ہے۔ تمہاری عزت کرتی ہے۔ تمہیں چاہتی ہے۔ تمہیں پیار کرتی ہے۔ تم نے کئی بار اس کے گالوں کو ہاتھ لگایا۔ لیکن وہ چپ رہی۔ کئی بار وہ تمہارے سینے سے چمٹ گئی۔ لیکن تم خاموش رہے۔ تم زینت سے الگ تھلگ رہے۔ تم اُس کے جسم کو چاہتے ہوئے بھی دھتکارتے رہے۔ اُس کے جسم کی مہک سے لطف اندوز ہو کر بھی اُس سے دور رہے آخر یہ کب تک۔ وہ کب تک تمہارے پاس اس طرح رہے گی۔ وہ چلی جائے گی اور ضرور چلی جائے گی۔

لیکن ان باتوں کو جانتے ہوئے بھی میں زینت سے جسمانی طور پر الگ تھلگ رہا۔ میرے دل میں صرف ایک کانٹا تھا۔ اور وہ تھا عارف زینت عارف کے ساتھ رہ چکی ہے۔ عارف کے پاس رہنے کا اتنا رنج نہ تھا۔ جتنا اس بات کا کہ میرے ہوتے ہوئے اس نے عارف کو کیوں پہلے انتخاب کیا۔ اگر عارف کے پاس جانے سے پہلے وہ میرے پاس آتی۔

تو میں مرد ہوں۔ اس کے ساتھ پیار کرتا۔ اُس سے شادی کرتا۔ لیکن اب میں نے تنگ کیا کبھی ہو گئے۔ عارف سے عارفہ کی محبت کو لے اٹھا۔ میاں دوسروں کا لگا ہوا کھلتے ہو۔ تم عارف سے زیادہ خوبصورت ہو۔ تم چاہو تو دنیا کی بہتر سے بہتر عورت کو حاصل کر سکتے ہو۔ اور میں چپ ہو جاتا تھا۔ اور سوچتا اور پھر سوچتا۔ کبھی کبھی خیال آتا۔ کہ ان چاندنی راتوں کو برباد نہ کیا جائے جیب میں روپیہ ہے جسم میں خون ہے۔ خون میں گرمی ہے۔ میں اکیلا ہوں۔ عورت میرے قریب ہے۔ میں زینت کے جسم کو چاہتا ہوں۔ زینت میرے جسم کو چاہتی ہے —— لیکن کم بخت عارف؟ عارف کا خیال آتے ہی میں پریشان ہو جاتا۔ سارے خون میں ایک ٹھنڈی سی لہر دوڑ جاتی۔ سارا جوش و خروش ختم ہو جاتا۔ اور تم نے خود مجھے کئی بار پھٹکارا! گالیاں دیں۔ اور میں خاموشی سے تمہاری گالیاں سنتا رہا ——

زینت اچھی ہے، خوبصورت ہے، پیاری ہے، میں اب بھی اس کے جسم کو چاہتا ہوں۔ لیکن عارف کی گرہ ایک پھندا بن کر اٹکی ہوئی ہے —— آہستہ آہستہ زینت سب کچھ سمجھ گئی۔ اور اُس نے مجھ سے ملنا چھوڑ دیا۔

اب وہ کیا کہتی ہے

پہلے اُس نے ایک سیٹھ کو پھانس رکھا تھا۔ اب اس نے ایک خوبصورت لونڈے کو اپنے گھر میں رکھا ہوا ہے۔ اور اب کہتی ہے۔ کہ وہ کسی مرد سے شادی نہیں کرے گی۔ اگر مردوں کو یہ حق حاصل ہے۔ کہ عورتوں کو داشتہ بنا کر اپنے گھروں میں رکھ سکتے ہیں۔ تو کیا عورتیں مردوں کو اپنے گھروں میں داشتہ بنا کر نہیں رکھ سکتیں۔ میرے پاس کس بات کی کمی ہے۔ اچھے خاصے روپے کماتی ہوں، حسین ہوں، جوان ہوں، چالاک ہوں۔ لوگوں کو اُلّو بنا سکتی ہوں۔ اب شادی نہیں کروں گی۔ کبھی نہیں کروں گی۔

بڑے مزے سے اس نے ایک خوبصورت لڑکے کو اپنے گھر میں رکھا ہوا ہے۔ اور دونوں مزے سے رہتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔ بارش ختم ہو چکی تھی۔ سورج دور پہاڑوں کے پیچھے غروب ہو چکا تھا۔ اس نے چائے کی پیالی اٹھائی اور ایک گھونٹ پیتے ہوئے کہنے لگا۔

"کمبخت! خوبصورت عورت تھی۔ میں نے اپنے ہاتھ سے کھو دی ہے۔"



آپ کے پسندیدہ فن کار
ن کے تازہ شاہکار
جھلملاتے ہوئے ستاروں کی طرح دلفریب پوٹھائل گیت
شریمتی بیناچودھری
جھمک بک چمکے گگن میں ملوے
دل ہو گیا پرایا
N 16706
مسکراتے ہوئے پھولوں کی طرح مسرت خیز سہرا
سُریندرکور
لال تروپ جوتی دی موری اک ۔ مٹ
پریاں وانگ اڈاریاں نظراں ۔ مٹ
N 13518
لہراتے ہوئے بادلوں کی طرح رومان انگیز ڈھولک گیت
مُنّورسُلطانہ
ہائے میری انکھ کیوں پھڑکے
آ وے مناں تن دل نہیں لگدا
N 13517
دی گراموفون کمپنی لمیٹڈ ۔ ڈم ڈم بمبئی مدراس دہلی لاہور



کولمبیا ریکارڈ
لوپھر بہار آگئی
اس رومان انگیز موسم میں
یہ ریکارڈ سنیئے
وِدیاناتھ سیٹھ
سپنوں میں آنا ہے ۔ گیت
نیناں کیوں روتے ہیں ۔ "
GE.5045
جمیلہ بائی (لکھنوی)
سندر سنا دے کوئلیا ۔ خیال بسنت بہار
GE.5026
پنجابی ڈھولک گیت
دلشاد بیگم
چانی رات اے آ و پریتم
G.E.5444
ریکارڈ نمبر

بقیہ ناک آؤٹ

نے ہمارے سامنے بیٹھ کر سب کچھ درست کیا۔ بڈی کے کہنے پر میری تھوڑی سی تعریف بھی شامل کی گئی۔

اب سیکنڈ شو کا پروگرام بنا۔ شیطان نے وہ اوور کوٹ اتار دیا جو پہن کر زیادہ سردی لگتی تھی اور پہلے اٹھوایا گیا تھا پھر سیدھا کرلایا گیا تھا۔ پروگرام اسی سینما کا تھا جس میں پہلے گئے تھے۔ شیطان بولے — آج سردی زیادہ ہے آج پھر رضائیاں اوڑھ کر چلیں گے۔ اور نوکر حقے کے ساتھ چلے گا۔

— ذرا سی دیر میں ہم رضائیاں اوڑھے اتنی ٹھنڈ میں ٹھنڈی سڑک پر جا رہے تھے اور تقسیم انعامات کا ذکر ہو رہا تھا۔ بڈی بار بار کہہ رہا تھا — "بولنے اولڈ بوائے، آج میں اپنے آپ کو ہیرو محسوس کر رہا ہوں، میں چیمپین ہوں میں نے ایک کپ جیتا ہے — یاہ ہوُدا"

اور جب ہم شہر کے بہترین سینما میں رضائیاں اوڑھے پکچر دیکھ رہے تھے اور حقے کے کش لگا رہے تھے تو ہمارے آس پاس بیٹھے ہوئے حضرات نہ ہمیں چیمپین سمجھ رہے تھے نہ ہیرو، بلکہ غالباً ایسی خواتین سمجھ رہے تھے جو حقہ پی رہی تھیں۔

شفیق الرحمٰن

ننانوے ناٹ آؤٹ

بڑی مشکلوں سے ہم نے میچ جیتا، یا یوں کہیے کہ ہارتے ہارتے بچے ۔ اب ہم سیمی فائینلز جیت کر فائینلز میں آ گئے تھے۔ سب سے زیادہ سکور مقصود گھوڑے کا تھا۔ اُس نے صبح سے کھیلنا شروع کیا۔ کوئی سٹروک ایسا نہ تھا جو اُس نے نہ دکھایا ہو۔ بولرز کو خوب سزا دی اور دو گھنٹے کے بعد تین رنز بنائیں۔ اُس کے بعد جو اُچھل اُچھل کر کھیلا ہے تو دوپہر تک تین سے دس تک سکور پہنچا دیا۔ لنچ کے بعد وہ بیحد تیز کھیلا، آگے بڑھ بڑھ کر جو ہٹیں لگانی شروع کی ہیں تو پانچ رنز کا اور اضافہ کر دیا۔ جب ہم شام کو دو وکٹ پر جیتے ہیں۔ اور آخری کھلاڑی نے ہٹ لگائی ہے تو مقصود گھوڑا پچیس رنز بنا چکا تھا۔

ہمارے مخالف بھی کافی گئے گذرے تھے وہ بھی اسی طرح کھیلے تھے اُن کی بولنگ کا یہ حال تھا کہ گیارہ کھلاڑیوں میں سے دس نے بولنگ کی تھی۔ گیارہواں وکٹ کیپر تھا اور مجبور تھا۔ ورنہ وہ بھی حسبِ توفیق مدد کرتا۔ کھیل دیکھنے والوں کا متفقہ فیصلہ تھا کہ دونوں ٹیموں کے ہارنے کا اتنا ڈر نہیں جتنا جیت جانے کا ہے۔

سیکنڈ شو دیکھنے کے لئے میں مقصود گھوڑے کو لے کر شیطان کے ہوسٹل میں پہنچا۔ اُن کے کمرے میں جا کر کیا دیکھتا ہوں، کہ بڑی مدھم روشنی میں ایک بڑے سے پلنگ پر چند حضرات رضائیاں اوڑھے کھانا کھا رہے ہیں۔ اُن میں شیطان بھی تھے۔ بولے —— "سردی بہت زیادہ ہے اور ہم تھکے ہوئے بھی ہیں"۔ شیطان میچ میں کھیلے تھے اور حسبِ معمول دونوں اننگز میں صفر سکور کی تھی۔ اُنہوں نے ہمارے لئے ایک رضائی منگوائی اور ہم دونوں بھی کھانے میں شریک ہو گئے۔ مقصود گھوڑا بولا: "رُدنی صاحب آپ کیسے ہیں؟" —— شیطان بولے —— "میں بفضلِ خدا خیریت سے ہوں اور خیر و عافیت آپ کی خداوند کریم سے نیک مطلوب ہوں۔ دیگر احوال یہ ہے کہ میں نے سینما کا پروگرام بنایا اور پوچھا کیا بجا ہے؟" —— شیطان گھڑی دیکھ کر بولے —— "جمعرات ہے"۔ ویسے سینما میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ شیطان بولے "ایک گھنٹے کا کیا ہے دس منٹ میں گزر جائے گا۔ آج سینما اسی طرح چلیں گے۔ رضائیاں اوڑھ کر —— اور نوکر بھی ساتھ چلے گا حقّہ لے کر۔ آج میچ جیتا ہے"۔

بڑی بحث ہوئی۔ مقصود گھوڑے نے کہا —— میں تو یہی مشورہ دوں گا کہ رضائیاں اوڑھ کر نہ چلیں بلکہ —— شیطان جلدی سے بولے —— میں آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ آپ مجھے مشورہ نہ دیں آج رضائیاں اوڑھ کر چلنا ہوگا۔ سردی بہت زیادہ ہے اور میرا اوور کوٹ ایسا ہے جیسے پہن کر اور زیادہ سردی لگتی ہے۔"

"وہی اوورکوٹ تو نہیں جسے اُلٹایا گیا تھا؟" کسی نے پوچھا۔

"جی ہاں! پہلے اُسے اُلٹایا گیا تھا۔ پھر سیدھا کرایا گیا ہے۔" شیطان بولے۔

"یہ روشنی بہت مدھم ہے۔ میں نے بات ٹالنے کو کہا۔ شیطان نے نوکر سے پوچھا —— "کیوں یہ بلب کتنے ہارس پاور کا لائے ہو؟"۔ اس غریب نے بلب کی ہارس پاور بتا دی۔ شیطان بولے —— آج بجلی ہی کم آ رہی ہے۔

کھانا ختم ہو چکا تھا۔ چلنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ نوکر حقّہ بھر کر لے آیا۔ سب نے رضائیاں لیں۔ شیطان اپنی عینک ڈھونڈنے لگے کسی نے بتایا کہ ایک عینک تو اُن کی ناک پر ہے۔ بولے —— آج کل میرے پاس تین عینکیں ہیں۔ ایک دُور کی چیزوں کے لئے اور دوسری نزدیک کے لئے اور تیسری ان دونوں کو ڈھونڈنے کے لئے۔ میں بقیہ دو عینکیں ڈھونڈ رہا ہوں۔

میں یہی سوچ رہا تھا کہ اگر جج صاحب کے کنبے میں سے کسی نے مجھے دیکھ لیا تو کہیں گے کہ عجب بدمذاق لڑکا ہے۔ شہر کے بہترین سینما میں رضائی اوڑھے بیٹھا ہے۔ اُن دنوں رضیہ مجھ سے رُوٹھی ہوئی تھی اور

میں کافی بیزار تھا۔ شیطان مجھ سے بیزار تھے۔ بار بار وہ یہی کہتے کہ میاں اگر ٹینس یا لڑکی ہاتھ سے نکل جائے تو ذرا فکر نہیں کرنا چاہیئے — وہ ابھی آتی ہوگی۔

چلتے چلتے پھر کسی نے شیطان کو مشورہ دینے کی کوشش کی، وہ بولے — میں آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ آپ مجھے مشورہ نہ دیں۔ تھوڑی سی دیر میں ہم ٹھنڈی سڑک پر اتنی ٹھنڈ میں رضائیاں اوڑھے جا رہے تھے۔ اور ہمارے پیچھے نوکر حقّہ تھامے آ رہا تھا۔ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں جج صاحب نہ آئے ہوئے ہوں۔ ویسے وہ سیکنڈ شو میں اکثر آجایا کرتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر دیکھا تو پکچر شروع ہو چکی تھی۔ جج صاحب کی موٹر جیسی ایک موٹر باہر کھڑی تھی۔ اب تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ضرور اندر ہونگے میں نے اپنی رضائی تو مقصود گھوڑے کے سر پر ڈالی اور شیطان کی نظر بچا کر ایک طرف ہو گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو جج صاحب بیٹھے تھے۔ میں بالکل سیٹ میں دھنس گیا کہ کہیں نظر نہ آجاؤں مگر ذرا سی دیر میں ننھی میرے سامنے کھڑی تھی۔ مجھے کھینچے بابا! پپا! — جج صاحب ساتھ جج صاحب کی بیگم، حکومت آپا اور رضیہ بیٹھی تھیں میں نے سلام کیا اور مجھے ننھی کی سیٹ ملی۔ ننھی میری گود میں بیٹھ گئی۔ جج صاحب نے پہلے تو میرے نہ آنے کی شکایت کی میں نے امتحان کا بہانہ بنا دیا پھر بولے "وہ خواتین کون تھیں؟" میں چونک پڑا — "کیسی خواتین؟ — کب بھلا —؟" بولے — "ابھی ابھی تمہارے ساتھ آئی تھیں — !"

"جی نہیں میرے ساتھ تو کوئی نہیں آیا۔ میں تو اکیلا آیا ہوں" میں صاف مکر گیا۔

"اور وہ کون ہیں —؟" انہوں نے شیطان وغیرہ کی طرف اشارہ کیا — "ارے لاحول ولاقوۃ !! — یہ خواتین تو حقہ پی رہی ہیں۔ شیطان وغیرہ حقہ پی رہے تھے — "خواتین نہیں ہونگی — کوئی اور ہوگا" میں نے کہا۔ وہ بولے — "عجب پراسرار شبیہیں ہیں۔ غالباً یہ خواتین نہیں ہیں — یا شاید ہوں"

میں نے کن آنکھوں سے رضیہ کو دیکھا جو کن انکھیوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ فوراً اُس نے منہ پھیر لیا۔ عرصے سے رضیہ مجھ سے ناراض تھی۔ ایسی ناراض تو پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ نہ مجھ سے بات کرتی نہ میری طرف دیکھتی۔ اور یہ بُعد روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ جتنا میں منانے کی کوشش کرتا اُتنا ہی وہ اور روٹھ جاتی۔ ہوا یہ کہ — کالج میں ڈراما بھی اُن ہی دنوں ہوا۔ جن دنوں ٹینس ٹورنامنٹ ہو رہا تھا۔ ٹینس میں سرلا میری پارٹنر تھی۔ اُدھر ڈرامے میں بھی ہم اکٹھے تھے۔ شام کو یا تو میچ ہوتا اور یا پریکٹیس ہوتی۔ اس کے بعد رہرسل، اور رات کو میں اُسے چھوڑنے جاتا۔ نہ جانے ننھی نے ہمیں کہاں دیکھ لیا۔ جا کر رضیہ سے کہہ دیا۔ اگلے روز اتفاق سے اُس نے ہمیں کالج سے اکٹھے نکلتے دیکھ لیا۔ پھر چند دنوں کے بعد کھیل کے بعد سرلا بولی۔ میرے ڈیڈی شام کی ٹرین سے گزر رہے ہیں۔ مجھے سائیکل پر سٹیشن لے چلئے۔ ٹرین آدھ گھنٹہ ٹھیرے گی۔ اس کے بعد فوراً ہی ریہرسل کے لئے آجائیں گے۔ میں اُسے سائیکل پر لے کر نکلا ہی تھا۔ کہ رضیہ اور حکومت آپا مل گئیں۔ بس اُس دن سے رضیہ ناراض ہو گئی۔ نہ جانے اس میں ناراض ہونے کی بات کیا تھی۔ سرلا پارٹنر تھی۔ اور وہ سٹیشن پر جانا چاہتی تھی۔ اور پھر فوراً ریہرسل کے لئے واپس بھی آنا تھا۔ ہم دونوں کے پاس فقط ایک سائیکل تھی۔ اور رضیہ کا روٹھنا بالکل بے جا تھا۔ اُدھر سٹیشن پر ہمیں ایک نہایت ہی کرخت قسم کے دراز ریش بزرگ ملے جنہیں ہرگز ڈیڈی نہیں کہا جا سکتا تھا۔

حکومت آپا حسبِ معمول خفا تھیں۔ شیطان کا خیال تھا کہ اُن کو مجھ سے ایک حسرت آمیز نفرت ہے۔ اور تو اور ننھی بھی کچھ کچھ ناراض تھی۔ ہم جج صاحب کے ہاں جو کچھ توڑتے پھوڑتے ننھی کے سر لگا دیتے شیشے کے گلاس، چینی کے گلدان، الماریوں کے شیشے غرضکہ جو کچھ بھی ہم سے ٹوٹتا ننھی کا نام لے دیتے۔ باغیچے سے جتنے پھول اور پھل ٹوٹتے وہ بھی ننھی کے سر لگتے۔

دوسرے یہ کہ شیطان کئی کئی مرتبہ کوکو پیتے۔ ننھی کوکو، بھوت اور چڑیلوں سے بہت ڈرتی تھی۔ رات کو ننھی کو سنا سنا کر شیطان کوکو ہوا کہ کوکو آنے والی ہے — کوکو کب آئے گی؟ اب۔ کوکو آگئی۔ کئی مرتبہ تو یہ ہوا کہ ننھی سو رہی ہے اور شیطان نے کوکو کہہ کر ڈرا دیا۔ بعد میں کہہ دیا کہ میں تو کوکو بنوا رہا تھا۔ تیسرے یہ کہ شیطان رات کو ننھی کے پاس بیٹھ کر انگریزی ریکارڈ بجایا کرتے۔ انگریزی کے ریکارڈوں کے متعلق ننھی کا یہ خیال تھا کہ ایک کمرے میں مختلف قسم اور مختلف سائز کے بہت سے کتے اکٹھے ہو جاتے ہیں اور آپس میں خوب لڑتے ہیں کبھی چھوٹے چھوٹے کتے اور کبھی بڑے بڑے، پھر بڑے اور چھوٹے کتے آپس میں لڑتے ہیں۔ جب تھک جاتے ہیں، تو خوب روتے ہیں۔ بعض اوقات ایک بوڑھا سا کتا اکیلا بیٹھ کر نہ معلوم کیوں رونا ہے

بعض اوقات بلیاں اور مرغیاں خوب لڑتی ہیں۔ ایسے ریکارڈ سن کر ننھی خوب ہنستی۔

میرا اور شیطان کا امتحان نزدیک تھا۔ اس لئے ہم دونوں جج صاحب کے ہاں سے ہوسٹل میں چلے آئے تھے۔ ہمارے ہوسٹل دور دور تھے لیکن ہمارا وقت اکٹھے ہی گزرتا۔ ادھر جج صاحب خوب کوٹھیاں بدل رہے تھے۔ پچھلے چند ماہ میں انہوں نے چار پانچ مرتبہ مکان بدلا تھا۔ شیطان جب کبھی اُن سے ملتے یہی پوچھتے کہ آج کل آپ کہاں رہتے ہیں۔ اُن کی پہلی کوٹھی میں ہمارے رہتے ہوئے چوری ہوئی تھی۔ جج کے ہاں چوری — عجیب ہی بات تھی۔ صبح صبح پتہ چلا کہ رات کو چوری ہوئی ہے لیکن سب چیزیں جُوں کی تُوں موجود تھیں۔ پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ چرایا کیا گیا ہے۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ چور محض تفریحاً آئے تھے۔ بعد میں جا کر پتہ چلا کہ میرے سارے کپ جو انگیٹھی پر اور الماریوں میں رکھے تھے غائب ہیں۔ بڑے نامعقول چور نکلے۔

وہ کوٹھی تھی بھی سنسان سی جگہ میں۔ پھر ایک مرتبہ سارا کنبہ کسی دوسرے شہر میں گیا۔ میں اور شیطان سیکنڈ شو دیکھ کر بہت دیر سے لوٹے۔ کوٹھی میں بالکل اندھیرا تھا۔ ہم دیوار کود کر چھوٹے راستے سے اندر چلے آئے۔ اندھیرے میں آہٹ سنائی دی۔ دبے پاؤں جا کر دیکھتے ہیں تو ایک صاحب تالا کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ دیر دیکھتے رہے۔ جب تالا کھل گیا تو شیطان نے چور کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑے شکایت آمیز لہجے میں کہا — "یار بڑا افسوس ہے" اُس نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن ہم نے اُسے کہیں نہ جانے دیا۔ بلکہ اُسے اندر لے آئے اُسے کافی پلائی گئی۔ چاکلیٹ کھلائے گئے۔ وہ بیچارہ بڑا پشیمان تھا۔ میں نے اپنے کپوں کے متعلق پوچھا۔ وہ قسم کھا گیا کہ اُس نے کپ نہیں اُٹھائے۔ اگر وہ چوری کرتا بھی تو کپ کبھی نہ اُٹھاتا — سپورٹسمین چور معلوم ہوتا تھا۔ ہم نے ہاتھ ملا کر اُسے رخصت کیا۔ جج صاحب نے کوٹھی بدلی۔ نئی کوٹھی میں ہر روز بجلی فیل ہو جاتی تھی۔ پھر مکان بدلا۔ اُس کے پڑوس میں رات دن قوالیاں ہوتی تھیں۔ بینڈ بجتے تھے۔ ایک دو مرتبہ پھر اسی طرح ہوا۔ اب موجودہ مکان ایسی جگہ تھا کہ آس پاس بے شمار لڑکیاں رہتی تھیں۔ سہ پہر کو لڑکیاں سکولوں اور کالجوں سے لوٹتیں۔ شام کو خوب رونق ہوتی۔ شیطان نے اُس جگہ کا نام مینا بازار رکھا تھا۔ پروگرام یہ تھا کہ امتحان ختم ہوتے ہی ہم ہوسٹل چھوڑ کر جج صاحب کے ہاں آ جائیں گے۔

جج صاحب بدستور اُن خواتین کو دیکھ رہے تھے جو کچھ پی رہی تھیں۔ اور اُن کے متعلق ہی گفتگو ہو رہی تھی۔ رضیہ نے سر پہ دوپٹہ اس انداز سے رکھا تھا کہ مجھے صرف اُس کی ناک کا ذرا سا حصہ نظر آ رہا تھا۔ میرے خیال میں وہ ایک حسین ترین ناک کا حصہ تھا۔ حکومت آپا مجھ سے باتیں کر رہی تھیں۔ کہ میں اتنے دنوں سے کیوں نہیں آیا۔ اور آج کل اُس لڑکی کا کیا حال ہے جو میرے ساتھ سائیکل پر تھی۔ وہ لڑکی بہت حسین بھی نہیں ہے لیکن بُری بھی نہیں ہے۔ بڑی شوخ سی ہے اور ہمیں کسی نے اور بھی باتیں بتائی ہیں۔ جو اس وقت کہنے کی نہیں ہیں۔ کیونکہ ننھی سُن رہی ہے۔ ننھی جو میری گود میں تھی بولی — میں بالکل نہیں سُن رہی ہوں۔ میں نے خوشامد کے طور پر ننھی کو کہانیاں سنائیں۔ — سنو ننھی ایک کہانی — ایک شخص شیر کا شکار کھیلنے جنگل میں گیا — شیر لولا — آہاہا۔ اچھا ایک اور کہانی سنائیں — سنو۔ دو چیتے کے شکاری اور ایک چیتا — ایک چیتے کا شکاری اور ایک چیتا — ایک چیتا — ننھی پھر رونے لگی۔

انٹرول ہوا اور روشنی میں جج صاحب کو یہ تو یقین ہو گیا کہ وہ خواتین نہیں ہیں۔ لیکن اب یہ بحث شروع ہوئی کہ یہ لباس کس قسم کا ہے اور یہ کس قسم کے حضرات ہیں اور کس سلسلے میں یہاں آئے ہیں۔ شیطان اور دیگر حضرات نے رعنائیوں میں منہ سر لپیٹ رکھے تھے۔ ورنہ ضرور پہچانے جاتے۔

میں نے بات ٹالنے کے لئے اپنے کرکٹ میچ کا ذکر شروع کر دیا۔ کہ آج ہم ایک میچ جیت کر فائنلز میں آ گئے ہیں۔ دو روز کے بعد ہمارا میچ ہے چار روز تک ہوگا جس میدان میں میچ ہوگا وہ جج صاحب کی کوٹھی اور مینا بازار کے بالکل پڑوس میں تھا

وہ بولے — ہم ضرور دیکھیں گے۔ اسی ہفتے میں کئی چھٹیاں بھی ہیں۔

پکچر ختم ہوئی۔ چلتے وقت میں نے کن انکھیوں سے رضیہ کو دیکھا۔ جو کن انکھیوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ جلدی سے اُس نے مُنہ پھیر لیا۔

ہمارے کلب کے کپتان گیدی صاحب تھے۔ اُن کا اصل نام شاید زیدی تھا لیکن اُن کو گیدی ہی کہا جاتا تھا۔ اُن کا قد بہت چھوٹا تھا اور بقول شیطان وہ سطح سمندر سے ساڑھے چار فیٹ بلند تھے۔ اُن کے ساتھ ہر وقت اُن کے دو مشیر ہوتے۔ جو کافی دراز قد تھے۔ گیدی صاحب اُن کے درمیان میں چلتے شیطان

نے ان تینوں کا نام ایک سو ایک ــــ ۱۰۱ ــــ رکھا ہوا تھا۔ اُن کے مطابق ٹیم کی انتخابی کمیٹی بھی تین احمقوں پر مشتمل تھی ــــ گیدی صاحب اور سمتھ۔ سمتھ کا اصلی نام بلدیو سنگھ تھا۔ وہ بولر تھے۔ اور اُن کا خیال تھا کہ اُن کا سٹائل مشہور آسٹریلین بولر فلیٹ وڈ سمتھ سے بہت ملتا ہے۔ ہر وقت وہ یہی الاپتے رہتے۔ چنانچہ اُن کا نام بلدیو سنگھ سمتھ رکھا گیا۔ جو بعد میں سمتھ رہ گیا۔ اخبار میں بھی یہی چھپتا۔ بڈی بھی ہمارے کلب کا ممبر تھا۔ وہ اس ٹورنمنٹ کے تینوں میچ کھیل چکا تھا۔ امریکہ میں وہ بیس بال کھیلتا رہا تھا اور اچھا کھلاڑی تھا۔ کرکٹ بھی وہ بیس بال کھیلتا رہا تھا اور اچھا کھلاڑی تھا۔ کرکٹ بھی وہ بیس سال کی طرح کھیلتا، بلا ترچھا رکھتا۔ اور ہر وقت ہلتا رہتا۔ مُنہ میں چیونگ گم ہے مُنہ ہل رہا ہے۔ ہاتھوں میں ترچھا بلا ہے۔ ہاتھ ہل رہے ہیں۔ بلا ہل رہا ہے۔ خود ہل رہا ہے۔ جیسی بھی گیند آتی وہ ضرور بلا گھما دیتا۔ بعض اوقات سکور بھی کر لیتا تھا۔ کیچ بہت اچھا کرتا تھا۔ اسی لئے اُسے سلپس میں کھڑا کرتے۔ ہر میچ میں دو تین کیچ اُس کے ہوتے۔ ہماری ٹیم میں دو تین اچھے کھلاڑی بھی تھے۔

پہلی مرتبہ ہم لگاتار تین میچ جیت کر فائنل کھیلنے والے تھے۔ دو روز کے بعد میچ تھا۔ ایک نہایت اچھے کلب کے ساتھ مقابلہ تھا۔ جیتنے والی ٹیم کے لئے ایک وزنی سا چیلنج کپ اور گیارہ چھوٹے چھوٹے کپ منتظر تھے۔

سہ پہر کو ساری ٹیم پریکٹس کے لئے آئی۔ گیدی صاحب بیٹنگ کی ترتیب مرتب کرنے لگے۔ شروع میں وہ اور مقصود گھوڑا تھے۔ بڈی ساتویں وکٹ پر۔ آٹھویں وکٹ پر میں اور نویں پر شیطان۔ شیطان نے بڑا حساب لگایا۔ جب اُنہیں پتہ چلا کہ وہ گیارہویں کھلاڑی ہیں تو مچل گئے۔ گیدی صاحب سے بولے

ــــ مجھے گیارہواں کیوں بھیجا جا رہا ہے؟

بڈی نے جواب دیا ــــ اس لئے کہ کوئی بارہواں نہیں ہوتا۔ گیدی بولے ــــ "کپتان صحیح اندازہ لگا سکتا ہے اور اُس کا نظریہ ہمیشہ درست ہوتا ہے"

شیطان بولے ــــ "ہر شخص کے دو نظریے ہوتے ہیں ـ۔ اُس کا ذاتی نظریہ اور غلط نظریہ"

مصیبت یہ تھی کہ شیطان نہ بولر تھے: بیٹسمین، نہ وکٹ کیپر۔ اور ان کا دعویٰ تھا کہ ایک اعلیٰ درجہ کی ٹیم میں پانچ اعلیٰ درجے کے بیٹسمین ہونے چاہئیں۔ چار بہترین بولر۔ ایک وکٹ کیپر اور ایک مدفی۔

ہر میچ میں شیطان کا سکور یا تو صفر ہوتا یا دو یا تین۔ ہر میچ کے بعد وہ یہی کہتے کہ اگر زندگی میں ... ... میں کیسے ہاتھ دکھا سکتا ہوں۔ بڈی نے کئی مرتبہ پوچھا بھی کہ گیارہواں ٹک گیا تو سارا معاملہ اتنا بلند ہونے کا ہے۔ لیکن یہ شیطان کا محبوب فقرہ تھا۔

ہر روز جب مشرق سے سورج نکلتا ہے تو کلیاں کھل کر پھول بن جاتی ہیں تتلیاں جاگ اُٹھتی ہیں۔ پرندے چہچہانے لگتے ہیں۔ کائنات میں ہل چل مچ جاتی ہے۔ ہر روز سورج ڈوبتے وقت ایسی شفق پھولتی ہے کہ سب کچھ جگمگا اُٹھتا ہے چاندنی رات میں ایک عجیب سا فسوں آسمان سے زمین تک چھا جاتا ہے۔

ــــ لیکن حکومت آپا کو اس کا علم تک نہ تھا۔

جس وقت ہم جج صاحب کی کوٹھی میں پہنچے تو عجب سہانا سماں تھا۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری شعاعیں ٹہنیوں اور پتوں پر رقصاں تھیں۔ باغیچے میں ایک فوارہ چل رہا تھا۔ چند رنگ برنگے پرندے سیٹیاں بجا رہے تھے۔ گلاب کے پھولوں نے جیسے آگ سی لگا رکھی تھی ــــ لیکن یہ سب کچھ بیکار تھا۔ کیونکہ بالکل نزدیک ہی حکومت آپا ایک کرسی پر بیٹھی تھیں۔

ہم دیر سے اُن کے ہاں نہیں گئے تھے۔ اور ہماری غیر حاضری میں وہ اپنے محبوب ترین مشغلے یعنی فضول کی بحث اور لڑائی جھگڑے سے لطف اندوز نہ ہو سکتی تھیں۔ کیونکہ اس کے لئے کم از کم دو کی ضرورت ہے۔

حکومت آپا مجھ سے اس لئے بھی خفا تھیں کہ جب وہ موٹی ہو گئی تھیں۔ تو میں نے اُن کو دُبلا ہونے کا مناسب نسخہ نہیں بتلایا۔ میں نے فاقہ کشی کیلئے کہا وہ بولیں۔ "نہیں کوئی کھانے کی ایسی چیز بتاؤ جس سے میں دُبلی ہو جاؤں" بڑی مصیبتوں کے بعد میں نے اُن کا لنچ چھڑایا ایک روز جا کر دیکھا تو وہ چائے پر پلاؤ کھا رہی تھیں تو میں نے اُن کا لنچ پھر شروع کرا دیا۔

شیطان کا خیال تھا کہ وہ صبح صبح شام کلیاں کھایا کرتی ہیں ــــ ہمیں دیکھ کر وہ مسکرائیں اور سورج غروب ہو گیا۔ چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ ہم اندر گئے سب ملے۔ رضیہ بھی ملی۔ اُسی طرح منہ بنا رکھا تھا۔ جتنی دیر بیٹھی رہی۔ مُنہ موڑ کر اور چپ چاپ کچھ دیر کے بعد اُٹھ کر چلی گئی۔ ہمیں کھانے پر ٹھہرا لیا گیا۔ میں اکیلا بیٹھا ریڈیو سُن رہا تھا۔ دفعتاً مجھے خیال آیا کہ شیطان اور حکومت آپا کہاں چلے گئے۔ دیر سے غائب ہیں۔ باہر نکل کر دیکھتا ہوں تو چاند نکلا ہوا تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ ضرور یہ دونوں باغ میں ہونگے اور وہاں گفتگو ہو رہی ہوگی۔ میں دبے پاؤں گیا۔ واقعی وہ دونوں فوارے کے پاس بیٹھے تھے۔ اور وہاں انگریزی باتیں ہو رہی تھیں۔ میں چھپ کر سُننے لگا۔

شیطان بولے ۔۔۔ "حکومت تم بہت پیاری معلوم ہو رہی ہو۔"

حکومت بولیں۔ "سچ میرے پاس اس وقت روپے نہیں ہیں۔ ورنہ ضرور قرض دے دیتی۔"

شیطان بولے ۔۔۔ "یقیناً ان چند مہینوں میں تمہاری رنگت نکھر آئی ہے جب تم جون میں آئیں تو تمہاری جون بدلی ہوئی تھی۔"

حکومت بولیں۔ "یقیناً میرے پاس روپے نہیں ہیں۔"

شیطان بولے ۔۔۔ "روپے، کمال کرتی ہے تم سے، بھلا ایسی رومان انگیز فضا میں جہاں باغ کا ایک گوشہ ہو۔ فوارہ چل رہا ہو۔ چاندنی چھٹکی ہوئی ہو اور تم سامنے ہو تو وہاں روپوں کا کیسے خیال آسکتا ہے۔ وہاں تو ایک معصوم سی آرزو دل میں کروٹیں لینے لگتی ہے ۔۔۔"

"سچ ۔۔۔؟" حکومت آپا شرما گئیں۔

"ہاں سچ!"

"بھلا اس وقت آپ کو کس چیز کی آرزو ہے؟"

"کلوروفارم کی ۔۔۔! ۔۔۔ جانتی ہو حکومت! انسان کا سب سے بڑا دشمن کون ہے؟"

"کون ہے ۔۔۔؟"

"آئینہ! ۔۔۔ اور کئی انسان آئینے کو بھی دھوکا دے جاتے ہیں۔ آئینہ کچھ کہے وہ ایک نہیں سنتے۔ اُن میں سے ایک تم بھی ہو۔"

اب حکومت آپا کچھ بگڑنے لگیں۔ شیطان جلدی سے بولے ۔۔۔ "نہیں یہ بات نہیں ہے، وہ تو یونہی مُنہ سے نکل گیا تھا۔"

اب پھر رومانی باتیں ہونے لگیں۔ حکومت آپا بولیں ۔۔۔ "رومانی ادب میں تمہاری محبوب کتاب کونسی ہے؟"

شیطان بولے ۔۔۔ "ڈکشنری!"

حکومت شیطان کے چہرے کو غور سے دیکھتی رہیں پھر بولیں ۔۔۔ "تمہاری ناک اتنی لمبی کیوں ہے؟"

شیطان نے ایک آہ بھری اور بولے ۔۔۔ "کیا بتاؤں ناک لمبی کیوں ہے یہ فطرت کے راز ہیں۔ تم ہی بتاؤ کہ تمہارا ماتھا باہر کو کیوں نکلا ہوا ہے۔ تمہارے کان مڑے ہوئے کیوں ہیں۔ تمہارے دانت خرگوش کے دانتوں سے کیوں ملتے ہیں۔ حکومت تم اُن ہستیوں میں سے ہو جن سے اگر وقت پوچھا جائے تو گھڑی

بنانے کا طریقہ بتا دیں۔ تم اُن حکمرانوں کی طرح ہو جو آج یہاں ہیں ۔۔۔ اور کل ۔۔۔ کل بھی یہیں ہیں۔ آج سے پانچ سال پہلے سب کہتے تھے کہ اس لڑکی کا مستقبل نہایت لاجواب ہے۔ اور اب سب یہی کہتے ہیں کہ اس لڑکی کا ماضی بڑا شاندار ہوگا۔"

اب تو باقاعدہ لڑائی شروع ہو گئی۔ اور مجھے بھی شامل ہونا پڑا۔ کھانے پر رضیہ کہیں دُور بیٹھی تھی۔ حکومت آپا شیطان سے دور اور مجھ سے نزدیک تھیں سب فضول سا وقت گذرا۔ واپسی پر میں نے رضیہ کی بے رخی کا ذکر کیا۔ روٹھنے کی وجہ بتائی اور یہ بھی بتایا کہ اسی لئے میں نے مرلا سے ملنا جلنا چھوڑ دیا ہے۔

شیطان بولے ۔۔۔ "اگر میں تمہاری جگہ ہوں تو مرلا کو ہر وقت سائیکل پر بٹھائے پھروں۔ اور رضیہ کے گھر کے سامنے سے ہر روز دو مرتبہ گذارا کروں تاکہ وہ اچھی طرح دیکھ لے۔ یہ روٹھنا وُٹھنا سب درست ہو جائے۔ میری مانو تو آج سے تم بھی رضیہ سے روٹھ جاؤ۔ مکمل طور پر روٹھو۔ پرسوں پکنک پر مرلا کو ضرور بلاؤ اور اُس کے ساتھ خوب کھیلیں کرو۔ اور پھر قدرت کا تماشہ دیکھو۔"

میں نے ان کو اپنا خواب سنایا جو رات کو میں نے دیکھا تھا ۔۔۔ "میں نے دیکھا کہ رضیہ نے آسمانی اوڑھنی اوڑھ رکھی ہے۔ جس میں سنہرے تلمے ہیں اور روپہلی تیّوں، رضیہ کے گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے۔ دمکتے ہوئے چہرے پر کالی کالی لٹیں بکھری ہوئی ہیں۔ اُس کے سیپ سے دانتوں ۔۔۔"

"تو جناب آج کل خواب بھی ٹیکنی کلر میں دیکھتے ہیں ۔۔۔ سب سے اچھا خواب جانتے ہو کیا ہے؟"

"کیا ہے؟"

"یہی کہ کوئی خواب نہ آئے۔"

میں نے اپنی بیزاری کا اظہار کیا کہ جب سے رضیہ روٹھی ہے میں جیسے ہر وقت تنہا سا رہتا ہوں۔ شیطان بولے ۔۔۔ "اگر تنہا رہتے ہو یا تنہائی سے ڈرتے ہو۔ تو کبھی شادی نہ کرنا۔" میں نے ایک رُومان شروع کیا ہے۔ وہ بولے "تمہیں محبت کی ایک بہترین کہانی میں تمہیں سناتا ہوں ۔۔۔ سنو ۔۔۔ وہ بولا کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟ ۔۔۔ وہ بولی نہیں ۔۔۔ اور اس کے بعد وہ دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے۔ کہو کیسی کہانی ہے۔ ہاں ایک اور یاد آگئی ۔۔۔ یہ بھی سُن لو ۔۔۔ وہ بولی۔ ہم دونوں شادی کیوں نہ کرلیں ۔۔۔ وہ بولا۔ لیکن ہم دونوں سے شادی کون کرے گا؟

تیسرے روز ہمارا میچ شروع ہوا۔ کچھ چھٹیاں تھیں اور کچھ مینا بازار کا قرب ویسے بھی وہاں چاروں طرف لاتعداد ریٹائرڈ بزرگ رہتے تھے۔ وہ سب کے سب آئے۔ ان کے ساتھ لڑکیاں آئیں۔ ہماری مخالف ٹیم کے ساتھ بھی اچھے لمبے چوڑے کنبے آئے ہوئے تھے۔ ہمارے کپتان نے حسبِ معمول ٹاس ہارا اور ہم فیلڈ کرنے چلے۔ لڑکیوں کی تعداد کا اندازہ ہمیں میدان میں پہنچ کر ہوا۔ جدھر نظر اُٹھاؤ رنگ برنگے ملبوس دکھائی دیتے تھے۔ بڈی بولا ـــــ بوائے او بوائے آج مجھے امریکہ یاد آرہا ہے۔ ہمارے کپتان گیدی صاحب بولے ـــــ دوستو اگر یہ میچ نہ جیتا تو آئندہ کھیلنا چھوڑ دیں۔ "آئندہ کھیلنا چھوڑ دیں گے" والا فقرہ وہ ہر میچ میں کئی مرتبہ کہتے۔ شیطان بولے اگر زندگی نے وفا کی تو دیکھنا تماشہ۔

بولنگ سمتھ اور میں شروع کیا کرتے تھے۔ گیدی صاحب نے چمکتی ہوئی نئی گیند میرے ہاتھ میں دی۔ اور میں فیلڈ جمانے لگا۔ شیطان کا اصرار تھا کہ اُن کو شامیانے کی طرف باؤنڈری لائن پر بھیج دیا جائے۔ غالباً اس لئے کہ وہاں لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ بڈی سلپس میں تھا۔ تالیاں بجیں اور بیٹسمین شامیانے سے روانہ ہوئے۔ ایک صاحب بیحد موٹے تھے اور دوسرے بالکل ذرا سے تھے کم عمر بھی تھے۔ کسی نے بتایا کہ یہ کسی یار جنگ بہادر کے لڑکے ہیں۔ شیطان چونک کر بولے ـــــ "اچھا؟ ـــــ اتنا کم عمر اور ابھی سے ایک یار جنگ بہادر کا لڑکا کمال ہے!"

جب وہ موٹے تازے حضرت ایمپائر سے پوچھ کر نشان لگا رہے تھے۔ تو شیطان نے پھر وہی رٹ لگادی۔ آخر میں نے ان کو شامیانے کی طرف بھیج دیا اُن موٹے تازے حضرت کا نام قلندر صاحب تھا ـــــ شاید قلندر بیگ یا قلندر حسین ہونگے۔ یہ نام ہمیں یوں معلوم ہوا۔ کہ جب میری تیسری گیند اُن کی توند سے چھو کر وکٹ کیپر کے برابر سے گذر گئی تو یار جنگ بہادر کے صاحبزادے ادھر سے چلا کر بولے ـــــ قلندر صاحب وہیں ٹھیرئیے۔ سمتھ کے اوور میں پتہ چلا کہ چھوٹے صاحب کا نام چُنتو میاں تھا۔ سمتھ کی گیند پر اُنہوں نے ہٹ لگائی۔ اُدھر سے قلندر صاحب چلائے ـــــ چُنتو میاں وہیں ٹھیرئیے۔ دیر تک یہی ہوتا رہا۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے کو وہیں ٹھیرنے کے لئے کہتے رہے۔

چُنتو میاں میرے سامنے آئے۔ میں خوب تیز گیندیں پھینک رہا تھا۔ سب کی سب اُن کے سر کے اوپر سے گذر گئیں۔ ایک گیند پر اُنہوں نے کٹ مارنے کی کوشش کی اور گیند بڈی کے سامنے سے گذری لیکن اُس نے ہاتھ تک نہیں ہلایا۔ معلوم ہوا کہ آپ لڑکیوں کو دیکھ رہے تھے۔ مفت کی باؤنڈری ہوگئی۔ قلندر صاحب نے ایک گیند ہوا میں اُٹھا دی۔ گیند شیطان کی طرف جا رہی تھی سب کو اُمید تھی کہ وہ کیچ کر لیں گے۔ لیکن اُنہوں نے گیند کی طرف دیکھا تک نہیں وہ کسی اور طرف دیکھ رہے تھے۔ گیند اُن کے پاس ہی گری۔ جب شور مچا تو شیطان چونکے۔ جتنی دیر میں گیند واپس آئی تین رن ہو چکی تھیں۔ اب معلوم ہوا کہ سوائے بولر اور بیٹسمین کے ہر ایک رنگین لباسوں اور حسین چہروں کو دیکھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ جب قلندر صاحب نے وکٹ کے سامنے ٹانگ اڑا دی۔ اور میں نے چلا کر اپیل کی تو ایمپائر چونک پڑے ـــــ جیسے جاگ کر بولے ـــــ ایں؟ پھر آہستہ سے کہنے لگے۔ بھئی معاف کرنا میرا دھیان کسی اور طرف تھا۔ ایمپائر اچھے خاصے قبر رسیدہ بزرگ تھے۔ وکٹ کیپر نے بھی کئی آسمان سے کیچ چھوڑے سمتھ بولے ـــــ یار یہ لڑکیاں ہمیں ہرائیں گی۔ قلندر صاحب اور چُنتوں میاں تیس تیس سکور کر چکے تھے۔ شیطان نہ تو کیچ کرتے اور نہ گیند روکتے۔ تنگ آکر میں نے اُن کو نزدیک بلایا۔ گیدی بولے ـــــ بھئی اب ایک آدھ کو ضرور آؤٹ ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ معلوم ہوتا تھا کہ میں اور سمتھ ساری عمر بولنگ کرتے رہیں گے اور قلندر صاحب اور چُنتوں میاں ساری عمر کھیلتے رہیں گے۔ دفعتاً قلندر صاحب نے ایک گیند آسمان میں چڑھا دی ـــــ یہ کیچ میرا تھا۔ گیند اُوپر چڑھتی گئی۔ میں ہاتھ پھیلائے گیند کا منتظر تھا اور گیند نیچے آتی ہی نہ تھی۔ اس وقفے میں جیسے ساری زندگی میری آنکھوں کے سامنے آگئی۔ بچپن، لڑکپن ـــــ ساری شرارتیں ـــــ سب کچھ نگاہوں کے سامنے پھر گیا اور جب خدا خدا کر کے گیند نیچے آئی تو اتنی ذرا سی معلوم ہوئی جیسے زیرے کا دانہ ہو۔ میں نے اُچھل کر دونوں ہاتھوں میں گیند کو یُوں دبوچ لیا جیسے کوئی چھین لے گا۔

قلندر صاحب آؤٹ ہوگئے۔ جب وہ جا رہے تھے تو شیطان بولے ـــــ قبلہ اب آپ کے بغیر یہ میدان خالی خالی سا معلوم ہوگا ـــــ واقعی قلندر صاحب نہایت موٹے تھے۔ اب جو نئے صاحب آئے۔ اُنہوں نے شیطان کو دیکھا اور ان سے لپٹ گئے۔ شیطان نے اب تک کوئی اشتیاق ظاہر نہیں کیا تھا۔ وہ بولے ـــــ آپ مجھے پہچانتے ہیں میں وہی غلام فقیر ہوں۔ شیطان نے بغور دیکھا اور بولے ـــــ ممکن ہے کہ آپ وہی غلام ہوں لیکن فقیر وہ ہرگز نہیں ہیں جو پہلے تھے۔ وہ بولے ـــــ میں سچ مچ وہی ہوں، ذرا بدل گیا ہوں۔ پہلے سے میرا قد چھوٹا ہوگیا ہے!

اب وہ دونوں باتیں کر رہے ہیں۔ اور ہم سب انتظار کر رہے ہیں۔ آخر امپائر نے پلے تب غلام فقیر صاحب نے کھیلنا شروع کیا۔ میری پہلی ہی گیند کو اُنہوں نے لیگ کی طرف اُٹھا دیا۔ اور ایک صاحب کے پاس گیند آ گری۔ اُنہوں نے مڑ کر دیکھا تک نہیں۔ جب میں نے اُن کا نام پکارا تب چونک کر اُنہوں نے گیند اُٹھائی اور از راہ کرم میری طرف پھینک دی۔ کچھ دیر میں لڑکیوں کی تعداد اور بھی بڑھ گئی اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ جس فیلڈر کی طرف گیند جاتی۔ فوراً اُس کا نام لے کر اُسے مطلع کیا جاتا۔ تب گیند واپس آتی۔

چھنو میاں نے گھوم کر لیگ کی طرف ہٹ لگائی۔ آگے مقصود گھوڑا دنیا و مافیہا سے غافل مراقبے میں کھڑا تھا۔ دھم سے گیند اُس کے پیٹ میں لگی۔ اُس نے نعرہ لگا کر وہیں دبا لی۔ چھنو میاں آؤٹ ہوئے۔ اور اُن کو جاتے دیکھ کر سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ ایک کھجور جیسے لمبے حضرت تشریف لائے۔ آتے ہی انہوں نے ایک چھکا لگا دیا۔ گیند کی چمک ختم ہو چکی تھی۔ اور میری گیندیں بالکل سیدھی جا رہی تھیں۔ نہ کوئی بریک ہوتی تھی نہ کچھ۔ میں نے گیدی صاحب سے کہا کہ اب سلو بولر کو بلائیے۔ وہ بولے لنچ تک ٹھیر جاؤ۔ اتنے میں شیطان لپک کر آئے اور میرے کان میں بولے —— وہ جو دو لڑکیاں دیکھ رہے ہو۔ سفید شلوار اور نیلی ساری والی وہ چھنو میاں کی رشتہ دار معلوم ہوتی ہیں۔ اُن کے پاس ہی بیٹھی ہیں۔ دو وکٹیں سمجھ لیں۔ جب ہم لنچ کے لئے گئے۔ تو چار وکٹوں پر ایک سو پچیس سکور تھا۔ شیطان کے غلام فقیر چالیس ناٹ آؤٹ تھے اور اس میں اُنہوں نے کوئی بیس چالیس لئے ہوں گے۔

میں یہی سوچ رہا تھا کہ لنچ کے وقت کو کس طرح گزاروں۔ کیونکہ میں لنچ سے بے نیاز ہوں۔ ہجوم میں سے کسی نے ہلو کر دی)۔ میں نے دیکھا۔ سرلا کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ہلو کر کے میں بھی اُس کے پاس چلا گیا۔ نزدیک ہی رضیہ مُنہ بنائے بیٹھی تھی۔ میں جج صاحب اور حکومت آپا سے ملا۔ رضیہ کی طرف میں نے دیکھا تک نہیں۔ بلکہ اُس کے پاس ہی بیٹھ کر سرلا سے باتیں کرنے لگا۔

سرلا رضیہ جیسی حسین تو نہ تھی لیکن نہایت ہی ہنس مکھ اور مسخری لڑکی تھی جب دیکھو مسکرا رہی ہے۔ چہرہ کھلا ہوتا ہے۔ اتنے میں چھنو میاں اُن دونوں لڑکیوں کو لئے ہوئے آئے۔ میرا تعارف کرایا گیا۔ شیطان کا کہنا درست تھا۔ وہ اُن کی بہنیں تھیں۔ ہمارے ایک بوڑھے پروفیسر جو نزدیک ہی رہتے تھے۔ اپنی لڑکیوں سمیت آئے ہوئے تھے۔ وہ لڑکیاں بھی میرے پاس آ بیٹھیں۔ ایک ہم جماعت بھی مل گئی۔ خوب مزے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کہیں سے سو ڈیڑھ سو واقف لڑکیاں اور بھی آ جائیں۔ تاکہ آج رضیہ کے سامنے اُن سب سے باتیں ہوں۔ شیطان نے جب مجھے دیکھا تو فوراً لپک کر آئے لیکن میں نے جلدی سے حکومت آپا کو بلا کر حکومت آپ کو بلا کر شیطان کو اُن کے حوالے کر دیا۔ شیطان بولے —— یہ ہجوم کافی بدمذاق معلوم ہوتا ہے اب تک کسی نے ہمارا آٹوگراف نہیں لیا۔

لنچ کے بعد دونوں سلو بولرز آ گئے۔ میں اور شیطان شامیانے کے سامنے باؤنڈری لائن پکڑے ہوئے تھے۔ میں سرلا سے باتیں کر رہا تھا اور حکومت آپا شیطان سے باتیں کر رہی تھیں۔ شیطان کہیں اور دیکھ رہے تھے۔ سرلا نے مجھے ٹافیاں دیں جنہیں میں بڑی بے تکلفی سے وہیں کھانے لگا۔ گیدی صاحب پہلے ہی ہمیں دیکھ چکے تھے۔ اُن سے نہ رہا گیا۔ اُنہوں نے ہم دونوں کو سلپس میں بلا لیا اور دوسروں کو ہماری جگہ بھیج دیا۔ کیونکہ سلپ کا ہجوم میں کوئی واقف نہ تھا۔ اب شیطان بہت گھبرائے کیونکہ سلپس میں بہت سنجیدگی سے فیلڈ کرنا پڑتا ہے۔ کچھ دیر وہ سہمے ہوئے رہے اور یہی دعائیں مانگتے رہے۔ کہ کوئی کیچ نہ آ جائے آہستہ آہستہ انہوں نے باتیں شروع کر دیں۔ کچھ دیر کے بعد ہم خوب باتیں کر رہے تھے۔ ہمیں کچھ پتہ نہ تھا کہ آس پاس کیا ہو رہا ہے۔ شیطان نے شکایت کی کہ میں نے چھنو صاحب والی دونوں لڑکیوں سے اُن کا تعارف کیوں نہ کرایا۔ میں نے بتایا کہ مجھے اُن سے قطعی دلچسپی نہیں ہے۔ کل تعارف کرا دیا جائے گا۔ اور میں شیطان کے بتلائے ہوئے نسخے پر عمل کر رہا ہوں۔" بہت خوب —— اُنہوں نے مسکرا کر میری طرف ہاتھ بڑھایا۔" ملاؤ ہاتھ اسی بات پہ" —— شُوں سے ایک چیز آئی اور شپ سے شیطان کے ہاتھ سے چپک گئی —— لاحول ولاقوۃ، یہ تو گیند تھی۔ ایک صاحب بلا سنبھالے واپس جا رہے تھے۔ میدان تالیوں سے گونج اُٹھا۔ شیطان نے ایک نہایت لاجواب کیچ کیا تھا۔ اب ہم کھیل کی طرف متوجہ ہوئے۔ پانچ وکٹوں پہ سکور ایک سو اٹھانوے تھا اور وہ غلام فقیر بیاسی ناٹ آؤٹ تھے۔ ارے! —— یہ تو سنچری پر تلا ہوا ہے۔ نئے صاحب آئے۔ شروع میں معلوم ہو رہا تھا کہ یہ اب آؤٹ ہوئے اب آؤٹ ہوئے۔ لیکن ذرا سی دیر میں وہ بھی جم گئے۔ چار پر دو سو سکور تھا۔ پہلے میچوں میں یہ بات نہیں ہوتی تھی۔ لیکن یہ فائنل تھا۔ ایک اچھے خاصے ٹورنمنٹ کا —— ہم نے دیکھا کہ چاروں طرف بے رونقی تھی۔ بزرگ حضرات جا چکے تھے۔ اور لڑکیاں بھی اِدھر اُدھر ہو گئی تھیں۔

چاء کے بعد دو ایک پر گیدی صاحب نے نئی گیند لی۔ مجھے بلایا گیا۔ میں نے

بڑی تیز پھینکیں بریک کرانے۔ لیکن اُن فقیر صاحب پر کوئی اثر نہ ہوا۔ تین گیندوں پر تو وہ بالکل چتا ہوگئے تھے۔ اُدھر بُڈھے امپائر صاحب جو سارا دن کھڑے رہ کر تنگ آچکے تھے۔ اپنے پُرانے قصے سُنا رہے تھے۔ جب میں چھوٹا تھا تو یہ کیا کرتا تھا۔ جب میں چھوٹا تھا تو یہ بات ہو جاتی۔ شیطان بولے ۔ چچا اگر کہ آپ سچ مچ کبھی چھوٹے ہی تھے۔ اور وہ ناراض ہوگئے ۔ فقیر صاحب نے ہر وکٹ کے آگے ٹانگ اڑا دی۔ دھپ سے گیند لگی اور میں نے اپیل کی۔ اُنہوں نے اُسی خفگی میں سر ہلا کر انکار کر دیا۔ شیطان کی اس حرکت سے اُن فقیر صاحب کی جان بچ گئی ورنہ اس مرتبہ تو وہ سچ مچ آؤٹ تھے ۔ غضب خدا کا ۔ اب اُن کا سکور نسے تھا۔ بڈی نے مجھے مشورہ دیا کہ دوسرے کھلاڑی کو پار کر دو۔ میں نے ایک یارکر پھینکا اور بڈی کا مشورہ نہایت کارآمد ثابت ہوا۔ سمتھ نے دوسری طرف سے کئی یارکر پھینکے۔ لیکن فقیر صاحب بڑے مزے سے کھیلتے رہے۔ شام کو سات وکٹوں پر سکور دو سو چالیس تھا۔ اور فقیر صاحب ننانوے ناٹ آؤٹ تھے۔

ہم لوگ بیحد بیزار تھے۔ ایک بڈی غریب تھا جو سب کو ہنسانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اُس کے لطیفوں پر کوئی ہنستا ہی نہ تھا۔ سب یہی کہتے کہ بھئی یہ تو ہم نے پہلے سے سُن رکھا ہے۔ حالانکہ بڈی کے لطیفے ہمیشہ نئے ہوا کرتے تھے۔ بڈی کہیں سے موٹر لایا ہوا تھا۔ ہم تینوں روانہ ہوئے۔ شیطان بولے ۔ یار بڈی ذرا آہستہ چلاؤ تم موٹر ہمیشہ اسی طرح چلاتے ہو جیسے کسی حادثے کا ریہرسل کر رہے ہو۔

اگلے روز صبح صبح اخبار جو پڑھتے ہیں۔ تو اُس میں شیطان کی خوب تعریفیں تھیں۔ شیطان کے ایک کیچ کا ذکر نصف کالم میں تھا اُدھر فقیر صاحب کی خوب بُرائیاں کی ہوئی تھیں۔ میں نے شیطان سے پوچھا بھی، وہ بولے اخبار کا رپورٹر وہاں موجود تھا یہ اُس کی بے لاگ رائے ہے۔ شیطان ایک کیمرہ لائے ہوئے تھے، بولے۔ آج چھُنو میاں اور اُن کی دونوں بہنوں کی تصویریں اُتاروں گا اور سرلا کی بھی۔ شیطان نے سرلا کی تعریفیں شروع کر دیں۔ غالباً اُن کا ارادہ اُس پر عاشق ہونے کا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اُن کو روکا۔ وہ اس شرط پر مانے کہ میں اُن دونوں لڑکیوں سے اُن کا تعارف آج ضرور کرا دوں۔

میں نے رضیہ کا ذکر کیا کہ مُدتوں کو بھی دیکھ لیا۔ وہ بدستور خاموش رہے شیطان بولے۔ تم دیکھتے جاؤ۔ اگر خود آکر سلام نہ کرے تو سہی۔ تم آج دن بھر سرلا کے ساتھ رہنا۔ ہم سائیکلوں پر روانہ ہوئے۔ راستے میں سرلا ملی شیطان آہستہ سے بولے ۔ میں چلتا ہوں تم اسے سائیکل پر بٹھاؤ۔ اور یہ خیال رہے کہ رضیہ تم دونوں کو ضرور دیکھ لے۔

مسکراتی ہوئی سرلا مجھے دیکھ کر اور بھی مسکرانے لگی۔ میں نے اسے آگے جا کر لڑکیوں میں اُتارا جہاں رضیہ نے بخوبی دیکھ لیا۔ سرلا نے مجھے ایک رنگین ربن کا ٹکڑا دیا ۔ بولی ۔ یہ لیجئے ۔ گڈ لک کے لئے۔ ٹینس کے میچ سے پہلے وہ ہمیشہ مجھے ربن کا ایک ٹکڑا دیا کرتی تھی۔ جج صاحب ملے، بولے اور کچھ بھی ہو جائے۔ لیکن اُس لڑکی کے سنچری نہیں ہونی چاہیئے۔ وہ نہایت بری طرح کھیلا ہے۔ اگر وہ ایک اور رن بنا گیا تو مجھے سخت افسوس ہوگا۔ تم لوگوں کی فیلڈنگ بہت بری ہے۔ تم نے سکور بہت زیادہ کرا دیا ہے کہیں ہار نہ جاؤ۔ کھیل شروع ہوا۔ ہم بالکل بیزار تھے۔ میرے اوور میں فقیر صاحب نے کچھ نہیں کیا۔ وہ ہر گیند کو روک لیتے تھے۔ ہجوم خاموش تھا۔ سب اُن کی سنچری کے منتظر تھے۔ شیطان پھر شامیانے کے سامنے باؤنڈری لائن پر کھڑے تھے۔ اُن دونوں لڑکیوں کے بالکل قریب۔ ایک اوور وہ وہاں رہتے اور دوسرے اوور میں میدان عبور کر کے دوسری طرف جانا پڑتا۔ سمتھ کا اوور آیا لیکن شیطان وہیں کھڑے رہے۔ چند گیندوں کے بعد دفعتاً اُنہیں خیال آیا کہ وہ غلط جگہ کھڑے ہیں۔ وہ سرپٹ بھاگے۔ جب وہ میدان عبور کر رہے تھے تو ایک گیند اُن کے قریب سے گزری اور اُنہوں نے یُونہی پکڑ لی ۔ کیچ ہو گیا۔ کھلاڑی نے بڑی اچھی ہٹ لگائی تھی اور جہاں شیطان نے کیچ کیا۔ وہاں آس پاس کوئی فیلڈ نہ تھا۔ شیطان نے پھر ایک حیرت انگیز کیچ کیا تھا۔ تالیاں بجنے لگیں، سب نے یہی سمجھا کہ شیطان گیند کو اچھی طرح سمجھ کر خود بھاگے تھے۔ سکور وہی تھا۔ لیکن فقیر صاحب ابھی تک ننانوے ناٹ آؤٹ تھے۔ اور ہم سب کے سینوں پر مونگ دل رہے تھے۔

یکایک ہجوم میں سے کسی بزرگ نے چلا کر کہا ۔ کہ اس سے بولنگ کراؤ جس نے ابھی کیچ کیا ہے۔ گیدی صاحب کو نہ جانے کیا سُوجھی۔ شیطان کو بُلا کر گیند ہاتھ میں دے دی۔ شیطان بڑے گھبرائے۔ کیونکہ آج تک اُنہوں نے کبھی میچ میں بولنگ نہیں کی تھی۔ دوسرے یہ کہ اُن کے سامنے اُن کے غلام فقیر کھڑے تھے۔ جن کا سکور ننانوے ہو چکا تھا۔ فیلڈ جمائی گئی تھی۔ اس لئے

صاحب نے کہا ـــــ تم تیز گیند پھینکتے ہو یا آہستہ، شیطان بولے: مجھے کیا پتہ؟ ابھی پھینک کر دیکھوں گا۔ پھر مجھ سے پوچھنے لگے کہ کتنے فاصلے سے دوڑ کر آتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہر بولر کا دوڑنے کا فاصلہ مختلف ہوتا ہے۔ اُنہوں نے کئی مرتبہ قدم گنے اور مختلف جگہوں پر نشان لگائے۔ گیدی صاحب نے فیلڈ کھڑی کی، نیا کھلاڑی آچکا تھا۔ اب جو کچھ ہوا وہ شیطان اور کرکٹ دونوں کے لئے ایک معجزہ تھا۔ اور بقول شیطان کرکٹ کی تاریخ میں سنہری الفاظ سے لکھے جانے کے قابل تھا۔ شیطان نے گیند رومال سے خوب صاف کی۔ اِدھر اُدھر دیکھا، اور عجیب بے ڈھنگے طریق سے بھاگنا شروع کیا۔ وکٹوں کے پاس آکر ان کے قدم غلط ہو گئے، اور ایک نہایت ہی بیہودہ گیند اُنہوں نے پھینکی۔ فقیر صاحب نے آگے بڑھ کر بلا گھمایا اور ایک غدر بچ گیا۔ چیخیں سنائی دینے لگیں۔ میدان تالیوں سے گونج اُٹھا ـــــ فقیر صاحب کی سنچری پر نہیں بلکہ اُن کے آؤٹ ہونے پر، شیطان نے اُن کی وکٹیں اڑا دیں ـــــ سنچری نہیں ہوئی۔ وہ ننانوے پر آؤٹ ہو گئے۔
ـــــ شیطان نے سچ مچ کمال کر دیا۔ اسکور وہی دو سو چالیس تھا۔ شیطان بولے ـــــ بس اب کسی اور سے بولنگ کرائیے۔ میں گھبرا رہا ہوں۔ گیدی بولے بھئی اوور تو ختم کر دو۔ شیطان کی تیسری گیند پر کھلاڑی نے ہٹ لگائی اور بھاگا۔ بڈی نے نہایت پھرتی سے گیند روکی اور وکٹ میں نشانہ لگایا ـــــ اُسے رن آؤٹ کر دیا۔ شیطان بولے یہ بھی میری ہی وکٹ رہی۔ یہ خاص رن آؤٹ کرانے والی گیند تھی۔
شیطان کی خوب تعریفیں ہوئیں۔ شاباش دینے کے بہانے سے اُنہیں پیٹ پیٹ کر رکھ دیا گیا۔ اسکور وہی دو سو چالیس تھا اور ساری ٹیم آؤٹ ہو چکی تھی۔

اب ہماری اننگز شروع ہوئی۔ میں اور سرلا رضیہ کے قریب بیٹھے تھے۔ اور وہ وزدیدہ نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔ رضیہ نہایت پیاری معلوم ہو رہی تھی۔ آج اُس نے میرا پسندیدہ لباس پہن رکھا تھا۔ بال بھی میری پسند کے مطابق بنائے ہوئے تھے۔ گلے میں وہ سادہ سا ہار تھا جو میں نے اسے دیا تھا۔
مخالف ٹیم فیلڈ کرنے چلی۔ اور شیطان کیمرہ لے کر پہنچے اُن کی تصویریں اُتاریں۔ باقاعدہ پوز کرا کے ـــــ پھر گیدی صاحب اور مقصود گھوڑا بیچنے لگے کرشامیانے سے پہلے ـــــ شیطان نے اُن کی تصویریں اُتاریں۔ میں نے اُن دونوں لڑکیوں سے شیطان کا تعارف کرا دیا۔ . . . . . .
اور اب خوب باتیں ہو رہی تھیں شیطان کی ہدایت کے مطابق ہم نے ... ٹافیاں اور چُوسنے کی گولیاں تقسیم کیں۔ رضیہ ہماری طرف بہت توجہ دے رہی تھی لیکن ہم دیر تک شامیانے میں نہ بیٹھ سکے۔ ہمارے مخالف بولر نہایت ہی اچھے تھے یا ہمارے بیٹسمین شامیانے کی طرف دیکھتے رہے۔ جو بھی جاتا وکٹوں کے پاس ... کر واپس آجاتا۔ جب ساتویں وکٹ پر بڈی ... گیا تو اسکور پچیس تھا۔ بڈی کے منہ میں چیونگ گم تھا۔ اور ... جاتے ہی اُس نے ترپن بچنے سے ایک چوکا لگا دیا۔ اگلی گیند پر چوکا۔ پھر چھکا، پھر چوکا۔ غرضیکہ بولر کے چھکے چھڑا دیئے۔ اُدھر ... بڑی چلتا ... گیند زمین پر پڑتے ہی ... ہٹ لگتی۔ وہ تیز ... قسم کی بولنگ کراکر ... لاٹھی سے ... گیا۔ میں نے کوشش کی کہ بڈی کی مدد کروں ... اسی ... میں آؤٹ ہو گیا۔ شیطان گئے اور جب ... واپس آ گئے۔
ـــــ ساری ٹیم ننانوے پر آؤٹ ہو گئی۔ اُسی ننانوے پر ... کا سکور تھا۔ غضب ... اور ہماری ٹیم کی ننانوے میں بڈی کا ... اُن بڈی کا سکور ... کرکٹ ... بال کی طرح کھیلتا تھا۔ ... کا کھلاڑی نہیں ... تھا۔ جج صاحب نے فیصلہ صادر فرما دیا کہ ہم ... گیدی صاحب ہمت ہار بیٹھے تھے۔ سب ... چلے گئے ... کے پاس آ بیٹھا۔ وہ بولی چلیے باہر گھاس پر بیٹھ کر چلغوزے ... کھائیں۔ ہم باہر چلے گئے۔ سرلا اپنی کسی سہیلی حمیدہ کا ذکر کر رہی تھی کہ وہ بہت پسند کرتی تھی۔ اتنے میں شیطان آ گئے۔ بولے ـــــ حمیدہ دیکھو نہیں جو لباس بہت اچھا پہنتی ہے؟
سرلا بولی ـــــ "ہاں"

"اور جیسے لباس لگتا بھی اچھا ہے؟"

"ہاں!"

"اور جو بلا کی حسین ہے۔"

"ہاں!"

"اور جو گاتی بھی خوب ہے۔"

"ہاں! ـــ کیا آپ اسے جانتے ہیں؟"

"نہیں، ابھی تک تو نہیں جانتا لیکن جاننا چاہتا ہوں، کیا آپ کبھی اُس سے میرا تعارف کرادیں گی؟"

مسز لا بولی ـــ ضرور

شیطان حمیدہ کو بالکل نہیں جانتے تھے۔ ہم دونوں نے اُس لڑکی کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر حمیدہ کی باتیں ہونے لگیں۔ شیطان بڑا اشتیاق ظاہر کر رہے تھے۔ دفعتاً ہمیں ایک ایسی ہستی نظر آئی کہ شیطان کے دیوتا کوچ کر گئے یہ مس ریچھ تھیں۔ مس ریچھ پر شیطان چند ماہ پہلے بُری طرح عاشق تھے۔ عاشق کیا بالکل دیوانے بنے ہوئے تھے۔ اُدھر مس موصوفہ میں کوئی بات ایسی نہیں تھی جس پر کوئی عاشق ہوتا ہوا اچھا لگے۔ یہ نام اُن کو بہت زیب دیتا تھا۔ وہ خوب طویل و عریض تھیں۔ اُن کی والدہ شیطان کو کبھی پسند کرتی تھیں کبھی ناپسند۔ وہ بھی اُسی سانچے کی بنی ہوئی تھیں۔ بس ذرا پُرانا ماڈل تھیں۔ بعض اوقات تو وہ اپنی بیٹی سے قدرے حسین معلوم ہوتی تھیں۔ شیطان کا خوب مذاق اُڑتا ـــ ریچھوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں ـــ سو غنیمتیں کھا کے پلا ریچھ کا بچہ ـــ تو ہی اداں چند ریچھوں پر قناعت کر گیا ـــ مانا کہ تیرے ریچھ کے قابل نہیں ہوں میں، تو اپنا ریچھ دیکھ میرا انتظار دیکھ ـــ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن شیطان باز نہ آئے اور اس وقت تک عاشق رہے جب تک اُن کا موڈ عاشقانہ رہا۔ پھر خود بخود راہِ راست پر آگئے۔ بابی کا خیال تھا کہ شیطان مس ریچھ پر اس لئے عاشق ہوئے ہیں کہ اس وقت اور کوئی عاشق ہونے کے لئے نہیں ہے۔ اُن سے تعارف نہایت ہی پُر لطف طریقے سے ہوا یوں کہ میں اور شیطان چھٹیوں میں کہیں سے آرہے تھے۔ شیطان مارے کنجوسی کے سیکنڈ میں سفر کر رہے تھے۔ ایک جنکشن پر گاڑی بدلی۔ دوسری گاڑی چلنے والی تھی۔ بھاگا دوڑی میں سامان رکھوا رہے تھے۔ کہ ہجوم میں ہمیں ایک سفید ریش فقیر دکھائی دیا جو ایک بچے کی اُنگلی پکڑے جا رہا تھا۔ فقیر کافی بوڑھا تھا اور قدرے گبرا بھی تھا۔ شیطان کو ایسے موقعوں پر فوراً ترس آجاتا ہے۔ اپنی جیبیں ٹٹول کر بولے ـــ میرے پاس نوٹ ہیں۔ تمہارے پاس کچھ ٹوٹا ہوا ہو تو اسے نکالو دو ... گھبراہٹ میں کچھ نہیں۔ بڑی مشکل سے دو آنے لے جلدی سے اُس فقیر کو دیئے۔ اور قلیوں کے پیچھے بھاگے۔

سیکنڈ میں کافی جگہ تھی۔ گاڑی چلنے سے ذرا پہلے کسی کا بہت سا سامان آگیا۔ اس کے بعد ایک سالم کنبہ۔ اور اس کے بعد ہی فقیر اُسی بچے کے ساتھ سیکنڈ میں آبیٹھا۔ سارا کنبہ اُسے ابا جان کہہ رہا تھا ـــ لاحول ولا قوۃ! ـــ ہم بڑے شرمندہ ہوئے وہ بزرگ جو ہمیں اُس وقت فقیر معلوم ہوئے نہایت معزز قسم کے حضرت نکلے۔ دراصل کچھ تو اُن کا لباس سادہ تھا۔ کچھ ہم گھبرائے ہوئے تھے۔ اور کچھ شیطان کو ترس زیادہ آگیا تھا۔ اُنہوں نے ہمارے دو آنے واپس کئے اور بڑے مزے کی باتیں ہوئیں۔ اُسی کنبے میں مس ریچھ بھی تھیں۔ اور شیطان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً عاشق ہو گئے۔ واپسی میں بدی کو بتایا گیا وہ بولا۔ شاید یہ پانچویں لڑکی ہے جس پر تم اس سال عاشق ہوئے ہو۔

شیطان بولے ـــ نہیں چوتھی ہے، ایک لڑکی پر میں دو بار عاشق ہوا تھا۔

جب شیطان رُو بہ صحت ہوئے تو مس ریچھ سے میلوں پرے بھاگنے لگے۔ کیا تو اُن کے درشن کے لئے بیتاب رہتے تھے۔ اور کیا اب اُن کے درشن سے بیزار ہونے لگے۔ اور اکثر کہا کرتے کہ جن جن باتوں پر پہلے شرم آتے ہوئے فخر محسوس ہوتا تھا اُن ہی باتوں پر اب فخر محسوس کرتے ہوئے شرم آتی تھی۔

وہ تو شیطان کی خوش قسمتی ہے مس ریچھ نے ہمیں دیکھا نہیں ورنہ وہ سیدھی ہماری طرف آتیں۔

جب ہم فیلڈ کرنے جا رہے۔ تھے تو ننھی آئی بولی ـــ آپ اس طرح گیند کیوں نہیں پھینکتے۔ پوچھا۔ کس طرح؟ بولی اسی طرح جیسے اُس روز پھینکی تھیں۔ پوچھا۔ کس روز؟ بولی؛ ـــ میں بھول گئی ٹھہریئے ابھی پوچھ کر آتی ہوں اور سیدھی رضیہ کے پاس گئی۔ اچھا تو یہ سب رضیہ صاحبہ تمہیں ہدایت دے رہی تھیں۔ ننھی نے مجھے ایک کاغذ کا پرزہ لا کر دیا جس پر لکھا تھا۔ "بیگ تھیوری"

خیال تو اچھا تھا لیکن مصیبت وہی کیچ کرنے کی تھی۔

میچ کی دوسری اننگز شروع ہوئی۔ گیدی صاحب نے بڑی غلطیاں کیں۔ ایک تو یہ کہ سمتھ کو بہت جلد ہٹا لیا۔ اُس کی جگہ شیطان سے بولنگ کرائی۔ سب نے کہا کہ سیم جو کچھ ہوا اتفاقاً ہو گیا، لیکن گیدی نہ مانے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شیطان کی خوب پٹائی ہوئی۔ پھر گیدی صاحب کو جوش آیا۔ تو اُنہوں نے خود بولنگ کی۔ اور وہ گیندیں پھینکنی شروع کیں جن کے متعلق اُن کا خیال تھا کہ گگلی ہیں لیکن کچھ نہ بنا۔ شیطان بار بار مجھ سے شرط بدتے "لگتے ہو دس روپے ——— یہ کھلاڑی پچاس سے اوپر سکور کرے گا۔" میں انکار کرتا تو فوراً کہتے ——— "اچھا چلو لگتے ہو دس روپے ——— یہ کھلاڑی پچاس سے نیچے سکور کرے گا۔" میں برابر انکار کرتا رہا کیونکہ میرے روپے ختم ہو چکے تھے۔ شیطان نے کہا کہ حکومت آپا سے اُدھار لے لو۔

جب ہم چائے پینے لگے تو سکور ڈیڑھ سو تھا اور صرف چار کھلاڑی آؤٹ ہوئے تھے وہ [illegible] ابھی کھیل رہے تھے اس پر تبرا یہ ہوا شیطان بالکل بات نہیں کی شاید خفا ہو گئے تھے۔ گیدی صاحب بالکل نا امید ہو چکے تھے۔ جج صاحب نے بھی بیزاری کا اظہار کیا۔ میچ کا نتیجہ صاف نظر آ رہا ہے لیکن سرلا نے بڑی ہمت بندھائی، بولی۔ آپ ضرور اچھا کھیلیں گے۔ میں نے وہ رومال جو دیا تھا۔ [illegible] پھر آئی بولی آپا کہہ رہی ہیں کہ آپ نے ہمارا کہنا نہیں مانا۔ [illegible] سے کہو کہ ابھی مانتا ہوں۔ میں نے گیدی صاحب سے لیگ تھیوری کے لئے کہا۔ وہ بہت گھبرائے۔ بمشکل رضامند ہوئے۔ دن بھر کے کھیل سے وکٹ کافی خراب ہو چکی تھی۔ پہلی گیند ایسی تیز بریک ہوئی کہ میں حیران رہ گیا۔ خود بخود لیگ بریک ہو رہے تھے۔ اتنی تیز گیندوں پر۔ گیدی صاحب بولے یہ اتنے تیز لیگ بریک تم نے کب سے شروع کئے؟ ——— میں نے کہا ——— آج سے۔ بلکہ ابھی سے۔ تیسری گیند پر بڈی نے بیگ پر ایک نہایت خوبصورت کیچ کیا اور فقیر صاحب شامیانے کی طرف چل دیئے۔ فقیر صاحب کے آؤٹ ہونے پر سب خوش ہوئے ——— سوائے فقیر صاحب کے۔ اگلی گیند پر کھلاڑی نے گلانس کیا اور بڈی نے زمین پر لیٹ کر گیند دبوچ لی۔ اب تو شور مچ گیا۔ دو گیندوں پر دو کھلاڑی آؤٹ۔ آوازیں آ رہی تھیں کہ ہیٹ ٹرک کرو ہیٹ ٹرک کا خیال ہی ایسا ہے کہ مجھے پسینہ آ گیا۔ لوگ طرح طرح کے مشورے مجھے دے رہے تھے۔ میں نے انتہائی گھبراہٹ میں گیند پھینکی۔ گیند بالکل معمولی سی تھی۔ کھلاڑی نے گھوم کر لیگ کی طرف ——— لگانے کی کوشش کی۔ گیدی صاحب نے اُچھل کر ہوا میں کیچ کرنے کی کوشش کی۔ اُن کا ہاتھ پہنچا بھی، گیند ہاتھ سے چھوئی بھی لیکن کیچ نہ ہوا گیند کا رُخ بدل گیا۔ دوسرے فیلڈر نے پھرتی سے ہاتھ پھیلایا لیکن کیچ پھر بھی نہ ہوا۔ میں نا اُمید ہو گیا کہ اب کوئی نہیں کیچ کر سکتا۔ فیلڈر کے ہاتھ سے گیند چھوئی اور رخ پھر بدل گیا اتنے میں بڈی بجلی کی طرح تڑپا اور گرتی ہوئی گیند دبوچ لی ——— ہیٹ ٹرک ہو گیا۔ سچ مچ کا ہیٹ ٹرک ——— جس کے خواب دیکھے جاتے ہیں ——— جس کی بڑی ڈینگیں مارتے ہیں۔ گیدی صاحب نے اپنا چھوٹا سا ہیٹ میرے سر پر رکھ دیا۔ میں نے وہی ہیٹ بڈی کے سر پر رکھ دیا تالیوں کے شور میں مجھے رضیہ کی تالیاں بالکل علیحدہ سنائی دے رہی تھیں۔ یہ ہیٹ ٹرک اُسی کا تھا۔ میرے اگلے اوور میں بڈی نے پھر ایک لاجواب کیچ کیا ایک کیچ سمتھ نے بہت دور باؤنڈری لائن پر کیا۔ آخری کھلاڑی کو میں نے بولڈ کر کے واپس بھیج دیا۔ ایک سو اٹھاون پہ ساری ٹیم آؤٹ۔ میں نے لگاتار چھ وکٹیں لی تھیں، محض لیگ تھیوری کی بدولت اور یہ مشورہ رضیہ کا تھا۔ ہماری ٹیم اب چست ہو گئی تھی۔ سب کے چہروں پر اُمید کی جھلک تھی۔ سرلا نے دوڑ کر میرا استقبال کیا اور بولی ——— دیکھا میں کہتی نہ تھی۔ شیطان میرے کان میں بولے۔ اگر تم مجھے کسی طرح ریچھ سے محفوظ رکھ سکو تو کل کے اخبار میں تمہاری تعریفیں ہی تعریفیں ہوں گی۔ پوچھا ——— کیونکر؟ بولے ——— ایڈیٹر میرا دوست ہے اور وہ سب کچھ میرے کمرے میں بیٹھ کر لکھتا ہے۔ میں اُن کو [illegible] حفاظت میں حکومت آپا کے پاس لے گیا۔ وہاں ریچھ تو کیا بھوت پریت بھی شیطان کے پاس نہیں پھٹک سکتے تھے۔

ننھی نے مجھے ایک چاکلیٹ دیا۔ پوچھا کس نے دیا ہے؟ بولی ——— آپا نے۔ پوچھا ——— کونسی آپا نے؟ بولی ——— نہیں بتاتے۔ میں نے سر ہلا دیا ——— ہم نہیں لیتے۔ بولی ——— رضو آپا نے۔ میں نے ایک پرزے پر "شکریہ" لکھ کر دیا ——— یہ رضو کو دے دینا۔ وہ بولی ——— آپ ادب نہیں کرتے ہماری آپا کا، صرف رضو کہتے ہیں ——— رضو آپا نہیں کہتے۔ میں نے کہا ——— آپا ہوں گی تمہاری، ہماری تو وہ صرف رضو ہیں۔ بولی۔ میں ابھی جا کر کہتی ہوں۔

اب ہمیں جیتنے کے لئے صرف تین سو رنز درکار تھیں۔ برابر ہونے کے لئے دو سو ننانوے اور ہارنے کے لئے دو سو اٹھانوے، ڈھائی سو یا دو سو۔ مقصود گھوڑا منہ بنا کر بولا ——— "قسم ہے راجی کی میں اس اننگز میں ایسا کھیلوں گا کہ سب عش عش کر اُٹھیں گے۔" سمتھ نے مکا ہوا میں ہلا کر کہا ——— "اور قسم ہے

ہمیشہ میوں کی میں پاس انگو میں ضرور سکور کروں گا شیطان بولے — قسم ہے ملازن کی کہ — کسی نے فرانڈ ک دیا کہ لمٹن تو ٹینس کا کھلاڑی ہے۔ شیطان بولے — "اچھا تو قسم ہے گاما پہلوان کی میں سنچری ضرور کروں گا۔"

بڑی چیونگ گم چباتا ہوا بولا — "قسم ہے مکی ماؤس کی میں بھی کچھ نہ کچھ کر کے رہوں گا۔"

شام ہو چکی تھی، کل تین ستیس منٹ باقی تھے۔ وکٹ خراب ہو چکی تھی اور روشنی بھی کم تھی۔ گیدی صاحب اور اُن کے لمبے لمبے مشیروں نے کچھ کانفرنس سی کی اور بولے — اگر شروع کے اچھے کھلاڑی اس وقت گئے تو کہیں آؤٹ نہ ہو جائیں۔ بہتر یہی ہوگا کہ آخری کھلاڑیوں میں سے دو کو بھیج دیں۔ اگر وہ آؤٹ بھی ہو گئے تو کوئی نقصان نہ ہوگا۔ ممکن ہے یہ وقت نکال جائیں۔ پھر کل اصلی کھیل ہوگا مجھے اور بڈی کو چُنا گیا۔ ہمیں بے شمار ہدایتیں دی گئیں کیونکہ آج تک ہم دونوں میں سے کوئی شروع میں نہیں گیا تھا۔ بڈی کی بڑی منتیں کی گئیں کہ بس گیند روک لینا ہٹ وغیرہ ابھی مت لگانا۔ ویسے بیٹسمین تو میں بھی ایسا ویسا ہی تھا لیکن اُن دنوں کرکٹ کی کتابوں سے مشہور کھلاڑیوں کے سٹائیل نقل کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ میں اور بڈی میدان میں گئے تو چاروں طرف تالیاں بج رہی تھیں۔ مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے میں بہت مشہور بیٹسمین ہوں اور ابھی کچھ کا کچھ کر کے دکھا دوں گا۔ کھیل شروع ہوا، چمکتی ہوئی گیند بجلی کی طرح آتی تھی اور جھلک دکھا کر نہ جانے کہاں غائب ہو جاتی۔ میں بلا لئے دیکھتا رہ جاتا۔ پہلے دو اوورز میں ایک گیند بھی نہ چھو سکا۔ ایک گیند بولر کے ہاتھ سے نکلی۔ خیال آیا کہ کٹ کروں، ابھی دہنا پاؤں اٹھایا ہی تھا کہ گیند کا رخ بدل گیا۔ سوچا کہ ڈرائیو کروں گا۔ گیند کا رخ اور بھی بدل گیا میں ہُک کی تیاری کر رہا تھا کہ روکنے میں مصلحت سمجھی اور بیگ پر خواہ مخواہ گلانس ہو گیا۔ گیند نہایت تیز تھی باؤنڈری ہو گئی۔ اب کچھ ہمت بندھی۔ جہاں گیند زمین پر پڑتی اچھل کر وہیں اُسے روک لیتا لیکن میں بالکل کتاب کی نقل کر رہا تھا سیدھے بلے سے جب گیند کو آئینہ دکھاتا تو نعرے لگتے "بہت اچھے"۔ "شاباش"۔ بڈی کو گیند روکنا مصیبت ہو گئی ہر گیند پر وہ ہٹ لگانے کے لئے بلا اُٹھاتا لیکن پھر کچھ سوچ کر رک جاتا۔ رو کنے میں لگتا کہ بالکل ایسے عجیب طریقے سے روکتا کہ کچھ دیر میں گیند کی چھک دیکھ کر سب ہنس پڑتے۔ خدا خدا کر کے وقت ختم ہوا جب ہم تالیوں کے شور میں شامیانے کی طرف لوٹے تو میں گیارہ ناٹ آؤٹ تھا اور بڈی بارہ ناٹ آؤٹ۔ سج صاحب نے بڑی شاباش دی بولے — اب تم کل اچھی طرح کھیلنا تین سو سکور ہے تو زیادہ۔ لیکن کرکٹ میں کچھ بھی ہو سکتا ہے چاہے

رات کو میں نے شیطان سے تصویروں کے متعلق پوچھا کہ فلم کب بھلوا گے بولے — کونسی فلم؟ — میں نے کہا کہ آج جو تصویریں اتاریں وہ بولے — کیمرہ تو خالی تھا۔ آج کل فلمیں ملتی کہاں ہیں۔ پوچھا — تو پھر تصویریں اتارنے میں کیا مسخرا پن تھا، بولے — ویسے ہی ذرا لطف رہتا ہے۔ ہاتھ میں کیمرہ ہو تو انسان ذرا سمارٹ معلوم ہوتا ہے۔ اگلے روز اخبار میں میری بہت تعریف تھی۔ مطلب یہ کہ بولنگ کا تذکرہ نہیں تھا بلکہ بیٹنگ کا — یہ سب شیطان کی کرامات تھی۔

میدان میں پہنچ کر دیکھتے ہیں تو رضیہ اور سرلا اکٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ خود بخود دوستی ہو گئی خوب گھُل مل کر باتیں ہو رہی تھیں۔ شیطان نے پھر وہی رٹ لگا دی۔ حمیدہ سے تعارف کراؤ۔ آخر شیطان کی مراد بر آئی۔ واقعی حمیدہ بہت اچھی لڑکی تھی۔

گیدی صاحب نے ہمیں پھر نصیحتیں کیں، بولے ابھی وقت بہت ہے پورے دو دن باقی ہیں۔ بس گیندیں روکتے رہو۔ اور سکور خود بخود ہوتا رہے گا۔ کھیل شروع ہوا اور ہم نے گیندیں روکنی شروع کر دیں۔ کوئی نہایت ہی فضول گیند ہوتی جو وکٹ سے میلوں پرے ہوتی۔ اُس پر ہٹ لگا دو بھی دبلی ہوئی۔ ادھر بڈی بالکل میری نقل کر رہا تھا۔ واقعی رنز خود بخود ہو رہی تھیں۔ ہم دونوں نے سکور سو تک پہنچا دیا۔ اب تو ہمارے بیٹسمین ہونے میں کوئی کسر نہ رہی تھی۔ بڈی آہستہ آہستہ اپنی اصلیت پر آ رہا تھا۔ اُس نے ہٹیں لگانی شروع کر دیں۔ اور پھر سلپ سے کسی نے بڈی کا کیچ کر لیا۔ بیالیس پر وہ آؤٹ ہو گیا۔ گیدی صاحب آئے لیکن وہ بہت ڈرے ہوئے تھے۔ ایک آسان سی گیند پر وہ آؤٹ ہو گئے اور بولے میں گگلی پر آؤٹ ہوا ہوں۔ مقصود گھوڑا آیا اُس نے کھیل خدا اچھا دیا سکور ڈیڑھ سو ہو گیا۔ مجھے اب گیند فٹ بال جتنی دکھائی دے رہی تھی اور میں پچاس ناٹ آؤٹ تھا۔ ایک گیند پر مقصود گھوڑے نے ہٹ لگائی اور مجھے بلایا۔ ہم ایک رن کر چکے تو مقصود گھوڑے نے ایک اور کے لئے کہا۔ میں بھاگا دو کچھ دور چلا آیا پھر چلا کر کہا — واپس گیند فیلڈر کے ہاتھ میں آ چکی تھی میں اور مقصود گھوڑا دونوں وکٹوں سے گز دو گز دور تھے میں پھر جا کے بھاگا ہم پہنچ تو گیا لیکن بُری طرح گرا۔ کہنیاں چھل گئیں دیکھتا ہوں تو مقصود گھوڑا واپس چلا جا رہا تھا۔ ہم لنچ کے لئے گئے اور مقصود بھی رن کرنے چلا گیا۔ بالکل بچانے آئے

تھا کہ میں جا چکا تھا۔ لنچ کے وقت تین وکٹوں پر سکور ایک سو اسی تھا۔ میں حمید صاحب کے پاس گیا جہاں مرزا، رضیہ، حمیدہ اور شیطان بیٹھے تھے۔ آج حکومت آپا اور نجمی غائب تھیں ورنہ غالباً شیطان حمیدہ کی طرف دیکھ بھی نہ سکتے۔ شیطان نے کیمرے سے چند تصویریں اتاریں ـــــ یا یوں ظاہر کیا کہ تصویریں اتار رہے ہیں ـــــ لنچ کے بعد ایک ہی اوور میں ہمارے دو کھلاڑی نکل گئے۔ کچھ دیر میں بادل صاف ہو گئے اور سورج چمکنے لگا۔ دو سو پر نئی گیند آئی اور مجھے ایک مرتبہ پھر قیامت کا سامنا کرنا پڑا۔ آہستہ آہستہ میں تھکتا جا رہا تھا۔ اب مجھے پتہ چلا کہ بیٹنگ بہت مشکل چیز ہے۔ آج تک کبھی اتنی دیر وکٹوں پر ٹھہرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ بھاگنے کو اب بالکل جی نہیں چاہتا تھا۔ چار پر ہمارا سکور ڈھائی سو تھا۔ میرا سکور ستر تھا۔ میری ٹانگیں شل ہو چکی تھیں۔ کمر بُری طرح دُکھ رہی تھی۔ ستر رنز ـــــ کافی سکور تھا۔ سب کہہ رہے تھے کہ سنچری کرو۔ شیطان اور حمیدہ باتیں کر رہے تھے۔ حمیدہ بولی ـــــ مجھے بائیں ہاتھ سے کھیلنے والے زیادہ پسند ہیں ـــــ "لیفٹ ہینڈر" کھیلتا ہوا لگتا بھی اچھا ہے۔ شیطان بولے ـــــ میں آج بائیں ہاتھ سے کھیلوں گا۔ اگرچہ میں نے بولنگ دہنے ہاتھ سے کی ہے۔ لیکن بیٹنگ بائیں ہاتھ سے کروں گا۔ اور پھر یہ کرکٹ تو ہے بھی میرے بائیں ہاتھ کا کھیل۔ مجھے ایک طرف لے جا کر شیطان نے کہا ـــــ اس لڑکی نے مجھ میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ آج تم دیکھنا میں کیسا کھیلتا ہوں ـــــ اور ہاں آج رضیہ دن بھر اداس رہی ہے۔ روٹھنا وٹھنا سب ختم ہو چکا ہے۔ آج وہ تمہیں ضرور بلائے گی۔ اب تم بھی روٹھنا ملتوی کر دو۔ جب وہ بلائے چلے جانا اور جہاں تک ہو سکے بلا لو مجھے چاہو جس وقت ـــــ والا برتاؤ کرنا۔ اس شکر رنجی کا ذکر تک نہ کرنا۔

چار کے بعد پہلی گیند پر ایک وکٹ اور نکل گئی۔ سمتھ آیا۔ اب ایک ایک گیند پر تالیاں بجتی تھیں۔ سکور کرو نہ کرو۔ ہٹ لگاؤ نہ لگاؤ۔ چاہے روکتے رہو یا باہر کی گیند کو صاف چھوڑ دو ـــــ شور ضرور مچتا تھا۔ سمتھ مجھے موقعہ دے رہا تھا۔ وعدے کے مطابق وہ گیندیں روک رہا تھا۔ آخر ایک گیند پر ٹھوکا ـــــ "ہاؤ اِز اِٹ ؟" امپائر کی انگلی آسمان کی طرف اُٹھ گئی اور سمتھ واپس چلا گیا۔ اب آخری کھلاڑی آیا تھا ـــــ شیطان اپنی عینک سنبھالتے، بلا گھماتے ایک عجب شان سے تشریف لا رہے تھے۔ ہجوم خاموش ہو گیا۔

جیسے ناامیدی چھا گئی ہو ـــــ مجھے بھی یقین ہو گیا کہ اب نہ سنچری ہو گی اور نہ سکور پیدا ہو گا۔ میں نے شیطان سے التجا کی کہ دہنے ہاتھ سے ہی کھیلو۔ یہ بائیں ہاتھ کا شوق کبھی پھر پیدا کر لینا۔ بولے ـــــ ہرگز نہیں، حمیدہ دیکھ رہی ہے ـــــ اور تم دیکھنا تو سہی اگر زندگی نے وفا کی تو سکور پیدا کر کے دکھاؤں گا ـــــ جب میں جیتنے کی ہٹ لگاؤں گا تو حمیدہ کا چہرہ فخر سے اُونچا ہو جائے گا۔

شیطان کے محبوب سٹروک دو ہیں ـــــ لیگ بائی اور آف بائی۔ کبھی کبھی گیند پیڈوں سے بچ کر بلے میں بھی لگ جاتی ہے اور جب بلے سے نکل جائے تو پھر لازمی طور پر وکٹوں میں چلی جاتی ہے۔ اُنہوں نے لیفٹ ہینڈر کا سٹائل بنایا اور بولر کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ پہلی گیند اُن کے بازوؤں میں سے نکل گئی۔ دوسری ناک کے نیچے سے نکل گئی۔ تیسری کمر میں لگی۔ اوور کے بعد مجھ سے ملنے آئے۔ لوگوں نے سمجھا کرکٹ کی باتیں ہو رہی ہیں۔ خوب شور مچا۔ شیطان بولے ـــــ وہ دیکھو حمیدہ عین سیدھ میں بیٹھی ہے ـــــ وہ رہی۔ میں نے بتایا کہ وہ تو کوئی اور ہے۔ شیطان نے عینک کے شیشے صاف کیے اور بولے ـــــ تو ہجوم میں کہیں ہو گی۔ کاش کہ اس وقت دوربین ہوتی اور یہ پوائنٹ پر جو فیلڈر کھڑا ہے اس کی مونچھیں مجھے آؤٹ کرائیں گی۔

میرے اوور کے بعد پھر مجھ سے ملے، بولے ـــــ جانتے ہو یہ وکٹ کیپر حمیدہ کا کوئی عزیز ہے۔ جی چاہتا ہے اسے ایک کیچ کرا دوں۔ بیچارے نے آج ایک بھی کیچ نہیں کیا۔ میں نے پھر ان کی منتیں کیں۔ شیطان اتنی بری طرح کھیل رہے تھے کہ لوگوں نے ہنسنا شروع کر دیا: "یہ بیٹنگ کیسی ہو رہی ہے ؟" مخالف بولر آہستہ سے بولا ـــــ اور یہ بولنگ کیسے ہو رہی ہے ؟ شیطان نے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی اُچھل کر ایک لیگ بائی سکور کی۔ اب وہ وکٹ کے چاروں طرف کھیل رہے تھے اور بائی پر بائی سکور ہو رہی تھی۔ سکور دو سو اسی ہو گیا۔ میں پچانوے ناٹ آؤٹ تھا۔ اور شیطان نے آٹھ بائی سکور کی تھیں۔ میں اس قدر تھک چکا تھا کہ مجھے نہ کسی سکور کا پتہ رہا تھا نہ کسی میچ کا۔ بس ایسا جی چاہتا تھا کہ پیڈ وغیرہ اتار کر یہیں گھاس پر لیٹ جاؤں۔ ایک گیند پر بائی سکور کر کے شیطان نے مجھے بلایا میں چلا اُنہوں نے دفعتاً روک دیا گیند واپس آئی لیکن تیز تھی اس لیے دوسری طرف نکل گئی۔ شیطان نے پھر بلایا

میں چلا، گیند واپس آگئی وہ چلائے واپس جاؤ۔ میں بُری طرح بھاگا۔ وکٹوں تک پہنچا ہی تھا کہ شیطان نے پھر بلایا۔ ہم دونوں خوب بھاگے دوڑے لیکن سکور کچھ نہ ہوا۔ اگلی گیند پر شیطان نے پھر یہی حرکت کی، اس دفعہ تو میں رن آؤٹ ہوتا ہوتا بچا۔ شیطان وکٹ کیپر سے باتیں کر رہے تھے۔ مجھ سے بولے۔ میرا تعارف حمیدہ جیسی لڑکی سے ہو گیا ہے اب جہنم میں جائیں، گیدی صاحب اور یہ میچ۔ اگر چند گیندیں تو ایک چھوٹا سا اپ بن تو سے گا شیطان نے وکٹ کیپر کو بلانے پر مدعو کیا۔ وہ دونوں خوب مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہے تھے۔ آخری اوور آیا اور میں نے دل کڑا کر کے ایک چوکا لگا دیا، اب میں ننانوے ناٹ آؤٹ تھا۔ اگلی گیند کو گلانس کیا اور شیطان کو بلایا۔ وہ نہیں آئے۔ چوتھی گیند پر پھر بلایا وہ پھر بھی وہیں کھڑے رہے۔ وقت ختم ہو گیا۔ جب ہم واپس آئے تو سکور دو سو پچاسی تھا۔ میں وہی ننانوے ناٹ آؤٹ تھا۔ شیطان بولے —— میاں یہ ننانوے کا پھیر بہت برا ہوتا ہے۔ یہ ہندسہ ہمارے لئے منحوس ہے۔ کہیں کا تمہارے ساتھ اُن کا برا ہی سلوک نہ کرے جو میں نے خود بر وفتیر صاحب کے ساتھ کیا تھا جب وہ ننانوے ناٹ آؤٹ تھے میں نے اُن سے پوچھا کہ یہ آخر اوور میں کیا حرکت کی تھی، میرے بلانے پر کیوں نہیں آئے۔ بولے —— اس لئے کہ اب اس خاکسار کی دو آرزوئیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ تمہاری سنچری ہرگز نہ ہو۔ ورنہ تم ہم ناڑیوں کے زمرے سے نکل کر اپنے آپ کو نہ جانے کیا سمجھنے لگو گے اور ہمارا جینا دوبھر کر دو گے۔ دوسری یہ کہ جیتنے کی ہٹ میں لگا رہا تا ہوں کیونکہ حمیدہ نے مجھے حکم دیا ہے۔ میں ابھی شیطان کو لعنت پیش کر رہا تھا کہ اتنے میں رضیہ آگئی بولی —— ذرا سنئے میں اُس کے ساتھ سے باہر آ گیا۔ ہم دونوں ایک طرف گھاس پر بیٹھ گئے۔ باتیں شروع ہوئیں۔ وہ بولی —— اتنے دنوں سے میں پڑھائی میں مصروف رہی اور کچھ میرا جی اچھا نہیں تھا۔ میں نے کہا —— میں بھی اتنے دنوں سے بہت مصروف رہا۔ کچھ امتحان کی تیاری میں اور کچھ یہ ٹورنمنٹ کا سلسلہ۔ میں نے لیگ تصویری کا ذکر کیا کہ اُسے یہ خیال کیونکر آیا۔ بولی میں نے کرکٹ کی کتاب میں پڑھا تھا۔ پوچھا —— کرکٹ کی کتاب کیوں پڑھی تھی؟ —— بولی —— آپ کا میچ جو ہو رہا تھا۔ ہم دونوں بڑے شرما رہے تھے۔ وہ بولی —— اب آپ سنچری ضرور کیجئے۔ میں نے اپنی سہیلیوں سے شرط لگائی ہے۔ میں نے پوچھا۔ کل کیا پروگرام ہے؟ بولی —— کل چھٹی ہے۔ پوچھا —— کل میرے ساتھ ایک پک نک پر چلو گی وہاں بہت سی لڑکیاں اور بیویاں ہوں گی۔ بولی —— اجازت لینی ہو گی، امی سے اور حکومت آپا سے بھی۔ کہا —— میرا کا بہانہ کر دینا۔ —— بولی "اچھا کوشش کروں گی"۔ کہا —— کوشش وشش کچھ نہیں، وعدہ کرو۔ شرما شرما کر بولی —— "اچھا"۔

میں شیطان کے پاس چلا گیا، وہ وکٹ کیپر صاحب وہیں تھے، یہی بھی وہیں تھا۔ حمیدہ کی باتیں ہو رہی تھیں۔ کئی مرتبہ ننانوے ناٹ آؤٹ کا ذکر آیا۔ واپسی میں مجھے ہر دیوار پر جلی الفاظ میں ننانوے ناٹ آؤٹ لکھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اپنے ہوسٹل میں پہنچا تو بہت سے لڑکے ملنے آئے ہر ایک نے ننانوے ناٹ آؤٹ دوہرایا۔ ٹائم پیس کی ٹک ٹک میں مجھے ننانوے ناٹ آؤٹ۔ ننانوے ناٹ آؤٹ سنائی دیتا رہا، رات بھر کوئی میرے کانوں میں چیخ چیخ کر یہی کہتا رہا —— ننانوے ناٹ آؤٹ۔ ننانوے ناٹ آؤٹ۔

اگلے روز بہت زیادہ ہجوم تھا۔ میچ واقعی نہایت دلچسپ ہو گیا تھا۔ مینا بازار سالم کا سالم وہیں موجود تھا۔ رضیہ میرے لئے چاکلیٹ لائی تھی۔ بولی —— "جب آپ سنچری کریں گے تب آپ کو ملیں گے"۔ سرلا اپنی آٹوگراف بک لائی تھی۔ بولی "جب آپ سنچری کرائیں گے تب آپ کے دستخط کرائیں گے۔ گیدی صاحب بولے —— اگر تم نے سنچری کر لی تو آئندہ تمہیں شروع میں بھیجا کریں گے۔ بڈی بولا —— مجھے یقین ہے کہ تم ضرور سنچری کرو گے، کل میں تمہارے لئے کینڈی اور ببل گم کے کئی ڈبے لاؤں گا۔

تالیوں کے شور اور نعروں کے غل میں شیطان اور میں بیٹ لے کر نکلے۔ شیطان کی باری تھی۔ مخالف کپتان نے اپنے ایک فاسٹ بولر کو بلا لیا۔ اُس کی پہلی گیند شیطان اور وکٹ کیپر دونوں کے اُوپر سے گذر گئی، —— بائی کی چار رنز ہو گئیں —— اگلی گیند پر پھر یہی ہوا —— چار رنز اور ہو گئیں۔ اب اُنہوں نے فالتو فیلڈر لے لی۔ اور بقیہ گیندیں بھی شیطان کے اُوپر سے گذر گئیں لیکن مزید سکور نہ ہوا۔ دوسری طرف سے اُنہوں نے ایک نیا بولر لگایا۔ جس کو میں اب تک نہیں کھیلا تھا۔ وہ اوور یونہی گذر گیا۔ اگلے اوور میں شیطان نے قلابازی سی کھائی اور ایک نہایت اعلیٰ درجہ کا کٹ لگایا۔ ویسے اُن کا ارادہ لیگ کی طرف کھیلنے کا تھا لیکن کٹ زبردستی لگ گیا۔ اب سکور دو سو ستانوے ہو گیا۔ اور وہیں اٹک کر رہ گیا۔ چند اوور پھر ویسے ہی گذر گئے۔ ہجوم کا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا۔ ہر گیند کے ساتھ

وہ شور مچا رہا تھا کہ خدا کی پناہ — مجھے یہ ڈر تھا کہ اگر اس مرتبہ گیند شیطان کے سر کے اوپر سے نکل گئی تو میں وہی ننانوے ناٹ آؤٹ رہ جاؤں گا۔ وہ شیطان نے کٹ کرنے کی کوشش کی اور گیند لیگ کی طرف نکل گئی۔ ہم نے دوڑ کر دو رنز بنائیں، سکور دو سو ننانوے ہو گیا۔ ہم نے سکور برابر کر دیا تھا۔ اب ہمیں جیتنے کے لئے صرف ایک رن کی ضرورت تھی اور مجھے بھی سنچری کے لئے ایک رن کی ضرورت تھی۔

اُس اوور کی ابھی تین گیندیں باقی تھیں۔ ہر گیند پر شیطان نے بے تحاشہ بلا گھمایا لیکن گیند اور بلے کی ملاقات نہ ہوئی۔ اِدھر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ ننانوے ناٹ آؤٹ ایک سیاہ ٹیکا ہے جو میرے ماتھے پر لگا ہوا ہے۔ جیسے یہ ایک طوق ہے جو میرے گلے میں لٹک رہا ہے۔ جیسے یہ ایک سینگ ہے جو میرے سر میں اُگا ہوا ہے جیسے میں اس سے ہرگز پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔

اوور ختم ہوا اور میری باری آئی۔ وہی نیا بولر گیند پھینک رہا تھا۔ گز گز بھر کی ایک بریک کراتا تھا۔ پہلی گیند روکی، دوسری روکی، تیسری، چوتھی، پانچویں — میں کسی پر سکور نہ کر سکا۔ اب آخری گیند تھی۔ اُدھر گیند آئی اِدھر میں نے آنکھیں بند کر کے بلا گھما دیا۔ خدا جانے بلے کے کس حصے سے لگی، لیکن لگی ضرور۔ گیند مڈ آن سے نکل گئی۔ دو فیلڈر پیچھے بھاگے۔ اُدھر میں بھاگا۔ دوسری طرف پہنچا تو شیطان وہیں کھڑے تھے۔ میں نے گیند کی طرف دیکھا، فیلڈر بدستور بھاگے جا رہے تھے۔ میں نے شیطان کو دوسری طرف جانے کو کہا لیکن وہ وہیں کھڑے رہے۔ میں نے اُن کو بازو سے پکڑ کر ہلایا لیکن وہ نہیں ہلے۔ آخر میں اُن کو زبردستی گھسیٹتا ہوا اپنی وکٹ پر چھوڑ کر آیا اور تابڑ توڑ واپس بھاگا۔ بس رن آؤٹ ہوتے ہوتے بچا — اور پھر غدر مچ گیا، زلزلہ آ گیا۔ زمین کی جگہ آسمان نے لے لی۔ آسمان زمین کی جگہ آ گیا — سنچری ہو گئی — ہم جیت گئے۔ بلی بھاگا بھاگا آیا اور مجھے کندھے پر اُٹھا کر شامیانے تک لے گیا — بار بار وہ یہی کہہ رہا تھا — ہُرّائے اور ہُرّائے — میں اب چیمپین ہوں۔ میں ایک کپ جیت گیا ہوں۔

شیطان وکٹ کیپر اور حمیدہ کے ساتھ ایسے غائب ہوئے جیسے کبھی یہاں تھے ہی نہیں۔ رضیہ نے مجھے چاکلیٹ دیئے۔ سرلا نے میرے دستخط کرائے۔ جج صاحب نے خوب شاباش دی اور بہت سے بزرگوں نے تعریفیں کیں۔ سرلا آہستہ سے بولی — میں رضیہ کے گھر جا رہی ہوں۔ آدھ گھنٹے تک آپ میرے گھر سے رضیہ کو لے جائیے۔

میں جلدی سے ہوسٹل گیا، سائیکل کے پیچھے پک نِک کی ٹوکری باندھی اور واپس آیا، رضیہ اور سرلا دونوں ملیں۔ سرلا نے مسکرا کر ہمیں رخصت کیا۔ ہم پیدل چل رہے تھے۔ رضیہ نے نہایت خوشنما کوٹ پہن رکھا تھا۔ بولی — یہ نیا کوٹ ابا نے سالگرہ پر دیا تھا۔ میں اسے آج پہلی مرتبہ پہن رہی ہوں۔ میں نے پوچھا — اور اب تک کیوں نہ پہنا۔ بولی — میں نے سوچا کسی خاص دن پہنوں گی۔

میں نے اُسے سائیکل پر بیٹھنے کو کہا، بولی کیریر پر تو ٹوکری بندھی ہوئی ہے میں نے کہا — آگے بیٹھ جاؤ۔ بولی — جو کسی نے دیکھ لیا تو؟ میں نے کہا کسی نے دیکھ لیا تو میری خوش نصیبی پر رشک کرے گا وہ شرما کر آگے بیٹھ گئی، میرا چہرہ بالکل اُس کے بالوں سے چھو رہا تھا — "یہ تم نے حکومت آپا کی خوشبو آج پھر چرائی ہے" میں بولا — "آپ نے بھی تو سر میں حکومت آپا کا تیل لگا رکھا ہے" وہ بولی۔ ہم دونوں درست تھے۔

جب ہم دو تین میل نکل گئے تو رضیہ پوچھنے لگی تو رضیہ پوچھنے لگی کہ پک نِک کہاں ہو رہا ہے۔ میں نے بتایا کہ یہاں سے کچھ دور ایک باغ ہے وہاں ہو رہا ہے۔ اس نے پوچھا کہ پک نِک میں کون کون ہونگے۔ میں نے بتایا کہ پک نِک میں صرف دو ہیں — میں اور رضیہ۔ وہ بولی — مجھے پہلے ہی سے پتہ تھا۔ میں نے بتایا کہ اس باغ میں میں کئی سال سے تنہا آیا کرتا تھا۔ اس کے نظارے اور سنگ مرمر کی عمارتیں مجھے بہت پسند ہیں۔ عرصے سے میرا یہی جی چاہتا تھا کہ تم بھی کبھی میرے ساتھ یہاں آؤ۔ ہم دونوں اکٹھے سیر کریں۔ ایک اونچی بُرجی پر چڑھ کر غروب آفتاب دیکھیں۔ حوض کے کنارے سنگ مرمر کی محرابوں میں میں تمہیں چاندنی میں دیکھوں گا۔ ہم باغ میں پہنچ گئے، رضیہ بولی — واپسی میں دیر تو نہیں ہو جائے گی۔ میں نے پوچھا — تم کب تک کی اجازت لے کر آئی ہو۔ بولی — سرلا نے امی سے کہا تھا کہ رات کے کھانے تک پہنچ جائیں گے۔

میں بولا — سرلا بہت اچھی ہے۔ وہ مُنہ بنا کر بولی — جی ہاں، بہت ہی اچھی ہے بیچاری، آپ کی بھی بہت تعریفیں کرتی ہے۔ میں نے مُنہ بنا کر اُس کی نقل اُتاری۔ ہم دونوں ہنس دیئے۔

ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھاس کے قطعوں اور پھولوں کے تختوں میں پھرتے رہے، درختوں میں ہم نے آنکھ مچولی کھیلی، حوض کے کنارے

بیٹھ کر پینگیں اُڑائے۔ سیڑھیوں پر شرطیں لگا لگا کر چڑھے۔ جب دھوپ پیلی پڑ گئی اور درختوں کے سائے لمبے ہو گئے تو ہم سب سے اونچی بُرجی پر چڑھ گئے۔ وہاں سے ہم نے غروبِ آفتاب دیکھا۔ جو آج بہت حسین معلوم ہوا۔ بادلوں نے آسمان میں رنگ بکھیر دیا، چمکیلے محل، سنہری سیڑھیاں اور اودے اودے پہاڑ تیار کیے تھے۔ رنگوں کا یہ کھیل دیر تک رہا۔ آفتاب غروب ہو چکا۔ ہم نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو بڑا سا گول چاند چمک رہا تھا۔ چاندنی کھلی۔ اور ہم حوض کے کنارے جا بیٹھے۔ حوض میں مریں مچل رہی تھیں اور ہزاروں چاند تڑپ رہے تھے۔ آج چاندنی میں بلا کی جاذبیت اور نرالی دلآویزی تھی۔ سنگِ مرمر کی محرابوں تلے میں نے رضیہ کو دیکھا اور یہ تمیز کرنا مشکل ہو گیا کہ چاندنی زیادہ حسین ہے یا رضیہ کے چہرے کی وہ جلا جس نے چاندنی کو حُسن بخشا ہے۔ تب یوں معلوم ہوا جیسے رضیہ کا حُسن اور چاندنی ایک ہی نور کے حصے ہیں۔

جب ہم دونوں سائیکل پر واپس آ رہے تھے تو میرا دل مسرّت سے رقص کر رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اس چاندنی رات میں دنیا کا مسرور ترین انسان ہوں۔

رضیہ بولی ـــ "یہ میچ تو صرف آپ کا میچ تھا، وہ ہیٹ ٹرک خوب ہوا ـــ آپ گیند پھینکتے ہوئے بہت اچھے لگ رہے تھے!"

میں نے کہا ـــ "وہ ہیٹ ٹرک تو تمہارا تھا۔"

وہ بولی ـــ "اور وہ ننانوے ناٹ آؤٹ؟"

میں نے مچل کر کہا ـــ "نہیں سو ناٹ آؤٹ۔"

بولی ـــ "ہم تو ننانوے ناٹ آؤٹ ہی کہیں گے، وہ آخری رن تو آپ نے زبردستی بنالی۔ بھلا کرکٹ میں کبھی اس طرح بھی ہوتا ہے کہ کوئی اپنے ساتھی کو گھسیٹ گھسیٹ کر بھی سکور کرتا ہے۔ اور یہ سب نرملا کے رِبن کی برکت ہے۔"

میں نے کہا ـــ "ذرا میری طرف دیکھو۔" اُس نے میری طرف دیکھا کہا ـــ "اب ذرا مسکراؤ بھی۔" وہ مسکرانے لگی۔ کہا ـــ "اب ذرا مُنہ بنا کر دکھاؤ جیسے رُوٹھتے میں بناتی ہے۔" اُس نے مُنہ بنایا۔ میں نے کہا ـــ "تم مسکراتی ہوئی کیسی اچھی معلوم ہوتی ہو۔ ہلکی سی مسکراہٹ سے تمہارا چہرہ دمکنے لگتا ہے! یہ مُنہ بنانا یا رُوٹھنا تمہیں ذرا اچھا نہیں لگتا۔ اگر یقین نہ ہو تو آج آئینے میں دیکھنا۔"

اُس نے اپنی انگلیوں سے آہستہ سے میرا چہرہ موڑ دیا ـــ "آپ آگے دیکھئے ـــ بالکل سیدھ میں ـــ اور سائیکل سیدھی چلائیے، کہیں کسی درخت یا کھمبے سے ٹکر نہ ہو جائے۔"

نرملا کے ہاں پہنچے۔ اُس نے مسکراتے ہوئے ہمارا استقبال کیا۔ رضیہ کو چھوڑ کر میں نے شیطان کے ہوسٹل کا رُخ کیا، راستے میں وہی چھوٹا سا کا رپورٹر مل گیا، بولا ـــ مبارک ہو آپ لوگ میچ جیت گئے ہیں، آپ ننانوے ناٹ آؤٹ رہے۔ میں نے پوچھا ـــ آپ کو کس نے بتلایا؟ بولا ـــ مُعلّی صاحب نے، اور میں نے اخبار میں آپ کی بڑی تعریف کی ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ آپ ذرا اور خوش قسمت ہوتے تو ایک اور سکور کر کے سنچری بنا جاتے۔ میں نے پوچھا ـــ ابھی چھپا تو نہیں؟ بولا ـــ نہیں آدھی رات کے بعد چھپے گا۔ میں نے اُسے ساتھ لیا، راستے میں سٹینڈرڈ آتا تھا جہاں بڈی اکثر پایا جاتا تھا۔ وہاں سے بڈی کو پکڑا، شیطان کے کمرے میں پہنچے۔ دیکھا ایک ہجوم سے پلنگ پر رضائیاں اوڑھے چند حضرات کھانا کھا رہے ہیں۔

رضائیاں منگائی گئیں اور ہمیں بھی ساتھ بٹھایا گیا۔ "تم بھی کھانا کھاؤ گے؟" شیطان نے بڈی سے پوچھا۔

"نہیں! ـــ میں ابھی کھا کر آیا ہوں۔"

"اچھا ـــ تو ان کے لئے بھی کھانا لاؤ۔" شیطان نوکر سے بولے۔

"تم انڈے کھاؤ گے یا کباب؟"

"کباب!" بڈی بولا۔

"اچھا تو ان کے لئے انڈے لاؤ۔ بھلا! ابھی کھانا کھا کے آئے ہوتے!"

"آملیٹ!" بڈی بولا۔

"تو پھر تلے ہوئے انڈے لے آؤ۔"

رپورٹر بولا میں کچھ نہیں کھاؤں گا۔ شیطان نے اصرار کیا کہ چائے کافی ہی پی لو۔ وہ بولا ـــ "شکریہ میں فقط چائے پیوں گا۔"

شیطان نوکر سے بولے ـــ "کافی بنا لاؤ۔"

کھانے کے بعد میں نے وہ ننانوے ناٹ آؤٹ والا قصہ سنایا شیطان بولے ـــ "یار عجب سچویشن ہو گئی ہے۔ [illegible]

پریشان ہو [illegible] اچھا یار تمہاری سمجھ [illegible]

[illegible]

ڈائرکٹر نذیر سنتیجرین پردے میں پیش کرتا ہے

نذیر

ہند پکچرز کی موسیقی نواز معاشرتی فلم

یادگار

نمائش کیلئے تیار ہے

جس میں کا ہر منظر ہماری روزمرہ زندگی کے رنج و غم اور مسرت و فرحت کا آئینہ دار ہے

— اداکاران خصوصی —

جیوتی — ایم اسمٰعیل — کیلاش — تسنیم

— معاونین —

گلاب — جاردن شرما — گلزار — ریاض — ملک — رفیق علی

بے بی نور — رشید — آغا جان —

کہانی: — نذیر	آرٹ ڈائرکٹر: — ایم اسمٰعیل
مکالمے و نغمات: — تنویر	عکاس: — ایل این ورما
موسیقار: — اے آر قریشی	صدا بند: — جیلانی

— (کل دنیا کیلئے جملہ حقوق بحق) —

ہند پکچرز — مین روڈ — دادر بمبئی ۱۴

حقوق تقسیم

یو۔ پی دہلی	پنجاب و سرحد
ہری ٹاکیز ڈسٹری بیوٹرز چاندنی چوک دہلی	ملک ٹاکیز ڈسٹری بیوٹرز ۳ نسبت روڈ لاہور

زیر عمل **شیخ و برہمن** ہدایت کار نذیر

ناظرین کیلئے

دنیائے حسن کی ایک لازوال داستان

دو ہزار برس قبل از اسلام کی دلگداز داستان محبت

وامق عذرا

12 36 5
9 3

نذیر

ہند پکچرز کی رومان آفرین نغمہ بار دلکش

عوام کے محبوب فلمی ستاروں کی دلآویز اداکاری

— دلفریب مکالمے دلپسند نغمات دلکش موسیقی —

— اداکاران خصوصی —

سورن لتا — نذیر — ایم اسمٰعیل — کسم دیکشت پانڈے

— معاونین —

ڈبلیو ایم خان — تسنیم — ریاض — چاچا گنپت پرشاد — یونس — آغا پیر جان — رشید — الفو (منشی دل دریافت)

کہانی مکالمے: — منشی دل	آرٹ ڈائرکٹر: — ایم اسمٰعیل
نغمات: — تنویر	عکاس: — ایل این ورما
ہدایت کار موسیقی: — اے آر قریشی	صدا بند: — جیلانی

— (کل دنیا کیلئے جملہ حقوق بحق) —

ہند پکچرز — مین روڈ — دادر بمبئی ۱۴

حقوق تقسیم

برائے یو۔ پی۔ دہلی	برائے پنجاب سرحد
ہری ٹاکیز ڈسٹری بیوٹرز چاندنی چوک دہلی	ملک ٹاکیز ڈسٹری بیوٹرز ۳ نسبت روڈ لاہور

زیر عمل **روپ بسنت** ہدایت کار نذیر

اس پرچے کے کسی مضمون، افسانے، نظم یا غزل کے نقل کرنے کی اجازت نہیں

فہرست

طارق — محمد طفیل

مضامین

نظمیں، غزلیں

دل شاہجہانپوری کا غیر مطبوعہ کلام

حامد عزیز مدنی

افسانے

انتظاریہ

محمد طفیل ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغِ اردو، ایبک روڈ لاہور سے شائع کیا

طلوُع

ذاتی جھگڑوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ بعض کا منشا یہ بھی ہے۔ میں نے انتخابی پرچوں کے بارے میں اصولی باتوں کو چھیڑا تو کراچی کا ایک پرچہ ... مضامین نے اس ضمن میں جو کچھ لکھا تھا۔ اس کا مخاطب کوئی ایک رسالہ نہ تھا۔ بلکہ وہ سارے ہی رسالے تھے جو صرف انتخاب چھاپا کرتے ہیں۔ مگر موصوف نے بے قابو ہو کر (واضح اشاروں کے ساتھ) غریب نقوش کو بُرا بھلا کہہ ڈالا۔ دیکھیے سینہ زوری۔ ہماری بلی ہمیں سے میاؤں یعنی ایک تو ہماری اجازت کے بغیر چیزیں چھاپیں۔ اُلٹا ڈانٹیں بھی — نہ تو کسی سے بھی الجھنا نہیں چاہتے۔ نہ ہمیں کسی ایک رسالے سے کوئی سروکار ہے۔ نہ ہم اس بحث کو ذاتی بحث بنانا چاہتے ہیں۔

یاروں نے کہا (مدیرانِ رسائل نے) کہ کسی طرح انتخابی پرچوں کی وبا کو روکا جائے۔ ورنہ ایک دن ایسا آئے گا کہ ہمارے پرچے بند ہو جائیں گے (اس لیے کہ ہم نئے مضامین حاصل کرنے کے لیے ان تھک محنت کرتے ہیں) اور انتخابی پرچے بِکا کریں گے (اس لیے کہ انھوں نے دو روپے کی قینچی خرید لی ہے)

اسی ضمن میں میں نے ایک آدھ بار پہلے بھی لکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج میں اپنے ساتھ چند دوستوں کو بھی لایا ہوں۔ پہلے آپ اُن کی باتیں سُن لیں۔ میں تو گھر کا آدمی ہوں۔ میری باتیں تو آپ روز سنتے ہیں :-

برادرم۔ سلامِ مسنون۔ آپ کا ایک خط دس بارہ دن پہلے آیا تھا اور میں عجب چکر میں پڑ گیا کہ کیا جواب دوں؟ اس سے چھوٹنے نہ پایا تھا کہ ایک اور خط آ گیا اور اب پھر دو دن جواب سوچنے میں گزر گئے۔

برادرِ عزیز! مجھے اپنی دونوں آنکھیں پیاری ہیں۔ آپ بھی مجھے عزیز ہیں اور شمس صاحب بھی۔ آپ کی شکایت کو رفع کرنے کے لیے میں نے شمس صاحب سے کہہ دیا تھا کہ جو مضمون نقل کریں اس کی اجازت پہلے مضمون نگار سے حاصل کریں۔ دوسری بات یہ کہ نقوش کے تازہ پرچہ سے کوئی مضمون فوراً نقل نہ کریں۔ تیسرے یہ کہ جس مضمون کا کاپی رائٹ صاحبِ رسالہ کے پاس ہو اُسے یا تو نقل نہ کریں یا صاحبِ رسالہ سے اجازت لے کر نقل کریں۔ میری اور آپ کی گفتگو میں یہی باتیں طے ہوئی تھیں۔ شمس صاحب نے ان تمام شرائط کو منظور کر لیا اور ان پر عمل بھی کرنے لگے۔ اب میں اُن سے کیا کہوں؟ میرے خیال میں تو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ "نقوش" کا قدردان تو نقوش ہی خریدے گا۔ وہ اس کا انتظار نہیں کرے گا کہ نقوش کے اچھے افسانے جب

نقش میں چھپ کر آپ نے پڑھ لیے ہوں گے۔ نقوش بن گیا یہ ایک بڑی عمدہ بات ہے بلکہ ایسا راستہ جسے روکا نہیں جا سکتا۔ لہٰذا آپ خوش دلی سے کام لیجیے — باقی دونوں تو کشکولوں ہی میں جگہ پاتی ہیں۔

مخلص۔ شاہد احمد

طفیل صاحب! اس وقت یہی اشعار ذہن میں ہیں جو بھیجتا ہوں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے غالباً ابھی تک شائع نہیں ہوئے۔ انتخابی پرچوں کا مسئلہ خاص ہے۔ وہاں یہ مسئلہ ہے جس کا وہاں کی طرف سے اعلیٰ یقیناً غیر مستحسن سمجھتا ہوں لیکن اس بارے میں آپ کی رائے زیادہ وقیع ہے۔ فقط

نقش محمد طفیل

انتخابی رسائل میں ادبی تخلیقات کی بے دریغ اشاعت ایک مسئلہ بن چکی ہے۔ ہر مہینے مختلف معیاری ادبی رسائل کے مضامین نظم و نثر کا انتخاب چھاپنے والے اصحاب سے یہ دریافت کیا جائے کہ ان کے اس فعل کا کوئی جواز ہے تو صرف یہ کہ یوں عام لوگوں تک اچھے لکھنے والوں کا ادبی اور جمالیاتی ذوق نکھرتا ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا ہے اور ان کے قارئین کا حلقہ وسیع تر ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انتخاب کے سہارے چلنے والے رسالے اپنے فعل کا جواز پیش کرتے وقت دراصل یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم تو ایسا کر کے ادیبوں اور شاعروں پر احسان کرتے ہیں اور انھیں ہمارا ممنون ہونا چاہیے اور ہم سے کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لانا چاہیے۔ ان اصحاب میں سے کسی نے بھی یہ سوچنے کی تکلیف گوارا نہیں کی (اور اگر سوچا ہے تو اس کا اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھتے) کہ اگر پاکستانی فن کاروں کے افسانے اور نظمیں پہلی اشاعت اور اشاعت مکرر کے مستحق ہیں تو اجرت کے معقول معاوضے[2] کے بھی تو مستحق ہیں۔ دوسروں کو بزعم خود ان کی جیبوں کے بوجھ سے چھٹکارا دلا کر اپنے بھرنا چاہتے ہیں۔ خاطر جمع کرنے والے چاہے عمل کرتے رہیں۔ مگر ہمیشہ جیب بھرنے ہی کا دم ہے۔ اگر بعض حضرات کو "ڈائجسٹ" قسم کے رسالے چھاپنے کا شوق ہے تو انھیں اس حقیقت کو بھی تو "ڈائجسٹ" کرنا چاہیے کہ ادیب اپنی تخلیق صرف ایک رسالے کو اشاعت کے لیے دیتا ہے اور اس کے بعد سب تخلیقات کو اس توقع کے ساتھ مجموعوں میں جمع کر دیتا ہے کہ ادب کے قارئین انھیں یقیناً ضرور خریدیں گے۔ اگر "انتخابی" رسالے چھاپنے والے اصحاب کو لوگوں کا ادبی ذوق نکھارنے، ادیبوں اور شاعروں کی مقبولیت میں اضافہ کرنے اور ان کے قارئین کا حلقہ وسیع تر کرنے کے مقاصد ایسے ہی عزیز ہیں (اور یقیناً یہ بڑے مبارک مقاصد ہیں) تو وہ چند کتب کو معیاری ادبی کتابوں کی بیش از بیش خریداری کی ملک گیر تحریک چلائیں۔ اس کام کے لیے وہ رسائل میں سے مضامین چھپنے سے اُچک لینے کے بجائے ہر مہینے نئی ادبی مطبوعات کی ایک جامع اور خوبصورت فہرست شائع کیا کریں۔ یوں وہ ادب اور ادیب کی بے مثال خدمت کریں گے۔ مگر کیا وہ ایسا کریں گے؟ جبکہ اس ماہانہ فہرست کتب کو بہت ہی کم لوگ خریدیں گے اور انھیں

---

[1] بھائی شاہد کا ماہنامہ نقش سے عملاً کوئی تعلق نہیں۔ صرف مدیر نقش سے دوستی ہے۔ جس کا اظہار اس خط سے بھی ہوتا ہے۔

[2] سنا ہے کہ یہ حضرات دس روپے فی غزل اور بیس روپے فی افسانہ کے حساب سے ادیبوں کو نذرانہ دیتے ہیں۔

بہت ہی کم آمدنی ہوگی۔ ثابت ہُوا کہ اصل مقصد نہ ادب کی خدمت ہے اور نہ ادیب کی (اخلاقی) امداد۔ اصل مقصد حصولِ زر ہے۔ اس صورت میں پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کا فرض ہے کہ وہ اپنے اس ہمہ گیر استحصال کو متحد ہو کر روکیں۔ جن ادیبوں اور شاعروں نے ان "انتخابی" رسائل کو اپنی تخلیقات مفت میں چھاپنے کے "دوامی" اجازت نامے دے دئیے ہیں وہ یہ اجازت نامے واپس لے لیں اور صرف اس صورت میں اجازت دیں جب یہ رسالے انہیں معقول اور مناسب بلکہ پہلی اشاعت سے دُگنا معاوضہ دینے کو تیار ہوں۔ آخر ادیبوں اور شاعروں کو اپنی کتابوں کے پانچ دس ہزار مستقل قارئین سے ہاتھ دھونے کی اجرت تو ملنی چاہیے۔

احمد ندیم قاسمی

کیا ہمارے ہاں کوئی صحیح قسم کا ادبی ڈائجسٹ چھپ رہا ہے؟ صحیح قسم کا میں نے اس لیے کہا ہے کہ کوئی بھی شریفانہ کام ہو اس کے چند آداب ہوتے ہیں۔ اگر یہ آداب ملحوظ نہ رکھے جائیں تو بلیک مارکیٹ، تجارت اور سرقہ بھی فن کہلائے گا۔

ہمارے اکثر انتخابی پرچے انتخاب کے کسی معقول معیار سے محروم ہیں۔ مگر یہ تو اُن کا ذاتی معاملہ ہے۔ ممکن ہے ان کے نزدیک انتخاب کا یہی معیار معقول اور مقبول ہو۔

انتخاب کے معاملے میں نہ تو ادیب کی رائے لی جاتی ہے، نہ اجازت اور نہ معاوضے کی ادائیگی کا مفاد شکن معاملہ سامنے رکھا جاتا ہے۔ ادیب کو تو صرف اس اعلیٰ قسم کی بات سے خوش کر دیا جاتا ہے کہ اس کی تخلیق انتخاب میں آگئی ہے۔ بھلا خوشی سے بڑا معاوضہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ —— انتخابی جرائد ادھر ادیب کو خوشیوں کے معاوضے سے مالا مال کرتے ہیں، اُدھر اُن ادبی رسائل کا شکریہ بھی ادا کر دیتے ہیں جن کی چیزوں سے اپنے پرچے کو مالا مال کرتے ہیں۔ شکایت کا کسی کو بھی موقعہ نہیں دیا جاتا۔ مگر مشکل یہ ہے شکریہ اور خوشیوں کا معاوضہ دونوں بڑے مہنگے پڑ رہے ہیں۔ انتخابی رسائل ان پرچوں کا گلا گھونٹ رہے ہیں جو ہزاروں دقتوں کے بعد ادیب کو معاوضہ ادا کرکے اپنے آپ کو بناتے سنوارتے ہیں۔ مگر ان کا شمارہ ابھی اپنے قارئین تک ڈھنگ سے پہنچنے بھی نہیں پاتا کہ انتخابی جریدے ان کا نچوڑ حاصل کرکے اسٹال پر پہنچ جاتے ہیں۔ لکھا لکھایا سامان مل گیا، چھاپ کر سستے داموں بیچ ڈالا۔ ادھر قاری کا یہ رویہ کہ انتخاب کا انتظار ہو رہا ہے مہنگے ادبی رسائل کون خریدے۔ روپیہ بارہ آنے خرچ کرکے ملک کے تمام رسائل کے ادب کا نچوڑ پڑھ لیا گیا۔ اس سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا کہ اس انتخاب میں واقعی نچوڑ ہے یا نہیں۔

ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ادبی رسائل کے مالک سوچنے لگے ہیں کہ کیوں نہ وہ بھی آسان ترکیب استعمال کریں۔ مجھے ایک اچھے خاصے اشاعتی ادارے کے بارے میں معلوم ہے کہ پہلے اس نے ایک ادبی پرچہ چھاپنے کا ارادہ کیا تھا مگر بعد میں ادبی ڈائجسٹ شائع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ دراصل ہمارے ملک کا ماحول ابھی ادبی ڈائجسٹ کے لیے مناسب نہیں ہے۔ پڑھے لکھے باذوق پاکستانیوں کی تعداد کم ہے۔ اچھے ادبی رسائل بھی دو چار ہی شائع ہوتے ہیں۔ معقول کتابوں کی منڈی بھی محدود ہے۔ اگر ادبی رسائل اور کتب کا حصہ انتخابی جریدے سنبھال لیں تو انجام ظاہر ہے۔

خدیجہ مستور

برادرم طفیل صاحب! اس وقت مسئلہ پیشِ نظر یہ ہے کہ یہ جو "......" اور "......" وغیرہ اُردو کے موقت الشیوع رسائل و جرائد میں سے مستقلاً چیزیں لے کر شائع ہو رہے ہیں تو ان کے اس اقدام سے نتائج کیا برآمد ہوتے ہیں اور ہم اس سے کن صورتوں میں اور کہاں تک متاثر ہوتے ہیں! —— میں یہاں دو حیثیتوں سے اظہارِ خیال کروں گا۔ میری پہلی حیثیت ایک مصنف کی ہے۔ ایک ایسے

مصنف کی جو کچھ تجارتی رموز ہیں جانتا ہے — یہ بات واضح ہے کہ ایک مصنف رسایل و جرائد میں جو کچھ لکھتا ہے اس نقطۂ نظر سے لکھتا ہے کہ ایک دن اس کی بھی ذہنی کاوشیں جمع ہو کر ایک مستقل صورت یعنی کتابی شکل اختیار کریں گی اور وہ ناشر سے اس کتاب کے عوض ایک معقول معاوضہ حاصل کرنے کا حقدار ہو جائے گا۔ اب اگر اس مصنف کی تخلیقات کتابی شکل پذیر ہونے سے پیشتر دو تین مرتبہ منظر عام پر آچکی ہیں تو لازماً اس کے پڑھنے والوں کا حلقہ محدود ہو جائے گا اور نتیجۃً کتاب زیادہ فروخت نہیں ہو سکے گی جس کا اثر براہ راست مصنف کی ذات پر پڑے گا — میں سمجھتا ہوں کہ مذکورہ بالا پرچوں کی روش تجارتی اعتبار سے ہر مصنف کے لیے نقصان دہ ہے۔

میری دوسری حیثیت ایک ایڈیٹر کی ہے — ایک ایسے ایڈیٹر کی جس کی زندگی کے کم و بیش سترہ سال ایک ادبی ماہنامے کے ادارتی فرائض ادا کرتے ہوئے گزر گئے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ادارت کتنی محنت شاقہ کی متقاضی ہے اور مدیر رسالہ کو اپنا رسالہ زندہ رکھنے کے لیے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ پڑھنے والوں کے سامنے جو مضامین نظم و نثر آتے ہیں وہ عموماً اس انداز میں نہیں آتے جس انداز میں مصنفوں نے انھیں لکھا ہے — مدیر بسا اوقات مضمون کو درست کرکے ان کی نوک پلک درست کرتا ہے۔ ان کے حصول کی خاطر اسے طویل خط و کتابت کرنا پڑتی ہے، بعض مضامین پر معاوضہ بھی دینا ہے اور نہ جانے کیا کچھ کرنا ہے تب کہیں جا کے رسالہ چھپ کر قارئین کے سامنے پیش ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں کیا ایک ایڈیٹر کے لیے یہ صریحاً ناانصافی نہیں کہ سر توڑ یہ محنت تو وہ کرے اور فائدہ اس کے اپنے پرچے کی بجائے ان رسالوں کو پہنچ جائے جن کے مدیران کرام وقت کا بہت مختصر حصہ صرف کرکے مختلف رسالوں کے منتخب مضامین نظم و نثر پر محض نشان لگا کے کاتبوں کے حوالے کر دیں اور یوں ان کے رسالے اشاعت پذیر ہو کر مارکیٹ کے بیشتر حصے پر غاصبانہ قبضہ کر لیتے ہیں؟

یہ ایک بدیہی امر ہے کہ جو پرچہ ہر ماہ ہمارے معیاری جرائد کی نمایاں چیزیں اپنے دامن میں سمیٹ کر شائع ہو جاتا ہے اس کا خیر مقدم ان پرچوں کے مقابلے میں زیادہ گرمجوشی سے کیا جاتا ہے جن سے وہ زندگی حاصل کرتا ہے — اور یہ پہلے پرچوں پر ایک ناقابل برداشت ظلم ہے۔ ان زیادتی کرنے والے پرچوں کے خلاف متفقہ طور پر قدم اٹھانا نہایت ضروری ہے۔ اور اس ظلم کے خلاف جو آواز بھی بلند ہوگی اسے اہل علم اور مدیران رسائل و جرائد کی پُرجوش تائید حاصل ہوگی۔

میرزا ادیب

اردو میں ڈائجسٹ طرز کے رسایل کا سوال اردو ادب میں ایک مسئلہ بن گیا ہے۔ سب سے اوّل ہمیں دیکھنا چاہیے کہ یہ بدعت جہاں سے آئی ہے وہاں اُن کا طرزِ عمل کیا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں جو ڈائجسٹ رسایل شائع ہو رہے ہیں وہ دو قسم کے ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو شائع شدہ کتب اور مضامین کا خلاصہ تیار کرا کر شایع کرتے ہیں۔ کسی بڑے ناول یا مضمون کا خلاصہ یعنی نفسِ مضمون کسی قابل اہل قلم سے چند صفحات میں تیار کرایا جاتا ہے اور مرتب کنندہ کو اس کا معاوضہ دیا جاتا ہے۔ اس سے اصل کتاب یا مضمون یا افسانہ کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچتا بلکہ جن لوگوں کو یہ پسند ہو یا اُن کے مذاق کی چیز معلوم ہو وہ اصل کتاب یا مضمون حاصل کرکے اُس کا مطالعہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس سے رسایل اور کتب کی اشاعت میں مدد ملتی ہے۔ دوسری قسم کے وہ ڈائجسٹ رسایل ہیں جو مدیرانِ رسایل سے اجازت حاصل کرکے ان کے حوالے سے مضمون نقل کرتے ہیں — پاکستان کے اردو ڈائجسٹ رسایل کتابوں، افسانوں یا مضامین کا خلاصہ تو تیار نہیں کراتے کیونکہ یہ کام تو اصل سے زیادہ مشکل ہوتا ہے اور اس پر خرچ بھی زیادہ آتا ہے۔ بلکہ وہ دوسرے رسایل کے مضامین کو اکثر بلا اجازت نقل کرکے شایع کر دیتے ہیں۔ یہ تو وہی بات ہوئی ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔

ہمارے ہاں یہ بدعت کوئی نئی نہیں ہے۔ اس سے قبل بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔ میرے عزیز دوست اختر شیرانی مرحوم نے اسی قسم کا ایک رسالہ "انتخاب" کے نام سے جاری کیا تھا۔ جو چند مہینے شائع ہونے کے بعد بند ہو گیا۔ اس رسالہ کے تمام مضامین دوسرے رسائل سے نقل کیے جاتے تھے اور کتابت طباعت بہترین ہوتی تھی اور مضامین پر اختر صاحب کے لکھے ہوئے تعارفی نوٹ عالمانہ اور محققانہ ہوتے تھے اس کے باوجود پبلک نے اس رسالہ کو سخت ناپسند کیا تھا بلکہ بعض تو اُٹھا کر پھینک دیتے اور کہتے کہ اوہ! اس میں تو تمام مضامین مطبوعہ ہوتے ہیں۔ اُس زمانہ میں مطبوعہ مضمون چھاپنا ایک گالی تھی اور کسی اخبار یا رسالہ کی بڑی سبکی اور ہتک کی بات تھی کہ وہ کوئی شائع شدہ مضمون نقل کرے

میں ۲۸ سال سے نیرنگِ خیال کو شائع کر رہا ہوں۔ کیونکر اس دکھ کی واردات لکھوں تو حرف حرف جگر اور آنسوؤں میں ڈوبا ہوا چیخ و پکار کی داستان ہوگی۔ یہ لوگ ایک ایک مضمون حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ کرتے ہیں۔ پہلے زمانے میں مضمون دینے میں جو بخل ہو چکا اس سے نہیں ملتے تھے۔ با معاوضہ دینا گناہ اور ہتک سمجھتے تھے۔ وہ اگر لکھتے تھے تو شوق سے اپنے نام کے لیے، خدمتِ فن کے لیے، ادب کے لیے، عوام کے افادہ کے لیے۔ اس کے لیے ایڈیٹروں کو اہلِ قلم سے ذاتی دوستانہ تعلقات پیدا کرنے پڑتے تھے۔ اس سلسلہ میں خاکسار نے ہندوستان کے درجنوں سفر کیے۔ دہلی، علی گڑھ، آگرہ، لکھنؤ، کلکتہ، حیدرآباد اور بمبئی تک خاک چھانی۔ ہزاروں روپیہ صرف ہوتا تھا اور اس کا مقصد وحید صرف اہلِ قلم سے ذاتی تعارف و تعلق پیدا کرنا ہوتا تھا۔ اب آپ اندازہ کیجئے کہ آج کے معاوضہ سے جو بعض اصحاب حاصل کر رہے ہیں۔ ہمیں اس مد میں کس قدر زیادہ رقم خرچ کرنی پڑتی تھی اور اس کے ساتھ زحمتِ سفر مستزاد۔

ایک واقعہ سن لیجئے۔ سید امتیاز علی تاج نیرنگِ خیال میں لکھا کرتے تھے۔ اُن سے ایک مضمون حاصل کرنے کے لیے مجھے کتنی پریشانی اور دقت ہوتی تھی۔ اس کا اندازہ قارئین کرام نہیں کر سکتے۔ ہر اہلِ قلم جداگانہ مزاج اور انفرادی ساخت رکھتا ہے۔ امتیاز صاحب سے مجھے ایک افسانہ تین مہینے کی تگ و دو کے بعد ملا۔ یقین کیجئے کہ یہ چیز اٹھائیسویں چکر میں ملی تھی۔ ایک ایڈیٹر ۲۸[1] بار کوشش کرنے کے بعد ایک مضمون حاصل کرتا ہے۔ آپ نے کتنا وقت اس کے لیے دیا! اور تانگہ (سواری) کے اخراجات کیا ہوئے۔ کیونکہ وہاں جب بھی جانا پڑتا، دُور کی مسافت کی وجہ سے بغیر سواری کے نہ جا سکتا تھا۔ یہ افسانہ نیرنگِ خیال میں شائع ہوا تو میرے دوست اختر صاحب نے اسے انتخاب میں نقل کر لیا۔ چند دن بعد وہ میرے ہاں تشریف لائے تو میں نے انھیں کہا کہ اختر صاحب دو سو روپیہ آپ کے ذمہ ہیں۔ وہ کہنے لگے کیسے! میں نے کہا آپ نے نیرنگِ خیال سے جناب تاج صاحب کا جو افسانہ نقل کر لیا ہے اس کا معاوضہ! اختر صاحب نے کہا۔ واہ حضرت! دیکھئے افسانہ نقل کیا اور ٹھاٹھ سے نقل کیا اور حوالہ بھی دیا اور نوٹ بھی لکھا۔ کیا آپ نے تاج صاحب کو کچھ معاوضہ دیا تھا؟ میں نے کہا معاوضہ تو نہیں دیا نہ وہ مجھ سے معاوضہ لیتے ہیں۔ لیکن تین ماہ کی کوشش کے بعد اٹھائیسویں پھیرے میں یہ افسانہ ملا تھا۔ اب آپ اندازہ کیجئے کہ آپ نے اُسے نقل کر کے نیرنگِ خیال کی انفرادیت، وقار اور شہرت کو نقصان پہنچایا۔

حقیقتِ حال کا صحیح اندازہ کرنے کے بعد انھوں نے سر جھکا لیا اور کہنے لگے "حکیم صاحب میں نے اس بات کا تو اندازہ ہی نہیں کیا تھا۔ ہماری قینچی بے پناہ ظلم کر رہی ہے۔ اور اس کے ساتھ پبلک بھی پرچے سے نفرت کرتی ہے اور کہتی ہے کہ اس میں تو چھاپہ شدہ (نقل شدہ) مضامین ہوتے ہیں۔ اس مقصد میں مجھے کامیابی نہیں ہوئی، یہ پرچہ تو خود بخود بند ہو جائے گا۔" اور آخر انتخاب بند ہو گیا

---

[1] اس شمارہ میں مجنوں گورکھپوری کا ایک طویل افسانہ "تنہائی" چھپ رہا ہے۔ خود موصوف کا خط پڑھ لیجئے اور دیکھ لیجئے کہ میں نے ایک افسانہ حاصل کرنے کے لیے کتنے برس صرف کر دئے ہیں۔ (مدیر)

[illegible] صحافت [illegible] نہیں رہ سکتا [illegible] اور ضعیف ہو جانے کی وجہ سے [illegible]
[illegible] اور صحت اپنے میں نہیں پاتا۔

وہ رسائل جو نقل شدہ مضامین کے بل بوتے پر تجارت کرتے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مضامین کا حصول کتنا دشوار اور مشکل مسئلہ ہے اور نقد معاوضہ سے زیادہ ہمت تعلقات اور مضمون حاصل کرنے کی جد و جہد ہے۔ پھر کسی ایڈیٹر کی تخلیق یا اس کا [illegible] نشان اُسے اپنے پرچے کی زینت بنائے تو کیا یہ ظلم نہیں ہوگا؟

خلیل یوسف حسن

میرا اندازہ یہ ہے کہ اس نام کسی نے بھی اس مسئلے کے ہر پہلو پر سوچا ہی نہ تھا۔ بظاہر تو یہ سہانا خواب ہے۔ مگر اس کی تعبیر بے حد خوفناک۔

ارادہ نہ تھا کہ اس مسئلے میں احباب کو بھی زحمت دیتا جو ہم یا مشورے کی حد تک حرج ہی کیا ہے۔ اطلاع دی تو وہ پہلے ہی سے بیٹھے تھے۔ ساتھ ہو لیے۔ اب میں اس سلسلے کو پوری معقولیت کے ساتھ آگے بڑھاؤں گا۔ پاک و ہند کے سارے ادیب میرے دوست ہیں۔ میرے بھائی ہیں۔ وہ میری بات سنیں گے اور ہماری جائز مشکلوں میں ہمارا ساتھ بھی دیں گے۔

سب سے پہلے تو انتخابی پرچوں پر یہ چوٹ پڑی کہ انھیں مصنفین کو بھی معاوضہ دینا پڑ گیا۔ ورنہ صاحب پہلے کون پوچھنے والا تھا۔ میں نے اس مسئلے کو اٹھایا۔ رائٹرز گلڈ نے غور کیا۔ نتیجہ معاوضے کی صورت مصنف کے حق میں نکلا۔

سوال یہ ہے کہ کیا معاوضہ مل جانے پر مصنف کے حقوق کی پوری پوری حفاظت ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ہاجرہ مسرور صاحبہ کا ایک انٹرویو قابل توجہ ہے۔ جو ہفت روزہ نصرت (۲۴ اپریل ۱۹۶۲ء) میں چھپا تھا۔

"دراصل افسانے کے تنزل کا پراپیگنڈا کرنے میں کسی حد تک ہمارے ناشروں کا بھی ہاتھ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ افسانوں کا مجموعہ اب بکتا ہی نہیں لہٰذا اسے شائع کرنا خسارے کا سودا ہے۔ وہ لوگ بھی ایک حد تک سچے ہیں۔ اگر آج ایک افسانہ کسی پرچے میں چھپتا ہے تو دوسرے رسالے اُسے نقل کر کے حسب توفیق استفادہ کر لیتے ہیں۔ پھر رہی سہی کسر ہمارے چند ایک ریڈرز ڈائجسٹ قسم کے پرچے نکال دیتے ہیں۔ میرا اپنا ایک افسانہ "مول تول" اب تک چھ دفعہ شائع ہو چکا ہے۔ اس طرح ایک افسانہ قاری کی ایک بڑی تعداد کی نظر سے گزر جاتا ہے۔ اور جب ایک مصنف کے ایسے ہی افسانے مجموعے کی شکل میں شائع ہوتے ہیں تو قاری انہیں پہلے ہی متعدد بار پڑھ چکا ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ مجموعہ خریدنے میں پوری دلچسپی نہیں لیتا۔"

بعض دوست یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہمارا افسانہ پانچ دس پرچوں میں نقل ہو جائے گا تو اس سے ہماری پبلسٹی میں اضافہ ہوگا۔ یہ بات ایک مبتدی کے لیے تو شاید سود مند ہو۔ مگر جس ادیب کا ادب میں کوئی مقام ہے اور اس کی کتابیں بھی چھپتی ہوں۔ اس کے لیے یہ سودا قطعاً سود مند نہیں۔ اس ضمن میں ہاجرہ مسرور صاحبہ کا تجزیہ بہرصورت قابل غور ہے۔ اگر انتخابی پرچوں کی روش یہی رہی تو نوبت یہاں تک پہنچنے کا خطرہ ہے کہ ادیب کو اپنی دائمی زندگی برقرار رکھنے کے لیے خود اپنی گرہ سے اپنی کتابیں چھپوانا پڑیں گی۔

رسائل قاری اور مصنف کے درمیان ایک طرح کا رابطہ ہوتے ہیں۔ آج جتنے بھی بڑے بڑے ادیب نظر آتے ہیں۔ انھوں نے پہلے پہل

رسائل ہی میں لکھنا سیکھا۔ کسی نے نیرنگِ خیال میں، کسی نے ادبِ لطیف میں، کسی نے ساقی میں (وغیرہم) رسائل ہی کے ذریعہ ادیب نامور ہوئے اگر نئے اور ذہین قلمکاروں کی ذہنی کاوشوں کو یہ رسالے منظرِ عام پر نہ لاتے تو آج کئی بڑے ادیبوں کا وجود ہی نہ ہوتا۔ وہ اپنی تمام تر قابلیتوں کے باوجود گوشۂ گمنامی میں پڑے رہ جاتے۔ ظاہر ہے کہ ادب کی بقا اور نشوونما کے لیے اچھے اچھے ادبی رسالوں کا وجود بے حد ضروری ہے جو: پہلے لکھنے والوں کے جوہروں کو، درجہ بدرجہ بنا سنوار کے قارئین کے سامنے پیش کریں اور جو بالکل مبتدی ہوں۔ ان کی اس انداز میں تربیت کریں کہ وہ مستقبل کے ایسے ادیب بن سکیں۔ جن پر ادب فخر کرسکے۔ بے شک ہر نیا ادیب اپنی ہی صلاحیتوں سے چمکتا ہے۔ مگر اس میں مدیرانِ رسائل کی جانکنی بھی شامل ہوتی ہے۔ میرے نزدیک۔ تو اچھے رسائل، نئے ادیبوں کے لیے ٹریننگ اسکول ہوتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ رسائل جو ادب کی ترویج و ترقی کی بنیاد ہیں۔ وہ آج انتخابی پرچوں کے ہاتھوں اپنی آبرو لٹوا رہے ہیں۔ اس لیے کہ ہمارے یہ دوست محض ذاتی تجارت کی خاطر، ہر پرچے سے پانچ دس چیزیں اُڑا لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو پرچے صحیح معنوں میں ادب کی خدمت کر رہے ہیں وہ سخت پریشان ہیں۔ ان کی اشاعت پر یہ پرچے اثر انداز ہو رہے ہیں اور ایک وقت آئے گا کہ جن کے دم سے اُردو ادب کی ترویج و ترقی کی روایات وابستہ ہیں۔ وہ سب دم توڑ دیں گے۔ آج انتخابی پرچوں کی حوصلہ افزائی کا بالکل یہی مطلب ہے کہ ادب کی جڑوں کو کاٹ کر رکھ دیا جائے، اور شاخوں اور پتوں کی نشوونما ہی کو ادب کی ترویج و ترقی سمجھ لیا جائے۔

بعض دوست یہ کہتے ہیں کہ ادارۂ نقوش نے بھی تو تین چار نمبر صرف انتخابات پر مشتمل چھاپے ہیں۔ جی ہاں، یہ جرم سرزد ہو چکا ہے نقوش نے اپنی تیرہ سالہ زندگی میں، صرف چار نمبر (افسانہ نمبر، غزل نمبر، طنز و مزاح نمبر اور آخر میں خود نقوش ہی کا انتخاب ادبِ عالیہ نمبر) ایسے چھاپے ہیں۔ جو لوگ موجودہ انتخابی پرچوں سے اُن کا مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ بڑے بے درد ہیں۔ اس لیے کہ میں نے ایک ایک نمبر پر برسوں ہی محنت کی۔ اگر میں اور مجھ سے پہلے کچھ، اور باہمت حضرات ایسا نہ کرتے تو آج نہ کوئی تذکرہ ملتا اور نہ اُردو ادب کی تاریخ ہی کا کوئی سراغ ملتا۔ دوسرے میں نے آج کے پرچوں کو اُٹھا کر لال پنسل سے نشان نہیں لگا دیئے تھے جو کسی پہ زد پڑتی۔

آج انتخابی پرچے چھاپنے والے، کسی نہ کسی حیثیت میں، پہلے نئی چیزیں ہی حاصل کرکے اپنے رسالے چھاپا کرتے تھے۔ وہ کام کٹھن تھا۔ محنت طلب تھا۔ سوجھ بوجھ چاہتا تھا۔ اس لیے یہ لوگ اس امتحان میں پورے نہ اُترے۔ مارکیٹ میں اُن کے پرچوں کو کوئی اہمیت حاصل نہ ہوئی۔ اس طرح جب نقصان ہوا تو انھوں نے تعمیری کام کرنے والے پرچوں پر حملہ بول دیا۔ اب اُن کی قینچی ہے اور ہم مدیرانِ رسائل کی محنتوں کا خون!

اس مہم میں میں اکیلا نہیں ہوں۔ مدیرانِ رسائل میرے ساتھ ہیں۔ ادیب میرے ساتھ ہیں۔ اس لیے ہم اپنے اُن دوستوں کو ضرور سمجھا سکیں گے۔ جو اس وقت اپنی ذاتی منفعت کی بنا پر، علم و ادب کی خدمت کا دعویٰ کر رہے ہیں۔

محمد طفیل

مولانا ابوالکلام کی قدیم تحریریں

قاضی عبدالودود

[illegible] ابوالکلام [illegible] جلد شائع [illegible] ہو رہی ہے۔ اس [illegible] مجھے [illegible] اس سے معلوم ہوا ہے کہ [illegible] قدیم مضامین جو [illegible] ہیں [illegible] فہرست [illegible] ہیں [illegible] ۱۹۰۳ء [illegible] ۱۹۰۵ء [illegible] ۱۹۰۶ء کے کسی شمارے [illegible] میری نظر سے نہیں گزرا۔

ابتداً آزاد کا تعلق غالباً رنجیدہ ... لکھنؤ کی بدولت قائم ہوا تھا، اور عجب نہیں کہ ۱۹۰۳ء سے قبل بھی ان کی کوئی تحریر اس میں شائع ہوئی ہو۔ اس سنہ کے بعد کم از کم ۱۹۰۵ء تک اس تعلق کے باقی رہنے کا ثبوت موجود ہے۔ آزاد کا جو مضمون منقول ہوگا اس میں نہ استدلال کا زور ہے اور نہ اسلوب بیان کی خوبی۔

فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کا "وکیل" سے تعلق ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوا، لیکن جو مضمون "وکیل" سے نقل ہوگا اس کے آخر میں مرقوم ہے "مقیم دفتر وکیل امرتسر"۔ ممکن ہے یہ عارضی قیام ہو اور "وکیل" سے مستقل تعلق بعد کو قائم ہوا ہو۔ اس مضمون کا اسلوب بیان نسبتاً بہتر ہے مگر اس میں کوئی خاص خوبی نہیں۔ یہ مضمون جس وقت قلمبند ہوا تھا آزاد سید احمد خاں کے بڑے مداح تھے۔ [illegible] صاحب نے اپنے مضمون "آزاد اور سرسید" (اردو ادب) میں اس کا اعتراف کیا ہے مگر ساتھ ہی یہ لکھا ہے کہ ابتدائی زمانے میں بھی آزاد کو سید احمد خاں سے سیاسی اختلاف تھا۔ یہ ہرگز صحیح نہیں۔ خود آزاد کی بعض تحریروں سے کامل ہمنوائی ثابت ہے۔

"اک بتِ سیمیں بدن سے کرلیا لندن میں عقد"

"ہیں! یہ تم نے کیا کہا؟ اک بتِ سیمیں بدن سے کرلیا لندن میں عقد" "جی ہاں!" "غضب! کرلیا لندن میں عقد" "آخر کوئی وجہ؟ کیوں کرلیا لندن میں عقد؟" "بس یہ نہ پوچھئے" "کیوں؟ کس لیے؟ کیا آپ کو ہندوستان بھر میں کوئی پری تمثال ایسی نہیں ملی تھی کہ آپ کو معشوقانِ یورپ کی تلاش ہوئی؟ کیا آپ کو ہندوستان میں کوئی سیمیں بدن نہیں نظر آئی تھی کہ نہ تامانِ (کذا) وادئ گرمسان یورپ کی طرف توجہ

کرتی پڑیں؟ بھلا ایک مسلمان کے لیے یہ بات نازیبا نہیں ہے کہ وہ اپنی قوم اور اپنے خاندان کو چھوڑ کر غیر قوم، غیر مذہب، غیر خیال، غیر طبیعت سے تعلق پیدا کرے۔ کیوں جناب! فرمائیے نا، بغلیں نہ جھانکیے، ادھر دیکھیے، کیا آپ کے کانشنس نے آپ کو اس امر کی اجازت دی ہے کہ آپ بلا ضرورت اس قوم سے قومی نسبی تعلق پیدا کریں کرتی (کذا) ہیں آپ بھی، قدرت نے متضاد طبیعتیں رکھی ہوں؟"

"واہ حضرت واہ! آپ بھی مس پرانی لکیر کے فقیر نکلے۔ ابھی تک پرانے خیالات سے آپ کا دماغ خالی نہیں ہوا۔ سچ تو یہ ہے (کذا) ابھی روشنی کی تیز شعاعوں سے محروم رہا ہے ورنہ اس قدر تاریکی اس میں نہ ہوتی۔ آج کل کی حالت سے آپ بالکل بے خبر ہیں اور ہیں یا خواب دیکھ رہے ہیں۔ فی زمانہ اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ فاتح قوم سے ایسے چند قومی رابطے پیدا کریں اور ایسے تعلقات ہوں تاکہ ان میں ہم میں انس پیدا ہو اور وہ وحشت نہ رہے جو ہماری ترقی میں، جو فاتح قوم کی توجہ پر موقوف ہے، حائل ہوتی ہے۔ علاوہ اس کے انھیں اس امر کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنے شکوک کو جو مسلمانوں کی جانب مذہبی اور پولٹیکل امور میں ان کے دلوں میں جمے ہوئے ہیں رفع کریں اس لیے اگر یہ قومی تعلق پیدا ہو جائے تو بہت ان امور کا بہت اچھا موقع ہاتھ آئے گا۔ بس اسی خیال سے آج خاکسار نے بھی ایک مس صاحبہ سے کر لیا لندن میں عقد۔"

"کیا خوب! اے جناب! کیا فاتح قوم سے میل جول بڑھانے کے یہی معنی ہیں کہ ان سے یہ تعلق پیدا کیا جائے؟ کیا مواخات، معاشرت، امور تمدن وغیرہ باعث میل جول کے نہیں ہیں؟ ان الاسباب المحبۃ اربعۃ، اشیاء المجالسۃ والمکالمۃ والاکلۃ والمہاداۃ (کذا) میں میل جول کے سبب یہ باتیں کچھ کم ہیں؟ اور آپ کا یہ کہنا کہ ان کی توجہ ہماری ترقی کا ذریعہ ہے محض غلط ہے۔ آپ کسی ترقی یافتہ قوم کی مثال نہیں پیش کر سکتے کہ گورنمنٹ یا فاتح قوم کی توجہ سے ترقی پائی ہو، بلکہ جن قوموں میں سلف ہیلپ کا خیال قدرت نے پیدا کر دیا ہے انھوں نے خود ترقی کے اسباب پیدا کیے۔ خود مدارس جاری کیے، خود علوم و فنون کی تکمیل کے لیے دارالعلوم قائم کیے، خود آرٹ کے اسکول کھولے، بلا امداد غیر اپنے خیال اور اپنی مدد سے بے شک وہ ترقی کر گئے چنانچہ اس کی مثال کے لیے اہل یورپ کافی ہیں۔ ہاں ایسے موقعوں میں گورنمنٹ سہارا ضرور دیتی ہے اور یہ اس کا فرض ہے مگر اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں۔"

جواب ندارد.... (کچھ دیر بعد) "اچھا جانے دیجیے، یہ وجہ نہ سہی لیکن فرمائیے جناب کہ اسلام نے تو اہل کتاب سے ہم کو اس تعلق کی اجازت دی تھی پھر جناب یہ گفتگو کیا ہے؟"

"ہاں! آئیے، اب آپ مذہب کے دامنگیر ہوتے ہیں۔ سنیے، مذہب اسلام نے جس زمانے میں اس امر کی اجازت دی تھی بلا اس کے اس زمانے میں چارہ بھی نہ تھا۔ علاوہ اس کے مذہب اسلام کی آزادی بھی یہ معنی رکھتی ہے کہ مذہب اسلام انسانی ضرورتوں کے لیے ایک حد تک آزادی دینے والا ہے اور اس میں نہایت تسہیل ملحوظ رکھی گئی ہے جس سے اس کی جامعیت اور نافعیت متحقق ہو، اور اکثر مواقع میں جب کہ اتفاقیہ اس تعلق کی ضرورت ہو تو اہل کتاب سے مذہب کی ممانعت بیچ میں حائل نہ ہو، نہ یہ کہ بلا کسی خیال مصلحت کے ہر زمانے میں اس پر زور دیا جائے۔ علاوہ اس کے اس زمانے میں آج کل کی قوم فاتح مفتوح تھی، ہر طرف اسلامی سلطنت چھائی ہوئی تھی اس لیے اس تعلق سے مسلمانوں کو ہرگز ان مستورات اور ان کے اثروں کا خوف نہ تھا جس قدر کہ آج برعکس حالت پیش ہو جانے سے درپیش ہے۔ جس طرح کہ ہم مفتوح اور یورپین قوم فاتح ہے اسی طرح اس تعلق میں بھی عورت فاتح اور مرد مفتوح رہے گا۔ ایسی حالت میں اندازہ ہو سکتا ہے کہ اولاد پر کس قدر عورت کے اخلاق و عادات اور مذہب کا برا اثر پڑے گا۔"

جیسی باتیں مذہب میں ایسی جائز رکھی گئی ہیں، وہ اکثر مواقع کے لحاظ سے نقصان رساں ہوتی ہیں۔ پس اس سے اس کی [illegible] سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہیے۔

مولیکن ۔ تو فرمائیے کہ اس تعلق کا کیا برا اثر اولاد پر پڑ سکتا ہے؟ والد یا باپ کا مذہب ان کا موثر ہوگا۔ جہاں تک میرے نزدیک یہ بات سمجھ میں معلوم ہوتی ہے۔ ہاں آپ کوئی ایسا واقعہ پیش کر دیں کہ جس سے اس امر کی تصدیق ہو تو آپ کا فرمانا سچ قرار دیا جاسکتا ہے ورنہ آپ نے کہا اور میں نے مانا۔

۔ کیا آپ کو نہیں معلوم؟ تو آپ تو پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ مشہور ناول نگار شرر نے ایک ناول لکھا ہے، آپ نے دیکھی ہوگی۔ یہ ہے اس کا ایک تاریخی واقعہ جو اسلامی سلطنت میں واقع ہوا ہے پیش کرتا ہوں۔ اس سے آپ اندازہ لگائیے گا کہ آیا یورپین سلطنت ہے اور اس زمانے میں اسلامی بادشاہت تھی جیسی آج کل [illegible] اس واقعہ کو مسٹر شرر کے فلورا فلورنڈا[1] میں بھی آپ دیکھ سکتے ہیں۔ اندلس میں جب کہ عبدالرحمن ثانی کی حکومت تھی اور اس نے عیسائیوں کو مذہبی آزادی دے رکھی تھی، ایک بھائی بہن واقعے کے لحاظ سے اخوت گزرے ہیں۔ ایک لڑکی تھی جس کا نام فلورا تھا اور اس کا بھائی زیاد نامی تھا۔ فلورا کا باپ ایک اندلسی منصبی مسلمان تھا جس نے ایک عیسائی حسین عورت سے عاشقانہ تعلق پیدا کر لیا تھا اس سے فلورا پیدا ہوئی۔ باوجودیکہ باپ مسلمان نے اسلامی نام رکھ کر [illegible] مگر اس عیسائی عورت نے اپنے طریقے کے موافق اپنی زبان میں اس کا نام فلورا رکھا۔ باپ ہر وقت گھر میں رہ نہیں سکتا تھا، ماں کا سایہ اس پر ہر وقت رہتا تھا اس لیے اس نے فلورا کے دل میں عیسائی مذہب کی خوب اچھی طرح جما دی۔ ماں مر گئی، باپ مر گیا، بھائی زیاد صرف باقی رہا۔ پادریوں نے فلورا کو حاصل کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ ایک مسلمان کے پنجے سے نکل جائے۔ فلورا کو زیاد نے ہر چند سمجھایا کہ مذہب اسلام [illegible] مگر ایک نہ لگی۔ معاملے نے طول پکڑا، زیاد کے گھر عیسائی آنے لگیں اور اس کے نکالنے کی کوشش کرنے لگیں۔ زیاد نے بھی خوب انتظام کیا مگر بے سود۔ فلورا نکلی اور کہاں کہاں پہنچی۔ زیاد اس کی تلاش میں پریشان ہوا۔ کہاں کہاں کی خاک چھانی اور کدھر کدھر کی مٹی اڑائی۔ بالآخر بہت محنت [illegible] اس کی بدولت آخر سلطنت کو حیرانی ہوئی، رعایا کو پریشانی، زیاد اور فلورا دونوں برباد ہوئے اور دیکھنے والے افسوسناک نگاہ سے دیکھتے رہے۔

الغرض باوجودیکہ فاتح قوم مسلمان تھی لیکن پھر بھی اسی تعلق نے کیا کیا گل کھلائے، کتنے خاندان برباد ہوئے، کتنے جان سے گئے، تمام اسلامی اور عیسائی دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ کس لیے ہوا؟ یہ سب اسی تعلق کی وجہ سے ہوا۔ اسی کمبخت تعلق نے یہ سب کچھ کیا جس کی یہ کچھ آپ تعریف کر رہے ہیں۔ اب غور فرمائیے کہ آج کل فاتح قوم کا اثر بالکل رعایا پر چھایا ہوا ہے۔ فاتح قوم سے یہ تعلق کیا ایسی نہیں پیدا کرنا کر چکا ہے اور [illegible] کرے گا؟

جواب ندارد۔ ۔ ۔ ۔ (ادھر ادھر دیکھ کر) "اچھا اب (کھانس کر) جانے دیجئے۔ ہم ۔ ۔ ۔ ۔ (کھانس کر) مگر اس کا کیا جواب ہے کہ ہم ایسے تعلیم یافتہ لوگوں کو تعلیم یافتہ عورتوں کی ضرورت ہے، و ایں از ہندوستانیاں مفقود۔ پھر کیا کیا جائے؟ مجبوراً ہمیں دوسری تعلیم یافتہ معزز قوم (ذرا تبسم کے ساتھ) کی طرف توجہ کرنی پڑتی ہے۔ کیا ہم ایسے 'تعلیم یافتہ' جاہلہ عورتوں کی زبان سے [illegible]

---

[1] ناول کا نام فلورا فلورنڈا ہے۔

کی جاہلانہ اور باہر پرستی کی آوازیں بن سکتے ہیں؟"

۔۔ اتنی یہ آپ کا ارشاد ایک پہلو سے بجا ہے۔ جیسا کہ جناب چودھری خوشی محمد صاحب ناظر نے اس پر کانفرنس کے کیمپ میں ظاہر کیا۔ تھا۔ اس جماعت نسواں سے یہ اچھا عذر آپ کے ہاتھ آگیا ہے اور جب تک تعلیم نسواں کا خیال ہندوستان میں نہ ہوگا اس عذر (کذا) کا آپ کو موقع ملتا ہے کا لیکن حضرت نہیں اگر آپ محب قوم ہیں تو آپ کو چاہیے کہ آپ تعلیم نسواں کو جاری کرنے کی کوشش کریں اور عورتوں کو اس قابل بنائیں کہ ان سے عقد کریں تاکہ یہ ضرورت قوم کو تعلیم پر آمادہ کرے۔ نہ یہ کہ آپ یہ عذر پیش کر کے غیر قوم کی تعلیم یافتہ لیڈیوں کو ہم پہلو بٹھا کے مزے میں وخاک مزے میں زندگی بسر کریں اور اس سے مستغنی ہو جائیں سوا اس کے جو ہندوستانیوں نے یہ تعلق کیا ہے ان میں اکثر ایسے نکلیں گے جو اپنے اس کیے پر پریشان ہو رہے ہیں اور اس خرچ اور آزادی سے تنگ نہیں ہو سکتے جو اس سبب سے کرنے پڑتے ہیں (کذا) کیا آپ کسی ایک معزز شخص کے حالات سے بھی واقف نہیں جس نے یہ تعلق پیدا کر کے تقریباً اپنی زندگی تلخ کر رکھی ہو؟ مگر افسوس ہے کہ اس پر بھی آپ ایسے (کذا) ناواقفوں کی آنکھیں نہیں کھلتیں اور یورپ کی سفید رو لیڈیوں کو دیکھ کر جیکہ چوندھیا جاتی ہیں مگر ہاں یہ ضرور ہے کہ آپ لوگ ایک حد تک معذور اور مجبور بھی ہیں یہ سب کچھ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لندن میں تعلیم کے خیال سے ایک جوشیلے نوجوان کا جانا اور وہاں چار طرف حسن ہی حسن کا نظر آنا ایک ایسا نظارہ ہے جسے دیکھ کر بے اختیار نہ ہونا مشکل امر ہے۔

ہمارے مکرم دوست سید اکبر حسین صاحب سشن جج سہارنپور نے تعلیم یافتہ گروہ پر سے اس اعتراض کو رفع کرنے کی غرض کوشش کی ہے اور ایک عجیب و غریب دلچسپ نظم لکھی ہے۔ اس نظم نے ہم کو بہت ہی لطف حاصل کرنے کا موقع دیا ہے۔ ہم نہیں پسند کرتے کہ اس لطف سے ناظرین "پنچ" محروم رہیں ایسی حالت میں کہ اس کا پہلا مصرع عنوان پر ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اس نظم میں انھوں نے یہ اعتراض رفع کیا ہے اس کی داد ناظرین پر چھوڑتا ہوں۔

قطعہ۔

اک مس سیمیں بدن سے کر لیا لندن میں عقد ۔۔۔ اس خطا پر سن رہا ہوں طعنہ ہائے دل خراش
کوئی کہتا ہے کہ بس اس نے بگاڑی نسل قوم ۔۔۔ کوئی کہتا ہے کہ ہے یہ بدخصال و بدمعاش
دل میں کچھ انصاف کرتا ہی نہیں کوئی بزرگ ۔۔۔ ہو کے خود مجبور یہ کہتا ہوں اس پردے کو فاش
ہو رہی تھی تاکید لندن جاؤ انگریزی پڑھو ۔۔۔ قوم انگلش سے ملو سیکھو وہی طرزِ معاش
جگمگاتے ہوٹلوں میں جا کے نظارے کرو ۔۔۔ سوپ و کاری کی طرف راغب ہو چھوڑو دال ماش
جب عمل اس پر کیا پریوں کا سایہ پڑ گیا ۔۔۔ جس سے تھا دل کی حرارت کو سراسر انتعاش
سامنے تھیں لیڈیاں زہرہ وش و جادو نظر ۔۔۔ یاں جوانی کی امنگ اور ان کو عاشق کی تلاش
دونوں جانب تھا دلوں میں جوشِ خونِ[2] فتنہ زا ۔۔۔ دل ہی تھا آخر نہیں تھی برف کی یہ کوئی قاش

---

[1] کذا [2] یہاں پر کاغذ پھٹ گیا ہے۔ خون کا حرف ن موجود ہے۔

اس کی جو تھی تصنیف آئینہ اُس کی ذات کا تھا | جان اس کی تصنیف اُس کی تمام برق پاش
جب یہ صورت تھی تو ممکن تھا کہ اک برق بلا | وحشت سے ہیں گر بڑھاتی ہو رہیں گرما وہ پاش
بارہا آتے اتفاق سے یہاں میں پیش سال | حضرت سیدؒ سے جا کر وہ کرتا کوئی کام
در جہاں قعود یا تحت سر بند کردہ | نا تمکین کہ دامن عزمکن ہشیار باش

مرقوم ہے حضرت آپ نے جو مضمون بیان کی ہیں ان کی وہ انجام نصیحتیں کر سکتے ہیں جو اس کو سمجھے ہیں خدا رحم چکے ہیں کہ آپ میرے موقع شناس ہیں کہ سبب کاتب (کذا) لندن جانے والوں کے ساتھ ہی حسب حال ہے۔ راقم حضرت آپ کا نسیم۔
بقلم ابوالکلام محی الدین احمد دہلوی، کلکتہ۔

ممالک اسلامیہ اور سید احمد خانی خیالات

راز اعتصل کیسا باطن تھا ظاہر ہوا!
اب تو ہے سب کی زباں پر جو ہمارے سامنے ہے

سر سید احمد خاں مرحوم کی سب سے بڑی فطری قابلیت بے مثل عالی دماغی اور ان کی اسلامی تحقیقات کی قدر اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ جو آواز اب سے تیس چالیس برس پہلے اس اسلامی دور کے آخری مجدد کی زبان سے سر زمین ہند میں بلند ہوئی تھی آج ممالک اسلامیہ اور خود ہندوستان کے ہر روشن خیال اور تعلیم یافتہ شخص کی زبان سے نکل رہی ہے۔ وہ راگ جو اس زمانے میں ہمارے کانوں کو نہایت ناگوار اور زہر تھا اور جسے ہم اپنے خیال میں بے وقت کی راگنی سمجھ رہے تھے آج ہمارے تعصب پسند کانوں کو نہایت سریلا اور دلکش معلوم ہو رہا ہے اور ہم ہیں کہ اس راگ پر مست ہوئے جاتے ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص اسی راگ پر مٹا ہوا ہے۔ پچھلی مخالفت خود ہم کو اب شرمناک معلوم ہوتی ہے اور تعجب ہے کہ ایسی صاف اور صریح باتیں ہمارے تعصب اور (کذا) جہالت کے سبب کیونکر ہمیں ناگوار معلوم ہوتی تھیں۔ اس زمانے میں ہر سید کی مثال ایک ایسے روشن ضمیر مدبر کی سی ہے جو غفلت اور ناواقفی کے زمانے میں ایک اونچے پہاڑ کی بلند چوٹی پر چڑھ کر اپنی غافل قوم کو ایسی تعلیم دینا شروع کر دے جسے ان کی جہالت اور غفلت سے کوئی نسبت نہ ہو۔ ان کے کمزور خیالات ان کی حد سے بڑھی ہوئی غفلت اس تعلیم کے حاصل کرنے کی متحمل نہ ہو۔ وہ اس روشن ضمیر کے روشن خیالات پر ہنسیں اور اس کی عاقلانہ تعلیم کو دیوانگی سے تعبیر کریں۔ جہالت کا زور ان کی طبیعتوں پر یہاں تک غالب آئے کہ وہ اس محب قوم کو دشمن ملت سمجھ کر اس کی مخالفت پر آمادہ ہو جائیں۔ تعصب کا خوفناک دیو ان کی عقل پر یہاں تک مستولی ہو جائے کہ وہ اپنے جان و ایمان کے فدائی کی جان لینی اور اسے خدمت قومی کے جرم پر طرح طرح کی تکالیف دینی عین ایمان سمجھیں مگر وہ روشن ضمیر مدبر اور محب قوم ان کی ان جاہلانہ حرکتوں کو بچوں کی نادان حرکات سے تشبیہ دے اور انھیں اپنی بھلائی اور بھلائی سے ناواقف سمجھ کر انھیں ایسی قابل سرزنش حرکتوں پر بھی معذور رکھے لیکن یہ پکار پکار کر کہے کہ اس زمانے کو دور نہ سمجھو جب تم میں اپنی برائی بھلائی کی تمیز ہو جائے گی اور تم وہ سمجھو گے جو میں آج سمجھ رہا ہوں اور وہ جانو گے جو میں آج جان رہا ہوں۔

لے سید کے پیچھے سر سید احمد خان مرحوم

اس وقت نہ میری ان تعلیموں کی قدر کرو گے اور نہ میری خدمتِ قومی اور محبتِ وطنی یاد آئے گی۔ سرسید نے ہی سب سے پہلے یہ دعویٰ
کیا کہ اگر بائیبل پر بھی ان کے اصول پر تفسیر کی جائے تو وہ اختلاف دور ہو جائے جو بائیبل کے مطالب اور قرآن مجید میں مدت سے مانا
جاتا ہے اور ثابت ہو جائے کہ تثلیث کے مسئلے کو الہامی بائیبل سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ خود عیسائیوں کا ساختہ پرداختہ مضمون ہے۔
اسی دعوے کا عملی ثبوت تبیین الکلام کی تین جلدوں سے ملتا ہے جو سرسید نے اس زمانے میں لکھ کر شائع کی تھیں۔ یہی وہ بات جس نے
سرسید کو اس تفسیر کے لکھنے پر آمادہ کیا تھا ایک مدت کے بعد مصر میں ایک عیسائی عالم نے محسوس کی اور وحدت ادیان کے نام سے
ایک اخبار جاری کیا جس کی اصلی غرض یہ تھی کہ یہ مقصد اسلام، نصرانیت اور یہودیت پر ظاہر کر کے انھیں تقریب فی الادیان پر آمادہ کیا
جائے۔ سرسید ہی دنیائے اسلام میں وہ پہلا شخص ہے جس نے پہلے پہل یہ ضرورت محسوس کی کہ جدید فلسفے کے مقابلے میں جدید علم کلام
کی ضرورت ہے اور قدیم متکلمین کی تصنیفات موجودہ علوم کے لیے کافی نہیں ہیں۔ اگرچہ اس زمانے میں علمائے اسلام نے اس خیال کی
بڑی مخالفت کی لیکن آگے چل کر زمانے نے یہ راز بھی اچھی طرح سمجھا دیا۔ خود علماء اس طرف متوجہ ہوئے اور علم کلام کا جدید اسلوب پر ترتیب
دینا اسلام کی اصلی خدمت سمجھی گئی۔ ندوۃ العلماء کے ابتدائی جلسوں کی رپورٹ سامنے رکھو اور شاہ سلیمان صاحب پھلواری اور مولوی محمد حسین
صاحب الہ آبادی، مولوی محمد ابراہیم صاحب آروی مرحوم کی تقریریں دیکھو اسی ضرورت کا رونا نظر آئے گا جس کے ذکر کرنے پر انھیں علماء نے
ایک زمانے میں سرسید کی تکفیر کی تھی۔ ممالک اسلامیہ میں اس ضرورت پر ایک عرصے سے توجہ ہو رہی ہے۔ رسالۃ الحمیدیہ جو اسی موضوع پر ایک
طرابلسی عالم کی تصنیف ہے ہندوستان میں اچھی طرح شائع ہو چکا ہے اس کے علاوہ الحق الصریح، الاسلام والمدنیہ وغیرہ کئی کتابیں اسی ضرورت
پر مصر و بغداد میں شائع ہوئی ہیں۔ مصر و بلاد اسلامیہ کے اسلامی رسالوں میں آج کل یہ بحث چھڑی رہتی ہے اور اس پر مبسوط تحریریں لکھی جاتی ہیں۔
المنار مصر کے جس نے قدیم و جدید فائل دیکھے ہیں وہ ہمارے قول کی تصدیق کر سکتا ہے۔ مصر کے مفتی اور جامع ازہر کے کلیہ، شیخ محمد عبدہ دیارِ مصر
میں ایک بے بدل عالم و فاضل تسلیم کیے جاتے ہیں المنار میں آج کل آپ کے درس قرآن کا اقتباس تفسیر القرآن کے عنوان سے شائع ہو رہا ہے
جس میں اسی اصول پر قرآن شریف کی تفسیر کی جاتی ہے جو کبھی ہندوستان میں مستوجب تکفیر سمجھا گیا تھا۔ حال میں مصر کے ایک روشن خیال عالم
محمد فرید وجدی کی اسی موضوع پر ایک مبسوط کتاب ماہوار رسالے کی طرح مسلسل شائع ہو رہی ہے جس کا نام الاسلام فی عصر العلم ہے الغرض
جو خیال اب سے ۳۰ برس پیشتر سرسید مرحوم نے ظاہر کیا تھا وہی خیال آج کل اسلامی دنیا کا عام مسلمہ ہو رہا ہے اور انسان فطرتاً آزاد ہے اور اس
کی یہ آزادی کسی خارجی اثر سے زائل نہیں ہو سکتی۔ قدیم فلاسفہ اس قدرتی آزادی کی تہ کو نہ پہنچ سکے اور دنیا میں غلامی کی خلافِ فطرت رسم پیدا
ہو گئی۔ افلاطون الٰہی نے انسانی فطرت میں اختلاف کو تسلیم کیا اور صرف اہلِ یونان کو آزادی کا مستحق قرار دیا۔ اسی طرح یورپ بھی ایک عرصے تک
غلامی کا حامی رہا لیکن جب علم کی روشنی جہالت کی تاریکی پر غالب آئی تو تمام یورپ نے انسان کو فطرتاً آزاد تسلیم کر لیا اور ایک یورپین
کو جس آزادی کا مستحق سمجھا وہی استحقاق ایک حبشی اور سرکیشین کے لیے لازمی قرار دیا لیکن برخلاف اس کے اسلامی دنیا ایک عرصے سے غلامی
کو جائز سمجھ رہی ہے اور عام طور پر وہاں اس کا رواج ترقی کر رہا ہے۔ سلطان المعظم کا تمام محل سرکیشین لونڈیوں سے آباد ہے اور حرمین شریفین
کی رونق غلاموں سے بھی جاری ہے۔ یورپ اسلام پر بڑے زور سے معترض ہے کہ اسلام انسان کو اس کی فطری آزادی سے محروم رکھتا
ہے اور غلامی کی ناپاک رسم کا حامی ہے۔ اس اعتراض کے رفع کرنے کا سب سے پہلے اسلامی دنیا میں سرسید کو خیال ہوا اور مرحوم نے ’ایسیز
آن دی لائف آف محمد‘ میں عقلی و نقلی دلائل سے اسلام کو اس رسم کی اہانت سے بری ثابت کیا اور دکھایا کہ مسلمانوں کے افعال کا بانیٔ مذہب

[illegible]

غالب اور حادثۂ اسیری

(ایک معاصر شہادت اور قطعۂ تاریخ)

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

غالب کے واقعۂ اسیری کے حالات ابھی پوری طرح سامنے نہیں آئے۔ اس زمانے میں ذاتی وجاہت اور وضعداری کے آداب ہی کچھ ایسے تھے کہ انسانی کمزوریوں کو زیادہ سے زیادہ درپردہ رکھا جاتا تھا۔ اور ہر بات میں ایک خاص رکھ رکھاؤ اور سلیقے سے رہنے کے انداز کو ترجیح دی جاتی تھی۔ فن کو اخلاقیات اور معصومیت سے کچھ اس طرح بندھا ہوا سمجھا جاتا تھا کہ فن کار کی ذرا سی لغزش سے اس کی عظمت پر حرف آسکتا تھا۔ چنانچہ غالب بھی قید کے واقعہ کو اپنی بہت بڑی "بے آبروئی" تصور کرنے پر مجبور تھے۔ جہاں تک بن پڑا، انھوں نے اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا۔ غالب کے اولین سوانح نگار حالی نے بھی، چونکہ وہ قدیم اخلاق و آداب کے دلدادہ تھے، غالب کی سیرت کے اس پہلو کو تحقیق کی روشنی میں لانا پسند نہیں کیا۔ بلکہ ان کی شخصیت کو زیادہ سے زیادہ مثالی بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی۔

عام شہرت کے برخلاف غالب قماربازی کے الزام میں ایک دفعہ نہیں، دو دفعہ ماخوذ ہوئے تھے۔ پہلا واقعہ ۱۸۴۱ء کا اور دوسرا ۱۸۴۷ء کا ہے۔ مرزا حیرت دہلوی نے اپنی کتاب "چراغ دہلی" میں غالب کے حادثۂ اسیری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "مرزا صاحب کے ساتھ بہت رعایت کی گئی۔ کسی قسم کی توہین نہیں ہوئی اور کسی نے اعتراض تک نہیں کیا بلکہ ضمانت پر رہا کر دیے گئے"[1]۔ اس روایت میں ظاہر ہے کہ غالب کے پہلے واقعۂ گرفتاری کا ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ دوسری بار تو باوجود کوششوں کے قید ہو ہی گئی۔ پہلے واقعۂ گرفتاری سے متعلق ہماری معلومات کا مستند ترین ماخذ "دہلی اردو اخبار" ہے۔ جس میں غالب کی گرفتاری کی خبر ۱۵ اگست ۱۸۴۱ء کو چھپی تھی[2]۔ یہاں سے اسے سب سے پہلے امداد صابری صاحب نے "تاریخ صحافت اردو" میں نقل کیا[3]۔ لیکن انھوں نے غالب کی پہلی گرفتاری سے متعلق اس خبر کی اہمیت کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ اس کی طرف پہلی بار ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے توجہ دلائی[4]۔ مالک رام صاحب نے "ذکر غالب" کے تیسرے اڈیشن

---

[1] چراغ دہلی، حیرت دہلوی، ص ۲۲۷

[2] دہلی اردو اخبار، مورخہ ۱۵ اگست ۱۸۴۱ء، مخزونہ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، نئی دہلی

[3] تاریخ صحافت اردو، امداد صابری، دہلی، جنوری ۱۹۵۳ء، ص ۱۴۰

[4] کلاسیکی ادب، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، دہلی، جولائی ۱۹۵۳ء، ص ۴

میں اس خبر کا ذکر مالک رام صاحب نے ... سلسلے میں کیا ہے ... دہلی اردو اخبار کی تاریخ ۲۲ ... لکھی ہے جو غلط ہے۔ غالب کی گرفتاری کی یہ خبر ۱۵ اگست ۱۸۴۱ء کے اردو اخبار میں شائع ہوئی تھی۔ اس خبر سے جو نکتے نکلتے ہیں ان کو غالب کے سوانح نگاروں ... سے مختصر صحیح اہم نتائج اخذ کرنے میں مدد ملے گی۔ اس خبر سے سب سے پہلے ... ایک سطر دیکھ لینا ضروری ہے

"سنا گیا ہے کہ ان دنوں تھانہ گزر قاسم خاں میں مرزا نوشہ کے مکان سے اکثر نامی نامی قمار باز پکڑے گئے مثلاً ہاشم علی خاں وغیرہ ... لکھتے ہیں کہ بڑا قمار ہوتا تھا لیکن بسبب رعب اور کثرت مردوں کے بالکل طرح سے کوئی تھانہ دار دست انداز نہیں ہو سکتا تھا۔ اس عرصے میں جو تھانہ دار نیا مقرر ہوا ہے بہت ہی سیدھا اور ... سنا جاتا ہے ... مقرر ہوا ہے ... تھوڑی ہی مدت کا ذکر ہے کہ تھانہ دار نے بھی بہت ... مجرموں کو کرتا رہا ہے ... سنتے ہیں کہ ... مرزا نوشہ ایک نامی شاعر ... اور نواب شمس الدین قاتل ولیم فریزر صاحب سے قرابت قریبہ رکھتے ہیں۔ یقین ہے کہ ... جب ... کی سعی و سفارش ہوئی لیکن ... نے ... کو کام فرمایا۔ سب کو گرفتار کیا۔ عدالت سے جرمانہ علی قدر مراتب ہوا۔ مرزا نوشہ پر سو روپے۔ مرزا اگر نہ دیں تو چار مہینے قید۔ سبحان اللہ ... کی خدا کرے ... کو تو کام ... مانا انھوں نے لیکن اس علاقے میں بہت رشتہ دار معمول ... کے ہیں۔ کچھ تعجب نہیں کہ وقت بے وقت چوٹ چیٹ کریں ورنہ ... ان کی ... جان پر ... حکام ... ایسے تھانہ دار کو چاہیے کہ بہت عزیز رکھیں۔ ایسا آدمی کم یاب ہوتا ہے[2]۔"

حیرت ہے کہ اس واقعہ کا ذکر کسی دوسرے معاصر نے نہیں کیا۔ نہ ہی غالب نے اپنے اس طرح معتوب ہونے کی طرف کوئی اشارہ کیا ہے۔ یادگار غالب بھی اس واقعے سے خالی ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ خود غالب نے یا ان کے کسی بہی خواہ نے جرمانے کی یہ رقم ادا کر دی اور اس طرح وہ قید کی آفت ناگہانی سے بچ گئے۔ دہلی اردو اخبار کے اس بیان پر مندرجہ ذیل نتائج قائم ہوتے ہیں:

۱۔ غالب کا مکان قمار بازی کا اڈا تھا۔

۲۔ اس میں بڑے بڑے نامی قمار باز شریک ہوتے تھے۔

۳۔ نیا تھانہ دار جو قوم سے سید تھا، بہت بے طمع اور جری تھا۔

۴۔ تمام قمار باز گرفتار ہوئے اور عدالت سے علی قدر مراتب جرمانہ ہوا۔

۵۔ مرزا غالب پر سو روپے جرمانہ اور عدم ادائیگی کی صورت میں چار ماہ قید کی سزا ہوئی۔

۶۔ اس خبر میں غالب کے قید ہونے کا کوئی ذکر نہیں۔

---

[1] ذکر غالب، مالک رام، (اشاعت سوم) دہلی ۱۹۵۵ء ص ۸۲

[2] یہ جملہ غور طلب ہے۔ بظاہر بیان ہے ... قاتل ولیم فریزر کے قرابت قریبہ کا کوئی ... نہ تھا۔ لیکن ... سطور میں جو مفہوم جھانک رہا ہے وہ خاصا ... ہے۔

[3] دہلی اردو اخبار مورخہ ۱۵ اگست ۱۸۴۱ء محفوظہ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، نئی دہلی۔

اس واقعے کے چھ برس بعد غالب قماربازی کی وجہ سے دوسری بار ۱۸۴۷ء میں معتوب ہوئے۔ اس دفعہ احباب اعزہ کی سعی و سفارش کے باوجود قید ہو گئی۔ یہ واقعہ غالب پر سخت شاق گزرا۔ یہ وہی واقعۂ اسیری ہے جس سے متعلق غالب کے ایک معاصر شاعر کا بیان، اور قطعہ تاریخ جس پر بحث کرنا مقصود ہے۔ اس سے چونکہ بعض اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں، ان کا صحیح تجزیہ کرنے کے لیے اس واقعے سے متعلق خود غالب کے اور ان کے معاصرین کے بیانات کو سامنے رکھنا نہایت ضروری ہے۔ سب سے پہلے ان خبروں کو پیش کیا جاتا ہے جو غالب کے معاصر اخبارات میں ان کی گرفتاری کے بارے میں شائع ہوئی تھیں۔

(ا) غالب کے واقعۂ اسیری سے متعلق سب سے پہلی خبر جو اس وقت ہماری اطلاع میں ہے، ماسٹر رام چندر کے مرتب فوائد الناظرین دہلی میں مورخہ ۳۰ مئی ۱۸۴۷ء کو شائع ہوئی۔

> "خبر دہلی: ۲۵ مئی کو بیچ مکان جناب مرزا نوشہ اسد اللہ خاں صاحب کے قمار بازی ہو رہی تھی۔ چنانچہ کوتوال صاحب خبر پا کر وہاں گئے اور جناب مرزا صاحب کو معہ چند اور قمار بازوں کے گرفتار کر کے کوتوالی میں لے آئے۔ اب دیکھا چاہیے کہ صاحب مجسٹریٹ ان کے متعلق کیا حکم دیتے ہیں۔"[1]

غالب کی گرفتاری کی تاریخ یعنی ۲۵ مئی ۱۸۴۷ء اسی خبر سے معلوم ہوتی ہے۔ یہ خبر ان کی گرفتاری کے چند روز بعد شائع ہوئی۔ مجسٹریٹ نے اپنا فیصلہ نہیں سنایا تھا۔ ظاہر ہے یہ زمانہ انھوں نے حوالات میں گزارا ہو گا۔

(ب) اس سلسلے کی دوسری خبر بمبئی کے احسن الاخبار کی ہے۔ اس اخبار میں دہلی اور دربار شاہی سے متعلق جو حالات چھپتے تھے ان کا ترجمہ خواجہ حسن نظامی نے "دہلی کا آخری سانس" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ اس کتاب میں غالب کی گرفتاری کا ذکر ۲ جون ۱۸۴۷ء کی خبروں میں یعنی گرفتاری کے پورے ایک ہفتہ بعد یوں آیا ہے:

> "مرزا اسد اللہ خاں بہادر کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کے باعث قماربازی کے جرم میں قید کیا گیا۔ معظم الدولہ بہادر کے نام سفارشی چٹھی لکھی گئی کہ ان کو رہا کر دیا جائے۔ یہ معززین شہر میں سے ہیں اور جو کچھ ہوا ہے، محض حاسدوں کی فتنہ پردازی کا نتیجہ ہے۔ عدالت فوجداری سے نواب صاحب فلاں بہادر نے جواب دیا کہ مقدمہ عدالت کے سپرد ہے۔ ایسی حالت میں قانون سفارش کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔"[2]

۲ جولائی ۱۸۴۷ء کی خبروں میں پھر اس مقدمے کے فیصلے کا ذکر یوں آیا ہے:

> "مرزا اسد اللہ خاں غالب پر عدالت فوجداری میں جو مقدمہ دائر تھا۔ اس کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ مرزا صاحب کو چھ مہینے قید بامشقت اور دو سو روپے جرمانے کی سزا

---

[1] ص ۸۰، شمارہ ۱۰۔ بحوالہ "قدیم اخبارات کی کچھ جلدیں"، امتیاز علی عرشی، لوائے ادب اپریل ۱۹۵۸ء

[2] دہلی کا آخری سانس، خواجہ حسن نظامی ص ۱۷۱

جوئے [illegible] روپے ماہوار [illegible] اور [illegible] جوئے کا [illegible]
کے علاوہ [illegible] روپے [illegible] صاف ہو جاتے تھے۔ جب
[illegible] سے طبیعت [illegible] سونے [illegible]
کا [illegible] اور کوئی چیز [illegible] ہے۔ [illegible]
[illegible] مرزا صاحب کی [illegible] سے باہر ہے۔ بلکہ [illegible]
[illegible] ہے کہ اگر [illegible] کی عدالت میں [illegible] اور [illegible]
[illegible] عدالت [illegible]
[illegible] بالکل [illegible] ہے کہ [illegible]
[illegible] لوگوں کے دلوں پر [illegible]
میں [illegible] جس سے [illegible] کا [illegible] احتمال [illegible][1]

(ج) منشی کریم الدین نے غالب کے واقعۂ اسیری کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"ان ایام میں یعنی رمضان ۱۸۴۷ء میں ایک مقدمہ ان پر جانب سرکار سے بڑا جس کے سبب ان کو بہت رنج لاحق حال ہوا ....۔"[2]

(د) حالی نے "یادگار غالب" میں غالب کی گرفتاری کے حالات پوری طرح بیان نہیں کئے۔ بلکہ ان الفاظ میں صفائی پیش کرنے کی کوشش کی ہے:

"مرزا کو شطرنج اور چوسر کھیلنے کی بہت عادت تھی اور چوسر جب کبھی کھیلتے تھے برائے نام کچھ بازی بد کر کھیلا کرتے تھے۔"[3]

(ہ) اس واقعہ سے متعلق کچھ اشارے سید ناصر نذیر فراق دہلوی کی کتاب "لال قلعہ کی ایک جھلک" میں بھی ملتے ہیں۔ جس میں قلعہ کے بعض حالات وہاں کی ایک قدیمہ ملازمہ بی خانم کی زبانی لکھے گئے ہیں۔ اس کے مطابق مرزا غالب کا مقدمہ مرکنور وزیر علی خاں کی عدالت میں پیش ہوا اور قبل از وقت رہائی لاٹ صاحب یا کسی اور بڑے افسر کے اختیارات خاص کی وجہ سے ہوئی۔ گرفتاری کی وجہ انھوں نے یوں بیان کی ہے:

"کان گنہگار ہیں، میں نے سُنا کہ محبوب علی خاں خواجہ سرا اور شہر کے کئی اشراف آدمی مل کر راتوں کو جوا کھیلتے تھے اور لاکھ لاکھ روپے کی بازی لگائی جاتی تھی اور جو شخص جیتتا تھا، محبوب خاں اس کی جیت کا روپیہ بہنگیوں میں لدوا کر اس کے گھر

---

[1] دہلی کا آخری سانس، خواجہ حسن نظامی صفحہ ۱۷۴ اور ۱۷۵
[2] کریم الدین، تذکرہ طبقات شعرائے ہند ۱۸۴۸ء، صفحہ ۳۷۸
[3] یادگار غالب، حالی، طبع لاہور، صفحہ ۲۷

بجوا دیتا تھا۔ مرزا نوشہ (غالب) کی حیثیت تنی جادی بازی لگانے کی نہ تھی۔ مگر کرتو دا نہیں۔
...... کسی نہ کسی طرح مرزا صاحب اس صحبت میں پہنچ گئے۔ کوتوال جو ادیوں کی گھات
میں لگا ہوا تھا۔ آج اس کا داؤ لگ گیا، اس نے سب کو پکڑ دھر لیا :[1]

(د) اس سلسلے میں مفصل بیان مولانا ابوالکلام آزاد کا ہے۔ جسے مولانا ابوالکلام آزاد نے غلام رسول مہر کو ایک نوٹ کی صورت میں لکھا تھا۔
جو ان کی کتاب "غالب" میں شامل ہے۔ اس کے ضروری حصے یہاں نقل کیے جاتے ہیں :

"غدر سے پہلے ان کی آمدنی کا وسیلہ صرف سرکاری وظیفہ اور قلعہ کے پچاس روپے تھے[2]
چونکہ زندگی رئیسانہ بسر کرنا چاہتے تھے، اس لیے ہمیشہ مقروض و پریشان حال رہتے تھے۔
اس زمانے میں دلی کے بے فکر رئیس زادوں اور چاندنی چوک کے بعض جوہری بچوں
نے گزران وقت کے جو مشغلے اختیار کر رکھے تھے ان میں ایک قمار کا بھی مشغلہ تھا۔
گنجفہ عام طور پر کھیلا جاتا تھا اور شہر کے کئی دیوان خانوں کی مجلسیں اس باب میں شہرت
رکھتی تھیں۔ مرزا بھی اس کے شائق تھے۔ رفتہ رفتہ ان کے یہاں چاندنی چوک کے بعض
جوہری بچے آنے لگے اور باقاعدہ جوا بازی شروع ہو گئی۔ قمار کا عام قاعدہ یہ ہے کہ صاحب
مجلس (یا یوں کہا جائے کہ مہتمم قمار خانہ) کا ایک خاص حصہ ہر بازی میں ہوا کرتا ہے۔ جو
بھی جیتے، فی صدی اتنا صاحب مجلس کا ہو گا۔ مرزا صاحب کے دیوان خانے میں مجلس
جمنے لگیں تو وہ صاحب مجلس ہو گئے اور ایک اچھی خاصی رقم بے محنت و مشقت وصول
ہونے لگی۔ وہ خود بھی کھیلتے تھے اور چونکہ اچھے کھلاڑی تھے، اس لیے اس میں بھی کچھ نہ
کچھ مار ہی لیتے تھے ......"

"مدت تک شہر کے کوتوال اور حکام ایسے لوگ رہے جن سے مرزا غالب کی رسم و راہ
رہتی تھی۔ اس لیے ان کے خلاف نہ تو کسی طرح کا شبہ کیا جاتا تھا۔ نہ قانونی اقدام کا اندیشہ
تھا۔ انھیں میں ایک کوتوال فیض کا شاگرد مرزا خانی بھی تھے ......"

"لیکن غالباً ۱۸۴۴ء میں آگرہ سے تبدیل ہو کر ایک نیا کوتوال آیا۔ یہ مرزا خانی کی طرح نہ
تو شاعر تھا نہ شعر طراز کہ غالب کا قدر شناس ہوتا۔ نرا کوتوال تھا۔ اس نے آتے ہی سختی
کے ساتھ دیکھ بھال شروع کر دی اور جاسوس لگا دیئے ...... بالآخر ایک دن ایسے
موقعہ پر، کہ مجلس قمار گرم اور روپیوں کی ڈھیریاں چنی ہوئی تھیں، کوتوال پہنچا اور دستک

---

[1] لال قلعہ کی ایک جھلک، سید ناصر نذیر فراق دہلوی، طبع دہلی، صفحہ ۴۴، ۴۵

[2] مولانا آزاد کا یہ بیان غالب کے دوسرے واقعۂ اسیری یعنی ۱۸۴۷ء سے متعلق ہے لیکن اس وقت قلعہ کے پچاس روپے کہاں تھے۔ مولانا
سے تسامح ہوا ہے۔ غالب تو گرفتاری کے تین برس بعد ۱۸۵۰ء میں قلعہ کے ملازم ہوئے (ذکرِ غالب، مالک رام، ص ۶۷)

دی ... نواب ... سے نکل جائے گی ... صاحب ... مرثیے ... [1]

(۲) ... لالہ گھنشام لال عاصی بادۂ عشرت ... یہ قطعہ ... جو اس سلسلے میں ... جشن ... کیا گیا۔ عاصی [2] ... غالب کے ہم عصر تھے اور دہلی کے رہنے والے تھے۔ غالب کے ... سے متعلق یہ قطعہ تاریخ ... حاصل ... اس قطعہ میں عاصی نے پانچ تاریخیں نکالی ہیں۔ پہلی، دوسری عیسوی، تیسری اور چوتھی ہجری ... کو ظاہر کرتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

... فیض ... ہے
۱۲۵۷ فصلی

... ہے
۱۲ ... ۶۳ ھ

... غالب ... کے دل پر ہو
۱۲۶۳ ھ

... کان ... سے ... ہے

... ہو

... غمخوار ... فیض الحسن ... ہے
۱۹۰۴ ہجری

---

[1] غالب، غلام رسول مہر، ص ۱۸۶۔ [2] منشی گھنشام لال عاصی۔ دہلی کے باشندہ ... تھے۔ ان کے والد رائے چھنی لال شاہ عالم ثانی اور اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں دیوانی کے عہدوں پر سرفراز تھے۔ بہادر شاہ کے میر منشی مکند لال، انھیں کے بھتیجے تھے۔ یہ خود اکبر شاہ ثانی کے عہد میں مرزا بابر، خلف اکبر شاہ کے ملازم رہے۔ خوشنویسی اور موسیقی سے گہرا لگاؤ تھا۔ شاعری میں شاہ نصیر کے تربیت یافتہ تھے اور انھیں کی طرح سنگلاخ زمینوں کو پانی کرنا شعر گوئی کی معراج سمجھتے تھے۔ صنائع بدائع پر جان چھڑکتے تھے اور ساری توجہ چست بندشوں، خوشنما ترکیبوں اور الفاظ کی شعبدہ بازی پر صرف کرتے تھے۔ طبیعت تیز و طرار پائی تھی۔ دو غزلے، سہ غزلے لکھ کر اپنی قادر الکلامی کا لوہا منوا لیتے تھے۔ تاریخ گوئی میں بھی طاق تھے۔ ان کا انتقال ۶۰ برس کی عمر میں ۱۸۶۵ء میں ہوا۔ ان کے دیوان کا قلمی نسخہ انکے پوتے منشی بنس گوپال المتخلص بہ شاعر کے پاس محفوظ تھا، جسے انھوں نے موہن لال ماتھر دہلوی کے مقدمے کے ساتھ کایستھ سبھا دہلی سے شائع کر دیا ہے۔

عاصی کے نواسے منشی بہاری لال مشتاق غالب کے شاگرد تھے۔ اردو فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی گوری شنکر قیصر بھی صاحب دیوان تھے۔ ان دونوں کے انتخابات دہلی سے شائع ہو چکے ہیں۔

[مقدمہ کلام عاصی، تلامذۂ غالب صفحہ ۲۵۹، دیباچہ دیوانِ مشتاق، دیباچہ دیوان قیصر، تذکرہ بہار سخن صفحہ ۲۷۲ نیز سخن شعرا، نساخ ص ۳۲۱]

میر بازو کو بانہ تعویذ نصرت عاصی
اسد کو حق خوں سے کہہ سر رد از زنداں ہے[1]

اس قطعۂ تاریخ کی وضاحت میں عاصی نے ایک عبارت بھی لکھی ہے جس سے بعض اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

"مرزا نوشہ نے شاعر بے بدل دہلی، رند مشرب، متخلص بہ اسد و غالب تھے فیض الحسن خاں کوتوال دہلی کو ناحق عداوت پیدا ہو گئی۔ اور اس نے بعلت قمار بازی ان کو قید کرا دیا جس کی مندرجہ ذیل تاریخ نکالی گئی ..... بروقت گرفتاری کوتوال بمعہ بجوب رقعہ میں بیٹھ کر موقع پر گئے اور ظاہر کیا کہ سواریاں زنانی آئی ہیں۔ اس دھوکے سے اندر داخل ہو گئے اور اندر مکان کے ضربات جوتی باہم اس قدر ہوئیں کہ باہر آواز آتی تھی۔ مگر زینہ کے اندر بہت جمعیت تھی اور کئی امدادی برخنداز پہنچ گئے۔ گرفتار کر کے قید کرا دیا۔ بہت سے رئیس اور شرفا اس حرکت سے ناراض ہوئے۔ اور عدالت میں برأت کے حامی ہوئے مگر قید ہو ہی گئی۔

ایک روز مسٹر راس صاحب سول سرجن دہلی قیدیان جیل خانہ کو ملاحظہ کرتے ہوئے حضرت کے پاس تک پہنچ گئے اور حال دریافت کیا۔ آپ نے فی البدیہہ یہ فرمایا ؂

جس دن سے کہ ہم غم زدہ زنجیر بپا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

اس وقت ڈاکٹر صاحب نے گورنمنٹ کو چٹھی لکھ کر رہا کرا دیا۔"[2]

غور طلب امور

مندرجہ بالا شہادتوں کی روشنی میں سب سے اہم مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی غالب قمار بازی کے جرم کے مرتکب نہیں ہوئے تھے۔ اس بارے میں پیش کردہ بیانات میں گہرا تضاد ہے۔ بیان "ج" میں گرفتاری کے اسباب کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اس لیے اس مسئلے میں وہ خارج از بحث ہے۔ بیان "ب" (احسن الاخبار) اور "د" (یادگار غالب) سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غالب جوا نہیں کھیلتے تھے۔ اس کے برعکس بیان "الف"، "د" اور "ز" سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کا مکان قمار بازی کا اڈا بنا ہوا تھا اور وہ خود بھی جوا کھیلتے تھے۔ بیان "ہ" ان متضاد بیانوں میں سے کونسا قرین صحت ہے۔ یہ فیصلہ کرنے کے لیے ان مختلف بیانات کی صحت اور استناد کا درجہ متعین کرنا ضروری ہے

[1] کلام عاصی، ص ۲۶۳۔ اس قطعۂ تاریخ کے علاوہ عاصی کے دیوان میں "غدر دہلی" "قتل ولیم فریزر"، شادی حضرت بہادر شاہ ہمراہ زینت محل، وفات نواب واجد علی شاہ، مجیر (جلد پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی) کی تاریخیں بھی ملتی ہیں۔

[2] ایضاً ص ۲۶۳، ۲۶۴

[illegible] خبر [illegible] ت لکھا ہے

سب سے پہلے قرض [illegible] حالی نے بھی [illegible] کا حال [illegible] کیا ہے۔ حالی کا بیان تاریخی حقائق [illegible] تذکرہ [illegible] ہے۔ [illegible] پہچان [illegible] بعد میں ان کی صداقت مشکوک [illegible] کی حقیقی حیثیت، وہ مولانا ابوالکلام آزاد سے سنیے:

"مرزا حالی مرحوم نے اس واقعہ کو [illegible] لکھا ہے وہ ضعف کے [illegible] ہے
جو مرحوم سوانح نگاری کو [illegible] سمجھتے تھے۔ [illegible] پسند نہیں کرتے [illegible]
[illegible] جائے۔ حیاتِ جاوید میں بھی انہوں نے ہر جگہ یہی [illegible]
[illegible] صاحب سے اس معاملے کو [illegible] ظاہر کیا ہے کہ گویا کوئی بات [illegible]
محض [illegible] شطرنج کا شوق تھا۔ اس شوق کی تکمیل کے لیے برائے نام کچھ [illegible]
بد لیا کرتے تھے۔ کوتوال جو [illegible] تھا۔ [illegible] قماربازی کا مقدمہ بنا دیا [illegible]
[illegible] کے خلاف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ پورا قماربازی کا معاملہ تھا اور نواب
امین الدین مرحوم (والیِ لوہارو) نے [illegible] میں مرزا نے اپنے مکان کو جوا بازی کا
اڈا بنا رکھا تھا۔"[2]

غالب کے سوانح نگار کی حیثیت سے حالی کی کوتاہیاں بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔ [illegible] ہے کہ اس زمانے میں غالب سے متعلق جو معلومات حاصل ہو سکتی تھیں، حالی نے ان سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ [illegible] کی وجہ سے نہ صرف غالب کے حالاتِ زندگی میں بعض غلطیاں راہ پا گئی ہیں، بلکہ ان کی سیرت و شخصیت کے بعض اہم پہلو بھی تشنہ رہ گئے ہیں۔[3]

حالی کی طرح احسن الاخبار نے بھی غالب کی قماربازی کو تسلیم نہیں کیا۔ اس نے لکھا ہے کہ مرزا دشمنوں کی غلط اطلاعات کے باعث گرفتار ہوئے اور جو کچھ ہوا محض حاسدوں کی فتنہ پردازی کی وجہ سے ہوا۔ [illegible] الاخبار کی شہادت بھی تحقیق اور تاریخی دونوں اعتبار سے مردود ہے۔ یہ اخبار دہلی سے نہیں بمبئی سے نکلتا تھا۔ اس زمانے میں فاصلوں کی دوری اور سفر کی مشکلات کے باعث خبر رسانی واقعات کی رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ چنانچہ یہ خبر بھی غالب کی گرفتاری کے تیس دن بعد شائع ہوئی۔ اس میں بادشاہ کے سفارشی خط کا بھی ذکر ہے جو ریذیڈنٹ کو لکھا گیا تھا۔ غالب کی گرفتاری، احباب و اعزہ کی دوڑ دھوپ، بہادر شاہ کا خط لکھنا، ریذیڈنٹ کا کورا جواب دینا واقعات کا ایک سلسلہ ہے جس کا اثر دہلی کے عوام پر غالب سے ہمدردی کی صورت میں ظاہر ہوا ہوگا۔ اور احسن الاخبار کے نامہ نگار کا اس سے

---

[1] تذکرہ حالی از اسمٰعیل پانی پتی میں لکھا ہے کہ غالب سے حالی کے تعلقات کا آغاز ہنگامہ سنہ ستاون کے بعد شیفتہ کی ملازمت سے پہلے ہوا۔ نیز ملاحظہ ہو، راقم الحروف کا مضمون "یادگارِ غالب" سالنامہ پگڈنڈی، امرتسر، ۱۹۵۶ء

[2] نقشِ آزاد، مرتبہ غلام رسول مہر، طبع دہلی صفحہ ۲۷۹، ۲۸۰

[3] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "یادگارِ غالب کا تحقیقی مطالعہ" ڈاکٹر وحید قریشی، سویرا لاہور، ۲۴

متاثر ہونا خلافِ قیاس نہیں۔ چنانچہ وہ غالب کو قطعاً بے قصور گردانتے ہوئے ان کی گرفتاری کا باعث "دشمنوں کی غلط اطلاعات" قرار دیتا ہے۔ احسن الاخبار میں اس واقعہ سے متعلق جو دوسری خبر شائع ہوئی ہے، اس میں بھی غالب سے گہری ہمدردی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ اس کی آخری سطروں میں جو احتجاج کیا گیا ہے، ان میں "غالب کی طرفداری" کا رنگ نمایاں ہے۔ دوسری خبر میں احسن الاخبار نے غالب کے "جرم" کو قبول تو کر لیا ہے، لیکن وہ اسے "معمولی" قرار دیتا ہے۔ اور ان کی سزا میں رعایت فقط اس بنا پر طلب کرتا ہے کہ وہ ایک ایسے "باکمال" شخص ہیں، جن کی عزت اور حشمت کا دبدبہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے" یہ دلیل سراسر جذبات پر مبنی ہے حالانکہ قانون کے سامنے باکمال اور بے کمال، اور رئیس و مفلس سب کا درجہ برابر ہے۔ بغرض حالی کی طرح احسن الاخبار کے بیان میں بھی غالب سے عقیدت و محبت کا جذبہ پایا جاتا ہے اور اس میں غالب کے دامن کو قمار بازی سے پاک دکھانے کی جو کوشش کی گئی ہے، وہ جانبداری پر مبنی ہے۔

یہ معلوم کر لینے کے بعد کہ حالی اور احسن الاخبار کے بیانات تحقیقی اعتبار سے قابلِ اعتنا نہیں، ہم گواہوں کے دوسرے فریق کی طرف آتے ہیں جس نے غالب کو قمار بازی کا مرتکب بتایا ہے۔ اس فریق میں فوائد الناظرین، سر امیر الدین اور بعض نامعلوم عامی شامل ہیں۔ فوائد الناظرین وہ پہلا اخبار ہے جس نے غالب کی گرفتاری کی خبر شائع کی۔ گرفتاری کی تاریخ بھی غالباً اسی خبر سے معلوم ہوتی ہے۔ یہ خبر اس زمانے کے حالات کے مطابق تاخیر سے بھی شائع نہیں ہوئی۔ ایڈیٹر یا نامہ نگار نے اس پر کوئی تبصرہ بھی نہیں کیا۔ اس کی نوعیت محض اطلاعی ہے اور اس میں کسی رنگ آمیزی کو دخل نہیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر اس خبر کو صحیح تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے سر امیر الدین[1] کی زبانی جو روایت نقل کی ہے، اس میں غالب پر صاف الفاظ میں قمار بازی کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ اس روایت کے قوی نہ ہونے کی تین وجوہ ہیں:

(۱) غالب کے واقعۂ اسیری کے وقت امیر الدین پیدا ہی نہیں ہوئے تھے[2]۔ اس لیے یہ روایت ہم تک ایک سے زیادہ واسطوں سے پہنچی ہے۔

(۲) غالب کے قید ہونے کے بعد لوہارو خاندان کا طرزِ عمل نہایت افسوسناک تھا[3]۔ ان حالات میں سر امیر الدین کا بیان غیر جانبدارانہ نہیں ہو سکتا۔

---

[1] پورا نام، نواب سر امیر الدین احمد خان، فرخ مرزا۔ بیٹے تھے نواب علاؤ الدین احمد خاں علائی کے، جنھیں غالب نے اپنا خلیفہ ثانی بنایا تھا۔ وہ نواب امین الدین احمد خاں رئیس لوہارو کے بڑے صاحبزادے تھے جن کے والد نواب احمد بخش خاں غالب کے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف کے بھائی تھے۔

[2] "سر امیر الدین، غالب کی وفات کے وقت زیادہ سے زیادہ آٹھ برس کے ہوں گے" ان کے نام غالب کا خط غالباً ۱۸۶۷ء کا واقعہ ہے" مہر: خطوطِ غالب صفحہ ۴۷، ۱۱۱۔ غالب ابتدائے اسیری کے ۲۲ برس بعد تک زندہ رہے۔ اس طرح امیر الدین کی پیدائش تقریباً ۱۸۶۱ء یعنی واقعہ قید کے ۱۳ یا ۱۴ برس بعد ہوئی۔

[3] غلام رسول مہر، غالب، صفحہ ۱۸۷، ۱۸۸

(۳) آزاد کے بیان میں غالب کی تردید کا شدید جذبہ پایا جاتا ہے، جس کے باعث وہ انتہا پسندی کا شکار ہو سکتے ہیں۔

البتہ اس روایت کے حق میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ دو عمومیتیں جو یوں پر تو پردہ پڑ سکتا ہے۔ لیکن معائب اور کمزوریاں جب رو برو سامنے آجاتی ہیں تو کہا گیا ہے کہ ذاتی خامیوں اور کمزوریوں کا پردہ اسی وقت چاک ہوا جب کسی مخالف نے اپنے بے باکانہ انداز سے ان کی تشہیر کا سامان کر دیا۔ اس واقعہ کا تعلق بھی چونکہ غالب کی ایک کمزوری سے ہے۔ اس سے متعلق ہو بہو خاندان کے ایک فرد کا بیان مبالغے سے قطع نظر اصلیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جعفر صاحب غالب کی قمار بازی کی تصدیق فرما رہے ہیں اور ایک دہلوی معاصر کلیات عاصی کے بیان سے بھی ہو جاتی ہے۔

شیخ محمد اکرام نے "غالب نامہ" میں عاصی کی عبارت کو "قید" کے ذیل میں درج تو کیا ہے لیکن قطعہ تاریخ پیش نہیں کیا۔ اس سے متعلق ان کی رائے یہ ہے:

> "شاید عاصی، غالب کا دل سے قدردان نہ تھا۔ چنانچہ جو قطعہ تاریخ اس نے لکھا ہے، اس سے غالب کی صریح توہین ہوتی ہے۔"[1]

یہاں مولف "غالب نامہ" غالب پرستی کا شکار ہو گئے ہیں۔ یہ منطق خوب ہے کہ چونکہ عاصی کے قطعہ تاریخ سے "غالب کی صریح توہین ہوتی ہے" اس لیے ان کے بیان کو ناقابلِ اعتنا قرار دے دیا جائے۔ صداقت ہمیشہ تلخ ہوتی ہے اور اگر ایک شخص نے غالب کے واقعہ قید سے متعلق بھی باتوں کو صاف صاف بیان کر دیا تو اسے غالب کے قدردانوں اور بہی خواہوں کے زمرے سے خارج کرتے ہوئے اس کے بیان کی اہمیت کو کم کرنا کہاں کا ادبی انصاف ہے؟ یہ قید بجائے خود توہین آمیز تھی، پھر غالب کے کسی قدردان اور بہی خواہ سے یہ توقع کتنی عبث ہے کہ وہ حرفِ صداقت زبان پر لائے گا۔ واقعۂ قید سے متعلق حقیقتِ حال کا اظہار یا تو کوئی غیر جانبدار فریق کر سکتا ہے یا پھر مخالف، مگر دوسری حالت میں مبالغے کا قوی احتمال ہے۔ ہمارے نزدیک عاصی کو غالب کا مخالف یا معاند قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ وہ اپنے بیان میں غالب کو "شاعرِ بے بدل" کہتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ دلی میں اس وقت قدردانی کے اعتبار سے شاعروں کے دو خاص گروہ تھے۔ غالب ایک مخصوص حلقے میں پسند کیے جاتے تھے اور عوام زیادہ تر ذوق کے پرستار تھے۔ عاصی شاہ نصیر کے شاگرد تھے، اور جب شاہ نصیر سے ذوق کے تعلقات کشیدہ ہوئے تو عاصی بھی ذوق کے مخالف ہو گئے۔ چنانچہ تیلیوں والے معرکہ خیز مشاعرے میں جو قدیم دلی کالج میں منعقد ہوا تھا، عاصی نے ذوق اور ان کے ہواخواہوں کو نیچا دکھانے کی پوری کوشش کی تھی۔[2] ذوق سے عاصی کی کشیدگی کے پیشِ نظر

---

[1] غالب نامہ، شیخ محمد اکرام، طبع لکھنؤ، صفحہ ۱۰۵

[2] محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں اس معرکے کا ذکر یوں کیا ہے: "جن دنوں شاہ صاحب سے (ذوق کے) معرکے ہو رہے تھے۔ منشی فیض پارسا دلی کالج میں مدرسِ حساب تھے...... انھوں نے مدرسہ میں بڑی دھوم دھام سے مشاعرہ کیا...... ان دنوں میں مدرسہ اجمیری دروازہ کے باہر تھا۔ شہر کے دروازے ۹ بجے بند ہو جاتے تھے۔ گڑھ کپتان سے اجازت لی کہ مشاعرہ کے دن ۲ بجے (رات) تک اجمیری دروازہ کھلا رہا کرے۔ غرض مشاعرہ مذکور اس شان و شکوہ سے جاری ہوا کہ پھر کوئی ایسا مشاعرہ دلی میں نہیں ہوا۔ شہر کے رؤسا اور تمام نامی شاعر موجود ہوتے تھے۔ سب کی نگاہیں شاہ صاحب اور شیخ صاحب کی طرف ہوتی تھیں۔ چنانچہ ایک مشاعرہ میں شاہ صاحب نے غزل — قفس کی تیلیاں، خس کی تیلیاں پڑھی۔ دوسرے مشاعرے میں یہی طرح ہو گئی۔ سب غزلیں کہہ کر لائے۔ شیخ مرحوم نے دو غزلہ لکھا۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

یہ ضروری تو نہیں کہ ان کے غالب سے اچھے تعلقات تھے۔ لیکن بغیر کسی ثبوت کے انھیں غالب کا بدخواہ یا مخالف قرار دینا بھی غلط ہوگا۔ ذوق سے ان کی ہنگامہ آرائی اور غالب سے متعلق قطعہ تاریخ میں ان کے لہجے کی حق گوئی سے یہ نتیجہ ضرور نکالا جاسکتا ہے کہ وہ اگر غالب کے قدردان نہ تھے، تو ان کے مخالف بھی نہ تھے۔ ان حالات میں عاصی کا بیان قطعاً غیر جانبدارانہ قرار پاتا ہے اور ایسے بیان کی تاریخی اور تحقیقی حیثیت مسلم ہے۔ غرض عاصی اور فوائد الناظرین کے بیانات کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ غالب قماربازی کے مرتکب ہوئے تھے۔ اس سے ان کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ بلکہ ان کی سیرت کا ایک پہلو سامنے آجاتا ہے۔ غالب اپنی ادبی عظمت کی وجہ سے ہمیں محبوب ہیں لیکن کسی محبوب شخصیت کا ہر لحاظ سے مثالی ہونا ضروری نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسی شخصیت کی انسانی کمزوریاں

(حاشیہ بقیہ)

اور اس پر کچھ تکرار ہوئی۔ اس پر جوش میں آکر فرمایا کہ برس دن تک جو مشاعرہ ہو، اس میں سوائے غزل طرحی کے ایک غزل اس زمین میں ہوا کرے چنانچہ دو مشاعروں میں ایسا ہوا۔ ایسے معرکوں میں عوام الناس بھی شامل ہوتے تھے۔ تیسرے جلسہ میں جب انھوں نے غزل پڑھی تو بعض شخصوں نے کچھ کچھ چوٹیں کیں۔ جنھیں شیخ صاحب کے طرف دار سمجھے کہ شاہ صاحب کے اشارے سے ہوئیں۔ زیادہ تر یہ کہ شاہ وجیہ الدین منیر یعنی شاہ صاحب کے صاحبزادے نے یہ شعر بھی پڑھ دیا:

گرچہ قندیلِ سخن کو منڈھ لیا تو کیا ہوا
ڈھانچ میں تو ہیں وہی اگلے برس کی تیلیاں

اس پر تکرار زیادہ ہوئی اور مشاعرہ بند کر دیا گیا کہ مبادا زیادہ بے لطفی ہو جائے" (آب حیات طبع پانزدہم صفحہ ۴۷۶)

آزاد نے جس شعر کا حوالہ دیا ہے، وہ منیر کا نہیں، بلکہ گھنشام لال عاصی کا ہے۔ ان کے کلیات میں منجملہ اس شعر کے پوری غزل موجود ہے۔ اس مشاعرے میں چونکہ ذوق کا پلہ نیچا رہا تھا۔ آزاد نے نہ صرف باقی روداد کو حذف کر دیا بلکہ عاصی کے شعر کو بھی منیر کے نام سے لکھ دیا۔ جب لوگوں نے اس غلطی پر اعتراض کیا تو آزاد نے حاشیے میں فقط اتنا لکھا: "بعض بزرگوں سے سنا کہ لالہ گھنشام داس لال، عاصی نے پڑھا تھا۔ وہ بھی شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔" (آب حیات، صفحہ ۴۷۸) واقعہ یہ ہے کہ مشاعرہ میں شاہ نصیر کی غزل پر اعتراضاً ذوق نے اپنے تلمیذ بہادر شاہ ظفر کی غزل میں چند اشعار پڑھے تھے۔ مطلع یہ تھا:

قافیہ میں گر نہ تھیں حضرت کے بس کی تیلیاں
یار کی چلون میں ہوں پائے مگس کی تیلیاں

اسی پر آئندہ مشاعرہ معرکے کا قرار پایا۔ عاصی نے اس مشاعرے میں طرحی غزل سے پہلے "چھیڑ کی غزل پڑھی" اس کے آخری دو شعر یوں تھے:

کل شیخ جی ہرن کی طرح بھاگے چوکڑی — سیدھی سڑک بھی چل کے نہ متھرا پہنچ سکے
عاصی وہ تیلیوں کی غزل اب کرو رقم — جس کو نہ سلکِ گوہرِ یکتا پہنچ سکے

اس کے بعد عاصی نے ۴۲ اشعار کی بڑی سیر قوافی غزل پیش کی۔ جسے سن کر سامعین نے "ایماناً کہا کہ عاصی کی غزل لاجواب اور قابل تحسین ہے اور ذوق پر فوقیت رکھتی ہے۔" یہ غزل عاصی کے کلیات میں موجود ہے، اور اس کے بعض قوافی یہ ہیں: عبس، حظ رس، کرہ ہوس، افعی پر نوس، عاشق بے دسترس، بید قرس، سرس، ودس، ترس وغیرہ (کلام عاصی صفحہ ۱۴۲-۱۴۸)

کو سامنے رکھنے کے بعد ہی اس کی عظمت کو صحیح پس منظر کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے۔ غالب اپنے معاشرے کے بچے خود تھے۔ ان میں کم و بیش وہ تمام خوبیاں اور خامیاں تھیں جو اس زمانے کے سماج میں لازمی ہو سکتی ہیں۔ لیکن ان کمزوریوں کے باوجود وہ فن کی ان بلندیوں تک پہنچ گئے جہاں اُن کا کلام ہر معنوں میں حلقۂ شاعر و عصر سے نکل کر جاودانی ہو چکا ہے۔ حالی کے بیان سے غالب کے واقعۂ اسیری سے متعلق جن اسباب پر روشنی پڑتی ہے وہ یہ ہیں:

کوتوال سے دشمنی

واقعۂ اسیری کے بارے میں غالب کی تصانیف سے زیادہ مدد نہیں ملتی۔[1] انھوں نے جو اسی شعر کا ایک فارسی ترکیب بند قید کی حالت میں لکھا تھا، جسے متفقہ طور پر ان کی بہترین نظموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن ان کے احباب وغیرہ نے اس خیال سے حبسیہ کو کلیاتِ نظم میں شامل نہ کیا کہ اس سے غالب کی قید ہمیشہ کے لیے منظرِ عام پر آ جائے گی۔ گو بعد میں یہ متفرق فارسی کلام کے مجموعہ "سبد چیں" میں شائع کر دیا گیا۔[1] اس میں غالب نے اسیری کے حالات و جذبات تو بیان کئے ہیں، لیکن قید کے اسباب و علل کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ حبسیہ کو کلیاتِ نظم میں شامل نہ کرنے کے واقعہ سے شبہ ہوتا ہے کہ غالب کے ایسے خطوط کی اشاعت بھی روک لی گئی جن میں قید سے متعلق کوئی بات ہو گی۔ ایسے ہی ایک فارسی خط کے اقتباس کا ترجمہ حالی نے پیش کیا ہے۔ یہ خط اُن کے فارسی خطوط میں شامل نہیں۔ اس میں غالب نے اپنے قید ہونے کی وجہ کوتوال سے دشمنی کو قرار دیا ہے:

"کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف۔ فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں۔
باوجودیکہ مجسٹریٹ کوتوال کا حاکم ہے، میرے باب میں وہ کوتوال کا محکوم بن گیا۔
اور میری قید کا حکم صادر کر دیا۔"[2]

مولانا آزاد اس سے متعلق فرماتے ہیں:

"عرصہ تک شہر کے کوتوال اور حکام ایسے لوگ رہے جن سے مرزا غالب کی رسم و راہ رہی تھی۔ ...... انھیں میں ایک کوتوال قتیل کے شاگرد مرزا خانی بھی تھے ...... لیکن غالباً ۱۸۴۵ء میں آگرہ سے تبدیل ہو کر ایک نیا کوتوال آیا۔ یہ مرزا خانی کی طرح نہ تو شاعر تھا نہ نثر طراز کہ غالب کا قدر شناس ہوتا۔ نرا کوتوال تھا۔ ..."[3]

---

[1] منشی ہرگوپال تفتہ کے نام، ۱۰ دسمبر ۱۸۵۳ء کے ایک خط میں نقطہ نقطہ لکھا ہے: "سرکار انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا، رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا۔ پورا خلعت پاتا تھا۔ اب بدنام ہو گیا ہوں اور ایک بہت بڑا دھبہ لگ گیا ہے۔"

(اردوی، طبع لاہور، صفحہ ۸۲)

[1] سبد چیں، صفحہ ۲۴-۲۰۔ نیز ملاحظہ ہو "یوسف ہندی قید فرنگ میں" مطبوعہ حیدرآباد

[2] یادگارِ غالب، صفحہ ۲۷

[3] نقشِ آزاد، صفحہ ۲۸۱

یہ صحیح ہے کہ جب تک مرزا خانی دہلی میں تھے، غالب کو کسی قسم کا خطرہ نہ تھا۔ لیکن مولانا کا یہ بیان محل نظر ہے کہ نیا کوتوال ۱۸۴۵ء میں آگرے سے تبدیل ہو کر آیا۔ غالب اس واقعہ سے چھ برس پہلے ۱۸۴۱ء میں بھی قمار بازی کے الزام میں معتوب ہو چکے تھے اور دہلی اردو اخبار نے صاف الفاظ میں ان کی گرفتاری کو نئے تھانیدار کا کارنامہ قرار دیا تھا۔

"اب تھوڑے دن ہوئے یہ تھانیدار قوم سے سید اور بہت جری سنا جاتا ہے، مقرر ہوا ہے۔ یہ پہلے جمعدار تھا، بہت مدت کا نوکر ہے۔ جمعداری میں بھی یہ بہت گرفتاری مجرموں کی کرتا رہا ہے"......[1]

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مرزا خانی کے بعد نیا کوتوال بقول آزاد ۱۸۴۵ء میں نہیں بلکہ ۱۸۴۱ء یا اس سے کچھ پہلے مقرر ہوا۔ دوسرے یہ تھانیدار آگرہ سے تبدیل ہو کر نہیں آیا، بلکہ دہلی میں "مدت کا نوکر" تھا۔ اور "پہلے جمعدار تھا"۔ دہلی اردو اخبار نے اس کا نام درج نہیں کیا۔ فقط یہی لکھا ہے کہ یہ قوم کا سید ہے۔ گھنشام لال عاصی نے کوتوال کا نام اپنے قطعہ تاریخ اور توضیحی عبارت میں "فیض الحسن خان" بتایا ہے۔ احسن الاخبار مورخہ ۱۵ دسمبر ۱۸۴۶ء کی ایک خبر میں بتایا گیا ہے:

"گورنر جنرل نے دہلی میں ۱۷ کو دربار عام کیا تھا اور اس میں غالب کو خلعت ہفت پارچہ و سہ رقم جواہر اور فیض حسن کوتوال کو ایک شالی رومال عطا فرمایا" [2]

ظاہر ہے کہ یہ اعزاز فیض الحسن کو حسن خدمت کی بنا پر بخشا گیا اور وہ دربار کے انعقاد (۱۸۴۵) سے قبل دہلی میں اپنی کارگزاریوں کا ثبوت پیش کر چکا ہوگا۔ قیاس ہے کہ غالب کی پہلی گرفتاری بھی اسی کوتوال کے ہاتھوں عمل میں آئی ہوگی اور دو برسوں غالب کے درپے رہا ہوگا۔ عاصی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ "غالب سے فیض الحسن خان کوتوال دہلی کو ناحق عداوت پیدا ہو گئی ہے"۔ اس عداوت کا ذکر خود غالب کے خود بالا خطوط میں بھی ملتا ہے۔ لیکن مولانا آزاد اسے نظر انداز کرتے ہوئے گرفتاری کی تمام تر وجہ غالب کی قمار بازی کو قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ قمار بازی شہر کے دوسرے حصوں میں بھی ہوتی تھی اور بقول ان کے:

"شہر کی یہ رسم ٹھہر گئی تھی کہ رئیس زادوں کے دیوان خانے مستثنیٰ سمجھے جاتے تھے۔ گویا ان کی وہ نوعیت مان لی گئی تھی جو آج کل کے کلبوں میں برج کھیلنے کی ہے۔ انھیں از راہِ تجاہل رئیسانہ تفریحوں میں تصور کیا جاتا تھا" [3]

ان حالات میں کوتوال کا فقط غالب کو نشانۂ عتاب بنانا، غالب سے ذاتی عداوت ہی کی بنا پر سمجھا جا سکتا ہے۔ اور عاصی کے بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

گرفتاری کے حالات

مولانا آزاد لکھتے ہیں:-

"ایک دن ایسے موقع پر کہ مجلس گرم اور روپیوں کی ڈھیریاں چنی ہوئی تھیں، کوتوال

---

[1] دہلی اردو اخبار، مورخہ ۱۵ اگست ۱۸۴۱ء محزونہ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، نئی دہلی۔ [2] حوالہ ما سبق، نوائے ادب اپریل ۱۹۵۵ء
[3] نقش آزاد، صفحہ ۲۸۱

چنانچہ اندر دروازے پر دستک دی۔ اور لوگ تو پچھواڑے سے نکل بھاگے، صاحبِ مکان یعنی مرزا دھر لیے گئے۔" [۱]

لیکن حالی نے گرفتاری کے جو حالات لکھے ہیں وہ اس سے مختلف ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ گرفتاری کے وقت کوتوال اچانک دفعتاً میں بیٹھ کر موقع پر گئے اور ظاہر کیا کہ سواریاں زنانی آتی ہیں۔ اس طرح دھوکے سے اندر داخل ہو گئے۔ مولانا کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ "اور لوگ تو پچھواڑے سے نکل بھاگے صاحبِ مکان یعنی مرزا دھر لیے گئے۔" اس کے برعکس حالی لکھتے ہیں کہ "مرزا کے مکان کے قریب جوتی ہا بجہ اس قدر بچو ہیں کہ باہر تک آواز آتی تھی۔ مگر ریے کے اندر بہت جمعیت تھی اور کچھ اعادی پر تندانہ پہنچ گئے۔" غرض غالب تنہا گرفتار نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کے ساتھ دوسرے قمار باز بھی دھر لیے گئے تھے۔ فوائد الناظرین کی پیش کردہ خبر [illegible] میں بھی صاف الفاظ میں اس کا ذکر موجود ہے:

"جناب مرزا صاحب، مع چند اور قمار بازوں کے گرفتار کر کے کوتوالی میں لے آئے....."

متنازعہ فیہ شعر

نظامی بدایونی نے شرح دیوانِ غالب میں لکھا ہے کہ قید خانے میں غالب کے کپڑوں میں جوئیں ہو گئی تھیں۔ ان کو چن رہے تھے کہ ایک رئیس نے جا کر پرسشِ مزاج کی، غالب نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا:

جس دن سے کہ ہم خستہ گرفتارِ بلا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں [۲]

اس شعر سے متعلق غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

"میرا خیال ہے کہ یہ شعر غالب کا نہیں۔ اس سے قطع نظر شعر کی شان نزول قطعاً ناقابلِ قبول ہے..... بے یاری اور درماندگی کی یہ حالت کیونکر قرینِ قیاس سمجھی جا سکتی ہے کہ غالب کے کپڑوں میں جوئیں ہو گئی تھیں اور ایک رئیس ملاقات کے لیے آیا تو وہ جوئیں نکال رہے تھے۔ ...... لہٰذا جو صورت اس شعر میں پیش کی گئی ہے وہ بہرا عتبار سے مستبعد ہے۔" [۳]

حالانکہ اس شعر میں جو صورت پیش کی گئی ہے۔ وہ حقیقت ہی پر مبنی ہے۔ بات دراصل غالب کی "بے یاری" اور "درماندگی" کی نہیں، جیل خانے کے کپڑوں کی ہے۔ غالب کو جیل خانے میں آتے ہی اپنا لباس اتار کر جیل خانے کے کپڑے پہننے پڑے ہوں گے۔

---

[۱] نقشِ آزاد، صفحہ ۲۸۲
[۲] دیوانِ غالب مع شرح نظامی، طبع ششم، ص ۲۱۸
[۳] مہر، غالب صفحہ ۱۸۴

اُس زمانے میں ہندوستانی جیل خانوں کے کپڑوں کی جو حالت ہوگی، بآسانی قیاس کی جا سکتی ہے۔ مختلف قیدیوں کے استعمال کی وجہ سے، جو بیشتر غلیظ اور میلے کچیلے رہنے کے عادی ہوتے ہیں، ان کپڑوں میں جوئیں پڑ جاتی ہوں گی۔ مجبوراً وہی کپڑے غالب کو بھی پہننے پڑے ہوں گے۔ چنانچہ اپنے شعر میں غالب نے جو حالت بیان کی ہے، وہ ہرگز مستبعد نہیں اور مہر صاحب کا یہ خیال کہ "یہ شعر غالب کا نہیں" تحقیقی طور پر صحیح نہیں۔ حالی کے بیان سے بھی یہ شعر غالب ہی کا ثابت ہوتا ہے۔ انھوں نے بالتصریح لکھا ہے:

"ایک روز مسٹر راس صاحب سول سرجن دہلی قیدیان جیل خانہ کا ملاحظہ کرتے کرتے حضرت کے پاس تک پہنچ گئے اور حال دریافت کیا۔ آپ نے فی البدیہہ یہ فرمایا:

جس دن سے کہ ہم غم زدہ زنجیر بپا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

نظامی بدایونی کے ہاں اس شعر کا پہلا مصرع قدرے مختلف ہے۔ (یعنی "غم زدہ زنجیر بپا" کی جگہ "خستۂ گرفتار بلا") لیکن نظامی کی روایت پر حالی کے بیان کو فوقیت حاصل ہے۔ کیونکہ ایک تو یہ قدیم تر ہے اور دوسرے یہ بیان غالب کی زندگی میں دہلی میں لکھا گیا۔

قبل از وقت رہائی

سید ناصر نذیر فراق دہلوی نے غالب کے مقدمے کے جو حالات بیان کئے ہیں، ان میں لکھا ہے کہ ان کی قبل از وقت رہائی بادشاہ کی سعی اور بڑے افسر کے اختیاراتِ خاص کی وجہ سے ہوئی۔ اُن کے الفاظ ہیں: "مرزا صاحب کو قید میں پڑے چند روز ہوئے تھے کہ ان کی خوش نصیبی سے لاٹ یا ان جیسا کوئی اور بڑا حاکم شاہجہان آباد میں آیا اور مرزا صاحب کے عزیزوں نے اُس سے جا کر مرزا صاحب کی بپتا کہی اور اس نے اپنے اختیار سے مرزا صاحب کو فوراً چھوڑ دیا۔" [1]

مگر غالب کا وہ بیان جو حالی نے نقل کیا ہے، اس کے برعکس ہے:

"سیشن جج، باوجودیکہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کے برتاؤ برتتا تھا اور اکثر صحبتوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا۔ اس نے بھی اغماض اور تغافل اختیار کیا۔ صدر میں اپیل کیا۔ مگر کسی نے نہ سنا اور وہی حکم بحال رہا۔ پھر معلوم نہیں کیا باعث ہوا کہ جب آدھی میعاد گزر گئی۔ تو مجسٹریٹ کو رحم آیا اور صدر میں میری رہائی کی رپورٹ کی اور وہاں سے حکم رہائی کا آ گیا۔" [2]

غالب کے یہ الفاظ کہ "پھر معلوم نہیں، کیا باعث ہوا کہ جب آدھی میعاد گزر گئی تو مجسٹریٹ کو رحم آیا" غور طلب ہیں۔ گویا خود غالب کو اپنی قبل از وقت رہائی کے اسباب کا صحیح علم نہ تھا۔ مجسٹریٹ کو "رحم" آنا بھی معنی خیز ہے۔ حالانکہ مجسٹریٹ کے رحم و کرم کو پوری طرح آزمایا جا چکا تھا۔ اور بادشاہ سے سفارش کروانے اور صدر میں اپیل کے باوجود قید کی سزا برقرار رہی تھی۔ ایسے حالات میں ملزم کی رہائی محض مجسٹریٹ کے رحم

[1] لال قلعہ کی ایک جھلک، صفحہ ۳۵

[2] یادگارِ غالب، صفحہ ۲۷

کی بنا پر عمل میں نہیں آ سکتی۔ مجسٹریٹ سے اگر احکام صادر کر رہائی کی درخواست کی ہوگی تو وہ بھی قانونی حیلے حوالے کے نہ ہوگی۔ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے، اس سلسلے میں بھی حالی کا بیان ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ حالی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب غالب نے سول سرجن کے پوچھنے پر اپنی ناگفتہ بہ حالت کا شکستہ انداز اظہار کیا تو اسی وقت ڈاکٹر صاحب نے گورنمنٹ کو چٹھی لکھ کر رہا کرا دیا۔[1] غرض مسٹر راس نے غالب کی رہائی کی سفارش کر کے اپنا فرض بطریق احسن انجام دیا۔ لیکن اس نیک خاد شخص نے اپنا احسان جتانے کی کوئی کوشش نہیں کی، ورنہ غالب اپنی رہائی کو مجسٹریٹ کے رحم پر محمول نہ کرتے۔

واقعۂ قید کے ایام میں غالب کی تندرستی خراب رہنے کا ذکر احسن الاخبار میں بھی ملتا ہے:

> "مرزا صاحب بوجہ مرض علیل رہتے ہیں۔ سوائے چند پیسری غذا اطبا کے بتائی کے اور کوئی چیز نہیں کھاتے...... اس قدر ضعف اور مصیبت کا برداشت کرنا مرزا صاحب کی طاقت سے باہر ہے بلکہ ہلاکت کا اندیشہ ہے۔"[2]

ان بیانات کے مدنظر غالب کی قبل از وقت رہائی کا مسئلہ پوری طرح حل ہو جاتا ہے یعنی گرفتاری کے وقت ان کی صحت اچھی نہ تھی۔ تقریباً نصف سزا کاٹ چکنے کے بعد ان کی تندرستی مزید خراب ہو گئی اور جب مسٹر راس سول سرجن نے ان کی ناگفتہ بہ حالت دیکھی تو وہ رہائی کی رپورٹ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ غرض غالب خرابیٔ صحت کی وجہ سے قبل از وقت رہا کر دیے گئے اور اس میں مجسٹریٹ کے رحم و کرم کو مطلق کوئی دخل نہ تھا۔

---

[1] احسن الاخبار کے ایک پرچے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر راس جولائی ۱۸۴۷ء میں دہلی میں تھا۔ (نوائے ادب، اپریل ۱۹۵۸ء)

[2] دہلی کا آخری سانس، صفحہ ۱۷۴

آنکھوں کے مرثیے

محمد علم الدین سالک

انسانی کردار میں بعض اخلاقی خوبیوں کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ان میں استقلال اور تحمل اتنی نمایاں اہمیت رکھتی ہیں کہ ان ہی کی بدولت انسان نڈر ہو کر بڑے سے بڑے خطرے میں کود پڑتا ہے۔ کسی بلند مقصد کے لیے جان کی بازی لگا دیتا ہے۔ مصائب و آلام کی پروا نہیں کرتا، بڑی سے بڑی تکلیف کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کرتا ہے۔ اور تحمل کا سر رشتہ ہاتھ سے نہیں چھوڑتا

تیمور اور اس کی اولاد اس لحاظ سے شاہان عالم کی صف میں بہت ممتاز ہے۔ موت سے کھیل جانا ان کے لیے کوئی بڑی بات نہیں۔ یہ وصف ان میں آخری دم تک قائم رہا۔

تیموریوں کی زندگی کے اس روشن پہلو کے ساتھ ساتھ ایک اور وصف بھی نظر آتا ہے جس نے ان کی زندگی کو بڑا دلچسپ بنا دیا ہے۔ یہ ان کی شعر و ادب سے وابستگی ہے۔ وہ بڑے ادب نواز تھے۔ شعرا کے مربی اور ادیبوں کے محسن ہونے کے علاوہ وہ خود شعر کا صحیح ذوق اور ادب کا ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ یہ چیز انھیں میراث میں ملی تھی۔ گویا یہ ان کے گوشت پوست کا ایک حصہ تھا۔ وہ شعر کہتے، شعر سنتے اور شعر کا مزا لیتے مگر کیا مجال کہ ان کے شاہانہ مشاغل میں کسی قسم کا فرق آئے۔ ان کا ایک پورا پروگرام تھا جس پر وہ بڑی سختی سے کاربند ہوتے تھے۔

ادب اور شعر، رہائش زندگی کے لیے ضروری تھے اس لیے بھی انھیں شعر سے لگاؤ ہونا لازمی تھا۔ بابر سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک ہر بادشاہ دل کھول کر ادب نوازی کرتا، اچھے شعر کی داد دیتا، شعر کی خامیوں پر شعرا کو ٹوکتا اور وقت بے وقت خود بھی شعر کہتا۔ ان کی زندگی میں بعض نہایت خطرناک مواقع پیدا ہوئے جہاں انھیں جان سے کھیلنا پڑا مگر انھوں نے ایسے موقعوں پر بھی شعر و ادب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور زندگی کی ان تلخیوں کو شعر و ادب میں سمو کر ایسا گلدستہ تیار کیا جس سے شعر و ادب کی دنیا اب تک مہک رہی ہے۔

ہندوستان میں آل تیمور کا سلسلہ بابر سے شروع ہوتا اور بہادر شاہ پر ختم ہو جاتا ہے۔ ان میں سے ہر شہزادہ اور ہر بادشاہ اس خوبی سے آراستہ نظر آتا ہے۔ بابر دنیا کی عظیم المرتبت شخصیتوں میں سے ہے۔ پروفیسر لین پول کے قول کے مطابق "وہ اپنے زمانے میں مشرق و مغرب کی وہ شخصیت ہے جو بذات خود سب سے زیادہ شائستہ، مہذب اور متمدن تھی۔ بلکہ اس کا دربار اور اس کی ذات ثقافت کا زبردست مرکز تھی اور اس کی بدولت ثقافت اور فنون لطیفہ کو بے حد فروغ حاصل ہوا۔"

بابر دلیر اور جری سپاہی، تجربہ کار جرنیل اور رحم دل عزیز سردار تھا جس پر ادنیٰ سپاہی سے لے کر اعلیٰ سردار تک جان چھڑکتا اور اس کے ساتھ مرنا اور جینا فخر سمجھتا تھا۔ اس کی زندگی کا ایک ایک واقعہ اولوالعزمی، استقلال اور تحمل کا شاہکار ہے۔ اس کی زندگی کی یہ داستان بڑی دلکش

ہے اور اس کا ایک ایک واقعہ نہ صرف عبرت و بصیرت کا مرقع ہے بلکہ بڑا دلکش اور دلآویز بھی ہے۔ اس نے حوشیاریت اور جلاوطنی اور قید جیلیتوں سے اپنے آپ کو اعتقول کا یکہ متحرک ثابت کیا، بڑے سے بڑے ہلاکت آلام بیاہ۔ بہت کٹھن مرحلوں پر اس نے خوش خوئی کو ہاتھ سے نہ جانے دیا اور خوش مزاجی کو قائم رکھا۔ مایوسی اور یاس کا، ایک لمحہ نہ پڑنے دیا۔ وہ عظیم الشان سلطنت کا مالک ہے تب بھی وہ انتہائی خوش باش اور بشاش ہے اور اگر دو دشمنوں سے شکست کھا کر سر چھپانے کے لیے جگہ تلاش کرتا ہے۔ تب بھی اس کا چہرہ دلی مسرت کی غمازی کرتا ہے۔ جہاں موقع ملتا ہے دوستوں کے ساتھ مل کر جشن مناتا، کسی چشمے کے پاس بیٹھ کے قریب محفل پر بیٹھ کر شعر خوانی کرتا، موسیقی کی تانیں اڑاتا، دوستوں سے خوش گپیاں کرتا، لطیف مزاح سے خود بھی لطف اندوز ہوتا اور دوسروں کو بھی اس روحانی خوشی میں شامل کرتا ہے۔ فرصت پاتے ہی زندگی کے واقعات کو بلکے پھلکے انداز میں قلمبند کر کے آنے والی نسلوں کے لیے ایک ایسا مرقع [illegible] کر جاتا ہے جو اب بھی اتنا ہی دلچسپ اور دلکش ہے جتنا آج سے صدیوں پہلے تھا۔

کامران

بابر کی زندگی کا یہ پہلو علیحدہ تفصیل چاہتا ہے۔ ہم اس کی اولاد میں سے اس کے بیٹے کامران کی زندگی سے اس قسم کا ایک پہلو پیش کرتے ہیں جس میں بابر کے کردار کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ کامران بابر کا دوسرا بیٹا اور ہمایوں کا چھوٹا بھائی تھا۔ بابر نے اپنی سرپرستی میں اسے تعلیم و تربیت دی۔ وہ بڑا ذہین ہوشیار اور عالی مرتبت کا مالک تھا۔ بدقسمتی سے اس نے اپنے ... کی تکمیل کے لیے جو راستے اختیار کیے ان میں طرح طرح کی مشکلات پیدا کیں۔ وہ ایک مدت تک ہمایوں کے خلاف برسرپیکار رہا حتیٰ کہ آخر جب وہ اپنے بھائی سے شکست کھا کر سلیم شاہ سوری کے ہاں چلا گیا۔ اسے امید تھی کہ اسلام شاہ ہمایوں کے خلاف اس کی مدد کرے گا اور وہ کابل کا علاقہ دوبارہ ہمایوں سے چھین لے گا مگر واقعات نے بہت جلد اس پر ثابت کر دیا کہ وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہے۔ اسلام شاہ اس کی مدد کرنا تو درکنار، اس کی زندگی کے درپے ہے چنانچہ وہ اس کے ہاں سے بھاگا اور آدم خاں گکھڑ کے ہاں پناہ گزیں ہوا۔

اب کامران نے گکھڑ سردار کو ہمایوں کے خلاف اکسایا مگر وہ اس پر آمادہ نہ ہوا۔ اس کے بعد اس نے ہمایوں کے خلاف لڑنے کے لیے اس سے مدد چاہی مگر اس کی یہ امید بھی بر نہ آئی۔ آدم خاں اسے بطائف الحیل ٹالتا رہا۔ اور درپردہ وہ ہمایوں سے صلح صفائی کے بارے میں خط و کتابت کرتا رہا۔ چنانچہ دونوں کا آپس میں معاہدہ ہو گیا۔ کامران کو بھی اس کا علم ہوا۔ اس نے بھاگنے کا ارادہ کیا لیکن آدم خاں کے سپاہی اور دوسرے نوکر سائے کی طرح اس پر مسلط رہتے تھے۔ گویا وہ ان کی حراست میں تھا جہاں سے بھاگنا ناممکن تھا۔ ناچار اس نے ان کے ساتھ بسر اوقات کرنی شروع کی۔

ہمایوں سارے حالات سے باخبر تھا۔ وہ کامران کی طرف توجہ دینے سے پہلے کابل کا نظم و نسق درست کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد وہ ہندوستان کی مہم کے لیے تیار ہونا چاہتا تھا جب وہ ان حالات سے عہدہ برآ ہو گیا اور مہم کے لیے تیاری کر لی تو اس نے لشکر کے قاضی اور قاضی چاند کو سلطان آدم گکھڑ کے پاس روانہ کیا کہ وہ مرزا کامران کو ان کے حوالے کر دے تاکہ وہ میرزا کامران کو سمجھا بجھا کر راہ راست پر لائیں مگر ان کی یہ کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ اور میرزا کامران نے ہمایوں کی اطاعت قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

کامران کو چند سرداروں کی حراست میں ہمایوں کے کیمپ میں لایا گیا۔ ہمایوں کی دلی خواہش تھی کہ وہ کامران پر کسی قسم کی سختی نہ

کرے اور اگر میرزا اطاعت قبول کرے تو اسے ایک بہت بڑی جاگیر بخش دے۔ لیکن امیروں کو جب اس بات کا علم ہوا تو وہ بہت جزبز ہوئے۔ وہ عذر کی صورت میں ہمایوں کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے ہمایوں سے کہا کہ کامران نے بڑے بڑے جرم کیے ہیں اسے بڑی سے بڑی سزا ملنی چاہیے۔ وہ اس کا مستحق ہے۔ حق اور انصاف اسی بات کا تقاضا کرتا ہے۔ بادشاہ نے ان کی باتیں سنیں اور وہ قطعی طور پر انھیں ٹال دیا۔ وہ برابر کامران کے بارے میں مراحم خسروانہ سے کام لیتا رہا۔ اس کی حرکات سے چشم پوشی کرتا رہا اور ہر موقع پر لطف و کرم سے پیش آتا رہا۔ امرا نے جب یہ حالت دیکھی تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ اگر حالات ایسے ہی رہے تو دوبارہ فتنہ و فساد کا دروازہ کھل جائے گا۔ شور و شر پیدا ہوگا۔ جنگ و جدل کی آگ بھڑک اٹھے گی۔

اب وہ ایک عرضداشت کے ساتھ بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرضداشت پیش کرتے ہوئے کہا کہ رحمت و عاطفت بادشاہی فطرت عالی اور عطوفت والا کا تقاضا یہی ہے کہ بڑے سے بڑے گناہوں کو معاف کر دیا جائے۔ مگر دوراندیشی اور عاقبت بینی کا تقاضا یہ ہے کہ ستمگار مردم آزار، بدعہد اور قاتل کو اس کے اعمال کی سزا ضرور دی جائے تاکہ اس کی طبعی شرپسندی سے خلق خدا محفوظ رہے اور ان کی عافیت پر کسی قسم کی آفت نہ آئے۔ دوراندیشی اور دور رسی یہ ہے کہ ایک آدمی کی آسائش کو خلق خدا کی آسائش پر ترجیح نہ دی جائے۔ شکستہ دل اور آزردہ حال لوگوں کے اطمینان کے لیے ایک ظالم کو مٹا دینا ہی عدالت ہے۔ خاص کر جب ایسا کرنے سے ہزاروں کام خود بخود درجہ بہ اصلاح ہو جائیں گے۔ اس صورت حال میں رحم سے کام لینا عین بے انصافی ہوگی۔ میرزا کامران نے کیا کچھ نہیں کیا۔ اس نے بھائی چارے کو بالائے طاق رکھا۔ قدم قدم پر کفران نعمت کیا اور ہر موقع پر فتنہ و فساد برپا کیا۔ اس کے کردہ گناہوں کو اب نا کردہ خیال نہیں کیا جا سکتا۔ معاملہ اب رحم کی حد سے گزر چکا ہے۔ اس کو ملک عدم کا مسافر بنائیں تاکہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہزار ہا قسم کی بلاؤں سے نجات پائے اور اس کا نامہ اعمال بھی زیادہ سیاہ نہ ہو۔ ایک مدت مدید گزر چکی ہے کہ اس شریر اور فتنہ سرشت کے اثر سے رعایا کا مال و اسباب غارت ہوا۔ جانیں تلف ہوئیں۔ عزت و ناموس لٹا۔ اس لیے اب وقت ہے کہ اس موذی کے ہاتھوں سے خلق کو نجات دلائی جائے۔

ہمایوں بڑا عالی فطرت تھا۔ اس نے بڑے تحمل سے ان سب امیروں کی معروضات سنیں۔ وہ ابھی اس معاملے میں کسی قسم کا اقدام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اگر ایسے بشر کو اللہ تعالیٰ نے باقی رکھا ہے تو کسی خاص غرض اور مصلحت کے لیے ہوگا۔ اس کے علاوہ اسے اپنے باپ کی وصیت اچھی طرح یاد تھی اس لیے وہ کامران کو مارنا نہیں چاہتا تھا۔ امرا نے یہ دیکھ کر پھر جرأت سے کام لیا اور کہا کہ اس سفاک اور بے باک کی وجہ سے طرح طرح کے فتنے پیدا ہوئے۔ ناحق خون ریزی ہوئی۔ ہمیں بڑے بڑے صدمے اٹھانے پڑے۔ چنانچہ امرا اور علما کی ایک جماعت نے اس بارے میں ایک محضر تیار کر کے بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ بادشاہ نے یہی محضر میرزا کامران کے پاس بھیج دیا۔ جب اس نے اسے مطالعہ کیا تو یہ لکھا کہ جن لوگوں نے میرے قتل پر فتویٰ دیا ہے انھیں لوگوں کی بدولت مجھے آج یہ دن دیکھنا نصیب ہوا ہے۔

ہمایوں عجب کشمکش و پیچ میں مبتلا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ کافی غور و خوض کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ کامران کو ظاہری بصارت سے محروم کر دیا جائے۔ اس طرح ایک اٹھتا ہوا فتنہ دب گیا۔ امیروں کی تسلی ہو گئی۔ علما اس کامیابی پر بڑے نازاں تھے کہ اب فتنہ و فساد کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے۔

کامران کی بصارت زائل کرنے سے ہمایوں کی غرض و غایت یہ تھی کہ بادشاہت کے لیے اس کی ساری سرگرمیاں ختم ہو جائیں کیونکہ اندھا بادشاہ نہیں ہو سکتا اور اگر وہ کبھی تخت و تاج کا دعویٰ بھی کرے تو اسے عوام کی تائید حاصل نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ اسلام میں اکثر شہزادوں کو

مشاہدے کے واقعات بکثرت ملتے ہیں۔

اس فیصلے کا اعلان ہوا۔ بادشاہ نے پانچ آدمی اس کام کے لیے نامزد کئے۔ ان میں ایک جوہر آفتابچی بھی تھا۔ جوہر آفتابچی نے ہمایوں کے زمانۂ حکومت کی یادداشتیں تذکرۃ الواقعات کی صورت میں مرتب کی ہیں۔ چونکہ وہ اس مہم میں خود بھی شریک تھا۔ اس واسطے اس نے یہ واقعہ زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ہم اسی سے لے کر اس واقعہ کو یہاں درج کرتے ہیں۔

رمضان ۹۶۰ھ کا واقعہ ہے۔ عصر کی نماز کا وقت تھا جوہر کامران کے خیمے میں آیا۔ میرزا کامران نے اس سے مصلیٰ طلب کیا۔ جوہر نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ میرزا نے اسی مصلیٰ پر مغرب کی نماز بھی پڑھی۔ نماز سے فارغ ہو کر اس نے جوہر سے پوچھا۔ تمہارا نام کیا ہے۔ تم کتنے عرصے سے بادشاہ کی خدمت میں ہو؟ اس نے جواب دیا۔ میرا نام جوہر ہے اور میں بیس برس سے بادشاہ کا نوکر ہوں۔ کامران نے کہا تم تو پرانے نوکر ہو۔ کبھی تم نے مرزا عسکری کی نوکری بھی کی ہے؟ جوہر نے نفی میں جواب دیا۔ اس کے بعد میرزا نے کہا کہ میرے رمضان کے کچھ روزے قضا ہو گئے ہیں۔ کیا تو میرے عوض روزے رکھے گا؟ جوہر نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا کہ آپ کو خود قضا روزے رکھنے کا بہت وقت مل جائے گا۔ آپ ایسی بے دلی کی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ دل کو مضبوط رکھیں۔ حوصلہ نہ ہاریں۔ پھر کامران نے پوچھا۔ کیا تم جانتے ہو کہ میری گردن ماریں گے؟ جوہر نے جواب دیا:

رموز مملکت خویش خسرواں دانند

البتہ میں اپنی عقل سے یہ جانتا ہوں کہ کوئی شخص اپنے بازو کو اپنے ہاتھ سے نہیں توڑتا۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں ہمایوں بادشاہ بڑا بامروت ہے۔

یہ رات اسی قسم کی باتوں میں بسر ہو گئی۔ دوسرے دن بادشاہ نے حکم دیا کہ میرزا کی آنکھوں میں نشتر لگایا جائے۔ جب نوکروں کے پاس یہ حکم پہنچا تو سوال پیدا ہوا کہ یہ دردناک خدمت کون انجام دے۔ کوئی بھی یہ کام کرنے کے لیے آمادہ نہ تھا۔ سلطان علی بخشی نے علی دوست ایشک آقاسی سے کہا کہ تو نشتر لگا۔ علی دوست نے اسے جواب دیا کہ تیری احتیاط کی حالت تو یہ ہے کہ تو اگر کسی کو ایک خشابرخی دے سکتا ہے تو پہلے بادشاہ سے پوچھ لیتا ہے۔ میں تیرے کہنے سے یہ کام کیوں کروں۔ بادشاہ نے اگر پوچھا کہ تم نے میرے بھائی کو کس کے حکم سے اندھا کیا تو میں اسے کیا جواب دوں گا۔ سلطان علی بخشی نے بھی جوہر سے کہا کہ یہ کام مجھ سے نہ ہوگا۔

جوہر نے یہ دیکھ کر کہا۔ آؤ۔ بادشاہ کے پاس چلیں اس سے پوچھ آئیں۔ چنانچہ جوہر، علی دوست، سلطان علی بخشی، غلام علی شش انگشت بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ علی دوست نے ترکی میں کہا۔ کوئی آدمی نشتر لگانا نہیں چاہتا۔ بادشاہ بہت برافروختہ ہوا۔ اسے ترکی میں جواب دیا۔ اگر کوئی اور یہ کام نہیں کرتا تو تجھے کیا ہوا ہے۔ تو خود کیوں نہیں کرتا۔

بادشاہ کا یہ حکم سن کر علی دوست میرزا کامران کے پاس آیا اور معذرت پیش کرتے ہوئے کہا۔ اگر میں یہ بات اپنی طرف سے بنا کر کہوں تو اللہ تعالیٰ میری زبان گدی سے کھینچ لے۔ یہ بادشاہ کا حکم ہے ہم مجبور ہیں کہ اسے مانیں اور تمہاری آنکھوں میں نشتر لگائیں۔

میرزا کامران نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔ مجھے مار ہی کیوں نہیں ڈالتے۔ علی دوست نے کہا کہ بادشاہ کے حکم کے بغیر آپ کو کون مار سکتا ہے۔ اس کے بعد میرزا کامران بڑے سکون اور اطمینان کے ساتھ نشتر لگوانے کے لیے تیار ہوا۔ اس کی چال میں بڑا وقار تھا۔ اس کی نقل و حرکت میں متانت پائی جاتی تھی۔ وہ خیمے کے باہر آیا۔ علی دوست کے ہاتھ میں رومال تھا۔ اس نے اس کا گیند بنایا۔ میرزا زمین پر لیٹ گیا۔ گیند اس کے گلے میں ٹھونس دیا گیا۔ چار آدمیوں نے میرزا کے بازو اور ٹانگیں سنبھالیں۔ دو آدمیوں نے آنکھوں میں نشتر لگانا شروع کیا۔ اس کی آنکھو

میں کم و بیش پچاس نشتر لگائے گئے۔ مرزا نے اس تکلیف کو بڑے تحمل سے برداشت کیا۔ اس کی زبان سے اُف تک نہ نکلی۔ البتہ جس شخص جو اس کے دائیں پہ بیٹھا ہوا تھا اس نے جب اس کے گھٹنے کو زور سے دبایا تو مرزا نے فقط اتنا کہا، میں یہ جانتا ہوں کہ جو کچھ تمہارا کام ہے وہ پورا ہو، مگر جانے کیوں تم مجھ پر ظلم کرتے ہو۔ پھر ایک مجبور انسان پر یہ دباؤ اور تشدد کیوں؟ اس سارے عرصے میں اس نے اس بات کے سوا کوئی لفظ زبان سے نہ نکالا۔ مگر جب اس کی آنکھوں میں لیموں نچوڑ کر نمک چھڑکا گیا تو وہ شدتِ درد سے تڑپ اٹھا اور بے اختیار ہو کر بولا:۔

"یا الٰہی۔ یا الٰہی۔ میں نے اس دنیا میں جتنے بُرے کام کیے تھے۔ ان کا خمیازہ میں نے اسی دنیا میں بھگت لیا ہے۔ اب عاقبت میں مجھ پر رحم کرنا۔"

معاصرین میں سے بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ اس موقع پر کامران نے ایک شعر لکھا جس کے لفظ "نیشتر" سے اس کے نابینا ہونے کی تاریخ سنہ ۹۶۰ھ نکلتی ہے۔ یہ شعر تو مل نہیں سکا البتہ ایک اور شاعر نے اس واقعہ کی تاریخ "چشم پوشید ز بیداد سپہر" سے نکالی ہے۔

جب یہ سب کچھ ہو چکا تو مرزا کو گھوڑے پر سوار کیا گیا۔ وہ شاہی لشکر کے عقب میں روانہ ہوا۔ تھوڑی دور جا کر لشکر نے پڑاؤ کیا۔ میرزا کامران کے لیے جو جگہ مقرر کی گئی تھی وہ ذرا زیادہ گرم تھی۔ چنانچہ وہ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہوا اور لشکرگاہ کی طرف روانہ ہوا۔ اسے میرزا قاسم کے خیمے میں اتارا گیا۔ اس وقت کامران بہت بے چین تھا۔ ہوا بھی گرم تھی اور ویسے بھی مرزا کے زخم تازہ تھے۔ جوہر میرزا کی بے کلی نہ دیکھ سکا۔ وہ اپنے ڈیرے پر آیا اور وہاں مغموم ہو کر بیٹھ گیا۔ بادشاہ کی نظر اس پر پڑی۔ اس سے سارا ماجرا دریافت کیا جسے سن کر ہمایوں پر رقت طاری ہو گئی۔

میرزا کامران نے اسی روز منعم خاں کے پاس آدمی بھیجا کہ وہ کسی طرح بیگ ملوک کو اس کی خدمت کے لیے بھیج دے۔ یہ خوش عہد میرزا کامران کا خاص آدمی تھا اور اس پر میرزا کی خاص توجہ تھی۔ جب وہ آیا تو میرزا نے بیگ ملوک کا ہاتھ اپنی اندھی آنکھوں پر رکھ کر کہا ؎

ہر چند کہ چشم سر بہ رخت پردہ کشیدہ است
بیناست چشمے کہ بہ روئے تو دیداست

(گو میری ظاہری آنکھیں جاتی رہی ہیں مگر ابھی بصیرت کی وہ آنکھ باقی ہے جس نے بارہا تیرا چہرہ دیکھا ہے)

دریائے اٹک کے کنارے تک کامران بادشاہ کے ساتھ رہا اور جب وہ وہاں سے کابل کے لیے واپس ہوا تو میرزا نے منعم خاں کو بلا کر کہا، تم جانتے ہو کہ میں کابل میں کس شان و شوکت کے ساتھ رہا ہوں۔ میں نے وہاں بادشاہی کی ہے اور وہاں کے لوگوں کو میرا جاہ و جلال یاد ہے۔ اب میں ان آنکھوں کو لے کر وہاں جاؤں اور وہاں کے لوگوں کو کیا منہ دکھاؤں۔ مجھے مکہ مکرمہ جانے کی اجازت دلوا دو۔

منعم خاں نے ہمایوں سے سارا ماجرا بیان کیا اور میرزا کامران کی درخواست دہرائی۔ ہمایوں اپنے بھائی کی حالت سے واقف تھا وہ جانتا تھا کہ وہ آنکھوں کی بینائی سے محروم ہے۔ حجاز میں اس کا گزر کیسے ہوگا۔ اس لیے وہ اجازت دینے میں متامل تھا۔ وہ دن بھر اس مسئلے پر غور کرتا رہا۔ آخر امیروں کی سفارش پر اس نے میرزا کو اجازت دے دی۔

کامران نے بادشاہ کا شکریہ ادا کیا اور اس سے ملنے کی درخواست کی۔ ہمایوں اس سے ملنے سے گھبراتا تھا۔ آخر اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ خود میرزا کے پاس آئے گا بشرطیکہ وہ اس ملاقات کے موقع پر جزع فزع نہ کرے۔ میرزا نے یہ شرط مان لی۔ ہمایوں اس سے ملنے کے لیے اس کے خیمے میں آیا۔ میرزا مراسم تعظیم و تکریم بجا لایا۔ اور یہ شعر پڑھے ؎

زفقر و شوکت سلطاں نگشت چیزے کم
زالتفات بہ نوبت سرائے دہقانی

کلاہ گوشۂ دہقاں بہ آفتاب رسید
کہ سایہ بر سرش انداخت چوں تو سلطانی

ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد مرزا نے پھر عرض کیا ؎

برجانم از تو ہرچہ رسد جائے منت است
گر ناوک جفاست و گر خنجر ستم

یہ شعار ہی کا لطف تھا یہ فقرہ تھا، جس نے پاس بیٹھوں کے دل میں اتر گئے۔ وہ مرزا کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ جب اسے موقع حاصل ہوا تو اس نے اتنا کہا۔ خدا گواہ ہے میں نے اپنی خوشی سے یہ کام نہیں کیا۔ میں بہت شرمندہ ہوں، کاش مجھ سے پہلے تم میرا یہ حال کرتے۔

مرزا کامران نے جواب میں کچھ کہا۔ سنتعلال خاں نے بڑی نیازمندی سے پوچھا۔ یہ دونوں کون آدمی ہیں؟ اسے حاضرین نے نام بتائے تھے۔ اس نے کہا۔ وہ منصور تم سب کو۔ وہ یہ ہو اگر میں اپنے آپ کو بے گناہ خیال کرتا تو اس وقت جب کہ جہاں پناہ یہاں تشریف فرما ہیں، میں اس بات کا اعلان کرتا ہوں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں ہلاک ہونے کے قابل تھا مگر دوست نے میری جان بخشی کی اور اس کے سبب حجاز مقدس جانے کی اجازت بھی دی۔ اس احسان کے شکریے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ اس نے میری بدی اور بدعہدی پر قلم عفو پھیرا۔

اس کے بعد کامران نے اپنے بیٹے اور بیٹیوں کی سفارش کی۔ بادشاہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ وہ میرے اپنے بچے ہیں میں ان کے ساتھ ہمیشہ نیک سلوک کروں گا۔

اس کے بعد مرزا کو رخصت کیا اور اس کے نوکروں میں سے جو اس کے ساتھ جانا چاہتے تھے انھیں بھی اجازت دی مگر خود غرض دنیا میں جنس وفا نایاب ہے۔ اس کے بیشتر ساتھیوں اور نوکروں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ البتہ اس کی بیوی ماہ چوچک نے آخر دم تک اس کا پورا ساتھ دیا۔ اسے روکنے کی کوشش کی گئی مگر وہ اپنے ارادے پر قائم رہی۔ اور جب وہ جہاز پر سوار ہوئی تو اس کا باپ حسین اغوں اسے روکنے کے لیے وہاں پہنچا مگر وفا پرست ماہ چوچک نے باپ کو جواب دیا کہ تم نے مجھے خاوند کے سپرد اس وقت کیا جب وہ بادشاہ تھا۔ اب تم مجھے اس سے اس لیے جدا کرنا چاہتے ہو کہ وہ تباہ حال اور شکستہ دل ہے۔ ادبار اور نکبت کی گھٹائیں اسے ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ پہلے شاید اسے میری ضرورت نہ ہو۔ لیکن اب اسے قدم قدم پر میری ضرورت ہے۔ اس حالت میں، میں اس کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔ باپ اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ اس کی شوہر پرستی اور وفا کی بڑی تعریف کی اور اسے رخصت کیا۔

کامران تین حج کرنے کے بعد ۱۱۔ ذی الحجہ ۹۶۴ھ کو فوت ہوا۔ ملا قاسم کاہی نے تاریخ وفات کے متعلق مندرجہ ذیل قطعہ لکھا ؎

کامراں آں کہ بادشاہی را
کس نہ بود است ہمچو او در خورد

شد زکابل بہ مکہ و آنجا
جاں بحق داد و تن بہ خاک سپرد

گفت تاریخ او چنیں کاہی
بادشاہ کامراں بہ مکہ بمرد

وثیقی نامی شاعر نے بھی کامران کی تاریخ وفات کہی ہے ؎

شدہ کامران خسرو نامدار — کہ از سلطنت سر بکیواں رساند
مجاور شد اندر حرم چار سال — بکلی وز قید عالم رہاند
ز بعد وقوف حج بیست رمین — باحرام حج جاں بجاناں فشاند
چو در خواب دیشی در آمد شبے — حکایت نمود و دعائے خویشش خواند
بگفت او بہ پرسند ار فوت ما
بگو شاہ مرحوم در مکہ ماند
۹۶۴ھ

(بدایونی صہ ۴۴۳)

ابوالقاسم شوکتی

کامران کا بیٹا ابوالقاسم شوکتی بھی شاعر، ادیب اور استقلال کا پیکر تھا۔ اکبر نے جب اتگہ خیل کے نرغے میں پھنس کر بیرم خاں کے ہاتھ سے اختیارات چھیننا چاہے اور آگرہ سے دہلی کی جانب روانہ ہوا تو ماہم انگہ نے اس خوف سے کہ کہیں بیرم خاں، سے اکبر کے خلاف تخت پر نہ بٹھا دے۔ ابوالقاسم کو گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کر دیا اور ۹۷۲ھ میں جب خان زمان علی قلی خاں سیستانی اور اس کے بھائی بہادر خاں سیستانی نے جون پور میں علم بغاوت بلند کیا اور اس کے اگلے ہی سال اکبر کے سوتیلے بھائی میرزا حکیم نے بھی سرکشی شروع کی تو اکبر کو ابوالقاسم کی طرف سے پھر خطرہ پیدا ہوا۔ اس نے امیروں کے مشورہ سے اس خار کو ہمیشہ کے لیے راستہ سے دور کرنے کا حکم دیا۔ امیر کے کچھ اہم راجپوتوں ہی سے غالباً راجہ جگن داس نے گوالیار جا کر اسے ٹھکانے لگایا۔ جب جلاد اس کا سر قلم کرنے لگا تو اس نے فی البدیہہ یہ شعر کہا ؎

فلک بہ کشتن من ایں قدر شتاب مکن
چو خواہم از ستمت مرد اضطراب مکن

ایک خانہ زاد شاعر نے اس کی بڑی عجیب غریب تاریخ کہی ہے۔

نہال بوستان کامرانی — فتاد از صرصر غم ناگہانی
ابوالقاسم کہ گشت از کشتن او — بسان غنچہ خون جان جہانی
رقم زد دخشی تاریخ قتلش — نماند از کامراں نام و نشانی
۹۷۲ھ

ایک اور شاعر نے اس کی تاریخ یوں کہی ہے ؎

خسرو گلرخاں ابوالقاسم — آنکہ مہ از رخش منور شد
رفت و از قتلش دل خلقاں — پارہ پارہ چو ذرہ احمر شد
سال تاریخش از خرد جستم — خردم سوئے باغ رہبر شد
بلبل ناگہاں با فغاں گفت

شہریار

جہانگیر کے آخری ایام حکومت تھے۔ اس کی صحت روز بروز خراب ہو رہی تھی۔ جانشینی کے لیے کوئی خاص قاعدہ مقرر نہ تھا اس لیے سلطنت کے خیر خواہوں کو تشویش لاحق تھی۔ جہانگیر کا سب سے بڑا بیٹا خسرو مر چکا تھا، پرویز بھی اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ میدان میں دو امیدوار موجود تھے۔ شاہ جہان اور شہریار ——— شہریار اہل دربار میں چنداں ہر دلعزیز نہ تھا مگر نور جہاں کی بیٹی لاڈلی بیگم جو شیر افگن سے تھی اس سے بیاہی ہوئی تھی۔ اس لیے نور جہاں کی دلی خواہش تھی کہ ہندوستان کا تاج اس کے سر پر رکھا جائے۔ شاہ جہاں آصف خاں کی لڑکی ارجمند بانو سے بیاہا ہوا تھا اور اپنے اندر وہ تمام صلاحیتیں رکھتا تھا جو ایک اچھے بادشاہ میں ہونی چاہئیں۔ وہ مدبر، جفاکش، رعیت نواز اور عادت کا ہمدرد ہونے کے علاوہ ایک اچھا سپاہی اور بڑے اونچے درجے کا سپہ سالار بھی تھا۔ وہ درباریوں میں ہر دلعزیز تھا۔ نور جہاں نے ہر چند کوشش کی کہ وہ اہل دربار اور رعایا کی نظروں سے گر جائے مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ نور جہاں کی درازدستیوں سے تنگ آکر بغاوت پر آمادہ ہوا اور کھلے بندوں شاہی افواج سے لڑتا رہا۔ بعض امیروں نے بادشاہ کے حکم سے اس کا مقابلہ بھی کیا مگر شاہجہان سے جو عقیدت انھیں تھی وہ بدستور قائم رہی۔ اس میں کسی قسم کا فرق نہ آیا۔ وہ اب بھی رعایا اور دربار کی آنکھوں کا تارا بنا رہا۔

شہریار نہ تو رعایا میں ہردلعزیز تھا نہ درباری طبقہ اسے پسند کرتا تھا۔ وہ ناشدنی کے لقب سے مشہور تھا اور بعض اوقات ایسی حرکتیں بھی کر جاتا تھا جو شاہی وقار کے منافی ہوتی تھیں۔ امرا کا ایک طبقہ محض نور جہاں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اس کی وفاداری کا زبانی دم بھرتا تھا۔

۱۶۲۷ء کی بہار کا موسم تھا کہ جہانگیر عازم کشمیر ہوا۔ اس کے ساتھ نور جہاں، آصف خاں، شہریار اور مرحوم شہزادہ خسرو کا بیٹا داور بخش عرف بلاقی بھی تھا۔ شاہجہان دکن میں تھا۔ جہانگیر کھوئی ہوئی صحت کی تلاش میں کشمیر پہنچا مگر جنت ارضی کی آب و ہوا اس کی صحت کی بحالی میں کسی طرح بھی مفید ثابت نہ ہوئی۔ وہ دمہ کا مریض تھا۔ مرض نے یہاں پہنچ کر شدت اختیار کر لی۔ نقاہت بڑھتی گئی۔ جسمانی کمزوری نے ڈیرے ڈال دیئے۔ بھوک ختم ہو گئی اور خیر خواہان سلطنت کو بادشاہ کا انجام سامنے نظر آنے لگا۔ اب بادشاہ گھوڑے کی بجائے پالکی میں سوار ہو کر باہر نکلتا۔

انھی ایام میں شہریار پر داءالثعلب کا شدید حملہ ہوا۔ اس کے سر، داڑھی، مونچھوں، بھوؤں اور پلکوں کے بال گر گئے۔ اطبا نے اس کا علاج بڑی احتیاط سے کیا مگر اسے کوئی افاقہ نہ ہوا۔ آخر انھوں نے مشورہ دیا کہ وہ کشمیر جیسے سرد مقام کو چھوڑ کر میدانی علاقے میں چلا جائے چنانچہ وہ لاہور چلا آیا۔

شہریار کے کشمیر سے چلے آنے کے کچھ عرصہ بعد بادشاہ بھی لاہور کے ارادے سے چل کھڑا ہوا۔ جب وہ بہرام گلہ کے مقام پر پہنچا تو اسے شکار کی سوجھی۔ یہ اس کی پرانی شکارگاہ تھی اور وہ کشمیر سے آتے جاتے یہاں شکار کھیلا کرتا تھا۔ یہاں ایک حادثہ کی بنا پر اس کی صحت اور بھی بگڑ گئی۔ اس نے اس مقام کو خیرباد کہا اور دوسرے دن تھنہ پہنچا۔ یہاں سے چل کر وہ راجوری آیا جہاں سے وہ چنگس میں خیمہ زن ہوا۔ یہاں اس کی حالت بے حد نازک ہو گئی۔ رات بڑی بے قراری سے گزری۔ ۲۷ صفر ۱۰۳۷ھ مطابق ۲۸ اکتوبر ۱۶۲۷ء کو اس نے اپنی جان

جاں آفریں کے سپرد کر دی۔

بادشاہ کی وفات نے ایک دفعہ پھر جانشینی کے جھگڑے کو تازہ کر دیا۔ اب ہر جانب سے کوشش شروع ہوئی۔ نورجہاں نے شہریار کو طلب کیا۔ انھیں اس حادثے کی اطلاع دی۔ مگر آصف خاں نے اندر ہی اندر کچھ ایسی چال چلی کہ بہت کم با اثر امیر نورجہاں تک پہنچے۔ اس نے اس کے ساتھ یہ کوشش بھی کہ نورجہاں کی حیثیت ایک نظر بندی سی ہو کر رہ گئی۔ آصف خاں نے اپنے ایک وفادار ہرکارے بنارسی نامی کو اپنی انگوٹھی دے کر شاہجہاں کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ فوراً آگرہ پہنچ کر ہندوستان کے تخت پر قبضہ کرے۔ درمیانی وقفے کے لیے اس نے خسرو کے بیٹے داور بخش کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

داور بخش کو یقین نہ آتا تھا کہ آصف خاں شاہجہاں کو چھوڑ کر اس کا ساتھ دے گا۔ مگر جہاندیدہ آصف خاں نے اسے اس طرح سبز باغ دکھائے اور قسمیں کھا کھا کر اپنی وفا کا یقین دلایا کہ داور بخش قربانی کا بکرا بننے پر راضی ہو گیا۔ ارادت خاں نے بھی آصف خاں کے ساتھ مل کر نئے شہنشاہ کو مبارک باد دی۔ چنانچہ جمعہ کے دن اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ اس طرح داور بخش پوری طرح آصف خاں کے پنجہ میں آگیا۔

شاہجہاں کے چاروں بیٹے نورجہاں کی حراست میں تھے۔ کیونکہ جب شاہجہاں اور جہانگیر کے درمیان صلح صفائی ہوئی تھی تو اسے اپنی وفا کا یقین دلانے کے لیے اپنے چاروں بیٹے یرغمال کے طور پر بادشاہ کے پاس چھوڑنے پڑے تھے۔ آصف خاں جانتا تھا کہ اگر یہ شہزادے اسی طرح نورجہاں کے پاس رہے تو وہ انھیں کسی وقت ختم کر سکتی ہے۔ اس لیے انھیں اس کے پنجے سے نکالنا بڑا ضروری ہے۔ چنانچہ شہریار کو توڑنے کے ساتھ ساتھ اس نے چاروں شہزادوں کو نورجہاں کے پنجے سے چھڑا لیا۔

یہ سب کچھ ایک ہی دن میں ہوا۔ ان حالات سے نپٹنے کے بعد دوسرے دن آصف خاں بھمبر پہنچا۔ جہاں بادشاہ کی تجہیز و تکفین کی رسومات ادا ہوئیں۔ نماز جنازہ پڑھی گئی۔ نعش تابوت میں رکھ کر لاہور روانہ کی گئی تاکہ اسے باغ دلکشا میں دفن کیا جائے۔ یہ باغ نورجہاں کا تھا۔ بادشاہ کی خواہش تھی کہ اسے وہاں دفن کیا جائے چنانچہ اس کی یہ خواہش پوری کی گئی۔

شہریار لاہور میں تھا۔ نورجہاں نے کسی نہ کسی طرح اسے سب واقعات کی اطلاع پہنچائی۔ حالانکہ آصف خاں نے یہ بندوبست کر رکھا تھا کہ نورجہاں کا تعلق بیرونی دنیا سے ٹوٹ جائے تاکہ جو کچھ یہاں ہو رہا ہے۔ اس سے شہریار اور اس کے ساتھی بالکل بے خبر رہیں اور وہ چپ چاپ لاہور پر قبضہ کر لے۔ مگر نورجہاں نے اس معاملے میں اسے شکست دی۔ اس نے نہ صرف شہریار کو ساری اطلاعات بہم پہنچائیں بلکہ اسے حکم دیا کہ وہ جس قدر فوج اکٹھی کر سکے کرے۔ فوراً راوی پار کرکے اس تک پہنچے۔ شاہی فوج کم ہے وہ بڑی آسانی سے اس پر قابو پا سکتا ہے۔

شہریار اس پیغام سے گھبرا سا گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مگر دلی بیگم نے اس کی ڈھارس بندھائی اور اسے جرأت دلا کر مجبور کیا کہ وہ اپنی بادشاہت کا اعلان کرے۔ اس نے شاہی خزانہ اور قلعہ لاہور پر قبضہ کیا۔ اور ایک ہفتہ کے اندر اندر ستر لاکھ روپیہ سپاہیوں اور سرداروں میں بانٹ دیا۔ اس طرح اپنے گرد بہت بڑی فوج جمع کر لی۔ دولت کی اس بے پناہ بارش نے شاہی خاندان کے بعض افراد کو بھی شہریار کے جھنڈے تلے لا کھڑا کیا۔ ان میں شہزادہ دانیال کا بیٹا بایسنغر بھی تھا۔

شہریار اپنا لاؤ لشکر لے کر لاہور سے باہر نکلا۔ دریائے راوی عبور کیا اور مورچے سنبھال لیے۔ اس وقت اس کے ساتھ دو تین

[illegible] نے شہریار کو جو شہنشاہ کے سپرد کی گئی تھی اسے آصف خاں کی جیل میں بند کر سکے آصف خاں کو ایک بیٹے عزت کی نظر سے دیکھتی تھی۔ وہ سنے شہنشاہ کو ہر چیز سے کوشش مرتب سے لاہور کی جانب روانہ ہونا چاہا تو اس نے جہاں اس کی فوج سے ایک دن کے فاصلے پر پہنچ گئے۔ بیشتر کے ساتھ زندہ درگزر کر دیا گیا مگر وہ آصف خاں کے ایک محل میں تاب نہ لا سکے۔ وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے اور وہ لاہور میں قلعہ بند ہو گیا۔ آصف خاں نے قلعہ کا محاصرہ کیا ——— ماموں کی فوج کو دیکھ کر شہریار کی فوج میں سے آصف خاں سے ساز باز شروع کی اور ایک ہی دن میں حالات یکسر بدل گئے۔

آصف خاں قلعہ میں داخل ہوا شہریار اپنے ساتھیوں کی بے وفائی سے اتنا سراسیمہ اور پریشان ہوا کہ وہ تخت سے بھاگنے کی بجائے زنان خانے میں جا چھپا جہاں سے اسے گرفتار کر لیا گیا اور چند دن کے بعد اس کی آنکھیں نکال دی گئیں۔ سبحان رائے بھنڈاری کا بیان ہے کہ جب اس کی آنکھوں کی پتلیاں کاٹی جا رہی تھیں اور وہ درد سے تڑپ رہا تھا۔ اس نے اپنے اندھا ہونے کی تاریخ یوں نظم کی ہے

ز نرگس گلاب ارچہ نتواں کشید — کشیدند از نرگس من گلاب
اگر از تو پرسند تاریخ من — بگو کور شد دیدۂ آفتاب

۱۰۳۷ھ

شہریار کو مورخ ناشدنی کہتے ہیں یعنی وہ نالائق اور ناکارہ تھا مگر جب اس پر مصیبت پڑی تو اس نے اپنے استقلال کی یہ عظیم الشان مثال ہے۔ کہ ان ابیات کو قائم رکھا اور خندہ پیشانی سے اس کا مقابلہ کرتے ہوئے اس واقعہ کو منظوم کر کے ہمیشہ کے لیے جریدۂ روزگار پر ثبت کر دیا سچ ہے اس قسم کی مصیبتوں سے انسانیت نکھرتی ہے اور دوسروں کے لیے جرأت اندوزی کا سرمایہ بن جاتی ہے۔

شاہ عالم ثانی

خاندان تیموریہ میں آنکھیں نکالنے اور اس مصیبت کے وقت استقلال اور تحمل کا سر رشتہ ہاتھ سے نہ چھوڑنے کی چوتھی زبردست مثال شاہ عالم کی ہے۔

شہزادہ عالی گہر جو بعد میں شاہ عالم کے لقب سے تیموری شوکت و جلال کے مزار کا مجاور رہا تاریخ ہندوستان میں کچھ ایسی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کی بادشاہت کے بارے میں کسی ظریف کا مقولہ ہے کہ "بادشاہی شاہ عالم از دلی تا پالم"۔ وہ رحم دل، تحمل مزاج اور صاحب صباحت تھا مصیبت کے وقت خاص طور پر استقلال کا مظاہرہ کرتا۔ مگر جواں مردی اور شجاعت سے عاری تھا۔ جن کی ان صفات میں شہرت تھی۔ رحم اور مروت کی یہ حالت تھی کہ کوئی شخص خواہ کتنی ہی بے وفائی اور بد وفا کا اظہار کرتا، جب وہ اس کے سامنے آتا تو اس کی آنکھیں خود بخود جھک جاتیں اور وہ اس کے تمام گناہوں پر خط تنسیخ کھینچ دیتا۔ اس کے بعد وہ اس کے بارے میں سب کچھ بھول جاتا جس کی وجہ سے سلطنت کا نظم و نسق بگڑتا ہی چلا گیا۔ شاہ عالم بڑا شاکر و صابر تھا۔ ہر حال میں اللہ کا شکر بجا لاتا رہتا۔ مصائب و آلام کے طوفانوں میں وہ کبھی حوصلہ نہ ہارتا۔ ہمیشہ بہت بلند رکھتا۔

شاہ عالم اپنے باپ عالمگیر ثانی کے قتل کے بعد ہندوستان کے تخت پر بیٹھا۔ وہ دہلی سے دور بہار میں قسمت آزمائی کر رہا تھا کہ وہیں اس کی بادشاہت کا اعلان ہوا۔ آخر بکسر کی جنگ کے بعد اس کا مستقل قیام الہ آباد میں ہو گیا۔ وہ شجاع الدولہ اور ایسٹ انڈیا کمپنی دونوں کے درمیان

گھرا ہوا تھا۔ وہ اسے جس طرح چاہتے استعمال کرتے۔ دہلی میں نجیب الدولہ امیر الامرا اور شہزادہ جواں بخت بادشاہ کے نائب تھے۔ نجیب الدولہ نے سلطنت کی گرتی ہوئی عمارت کو سہارا دینے کی کوشش کی مگر حالات ایسے بگڑ چکے تھے کہ اس کا سنبھلنا ناممکن تھا۔ مرہٹے پانی پت کی تیسری لڑائی کے بعد شمال کا رخ کرتے ہوئے گھبراتے تھے۔ جاٹ، گوجر اور راجپوت گنگا دوآب میں لوٹ کھسوٹ مچا رہے تھے۔ شجاع الدولہ اپنی سلطنت کی وسعت میں ہمہ تن مصروف تھا۔ اس کا لقب نواب وزیر تھا۔ مگر اسے دہلی سے کسی قسم کا کوئی لگاؤ نہ تھا۔ وہ یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ دہلی کی سلطنت مٹ جائے، وہ صوبہ اودھ کو ایک سلطنت کی صورت دے کر رہے گا۔

ان حوصلہ شکن حالات میں نجیب الدولہ نے آٹھ برس تک بڑی بیدار مغزی، دلیری اور شجاعت سے شمالی ہندوستان میں امن و امان قائم رکھا۔ اس کی زندگی ہی میں مرہٹوں نے اپنے آپ کو درست کر لیا۔ اور ایک مرتبہ پھر وہ ہندوستان گیری کا خواب دیکھنے لگے۔ دکن کی تاخت و تاراج کے بعد انھوں نے شمالی ہندوستان کا رخ کیا۔ نجیب الدولہ نے یہ دیکھ کر کہ دہلی کے حالات خود ابتر ہیں، مسلمان امیر اور دربار کے بڑے بڑے سردار خود غرضی کا شکار ہو کر ایک دوسرے کی گردن کاٹنے پر تلے ہوئے ہیں، ان ناسازگار حالات میں مرہٹوں کا مقابلہ تو کیا ہو سکے گا، بگڑی سلطنت کا بچانا بھی مشکل ہے، اس نے مرہٹوں کے ساتھ صلح کر لی۔ حکومت دہلی نے پیشوا کو اقلیم ہند میں وسیع اختیارات سونپ دیئے اور یہ بھی فیصلہ کیا کہ شاہ عالم، جو الٰہ آباد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظر بند کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہا ہے، دہلی لایا جائے اور اس کی سرپرستی میں ملک کے امن و امان کے لیے کوشش کی جائے۔ چنانچہ مرہٹے اس پر متفق ہو گئے۔

شاہ عالم سے اس سلسلے میں گفت و شنید شروع ہوئی۔ وہ بھی دہلی آنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ مرہٹہ سرداروں کے قول و قسم سے مطمئن ہو کر عازم دہلی ہوا اور بارہ سال کی جلاوطنی کے بعد ۱۷۷۱ء کے آخر میں دہلی پہنچا۔ بڑے زور شور سے اس کا استقبال ہوا۔ اب نجیب الدولہ مر چکا تھا۔ نجف خاں دہلی کے سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ ضابطہ خاں اپنے باپ نجیب الدولہ کا عہدہ لینا چاہتا تھا۔ کوجی ہلکر وائسرائے اندور اس کا بڑا سرپرست تھا۔ ہلکر کا اثر دربار میں بھی تھا۔ اس نے بڑی کوشش کی مگر حالات نے ضابطہ خاں کا ساتھ نہ دیا۔ وہ کبھی تو امیر الامرا ہوتا کبھی فقط ایک معمولی سردار بن کر رہ جاتا۔

دہلی کی حالت دن بدن ابتر ہو رہی تھی۔ بڑی بڑی مہمات کے لیے روپیہ درکار تھا مگر یہاں خزانہ خالی تھا۔ بادشاہ بالکل کنگال تھا یہاں تک کہ جب ۱۷۷۸ء میں اس کی ماں لعل کنور فوت ہوئی تو شاہ عالم کے پاس اتنی رقم بھی نہ تھی کہ وہ اس کا مقبرہ بنوا سکے۔ ان حالات میں نجف خاں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے۔ وہ سلطنت کے ہر حریف سے لڑا۔ مگر جہاں گھر کے اندر دشمن موجود ہوں وہاں ایک آدمی کی کوشش سے کیا ہوتا ہے۔ شاہ عالم ان حالات کو خوب سمجھتا تھا مگر کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ نجف خاں کے مرنے کے بعد حالات نے پھر پلٹا کھایا۔ مرہٹوں کا اثر و رسوخ بہت زیادہ بڑھ گیا، جسے ہر صاحب بصیرت بڑے خوف و ہراس سے دیکھتا تھا۔ سب سے زیادہ خطرہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو تھا۔ مگر وہ کچھ کر نہیں سکتے تھے۔

یہ دیکھ کر غلام قادر روہیلہ جو ضابطہ خاں کا بیٹا تھا، منصور علی خاں خواجہ سرا کی وساطت سے بادشاہ کے حضور میں پیش ہوا۔ اس کے ساتھ مغل فوج کا سردار اسماعیل بیگ بھی تھا۔ یہ دونوں مادھوجی سندھیا کے خلاف ہاتھ پاؤں مار رہے تھے، سندھیا کا اقتدار دربار پر چھایا ہوا تھا۔ بادشاہ ایک طرف سندھیا سے امداد طلب کر رہا تھا، دوسری طرف وہ غلام قادر روہیلہ اور اسمٰعیل بیگ کو بھی ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ سندھیا کی فوجیں ادھر ادھر منتشر تھیں۔ بیگم شمرو جو اس وقت دہلی میں تھی اور جس کے ہوتے ہوئے خطرات لال قلعے سے دور ہی دور رہتے تھے، حالات سے مایوس ہو کر اپنی ریاست سردھنا میں چلی گئی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ مادھوجی سندھیا متھرا میں ہوتے ہوئے دہلی کی مہم میں کیوں شریک نہیں ہوتا اور بادشاہ کی امداد کے لیے خود کیوں نہیں آتا، اس میں کچھ کالا کالا ضرور ہے۔

بگڑ شہر کے جانے کے بعد فقط بہت سادہ گوسائیں بادشاہ کے ساتھ رہ گیا تھا۔ وہ پوری ہمت اور جرأت سے بادشاہ کے مفاد کا دفاع کر رہا تھا۔ مگر مسلمان سرداروں نے اسے دھمکیاں دے دے کر بادشاہ سے علیحدہ کر دیا۔ ان میں سب سے نمایاں کام منصور علی خاں خواجہ سرا نے کیا۔

جب اسمٰعیل بیگ اور غلام قادر بادشاہ کے حضور پیش ہوئے تو کورنش اور تسلیمات کے بعد دونوں نے عرض کیا کہ ہم دونوں جو کام کر رہے ہیں وہ جہاں پناہ کی خیر خواہی کے لیے ہے۔ بادشاہ سب کچھ سمجھتا تھا اور اپنی مجبوری اور معذوری سے بھی واقف تھا۔ مگر اس نے دونوں کو خلعت عطا کئے۔ غلام قادر کی امیر الامرائی کا اعلان کیا۔ ادھر ہی سندھیا اپنے عہدے سے موقوف کیا گیا اور اسمٰعیل بیگ تمام افواج کا سپہ سالار مقرر ہوا۔

غلام قادر روہیلہ نے کچھ دنوں بعد بادشاہ سے کہا کہ ہماری سپاہ کا ارادہ ہے کہ وہ متھرا پر حملہ کر کے مرہٹوں کو شمالی ہندوستان سے بھگا دے۔ جتنے امیر وہاں موجود تھے سب نے تائید کی۔ مگر بتیس داس خزانچی نے یہ عذر پیش کیا کہ خزانہ خالی ہے فوج کے مصارف کون برداشت کرے گا؟ غلام قادر نے خزانچی کو بُرا بھلا کہا۔ وہ مارے غصے کے بیتاب ہو گیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ شاہ عالم نے ایک خط مادھوجی سندھیا کو لکھا تھا کہ وہ اس کی امداد کے لیے آئے۔ یہ خط غلام قادر کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس نے خط نکالا اور بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ دونوں نے مکار کیا۔ غلام قادر نے اسی وقت حکم دیا کہ شاہی گارد فوراً ہتھیار ڈال دے۔ اس نے شاہ عالم کو حراست میں لے لیا اور اسے قید کر کے سلیم گڑھ بھجوا دیا۔

اس سے فارغ ہو کر اس نے ایک تیموری شہزادے کو قید سے نکالا اور اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ سب امیروں اور سرداروں کو حکم دیا کہ وہ اس کی بادشاہت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے ہاتھ پر بیعت کریں۔

غلام قادر نے تین دن تک بادشاہ کو بے آب و دانہ رکھا۔ اور باقاعدہ قصر لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ گو اسمٰعیل بیگ بھی برابر کا شریک تھا اس واسطے پہلے اسے ٹالا اور کہا کہ حالات کو قابو میں رکھنے کے لیے تمہارا فوج میں ہونا ضروری ہے۔ وہ اس چکمے میں آ گیا مگر لشکر میں پہنچ کر اپنی اس حماقت پر بہت پچھتایا۔ اس نے اتنا ضرور کیا کہ شہر کے دولت مند اہل کاروں کو بلا کر کہہ دیا کہ تم ہوشیار رہنا۔ اپنی حفاظت کا بندوبست رکھنا۔ ساتھ ہی اپنے سپاہیوں اور نائبوں کو یہ حکم بھی دیا کہ اگر روہیلے شہر کو لوٹیں تو تم بھی خوب لوٹو۔

غلام قادر نے سب سے اول نئے بادشاہ کو حکم دیا کہ اپنی تمام بیگمات سے زیورات، جواہرات اور قیمتی سامان لے لو۔ اس نے حکم کی تعمیل کی۔ جب یہ سامان جمع ہو گیا تو روہیلے نے اس پر قبضہ کر لیا۔

یہاں سے فارغ ہو کر اس نے شاہ عالم پر دباؤ ڈالا کہ وہ بتلائے اس نے دولت کہاں چھپا رکھی ہے اور کہاں کہاں دفینے موجود ہیں۔ شاہ عالم نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اب اس پر سختی شروع ہوئی۔ کوئی ایسا ظلم و ستم نہ تھا جو اس بوڑھے بادشاہ اور اس کی اولاد پر نہ توڑا گیا ہو۔ شروع شروع میں اس نے نئے بادشاہ بیدار بخت سے اسے خوب پٹوایا۔ ۲۰ جولائی ۱۷۸۸ء کو شاہی خاندان کی بیگمات کو پٹوانا شروع کیا۔ ان کے جسم پر نیل پڑ گئے۔ ان کے گال تھپڑوں سے لال ہو گئے۔ جب ان کو پیٹا جاتا تو سارا محل ان کی دردناک چیخوں سے گونج اٹھتا۔

اس دوران میں کبھی کبھی روہیلے کو خیال آتا کہ کہیں اسمٰعیل ان کی مدد کے لیے نہ آ دھمکے۔ اس لیے اس کا منہ بند کرنے اور اسے روکنے کے لیے ۱۳ جولائی کو پانچ لاکھ روپے اس کے پاس بھیج دیئے۔ جس پر اس نے احتجاج کیا۔ چند روز بعد اس نے مزید سات لاکھ روپیہ بھیجا۔

یکم اگست کو پھر بادشاہ پر سختی شروع ہوئی کہ وہ دفینے اور خزانے بتلائے۔ مگر اسے پتہ ہوتا تو وہ بتاتا۔ جب سختی حد سے بڑھ گئی تو

بلکہ بادشاہ نے کہا: "عالم! خزانہ کہاں ہے؟ کیا میرے پیٹ میں رکھا ہے۔ اگر وہاں ہے تو اسے چیر کر نکال لے۔" غلام قادر نے کہا "وقت آئے گا تو ایسا بھی کیا جائے گا۔"

شاہ عالم سے مایوس ہو کر اس نے بڑی بوڑھی بیگمات پر تشدد توڑنا شروع کیا۔ ان سب میں ملکہ زمانی اور ممتاز محل امتیازی حیثیت رکھتی تھیں۔ وہ شہر میں رہتی تھیں۔ جو کچھ ان کے پاس تھا وہ لوٹ لیا گیا۔ مزید مال و دولت بتانے کے لیے ان پر سختیاں کی گئیں۔

جب وہ ہر طرف سے مایوس ہو گیا تو اس نے تخت کو آگ لگا کر سارا سونا اور چاندی اس میں سے نکال لیا۔ محلات کے فرش اکھاڑے۔ اس خیال سے کہ شاید خزانہ ان کے نیچے دفن ہو۔ تین دن تک قلعہ میں یہی کام ہوتا رہا۔

۱۰ اگست ۱۷۸۸ء کو دوبارہ بادشاہ طلب کیا گیا۔ غلام قادر دیوان خاص میں بیٹھا ہوا تھا۔ بادشاہ اس کے حضور میں پیش ہوا۔ غلام قادر روہیلے کے ساتھ یعقوب علی خاں اور چار پانچ روہیلے پٹھان اور بھی تھے۔ اس نے بادشاہ سے خزانہ دریافت کیا۔ شاہ عالم نے بڑے تحمل سے جواب دیا کہ اگر مجھے دفینوں کا علم ہوتا تو میں چاندی اور سونے کے ظروف بیچ کر اپنے نوکروں کو تنخواہ کیوں دیتا؟ اگر میرے آباؤ اجداد میں سے کسی نے یہاں کوئی خزانہ دفن کیا ہے تو مجھے اس کا علم کیونکر ہو سکتا ہے۔

غلام قادر نے جھلا کر کہا۔ "تو بیکار محض ہے۔ اس دنیا میں تیرا کیا کام۔ تیری آنکھیں نکال لینی چاہئیں۔" شاہ عالم نے کہا "اے کم بخت! یہ آنکھیں وہ ہیں جو ساٹھ برس تک کلام اللہ پڑھتی رہی ہیں۔ انھوں نے تیرا کیا بگاڑا ہے۔ انھیں نکال کر تجھے کیا ملے گا؟"

یہ سن کر روہیلے نے منہ پھیر لیا اور حکم دیا کہ بادشاہ کے بیٹوں اور پوتوں کو خوب پیٹا جائے۔ چنانچہ نوکروں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ یہ دیکھ کر بوڑھے شاہ عالم نے کہا: "میں نے یہ عذاب اور مصیبت دیکھنے کے لیے ان آنکھوں کو باقی رکھنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ انھیں فوراً نکال ڈال۔ اب ان کا کیا فائدہ ہے؟"

غلام قادر غصے سے بے قابو ہو کر تخت سے کود پڑا۔ بادشاہ کو فرش پر لٹایا۔ چھاتی پر چڑھا اور اپنے خنجر سے بادشاہ کی ایک آنکھ نکال ڈالی۔ دوسری آنکھ نکالنے کا حکم یعقوب علی خاں کو دیا۔ اس نے ایسا کرنے سے انکار کیا۔ روہیلے نے تلوار سے اس کا سر قلم کر دیا۔ اس کے دو سرے ساتھی یہ دیکھ کر دہل گئے۔ انھوں نے فوراً بادشاہ کی دوسری آنکھ نکال دی۔

اس کے بعد شاہ عالم کو سلیم گڑھ بھیج دیا گیا۔ اس وقت تمام قلعے کے رہنے والے تصویرِ غم بنے ہوئے تھے۔ بیگمات اور شہزادیاں "ہائے عالم! وائے عالم!" کہہ کر سر پیٹ رہی تھیں۔ کوئی یہ دردناک واقعہ دیکھ کر بیہوش پڑی ہوئی تھی۔ کسی پر سکتے کا عالم طاری تھا۔ کوئی سسکیاں بھر رہی تھی۔ غرضیکہ سب پر غم و الم کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔

جب شاہ عالم کی آنکھیں نکالی جا چکیں تو غلام قادر کو پھر اسمٰعیل بیگ کا خیال آیا۔ چنانچہ اس واقعہ کے دو دن بعد اسے ایک بہت بڑی رقم اور بھیجی۔

شہر والوں کو کچھ خبر نہ تھی کہ لال قلعہ کی چار دیواری میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ چند روز کے بعد انھیں علم ہوا تو وہ خوف کے مارے شہر چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ ۱۴ اگست کو مرہٹوں کی فوج پہنچ گئی۔ انھوں نے لوگوں کو تسلی و تشفی دی اور یقین دلایا کہ ان کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہ ہوگی۔ اب شہر کا کاروبار پھر سے جاری ہوا۔ مرہٹوں نے قلعہ کی ناکہ بندی کی۔ اور علی گڑھ کو جانے والا راستہ بالکل روک لیا۔

اسمٰعیل بیگ یہ دیکھ کر کہ اب مرہٹے آ گئے ہیں، ان کے سردار رانا خاں کے پاس پہنچا اور عذر معذرت پیش کر کے یہاں سے نکل گیا۔ قلعے کے اندر پھر حالات بگڑے۔ روہیلہ سپاہیوں نے لوٹ کھسوٹ سے اپنا حصہ مانگا۔ اس کے ساتھ ہی سامان رسد بھی ختم ہو گیا۔ غلام قادر گھبرایا۔ اس نے بارود کو آگ لگائی اور خود میرٹھ بھاگ گیا۔

شاہ عالم نے ان حالات میں جس قدر صبر و استقلال کا ثبوت دیا، اس کا عشر عشیر بھی اگر میدان جنگ میں دکھاتا تو اسے یہ بُرا دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ اس نے اس واقعہ کے بارے میں ایک بڑی دردناک نظم لکھی جس کا ایک ایک لفظ درد میں ڈوبا ہوا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بوڑھا شاہ عالم اپنے انصار و اعوان کی طرف فریاد کا ہاتھ بڑھا بڑھا کر انھیں پکارتا ہے اور اپنی مدد کے لیے بلاتا ہے۔ اس کی یہ دردانگیز شاعری زندہ جاوید ثابت ہوئی۔ مرہٹے سب سے پہلے اس کی مدد کو پہنچے اور اسے کنج قفس سے نکال کر تخت شاہی پر بٹھایا۔ یہ نظم بڑی موثر اور شاہ عالم کی زبوں حالی کا بہترین نمونہ ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

صرصرِ حادثہ برخاست پئے خواریِ ما　　داد برباد سر و برگ جہانداریِ ما
آفتابِ فلکِ رفعتِ شاہی بودیم　　بود در شامِ زوال آہ سیہ کاریِ ما
چشمِ ما کندہ شد از جورِ فلک بہتر شد　　کہ نہ بینیم کہ کند غیر جہانداریِ ما
داد افغاں بچہ شوکتِ شاہی بر باد　　کیست جز ذاتِ خدائے کہ کند یاریِ ما
کردہ بودیم گناہے کہ سزایش ایں بود　　ہست امید کہ بخشند گنہگاریِ ما
کرد سی سال نظارت کہ مراد او بباد　　زود تر یافت تلافی ستمگاریِ ما
نازنیناں پری چہرہ کہ ہمدم بودند　　نیست جز محل مبارک بہ پرستاریِ ما
حق طفلاں کہ ز سی سال فراہم کردند　　کردہ تاراج نمودند سبکساریِ ما
عہد و پیماں بمیاں دادہ نمودند دغا　　مغلیاں خوب نمودند نمکداریِ ما
شیر دادیم بہ افعی بچہ پروردیم　　عاقبت گشت بجز پئے خونخواریِ ما
قوم افغان و مغلیہ ہمہ بازی خوردند　　بسکہ گشتند مجوز بہ گرفتاریِ ما
آں گدا زادۂ نہداں کہ بدوزخ برود　　بانیِ جور و ستم شد بدل افگاریِ ما
گل محمد کہ ز مرداں بشرارت کم نیست　　چہ قدر کرد وکالت بہ گرفتاریِ ما
ہم الہ یار و سلیمان و بدل بیگ لعین　　ہر سہ بستند کمر بہر دل آزاریِ ما
شاہ تیمور کہ دارد سرِ نسبت با من　　زندہ باشد کہ بیاید بہ مددگاریِ ما
مادھو جی سیندھیا فرزندِ جگر بندِ من　　ہست مصروفِ تلافی ستمگاریِ ما
راجہ و راؤ زمیندار امیر و چہ فقیر　　حیف باشد کہ نسازند بہ غمخواریِ ما
حال ما گشتہ بتر ہمچو اماماں ز یزید　　کرد تقدیر ازل روزیِ ما خواریِ ما
بود جانکاہ ز رہ مال جہاں ہیچ مرض　　دفع از فضلِ الٰہی شدہ بیماریِ ما

آصف الدولہ و انگریز کہ دستہ ہمن اند　　چہ عجب گر ہمہ آیند مددگاری ما

آفتاب از فلک امروز شب تیرہ بدی

باز فردا بدہد ایزد سر و سروری ما

شاہ عالم شاعر تھا۔ فارسی، اردو اور ہندی میں شعر کہتا تھا۔ اس کے ہندی کلام کا مجموعہ نادراتِ شاہی کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اردو اور فارسی کا کلام ابھی تک گوشۂ گمنامی میں پڑا ہے۔ اگر وہ چھپ جائے تو ہم نہ صرف اس کے حالات و واقعات اور ثقافت و معاشرت کے بعض گوشوں کو بے نقاب کرنے کے علاوہ تیموریوں کی ادبی تاریخ میں ایک بہت بڑا اضافہ ہوگا جس سے اس خاندان کی ادبی روایات میں ایک تسلسل قائم ہو جائے گا۔

شاہ عالم نے جس طرح زندگی کے دن گزارے شہزادگی سے لے کر بادشاہت تک اس نے بڑے بڑے انقلاب دیکھے۔ اپنوں کی بے وفائیاں، اغیار کی فریب کاریاں، جلاوطنی کی مصیبت اور قلعہ میں شاہانہ اسیری کی حیثیت سے قدم قدم پر انسانی فطرت کے نت نئے پہلوؤں کا مشاہدہ، مصائب و آلام کا ہجوم کر کے آنا ایسے واقعات ہیں جو شاعر کو حقیقی معنوں میں شاعر بنا دیتے ہیں۔ اس لئے کلام میں سوز و گداز اور خلوص پیدا کر دیتے ہیں اور شعر حقیقی معنوں میں شعر بن جاتا ہے جو زبان سے نکلتے ہی دل میں اتر جاتا ہے۔

شاہ عالم کی آنکھوں کا مرثیہ بھی اسی کی ایک کڑی ہے جو بڑی مؤثر ہے۔ جس نے اسے پڑھا وہ اس سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اگر شاہ عالم کا اور کوئی کلام باقی نہ رہتا تو فقط یہی نظم اس کے نام کو ہمیشہ کے لئے زندہ رکھ سکتی تھی۔ جدید ادب میں جس قسم کی شاعری پر زور دیا جاتا ہے شاہ عالم کی نظم اس کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ اس میں نہ مبالغہ ہے نہ تصنع۔ سیدھے سادے واقعات سیدھے سادے انداز میں بیان کر دیئے گئے ہیں۔ لفظ لفظ میں جو درد بھرا ہوا ہے جو ہر صاحبِ دل بن کر پڑھنے اور سننے والوں کے دل و دماغ کو مسخر کر لیتا ہے۔

مورخوں نے اس دردناک واقعہ کو خوب بڑھا چڑھا کر لکھا ہے۔ حالانکہ یہ بھی اسی قسم کا واقعہ ہے جس قسم کے کئی واقعات پہلے ہو چکے ہیں، البتہ ایک بات جو اسے دوسروں سے مختلف بناتی ہے، وہ مغل بیگمات کی بے حرمتی اور بے پناہ رسوائی ہے۔ اس سے پہلے تاریخ میں بیگمات کی بے حرمتی کا کوئی واقعہ نہیں ملتا۔ تیموریوں نے اپنی رعایا نوازی اور عدل گستری کے باعث لوگوں کے دلوں میں خاص عزت و وقار پیدا کر لیا تھا۔ رعایا انھیں بمنزلہ سرپرست اور باپ کے سمجھتی تھی اور وہ رعایا کو بمنزلہ اولاد خیال کرتے تھے۔ بادشاہ ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے اور ان کی خوشی میں خوش ہوتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ ان کی حکومت دلوں پر تھی، لوگ انھیں اپنے سے الگ نہ سمجھتے تھے، وحشی سے وحشی اور مہذب سے مہذب انسان مغل حرم کی دل سے عزت کرتا اور کوئی ایسی حرکت نہ کرتا جس سے ان کے وقار میں فرق آئے یا عزت و آبرو پر حرف آئے۔ چنانچہ ہم ذیل میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک سول افسر کے سفرنامے سے ایک واقعہ نقل کرتے ہیں جس سے اس خیال کی پورے طور پر تائید ہو جاتی ہے۔ اس افسر کا نام تھامس ٹوئننگ (THOMAS TWINING.) تھا۔ اس نے اس دلدوز واقعہ کے چھ برس بعد دہلی کا سفر اختیار کیا۔ یہ سفر اس نے نجی طور پر کیا تھا۔ جب وہ دہلی سے واپس ہوا تو اس کے ساتھ بیس کے قریب سپاہی تھے جو اس کی حفاظت اور رہنمائی کر رہے تھے۔ دوران سفر میں جب وہ [illegible] شہر پہنچا تو اسے بتلایا گیا کہ گوجر ڈاکوؤں کی ایک بہت بڑی جماعت جس میں دو ہزار کے قریب آدمی ہیں اس پر چھاپہ مارنے والی ہے۔ تھامس کے قول کے بموجب گوجر بڑے بہادر، خونخوار اور [illegible] ڈاکو

تھے۔ یہ خبر سن کر اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ پالکی سے پیچھے ہٹ جائیں اور جب ڈاکو نزدیک پہنچیں تو بلند آواز سے کہیں کہ بادشاہ کے حرم کی بی بی ہے۔ اس نعرے نے جادو کا اثر کیا۔ ان میں سے ہر ایک نے جھک کر پالکی کو سلام کیا اور چپ چاپ واپس چلے گئے۔

(TRAVEL IN INDIA. PAGE 269)

جب وحشی، خونخوار اور سفاک ڈاکوؤں کے دل میں شاہی خاندان کی یہ عزت تھی تو مہذب لوگوں کا اندازہ آپ خود ہی کر سکتے ہیں۔ ایک بات اور قابل ذکر ہے کہ جتنا ہو سکا شاہ عالم پر سختیاں ہوتی رہیں۔ اس کی زبان پر یا اللہ کا نام تھا یا کلمہ شہادت۔ اس نے کسی موقع پر بھی شکوہ و شکایت، آہ و زاری اور فریاد نہیں کی۔ یہ صبر اور تحمل کی بڑی اچھی صورت ہے۔ مگر اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر اس میں جرأت اور شجاعت کے جوہر بھی ہوتے تو نہ یہ بربادیوں کے دن دیکھنے ہوتے، نہ پھر بہار آجاتی اور اس کا خاتمہ اتنی جلدی نہ ہوتا۔

اُردو کا ایک اچھوتا ناول "نشتر"

سید مبارز الدین رفعت

ہمارے ایسے بزرگ جنھوں نے اپنی جوانی کے دنوں میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، حکیم محمد علی اور منشی سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ کے ناول مزے لے لے کر پڑھے تھے، اب آہستہ آہستہ اللہ کو پیارے ہوتے جا رہے ہیں۔ اس نسل کے کسی بزرگ کی موجودگی میں کبھی ناول کا ذکر چھڑ جائے تو بے اختیار ہو کر آپ سے پوچھ بیٹھیں گے "میاں! ناول نشتر بھی پڑھا ہے؟" آپ جواب دیں گے کہ اس نام کا کوئی ناول آپ کی نظر سے نہیں گزرا۔ اس پر وہ بزرگ حیرت اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے فرمائیں گے کہ ناول نشتر نہیں پڑھا تو آپ نے کچھ بھی نہیں پڑھا۔ ایسے ہی بزرگوں میں ایک ہمارے ادیبِ شہیر حضرت نیاز فتح پوری بھی ہیں۔ مثنوی زہرِ عشق کا جو خوبصورت اڈیشن مجنوں گورکھپوری نے شائع کیا تھا، اس کے دیباچہ "عذرِ لنگ" میں فرماتے ہیں: "یوں تو اپنی زندگی میں خدا معلوم کتنی بار رو چکا ہوں لیکن تین اشک باریاں ایسی ہیں جن کی تفصیل مجھے اب بھی یاد ہے اور شاید ہمیشہ یاد رہے۔ سب سے آخر میں اس وقت جب میں نے ایک نظم "مجرمِ وفا" کے عنوان سے لکھی تھی...... اس سے قبل جب ناول نشتر میری نگاہ سے گزرا اور اس سے بھی پہلے بعنوانِ شباب میں اس وقت جب اول اول مثنوی زہرِ عشق کا مطالعہ میں نے کیا۔"

میں نے آج سے کوئی دس پندرہ سال پہلے یہ ناول پڑھا تھا۔ اب گلبرگہ میں جہاں یہ کتاب لکھی گئی تھی، پھر ایک بار یہ کتاب مجھے پڑھنے کے لیے مل گئی۔ اس وقت میرے سامنے نشتر کا وہ اڈیشن ہے جو مطبع نولکشور لکھنؤ سے آٹھویں بار ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون اس کتاب کی "دوسری خواندگی" کا نتیجہ ہے۔

ناول نشتر کے مصنف منشی سجاد حسین انجم کسمنڈوی کے ساتھ تاریخِ ادبِ اُردو نے بڑی ناانصافی سے کام لیا ہے۔ وہ نشتر کے سوا کئی اور کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ ان کی ایک کتاب "کاشانات"[1] ہے جو اس وقت بہت کمیاب ہے۔ ان کی دوسری تصنیف "بگلا بھگت"

---

[1] مولانا عبدالماجد دریابادی کے قول کے مطابق اس کتاب کا پہلا اڈیشن مطبع آفتابِ ہند محلہ کچہری گھاٹ آگرہ سے سنہ ۱۹۰۱ء میں شائع ہوا تھا۔ راقم الحروف کی نظر سے اس کا دوسرا اڈیشن گزرا ہے جو محمد شمس الدین خاں اکبرآبادی کے اہتمام سے ان کے مطبع شمس المطابع افضل گنج حیدرآباد دکن سے ۱۳۳۲ف (م ۱۹۲۳ء) میں شائع ہوا تھا۔ کتاب کے عنوان سے دھوکا ہوتا ہے شاید یہ کتاب فلکیات کے موضوع پر لکھی گئی ہے لیکن اصل میں یہ انسانی زندگی کی رمزی یا تمثیلی داستان ہے۔ اس کو پڑھ کر مشہور انگریز مصنف بنین کی کتاب "پلگرمس پراگریس"

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

گلاب ہی نہیں غالباً یہ بھی ہے اور اس کے بارے میں تفصیلات کا علم نہیں ہو سکا۔ ان کی سب سے مشہور تصنیف "حیاتِ شیخ چلی" ہے۔ اردو کے ابتدائی دور کے اتنے اچھے ناول "نشتر" اور "حیاتِ شیخ چلی" جیسی زعفران زار کتاب کے مصنف ہونے کے باوجود بھی ان کتابوں کے مصنف کو اردو ادب کی تاریخ میں جگہ نہ مل سکی۔ مرزا محمد عسکری نے تاریخ ادب اردو میں، عبدالباری آسی نے تذکرہ منتخب میں اور آغا محمد باقر نے اپنی تاریخ نظم و نثر اردو میں ان کی کتاب "حیاتِ شیخ چلی" کا ذکر تو کیا ہے لیکن اسے ان کے ہمنام اور ہم عصر ایڈیٹر اودھ پنچ منشی سجاد حسین سے منسوب کر دیا ہے حالانکہ اودھ پنچ کے نامور ایڈیٹر منشی سجاد حسین نہ تو انجم تخلص کرتے تھے اور نہ وہ کسمنڈوی تھے۔ منشی سجاد حسین نے بھی احمق الذین، حاجی بغلول اور طرحدار لونڈی جیسے ناول لکھے ہیں۔ غالباً ناول نگاری اور پھر ہمنامی کی وجہ سے سجاد حسین کسمنڈوی کی یہ تصنیف ان کے مشہور ہم عصر سے منسوب ہو گئی۔

ناول نشتر سے صاحبِ نشتر کے سوانح حیات پر کچھ بھی روشنی نہیں پڑتی۔ اس کتاب سے بس اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسمنڈہ (اتر پردیش) کے رہنے والے تھے۔ پھر کسی طرح انھیں ریاست حیدرآباد میں سرکاری ملازمت مل گئی تھی۔ دفتر مال میں منشی کی خدمت پر مامور اور عرصہ دراز تک گلبرگہ میں تعینات رہے۔ گلبرگہ ہی میں وہ ۵ رمضان ۱۳۱۱ھ کو نشتر کی تالیف سے فارغ ہوئے۔ اس کتاب کو انھوں نے اپنے محکمے کے ایک افسر اعلیٰ محمد اکرام الدین خاں کے نام معنون کیا ہے جو پہلے گلبرگہ کے اوّل تعلقدار تھے اور نشتر کی تالیف کے وقت ایل گندل کی تعلقداری پر چلے گئے تھے۔ گلبرگہ کی مشہور "اکرام باغ" آج بھی اس علم دوست اور فیض رساں عہدہ دار کی یاد تازہ کر رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اکرام الدین خاں صاحبِ ذوق عہدہ دار تھے۔ منشی سجاد حسین نے یہ کتاب ان کے صاحبِ ذوق ہونے کی وجہ سے ہی ان کے نام معنون کی ہے۔ انسیت اور ساتھی کے تعلق سے "ہدیۂ پیش کش" کے عنوان کے تحت لکھے گئے ہیں: "یہ حقیر ترجمہ عالی جناب مولوی محمد اکرام الدین خاں صاحب بہادر اوّل تعلقدار ایل گندل ریاست حضور نظام دکن دام اقبالہٗ کے نام نامی کے ساتھ معنون کیا جاتا ہے۔ صرف جناب کی خالص عنایت اور محبت کے صلے میں ورنہ خوشامد کے واسطے بلند ہی اور نیچے اپنے نام مجھ کو باز ہیں۔"

رسالہ آج کل (دہلی) بابت ۱۵ رجون ۱۹۴۹ء میں جناب بشیر علی صدیقی نے "اردو کا ایک گم نام مصنف — منشی سجاد حسین انجم کسمنڈوی" کے عنوان کے تحت صاحبِ نشتر پر ایک فاضلانہ مقالہ سپردِ قلم فرمایا ہے مگر اس کی ادبی قدر و قیمت کے متعلق

(حاشیہ صفحہ سابق) یاد آ جاتی ہے۔ یہ کتاب ادبی خوبیوں کے ساتھ ساتھ بڑے گہرے مذہبی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس کا رنگ مصنف کی دوسری کتابوں سے بالکل ہی الگ ہے۔ اس کتاب میں خالق و مخلوق، خدا اور بندے کے آپس کے تعلقات کی نوعیت، زندگی کی مختلف منزلوں کی کیفیت اور آخر میں روزِ حساب کا نقشہ نیم شاعرانہ، نیم فلسفیانہ اور نیم صوفیانہ انداز میں بیان کیا ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۱؎ اس کتاب کا دوسرا اڈیشن راقم نے دیکھا تھا جو ۱۹۲۴ء کا چھپا ہوا تھا۔ اس کی ابتدا میں ایک سراجیہ دیباچہ ہے اور آخر میں خود مصنف کا یہ قطعۂ تاریخ درج ہے ؎

چھپے ہیں فقرے جو شوخیاں ہیں ہر طرف — ہے جو ہے سونی المثل فرخندگی خندہ گی
سالِ تاریخش جو ہے گا ہاتفِ غیبی بگفت — شیخ چلی آ گئے دنیا میں با سنجیدگی

ناانصافی سے کام لیا۔ منشی سجاد حسین کے حالاتِ زندگی کے لیے صدیقی صاحب نے مجھ اور لوگوں کے ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی سے بھی استفسار کیا تھا۔ منشی صاحب سے وہ ذاتی طور پر واقف تھے۔ جواب میں ڈاکٹر صاحب نے انھیں لکھا تھا۔

"منشی سجاد حسین انجم ۱۹۰۲ء یا ۱۹۰۳ء میں بیمار پڑے۔ ملازمت سے رخصت لے کر لکھنؤ آئے اور کچھ مہینے بعد انتقال کر گئے۔ بیالیس چھیالیس کے قریب عمر پائی۔ دبلے پتلے منجھولے قد و قامت کے آدمی تھے۔ سانولا رنگ، استخواں ناک، ہونٹ پتلے، داڑھی خشخشی، بشرے سے کدورت نمایاں، مزاج میں تمکنت تھی۔ مرزایانہ بسر کرتے اور مالی مشکلوں کا سامنا کرنا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر بہت خفا ہوتے تھے۔ صورت یا وضع قطع سے مذہبیت نہ ظاہر ہوتی تھی مگر تھے مذہبی آدمی۔ نماز روزے کے بہت سختی سے پابند تھے۔ مولانا عبدالوہاب لکھنوی (یعنی علی برادران مولانا محمد علی و مولانا شوکت علی کے مشہور پیر مولوی عبدالباری فرنگی محلی کے والد ماجد) سے بیعت تھی اور مرشد سے والہانہ اور گہری عقیدت۔ خدا بخشے۔"

منشی سجاد حسین اودھ پنچ لکھنؤ کے ابتدائی دور کے نامہ نگار بھی رہے تھے۔ وہ شاعر بھی تھے۔ انجم تخلص کرتے تھے۔ ان کی ایک نیچرل نظم اخبار اودھ پنچ میں شائع ہوئی تھی۔ لوگوں کو اپنے اشعار بہت کم سناتے تھے۔ ناول نشتر میں بھی انھوں نے دو ایک جگہ حسبِ حال اپنے اشعار نقل کر دیے ہیں۔ جراءت اور رنگین کے رنگ کی وہی جوبن اور انگیا والی شاعری ہے۔ ایک جگہ پوری ایک غزل نقل کر دی ہے۔ اس سے ان کی شاعری کا ایک سرسری اندازہ لگایا جا سکتا ہے ؎

ابھاروں پہ ہے حسنِ زیبا کسی کا — اٹھانوں پہ ہے جوبن آیا کسی کا
جو سینے سے ڈھلکا دوپٹہ کسی کا — مسل ڈالا ظالم کلیجہ کسی کا
اسے پیسا پامال اس کو کیا — مچاتا ہے اندھیر سینہ کسی کا
غضب دخترِ رز آج نکھری ہے ساقی — تماشہ ہے ٹوٹے جو تقویٰ کسی کا
وہ بیڑے کی تقدیر ہیکل کی قسمت — کہ ہاتھ آگیا جوبن ابھرا کسی کا
سرِ طور کیا خاک باقی ہے موسیٰ — ادھر آؤ دکھلائیں جلوہ کسی کا
چلو ہم بھی پوچھیں مزاجِ مبارک — سرِ طور انجم ہے جلوہ کسی کا

اپنی غزل نقل کرنے کے بعد خود ہی حاشیے میں یہ لکھ گئے ہیں: "ناظرین ہنس پڑیں گے کہ یہ بے وقت کی راگنی کیسی۔ مگر اپنے لختِ جگر سب کو اچھے معلوم ہوتے ہیں، ٹوکنے کی بات نہیں!"

نشتر منشی سجاد حسین انجم کسمنڈوی کی پہلی تصنیف ہے۔ اصل میں یہ سید حسن شاہ نامی لکھنؤ کے کسی صاحب کی خود نوشت عاشقانہ داستان کا فارسی سے اردو میں ترجمہ ہے۔ سید حسن شاہ کی اس فارسی تصنیف کا اب کہیں پتہ نہیں چلتا۔ معلوم نہیں اس فارسی داستان کا قلمی نسخہ کہاں سے منشی صاحب کے ہاتھ لگا تھا۔ اب چونکہ اصل فارسی کتاب ہماری دسترس میں نہیں ہے اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ منشی صاحب نے

کس حد تک اس میں اپنی طرف سے حک و اضافہ کیا ہے۔ اتنا تو یقینی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اکثر اردو اشعار منشی صاحب نے اپنی طرف سے بڑھائے ہیں۔ ناول میں جگہ جگہ منشی صاحب نے مترجم کی حیثیت سے حاشیے بھی لکھے ہیں۔ کہیں لکھا ہے "یہیں سے اصل فارسی عبارت ہی نقل کر دی ہے" "ترجمے میں اس کا لطف کہاں" کہیں لکھا ہے "یہاں حسن شاہ نے بہت سے فارسی شعر لکھے تھے، وہ سب میں نے حذف کر دیئے ہیں" کہیں ہیروئن نے حسن لطیف انداز میں ہیرو کو جو بنایا ہے اس کی داد دی ہے کہیں ہیرو کی حماقت پر طنز کیا ہے۔ ایک حاشیے میں تو یہاں تک لکھا ہے "داستان زمان کو میں نے جیسے تیسے سنبھالا ہے ورنہ مصنف نے اس زمانے کی تہذیب کا کچھ خیال نہ کیا تھا" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ داستان کا ڈھانچہ تو منشی صاحب نے سید حسن شاہ سے لیا ہے لیکن اس کو اپنے دلکش انداز میں ڈھال کر بیان کیا ہے، نرا ترجمہ ہی نہیں کیا ہے۔

منشی صاحب نے کتاب کی ابتدا میں "التماس مترجم" کے عنوان سے چار صفحوں کا ایک مقدمہ لکھا ہے۔ اس میں فرماتے ہیں: "...... ایک فارسی قصے کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین ہے۔ اس کتاب کے مفصل حالات کے واسطے ایک مستقل دیباچہ درکار تھا مگر نہ میں بالفعل لکھ سکتا ہوں اور نہ امید ہے کہ اس کے مطالعے سے طبیعت گھبرائی جائے گی ...... مختصر یہ ہے کہ اصل کتاب سیدھی سادی فارسی ہندی آمیز زبان میں قلمی میرے پاس موجود ہے۔ سال تصنیف ۱۲۰۵ھ اور سال کتابت ۱۲۱۴ھ۔ شریف مصنف نے اپنے عشق و محبت کا واقعہ نہایت سادہ الفاظ و عبارت میں لکھا ہے۔ تکلف اور تصنع غالباً بہت ہی کم اور سچا واقعہ ہے اس لیے دیکھنے والے واقعی کلیجہ تھام لیتے ہیں ......"

اٹھارویں صدی کے آخری دن ہیں اور یہی آپ کا ملک ہندوستان جنت نشان ہے۔ شہنشاہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد سے لگ بھگ ایک سو سال کی آپس کی خانہ جنگی، افراتفری، مرہٹوں کی لوٹ، نادر گردوں اور ابدالی کی مار سے مرکزی حکومت مغلیہ چور چور اور نڈھال ہو کر سسکتی ہوئی اپنی آخری گھڑیوں کا انتظار کر رہی ہے۔ ملک میں سات سمندر پار سے آئے ہوئے بدیسی صاحبوں کے اقبال کا آفتاب طلوع ہو چکا ہے۔ شمال میں، جنوب میں، مشرق میں، مغرب میں ہر سمت انہی کا بول بالا ہے۔ کیا مدراس، کیا بنگال، کیا گجرات اور کیا پنجاب، ملک کے سبھی حصے ان کے حلقۂ اقتدار میں آتے چلے جا رہے ہیں۔ ملک میں جگہ جگہ ان کی فوجی چھاؤنیاں قائم اور ہر جگہ ان کے انتظامی افسر متعین ہوتے جا رہے ہیں۔ ادھر ہم آپس کے بغض و عناد، رشک و حسد، کینہ اور بغض میں مبتلا ایک دوسرے کے سر پھٹول میں مشغول ہیں۔ سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے سلسلے ہیں کہ جاری ہیں۔ صدیوں کی عیاشی نے محنت کوشی کی جگہ سہل جوئی کا راستہ سجھا دیا ہے۔ تلوار مردوں کے ہاتھ سے چھن گئی تو طاؤس و رباب ہی کے دامن میں پناہ ڈھونڈی جا رہی ہے۔

ہندوستان میں مشرقی تمدن کا چراغ بجھنے سے پہلے اپنی پوری تابناکی کے ساتھ بھڑک رہا ہے۔ کام و دہن کی حلاوتوں، گوش و بصر کی گھلاوٹوں اور ہر طرح کی حسی لذتوں کے وہ وہ سامان بہم ہو رہے ہیں کہ بس فکر و عمل کی ساری صلاحیتیں ان ہی کے لیے وقف ہو کر رہ گئی ہیں۔ بدیسی نے فکر سیاست سے فراغت دے دی تو ساری سوجھ بوجھ، ساری دانائی، فراست صرف ہونے لگی بناؤ سنگھار میں، آداب میں، اطوار میں، اٹھنے میں، بیٹھنے میں، کھانے میں، پینے میں، اوڑھنے میں، بچھونے میں، غرض زندگی کے ہر فعل و عمل میں تکلف ہی تکلف برتتے ہیں۔ ارباب نشاط کے طائفے کو پروان چڑھنے کے لیے اس سے اچھے مواقع کہاں ملتے ہیں۔ ان دنوں ہندوستان میں اس طائفے کا کاروبار خوب ہی پھیلا

اور پر خوب ہی پھلا پھولا۔

کہتے ہیں جب کسی قوم پر سیاسی حیثیت سے زوال آنے لگتا ہے تو اس کے تمدن میں اتنی ہی نفاست اور شائستگی آنے لگتی ہے۔ تمدن کے انتہائی عروج کے دنوں میں فحاشی بھی ایک آرٹ بن جاتی ہے۔ طوائف ایک تہذیبی ادارہ کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ یہی حال فراعنہ کے مصر، فلسطینیوں اور دیوتاؤں کے یونانِ قدیم اور قیصروں کے رومتہ الکبریٰ کے تمدنی عروج کے دنوں کا تھا۔ یونان کے دانش ور تھینس اور پرکلز جیسے نامور فرزند میبس اور اسپاسا نام کی طوائفوں کی محبت پر نازاں تھے۔ روم کے حماموں میں سب ہی ننگے رہتے تھے اور ان سے مستقل طور پر قحبہ خانوں کا کام لیا جاتا تھا۔ ان حماموں میں جانا اور داد عیش دینا تہذیب و شائستگی کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے دوران میں ہندوستانی طوائفوں نے بھی ناچ گانے، شعر و شاعری، مجلسی آداب، لباس کی تراش خراش اور رفتار و گفتار میں وہ کمال دکھایا کہ ہندوستانی امرا انھیں اپنی سرکار سے وابستہ کرنے لگے اور شرفا اپنے بچوں کو تہذیب و شائستگی، محفل کے اطوار اور گفتگو کے آداب سکھانے کے لیے ان کے پاس بھیجنے لگے۔ ایسی عورتوں کے ڈیرے اور کوٹھے ایک طرح کے کلب تھے جہاں گھڑی دو گھڑی کے لیے بیٹھنا خلافِ وضع نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ ایک طرح باوضع، صاحبِ ذوق اور صاحبِ مرتبہ ہونے کی دلیل بھی سمجھی جاتی تھی۔ یہ جگہیں بڑی نفیس، شائستہ اور دلچسپ ہوتی تھیں۔ آج کل کی طوائفوں کے کوٹھوں کا ان سے مقابلہ کرنا ان کی توہین ہے۔

مشرقی تہذیب کی اس آخری بہار کی ان برائیوں کے ساتھ ساتھ اچھائی کے پہلو بھی آپ کو کافی مل جائیں گے۔ ان ڈیرے دار طوائفوں کا آج کے بازارِ حسن سے مقابلہ کیجیے تو کتنا زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ آج کے بازارِ حسن میں عشوہ طرازی اور رنا آفرینی کی کمی نہیں لیکن اس بازار میں جو جنس نایاب ہو گئی ہے وہ انسانیت اور شرافت ہے۔ کل کے گناہ کے کوچے اور آج کے گناہ کے کوچے میں بس فرق اسی کا دکھائی پڑتا ہے کہ کل کے گناہ کے کوچے کی دکانیں سجانے والیاں لاکھ ہرجائی ہوتے ہوئے بھی وفادار اور جاں نثار تھیں۔ آج جس آسانی کے ساتھ انھیں حاصل کیا جا سکتا ہے اس وقت ان کا حصول اتنا آسان نہ تھا۔ ایک عرصے کے میل جول کے بعد وہ کسی سے تعلق پیدا کرتی تھیں اور اس تعلق کو نباہ بھی دیتی تھیں اور کسی نیک بخت کو توبہ کی توفیق میسر ہو جاتی تو یہ بھی واقعہ ہے کہ اس کے بعد اس کی پوری زندگی عصمت و پاکبازی کی زندگی ہوتی تھی۔

عصرِ حاضر کے ایک فاضل مورخ نے بالکل سچ کہا ہے کہ "۱۸۵۷ء ہندوستان کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ قدیم و جدید کے درمیان یہی وہ منزل ہے جہاں سے ماضی کے نقوش بھی پڑھے جا سکتے ہیں اور مستقبل کے امکانات کا جائزہ بھی لیا جا سکتا ہے۔ مغلیہ سلطنت جس کے دامن میں ایک ایسی تہذیب نے پرورش پائی تھی جو رنگ و نسل اور مذہب و ملت کے سارے امتیازات سے بالاتر ہو کر ایک عرصے تک ہندوستان کی سیاسی وحدت کی ضامن رہی تھی، یہاں پہنچ کر دم توڑ دیتی ہے اور اس کے ساتھ تاریخ کا ایک دور ختم ہو جاتا ہے۔ پرانا سماجی نظام اور پرانے نظریات وقت کے نئے تقاضوں کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں اور نئی سماجی قوتیں صرف فکر و نظر کے سانچے ہی توڑنے پر اکتفا نہیں کرتیں بلکہ زندگی کے سارے محور بدل ڈالتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء میں صرف ایک سیاسی نظام ہی کا جنازہ نہیں نکلتا بلکہ ہندی قرونِ وسطیٰ کا سارا تہذیبی سرمایہ بھی نیست و نابود ہو جاتا ہے۔"

ہندی قرونِ وسطیٰ کے سارے تہذیبی سرمایے کا جنازہ نکلنے پر تقریباً نصف صدی گزر چکی ہے لیکن بہادر کے جو بھی

ملازم انگلستان سے ہندوستان بھیجے جا رہے ہیں ان میں ابھی تک اپنی تہذیب کی برتری کا احساس نہیں جاگا اور ہندوستانی تہذیب کے ساتھ اس حقارت کا برتاؤ شروع نہیں ہوا جو بعد میں سوچی سمجھی پالیسی کے طور پر شروع ہوا۔ اس وقت ہندوستان کے ساحل پر قدم رکھتے ہی ان کی آنکھیں مشرقی تمدن کی آخری بھڑک سے کچھ ایسی چکا چوند ہو گئی تھیں کہ انھوں نے اپنی تہذیب اپنے رہن سہن اور ٹھاٹ باٹ کو یہاں کے طور طریق سے فروتر جانا۔ وہ بتدریج ہندوستان کے حاکم اور اونچے طبقے کی جگہ لیتے جا رہے تھے اس لیے لازمی طور پر انھوں نے مکر کھاؤ اور رہن سہن میں اسی طبقے کی ریس کی اور اسی کو اپنا نمونہ قرار دیا۔ عیش و عشرت کے جو جو ڈھنگ اس زوال پذیر طبقے نے ایجاد کر رکھے تھے ان سب کو ان نئے حاکموں نے اپنایا اور انھی کے انداز میں داد عیش دیتے ہیں ان سے کسی طرح پیچھے نہ رہے۔ ہمارے اس دور میں جب کہ ہر طرف مغربی تہذیب کی نقلید کا دور دورہ ہے اور علم و ہنر اور اخلاق کے ساتھ ساتھ حسن و عشق اور عیش و عشرت کے معیار بھی بدل گئے ہیں اور ہم اپنی رنگینیوں اور عیش پسندیوں میں روز بروز مغربی معیار کے پابند ہوتے جا رہے ہیں یہ بات کچھ تعجب خیز سا معلوم ہوتی ہے کہ کسی زمانے میں اسی مغربی تہذیب کے نمائندے اپنی تہذیب کو حقیر تر اور فروتر جان کر اسی مشرقی تہذیب کی پیروی پر فخر کرتے تھے جسے بعد میں ذلیل تر اور پست تر قرار دیا گیا۔

ناول "نشتر" کا قصہ کچھ ایسی ہی فضا میں شروع ہوتا ہے۔ اس کے ہیرو سید حسن شاہ جو خود اس داستان کے راوی ہیں اپنے آپ کو صحیح النسب سادات سے بتلاتے ہیں۔ ۱۱۷۵ھ میں پیدا ہوئے اور بچپن ہی میں یتیمی کا داغ اٹھایا۔ نانا نے ان کی پرورش کی اور تعلیم و تربیت دی۔ سولہ سترہ سال کی عمر میں اپنے نانا کے توسط سے جنرل کوٹ کے بھانجے مسٹر رنگ ممبر کونسل کیپ فانپور کے خانگی منشی کی حیثیت سے نوکر ہو گئے۔ مسٹر رنگ ایک خوش مزاج، عیش پسند اور خوش گزران فوجی افسر تھے۔ میر صاحب کی مستعدی، کارگزاری اور دیانت داری سے وہ بہت خوش ہوئے۔ رفتہ رفتہ ان کے سارے خانگی کاروبار میر صاحب کی نگرانی میں آ گئے اور وہ انھیں بہت چاہنے لگے۔

میر صاحب کو رنگ صاحب کے پاس ملازم ہوئے کوئی تین چار سال ہو گئے ہوں گے، ایک دن میلے میں ان کی ملاقات کشمیری زنانہ طائفے کے ڈھاڑی محمد اعظم سے ہو گئی۔ یہ شخص میر صاحب کے نانا کا شناسا تھا۔ میر صاحب کے نانا کی مزاج پرسی اور اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس نے میر صاحب سے درخواست کی کہ میں نے ایک گویّے سے سُن کر کچھ فارسی غزلیں کمر لی ہیں، ممنون ہوں گا اگر آپ میرے خیمے پر چل کر ان کو درست فرما دیں۔ میر صاحب محمد اعظم کے خیمے پر پہنچے تو یہاں پورے طائفے کے اراکین سے ان کا تعارف ہوا۔ ان میں نیرہ چودہ سال کی ایک نہایت درجہ حسین لڑکی بھی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں میر صاحب اپنا نقد دل اسے نذر کر بیٹھے۔ طائفے اور خاص کر اس لڑکی کے حالات کی جستجو ہوئی تو معلوم ہوا کہ اس طائفے کا سربراہ کشمیری اعظم جی ہے۔ پہلے تجارت کا پیشہ کرتا تھا اس میں زبردست نقصان ہوا اور دیوالہ نکل گیا تو اس کی داشتہ چنبل جان نے جو قوم کی کسبی تھی ایک طائفہ قائم کر کے ہندوستان کا عزم کیا۔ اس طائفے میں میرزائی نامی ایک عورت ہے جس کی حیثیت نائکہ کی سی ہے۔ ایک عورت گلبدن ہے اور ایک عورت بی جان ہے ان ہی کی کمائی پر طائفے کا گزر ہے۔ کانپور میں مقیم فوج کے کمانڈنگ آفیسر کلی صاحب کی سرکار میں یہ کشمیری طائفہ ملازم ہے اور وہ جو چودہ سال کی لڑکی ہے اس کی داستانِ حیات بھی دلچسپ ہے۔ چنبل جان کی ایک بیٹی صاحب جان اس کے کسی پہلے شوہر سے تھی صاحب جان کو ایک پٹھان سوار نے نوکر رکھ لیا اور اس کی مرضی کے خلاف اس سے نکاح کر لیا۔ اس سے یہ لڑکی پیدا ہوئی۔ اس کا نام خانم جان رکھا گیا۔ چند روز بعد پٹھان سوار مر گیا اور صاحب جان اپنی بچی کو لے کر اپنی ماں کے پاس بھاگ آئی اور کچھ دنوں بعد مر گئی۔ اعظم جی کی خواہش تھی

اولاد نہ تھی۔ اس لڑکی کو اس نے اپنی بچی بنا لیا اور اس کی تعلیم و تربیت کا بڑا اہتمام کیا۔ مرزائی کو بھی اس لڑکی سے بہت محبت ہے اور وہ بھی اسے اپنی بچی کی طرح چاہتی ہے۔ اعظم جی کو اس کا ناچنا گانا پسند نہ تھا لیکن اس کی نانی رنگی نائکہ تھی، اس نے اعظم جی کی بات نہ مانی اور اس کو رقص و سرود کی تعلیم دلائی، اس کے باوجود اعظم جی کا خیال ہے کہ کسی شریف آدمی سے اس لڑکی کی شادی کر دی جائے۔ کئی انگریزوں نے اس کی خواہش کی لیکن اعظم جی اور مرزائی نے قبول نہ کیا۔ ابھی تک وہ پاک دامن اور عفت مآب ہی ہے۔

میر صاحب پہلی ہی ملاقات میں اپنا نقدِ دل ہار چکے تھے، کچھ ایسے لٹے ہوئے کھوئے اور بوکھلائے رہے کہ ملاقات کے اور لوگوں نے سمجھا کہ میر صاحب پہلے ہی سے دل باختہ ہیں لیکن دل را بہ دل راہ است، خانم جان کم عمر سہی لیکن طوائف زادی تھی، اس کے اطراف ماحول ہی کچھ ایسا تھا کہ تیور ہی سے اندازہ لگا سکتی تھی کہ حضرت کا کیا حال ہے۔ سید حسن شاہ خود بھی خوش رو تھے، نوجوان تھے، بیس اکیس سال سے زیادہ ان کی عمر نہ تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں خانم جان نے بھی میر صاحب کے لیے اپنے دل میں جگہ پائی اور یک گونہ کشش اس نے بھی میر صاحب کی طرف محسوس کی۔

اب میر صاحب کسی نہ کسی بہانے اعظم جی کے یہاں آنے جانے لگے۔ خانم جان سے ان کی دوسری ملاقات اس وقت ہوئی جب کہ اعظم جی کے یہاں خانم جان کی سالگرہ کا جشن ہو رہا تھا۔ میر صاحب کو بھی اس جشن میں شرکت پر مجبور کیا گیا۔ کھانے کے بعد میر صاحب نے گانے کی فرمائش کی، تو چونکہ فارسی ادب میں طاق تھی، خانم جان نے کچھ برمحل شعر گائے، ان میں سے ایک غزل تھی ؎

آنچہ ہم از دل برد از تاثیر فریاد من است ۔۔۔ وانکہ بسیار آورد خاصیت یاد من است

آں شکار من کہ ہم لائق بہ کشتن نیستم ۔۔۔ شرم می آید مرا زانکس کہ صیاد من است

یہ اشعار سن کر میر صاحب حیران رہ گئے کہ پروردگار کس نے اس کے کان میں کہہ دیا کہ میں تم پر مرتا ہوں۔ اس کے بعد پھر گانے کا رنگ جما تو میر صاحب کا دل بھر آیا اور کلیجہ امنڈنے لگا، بے اختیار آنکھوں میں آنسو جاری ہو گئے اور ہچکیاں بندھ گئیں۔ اس کے بعد اس سخن سنج اور سخن فہم نے خواجہ حافظ کی یہ غزل چھیڑ دی ؎

یا رب آں شمع شب افروز ز کاشانۂ کیست ۔۔۔ جان ما سوخت بپرسید کہ جانانۂ کیست

حالیا خانہ بر انداز دل و دین من است ۔۔۔ تا ہم آغوش کہ می باشد و ہم خانۂ کیست

اس شعر کو مکرر سہ کرر گایا ؎

یا رب ایں شاہ وش و ماہ رخ و زہرہ جبیں
دُر یکتائے کہ و گوہر یک دانۂ کیست

اس غزل سے عالم ہی اور ہو گیا، سب کی حالت متغیر تھی اور وہ شرما کر سر جھکائے جس طرح گا رہی تھی ہرگز نہیں اٹھاتی تھی اور چند غزلیں گانے کے بعد اس نے یہ شعر گائے ؎

در عین سینۂ من زخم بے نشاں زدۂ ۔۔۔ بحیرتم کہ عجب تیر بے کماں زدۂ

کجا روم بکہ گویم و چہ چارہ کنم ۔۔۔ کہ تیر عشق مرا در درون جان زدۂ

یہ شعر گاتے ہوئے اس نے کنکھیوں سے میر صاحب کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور زیر لب کچھ کہا اور میر صاحب تڑپ کر رہ گئے۔

اس دوسری ملاقات کے بعد میر صاحب کو یقین ہو گیا کہ جس پردہ غدا میں اس کے مل میں بھی او سکے لیے جگہ ضرور ہے۔ میر صاحب کی اس گرفتاری پر ابھی کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ محمد اعظم نے راستے میں مل کر میر صاحب کو یہ خبر وحشت اثر سنائی کہ جس انگریز کا نذ نگ آفیہ کی سرکار میں یہ طائفہ ملازم تھا اس کی بدلی کلکتے ہو گئی ہے۔ اس نے طائفے کو جواب دے دیا۔ اب ہم تلاش روزگار میں ہر ایک صاحب کے پاس جا رکھ جاتے ہیں۔ یہ سنتے ہی میر صاحب کے ہوش اڑ گئے۔ بوکھلائے پھرتے تھے کہ ابن الدین مرحوم کی ایک بیاض میں انہیں "عمل عقد الطریق" نظر آگیا۔ حساب کیا تو وہی دن عمل کے واسطے معین تھا اس کو نیک شگون سمجھ کر عمل پڑھا۔ چار روز اسی بیدو دھا میں گزرے۔ چوتھے دن اپنے خدمت گار کو خبر لانے کے لیے محمد اعظم کے پاس بھیجا تو وہ خود ہی سراسیمہ پریشان چلا آیا۔ اب اسے "عمل عقد الطریق" کی برکت سمجھئے یا بخت و اتفاق، معلوم ہوا کہ اسی رات گلبدن بی خانہ خراب کسی انگریز کے ساتھ بھاگ گئی۔ ہر چند تلاش کیا پتہ نہیں ہوا۔ تنے بڑے کارخانے کا دار و مدار اسی کی ادائی پر تھا۔ اب کہاں کا سفر اور کہاں کا قیام۔ اس کے بعد میر صاحب نے کچھ ایسی چال چلی اور کچھ ایسی ترکیبیں بتائیں کہ منگ صاحب جن کے پاس وہ خود منشی تھے اس طائفے کو ملازم رکھنے پر آمادہ ہو گیا۔ اسی کے طور پر پہلا مجرا ہوا تو آپ بھی اس میں موجود تھے۔ خانم جان سے حافظ کی یہ غزل گانے کی فرمائش کی ؎

حالِ دل با تو گفتنم ہوس است — خبرِ دل شنفتنم ہوس است
طمعِ خام بیں کہ قصہ فاش — از رقیباں نہفتنم ہوس است
شبِ قدرے چنیں عزیز و شریف — با تو تا روز خفتنم ہوس است
آں کہ در دانہ چنیں نازک — در شبِ تار سفتنم ہوس است

خانم جان نے میر صاحب کی فرمائش پر یہ غزل تو گا دی لیکن اس کے بعد حافظ ہی کی ایک غزل جواباً گا دی ؎

رسید مژدہ کہ ایامِ غم نخواہد ماند — چناں نماند و چنیں نیز ہم نخواہد ماند
غنیمتے شمر اے شمع وصلِ پروانہ — کہ ایں معاملہ تا صبح دم نخواہد ماند
سحر ز ہاتفِ غیبم رسید مژدہ بگوش — کہ کس ہمیشہ گرفتارِ غم نخواہد ماند

صاحب کو اس طائفے کے مردوں کا گانا اور عورتوں کا رقص و سرود بہت پسند آیا اور وہ ان کی سرکار میں ملازم رکھ لیا گیا۔ جب تک گلبدن اس طائفے میں رہی، اعظم جی اور مرزائی نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ خانم جان سے پیشہ کرائیں گے۔ وہ بھاگ گئی تو مجبوراً اس کے لیے راضی ہو گئے۔ میر صاحب نے نوکر رکھانے کو اس طائفے کو منگ صاحب کے پاس نوکر رکھا دیا لیکن دل میں پیچ و تاب کھاتے رہے کہ اب خانم جان صاحب سے کیسے بچی رہے گی۔ جس دن یہ طائفہ نوکر ہوا اسی رات کو ان حرام خوروں نے معمول کے مطابق خانم جان کو بنا سنوار کر صاحب کے پاس پہنچا دیا۔ وہ چلی تو گئی لیکن جب صاحب نے دست درازی کا قصد کیا تو اس نے اور بیداد مچائی اور زار و قطار رونا شروع کیا جس سے صاحب کے آنے کے حواس غائب ہو گئے۔ آدھی رات تک یہی حالت رہی۔ آخر مرزائی کو بلا کر کہا کہ جب یہ بی بی راضی نہ تھا تو کیوں تم نے بھیجا۔ ہم کو زبردستی کے ساتھ ضرورت نہیں اور اس وقت بی جان کو بھیج دو۔ خانم جان کی جگہ بی جان بھیج دی گئی اور خانم جان کی ناموس محفوظ رہی۔

اب یہ طائفہ مستقل طور پر صاحب کے بنگلے کے احاطے ہی میں میر صاحب کی قیام گاہ کے سامنے خیمہ لگا کر رہنے لگا۔ بی جان تو مستقل طور پر صاحب کی داشتہ بن گئیں اور خانم جان بھی گانا سنانے، ناچ دکھانے اور اپنی شوخ و شنگ اداؤں سے صاحب کا دل بہلانے کے لیے نوکر رکھ لی گئیں۔

میر صاحب اور خانم جان دونوں برابر کی آگ میں جل رہے تھے۔ اس قرب مکانی نے طائفے کے باورچی کے کمسن لڑکے رحم اللہ کے ذریعے پہلے زبانی پیام و سلام اور بعد میں باقاعدہ مکاتبت کی صورت پیدا کر دی۔ خیمہ کی قنات میں ایک سوراخ کر کے تاک جھانک اور حسب حال برمحل اور پرسوز اشعار سنانے کا موقع بھی فراہم کر لیا گیا۔ جس قسم کے حالات تھے ان میں اس تعلق کا چھپانا ضروری تھا کیونکہ صاحب آقا تھے اور یہ دونوں ان کی سرکار کے ملازم، طائفے والے حرام خور تھے اور بے درد۔ خانم جان نے انتہائی دانائی اور فراست سے یہ ڈھونگ رچایا کہ وہ میر صاحب کو ناپسند کرتی ہے اور ان سے اسے بغض للّہی ہے۔ صاحب کی موجودگی میں وہ میر صاحب پر ایسی ایسی چوٹیں کرتی کہ خود صاحب بہادر کو میر صاحب کی طرفداری کرنی پڑتی اور وہ خانم جان سے کہتے کہ ہمارے منشی صاحب بہت نیک آدمی ہیں، پارسا ہیں، ایماندار ہیں، لائق ہیں، قابل ہیں، ان کے ایسے ہی صفات کی وجہ سے میں ان کا ادب ہی نہیں کرتا بلکہ ان سے ڈرتا ہوں لیکن مجروں میں معاملہ ہی کچھ اور ہوتا۔ میر صاحب کسی درد انگیز غزل کی فرمائش کرتے، وہ خانم جان گا دیتی اور پھر اس کے جواب میں آپ ہی کوئی برمحل غزل چھیڑ دیتی۔ یہ راز و نیاز دونوں میں ہوتے اور اس کی کراماً کاتبین کو بھی خبر نہ ہوتی۔ کبھی کبھار چوٹ کرنے میں رنجش کی نوبت بھی آ جاتی نامہ و پیام اور قنات کے پاس کھڑے ہو کر تانکا جھانکی سب بند ہو جاتی لیکن مجرے کی محفلوں میں پھر ایک بار ترجمانِ غیب کی بہترین غزلیں دونوں کے دلوں کی ترجمانی بنتیں اور پھر دل صاف ہو جاتے۔

ادھر خط و کتابت بھی جاری تھی۔ سید حسن شاہ کے خطوں میں بے نکے پن سے اظہارِ عاشقی اور "تمنائے وصال" کے سوا اور کچھ نہ ہوتا۔ خانم جان کے خط جو بڑے سلیقے سے لکھے ہوتے ان میں یہی جواب ہوتا ہے کہ چند سے اور صبر کرو میں تمھاری ہو چکی لیکن مجھ پر اسی وقت تصرف کر سکو گے جب کہ قانونی طور پر بھی تم مجھے اپنا لو۔ حرام کاری میری فطرت سے دور ہے۔ اگر یہی مقصود ہوتا تو میں کب کی اپنے جسم کا سودا کر چکی ہوتی۔ اسی درمیان میں خانم جان نے سید حسن شاہ کی محبت کا ایک امتحان بھی لے لیا۔ اس کی نانی کی ہم جولی ہم پیشہ ایک ڈیرے دار رنڈی کی اکلوتی حسین و جمیل بیٹی تھی۔ یہ عورت جو بے حساب روپیہ کما چکی تھی چاہتی تھی کہ اپنی بیٹی کسی مردِ شریف سے بیاہ دے۔ خانم جان نے ایک بہانے سے یہ لڑکی میر صاحب کو دکھا دی اور پھر انھیں لکھا کہ چاہو تو اس لڑکی سے تمھارا نکاح کرا دوں۔ میر صاحب نے جب اس سلسلے میں صاف جواب دے دیا تو تب کہیں جا کر ان کی محبت پر اسے بھروسہ ہوا۔

اتفاق دیکھیے چند ہی دنوں بعد اس لڑکی کی مسّی کی رسم ٹھہر گئی۔ اس تقریب میں شریک ہونے کے لیے پورا طائفہ تیاری کرنے لگا۔ عین تقریب کے دن خانم جان نے میر صاحب سے کہا کہ آج اپنا بنگلہ خالی رکھو اور چار شخص مل سکیں تو بہتر ورنہ دو ہی آدمی تجویز کر رکھو ملن بھروہ ہو بہو جو بتاؤ۔ سنگھار اور کنگھی چوٹی میں مصروف رہی لیکن جب چلنے کا وقت آیا تو اٹواٹی کھٹواٹی لے لحاف اوڑھ پلنگ پر لیٹ گئی۔ مرزائی نے پوچھا تو کہا ابھی میرے سر میں شدت کا درد ہونے لگا اور اعضا شکنی سی معلوم ہوتی ہے۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے تھم گئے۔ ادھر صاحبِ تقریب کے پاس سے آدمی پر آدمی آنے لگے۔ مرزائی نے سب کو بھیج دیا، آپ رہ گئی لیکن خانم جان نے چار گھڑی رات گئے ہم قومی کا واسطہ دے کر اسے بھی بھیج دیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ میر صاحب کے بنگلے میں آ گئی۔ میر صاحب نے پہلے ہی چار اجنبی

غریب مسلمانوں کو بلوا لیا تھا اور انھیں کھانا کھلا کر بٹھا لیا تھا کہ یہاں آج ایک شخص کا نکاح ہے اس سے فراغت کر کے آپ کو رخصت کر دوں گا۔ خانم جان آ گئی تو ان چار آدمیوں کے سامنے تعین مہر کے بعد میر صاحب نے ایجاب و قبول کے الفاظ کہے اور انھیں کچھ دے دلا کر رخصت کر دیا۔

شب وصل جس لطف سے گزری اس کا احوال تو سید حسن شاہ کی زبانی سننا اور روبرو قدم بہ قدم ہم کے چلتے ہیں جو غلغلے ہر عاشقی کی صورت میں ہیں، اصل کتاب ہی میں پڑھنا مناسب ہوگا۔ مختصر یہ کہ میر صاحب کی ہوس رانی نے تیتری نازک اندام خانم جان کو شدت کے بخار میں مبتلا کر دیا اور جو دو سنگ بیماری کا رہا یا گیا تھا وہ اسہال کی صورت اختیار کر گیا۔ کسی کو شبہ ہوا نہ کسی کے کانوں کان خبر ہوئی۔ میر صاحب اور خانم جان باقاعدہ میاں بیوی بن گئے۔

عشق است و ہزار بدگمانی تو یہ کہ ان محبت کا تقاضا یہ ہوا کہ تھوڑی بہت شکر رنجیاں بھی آپس میں شروع ہو گئیں۔ ہر بار نہ جانے غیب کی غزلوں ہی کو ترجمانِ دل بنایا گیا۔ ادھر سے ایک غزل کی فرمائش، ادھر اس غزل کا جواب بھی سنا دیا جاتا۔ غرض بڑے حریفانہ راز و نیاز کے بعد دل صاف ہوتے۔

پوشیدہ رشتہ ازدواج کے باوجود خانم جان کو میر صاحب کے پاس پہنچنے کا موقع ہی نہ ملتا تھا۔ میر صاحب تو تھوڑی بہت آہ و زاری کے بعد جوانی کی نیند کے مزے لیتے لیکن خانم جان اکثر رات کے پاس کھڑی ہو جاتی اور میر صاحب کو بنگلے کے برآمدے میں سوتا ہوا دیکھا کرتی۔ ایک بار بارش ہونے لگی۔ میر صاحب جاگے۔ قنات کی طرف نظر کی تو ایسا معلوم ہوا وہاں کوئی کھڑا ہے۔ آپ کا کلیجہ کا کیا کہنا، پہلا خیال یہی آیا کہ شاید چور ہے۔ طپنچہ تکیے کے نیچے سے نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ پھر خیال آیا شاید خانم جان ہوں گی، آہستے ایک شعر پڑھا، ادھر سے جواب آیا ؎

واقفے نیست ز دردِ دلِ ناتوانِ من!
یک بلب رسید ز دردِ تو جانِ من

یہ ایک گرد و ڑے خانم جان کو گود میں اٹھا لائے، دیکھا سر سے پیر تک بارش میں بھیگ چکی ہے۔ رات سے دانت بج رہے ہیں۔ جب ذرا بات کرنے کے قابل ہوئی تو اپنا دردِ دل رو رو کر سنایا، مستقبل کے اندیشوں کا ذکر ہوا۔ میر صاحب نے بھی کچھ آہ و زاری کی لیکن آخر میں کچھ اور ہی مطالبہ کر بیٹھے۔ یہ سنتے ہی وہ نہایت برہم ہو کر بولی اس قدر بے حیائی کیا ضرور ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم اسی بات کے طالب ہو۔ اگر ایسا ہے تو یہ میری کاہشِ جان اور سوہانِ روح کا باعث ہے۔ میر صاحب نے جواب دیا اے میری جان ایں امر خلاصۂ معاملات است۔ اس نے کہا شاید ہو بھی مگر اس طرح اس کے سبب سے گرویدہ اور بندۂ ہوس ہونا از صاحبانِ لطافت مزاج خوش طبع بسیار امش نہایت نازیبا و ناگوار است۔ میر صاحب نے جواب دیا کہ اپنا تو یہ عقیدہ ہے کہ ؎

گذشتہ خواب و آئندہ خیال است
غنیمت دان ہمی دم را کہ حال است

جواب دیا کہ ہاں ع

فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا۔ قریب قریب ایک سال اس طائفے کو منگ صاحب کی خدمت میں بسر ہو چکا تھا۔ خانم جان اور میر صاحب کے ذہنوں میں ابھی اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی خاکہ پوری طرح بھی نہ پایا تھا کہ یک بیک خبر آئی کہ منگ صاحب کی بدلی کانپور سے کلکتہ ہو گئی۔ منگ صاحب نے طائفے کا حساب کتاب کر کے بی جان، خانم جان وغیرہ کو انعام اکرام دے کر طائفے کو موقوف کر دیا اور کلکتے جانے کی تیاری کرنے لگے۔ ان دنوں میر صاحب اور خانم جان پر جو کچھ گزر رہا ہے اس کا اندازہ وہی لگا سکتے ہیں جن پر ایسی واردات گزری ہو۔ رو رو کر دونوں کا برا حال تھا اور کوئی تدبیر سوجھتی ہی نہ تھی۔ آخر بی جان نے پھر یہی کہا کہ ہوبلر صاحب کے پاس چنار گڑھ چلنا چاہئے کہ اس سے پہلے بھی بی جان انہی صاحب سے وابستہ رہ چکی تھی۔ خانم جان کا یہ اندیشہ درست تھا کہ یہاں تو وہ منگ صاحب کی شرافت کی وجہ سے بچ گئی، ہر شخص منگ صاحب نہیں ہوتا۔ بی جان خود لالچ سے کسب پر مجبور کر دیں تو کیا ہوگا۔ میر صاحب نے خانم جان کو لے بھاگنے کا ارادہ کیا۔ وقت پر گھوڑے سے منشا اور اس کی عملی صورت بھی نہ نکلی۔ ادھر طائفے نے چنار گڑھ جانے کے لیے کشتی تلاش کرنی شروع کر دی۔ اب میر صاحب نے یہ تدبیر سوچی کہ طائفے کی بڑی کشتی کے روانہ ہونے کے کچھ دیر بعد یہ اس کے پیچھے ایک چھوٹی سی تیز رفتار کشتی لے کر روانہ ہو جائیں، جیسے ہی موقع ملے، خانم جان بڑی کشتی سے میر صاحب کی کشتی میں منتقل ہو جائیں۔ دریائی سفر میں طائفے کو پیچھا کرنے میں بہت دشواریاں پیش آئیں گی۔ یہ تجویز پکی ہو گئی اور میر صاحب نے ایک کشتی بھی کرایہ پر لے لی۔ آخری بار جو مجرا ہوا اس میں خانم جان نے ایسی ایسی پرسوز غزلیں گائیں کہ مجلس کی حالت متغیر ہو گئی۔ ؎

ما برفتیم تو دانی و دل غم خور ما — بخت بد تا بہ کجا می برد آبشخور ما
بدعا آمدہ ام ہم بدعا دست برار — کہ وفا با تو قرین باد و خدا یاور ما
بسرت گر ہمہ عالم بسرم جمع شوند — نتواں برد ہوائے تو برون از سر ما
فلک آوارہ بہر سو کندم می دانی — رشک می آیدش از صحبت جاں پرور ما

گر بپرسد کہ کجا رفت ازیں جا حافظ
گو بزاری سفرے کرد و برفت از بر ما

سب کی حالت قابل بیان نہیں، حد یہ کہ ہر موقع پر ضبط و تحمل سے کام لینے والی خانم جان بھی کھل کر زار زار روئی اور پھر یہ غزل شروع کی ؎

فاش می گویم و از گفتۂ خود دل شادم — بندۂ عشقم و از ہر دو جہاں آزادم
طائر گلشن قدسم چہ دہم شرح فراق — کہ دریں دام گہ حادثہ چوں افتادم
من ملک بودم و فردوس بریں جایم بود — آدم آورد دریں دیر خراب آبادم
کوکب بخت مرا ہیچ منجم نشناخت — یا رب از مادر گیتی بچہ طالع زادم

اس شعر پر سب بے قرار ہو گئے اور بار بار گاتی تھی اور اگلا شعر بھی تکرار کیا ؎

می خورد خون دلم مردمک چشم سزاست — کہ چرا دل بہ جگر گوشۂ مردم دادم

پھر ایک آہ سرد کھینچی اور کہا، ہائے میری مٹی خراب ہوتی، کاش میں پیدا ہی نہ ہوتی!

ادھر قسمت کی گردش دیکھیے، منگ صاحب نے میر صاحب کو بلا کر کہا کہ پانچ مہینے سے حساب نہیں ہوا ہے، عنقریب دورہ پیش ہے اس لیے مہاجنوں کا چکوتہ جلد کر دینا چاہیے۔ حکمِ حاکم مرگِ مفاجات۔ میر صاحب نے دن رات بیٹھ کر حساب کتاب درست کیا اور کاغذات صاحب کے ملاحظے میں پیش کر دیے۔ جس دن طائفہ چنار گڑھ کے لیے رخصت ہونے والا تھا اس دن صاحب کو کسی وجہ سے فرصت نہ تھی، انھوں نے کاغذات نہ دیکھے اور کہا کل دیکھیں گے۔ یہ سن کر میر صاحب کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ پھر سوچا ایک دو روز میں طائفے کی کشتی زیادہ سے زیادہ تیس پینتیس میل جائے گی۔ میری کشتی چھوٹی ہے بڑی کشتی کے چنار گڑھ پہنچتے پہنچتے میں اس کو جا لوں گا۔ قصہ مختصر اسی روز طائفہ رخصت ہوا، رخصتی کا منظر روزِ حشر سے کم نہ تھا۔ طائفہ کا کوئی آدمی ایسا نہ تھا جو دھاڑیں مار کر نہ روتا تھا۔ میر صاحب بھی روتے روتے نڈھال تھے لیکن خانم جان کا عجیب حال تھا۔ ایک سکوت کے عالم میں تھی۔ نہ آنکھ میں آنسو تھا نہ لب پر کلام مگر چہرے پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا مگر واہ رے ضبط، اگر ہونٹ سل جائیں تو ہونٹ کاٹ کر پھینک دے۔ اگر زبان سے اُف نکلے تو زبان کھینچ لے۔ پیشانی پر شکن نہیں، چہرے پر بل نہیں۔ سب اٹھ کر چلنے لگے تو میر صاحب نے بھی تھوڑی دور مشایعت کی۔ آخر رخصتی سے میر صاحب کے ہاتھ چومے، ہر شخص انتہائی رنج و ملال کے ساتھ میر صاحب سے رخصت ہونے لگا۔ روتے روتے ہر ایک کی ہچکیاں بندھی تھیں۔ کوئی اپنے ہوش میں نہ تھا مگر وہ متحمل مزاج، وہ مستقل طبع، وہ دل کے جوش کو روکنے والی خانم جان اسی طرح بہ صورت چپ خود فراموشی کے عالم میں نہ روتی تھی نہ کوئی لفظ کہتی تھی، ہاں جب سلام کر کے آگے بڑھی تو میر صاحب کے نزدیک سے ہو کے نکلی اور یہ مصرع آہستہ سے پڑھا ع

ما برفتیم تو دانی و دلِ غم خورِ ما!

اعظم جی کا طائفہ تو کشتی میں سوار ہو کر روانہ ہو گیا، لیکن اس کے روانہ ہونے کے چار روز بعد تک بھی حساب فہمی سے میر صاحب کو چھٹکارا نصیب نہ ہوا۔ مجبوراً صاحب سے آٹھ دن کی مہلت لے کر وہاں سے چھوٹتے ہی تیز رفتاری سے کشتی میں بیٹھ چنار گڑھ کی طرف روانہ ہو گئے۔ کڑا مانک پور کے آگے انھیں دورا ملا۔ یہ سیدھے آگے بڑھ گئے اور نہایت تیز رفتاری سے الہ آباد پہنچ گئے لیکن کہیں بھی اس بڑی کشتی کا پتہ نہ چلا۔ ملاحوں نے کہا کہ چاہے کوئی کشتی کتنی ہی تیز رفتار ہو، اتنی مدت میں ہم سے آگے الہ آباد نہیں پہنچ سکتی۔ معلوم ہوتا ہے وہ کشتی دور ہی سے دوسرے رستے پر چلی گئی۔ میر صاحب مایوس اور نامراد لوٹ آئے۔

کانپور آ کر میر صاحب نے باقی حساب تیار کرنا شروع کیا۔ آگے کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ چنار گڑھ سے ہولیر صاحب کی چٹھی ہنگ صاحب کے نام آئی کہ اعظم جی کا طائفہ یہاں پہنچ گیا اور میں نے بی جان کو نوکر رکھ لیا لیکن اعظم جی کی بیٹی خانم جان کو یہاں کی آب و ہوا راس نہ آئی۔ وہ یہاں آتے ہی بیمار پڑ گئی، اس کے علاج کے لیے یہ لوگ اسے لکھنؤ لے گئے ہیں۔ یہ اطلاع پا کر میر صاحب ایک ہرکارے کو لکھنؤ بھیجنا ہی چاہتے تھے کہ صاحب کے نام ایک عرضی اور میر صاحب کے نام ایک خط مرزائی کا پہنچا کہ کانپور سے نکلتے ہی راستے میں خانم جان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ چنار گڑھ پہنچ کر حالت بگڑ گئی، علاج کے لیے اسے ہم لکھنؤ لے جا رہے ہیں۔ اس سے پہلے میر صاحب کے نانا نے اس کا علاج کیا تھا اس سے اسے صحت ہوئی تھی۔ اب بھی بار بار وہ یہی کہتی ہے کہ بڑے حکیم صاحب کے علاج سے مجھے صحت ہو جائے گی، اس لیے آپ سے درخواست ہے کہ بڑے حکیم صاحب کو کسی طرح میر صاحب کے ہمراہ لکھنؤ روانہ فرمانے کا انتظام فرمائیں۔ میر صاحب نے اپنے نانا کو لے کر لکھنؤ جانے کی

تیاری شروع کی تو صاحب نے اجازت تو دے دی لیکن حساب فہمی کے بغیر جانے سے منع کیا۔ ادھر وہ معاملات حساب صاف کرنے میں الجھ گئے اور دن پر دن نکلتے رہے۔ حساب فہمی سے فراغت ہوئی تو ناصاحب نے اسباب سفر باندھتے ہیں اور کچھ دن نکالے مختصر یہ کہ جب وہ لکھنؤ پہنچے ہیں، حد درجہ حساس اور ضابطہ خانم جان فراق کے جاں گداز صدمے اٹھا کر اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر چکی تھی۔ یہاں باورچی کے لڑکے نے میر صاحب کو خانم جان کا وہ خط دیا جو اس نے مرنے سے ایک روز پہلے لکھ کر اسے دیا تھا۔ اس میں شرح فراق کے بعد وصیت کی تھی کہ میری جان نزع طبعی نظر نہیں آتی میرے بعد تم میرا غم نہ کرنا اور میرے غم میں اپنے آپ کو ہلاک نہ کرنا۔ پھر اپنی محبت کی سوگند دی تھی کہ اپنی صحت کا خیال رکھنا کہ اسی میں میری خوشی ہے۔ میر صاحب بہت روئے پیٹے، چیخے چلائے لیکن اس سے کیا ہوتا ہے، ناچار کلیجے پر صبر کا پتھر رکھ کر اپنی محبوبہ کی وصیت کی تعمیل کرتے ہوئے اپنی زندگی کے باقی دن گزارنے لگے۔

———

خلاصہ پھر خلاصہ ہی ہے۔ اس میں اصل کا لطف کہاں، اس پر کچھ میری بیانی اپنی، اندیشہ ہی نہیں یقین ہے کہ اس نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی ہوگی۔ لیکن اردو ادب کے اس شہ پارے کو متعارف کرانے کی اور کوئی صورت بھی تو اس کے سوا نظر نہیں آئی۔

اس ناول میں یوں تو کئی کردار ہیں لیکن اہم کردار تین ہی ہیں، منگ صاحب، میر صاحب اور خانم جان اور ان ہی کے گرد یہ پورا قصہ گھوم رہا ہے۔

سب سے پہلے منگ صاحب ہی کو لیجئے۔ آدمی عیاش سہی، اوباش سہی لیکن اس کے شریف ہونے میں کیا کلام ہے اور یہ بھی تو دیکھیے کہ اس وقت کی ہماری اونچی سوسائٹی میں یہ عیب عیب کب سمجھا جاتا تھا، یہ تو عین صاحب امارت، مہذب اور شائستہ ہونے کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔ ہمارے چھوٹے بڑے سب امیر اسی قسم کے مشغلوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ بیچارہ تو ان ہی لوگوں کی نقالی کر رہا تھا لیکن اس کی یہ شرافت تو کسی طرح بھلائے نہیں بھولتی کہ خانم جان کے ہر طرح اس کے قبضہ و اختیار میں ہونے پر بھی اس نے زور اور زبردستی کا سلوک اس سے روا نہ رکھا بلکہ اس کے جذبات اور احساسات کا پورا پورا احترام کیا۔ اسے بھی دوسری عورت کے برابر تنخواہ دے کر صرف اس کی شوخ و شنگ اداؤں اور بے نظیر ذہانت و ذکاوت ہی سے جی بہلانے پر اکتفا کیا۔ بعض بدگمان طبائع کی طرح شاید آپ بھی اس واقعہ پر شبہ کا اظہار کریں، اسی لیے منشی سجاد حسین نے بحیثیت مترجم اس واقعہ پر نوٹ لکھنا ضروری سمجھا کہ:-

"ایک صاحب نے مجھ سے یہ کتاب لے کے دیکھی، بہت محظوظ ہوئے اور خانم جان
کی بہت تعریف کی۔ اس کے بعد تعجب سے فرمانے لگے، منگ صاحب نے خانم جان
کو چھوڑ دیا ہوگا اور وہ عاصمہ رہی ہوگی؟ میں نے کہا، وہم کا علاج تو لقمان کے پاس بھی نہیں۔"

پھر اسی واقعہ کا مقابلہ ہمارے حاکموں، رئیسوں، فاتحوں اور مجاہدوں کی ہوس رانیوں کی ہولناک داستانوں سے کیجیے۔

دیکھیں جانیے' تقریباً قریب اسی عہد کی ایک مومنی "مجاہد" اور "رحمۃ اللہ علیہ" اور "انار افضل بیگ" کے حاشیہ لکھوں کے ساتھ یاد کی جانے والی ایک تاریخی شخصیت کے طرزِ عمل سے سمجھئے اور اس پر بھی اپنے "مشرقی" اخلاق اور کردار کے مداح خواں ہیں۔ محمد شاہ رنگیلے کی ایک لڑکی تھی حضرت بیگم' حسن و جمال میں ڈھونڈے سے اس کا ثانی نظر نہ آتا تھا۔ اس کی سولہ سال کی عمر تھی کہ عالمگیر ثانی نے ساٹھ سال کی عمر میں اس سے زبردستی شادی کرنی چاہی لیکن اس نے صاف انکار کیا اور زیادہ دق کرنے پر زہر کھا لینے کی دھمکی دی' اس پر خفا ہو کر عالمگیر ثانی نے اسے قید تنہائی میں ڈلوا دیا۔ ابھی وہ قید تنہائی کی سزا بھگت ہی رہی تھی کہ احمد شاہ ابدالی قہرِ خداوندی کی صورت میں دلی پر نازل ہوا۔ امرا اور عوام کو طرح طرح کی اذیتیں دے دے کر ان کا مال و منال ان سے چھیننے کے سوا ان مجاہد اور غازی صاحب نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کی حسین بہو بیٹیاں بھی ان سے چھینیں۔ انہی میں حضرت بیگم بھی پکڑی ہوئی آئی۔ ساٹھ سالہ عالمگیر ثانی میں انسانیت کی اتنی خوبو باقی تھی کہ اس نے حضرت بیگم کے انکار پر اسے قید میں ڈلوا دیا لیکن ۶۵ سالہ مجاہد صاحب پر اس کی آہ و زاری کا ذرا بھی اثر نہ ہوا اور آپ نے حضرت بیگم سے نکاح پڑھوا ہی لیا!

اپنے ملازموں سے ننگ صاحب کا سلوک بھی مثالی ہے۔ میر صاحب اس کے خانگی تنخواہ یاب ملازم ہیں لیکن وہ ان سے برابری کا سلوک کرتا ہے۔ عیش و طرب کی محفل ہو کہ کاروبار کی مجلس انھیں ہمیشہ اپنے برابر کرسی دیتا ہے۔ وہ میر صاحب کی شرافت' ایمان داری اور سلیقہ مندی کا معترف اور دل سے ان کا قدردان ہے۔ وہ بڑے ظرف کا آدمی ہے۔ اسے اپنی داشتہ اور ملازم عورتوں کے سامنے یہ کہتے بھی باک نہیں کہ میرے منشی صاحب بڑے سچے خیر خواہ ہیں۔ وہ مجھ سے زیادہ لائق ہیں اور صدق و صفا کے پاک باز ہیں۔ میں ان کی انہی صفات کی بنا پر ان سے ڈرتا ہوں۔ حالانکہ عام طور پر کم ظرف آدمی اس قسم کی عورتوں کی موجودگی میں پھول کر ایسے پھیلتے اور پیر پھیلاتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ خوش طبعی اور ظرافت ننگ صاحب کی طبیعت کا ایک بڑا وصف ہے۔ وہ اپنے ملازمین سے برابری کی چہلیں اور چہلیں کرتا ہے۔ ننگ صاحب کے بعد آنے والے انگریزوں سے اس شریف انگریز کے برتاؤ کا مقابلہ کیجیے جو ہندوستانیوں کو منہ لگانا گوارا نہ کرتے تھے اور ان سے میل جول کو اپنے لیے عار سمجھتے تھے اسی لیے منشی سجاد حسین بحیثیت مترجم ایک فٹ نوٹ میں بے اختیار اس کو خراجِ تحسین ادا کر گئے ہیں:۔

"حسن شاہ اور خانم جان تو صاحب معاملہ تھے مگر صاحب بہادر بڑے مسخرے
تھے۔ جہاں دیکھو ٹپکے پڑتے ہیں۔ افسوس اب ایسے انگریز نہیں آتے ورنہ ہم بھی
بتا دیتے۔"

ننگ صاحب بڑے دل کا آدمی ہے شاہ خرچ ہے' فیاض ہے' وہ روپے پیسے کو عزیز رکھنے والا حریص آدمی نہیں' انسان دوست اور انسانیت نواز آدمی ہے۔

ننگ صاحب اس وقت کی سب سے مقبول ہندوستانی زبان اردو میں نہایت روانی کے ساتھ گفتگو کرتا ہی تھا لیکن اس کے سوا اسے فارسی زبان اور فارسی ادب پر بھی اچھا خاصا عبور حاصل تھا۔

اب ناول کے ہیرو سید حسن شاہ کو لیجئے۔ سید زادے ہیں' میر صاحب کہلاتے ہیں' اپنے زمانے کے لحاظ سے اچھے خاصے تعلیم یافتہ ہیں۔ انھیں بھی خانم جان سے محبت ہے لیکن ان کی محبت کے تصور میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ وہ لاکھ پاکباز سہی' پھر بھی

محبت کے بارے میں ان کا تصور جسمانی اتصال اور مادی وصال سے آگے نہیں بڑھتا۔ انھیں ہوس کار تو نہیں کہا جا سکتا لیکن ہوس کا ان کی محبت، مثالی نہیں۔ محبت وہ بے شک کرتے ہیں لیکن بے محابا محبت اور اس راہ میں اپنی متاع عقل و دین لٹانے کی لذت سے وہ ناآشنا ہیں۔ بقول مولانا نیاز فتح پوری :-

"نشتر اور تیر عشق دونوں کے مطالعے کے بعد صرف یہی نہیں ہوا کہ میں اشک باری پر مجبور ہو گیا ہوں بلکہ اس کے ساتھ غصہ کی بھی کیفیت مجھ پر طاری ہوئی اور ان کے مصنفوں کو میں نے بہت برا بھلا کہا کیونکہ ان دونوں کے ہیرو قریب قریب ایک ہی قسم کے کند حس رکھنے والے ہیں۔ .... ناول نشتر میں جب ہیروئن نے جان دی تو ہیرو بھی بہت متاثر ہوا۔ لیکن یہ تاثر اس سے زیادہ نہ تھا کہ جب حضرت قبر پر فاتحہ پڑھنے گئے اور اتفاق سے ان کا جوتا گڑھے میں گر گیا تو ان کو سب سے پہلے یہ فکر لاحق ہوئی کہ یہاں سے ننگے پاؤں کیونکر جاؤں گا اور آخرکار ایک رستمانہ عزم کے ساتھ انھوں نے جوتا نکال کر اس مہم کو سر کر ہی لیا۔"

سید حسن شاہ معمولی سوجھ بوجھ کے آدمی ہیں۔ ذکاوت اور ذہانت میں وہ خانم جان کے پاؤں پاسنگ بھی نہیں۔ منگ صاحب کی موجودگی میں خانم جان نے جیسی خوب صورت شوخیاں کی ہیں ان کے جواب میں میر صاحب کی بھونڈی حرکتیں دیکھ کر ان کی عقل و دانش پر رونے کو جی چاہتا ہے۔ کتاب میں انھوں نے اپنے وہ خط بھی درج کیے ہیں جو انھوں نے خانم جان کے نام لکھے تھے۔ غالب کی زبان میں یہ خط محمد شاہی رسم مکتوب نگاری کا بہت اچھا نمونہ ہیں۔ وہی گز گز بھر کے پُرتکلف آداب و القاب اور وہی مقصد مکتوب سے دور پُرتصنع مضمون آرائی۔

سید حسن شاہ اور خانم جان کے کردار کا یہ فرق بھی بھلایا نہیں جا سکتا کہ سید حسن شاہ نے سید زادہ ہونے کے باوجود، لاکھ پس و پیش کے ساتھ سہی، اپنی محبوبہ کو صاحب کے نذر کرنے سے دریغ نہیں کیا اور خانم جان نے باوجود طوائف زادی ہونے کے اپنی عزت و آبرو اور اپنی عفت و عصمت کو بچانے میں اپنی حد تک کوئی کسر اٹھا نہ رکھی!

خانم جان طوائف زادی سہی لیکن عفت و عصمت کے معاملے میں پوری شریف زادی ہے۔ ہرجائی ہونا تو ایک طرف رہا، محبت کے بارے میں اس کا تصور نہایت درجہ اونچا اور پاکیزہ ہے۔ اس کی محبت میں گہرائی ہے، دردمندی ہے، سوز ہے، تڑپ ہے۔ اس کے نزدیک محبت صرف جسمانی اتصال اور مادی وصال کا نام نہیں، روحانی اتحاد اور دلی ملاپ کا نام ہے—— سید حسن شاہ کی محبت اور اپنی محبت کے فرق کو وہ بھی محسوس کرتی ہے اور اس پر اپنا کلیجہ مسوس کر رہ جاتی ہے۔ وہ جتنی صورت شکل کی حسین و جمیل ہے، اتنی ہی ذکی اور ذہین بھی ہے۔ اسی ذکاوت اور ذہانت کا نتیجہ اس کی بے پناہ شوخی اور پُرلطف شرارت ہے۔ وہ بے محابا محبت کرنا بھی جانتی ہے اور حد درجہ ضبط و تحمل سے کام لینا بھی اسے آتا ہے۔ وہ بے انتہا حساس بھی واقع ہوئی ہے، اور اسی زود حسی نے آخرکار اس کی جان پر بنا دی۔ طبیعت عشق کی خوددار بھی ہے، خانم جان محبت کی آگ میں سراپا جلنے کے باوجود بہت خوددار بھی ہے۔ اس سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہیں ہوتی جس سے اس کی محبت کی رسوائی ہو۔ حد یہ ہے کہ اسے اپنے محب اور محبوب

کو بھی کوئی ایسی حرکت گوارا نہیں ہوتی جس سے اس کی محبت کی توہین ہوتی ہو۔

خانم جان شعر و سخن کا بڑا اچھا مذاق رکھتی ہے۔ وہ برمحل اتنے اچھے شعر پڑھتی اور سنانی اچھی غزلیں گاتی ہے کہ اس کے اس پاکیزہ ادبی ذوق پر بھی لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔ دیوانِ حافظ کی تو وہ گویا حافظ ہے۔ بعض موقعوں پر اس نے اتنی برمحل غزلیں منتخب کی ہیں گویا وہ غزلیں اسی موقع کے لیے لکھی گئی تھیں۔ میر صاحب کے خطوط کے مقابلے میں اس کے خطوط رسمی تکلف سے عاری ہیں۔ ان خطوط کے القاب و آداب مختصر مگر بڑے جاندار ہیں۔ ان میں کسی رسمی تکلف اور ہیر پھیر کے بغیر راست حرفِ مطلب زبانِ قلم پر آتا ہے۔ خانم جان کے خطوں کے ایک ایک لفظ سے لکھنے والی کا خلوص، اس کے جذبے کی گہرائی اور اس کی دردمندی جھلکی پڑتی ہے۔ القاب کے اختصار اور راست مطلب نگاری کے لحاظ سے غالب کے خطوط سے یہ خط بہت ملتے جلتے ہیں۔

مختصر یہ کہ خانم جان ہر طرح محبت کرنے اور جان چھڑکنے کے قابل کردار ہے۔ سید حسن شاہ خوش بخت تھے جو ایسی پیاری شخصیت کو چاہنے اور اس سے چاہے جانے کی سعادت سے سرفراز ہوئے۔

اس مضمون کی ابتدا میں صاحبِ "نشتر" پر جناب عشرت علی صدیقی کے مضمون کا ذکر آ چکا ہے۔ اس میں اور سب باتیں تو ٹھیک ہیں لیکن "نشتر" کی ادبی قدر و قیمت کے تعین میں صدیقی صاحب نے سخت ناانصافی سے کام لیا ہے اور لکھ دیا ہے کہ "ناول کے موجودہ معیار پر ہمیں "نشتر" کو نہیں پرکھنا چاہیے بلکہ ایک عشقیہ قصہ سمجھ کر وقت گزاری کے لیے پڑھنا چاہیے۔" آپ اس ناول پر جناب نیاز فتح پوری کی "اشک باری" دیکھ چکے اب عزیز احمد کی رائے ملاحظہ فرمائیے جو بڑی حد تک اس ناانصافی کی تلافی کر دیتی ہے۔ عزیز احمد اپنی کتاب "ترقی پسند ادب" میں لکھتے ہیں:-

> "..... نشتر ایک تماش بین کی سرگذشت ہے جو غالباً میر تقی میر کا ہم عصر تھا اور جس نے فارسی میں اپنی حیاتِ معاشقہ کے متعلق یہ بے مثل کتاب لکھی۔ سجاد حسین کسمنڈوی نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا۔ معلوم نہیں اصل فارسی کتاب کہیں باقی بھی ہے یا نہیں لیکن اردو ترجمہ اردو کے چند بہترین ناولوں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے اور اس صنف کے بہترین مغربی ناولوں کے مقابل پیش کیا جا سکتا ہے۔ نقطۂ نظر تماش بین کا ہے لیکن اپنی نفسیاتِ عشق، اپنے والہانہ جذبے کے بیان میں مصنف نے کمال کر دیا ہے۔ قصہ کی ٹریجڈی، ورتھر کی "داستانِ غم" سے کم پُراثر نہیں۔ تفصیلات ایک ایسی زندگی پر سے پردہ اٹھاتی ہیں جو اگر ناول نہ لکھا جاتا تو شاید ہمیشہ فراموش اور نامعلوم رہتی۔ انگریزی قبضے کے ابتدائی زمانے میں شریف انگریزوں کی نوکر پیشہ داشتہ اور دونوں طبقوں کا ادبی ذوق، حافظ کی غزلوں کا زندگی پر اثر، کوئی اور کتاب اس زمانے کی زندگی کے اس پہلو پر روشنی نہیں ڈالتی اور اس پس منظر سے مصنف اور خانم جان کے پوشیدہ اور والہانہ عشق کا جو نقشہ اُبھرتا ہے، وہ دنیا کے افسانہ کے چند بہترین نقشوں میں سے ہے۔"

حیدرآباد کے مزاح اور طنز نگار

نصیر الدین ہاشمی

اُردو زبان میں مزاح اور طنز نگاری کا آغاز نظیر اکبر آبادی اور غالب سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اخبار اودھ پنچ کے مضمون نگار اس شعبۂ ادب کے امام نظر آتے ہیں۔ اگرچہ اس سے پہلے بعض ہجوگو ایسے گزرے ہیں جن کو اس شعبہ میں منسلک کیا جا سکتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ عصر حاضر میں ادب کی اس شاخ نے ترقی کے جو مدارج طے کیے ہیں اس کو مغربی ادب کا رہین منت قرار دیا گیا ہے۔

اُردو زبان کے مزاحیہ نگاروں پر تبصرہ کرنا آسان نہیں ہے۔ اُردو کی عمومی تاریخ سے قطع نظر جس طرح صوبہ وار تاریخیں دکن میں اُردو، پنجاب میں اُردو، مدراس میں اُردو، گجرات میں اُردو، بنگال میں اُردو، بہار میں اُردو زبان اور ادب کا ارتقا وغیرہ لکھی گئی ہیں اسی طرح مزاحیہ نگاری کو بھی صوبہ کے لحاظ سے تقسیم کرنا چاہیے اس لیے یہاں ہم حیدرآباد (آندھرا) کے مزاحیہ نگاروں کا مختصر تذکرہ کرتے ہیں۔

حیدرآباد میں مزاح اور طنز کا آغاز بھی ہجوگوئی سے ہوا ہے۔ قطب شاہی دور سے قطع نظر آصفی دور میں کئی شاعر ہجوگوئی کے لیے مشہور ہیں مگر ہم ان کا تذکرہ نہیں کر رہے ہیں کیونکہ ان کا مقصد محض ہجوگوئی تھا طنز اور مزاح نہیں تھا۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار ۱۸۹۵ء میں حیدرآباد آئے اور مہاراجہ سرکشن پرشاد کے متوسل ہوئے، ماہوار رسالہ دبدبۂ آصفی کے ایڈیٹر بنے۔ حیدرآباد ہی میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی چند تصانیف یہاں بھی ہوئیں اس لیے سرشار کو اس شعبہ کا اولین معمار تسلیم کیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔

جدید دور کے پیش رو عظمت اللہ خاں مرحوم، مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم ہیں ان کے ساتھ اور بعد کئی اصحاب اس زمرہ میں شامل ہیں۔ ہم یکے بعد دیگرے ان کا مختصر تعارف کراتے ہیں۔

(۱) عظمت اللہ خان

عظمت اللہ خاں پانچ سال کی عمر میں حیدرآباد آئے۔ یہاں ان کی تعلیم اور تربیت ہوئی۔ علی گڑھ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری لی اور مددگار ناظم تعلیمات پر تقرر ہوا اور ۱۹۲۶ء میں جوانی میں دنیا سے چل بسے۔ جس طرح عظمت اللہ خاں جوان تھے اسی طرح ان کے ادبی کارنامے بھی جوان ہیں۔ وہ ایک بلند پایہ ادیب اور شاعر تھے۔ نثر اور نظم دونوں کی خدمت کی۔ مزاحیہ نگاری میں ان کو حیدرآباد کا اولین معمار قرار دینا چاہیے۔ انھوں نے سدا بہار پھول لگائے ہیں۔ انھوں نے اردو شاعری کے لیے ہندی بحریں استعمال کر کے ایک جدت پیدا کر دی۔

نثر میں تنقیدی مضامین لکھے اور ادبی تحقیق فرمائی۔ اس کے ساتھ ہی مزاحیہ طرز پر مضامین لکھے۔ عظمت اللہ خاں کے مضامین سنجیدہ ہی میں شامل سمجھے جاتے ہیں۔ اس کے پڑھنے سے قہقہہ نہیں آتا بلکہ تبسم کی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ انھوں نے سیاسی، معاشرتی اور سماجی معاشی موضوعات کو اپنی مزاحیہ نگاری کا میدان بنایا تھا۔ سنجیدہ، دلکش، شگفتہ انداز میں خیال آرائی کی۔ خان صاحب نے اپنی نثر نگاری سے اردو نثر میں ایک نئی طرز کی بنیاد رکھی اور رواج بھی ڈالی۔ خان صاحب کی مزاحیہ نگاری کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

> "اچھا اب ہم افراتفری کو لیتے ہیں۔ میاں شہاب خاں کی دلہن آئیں۔ سماج سدھار کی چوٹ بازیں ہیں۔ کیا کریں مجبور تھیں۔ مسٹر ن کے سب حسب و منشا ان سے کرنے کے لیے بیٹا ادھار ہو کر رو بد و چھوٹنا پڑا۔ جی تو یہی چاہتا ہے کہ ایسی بہو بیاہ لائیں جو بیٹے کی دلہن کہلانے کے ساتھ مسٹری کے پارلیمنٹ سے کورس رہے مگر یہ ناممکن۔ بھابھی بیٹے کی شادی کو بہو نہ کریں۔ اس کے گھر کا آباد ہونا، اس کا سہرا دیکھنا اور پوتے کو گود میں کھلانا بھی بے چاری بڑی بی بی کا اب رہا سہا ارمان تھا۔ غرض سہرو شکر کر کے رات کاٹی اور ان سب بیٹیوں اور صاحب جان منشی سے صلاح اور مداہنت کا مشورہ کیا۔ صبح ہی گھر بہ گشتن رہ نہ اوّل سے کارگر اصول پر چیز مدعی شروع کر دی جائے۔"

(۲) مرزا فرحت اللہ بیگ

مرزا صاحب کے خاندان کے افراد مدتوں سے حیدرآباد میں تھے۔ مرزا صاحب ۱۹۰۷ء میں حیدرآباد آئے اور ابتداً سررشتہ تعلیمات میں مدرس مقرر ہوئے پھر سررشتہ عدالت میں تبدیل ہو گئے۔ منصف، مجسٹریٹ، ناظم عدالت، سیشن جج اور انسپکٹنگ افسری کی خدمات نیک نامی سے انجام دے کر وظیفہ حاصل کیا۔ ملازمت کے زمانہ میں کئی عدالتی کمیٹیوں پر مامور کیے گئے۔ ملازمت اور وظیفہ کے بعد سینکڑوں مضامین لکھے جن کے سات مجموعے خود شائع کیے اور شاعری کی ایک پمفلٹ شائع کر دی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ اولاً مرزا الم نشرح کے نام سے مضمون لکھتے رہے جو ایک تجارتی اور ادبی رسالہ میں شائع ہوتے تھے۔ یہ رسالہ ان کے قریبی عزیز حیدرآباد سے شائع کرتے تھے۔ اس کے بعد جب رسالہ اردو میں ان کا مضمون مولانا نذیر احمد کے متعلق شائع ہوا تو پھر ان کے مضامین کی دھوم مچ گئی۔ اردو کا ہر ایک رسالہ ان سے مضامین طلب کرنے لگا۔ مضامین بھی لکھے اور ان کے مجموعے بھی شائع کیے۔

بعض اصحاب مرزا فرحت اللہ بیگ کا مقابلہ رشید احمد صاحب اور پطرس اور عظیم بیگ چغتائی سے کرتے ہیں۔ اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو واضح ہوگا کہ پطرس کی مزاحیہ نگاری میں ذہنیت تو بلند نظر آتی ہے مگر زبان کی سلاست، روانی، شادابی اور فنکاری کے لحاظ سے مرزا صاحب کو ترجیح دینا ناگزیر ہے۔ رشید احمد صاحب کے مضامین میں تصنع اور آورد نظر آتی ہے۔ مرزا صاحب کے تمام مضامین آمد کا پتہ دیتے ہیں۔ ان میں تصنع نہیں ہوتا۔ مرزا صاحب کے مضامین میں متانت، شائستگی اور خوش مذاقی پائی جاتی ہے ان سے انبساط اور روح کی بشاشت حاصل ہوتی ہے۔ ڈاکٹر مولانا عبدالحق صاحب نے مرزا فرحت اللہ بیگ کے متعلق جو خیالات ظاہر کیے ہیں اس میں وہ صراحت کرتے ہیں :-

"مرزا فرحت اللہ بیگ کا طرزِ تحریر بھی ان کی طبیعت سے ملتا جلتا ہے۔ بیان سادہ ہے، تصنع نام کو نہیں، ٹھیٹھ دلّی کی زبان لکھتے ہیں۔ تحریر میں شوخی بھی ہے اور ظرافت کی چاشنی بھی۔

مرزا صاحب کو فنِ مصوری میں بھی دخل ہے اس لیے ان کی نظر چیزوں کے مختلف پہلوؤں پر کھلے ہوں یا ڈھکے وہیں پڑتی ہے جہاں ہنسنے کی کوئی بات ہوتی ہے اور جس پر سے عام نظریں سرسری طور سے گزر جاتی ہیں۔ ان کی اسی نظر کی بدولت مضمون میں جان پڑ جاتی ہے اور بیان کا خط و خال درست کر کے ایک اور ہی رنگینی پیدا کر دیتا ہے۔"

مرزا فرحت اللہ بیگ نے اگرچہ اولاً مزاحیہ رنگ میں مضمون نویسی شروع کی مگر بعد میں ادب کا کوئی ایسا موضوع نہیں رہ جس پر انھوں نے اپنے نقش ثبت نہ کیے ہوں۔ سوانح حیات، سفرنامہ، مختصر افسانہ، سماجی اصلاح، سیاسی نظریے و ادبی تنقید وغیرہ مختلف موضوع مضامین پر انھوں نے اپنے خاص انداز میں خامہ فرسائی کی ہے اور بہترین نقش چھوڑے ہیں۔ یوں تو ان کے بیسیوں مضمون زندگیِ جاوید کی حیثیت رکھتے ہیں مگر مولانا نذیر احمد کی سوانح حیات اور دہلی کا مشاعرہ، دیوانِ تمکین اور دیوانِ نظیر کے مقدمات، پھول والوں کی سیر ایسے مضامین ہیں جن کو اردو ادب میں بلند سے بلند مرتبہ حاصل ہے۔

حیدرآباد میں مرزا فرحت اللہ نے اپنی زندگی کے پورے چالیس سال بسر کیے یعنی ۱۹۰۷ء میں حیدرآباد آ کر ملازم ہوئے اور ۱۹۴۷ء میں یہاں سے آخرت کا سفر اختیار کیا۔ تیس سال سے زیادہ انھوں نے سرکاری ملازمت میں بسر کیے اور وہ بھی عدلیہ ہی میں رہے۔ بیانات لکھتے رہے، وکیلوں کی بحث اور جرح سنتے رہے اور فیصلے کرتے رہے اور اس زمانہ میں ادب کی خدمت بھی کرتے رہے۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے مرزا صاحب نہ صرف نثر کے میدان کے شہسوار تھے بلکہ نظم کی فضا میں بھی پرواز کی ہے اور اپنے دیوان کو "میری شاعری" کے عنوان سے شائع فرمایا ہے۔ مرنے سے چند سال پہلے حیدرآباد میں ایک ادبی ادارہ "اردو مجلس" کے نام سے قائم کیا تھا۔ ہر ماہ ایک مرتبہ اس مجلس کا اجلاس ہوتا اور کوئی صاحب مضمون سناتے اور اس کے بعد شعرا اپنا کلام سناتے تھے۔ یہ مجلس حیدرآباد کے بلند پایہ کے ادیبوں اور شاعروں پر مشتمل ہوتی تھی۔ مرحوم کے بعد بھی یہ ادارہ باقی ہے اور آج تک اردو کی خدمت کر رہا ہے۔

مرزا صاحب کی نثر اور نظم کا نمونہ پیش ہے:-

"مجھ کو مولوی صاحب کی طرزِ تحریر پر کوئی رائے ظاہر کرنے کا حق نہیں ہے کیونکہ اول تو میرے لیے ابتدا ہی میں خطائے بزرگاں گرفتن خطا است کی سب سے بڑی ٹھوکر ہے۔ دوسرے میری قابلیت محدود کی سرحد سے گزر کر مفقود کی سرحد میں آ گئی ہے لیکن باوجود ان واقعات کے میں نے مولوی صاحب کے سامنے بھی کہا، اب بھی کہتا ہوں اور ہمیشہ کہوں گا کہ محاوروں کے استعمال کا شوق مولوی صاحب کو حد سے زیادہ تھا۔ تحریر میں ہو یا تقریر میں وہ محاوروں کی ٹھیم ٹھس سے عبارت کو بے لطف کر دیتے تھے اور بعض وقت ایسے محاورے استعمال کر جاتے تھے جو بے موقع ہی نہیں اکثر غلط ہوتے تھے۔ خدا معلوم انھوں نے محاوروں کی کوئی فرہنگ تیار کر رکھی تھی یا کیا۔"

(ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی)

"بہر حال تاریخ پیشی آگئی اور میں کتابوں کا پشتارہ بغل میں مار، ڈپٹی صاحب کے اجلاس پر پہنچ گیا۔ پہلی پیشی ہمارے ہی مقدمہ کی تھی۔ اندر جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ تیس چالیس کتے ایک رسی میں بندھے کھڑے ہیں، رسی کا سرا مولوی قطب صاحب کے ہاتھ میں ہے اور مولوی صاحب ڈیکول ہیڈ ماسٹر سے کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔ ڈپٹی صاحب اس وقت تک اجلاس پر تشریف نہیں لائے تھے۔ میں نے کول صاحب سے کہا کیا آپ ان ملزموں کے وکیل ہیں؟ انھوں نے کہا ہاں۔ میں نے کہا کیا ناممکن نہ ہوگا کہ ان ناپاک ہستیوں کو عدالت کے کمرہ سے خارج کر دیا جائے؟ انھوں نے کہا نہیں ملزمین کے مواجہ میں تحقیقات ہوگی، بالکل قانون کے مطابق ہوا ہے۔"

مرزا صاحب کی مزاحیہ شاعری کا رنگ ملاحظہ ہو۔

جناب شیخ لشکر سے چلے جب نامی جنت کو — برہمن تو صلہ ملتا ہے کیا دیکھیں عبادت کا
نماز عصر کا وقفہ ہوا ہے وعظ میں زاہد — چلو پی آئیں ایسے میں کہ ہے یہ وقت فرصت کا
اگر اللہ کی خدمت کا ہے حوری مومنین کو — جناب شیخ کو بھی شوق ہے حوروں کی خدمت کا
کبھی جو رائے صاحب کو بلایا تھا کلکٹر نے — وہ یوں رکھی ہے چٹھی گویا پروانہ ہے جنت کا
کلکٹر ہو گئے لکھ پڑھ کے قسمت سے خلیفہ جی — مگر جب یاد ہے اکثر جی بوکن کی حجامت کا
چلو لیڈر ہی بن کر جیل میں تھوڑی بہت کاٹیں — کہ اب سیدھے رستوں پر بند ہے دروازہ جنت کا

ابھی ڈاڑھی منڈی ہے ایک دو مجلس بھی غائب ہیں
غرض ہونے لگا ہے اب تو ذوق جنت پہ محبت کا

(۴۳) ناکارہ

محمد شفیع الدین صاحب نام اور ناکارہ لقب۔ حیدرآباد کے متوسل نظام کالج میں تعلیم پائی جبکہ اس کا تعلق مدراس یونیورسٹی سے تھا۔ خانگی مجبوریوں سے تعلیم کو مکمل نہ کر سکے۔ طالب علمی کے زمانہ سے مضمون نگاری کا شوق رہا۔ اخبار رہبر دکن سے بھی تعلق رہا۔ ان کے مضامین کا مجموعہ "صدائی" کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔

ناکارہ صاحب مزاحیہ افسانے، ڈرامے دونوں لکھتے ہیں۔ ان کے مضامین میں قہقہہ نہیں ہوتا۔ وہ سبق آموز ہوتے ہیں۔ کسی میں طنز ہوتا ہے، کسی کے خاکے میں ایسے واقعات کا تذکرہ ہوتا ہے جس سے ہم ہنسنے لگتے ہیں۔ کسی مضمون میں اپنے گرد و پیش کے واقعات اور تجربات کی باتیں اس طرح لکھتے ہیں کہ ہم ہنسنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کہیں وہ اپنی ذکاوت اور فراست سے انشا پردازی کو اتنا دلکش اور دلچسپ بنا دیتے ہیں کہ غیر دلچسپ مواد میں غیر معمولی شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کے مضامین میں طنز اور ظرافت میں خوشگوار ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور کبھی طنز ناگوار اور تلخ ہونے نہیں پاتا۔ نمونہ ملاحظہ ہو:-

سبک آپ اور سر کے مصنوعی بال لگاتے اور ساڑھی اور چمپر پہننے کے بعد میں کتنا حسین معلوم ہو رہا تھا۔ اپنے آپ پر عاشق ہو جاتے کو بے اختیار جی چاہ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی غلمان حور کے بھیس میں رستہ بھٹک کر خدا کی اس دنیا میں پہنچ گیا ہے بعد میں معلوم ہوا کہ تماشائیوں کی ایک کثیر تعداد میرے بچ کا عورت ہونے کے متعلق بالکل بند کرتی ہے لیکن کچھ لوگ کہتے ہیں کہ میں عورت ہوں نہ مرد۔ میں نے دل میں کہا کاش مجھے وہ ان تماشا بینوں کو میری جوتی کو کیا غرض پڑی ہے کہ ان سیاہ کاروں کی زنجیبانہ چشمک کی طرف توجہ کروں۔ لیکن میں نے نسائیت کی کیسی ہو بہو نقل اتاری تھی۔"

(تماشے پر تماشا)

"شام کو وہ لوگ اطمینان کی سانسیں اور بریانی کی ڈکاریں لیتے ہوئے رخصت ہوئے —— آنجناب اس میں شک نہیں کنوارے آئے تھے اور شادی شدہ واپس گئے لیکن مہربانو کو اس کا افسوس تھا اور ان کے ساتھ ہمدردی بھی کہ اکیلے آئے اور اکیلے ہی گئے ...... اور صمدانی نے ہمارے حق میں دعائے خیر کی۔ خدائے پاک دولہا دلہن کو ایک سال تک صبر جمیل عطا فرمائے... ...." (مس شہاب ثاقب)

(۴) محمد حسین آزاد

مولانا محمد حسین آزاد دنیائے اردو میں ایسے مشہور ہوئے کہ کئی اصحاب نے ان کے تخلص کو اختیار کیا اور بعضوں کا نام بھی محمد حسین رہا۔ چنانچہ حیدرآباد کے مولوی محمد حسین آزاد تخلص اپنی تمام عمر درس و تدریس میں بسر کی۔ سررشتۂ تعلیمات میں ملازم رہے، بعد وظیفہ اسی تدریسی کے مشغلہ میں اب تک مصروف ہیں۔ شاعری میں اکبر کا رنگ اختیار کیا۔ ۱۲۹۷ھ میں حیدرآباد میں تولد ہوئے، پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل میں کامیابی حاصل کی حضرت امجد نے آپ کی شاعری کے متعلق حسب ذیل صراحت کی ہے:

"اگر اکبر مرحوم کی شاعری عالم وجود میں نہ آتی تب بھی ہمارے آزاد صاحب اس طرح آزادانہ اور ظریفانہ شعر کہا کرتے۔ ان کی تمام نظمیں ظرافت میں ڈوبی ہوئی ہیں۔"

حضرت امجد کی یہ صراحت حقیقت بردار ہے۔ "خیالات آزاد" کے نام سے آزاد صاحب کی نظموں کے دو حصے شائع ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ بالک لوریاں اور مسدس آزاد بھی آپ کی تصانیف میں شامل ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

سفارش

یہاں سے اپنی گاڑی ہم بچا کر کیسے لے جائیں — جدھر دیکھو اُدھر اٹکا ہے اک روڑا سفارش کا
لیاقت کا اگر چلتا نہیں ٹٹو تو اے حضرت — لگا دو زور سے تم اس کے اک کوڑا سفارش کا

سفارش کا اسے تو لیوں کر میں نہیں کہتا
ہمارے بانی اب کرنے لگا کچھ وہ سفارش کا

ترقی کا تسبیہ قابلیت سے نہ نکلے گا
لگاؤ گے نہ تا وقتیکہ تم جوڑا سفارش کا

سفارش نے تو اونچے اونچوں کو نیچا دکھایا ہے
بڑا ہی سر پھرا ہے جس نے منہ موڑا سفارش کا

یہ دل گر راہ جارا دیکھو پیتے ہیں وہ داور محشر
قیامت میں بھی دامن ہم نے کب چھوڑا سفارش کا

بس

غضب کا ہے جوبن بلا کا ابھار
بس حسن زا کے یہ سولہ برس

یہ سب کچھ ہی اس سے ملنے والا
عبث تجھ کو بس کی ہوتی ہے ہوس

تو کس پہ رکے پہ بس کا عاشق ہوا
نہ ہوگی یہ عصمت کی فریاد رس

تو دیتا ہے دل اور وہ لیتی نہیں
نگاہ اس کی نظروں میں بے کار و خس

رہ دلدار ہے یہ نہ سب ہے وہاں زما
جو زردار ہے زور دیتا ہے یہ بس

یہ بس ہے نہ پگھلے گی زر کے بغیر
یہ بس ہے نہ ہو گی کبھی ٹس سے مس

(۵) عصمت اللہ بیگ

عصمت اللہ بیگ، مرزا فرحت اللہ بیگ کے رشتہ دار تھے۔ ان کی ہی طرح نظم اور نثر میں مزاح کے گل کھلاتے رہے مگر فرق یہ ہے کہ عصمت اللہ بیگ نے زیادہ تر شاعری میں مزاحیہ نگاری کی ہے، نثر کا حصہ کم ہے اور مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے نثر میں زیادہ مزاحیہ نویسی کی ہے۔

عصمت اللہ بیگ کی پیدائش تو دہلی میں ہوئی مگر کم سنی ہی میں حیدر آباد آ گئے اور یہاں تعلیم پائی، ملازمت کی اور باقاعدہ وظیفہ حاصل کیا۔ اپنی مزاحیہ شاعری سے اردو زبان کی خدمت کی۔ نظم کے ساتھ نثر میں بھی مزاحیہ پہلو نظر انداز نہیں کیا۔ انھوں نے سماجی مسائل کو مزاحیہ رنگ میں بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔ "انوارِ تبسم" ان کے کلام کا مجموعہ شائع ہو گیا ہے، اس کے دیباچہ نگار گوپال راؤ اکبوٹے نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ:-

> "عصمت کا انداز بیان بہت ہی دلکش اور ان کا اسلوب کافی شگفتہ ہے۔ وہ انگریزی الفاظ کو بھی استعمال کرتے ہیں اور اس طرح کہ اشعار کا مزاحیہ رنگ اور زیادہ نکھر جائے۔ سیاسی موضوعات پر بھی ان کی نظمیں اور غزلیں اسی طنز و ظرافت او ماشارتی رنگ کی حامل ہیں۔"

عصمت اللہ بیگ صاحب شاعری میں اکبر سے متاثر تھے۔ طنز اور ظرافت سے اصلاح کا کام لیتے تھے۔

تین چیزیں

دنیا میں اگر پوچھو تو ہیں سینکڑوں چیزیں — ہیں بیش بہا اور اہم ان میں مگر تین
ان تینوں میں پہلے تو بڑا سب سے ہے پٹرول — دو اور تیسری ہیں اس کے لیے آپس میں سلاطین
ڈرتے تھے سویت بھی و ہٹلر بھی اسی سے — دبتا ہے کسی سے جو تو اس سے ہے شاہین
پٹرول کے بعد آتی ہے بارود کی باری — ابلیس نے جاری کیے ہیں جس کے فرامین
بچھ جائے سرنگ اس کی تو اڑ جاتے ہیں یک سے — ارض حبش و مصر و فلسطین و چین
ہے تیسری وہ دھات جسے کہتے ہیں لوہا — بے لوہے کے ان دونوں کے ہیں پاس کے قوانین
بنتے ہیں اسی چیز سے توپ اور دبابے — شمشیر و سناں تیر و تفنگ اور فرابین
قبضے میں کسی کے اگر آجائیں یہ تینوں — ہے ملک تو کیا چیز وہ دنیا کو بھی لے چھین

صلح پسندی

دشمن کو بنا لیتے ہیں ہم دوست خوشی سے — ہم امن کے طالب ہیں زمانہ میں سبھی سے
اک ذرہ ہیں ہم صلح پسندی ہی میں حشمت — مذہب بھی ہمارا نہیں لڑنا ہے کسی سے

نثر کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

مشاعرہ کرنے میں حکیم جی ملک الشعرا تھے۔ ادھر کسی کی شادی ہوتی ادھر مشاعرہ۔ لڑکی کے بچہ ہوا اور مشاعرہ۔ کوئی بیمار رہا مشاعرہ، کوئی مرا مشاعرہ، غرض کہ مشاعرہ کیا تھا ایک جیتہ تھا۔ پھر خرچہ کچھ نہیں۔ تانگے والوں نے قندیلوں میں سے موم بتیاں نکال کر ڈھیر لگا دیں۔ بزاز نے چاندنی کے پاٹ لا بچھا دیے۔ خیمے والوں نے دو پہرے ڈیرے ڈال دیے۔ پنواڑی نے گلوریوں کے ڈھیر لگا دیے۔ چائے خانہ والوں نے چائے نوشی کا انتظام کر دیا۔ گڑ فروش نے ہر دم تازہ حقے اور کلیاں فراہم کر دیں۔ حکیم جی نے غزلیں کہہ دیں اور بنا دیں اور یار لوگ اکھاڑے میں جا کودے۔ چلو لینا ایک نہ دینا دو، مشاعرہ ہوا اور ہنسی خوشی ہوا۔

(حکیم معشوق علی خان جوہر)

(۶) شمشاد

غلام پنجتن صاحب شمشاد تخلص سید سراج الحسن سراج یار جنگ جج ہائیکورٹ حیدر آباد کے بڑے فرزند، علی گڑھ اور یورپ کی تعلیم کے بعد حیدر آباد آکر سررشتہ عدالت میں ملازم ہوئے اور سیشن جج تک ترقی پائی، وظیفہ حاصل کیا۔ حیدر آباد آنے

سے پہلے سیاسی میدان میں بہت حصہ لیا اور حیدرآباد میں اولاً سیاسی مضامین لکھے پھر ملازمت کے دائرہ میں آنے کی وجہ سے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ وظیفہ کے بعد پھر سیاسی، ادبی اور صحافتی حیثیت سے میدانِ عمل میں گامزن ہیں۔ اپنے ہمعصروں کے جو حالات لکھے ہیں ان کو "حیدرآباد کے بڑے لوگوں" کے نام سے ادارۂ ادبیاتِ اردو نے شائع کیا ہے۔ اس کے علاوہ کئی کتابیں آپ کے نوکِ قلم کی رہینِ منت ہیں۔ ان حالات کو بڑے دلکش انداز میں لکھا ہے اور کردار کی نقاشی بڑی چابکدستی سے کی ہے۔ غلام پنجتن صاحب جس طرح سیاسی میدان میں نڈر ہیں اسی طرح ادبی میدان میں وہ صحیح تنقید کرتے ہیں۔

آپ کی مزاحیہ شاعری خاص رنگ کی حامل ہے۔ اس میں طنز کے نشتر بھی ہوتے ہیں۔ نمونہ پیش ہے ـــ

نہ ہو تری دین فروشی سے تسلی نہ سہی ــــ نقصان وہ بھی باقی ہو یہ بھی نہ سہی
ہے جو بلیک مارکٹ الکشن کی وہی کیا کم ہے ــــ نوحہ جو ری میں نغمۂ شادی نہ سہی
دل میں اس چال سیاست سے اک ہیجان تو ہے ــــ ترقی گلچین گلستان تسلی نہ سہی
ہے ہر آئینہ جبینِ حسن جھلکار پہ ووٹ ــــ گر نہیں ہیں تیرے شانا تیری تمنا نہ سہی

کردار رقیبانہ انداز عاشقانہ ــــ اظہارِ عاشقی کب باجبر محمودانہ
صیاد کا نہ کھٹکا گلچیں کا اب نہ ڈر ہے ــــ کاندھوں پہ آندھیوں کے اپنا ہے آشیانہ
سوکھی زباں پر ہیں آزادیوں کے نغمے ــــ اللہ رے فاقہ مستی گھر میں نہیں ہے دانہ
آقاؤں کی دلکش الفاظ ان کے میٹھے ــــ یہ سب درست ہے لیکن مضمون عامیانہ
دورِ جدید آیا وہ دن ہوا ہوئے جب ــــ لیلیٰ کے باپ لے کر پھرتے تھے تازیانہ

چڑھی ہے بڑھاپے پہ ان کے جوانی ــــ عمل بنڈری، فلسفہ گاندھیانی
اڑا لائی کس کی زباں میری مینا ــــ تلنگی مرہٹی نہ ہندوستانی
قفس ان کے ہاتھوں میں اور ہم قفس میں ــــ بڑی خندہ روائی بڑی مہربانی
تباہی کے سامان سب ہیں مکمل ــــ اناڑی سا مانجھی ہے نیّا پرانی
جھجکتے ہیں اپنوں سے آنکھیں ملاتے ــــ رقیبوں سے چلتی نہیں لن ترانی
وہ ہنسنے لگے سن کے میرا فسانہ ــــ کہی ان کہی ہو گئی سب کہانی

(۷) فضل الرحمٰن

فضل الرحمٰن صاحب حیدرآباد میں تولد ہوئے۔ یہیں تعلیم پائی اور اس کی تکمیل پونہ میں کی۔ بی۔ اے آنرز کی ڈگری بمبئی یونیورسٹی سے حاصل کی۔ اورلا سٹی کالج میں معاشیات کے لکچرار مقرر ہوئے مگر سیاست میں حصہ لینے کے باعث ملازمت سے سبکدوشی حاصل کرلی۔

ایک عرصہ کے بعد اعلیٰ سرکاری عہدہ داروں کے جبر سے پھر ملازمت میں شامل ہوئے نائب ناظم دفتر معلومات مقرر ہوئے اس کے بعد افسر اور اس کے بعد ناظم تعلیمات مقرر ہوئے اور اسی خدمت سے قبل عمر ۵۵ سالہ وظیفہ حاصل کر لیا۔ فضل الرحمٰن صاحب کے ڈرامے بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ اب تک سات ڈرامے شائع ہوئے ہیں۔ ظاہر و باطن۔ نئی روشنی۔ حشرات الارض۔ آئندہ زمانہ۔ کارخانہ۔ سقراط۔ چنگیز۔ کلام کے دو مجموعے "دھوپ چھاؤں" اور "نقش حیات" شائع ہو چکے ہیں بقول ڈاکٹر غلام یزدانی "فضل الرحمٰن کو دکن کا میتھو آرنلڈ کہنا چاہیئے"۔ فضل الرحمٰن کے مضامین میں طنز اور خوش مذاقی کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ نمونہ حسب ذیل ہے:۔

"بیگم : میں اس سے زیادہ ٹھاٹ باٹ کا سامان خریدتی مگر آپ نے روپے کے لیے ایسا ترسایا کہ میری ہمت نہ پڑسکی۔

نواب : تمہاری ادنیٰ سے ادنیٰ خواہش کو پورا کرنے کے لیے میں اپنے بڑے سے بڑے عیش کو قربان کر دیتا ہوں۔ وہ کون سی ایسی فرمائش تھی جو میں نے پوری نہیں کی۔

بیگم : میں نے سونے کے پلنگ کی فرمائش کی تھی۔ سونے کے پلنگ پر کمخواب کا بچھونا اور مشجر کے تکیے۔ آپ آخر وقت تک مجھے دم دیتے رہے اور اس کے بعد خرید لائے تو ایک سڑا چاندی کا پلنگ۔

نواب : میں تمہارے حکم کے بموجب سونے کا پلنگ خریدنے کے لیے بازار گیا تھا لیکن کم بخت دکانداروں نے جب میری ضرورت اور تمہارا شوق دیکھا تو ایک کے چار مانگنے لگے۔ اس پر بھی مجھے کوئی عذر نہ ہوتا بشرطیکہ میرے پاس کافی روپیہ رہتا۔

بیگم : اسی لیے میں کہا کرتی تھی دو لاکھ نکال لو۔ ایک لاکھ سے کام نہیں چلے گا مگر آپ ہمیشہ اپنی ضد پر اڑے رہے۔

نواب : ضد مجھے نہیں اس مہاجن کو تھی جس کے پاس جاگیر رہن ہے۔ وہ قرض دینے پر آمادہ ہوتا تو میں دیتا نہ تھا جو مفت کی رقم لینے سے انکار کرتا۔ تمہیں معلوم ہے قرض میری آمدنی کا واحد ذریعہ ہے۔ میرے نزدیک زیادہ قرض کے معنی زیادہ آمدنی کے ہیں۔"

(آئندہ زمانہ)

"میرے فاضل پیشرو اور قابل دوست علامہ احمد مدیر الاعمال نے ابھی ابھی جو تحریک صدارت آپ کی خدمت میں پیش فرمائی ہے مجھے اس کی تائید کا فخر حاصل ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس زمین کے اوپر اور اس آسمان کے نیچے اگر کوئی باتوقیر شخصیت اس غرض کیا انجام دینے کی اہل ہے تو ہمارے شفیق و کرم فرما ہمارے ہر دلعزیز قومی کارکن عالی جناب معلی القاب اعزاز احمد صاحب کی ذات ستودہ صفات ہے (تالیاں) صاحب ممدوح کی شان میں اس ہیچ میرز نے چند ماہ قبل ایک قصیدہ کہا تھا۔ اگر آپ اجازت دیں تو اس نادر موقع سے استفادہ کر کے بعض اشعار سے احباب کی ضیافت طبع کا سامان کروں ؎

زمین و آسماں میں شہرہ ہے اعزاز احمد کا
نہ کچھ حد ہے نہ کچھ اندازہ ان کے فیض بے حد کا
بزرگان سلف ہیں طفل ابجد خواں حضور ان کے
ہوا ہے ان سے روشن نام دنیا میں اب و جد کا"

(حشرات الارض)

(۸) جگن ناتھ پرشاد

حیدرآباد کے ایک ممتاز ڈاکٹر، حکیم اور صاحب قلم ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں ایک اخبار "دکن پنچ" ہفتہ وار شائع کرتے رہے جو اودھ پنچ کا ایک چربہ تھا۔ نظم و نثر دونوں پر قدرت حاصل ہے اور ظرافت نگاری کا اچھا سلیقہ ہے۔ بذلہ سنجی اور خوش طبعی میں مشہور ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

اے خداوند توانا بزرگ و برتر جانتا ہے کہ سال گزشتہ "دانش مند" کا نزول حیدرآباد پر ہوا۔ ہزاروں مخلوق تباہ و برباد ہو گئی۔ کوئی برساتی نالا نہ ہوا جو جیبوں کا نالہ بن کر جاری [illegible] ہو گئیں، متعدد [illegible] ہو گئے۔ بلکہ جو [illegible] معصوم بچے دانہ دانہ کو ترسے محتاج بن گئے۔ اے پروردگار رحیم اگر گزشتہ سال کیا کم تھا کہ اب اس سال ایک دوسری بلا "آئی ایف۔ اے" کے نام سے حیدرآباد میں نازل ہے۔

یا خداوندا! تجھ کو خوب روشن ہے کہ حیدرآباد کی ملکی پولیس ہی [illegible] طاعون، [illegible] سے فنا ہو رہی ہے، [illegible] اور بھی فنا کر رہی ہے۔"

(دکن پنچ جلد نمبر)

(۹) تمکین کاظمی

حیدرآباد کے ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ منشی فاضل ہیں۔ دفتر دیوانی و مال و ملکی اسٹیٹ ریکارڈ آفس میں مامور تھے۔ اب وظیفہ حاصل کر لیا ہے۔ تمکین صاحب کو تاریخی اور ادبی شعبہ میں دلچسپی ہے۔ افسانے بھی لکھے ہیں۔ "غنچۂ تبسم" مزاحیہ مضامین کا مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ ان کے مزاحیہ مضامین میں دکنی الفاظ زیادہ ہوتے ہیں۔ حضرت نیاز فتح پوری نے اس مجموعہ کے متعلق حسب ذیل صراحت کی ہے:-

"نگارشی مضامین کی سب سے بڑی خوبی محاکات اور تجزیہ جذبات کہلاتی ہے سو ان دونوں کی اچھی اچھی مثالیں اس مجموعہ میں نظر آتی ہیں۔ زبان کے لحاظ سے البتہ مجھے اکثر جگہ اختلاف ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ اختلاف شمال و جنوب کا اختلاف ہے جس کا دور ہونا ممکن نہیں ہے۔"

نمونہ ملاحظہ ہو۔

"چوتھے طبقے کے لوگ فی زمانہ نوما کہیں مگر قربان جائیے خالق کے کہ اس تماشا گاہِ عالم میں طرح طرح کے پتلے نچاتا ہے۔ ایک مولوی صاحب جو نہایت کم سخن، متین، سنجیدہ ہیں اس قدر مجبور ہیں کہ کوئی ان کے گھر پہ ملنے جائے تو بازار سے منگوا کر پان کھلاتے ہیں، یہ محض اس سبب سے کہ بیوی صاحبہ پان کی فرمائش پر اس قدر خفا ہوتی ہیں کہ ان کو کم از کم

...ور وزنک پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا۔ ایک بزرگ جب تک باہر رہتے ہیں چار پانچ ڈبیاں سگریٹ کی خالی کر ڈالتے ہیں مگر گھر میں کھانا کھانے کے بعد بھی سگریٹ پینے کی مجال نہیں اس لیے کہ بیگم صاحبہ کو اس سے نفرت ہے۔" (زن مرید)

———

مرزا صاحب کے ہیکڑپن سے ہماری روح بھی فنا ہوتی ہے ہم نے سوچا کہ مرزا صاحب سے نہ ملیں تو پھر قیامت آجائے گی۔ راستے میں جہاں کہیں ملاقات ہوگی حضرت قصے ڈالیں گے۔ وہ وہ بے نقط سنائیں گے کہ سنگ آمد و سخت آمد کہہ کر بیٹھ بھی گئے مرزا صاحب دیوان خانہ میں بیٹھے ایک صاحب کو ہوش سے کچھ زبانی گُر بتا رہے تھے ایک شخص کو موجود پا کر مسرت ہوئی کہ چلو اس غریب سے مرزا صاحب کو جھک جھک کرنے دو۔ ہم تھوڑی دیر بیٹھ کر چپ آتے گئے مگر ہمارا عجیب ہی تھا کہ مرزا صاحب نے پنا لکچر ختم کر دیا اور متوجہ ہو گئے۔" (مرزا صاحب)

(۱۰) جلال الدین اشک

مولوی وحید الدین المخاطب نواب وحید نواز جنگ کے فرزند جامعہ عثمانیہ کے ابتدائی دور کے سپوت ہیں۔ بی۔ اے اور ایل۔ ایل بی میں کامیابی حاصل کی۔ اپنی سلجھی ہوئی خوش مذاقی کے باعث ادبی حلقوں میں مقبول تھے۔ حیدرآباد کے سررشتہ کروڑگیری (کسٹم) میں ملازم رہے۔ اس کے بعد پاکستان چلے گئے تھے۔ ۱۹۵۱ء میں وہاں انتقال ہو گیا تھا۔ ان کی تصانیف "شیطان کا انتقام" اور "سلک گوہر" شائع ہو چکی ہیں۔ سلک گوہر ڈرامہ ہے۔ "شیطان کا انتقام" میں انھوں نے اس امر کو واضح کیا ہے کہ ہماری تہذیب شیطان کا انتقام ہے جو انسان کے بچوں کے ساتھ لیا جا رہا ہے۔

نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"شیطان کا پہلا حکم یہ تھا کہ جاؤ دنیا میں شاعری کرو مگر دیکھو اپنی شاعری میں عورت اور شراب کے سوا کسی دنیوی چیز کا ذکر نہ لانا۔ ہاں کبھی کبھی تنوع کی خاطر کچھ مرثیے بھی لکھ دیا اور دیکھو کبھی کبھی بکے بہت کر کے قومی نظمیں بھی لکھ دیا کرو۔ تم جب اپنی شاعری میں عورت کی تعریف کرو گے اور رنڈی کاوش سے اس کا سراپا کھینچو گے تو اس کے نتائج خاطر خواہ نکلیں گے۔ بہت سارے نوخیز طالب علم بہت سارے نیم تعلیم اور نیم دماغ تمہاری شاعری سے متاثر ہو کر بہت جلد بلکہ بلوغ سے قبل ہی کسی نہ کسی فاحشہ کے دام میں گرفتار ہو جائیں گے اور چار چھ مہینے یا شاید سال دو سال تک بڑی مسرت و پُرکیف لذت بخش زندگی گذاریں گے اس کے بعد ہاں اس کے بعد کیا ہوگا؟ ان کی صورتیں مسخ ہو جائیں گی، ان کے گال پچک

جاتیں گے، ان کے سینے سوکھ جائیں گے، دماغ از کار رفتہ ہو جائیں گے، وہ زندہ رہیں گے
مگر اس طرح کہ دنیا ان کی نظر میں تاریک ہو جائے گی۔"

(۱۱) یوسف ناظم

سابق حیدرآباد کے حصہ مہاراشٹر کے باشندے، جالنہ اور اورنگ آباد میں تعلیم پائی تھی۔ حیدرآباد آکر جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے کی ڈگری لی۔ کچہری کی خدمت پر مامور رہے تھے۔ مزاحیہ اور طنزیہ مضامین کا اچھا سلیقہ حاصل ہے۔ طنز اور مزاح پر تحقیقاتی کام بھی کیا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔ مرزا غالب کی جسمانی صحت کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے اس کا ایک اقتباس یہ ہے۔

"زمین صرف بیٹھے رہنا غالب کے بس کا نہ تھا۔ ان کی فطری کاہلی کچھ اور چاہتی تھی۔ غالب کرسی پر بیٹھے بیٹھے بھی ضعیف ہونے لگے، اسی سبب انھوں نے یہ فرمایا ؎

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

پڑے رہنے میں بھی غالب نے کئی نکتے نکالے ہیں اور یہی مقام ہے جہاں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ غالب نے بہت ہی عمدہ اور اعلیٰ قسم کی نفسیاتی شاعری کی ہے۔ غالب صرف پڑے رہنے کے ہی قائل نہ تھے بلکہ اس کارِ خیر میں انھیں نفاست اور آرام کا پورا پورا خیال رہتا تھا اور ہمیشہ بنا ہوا بستر بھی ساتھ رکھتے تھے تاکہ جب بھی لیٹنے کا موقع ملے بستر بچھا لیں۔ فرماتے ہیں ؎

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

(۱۲) خواجہ یوسف الدین

حیدرآباد وطن، جامعہ عثمانیہ اور علی گڑھ سے بی۔ اے، ایم۔ اے، ڈپ ایڈ کی ڈگری لی، اس کے بعد انگلستان جاکر ایم ایڈ ہوئے۔ عثمانیہ ٹریننگ کالج کے لکچرار اور پھر اورنگ آباد کالج کے پرنسپل ہوئے۔ ۵۵ سال کی عمر میں وظیفہ حاصل کیا۔ اب انوار العلوم کالج میں اپنے اوقاتِ فرصت کو کام میں لاتے ہیں۔ کئی مزاحیہ مضمون لکھے ہیں۔ بعض شعرائے اُردو کے متعلق بہت کام کیا ہے۔ عبارت کا نمونہ پیش ہے:۔

"شیخ صاحب نہ صرف اپنے گاؤں اور شہر میں بلکہ دور دور بھی ایک ہوشیار لڑنے والے سمجھے جاتے تھے۔ لڑنے سے مراد یہاں ہاتھا پائی یا کشتی یا شمشیر زنی نہیں اس لیے کہ ان چیزوں سے ہمارے شیخ صاحب کو دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ وہ لڑتے تھے کاغذ کی

ہوئی اور پھر اس انہماک اور جوش و خروش سے کہ کچہری والے ان کو مانتے تھے اور جب یہ مشہور صیغہ داروں، چپراسیوں اور اہل معاملہ کے مجمع میں بیٹھے ہوئے اپنے کارناموں کو نمک مرچ لگا کر بیان کرتے تو کون تھا جو ان کی زبان و ذکاوت کی داد نہ دیتا۔

(۱۳) مرزا شکور بیگ

مرزا شکور بیگ مولوی عزیز مرزا کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ عزیز مرزا صاحب کا نام مسلم لیگ کی تاریخ میں ہمیشہ درخشاں رہے گا۔ حیدرآباد سے رخصت ہونے کے بعد انھوں نے مسلم لیگ کی سیکرٹری شپ کو سنبھالا تھا۔

مرزا شکور بیگ کی پیدائش حیدرآباد میں ہوئی۔ یہیں ان کی تعلیم ہوئی۔ جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے، ایل ایل بی میں کامیابی حاصل کی اور بعد کامیابی وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ اس وقت ورنگل کے مشہور ایڈووکیٹ ہیں اور آج کل پردیش کانگریس کے ممبر کانگریس کی جانب سے چنے گئے ہیں۔ شکور بیگ کی شاعری ان کی تعلیم کے زمانے سے شہرت رکھتی ہے۔ پہلا دور شاد اور دوسرا دور ان کی نظمیں زمانہ تعلیم میں شہرت رکھتی تھیں۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

ممکن نہ ہو تو آنے کا وعدہ نہ کیجئے ہم تاکتے رہیں کبھی ایسا نہ کیجئے!
کچھ دیر عشق کے غم و غصہ کی داستاں یہ مشورہ دیا کہ تمنا نہ کیجئے!
دنیا ہو جو سزا وہ دیا کیجئے مگر پہلا آپ کے سامنے ہمیں رسوا نہ کیجئے!
ہم مر گئے تو آپ پہ آخر مرے گا کون کہتے ہیں اس سے نہیں کوسا نہ کیجئے
بیزار ہو کے یار نے مرزا سے یہ کہا یوں آنکھیں چار کر کے بچا نہ کیجئے

مجھے دل کو بہلانا پڑے گا کیے پر اپنے پچھتانا پڑے گا
اگر مرزا کی آہوں میں ہے تاثیر انھیں جھک مار کے آنا پڑے گا

موٹر ملے، مکان ملے، سیم و زر ملے سب کچھ ملے خسر کی طرف سے مگر ملے
ہر جس کے دل میں درد وہ انسان نہیں ملا لیڈر ملے، وکیل ملے، ڈاکٹر ملے

جو اسیرانِ قفس قید پہ اتراتے ہیں وہ رہا ہو کے بھی صیاد کے گن گاتے ہیں
بر سرِ عہدہ تو ان سا کوئی کج خلق نہ تھا بعد پنشن کے یہ عالم کہ بچھے جاتے ہیں
کام کچھ کر کے دکھاتے نہیں مرزا لیکن
صرف تنقید بڑی شان سے فرماتے ہیں

(۱۴) ابراہیم جلیس

حکومت آصفیہ کے علاقہ کرناٹک (گلبرگہ) کے متوطن اور اب پاکستان کے باشندہ ہیں۔ میٹرک تک گلبرگہ میں تعلیم پائی اس کے بعد علی گڑھ گئے۔ مسلم یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری لے کر حیدرآباد آئے اور کمرشل کارپوریشن میں ملازم ہو گئے۔ اس کے بعد بمبئی فلم میں ساحر لدھیانوی کے ساتھ کام کرتے رہے مگر یہاں کی فضا ان کو راس نہ آئی۔ پھر حیدرآباد واپس ہو گئے اور ۱۹۴۸ء میں پاکستان چلے گئے اور وہاں اخباری دنیا اور پھر فلمی دنیا سے متعلق ہیں۔ اپنی مزاحیہ نگاری کے باعث پاکستان میں اچھی شہرت حاصل کر لی ہے۔ ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں۔ زرد چہرے۔ چور بازار۔ چالیس کروڑ بھکاری۔ نکتہ وہیں۔ کچھ غم جاناں کچھ غم دوراں۔ دو ملک ایک کہانی۔ پبلک سیفٹی ریزر۔ جو کا ہے تکال وغیرہ

اس تفصیل کے بعد اب حیدرآباد کی مزاحیہ نگار خواتین کو پیش کیا جاتا ہے۔ اگرچہ بعض حیدرآباد سے پاکستان منتقل ہو چکی ہیں مگر چونکہ ان کے کارنامے ایک عرصے تک حیدرآباد میں وجود میں آئے ہیں ان کو حیدرآباد سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔

(۱۵) آصف جہاں بیگم بلگرامی

ان کے والد عبدالمجید صاحب بلگرام کے مردم خیز قطعہ سے تعلق رکھتے تھے۔ عرصہ تک صدر مہتمم تعمیرات رہے۔ حیدرآباد ہی میں انتقال ہوا۔ آصف جہاں کی پیدائش ۱۹۲۴ء میں حیدرآباد میں ہوئی۔ اگرچہ مدرسہ میں صرف میٹرک تک تعلیم پائی مگر مطالعہ کی بدولت اچھی قابلیت پیدا کر لی۔ کم عمری سے لکھنے کا شوق ہے اور مزاحیہ رنگ اختیار کیا۔ مضامین کا ایک مجموعہ "گل خنداں" کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔ شادی کے بعد دوسری مصروفیتوں کے باعث لکھنا ترک کر دیا مگر جو کچھ لکھا ہے وہ قابل داد ہے۔ مرحوم مرزا فرحت اللہ بیگ نے ان کی مزاحیہ نگاری کی داد دی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:-

> "یقین مانیے کہ مضمون واہ واہ ہے۔ مضمون پڑھتا تھا اور دل میں سوچتا تھا کہ یا اللہ یہ کیا ہونے والا ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ مزاحیہ مضامین لکھنا صرف مردوں ہی کا حصہ ہے لیکن اب معلوم ہوا کہ صنف نازک بھی ہماری حصہ دار بن گئی ہیں ..... ہم مذاق سے مطلب کسی ہنسی کی بات پر ہنسی لیتے تھے مگر یہاں ہر فقرہ میں چٹکیاں لی گئی ہیں اور خطرا یہ ہے کہ ہر فقرے پر بجائے رونے کے ہنسی آتی ہے"

اس سے واضح ہو سکتا ہے کہ آصف جہاں بیگم کا درجہ مزاحیہ نویسی میں کس قدر بلند ہے۔ اب وہ پاکستانی بن گئی ہیں اور وہاں ہی مقیم ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو:-

> "آہا۔ اونہہ! اس کا تو نام بھی نہ لیجئے۔ بہن بچے کی قسمت کی مالک ہوتی ہے۔ جتنی خود میلی رہتی ہے اس سے زیادہ میلا بچے کو رکھتی ہے۔ اگر خود کا بچہ بھی ساتھ ہی ہو تو بیگم کے سامنے اپنے بچے کو

مارتی ہے۔ بیگم کے بچے کو پیار کرتی ہے۔ جب بچے کو پیپے پیپے تھک جاتی ہے تو بیگم کے سامنے جا کر اس صفائی کے ساتھ پھسکڑ چلی بیتی ہے کہ بیگم تو بیگم ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوتی اور وہ سمجھتی ہیں کہ بچہ ان کے پاس آنے کے لیے رو رہا ہے۔

بچہ زیادہ دق کرتا ہے تو افیون کی گولیاں کھلاتی ہے۔ محلے بھر کی رپورٹر ہوتی ہے جس محلہ میں ایک دو انا ئیں ہوں تو سمجھ لیجئے کہ وہاں کسی رپورٹر کی قطعی ضرورت نہیں جہاں محلے میں کوئی ذرا غیر معمولی بات ہوئی اور اس کا پیٹ پھولنا شروع ہوا۔ یا بخار اس وقت تک کم نہیں ہوتا جب تک کہ تمام محلے میں اس واقعہ کی خبر نہ ہو جائے۔ چغلی کھانے میں مشاق ہوتی ہے۔ محلے کے کس گھر میں کس نے کیا کھایا، کیا کہا، کہاں گیا، کم اس سے سن لیجئے۔"

(گل خنداں)

(۱۶) تاج یٰسین علی خان

حیدرآباد کے ایک صاحب علم اور با عمل خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ مولوی غیاث الدین المخاطب نواب اعظم جنگ کی دختر ہیں۔ محبوبیہ اسکول میں تعلیم پائی۔ سید یٰسین علی خان صاحب ریلوے انجینئر کی شریک زندگی ہیں۔ اپنے شوہر کے ساتھ یورپ، آسٹریلیا اور عراق کا سفر کر چکی ہیں۔ شادی سے پہلے بھی مزاحیہ مضامین لکھا کرتی تھیں۔ آسٹریلیا کے سفر کے بعد اپنا سفرنامہ "آسٹریلیا کی جھلک" کے نام سے شائع کیا ہے۔

ان کے مضامین میں تخیل کی بلندی، نظر کی گہرائی اور مزاحیہ نگاری کی پوری قدرت حاصل ہے۔ ڈاکٹر زور صاحب نے ان کے اس سفرنامہ کے متعلق جو صراحت اپنی تقریظ میں کی ہے وہ یہ ہے:

"ان کے سفرنامے کے کچھ حصے ماہنامہ شہاب میں شائع ہو رہے تھے اور میں حیرت اور تعجب کے ساتھ ان کو پڑھتا تھا۔ اس کتابی صورت میں میں نے بڑے شوق سے اس کو پڑھا اور اعتراف کرتا ہوں کہ یہ خاتون . . . کی بڑی اچھی قدرت رکھتی ہیں اور اپنے خیال کے اظہار پر خوب سے قادر ہیں۔ ان کی طبیعت میں ظرافت، شگفتگی اور انبساط کی کمی نہیں اور یہ سب خوبیاں ہی اس درجہ کو نہ پہنچ سکیں کہ خرابیوں کی سرحد میں داخل ہوں۔"

اس صراحت سے تاج یٰسین علی خاں کی مزاحیہ نگاری کا حال منکشف ہو سکتا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:-

"جب مجھے معلوم ہوا کہ یہاں بچے پیدا کرنے پر تنخواہیں دی جاتی ہیں تو اپنے یہاں کے بچے والوں کی بہت یاد آئی۔ دل میں حساب جوڑتی رہی کہ فلاں کو فی ہفتہ اتنے پونڈ ملتے اگر وہ آسٹریلیا میں ہوتے۔ بہرحال یہاں کی مائیں بھی بچے پیدا کرنے میں ہندوستان کی عورتوں سے پیچھے نہیں ہیں اور یہاں کی زمین تو ہندوستان کی زمین سے بہت زیادہ زرخیز ہے۔

اپنے خیالات میں علامہ صاحب کا ایک مصرع موزوں سے گنگنا اٹھی۔ بیرسے آئینہ کو کبیدہ ہوتی ہوتی کہ اس مصرع سے ان باتوں کا کیا تعلق۔ اس کے کیا معنی ہیں۔ اس وقت یہاں کس مناسبت سے آپ نے یہ مصرع گایا وغیرہ۔ میں نے کہا آپ اپنے دماغ کی قیمتی مشینری کو ان معمولی باتوں سے تکلیف نہ دیں۔ یہ چھوٹے موٹے لوگوں کی باتیں ہیں۔"

(آسٹریلیا کی جھلک)

(۱۷) زینت ساجدہ

حیدرآباد کے ایک مشائخ خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ اگرچہ اب پیری مریدی کا سلسلہ ان کے یہاں باقی نہیں رہا۔ قاضی محمود بحری اور شاہ نور رانچوری ان کے اجداد میں شامل ہیں۔ زینت ساجدہ نے زنانہ کالج میں جامعہ عثمانیہ کے تحت اپنی تعلیم کی تکمیل کی۔ ایم اے ہو کر ملازمت اختیار کی۔ پی ایچ ڈی کا کورس بھی ختم کر لیا مگر ہنوز مقالہ پیش نہیں کیا۔

زنانہ کالج میں اردو کی لکچرار ہیں اور اپنے علمی اور سوشل کاموں کے باعث مشہور ہیں۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے ہیں اور تنقیدی مضامین بھی۔ افسانوں کا مجموعہ "جلترنگ" شائع ہو چکا ہے۔ وہ ترقی پسند زمرہ میں شامل ہیں مگر ان کے افسانوں میں عریانی نہیں ہوتی۔ ان کے تنقیدی مضامین بلند معیار کے ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنے ادبی نقش سے اردو کے معیاری ادیبوں میں اپنا مقام بہت اونچا بنا لیا ہے۔

مزاحیہ نگاری کا بھی سلیقہ ہے ان کی مزاحیہ نگاری کو خوش مذاقی میں شامل کرنا چاہئے۔ اخبار سیاست میں ان کے کئی مزاحیہ مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

(۱۸) جیلانی بانو

علامہ حیرت بدایونی کی دوسری صاحبزادی ہیں۔ علامہ بدایوں سے حیدرآباد آکر بس گئے۔ جیلانی بانو کی پیدائش حیدرآباد ہی میں ہوئی اور یہیں نشو و نما پائی۔ خانگی تعلیم ہوئی اور اس تعلیم سے آپ جامعہ عثمانیہ کے بی۔ اے کے امتحان میں شریک ہو رہی ہیں

اگرچہ جیلانی بانو کو علمی میدان میں آئے صرف چند سال کا عرصہ ہوا ہے مگر اس قلیل عرصہ میں انھوں نے اپنے زور قلم کے جو نقش ثبت کر دیے ہیں وہ حیرت انگیز ہیں۔

ان کے افسانوں کا مجموعہ "روشنی کے مینار" پاکستان کے بین الاقوامی ادب کے مقابلہ میں درجہ اول کا تمغہ حاصل کر چکا ہے۔ جیلانی بانو کے افسانے پاکستانی رسالوں میں کثرت سے شائع ہوتے ہیں۔ حیدرآباد کے رسالوں کے علاوہ اخبار سیاست میں بھی ان کے مزاحیہ مضامین شائع ہوتے اور پسند کیے جاتے ہیں۔ جیلانی بانو نے صرف چند سال میں اردو کی جو خدمت کی ہے اور ادبی میدان میں اپنا جو مقام بنا لیا ہے وہ قابل ستائش ہی نہیں بلکہ تعجب خیز ہے۔ توقع ہے کہ اگر آپ اسی طرح اردو کی خدمت کرتی رہیں تو دنیائے اردو میں ان کے کارنامے زندگی جاوید حاصل کریں گے۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

"آپ انفلوئنزا میں مبتلا ہیں۔ فلاسفی میں پی۔ ایچ ڈی کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ بیوی سے سخت قسم کی ناچاقی رہتی ہے۔ عنقریب آپ آٹھویں لڑکی کے باپ بننے والے ہیں۔ آپ

جنگ کے حامیوں میں سے ہیں۔ آپ کی عمر ساٹھ اور ستر کے درمیان ہے۔ پچھلی زندگی عشق میں گزارنے کے بجائے کلرکی میں کٹ گئی۔ ڈاکٹروں اور دواؤں پر سے آپ کا عقیدہ اٹھ چکا ہے۔

اگر آپ ریڈیو سیلون کے نام پر مسکرا چکے ہیں تو پہلی بات یہ ہے کہ آپ "لتا" کی آواز پر مرتے ہیں۔ اس کے علاوہ محلے کی کئی لڑکیوں سے عشق کا کاروبار جاری ہے۔ آپ ہر وقت کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا ہیں۔ بیک آپ بے حد کرتے ہیں دن بھر پلنگ پر بیٹھے معمے حل کرتے ہیں۔ آپ مالکوس اور درباری کا فرق بتا سکتے ہیں۔ فلمی دنیا کی تاریخ پر آپ کو عبور حاصل ہے۔ شکیل، راجندر، کرشن اور غالب آپ کے پسندیدہ شاعر ہیں بلکہ غالب کی طرح داڑھی رکھنے کا آپ کو نیا نیا شوق ہوا ہے۔

وحیدہ نسیم

وحیدہ نام اور نسیم تخلص۔ ان کے اجداد شمالی ہند سے اورنگ آباد آکر بس گئے۔ نسیم کی پیدائش اورنگ آباد میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم وہیں ہوئی اس کے بعد حیدرآباد آکر زنانہ کالج میں شریک ہوئیں اور ایم۔ایس سی میں کامیابی حاصل کی۔ نسیم کے خاندان میں کئی اصحاب شاعر تھے۔ بچپن سے شاعری کا ماحول ملا۔ کالج کی تعلیم کے زمانہ ہی میں ان کی شاعری مشہور ہو گئی۔ ان کی شاعری کے کئی مجموعے تیار ہو چکے ہیں جن کو مختلف ناموں سے موسوم کیا گیا ہے مثلاً ۱۔ کوثر نسیم (نظموں کا مجموعہ) ۲۔ ساغر صہبا (غزلوں کا مجموعہ) ۳۔ تبسم حیات (مزاحیہ کلام) ۴۔ طفلستان (بچوں کی نظمیں) ۵۔ دربلادوا (سیاسی نظمیں)۔

اگرچہ یہ مجموعے ہنوز زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئے مگر ان میں کا ایک حصہ رسالوں اور اخباروں میں شائع ہو گیا ہے۔ ۱۹۴۸ء کے بعد نسیم پاکستان چلی گئیں اور اب کراچی کے سنٹرل زنانہ کالج میں لیکچرار ہیں۔

جیسا کہ تذکرہ کیا گیا ہے وحیدہ نسیم کی شاعری کا مزاحیہ حصہ تبسم حیات سے موسوم ہے اس میں بیسیوں نظمیں شامل ہیں۔ کلام میں ایک حصہ وہ ہے جو کالج کی تعلیم اور بورڈنگ کے قیام کے زمانہ میں لکھا گیا ہے۔ نسیم کا مزاحیہ کلام نہ صرف ہنسانے کا ذریعہ ہے بلکہ سبق آموز بھی ہوتا ہے۔ اس میں طنز کے نشتر ہوتے ہیں۔ تخیل کی بلندی اور زبان کی سلاست بھی ہوتی ہے ؎

گھنٹی بجی گھنٹی بجی اسے لو قیامت آگئی — چہرے پہ سب کے دیکھو کیسی متانت آگئی
اب پیاس بھی لگتی نہیں وہ بھوک ساری مر گئی — سب لڑکیوں پر اک خموشی کام اپنا کر گئی
معراج کیوں خاموش ہے یا تیرہ ساری کیا ہوئیں — پھر شور جانے کو ہے کھانا ہے کہ ساری کیا ہوئیں
صفیہ ستاتی کیوں نہیں سعیدہ بھی کیوں چیختی نہیں — ڈرتی ہیں سب ایسا نہ ہو سب پر ہنسی آئے نہیں
گانے کی جو عادی بھی کیوں شمس ڈسمس ہو گئی — گویا کہ سب نیند میں خاموشیوں میں سو گئی
خاموش ہو بیٹھی کیوں ہنس نسبکا ... — سنجیدگی کے کیوں ہیں آثار چہرے سے عیاں

دھوبن کی یاد

آئی خبر ہے اب تک وہ مہرباں ہماری — لیتی ہے دھوبن کو اک سنسنہ زباں ہماری
جلدی سے لاؤ وہ تختہ قسمت کہاں ہماری — ہے کس جگہ یہ آخر دھوبن مہرباں ہماری

جائیں گے ہم وہیں جو دھوبن جہاں ہماری

چادر بہت سے میلی بستر پہ کیا بچھائیں — تکیے غلاف ہیں سب تم کچھ بتاؤ جائیں
بستر کی دیکھ حالت مٹی سے نہ ملائیں — ہوتی بتاؤ دھوبن کا کام کیسے جائیں

میلی پڑی ہوئی ہیں سب چادریاں ہماری

غصے میں خود اکیلے ہم سب بگڑ رہے ہیں — دھوبن کے پاس آکے کپڑے پڑے ہوئے ہیں
اور اس سے زیادہ جو کچھ سب پھٹ گئے ہیں — دامن میں جو کچھ ان پر جڑے سے ہوئے ہیں

خالی پڑی ہوئی ہیں الماریاں ہماری

طویل نظم ہے۔

روٹی تم نے ہے پکائی بدر کامل کی طرح — داغ ڈالے اس میں پھر عشاق کے دل کی طرح
لیکن اس پکوان پر ہے تم سے اک میرا سوال — آج کیوں روٹی پکانے کا تمہیں آیا خیال
بس حنا کے واسطے ناخن تمہارے وقف تھے — مجھ کو کب منظور تھا کہ ان میں تو آٹا جڑے
تھیں فقط پیسوں پکڑنے کو تمہاری انگلیاں — ہے تعجب ان سے کس طرح پکائیں روٹیاں
روٹیوں کو دست نازک وقف تم نے کر دیا — نرگسی آنکھوں کو کیوں تم نے دھوئیں سے بھر لیا
پھول سے رخسار جن پر شرم کی تھی اک لہر — آگ کی گرمی سے اب وہ بن گئے ہیں تاب بھر
مسکراہٹ پھول برساتی تھی ہنس کر ہونٹ پر — آگ میں ڈالو نہ ان پھولوں کو چولہا پھونک کر

بس نسیمہ ختم کر دو یہ شاعری کا سلسلہ
ڈر رہی ہوں حسن کا بھی بڑھ نہ جائے حوصلہ

دی ہے جو تو نے میرے تن ناتواں کو کھجلی — دے دی ہے تو نے یارب سارے جہاں کو کھجلی
ناخن ہلال بن کر کھجلاتے ہے فلک کو — تارے بھی پھنسیاں ہیں سب سے آسماں کو کھجلی
پانی کی بھی سطح پہ یہ آبلے سے کیا ہیں — کیا ہو گئی خدایا آب رواں کو کھجلی
کمی نہیں ہے اک جا دست زباں کبھی بھی — مطلب ہے یہ ہوئی ہے دور زماں کو کھجلی
اک پیڑ کہ جو ہر دم کھجلا رہے ہیں پتے — گل پر ہیں داغ لاکھوں ہے گلستاں کو کھجلی

بسنت چنار ہر دم کھجلا کے روئے گلشن   کہتا ہے سب سے مدد روپ بوستاں کو کھجلی
کھجلی سے ہو جو فرصت توڑے نہ پھول کوئی   ہے بدنما لے جبل ہو باغباں کو کھجلی
کوئی اگر یہ پوچھے یہ طلسم کیوں کھی ہے   کہہ دو کہ ہو رہی ہے میری زباں کو کھجلی
تنہا کھجا کھجا کے ہاں فائدہ بھی کیا ہے
ہوتی نسیم سارے ہندوستاں کو کھجلی

صفحاتِ گزشتہ میں حیدرآباد کے مزاحیہ نگاروں کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے۔ ان کی نظم و نثر کے نمونے بھی پیش کئے گئے ہیں اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حیدرآبادی مزاحیہ نگاروں نے مختلف نہج سے مزاحیہ اور طنزیہ ادب کی خدمت کی ہے۔ انھوں نے اپنے نقشِ قلم سے تنوع پیدا کیا ہے۔ اگر ایک طرف سماج کی دکھتی رگوں پر نشتر لگایا ہے تو دوسری طرف کوتاہی کی کڑوی گولی پر شکر لگا کر اس کی تلخی کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہیں قہقہہ کا موقع پیدا کیا تو کہیں تبسم کی دنیا میں پہنچایا ہے۔ غرضکہ انھوں نے اپنے خصوصی قدروں کو کامیابی سے جولانی دی ہے۔ اردو کے مزاحیہ اور طنزیہ ادب کو ترقی دینے میں ان کے کارنامے پسندیدہ اور بلند معیار کے حامل ہیں اور بعض تو اس صنف کے چوٹی کے ادیبوں میں شامل ہیں اور ان کے کارنامے زندگیِ جاوید کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

گوئٹے

(پیدائش، خاندان اور شخصیت)

اختر انصاری

[گوئٹے اور اس کی شخصیت کے متعلق یہ مختصر مضمون ٹامس مان کے ایک طویل مقالے کے ابتدائی حصے کا ترجمہ ہے۔ یہ مقالہ ٹامس مان نے گوئٹے کے انتخاباتِ نظم و نثر پر ایک مقدمے کے طور پر لکھا ہے۔ خود ٹامس مان کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ وہ موجودہ دور میں جرمنی کا سب سے بڑا مصنف خیال کیا جاتا ہے۔ ۱۹۲۹ء میں اس نے لٹریچر کا نوبل پرائز حاصل کیا اور ۱۹۵۵ء میں اس کا انتقال ہوا۔]

اگست ۱۷۴۹ء کی اٹھائیسویں تاریخ تھی اور دوپہر کا وقت! فرینکفرٹ کے ایک معزز گھرانے میں ایک اٹھارہ سال کی کم سن ماں کی کوکھ سے جاں لیوا کی غیر معمولی تکلیف میں ایک بچے نے جنم لیا۔ اس کا بدن نیلا ہو رہا تھا اور وہ بظاہر مردہ تھا۔ گویا اس دنیا کی روشنی سے اس کو کوئی علاقہ نہیں، جیسے گویا وہ زندگی کی اس شاہراہ پر گامزن ہونے کا قطعی کوئی ارادہ نہیں رکھتا جس کے لیے یہ مقدر ہو چکا تھا کہ وہ ایک وسیع و عریض، گل پوش، مسرت بھری، جدوجہد سے لبریز، انسانی سعادتوں سے بھرپور، رنگینی و شادابی کی شاہراہ ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ماں کے بطن کے بعد وہ براہِ راست زمین کے بطن میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ کئی منٹ گزر جانے کے بعد بچے کی دادی نے جو پٹی سے لگی بیٹھی تھی، کراہتی ہوئی ماں سے کہا: "الزبتھ! بچہ زندہ ہے!" یہ ایک عورت کی آواز تھی جس کی مخاطب ایک دوسری عورت تھی اور بس! محض ایک انسانی آواز! محض ایک بشاشت آمیز گھریلو پیغام! تاہم ساری دنیا اور ساری انسانیت کو اس آواز کا مخاطب ہونا چاہیے تھا اور آج بھی پوری دو صدیوں کے بعد اس آواز کی بہجت آفرینی جوں کی توں قائم ہے جس طرح آئندہ صدیوں تک قائم رہے گی جب تک روئے زمین پر زندگی اور محبت کا وجود باقی ہے، جب تک زندگی خود اپنی چاہت میں غرق ہے، نہ اپنے حلاوت بھرے غم سے تھکتی ہے اور نہ اپنے وجود سے بیزار ہوتی ہے، اس وقت تک ایک عورت کے منہ سے نکلنے والی یہ آواز، یہ سادہ و بے لوث پکار "وہ زندہ ہے" یونہی گونجتی رہے گی اور یونہی موسیقیاں برساتی رہے گی۔

وہ بچہ جس نے اس روز تاریکی سے بڑھ کر روشنی میں قدم رکھا، جس کا حلق آواز سے خالی تھا اور جس کا جسم جسدِ بے روح معلوم ہوتا تھا، بڑی لمبی عمر لے کر آیا تھا۔ قدرت کو یہ منظور تھا کہ وہ بے پایاں تحمل کا مالک ہو اور صحیح معنوں میں رشیوں اور پیغمبروں کی سی طویل زندگی بسر کرے، نشوونما اور تجدید و احیاء کی عظیم الشان صلاحیتوں کا ثبوت دے، اپنی انسانی تقدیر کو بدرجۂ اتم پورا کرے اور دوجوں کی سی

عالی مقامی پر فائض و متصرف ہو جو سلاطین و اقوام کو جھکنے پر مجبور کر دے اور جس کی خلقت و پیدائش کو خود اس نے ایک موقع پر بڑی سنجیدگی کے ساتھ تفنن و قہقہہ کا موضوع بنایا۔ بہرحال جس روز وہ پیدا ہوا تھا اس کو ماضی کی آغوش میں گئے ہوئے تراسی برس ہو چکے تھے۔ تاریخ کے مہیب اور پُرشکوہ ابواب اس کی نظروں کے سامنے سے گزر چکے تھے اور اس کے دل و دماغ پر چھاپ مار چکے تھے۔ ہفت سالہ جنگ، امریکہ کی جنگِ آزادی، انقلابِ فرانس، نپولین کا عروج، سقوطِ مقدس رومانی سلطنت کا اختلال و انتزاع، نئی صدی کے آغاز کے ساتھ یورپ اور دنیا کے ماحول کی تغیر، بورژوائی عہد کی ابتدا، مشینی دور، اور ——— انقلاب جولائی اور یہ بیاسی سالہ جو یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہے اپنی میز پر بیٹھا ہے۔ ۔۔ سپید مو اور بے داغ، اس کی کنپٹیوں کے چاروں طرف بڑھاپے کے مخصوص حلقے ہیں جس سے اس کی ابھری اور ایک دوسرے سے قریب ہونے والی آنکھیں پرندوں کی آنکھوں کی مانند معلوم ہوتی ہیں۔ وائمر کا وہ مکان ہے جو بہت پہلے انسان کے پرستارانہ جذبات کے لیے ایک سجدہ گاہ بن چکا ہے۔ وہ اپنے دارالمطالعے میں جس کو دانستہ طور پر سامانِ تعیش سے بری رکھا گیا ہے اپنی میز پر بیٹھا ہے اور حسین تفکر و تصور کے عالم میں اپنے قدیمی دوست، ماہرِ سیاست و ماہرِ لسانیات، ولہلم فان ہمبولٹ کے نام جو برلن میں ہے اپنا آخری خط لکھتا ہے۔

"۔۔۔ اعلیٰ ترین ذہانت کا وصف یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو جذب کر لیتی ہے اور پچا لیتی ہے اور اس کے باوجود اپنی ازلی تقدیر کو جسے ہم کردار کے نام سے موسوم کرتے ہیں خفیف سے خفیف صدمہ بھی نہیں پہنچنے دیتی بلکہ حتی الامکان اس کو پختہ تر اور عظیم تر بناتی ہے۔ انسان کے قویٰ اپنی آزاد جبلی مصروفیت میں تربیت، تعمیرِ تفکر، کامیابی، ناکامی، ترقی پذیری، ٹھہراؤ اور پھر مزید تفکر کے ذریعے اکتسابی خصوصیات اور وہبی اوصاف کو شیر و شکر کر کے ایک ایسی متوازن اور ہم آہنگ وحدت کو وجود میں لاتے ہیں جو ساری دنیا کو سحر زدہ کر دیتی ہے۔

تمھارا مخلص دوست:

جے ڈبلیو فان گوئٹے"

کتنی پُرسطوت سادگی ہے! ذاتی قدر و قیمت کا یہ جائزہ کس درجہ سادہ و پُرکار ہے۔ اس میں بیک وقت ایک طفلانہ معصومیت بھی ہے اور ایک عبقریت بھی، فرحت انگیزی بھی اور ہیبت آفرینی بھی! اس سے سترہ سال پیشتر چھیاسٹھ برس کی عمر میں اس نے اپنی زندگی کی ایک ایسی ہی جھلک اپنی ایک نظم میں پیش کی تھی جو پڑھنے والے کو "دنیا نے سحر زدہ" والے فقرے کی طرح متاثر بھی کرتی ہے اور چونکاتی بھی ہے۔ اس وقت وہ ایک نوجوان خاتون، ایک نئی نویلی دلہن، مریان فان ولیمر کے ساتھ جو دیوانِ شرق و مغرب میں زلیخا کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے، ایک ایسے معاشقے میں مصروف تھا جو بے وقت کی راگنی ہونے کے باوجود بھی فنی اعتبار سے ایک مناسب وقت اور یقیناً نتیجہ خیز معاشقہ تھا اور یاد رہے کہ یہ اس کا آخری معاشقہ ہرگز نہیں تھا۔ اپنے آخری معاشقے کا شکار وہ چوہتر سال کی عمر میں ہوا، جب کہ سیکس وائمر کی ریاستِ اعلیٰ کا یہ عالی مرتبت وزیر باتدبیر، یہ شہرۂ آفاق شاعر، مرین باد میں ایک دفعہ پھر رقص گاہ کا کنہیا بن گیا اور عشق، پیار، شیفتگی اور دل لگی کے تمام ساز و سامان سے مسلح ہو کر ایک سترہ سال کی چھوکری کے ساتھ بیاہ رچانے پر کمربستہ ہو گیا۔ نتیجہ کچھ بھی نہیں نکلا، کیونکہ اوّل تو خود اس کے خاندان والوں نے اس کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کر لیا اور دوسرے وہ دوشیزہ بھی شادی کی کچھ بہت زیادہ آرزومند نہیں تھی۔ گو یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ اس نے پھر کسی دوسرے شخص کے ساتھ بھی شادی نہیں کی۔ بہرحال چھیاسٹھ برس کی عمر میں جب کہ وہ ایک والہانہ محبت میں گرفتار تھا اور مجبور بھی اپنے نرم مزاج شوہر کی آنکھوں کے سامنے

جو آیا اس جوش و خروش سے مانند اس کی دلدادہ نظر آتی تھی اس نے یہ اشعار رقم کیے ہے

کھل کھلنے کا سماں ہے روز و شب | حالِ محبت میں جواں ہے روز و شب
برف کے گالوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں | آتشیں آتش فشاں شعلہ زن روز و شب

نو بہار سا جن ہو کہ مثلِ سحر | اک فسردہ کوہ کی ہے سادہ پر
اور اس حالت میں ہے عزلت گزیں | اک تب و تاب اک حرارت بید آخر

گوئٹے کی اس نوجوانی معشوق شاعرانہ مبالغہ ہے جو ان تک ہمیں اسے جانا ہوں اس کا دل کبھی کسی عورت کے لیے ایک آتش فشاں کی مانند نہیں دہکا۔ وہ بہ قسم ہی آتش فشانی کے خلاف تھا۔ مارچ تک کہ ساٹھ سال کی دنیا میں بھی اس کی یہ رومانی تھی لیکن اک فسردہ کوہ کی وسعت۔ ذاتی شرف و وقار کا یہ بیان بے تعلقی سے کرتا ہے اور یہ حوصلہ صداقت سے لبریز اپنے اندر حقیقی عظمت رکھتا ہے۔ کتنی بڑی بات ہے اپنے متعلق یہ کہنا ـــ یہ کہنے کا حق رکھنا: ـــ کہ میں ایک عظیم، قدر آور، رفیع الشان پہاڑ کی مانند ہوں جو اپنی حسن پرور برگزیدگی میں منہ ہے اور بھید ہے اور اس کے باوجود ایک حلاوت بھرا حسن ہے جو اس پر رنگ و نور کی لطیف پھواریں برساتا ہے جو اس کی مہیب عظمت سے خوف نہیں کھاتا بلکہ اسے چومتا ہے، اسے سنوارتا ہے، اسے تب و تاب بخشتا ہے ـــ وہ حسن جو سحر کی مانند ہے!

علاوہ ازیں غیر جرمن قاری کی خاطر یہ بتانا ضروری ہے کہ نظم کی ہیئت کے پیش نظر دوسرے بند کے تیسرے مصرعے میں گوئٹے کا قافیہ ہونا چاہیے۔ یہ قافیہ جسے مصنف نے شرارتاً ایک مشرقی نام حاتم کے پردے میں چھپایا ہے اور جسے قاری کی سماعت حظ و لطف ترنم کے مطابق خود بخود مہیا کر دیتی ہے: اصل نام یعنی گوئٹے ہے۔

یہ ایک شان دار انا پرستی ہے جس سے ہم یہاں دوچار ہوتے ہیں۔ ایک خود پرستی جو اتنی پُر وقار ہے جو اپنی تکمیل، اپنی پاکیزگی اور اپنے مختلف عناصر و اجزا کی چھان پھٹک میں اس شدت اور تسلسل کے ساتھ منہمک رہتی ہے کہ اس سے خود پسندی جیسے ہلکے لفظ کا استعمال قطعاً نامناسب ہوگا۔ یہ دراصل ایک گہری انبساطی کیفیت ہے جو انا اور اس کے تدریجی ارتقا میں ڈوبنے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس نے ہم کو شاعری اور صداقت جیسی تصنیف ارزانی کی جو دنیا کی بہترین اور یقیناً دل فریب ترین خود نوشت سوانح عمری ہے۔ یہ صیغۂ واحد متکلم میں گویا ایک ناول ہے جو ایک عدیم المثال اور ناقابلِ تقلید دل پذیری کے ساتھ یہ بتاتا ہے کہ ذہانت کس طرح وجود میں آتی ہے، کس طرح سے مرفہ الحالی اور جوہر اصلی کسی پُراسرار مشیت کی تعمیل میں باہم شیر و شکر ہوتے ہیں اور شخصیت کی کلی کیونکر رحمت و رافت کی دھوپ میں کھلتی ہے۔ شخصیت! گوئٹے نے اس چیز کو فانی انسان کی سب سے بڑی خوش طالعی اور خوش نصیبی بتایا لیکن یہ حقیقت میں کیا چیز ہے، کن عناصر سے ترتیب پاتی ہے، اس کا کیا راز ہے ـــ اور راز ہے یقیناً ـــ یہ خود اس نے بھی واضح نہیں کیا۔ صحیح اور جچے تلے الفاظ کے استعمال سے اس کو خود بھی تھی اس کے باوجود اس کا یہ خیال تھا کہ ہر بات گفتنی اور لائق تصریح نہیں ہوتی۔ بہرحال شخصیت کے نقد اور نظر کے ساتھ ہم خالص ذہنی، عقلی اور قابلِ تجزیہ امور کی دنیا سے رخصت ہوتے ہیں اور فطری، عنصری اور مافوق الفطری حقیقت کے دائرے میں داخل ہوتے ہیں جو ساری دنیا کو سحر زدہ کر دیتی ہے اور بحث و تجسس کا موضوع نہیں بن سکتی۔

گوئٹے کی موت کے چند روز بعد ولہلم فان ہمبولٹ نے جو نہایت گہری نظر رکھتا تھا اس حیرت ناک امر کا اظہار خیال کیا کہ یہ شخص

بغیر کسی شعوری ارادے اور کوشش کے محض اپنے وجود کی بنا پر بے حد و قیاس اثرات پیدا کرنے کا باعث ہوا تھا اس نے لکھا: ''یہ جینیس تخلیقی کام سے بالکل علیحدہ ہے جو اس نے مفکر و مصنف کی حیثیت سے سرانجام دیا۔ یہ اس کی عظیم اور منفرد شخصیت کا کارنامہ ہے۔'' اس جملے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ شخصیت کا لفظ محض ایک لسانی پینترا ہے کسی ایسے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے جس کے اظہار میں ناطقہ سربگریباں ہے، کسی ایسی تخلیق کو ظاہر کرنے کے لیے جس کے سوتے ذہنی نہیں بلکہ حیاتی ہیں۔ شخصیت جو ہمہ گیر جاذبیت اور عالمگیر کشش رکھتی ہے یقیناً ایک مخصوص و زبردست نہ کہ سادہ و ناتراشیدہ قوتِ حیات کی ساختہ و پرداختہ ہے۔ وہ مکارم و مفاسد اور محاسن و نقائص کا ایک آئینہ ہے جو ایک ایسے تناسب کے ساتھ اور ایک ایسے عمل کے ذریعے جو فطرت کے گہرے و ادق تجرباتی رازوں میں سے ایک راز ہے۔

صدیوں کی جرمن زندگی پر اگر نظر ڈالی جائے تو نسل و خون کے ایک دھارے کا پتا چلتا ہے جو غیر محسوس طور پر جاری ہے اور کوئی غیر معمولی چیز بھی نہیں ہے۔ یقیناً مادرِ فطرت کے سامنے کوئی نصب العین نہیں مگر ہم دیکھتے ہیں کہ عملاً ایک نصب العین ہے ایک مخصوص نصب العین؛ چنانچہ گوئٹے اپنی انا یا کی زبان سے یہ الفاظ ادا کرتا ہے:۔

> ''ناممکن ہے کہ ایک قبیلہ غیر متوقع طور پر کسی دیوزاد کو جنم دے یا کسی عفریت کو وجود میں لائے
> صرف اچھے اور برے انسانوں کی ایک نسل ہی پایانِ کار مسرت یا تباہی پیدا کرنے کا سبب
> بنتی ہے۔''

دیوزاد اور عفریت یعنی فوق الفطرت مخلوق۔ اس کے ذہن میں دونوں کا خیال بیک وقت آتا ہے۔ وہ ان دونوں میں کوئی فرق نہیں سمجھتا اور جانتا ہے کہ جس طرح ابتہاج و مسرت میں ہمیشہ وحشت کا بھی ایک پہلو ہوتا ہے اسی طرح دیوزاد میں بھی عفریتی انداز کا پایا جانا لازمی ہے صاف اور سیدھی نثر میں وہ اس بات کو یوں کہتا ہے ''جب خانوادے ایک طویل مدت تک قائم رہتے ہیں تو بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ صفحۂ ہستی سے معدوم ہونے سے قبل وہ ایک ایسے شخص کو وجود میں لاتے ہیں جو ایک مجموعہ ہوتا ہے اور ایک مظہر ہوتا ہے اپنے اجداد کے تمام اوصاف کا' نیز ان کے ایسے میلانات کا جو مخفی رہے اور بروئے کار نہ آسکے۔'' یہ بات مختصر سے انداز میں کی گئی ہے لیکن عارفانہ تلقین کا رنگ رکھتی ہے' انسان اور فطرت کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتی ہے اور اس کے اپنے فوق الفطرت وجود سے سوچ سمجھ کر استنباط کی گئی ہے لیکن ایسا ہوتا کیونکر ہے؟ امتزاج و التیام کا عمل کیونکر آگے بڑھتا ہے؟ نہایت خاموشی کے ساتھ اور بہت ہی دھیمے انداز میں! مختلف قبائل پھیلتے پھولتے ہیں اور آپس میں شادیاں کرتے ہیں۔ کاریگروں، اقوام اور پیشہ و طبقوں میں آمیزش و اختلاط کے سلسلے قائم ہوتے ہیں۔ قدیم رواج کی پیروی میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے والا معمولی دستکار اپنے استاد یعنی مستری کی لڑکی سے شادی کرتا ہے۔ نوابی محل سرا کی کنیز سرکاری امین یا ناظم سے بیاہی جاتی ہے۔ پیدائش اور موت کی حدوں کے درمیان مجانست و مخالطت کا یہ بے ضرر عمل آگے بڑھتا رہتا ہے اور بظاہر کوئی اہمیت بھی نہیں رکھتا لیکن بتدریج اس تعزز و توقیر کی شکل اختیار کرنے لگتا ہے جو ملکیت، ثقافت، شائستگی اور نجابت سے وابستہ ہے۔ یہاں تک کہ انجام کار ایک سٹی مجسٹریٹ کو وجود میں لانے کا باعث بنتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ لنڈھائمر خاندان نے ٹیکسٹر خاندان کے ساتھ جو جرمنی کے جنوب سے آکر فرینکفرٹ میں بس گیا تھا، سلسلۂ ازدواج قائم کیا اور پھر اسی طرح ٹیکسٹر خاندان نے گوئٹے خاندان کے ساتھ جس کا وطنِ اصلی شمال میں تھرنجین فارسٹ اور ہرز کے پہاڑوں کا درمیانی علاقہ تھا' شادی بیاہ کے ناتے جوڑے۔

میرا خیال ہے کہ اس عظیم شاعر کی فطرت کا بہترین حصہ منفرد ترین اور سب سے زیادہ فیصلہ کن عنصر لنڈھائمر خاندان کا وہ خون ہے

جو قدیم روم، مرحد کے قرب و جوار سے آیا، جہاں بہترو روحی اور روحانیانہ نسلی دھارے صدیوں قیام سے متحد ہوتے چلے آ رہے تھے۔ بیاس کی نانی کا ورثہ تھا جو پیدائش کے لحاظ سے لندھائمر خاندان سے اور رشتوں کے اعتبار سے شہر خاندانوں سے تعلق رکھتی تھی اور ایک صاف طبیعت اور شریف النفس بھولے رنگ کی عورت تھی۔ تصویروں اور شبیہوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی پیشانی موقعوں کی بناوٹ اپنی سیاہی آنکھیں اور اپنی عمومی عجمی حسن اسی سے نہیں سے ورثے میں پائی اور غیبیاتی مادہ اصل تھا اس کے کلاسیکی رجحان کا، اس کی ہیئت پرستی اور وضاحت پسندی کا اس کی تخلیقات کی ہموار اور دلکشی کا اور جرمن کردار سے اس کی عجیب ناخوشی کا جو کبھی تنقید کی شکل اختیار کر لیتا اور کبھی بیزاری کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے۔

اس سب کے باوجود ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہ جرمن کردار کے بُرے حلوص اور کمزور عرفانی انداز کا ایک اہم جزو تھا جو اس نے جس اور ماڈرن نورمن کی نسل سے ورثے میں پایا۔ چنانچہ یہ کہنا حقیقت سے بعید نہ ہو گا کہ شاید ہی کبھی کسی ایسے شدید جرمن شخص نے المانویت پر ایسی سخت اور لاعلاج تنقید کی ہو اور یہ کہ جرمنوں کی پست ہمتی (یعنی خود کشی) کی اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی۔

جایانی نقطۂ نظر سے وہ خاندان جو اس عظیم اس دیو زاد کو وجود میں لانے والا تھا عجیب کچھ بہت ممتاز نظر نہیں آتا تھا۔ اس کا دادا فریڈرک جارج گوئٹے جو درزی تھا جرمنی ہجرت کر کے سادہ ہو چکا اور ابتدائی قوئی کا شکار ہو گیا تھا۔ اس نے دو مرتبہ شادی کی اور گیارہ بچوں کا باپ بنا جن میں سے اکثر بچپن ہی میں فوت ہو گئے۔ صرف تین ایسے تھے جو اس کے بعد تک زندہ رہے۔ ان بیں سب سے بڑا بیٹا ایک سر پھرا سا شخص تھا اور ۲۴ سال کی عمر میں شدید خلل دماغ کے عالم میں جاں بحق ہوا۔ شاعر کا باپ یوہان کیسپر گیارہ بہن بھائیوں میں دوسرے تھا جو اپنے عمر رسیدہ والدین کی بڑھاپے کی اولاد، اس کا وجود اس امر کی جیتی جاگتی شہادت تھی۔ یہ ماہر قانون جس کے پاس سلطانی منصب کا عہدہ اور اعزاز بھی تھا کچھ عجیب سا، مزاجاً چڑچڑا اور وہمی سا، ایک انسان واقع ہوا تھا، ایک طول نشاء بہ دولت کر بیٹھا جو کبھی اپنے پیشۂ قانون کے سلسلے میں کوئی کام نہیں کرتا۔ نوادرات کا جمع کرنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا جس پر وہ بے حد وقت صرف کرتا تھا۔ اس کی تفصیلات آنی اور سادہ بناوٹ ناقابل برداشت تھی۔ وہ ایک بیمار مزاج انسان تھا جس کے بیچیدہ وسوسہ انگیز رجحانات کا ایک ملکا سا تجزیہ بھی آسانی سے کیا جا سکتا تھا۔ الیزبتھ نے جس کا باپ ٹاؤن مجسٹریٹ اور ماں لندھائمر خاندان کی خاتون تھی اور جو ایک شگفتہ مزاج لڑکی تھی جب اس سے شادی کی تو اس کی عمر سترہ سال کی تھی۔ یعنی شوہر کی عمر سے تقریباً نصف۔ اس نے ہرگز کسی دانشمندی کا ثبوت نہیں دیا کیونکہ اسے اپنی زندگی کا بہترین حصہ ایک خود سر، جابر بوڑھے کی نرس کی حیثیت سے گزارنا پڑا۔ الیزبتھ کا باپ یوہان وولف گانگ ٹیکسٹر بھی کم سے کم اپنی جوانی میں عمر رسیدہ شاعر کی طرح رہا ہو گا جیسا کہ گوئٹے اپنی ماں کو کہا کرتا تھا گویا وہ ایک شہدا تھا جو بے دھڑک عورتوں کے پیچھے بھاگا پھرتا تھا اور کبھی کبھی بھلائے ہوئے شوہروں کے ہتھے بھی چڑھ جاتا تھا گویا وہ ایک مجموعۂ اضداد تھا۔ ان حرکتوں کے باوجود اس میں پیش گوئی کی صلاحیتیں عجیب و غریب تھیں عجیب جن کی قوت تھی اور اپنی پیرانہ سالی میں ——— وہ اسی سال کی عمر میں مرا ——— اس نے سنجیدگی، متانت، پاکبازی اور عزت و وقار کا ثبوت دے کر اپنے دورِ شباب کی بے راہ رویوں اور بیہودہ کاریوں کی بوجہ احسن تلافی کر دی۔ اس نے اپنے آخری سال ایک پہیے دار کرسی میں ایک مسلوب الحواس مریض کی حیثیت سے گزارے۔

مدد صاحبانِ منصب کی بیوی الیزبتھ کے یہاں چھ بچے ہوئے جن میں چار پیدائش کے دو دن تین دن بعد ہی عالم مرگ کی جانب منہ موڑ گئے۔ صرف ایک بہن کورنیلیا نے اپنے بھائی وولف گانگ کا بچپن کے بعد تک ساتھ دیا۔ یہ ایک بد قسمت آزردہ مزاج لڑکی تھی جو اعصابی اور جسمانی امراض کی شکار تھی۔ وہ سرد مہر اور بدمزاج تھی اور جیسا کہ اس کے بھائی نے کہا بیوی بننے کی بجائے راہبہ بننے کے لیے پیدا ہوئی تھی تاہم اس نے شادی کی اور زچگی میں جس کے خیال سے اس کو پہلے ہی سے تنفر رکھا تھا جاں بحق ہوئی۔ صرف وہی ایک تنہا بچ گیا اور اس بھرپور طریقے سے جیا گویا پانچوں بہن بھائیوں کی زندگی اسی کے حصے میں آ گئی۔ اگرچہ یہ بھی صحیح ہے کہ وہ صحت و توانائی جس سے وہ محروم رہے تھے اور جس پر اس نے ایک غیر ارضی حرص و ہوس کے ساتھ متصرف ہونے کی کوشش کی اس کے حصے میں بھی نہیں آئی۔

کیا داستانِ حمزہ کی اصل فارسی ہے؟

راز یزدانی

کہتے ہیں کہ تواتر اپنی صداقت ہے یعنی جب کوئی بات متواتر کہی جائے تو وہ سچی ہوتی ہے۔ خاص طور پر یہ بات ہے کہ عوام تو عوام ہمارے خواص نے بھی یہ طے کر رکھا ہے کہ داستان امیر حمزہ صاحبقراں فارسی سے ترجمہ ہو کر اردو میں منتقل ہوئی ہے۔ حقیقت اسی قسم کی غلط فہمیوں نے جو اردو کی داستانوں کے متعلق عام ہیں مجھے مجبور کیا کہ میں اپنی عمر عزیز کے تیس سال داستان پڑھنے اور داستان کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنے میں صرف کروں۔ لیکن اس مدت میں مجھے جو کچھ حاصل ہوا اس کو دیکھتے ہوئے مجھے بڑی خوشی ہے۔ میں کہہ دینے پر آمادہ ہوں کہ میری عمر کا یہ حصہ ضائع نہیں گیا ۔۔۔ ان ہی حاصل شدہ حقیقتوں میں ایک حقیقت یہ ہے کہ میں اس داستان کو فارسی سے ترجمہ شدہ داستان نہیں سمجھتا۔

اردو میں اس داستان کے فارسی سے ترجمہ ہونے کا ڈھونگ نولکشور پریس نے رچایا۔ کس وجہ سے؟ یہ تو معلوم نہیں لیکن حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ اردو داں طبقہ نے بغیر کسی تحقیق کے پریس کے اس پروپیگنڈے کو قبول کر لیا ۔۔۔ میں مانتا ہوں کہ جناب کے زمانے میں پریس کا یہ پروپیگنڈہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے اور تقریباً ہر کتاب کے اندر جہاں جہاں موقع ملا۔ چھاپی پروپیگنڈہ کو شد و مد سے پھیلایا گیا ہے۔ چنانچہ لکھنوی طلسم ہوشربا جلد ... میں لکھتے ہیں:

"ملا فیضی صاحب وغیرہ نے جو ہفت دفاتر نوشیرواں نامہ وغیرہ تحریر فرمائے"

یہ ہے وہ پروپیگنڈہ جسے دیکھتے دیکھتے انسان کی نگاہ دھوکا کھا جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہی تو ہے کہ یہ ہفت دفاتر فارسی سے اردو میں ترجمہ ہوئے۔

صندلی نامہ کے مؤلف مولوی محمد اسمٰعیل اثر نے تو اس سلسلہ میں وہ "تیر بے کمان" چلایا ہے کہ ——

درونِ سینۂ من زخم بے نشاں زدہ

فرماتے ہیں:

"جناب مرحوم (مراد منشی نولکشور سے ہے) نے اس ہیچ مدان سے ارشاد فرمایا کہ ہر چند داستانِ صاحبقراں کے کئی دفتروں کا ترجمہ ہوا ہے اور جلدیں اس کی مطبوع ہو کر منظورِ نظر ناظرین والا تمکین ہوتی ہیں...... ایک دفتر کا ترجمہ مجھ سے متعلق کیا جاتا ہے۔ جزو صندلی نامہ احقر کے سپرد فرمایا اور شیخ تصدق حسین صاحب سے جن کے اہتمام سے نوشیرواں نامہ

کیا یہ سب ترجمے، بالخصوص اس دستیاب مجموعے سے، اصل فارسی سے ہوسکتا؟

(مخدوم محمد طاہر)

مجھے شبہ ہے کہ اس سے بڑی حماقت ہو سکتی ہے ۔۔ مولوی صاحب کے کارکنوں کو اب بھی تسلیم کرنے سے انکار کوئی چارۂ کار نہیں کہ جتنی سرخیاں فارسی نسخوں سے حرف بحرف فراہم کی گئی ہیں، وہ حاصل ہو گئے تھے، مگر وہ قوتِ متخیلہ کی اعلیٰ سطح ان بچوں یا کمزور لوگوں کی طرح رہنے کی صورت میں کسی دیدہ وری کی کمی رہی ہے، جس سے ہمیں یہ مجبوری آگئی ہے، بے اختیار یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ان کا یہ سارا اردو میں ترجمہ ہو جانے کے بعد اصل مسودات کو اگر ردی کی ٹوکری میں نہیں ڈالا گیا تو وہ کہیں کسی کتب خانے کی تحویل میں محفوظ ہوں گے ۔ غور کیجئے، ایسے فارسی مخطوطے جن سے دنیا بھر کی بڑی بڑی داستانیں، بے پناہ خیال میں، جو فروزاں جو ہر رکھتے تھے، کسی کے نہ جاننے پر وہ نیست و نابود ہو گئے اور ان پر کسی کو تعجب تک نہ ہوا، یہ بات عقل میں نہیں آتی۔ منشی نولکشور صاحب جیسا اردو کے عاشق، بیدار مغز اور روشن دماغ انسان، جس نے اپنی قوت بازو سے "نولکشور پریس" جیسا ادارہ پیدا کیا اور ایسا قیمتی سرمایہ جو آج بھی ان کے خاندان کے لیے شرف کا باعث ہے، ان فارسی مخطوطے کو، جو گویا ان کے حاصل ہو گئے تھے، انھیں یوں نابود ہونے دیں، ان کو محفوظ رکھنے کی بجائے انھوں نے ترجمے کے بعد ردی میں پھینک دیا ہو، یہ "دیوانے کے خواب" کی طرح سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔

میری خوش قسمتی ہے کہ ۔۔۔۔ کا ایک پڑپوتا منشی نولکشور کے نبیرہ صاحب ۔۔۔ صاحب فرمانروا ہیں، جو اس وقت ۔۔۔ کے مالک ہیں اور شعبہ ادب و اسلامی کے صدر بھی ہیں، اور ماہنامہ "فروغ اردو" لکھنؤ بھی آپ ہی کے اہتمام سے شائع ہوتا ہے۔ میں نے انھیں لکھا اور توقع ظاہر کی کہ یادداشتیں کھنگالیں، شاید پرانے ریکارڈ میں داستانِ حمزہ کے فارسی مخطوطے موجود ہوں تو مجھے بتائیں ۔۔۔ یوں تو اس سلسلے میں مجھ سے بڑی طویل خط و کتابت ہوئی اور بہت سی کارآمد باتیں ان سے معلوم ہوئیں لیکن داستان گویوں کے مفصل حالات اور ان مخطوطوں کے متعلق آخر میں انھوں نے جو کچھ مجھے لکھا وہ درج ذیل ہے:

> "مطلوبہ حالات کتابوں میں تو موجود نہیں، پروفیسر مسعود حسن رضوی کے ذریعے سراغ لگا رہا ہوں ۔۔۔ اصل فارسی داستانوں کا کسی جگہ کوئی سراغ نہیں لگا۔ حقیقت یہ ہے کہ دو ایک بنیادی کتب ضرور تھیں لیکن یہ داستانیں خود مطبع کے داستان گو روز روز سناتے تھے اور کاتب لکھتے جاتے تھے، یہاں تک کہ ان کی کوئی اصل بھی محفوظ نہیں ہے۔ یعنی جو کاتب لکھتے تھے وہ مسودات۔ سامنے ایک چبوترہ پر داستان گو بیٹھتے تھے، سامنے کاتب بیٹھتے تھے وہ سنتے اور لکھتے جاتے تھے۔ اس سے زیادہ ان کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔"
>
> ۲۲ اپریل ۵۹ء

داستان گویوں کے جن حالات کا میں خواستگار تھا وہ تو باوجود متعدد یاد دہانیوں کے آج تک نہیں ملے اور نہ اب کوئی توقع باقی ہے کیونکہ مل سکتے تو مل چکے ہوتے، لیکن اس خط نے جو میرے نظریات کے مطابق تھا اور اب تک میرے پاس محفوظ ہے، فارسی جلدوں کی موجودگی اور ان سے براہِ راست ان داستانوں کے اردو میں ترجمہ ہونے کا باب ختم کر دیا۔ دو ایک بنیادی کتابوں کی موجودگی سے

مجھے انکار نہیں ہے۔ میرے علم میں ہے کہ سلطان محمود نے داستان حمزہ کو دو بڑی بڑی جلدوں میں لکھوایا تھا۔ قمر لکھنوی نے طلسم ہوش ربا جلد ششم کے آخر میں شاہان اودھ کی لکھوائی ہوئی ان دونوں کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔

سب سے بڑی اور سب سے زیادہ افسوسناک بات جو غلطی سے ان دفتروں کے براہ راست ترجمے کے خلاف کہی جاتی ہے یہ ہے کہ نوشیرواں نامہ یعنی پہلے دفتر سے ایرج نامہ یعنی چوتھے دفتر تک جو صاحب ان دفتروں کے ترجمے کے سلسلے میں شیخ تصدق حسین وہ داستان گو تھے جو نے ناخواندہ یعنی کچھ پڑھ نہیں سکتے تھے۔ تو اگر شیخ صاحب کے نانا میر باقر کا عام کرنا دستور وہ اس کی وہ عام گو ہوجاتا تو ہر کتاب جس کے ہونے ہوتے۔ کہا جاسکے کہ داستان جس کتاب کے لیے کسی فاضل فارسی داں کے ملنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ دوم یہ کہ ایک ناخواندہ شخص فارسی کے عام محاورے وغیرہ جان تو شاید اس کام کو کرہی سکتا لیکن سعدی یا ستائی کرنے سے بہت بھرنے والے ایک ناخواندہ شخص کے لیے تو اور زیادہ مشکل ہے کہ وہ فارسی سے ترجمہ کرسکے۔

طلسم ہوش ربا کے۔ دیکھنے دیتے ہیں قمر لکھنوی اور جاہ لکھنوی ان دونوں نے اپنے اپنے مقام پر تسلیم کیا ہے کہ داستان حمزہ اور طلسم ہوش ربا دونوں میں خود لکھنؤ کے داستان گویوں نے اضافے کیے ہیں تصدق جاہ لکھنوی لکھتے ہیں:

"یہ بھی واضح ہو کہ صاحب دفتر نے یہ امر اصل مصنف سے ہوگی) حال جہانگیر نہیں
لکھا ہے بلکہ یہ لکھا اب سے ایک دوست شیخ تصدق حسین نامی ایک داستان گو جن
انھوں نے بیان کیا تھا۔" (۹۳/۴)

گویا طلسم ہوش ربا میں جہانگیر بن صاحبقران کی داستان اور طلسم کوکب کے ٹوٹنے کا ماجرا خالص شیخ تصدق حسین کا بڑھایا ہوا ہے۔ قمر لکھنوی نے طلسم ہوش ربا کی چھٹی جلد صفحہ ۱۸ پر داستان حمزہ میں ایجاد و بدعت کے متعلق اور زیادہ واضح اعتراف کیا ہے۔

"بعض صاحبین نے داستان تازہ و جدید کو سماعت فرمایا ہے لیکن حقیقی آبرو بڑھاتے ہیں
ارشاد فرماتے ہیں کہ جس طرح سے حقیقت میں دفاتر یعنی نوشیرواں نامہ وغیرہ و طلسم ہوش ربا
تو نے بیان کیا یہ داستانہائے دلچسپ کبھی نہ سماعت کی تھیں۔"

ابتدائی سطریں پڑھ کر ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ شاید قمر نے طریقۂ بیان کی دلکشی کے متعلق کہا ہو لیکن "یہ داستانہائے دلچسپ" جو قمر کی زبان کے علاوہ کبھی سماعت میں نہ آئیں ان سے تو یہی مطلب نکالا جاسکتا ہے کہ قمر نے جہاں موقع پایا کچھ ٹکڑے اپنی طرف سے پیوند کردیے۔

یہ کیفیت "داستان حمزہ" کی صرف اسی عہد سے ہمارے سامنے ہے جب سے اردو میں داستان گوئی کا رواج پڑا۔ اب ذرا ۹۸۰ھ اور ۱۰۲۲ھ سے تیرھویں صدی یعنی تقریباً ۱۲۲۵ھ تک کی اس کیفیت پر غور کیجیے جو ایسی قصہ خوانوں کے عہد میں اس داستان پر گزری ہوگی اس کا ایک اندازہ بوستان خیال سے ہوتا ہے۔ بوستان خیال ۱۱۵۵ھ سے ۱۱۷۵ھ تک لکھی گئی ہے یعنی داستان حمزہ کے ہندوستان میں آنے سے تقریباً سو اسو برس کے بعد میر تقی خیال رموز حمزہ کے ساتھ ساتھ کوچک باختر اور بالا باختر کا حوالہ دیتے ہیں —— (دیدہ مشتاق الابصار ۱/۶) گویا اس زمانہ تک نوشیرواں نامہ، کوچک باختر اور بالا باختر کے نام بھی مخصوص ہوچکے تھے حالانکہ ابتدائی رموز حمزہ میں جیساکہ میں عرض کرچکا ہوں صرف مقام پائے جاتے ہیں ایرج نامہ اور صندلی نامہ ایسی سے صاف ظاہر ہے کہ عراق اور ایران کا

[illegible] ہیں۔

ان تمثیلوں کا اندازہ [illegible] اس داستان [illegible] ہے [illegible]

نمبر ۳۰۵۲ مجموعہ (نوشیرواں نامہ کرچک باختر [illegible] ترتیب [illegible]

تعداد صفحات ۱۰۵۲ [illegible] ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible] ہے۔

[illegible]

گل چہرہ گرمان:

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۰۲۲ یا ۹۹۸ صفحات [illegible] ہیں۔ [illegible] سب کہاں سے داخل ہوتے اگر فارسی کے قصہ خوانوں نے اس داستان میں اپنی طرف سے [illegible] نہیں کیے۔

نمبر ۳۰۵۲ نوشیرواں نامہ . . . [illegible] تعداد صفحات ۱۰۸۴

نمبر ۳۰۵۳ مجموعہ کرچک باختر و بالا باختر تعداد صفحات ۱۱۳۴

صاف ظاہر ہے کہ ۳۰۵۲ پر نوشیرواں نامہ، کرچک باختر، بالا باختر اور ایرج نامہ کا جو مجموعہ تھا اس کے صفحات کی تعداد کل ۱۰۵۲ تھی۔ نمبر ۳۰۵۲ پر صرف نوشیرواں نامہ آیا اور اس کے صفحات کی تعداد ۱۰۸۴ ہو گئی یعنی صرف نوشیرواں نامہ کے صفحات پورے مجموعہ سے بقدر ۳۲ صفحوں کے بڑھ گئے۔ یہی حال کرچک باختر اور بالا باختر والے مجموعہ کا ہے کہ ان کے صفحات پورے مجموعہ سے بقدر ۸۲ کے بڑھے ہوئے ہیں۔

یہیں ۳۰۴۳ کے ایرج نامہ کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس پر کاتب کا نام درج نہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ یہ بارھویں صدی ہجری کی تحریر ہے۔ اس کے صفحات کی تعداد ۸۵۰ ہے گویا صرف ایرج نامہ کی ضخامت۔

یہ مخطوطے اپنی زبان کے لحاظ سے [illegible] نہیں پہنچے بلکہ ان میں ادبی چاشنی نہ ہونے کے برابر ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ترتیب دینے والے فارسی کے ادیب نہیں تھے۔ ان کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ فارسی سے [illegible] کوئی ایسا شخص فارسی لکھتا چلا جاتا ہے [illegible] اپنے زمانے کی عام شہرت کی لسانی [illegible] سے بلند نہیں بلکہ ۳۰۵۰ پر [illegible] گرمان کے نام سے ایک مخطوطہ ہے اس کے ترتیب دینے والے کی فارسی دانی اس مرتبہ کی ہے کہ

(۱) صاحبقراں [illegible] اصرار کر رہے ہیں کہ تم بتاؤ [illegible] تھا کہاں بھاگ گیا اور اگر نہ بتاؤ گے تو [illegible] دشنام [illegible] (۸ سے ۱۰ تک کسی صفحہ کی پانچویں سطر)

(۲) صفحہ ۳۳۳ اسماق نادیں مسل مکان کرشا نمیدہ ذکر شاک ہیچ کرشاد :

(۳) صفحہ ۳۹ ۱ سطر ۳ پہلے صفحہ ۳۴۳ ۔ صفحہ ۳۰۳ گزر چکی بہ شیر صفحہ ۳۵۵ ۔ عمرو عیار کہ کشتی بعض جگہ غائب شدہ صفحات ۱۰۱، ۳۴ ا پر فقرہ اردو میں لکھنا شروع کر دیا ہے مثلاً گفت اے عمرو صاحبقران مرا کہ صد رنج پر دین پرست ہو کر تاب غلامی ... چمنِ گردوں سے وغیرہ ارسال کیا ہے اس نے بھیجا ہے ۔

گویا اس مخطوطے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فارسی تو اس دور کے عام دفتری لحاظ سے اختیار کی گئی ہے ورنہ کاتب فارسی سے زیادہ اردو پر قادر ہے اور جہاں وہ فارسی سے الجھتا ہے بے تکلف اردو شروع کر دیتا ہے لیکن جیسے ہی اسے محسوس ہوتا ہے کہ میں اردو لکھ رہا ہوں اور زمانہ فارسی کا ہے وہ فارسی شروع کر دیتا ہے ۔

بہرحال یہ مخطوطے خواہ ان کی ادبی حیثیت کچھ ہی کیوں نہ ہو ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ رموزِ حمزہ میں فارسی قصہ خوانوں نے بہت ترامیاں کی ہیں۔ ہماری بدقسمتی ہے چودھویں صدی کے شروع اور بارھویں صدی ہجری کے اواخر تک قصہ خوانی کا فن جب اردو میں منتقل ہو جانے کے بعد بجائے قصہ خوانی کے داستان گوئی کا فن کہا جانے لگا کتاب بہ کتاب نہیں بلکہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوا ہے یعنی ہر عہد کی کتابوں کا ریکارڈ ہمارے سامنے نہیں بلکہ ہوا یہ ہے کہ کسی عہد میں کوئی مشہور قصہ خوان پیدا ہوا، اس کے دس بیس شاگرد ہوئے ہر شاگرد اپنے جوہرِ ذاتی کے مطابق قصہ خواں ہو گیا۔ کچھ استادوں نے اپنی طرف سے اصل داستان میں چند ٹانکے لگائے کچھ شاگردوں نے استاد ہو کر اپنی کثرتِ ہیونت کے جوہر دکھائے اور پھر شاگردوں کے جانشینوں کے ؛ تک جب داستان آئی تو انھوں نے بھی کمی نہیں کی۔ اس عالم میں ذرا اس کا اندازہ بھی کیجیے کہ ہر دور میں صرف ایک ہی قصہ خواں نہ رہا ہوگا یا ایک ہی قصہ خواں کا ایک ہی شاگرد کامل الفن نہ ہوا ہوگا۔ سوہ بھی کئی قصہ خواں ہوں گے : ایک ایک قصہ خواں کے کئی کئی شاگرد اپنے فن میں کامل ہوئے ہوں گے۔ ہر استاد نے دوسرے سے آگے جانے کی کوشش کی ہوگی۔ ہر شاگرد نے اپنے پیشرو سے جداگانہ طرزِ بیان اختیار کرنے کی کوشش کی ہوگی اور داستانِ حمزہ ہر دور میں کچھ نہ کچھ آگے ہی بڑھتی رہی ہوگی۔

ان حالات میں منشی نولکشور کے اس وقت تک جب انھیں اس داستان کو چھاپنے کا خیال پیدا ہوا اگر "رموزِ حمزہ" سے آگے بڑھ کر داستانِ حمزہ اپنی مطبوعہ حدود تک آ گئی تھی تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے اسے ضرور آگے بڑھنا چاہیے تھا۔ یہ چند کے مشہور قصہ خوانوں کے ہاتھوں ضرور آگے بڑھی لیکن قصہ خوانی کا فن چونکہ "علومِ سینہ" میں شامل تھا اور ظاہر ہے کہ علمِ سینہ کے متعلق روایت یہی ہے کہ "گنجینہ در سفینہ" اس لیے اس کی کوئی تحریری یادگار کسی عہد میں قائم نہیں ہوئی نہ کبھی یہ موجودہ سلسلے کے ساتھ کتابی صورت میں لکھی گئی ——— اگر ایسا ہوتا اور یہ فارسی میں بھی سلسلہ وار لکھی جاتی تو اس کے مکمل مخطوطے خواہ بوڈلین لائبریری اور انڈیا آفس لائبریری میں ہوتے یا نہ ہوتے رضا لائبریری رام پور میں ضرور ہوتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے جب روہیل کھنڈ میں روہیلوں کی حکمرانی از گنگ تا سنگ سے محدود ہو کر صرف رام پور کی حدود تک رہ گئی اور "کمپنی بہادر" کی حکومت کی "ناخواستہ سرپرستی" نے "حوصلہ مند اور پُرجوش" روہیلوں کی تلواروں کو نیام کر کے گھر کی کھونٹیوں پر لٹکوا دیا تو ان شیرانِ نیستانِ شجاعت نے میدانِ جنگ کی خونریزیوں کے جذبے کو مہماتِ لشکر داستانِ جنگ و عشق کی صورت میں ڈھال دیا۔ "پٹھان شاعری کرنے لگے" اور دربارِ رام پور داستانِ حمزہ صاحبقراں سننے لگا۔ دہلی اور لکھنؤ کے منتخب داستان گو دربارِ رام پور میں جمع ہو گئے چنانچہ بوستانِ خیال کی ژولیدہ بیانی کو رفع کرنے

اور داستانِ حمزہ کو زندہ رکھنے میں کچھ نامی داستان گویوں سے امداد لی۔ نول کشور نے جو سلسلہ چھاپا وہ مشہور ہے
یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ داستانیں فارسی داستانوں سے ثابت ہوتی ہیں۔ آخر
کیا بات ہے کہ امیر حمزہ کے بعد یہاں تک بڑی بڑی جلدیں پیدا ہوتی گئیں جیسا کہ اوپر ذکر ہوا اور
کہ یہ داستانِ حمزہ کا کوئی فارسی سلسلہ ہے جس کی مستقل کتاب سے ملتی جلتی ہو، کم پایا جاتا ہے۔ سارا ترجمہ نام ہی میں
پایا جاتا ہے۔ اس کام کا سلسلہ چلتا رہا اور یہ بات ممکن ہے کہ داستان گو جو کچھ کہتے تھے وہ لکھ لیا گیا
اور پھر اس کا اردو میں ترجمہ کرنے کا کام ... کے پیشِ نظر تھا۔ جس قصہ گو کو منشی نول کشور نے اجازت دی ہوگی
اور جو نہ ہو سکا اسے نول کشور پریس لکھنؤ نے خاص طور پر اپنے ہاں مکمل کر دیا۔

اس کام کے سست رفتاری سے ہونے کی وجہ سے ... کے سامنے
... سے زیادہ اہم یہ تھا کہ ... جانتے تھے کہ ... کامیابی ہے ... ہوتی ہے
اس کے بعد ... ہو گئے۔ اس سب سے کام سست ... ہے ... جو ...
جس قصہ گو نے ... کہیں ... پایا جاتا ... ہے کہ ... داستانِ حمزہ کی ... صورت
کہیں نہ تھی۔ اگر کہیں ہوتی تو ... قیمت ... کہیں نہیں پائی گئی ... قیمت کی۔ ... کوشش سے کم کر نہ
سکی۔ اس لیے کہ کہیں ہوتی تو آتی ——— جس ... نے مشہور داستان گو میر احمد علی مصنف ہوش ربا ... اور
دوسرے ... لکھنؤ سے کم کر ... گئے ——— بہر حال یہ کہیں کسی کہانی ... جو ہوتی تو اپنے قدر سے ... جاتی
تو ... نام ... لکھنا چاہی۔ ... سست رفتاری کے ساتھ نامکمل صورت میں ——— ... احمد سعید خاں ...
... نواب سر محمد رضا علی خاں کے ... اس کی داستانیں ... کہیں ... کہ ... آثار
اور ... میں ... داستانِ حمزہ کا فارسی میں ... تفصیل سے پایا جانا ... کتابی
صورت میں پایا جانا ثابت نہیں ——— ثابت ہوتا ہے کہ داستانِ حمزہ طلسم ہوش ربا کے علاوہ اسی صورت میں داستان گویان لکھنؤ
نے نول کشور پریس سے ان داستان گویوں سے زبانی اردو میں لکھوایا اور طبع کر کے شائع کر دیا۔

پہلے ۱۹۵۲ء میں

پھر ۱۹۵۴ء میں

نقوش

کے افسانہ نمبر منظرِ عام پر آئے تھے

اب ۱۹۶۰ء میں بھی

ایک غیر فانی افسانوی دستاویز

پیش کی جائے گی

دل شاہجہانپوری کا غیر مطبوعہ کلام

[illegible] غیر مطبوعہ [illegible] دل شاہجہانپوری کا وہ غیر مطبوعہ [illegible]
[illegible] تحقیق [illegible] شاہجہانپوری [illegible] شائع [illegible]

[illegible] ۱۹۵۱ء [illegible] بہت کمزور ہو گئی تھی۔ [illegible]
[illegible] جاتے تھے [illegible] بالکل [illegible]
[illegible] سے [illegible] شاغل جاری رکھے۔

۲۴ دسمبر [illegible] ایک شعر کہا ہے

بہت سے [illegible]
ساقی کچھ کسی سے کہہ لیں گے

۲۵ دسمبر کی دوپہر کو طبیعت میں سکون ہوا لیکن پھر تکلیف بڑھ گئی۔ بار بار [illegible] سے ہاتھ باہر نکالتے تھے۔ آواز سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ پڑھ رہے ہیں۔ اسی حالت میں دو مصرعے پڑھے

(۱) جیسی اب ہے مری حالت کبھی ایسی تو نہ تھی
(۲) اجل اتنی تو مہلت دے کہ اک سجدہ ادا کر لوں۔

۲۶ کی صبح کو پکارا تو کوئی جواب نہیں دیا۔ قوت گویائی ختم ہو چکی تھی۔ ناک سے کچھ خون بھی بہا۔ ڈاکٹر نے دیکھ کر کہا کہ دماغ پر فالج کا شدید حملہ ہو گیا ہے۔ موت و حیات کی اس کشمکش میں [illegible] بجے دن کے نہایت سکون کے ساتھ روح پرواز کر گئی۔ ۶ بجے شام بعد نماز مغرب سپرد خاک کر دیا گیا۔"

○

حسن نے مان لیا قابلِ تعزیر مجھے
نظر آئی ہے محبت کی یہ تقصیر مجھے

کیوں نہ ہو بادۂ سرجوش کی توقیر مجھے
مل گئی پیرِ خرابات سے تحریر مجھے

جلوۂ حسن کے مفہوم پہ جب غور کیا
ایک دھندلی سی نظر آئی ہے تصویر مجھے

اب مری وحشتِ رسوا کا عجب عالم ہے
کر دیا آپ نے وابستۂ زنجیر مجھے

بے تکلف رخِ زیبا سے اٹھائے وہ نقاب
حسن خود پائے گا اک پیکرِ تصویر مجھے

زندگی اک نئے عالم میں نظر آتی ہے
لے چلی آج کہاں گردشِ تقدیر مجھے

کھا گئی دلکشئ حسن مری نظروں میں
جی بہلنے کو ملی آپ کی تصویر مجھے

زلفِ شب گوں رخِ انور کی ستائش کے سوا
کوئی مضموں نہ ملا قابلِ تحریر مجھے

حسنِ دلکش کے تعلق پہ نظر جب پہنچی
نہ رہا پھر گلۂ گردشِ تقدیر مجھے

○

ہر سانس ہے شرحِ ناکامی، پھر عشق کو رسوا کون کرے
تکمیلِ وفا ہے مٹ جانا، جینے کی تمنا کون کرے

جو غافل تھے ہشیار ہوئے، جو سوتے تھے بیدار ہوئے
جس قوم کی فطرت مردہ ہو اس قوم کو زندہ کون کرے

ہر صبح کٹی، ہر شام کٹی، بیداد سہی، افتاد سہی
انجامِ محبت جب یہ ہے اس جنس کا سودا کون کرے

حیراں ہیں نگاہیں دل بے خود مجبور ہے، حسن بے پروا
اب عرضِ تمنا کس سے ہو، اب عرضِ تمنا کون کرے

فطرت ہے ازل سے پابندی کچھ قدر نہیں آزادی کی
قطروں میں ہیں دلکش زنجیریں رخ جانبِ صحرا کون کرے

○

جہاں تک عشق کی توفیق ہے رنگیں بناتے ہیں
وہ سنتے ہیں ہم ان کو سرگزشتِ دل سناتے ہیں

ادھر حق الیقیں ہے اب وہ تنہا اٹھ آتے ہیں
اُدھر انجم مری اس ذہنیت پر مسکراتے ہیں

شبِ غم اور مجبوری، یہ عالم اور مجبوری
ٹپک پڑتے ہیں آنسو جب وہ ہم کو یاد آتے ہیں

وہیں سے دورِ حسن و عشق کا آغاز ہوتا ہے
جہاں سے واقعاتِ زندگی ہم بھول جاتے ہیں

ہمیں کچھ عشق کے مفہوم پر ہے تبصرہ کرنا
اک آہِ سرد کو عنوانِ شرحِ غم بناتے ہیں

بہا کر اشکِ خوں کھینچی تھیں جو آئینۂ دل میں
ہم ان موہوم تصویروں کو اب رنگیں بناتے ہیں

شبابِ زندگی، جلووں کا اک معصوم نظارہ
ہمیں اے دل وہ افسانے ابھی تک یاد آتے ہیں

○

بے سود ہے یہ جوشِ گریہ اے شمعِ سحر ہو جانے تک
چھینٹا ترے اشکِ پیہم کا پہنچا نہ کبھی پروانے تک

اے اہلِ نظر میری ہستی سب کچھ تھی کبھی اب کچھ بھی نہیں
زندہ ہوں مگر میعادِ بقا اک سانس کے آنے جانے تک

ہاں غور سے اک خوددار نظر اپنے ہی گریباں پہ ناصح
کیا جانے رہے گا کس حد میں دیوانہ تجھے سمجھانے تک

اے خاکِ پریشاں کے ذرّو، آغوش میں تم مجھ کو لے لو
تمکین و خودی کو ٹھکراتا آیا ہوں میں ویرانے تک

آشفتہ نظامِ ہستی ہے کچھ اور نہ برہم ہو جائے
مشاطۂ فطرت کے ہاتھوں گیسوئے بتاں سلجھانے تک

وعدہ ہے مگر کس عالم میں اک شوخِ تغافل فطرت کا
جب لیلیٔ شب کے بل کھاتے گیسو اتر آئیں شانے تک

○

اب کوئی غمگسار ہمارا نہیں رہا
دنیا کو اعتبار ہمارا نہیں رہا

اس فرطِ غم میں خون کے آنسو ٹپک پڑے
اب دل بھی رازدار ہمارا نہیں رہا

اس کی حضورِ پیرِ مغاں میں ہے منزلت
جو عہد پائیدار ہمارا نہیں رہا

ہر داغ ابھر کے زخم بنا زخم رشکِ گل
دل مائلِ بہار ہمارا نہیں رہا

یہ ہے مآلِ صحبتِ زاہد جنابِ دل
رندوں میں اب شمار ہمارا نہیں رہا

حامد عزیز مدنی

اے عروسِ سخن

ہزار درد خریدے ہیں میں نے دل کے لیے
ہزار شیونِ جاں ہے کہ ایک پردۂ ساز
ہزار گوشِ سخن آشنا کے بعد بھی کچھ
لرز رہی ہے ترے نام سے مری آواز

تجھے خبر ہے مری لے ہے ایک مدت سے
ہجومِ کاہ میں مانندِ آتشِ چقماق
اسی خزاں میں جو موجِ نفس کے ساتھ گئی
ملیں گے صوت و صدا کے ہزارہا اوراق

سکونِ ہجر میں بدلی تھی آرزوئے وصال
کہ دستِ شوق سے داماں تھا نارسیدہ بہت
تو ہی تو خلوتیِ دیر آشنا ـــ نکل
رسومِ پردہ کشائی سے سرکشیدہ بہت

کوئی محل یہ تری برقِ انگنی کا نہ تھا
تجھے خبر ہے مرا کارواں ہی راہ میں ہے
یہ نذرِ اول و آخر ہے اے عروسِ سخن
رگِ گلو کا لہو تیری بارگاہ میں ہے

معذرت

(معذرت بھی ہے پشیمانی بھی ہے) تقی

ہم نے مانا نژادِ نو ہے ابھی — شبِ تیرہ میں مینڈکوں کا جلوس
صنعتِ خامکار کے ہاتھوں — حرف کے آئینے میں سب معکوس
اب وجہ کی زباں ہے اس کے لیے — اجنبی ملک کا کوئی جاسوس
اس کی حکمت ہے آپ اک معترض — اس کی فرہنگ طائرِ محبوس
بدگمانِ محاورات ہے یہ — میوۂ خشک و تر سے مایوس
اس کے مشربِ دوام کی خاطر — ہر پیالے میں عکسِ چین و روس
اس کے ارژنگ میں نہیں ملتے — چشمِ آہو و کلغیٔ طاؤس
یہ کہ محرومِ دانشِ پیشیں — یہ کہ ناآشنائے گبر و مجوس
لیکن اسے قبلۂ سخن گویاں — خامِ جبعانِ راہ کا یہ جلوس
کس سے کہیے کہ کس طرف ہے رواں — بات پر بھول راہ نامانوس
ہر نفس اک سکوتِ مرگ اثر — ہر نفس اک صدا ہے قرنا و کوس
ہر ہیولے میں ایک عالمِ جان — ہر تصور میں عالمِ محسوس
جن رصدگاہ کے پڑھاتے ہیں — بندِ سرو زیست کا نیا قابوس
ہر مساوات کیمیائی ہے — سرِ مجلس اشارۂ مانوس
آج جادوگروں کے منتر سے — کوزۂ گل میں بھر اقیانوس
فرصتِ یک نفس نہیں ملتی — ایک ہی رٹ ہے، کوئی ماتھہ نہ پوس
دل میں اتری ہے موجِ زہر آگیں — سر پہ ٹھہری ہے ساعتِ منحوس
کیا حنا بندیٔ عروسِ خیال — کیا عروسِ خیال کا ملبوس
رشتہ ہائے نظر دھواں ہیں تمام — بجھ گئی شمع سو گئے فانوس

زخم سر سے بدل گئے یہ لوگ
تابِ صد آبگینۂ ناموس

جُرم

کل صبح کی تازہ دم ہوا میں
بازو پہ مرے وہ سو گیا تھا

تالیفِ خیال کر رہی تھی
اسلوبِ بدن کی خوشگواری
کیا کیا تھی نزاکتوں کی ہم راز
چادر تھی کہ نافۂ تتاری
ساحل کے سکوں میں کھو گیا تھا
ٹھہرا ہوا رود ہم کناری
کہتے ہیں وصال کا یہ انداز
آئینِ وجود و ضرب کاری
جو ہاتھ اُٹھے حریفِ تعزیر
اس ہاتھ کی ضرور پاسداری.
اِنسان کے قدیم جرم ہی نے
رکھ دی تھی بنائے غم گساری

آبادی کے دائرے

اے برادر۔ بازِ داں مکارِ تاری۔ کچھ نہ پوچھ
یہ سرِ قرطاس آبادی کے دکھوں۔ دائرے
کس کے یہ تابوت ہیں کس کی عماری کچھ نہ پوچھ

سرد تاریکی میں دھندلے دائرے کھینچے ہوئے
بے نکالی کھیتیاں تشکیک کی ہیں دور تک
بیچ چوب و دار کے الفاظ میں بوئے ہوئے

دائرے تاریک، خونیں، آتشیں ژولیدہ مو
آپ خود اپنا غیاب و آپ خود اپنا حضور
جنبشِ پرکار کا دوڑا نہیں جن میں لہو

نیشِ عقرب کی طرح حرص و ہوا کی بے کلی
دل زدوں کے دائرے تیرہ طلب کی بارکیں
رشک کے تاریک کوچے خوف کی اندھی گلی

زمیں کے زینے، پرانی بوتلیں، میراثِ جد
علم کی بے حس کمیں گاہیں جن کی اوٹ سے
کاٹ دی ہے دیمکوں نے زندگی کی تازہ حد

مہ وشانِ نیم رُخ کے عارضِ عصیاں کے خواب
آسیا گرداں بتول و مریم تنہا نشیں!
آتشِ خوابِ زلیخا، رونقِ زنداں کے خواب

اک بتِ رقاصِ حبشی، آبنوسی اک شجر
طبل کی آواز سے جنتی درندوں کی میاں
مہ وشانِ نیم عریاں کی بلوتی ہے ــ کمر

عارضے زرخیز، چٹیل آب و روغن کے حصار
بطنِ معدن آگ دریاؤں کے چہرے آئینے
حلقہ ہائے باد و باراں، کشت و خرمن کے حصار

ٹینک سے دبتے ہوئے بچوں میں فصلیں بے سبیل
رحم میں تاریخِ افلاسِ جہاں، لب پر سوال
خشک سالی، خشک سالی سے زمیں کے رُخ پہ نیل

سخت تریا کی دھوپ میں ضو فشاں محنت کی آنکھ
سوئیاں بیتاب میٹر کی ہیں محوِ شمار،
پڑھ رہی ہیں ایک تحریرِ رواں محنت کی آنکھ

ساحلوں کا جن ہے خوابیدہ جہازوں کی قطار
پی رہے ہیں رات کی نیلی سیاہی میں لہو
دور تک پٹرول کے چشموں پہ گرگ ریش دار

ہم فیصلوں میں گم رہے خود سیاروں سے کھیل
بازیٔ چوگاں، خداؤں کی بساطِ فلک — پر
خوں منہ کو لگ گیا ہے اپنے ادتاروں سے کھیل

وقت سے بہتر ہے کہ ذوقِ جنوں کے راز میں
سر رہے جائیں، درندوں کی تنہائی وحشتوں کے قدم
زندگی کی دوڑ میں یک نیزہ خوں کے ساز ہاں

اے برادر یوں نہ جا، ان دائروں کے درمیاں
تیرتا ہے اس فضا میں اک ہجومِ ارواح کا
اس طرف دوزخ کی آبادی کا آتش کدہ ہوس

دائرے وہ زندگانی کے سفر کی راہ میں
راستہ کھویا ہوا، تاریک جنگل کا محیط
روشنی آتی نہیں ہے علم بے آگاہ میں

کوئی شاخِ آشنا

شہر پر نیلے دھوئیں کی سامری زنجیر ہے
جل رہا ہے سینۂ خورشید میں داغِ غروب
روشنی مجروح طائر کی طرح — دلگیر ہے

کچھ غلامانِ کہن پرچھائیاں حبشی نژاد
کھینچے نکلے ہیں عصیاں کا سبک رفتار رتھ
وقت کی جنبش بدی کے چابک کو دیتی ہے داد

خواب و بیداری کے تیرہ فاصلوں کے درمیاں
کتنے اندیشوں کی بے حلقہ جبیں کھول کر
ناپتا ہے اس خلا کو ایک وقتِ رائگاں

رات کے ہاتھوں چلے جانے کو ہیں نیلام میں
شہر، بندرگاہ، سیارے، سمندر روشنی
دور تک بکھری ہوئی اشیا ہیں اک گودام میں

جزر و مد کے بیچ میں ساحل کا ساکت پاؤں ہے
سو رہے ہیں آہنی جہازوں کے قطار اندر قطار
سینۂ قلزم میں گم ہوتی ہوئی اک چھاؤں ہے

روحِ قزاق و سکندر۔ لشکری گو ہے
ان حریفانِ تگاپو سے یہاں سر ہوتی نہیں
قلزمِ بیتاب کس کی آرزو میں گو ہے

دور تک ہے اس فضا میں خوابِ بیداری کی چمک
شہر سے گزری ہے آوارہ ہوا زرکش مدہوش
جانے کس بستی میں اترے خلوتِ شب تا بہ رنگ

دور تاریکی کی چادر سے شرر اڑتے ہوئے
رات کے جنگل کا جادو ریلوے کی دلکشاب
اک دھوئیں میں آہنی نیلوں کے مل ہٹتے ہوئے

اس فضا میں وقت۔ درد ہجر و آغوشِ وصال
اک فروغِ ضعف تازہ ضعف کرم آلودہ ہے
طالبِ جاں قرب پہ پھیکا ہوا مدی کا جال

تیز قندیلوں میں سعیِ زندگی کے زاویے
رہگذر پر سیکڑوں رنگوں کی اک پیکار ہے
خستگی کے زاویے۔ وابستگی کے زاویے

چشمکِ ادراک کے خوابِ جنوں کے مرحلے
طعنۂ نایافت دیتی ایک روحِ ابر و باد
مرگ کی قوسیں، تغیر کے ہزاروں سلسلے

اس فضا میں وقت، روحِ جنبش، جانِ وجود
نطفوں سے پہلے روپ کے نازک جسم میں
استخوانوں سے لپٹتی زندگی کی موجِ دُود

تمنائے زندگانی ، اجتنابِ زندگی
کربِ تولید و فشارِ جانکنی کی ساعتیں
درد کے اعشاریوں میں اک حسابِ زندگی

اے دل اے پامالِ جاناں، اے مری متاعِ ہیچ
ڈھونڈ تو بھی درد کے تنہا نشیمن کے لیے
کوئی شاخِ آشنا، بے آشیاں بے خواب ہیچ

فراق گورکھپوری

○

یاد آتی ہیں تری رعنائیاں — دل میں پڑتی ہیں کئی پرچھائیاں
جلوے کی تکرار ممکن ہی نہیں — کتنی یکتا ہیں تری یکتائیاں
زندگی گھبراہٹوں میں کٹ گئی — پوچھتے ہو کیا مری تنہائیاں
آفتابوں پر کمندیں ڈال دیں — اُف مری تخئیل کی گیرائیاں
کیا سمجھتا تھا کوئی جانِ بہار — رنگ لائیں گی مری رسوائیاں
دونوں عالم لائیں گی زیرِ نگیں — بے نوائے عشق کی دارائیاں
خالقِ آفاق بھی دیکھا کیا — مُشتِ مُشتِ خاک کی پیمائیاں
زندگی کے راز مجھ سے جان لے — میری نادانی نہ کر دانائیاں
خار و خس بھی بن گئے شاخِ نبات — ان نگاہوں کی حیات افزائیاں
ہاں نہ تھا یہ دل جب اک اُجڑا نگر — یاد آتی ہیں وہ بزم آرائیاں
زندگی کو ان نگاہوں کے طفیل — موت کی آنے لگیں انگڑائیاں
عشق کو یارو بُرا کہتے تو ہو — اس میں پاؤ گے کہیں اچھائیاں
عشق کے کچھ جھوٹ ہم سُنتے گئے — ہاتھ کچھ آتی گئیں سچائیاں
نہ سُنی میری نہ دنیا کی سُنی — عشق کی اللہ رے خود رائیاں
زیرِ پا بھی دور بھی ہیں منزلیں — دیدنی ہیں عشق کی پسپائیاں
کھنچتی جاتی ہیں دلوں کی شہ رگیں — اُف تری اُٹھتی ہوئی برنائیاں
دیکھ آئے آج یادوں کا نگر — ہر طرف پرچھائیاں پرچھائیاں

ذرّہ ذرّہ اس خرابے کا فراق
ہے دو عالم کی لیے پہنائیاں

احمد ندیم قاسمی

○

کتنے نالے تھے جو شرمندۂ تاثیر ہوئے
ریگِ زریں پہ کبھی قصر نہ تعمیر ہوئے

جن کو شاخوں سے اڑا لے گئیں امواجِ صبا
وہی گل خاکِ چمن کے لیے اکسیر ہوئے

شب کے پہلو میں کہیں پھوٹ رہی ہے پو بھی
کبھی دنیا میں اندھیرے نہ جہانگیر ہوئے

ہم اصولوں کے حصاروں میں چھپے لاکھ، مگر
اک نگاہِ غلط انداز سے تسخیر ہوئے

وہی آواز کی قوسیں، وہی تاروں کے خطوط
چند نغمے تھے جو مل کر تری تصویر ہوئے

ایک انداز تو ہے بے سروسامانی کا
ہم تری دھن میں ترے غم سے بغلگیر ہوئے

ایک امیدِ ملاقات نے مرنے نہ دیا
زندگی بھر ترے پیماں ہی عناں گیر ہوئے

تجھ سے مل کر تجھے پا لینے کی حسرت جاگی
کچھ نئے خواب ترے خواب کی تعبیر ہوئے

اک خلا طے ہوئی، اک اور خلا کی حد پر
اپنے شہپر نہ ہوئے، حلقۂ زنجیر ہوئے

ہم نے لفظوں میں لہو اپنا دمکتا پایا
لوگ وارفتۂ رنگینیٔ تحریر ہوئے

صوفی تبسم

O

جب اشک تری یاد میں آنکھوں سے ڈھلے ہیں
تاروں کے دیئے صورتِ پروانہ جلے ہیں

کیا جانئے یہ رند بُرے ہیں کہ بھلے ہیں
ساقی کی نگاہوں کے اشاروں پہ چلے ہیں

سو بار بسائی ہے شبِ وصل کی جنت
سو بار غمِ ہجر کے شعلوں میں جلے ہیں

ہر آن امنگوں کے بدلتے رہے تیور
ہر آن محبت میں نئی راہ چلے ہیں

مہتاب سے چہرے تھے ستاروں کی نگاہیں
ہم لوگ انہی چاند ستاروں میں پلے ہیں

نوچے ہیں کبھی ہم نے حوادث کے گریباں
ناکامیٔ کوشش پہ کبھی ہاتھ ملے ہیں

تاریک فضاؤں کے ابھرتے رہے طوفاں
پھر بھی تری یادوں کے دیئے خوب جلے ہیں

محسوس یہ ہوتا ہے کہ دنیا کی بہاریں
اس گلکدۂ ناز کے سایے کے تلے ہیں

یونہی تو دل آویز نہیں شعرِ تبسم
یہ نقش ترے حسن کے سانچے میں ڈھلے ہیں

گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم

جگن ناتھ آزاد

برادرم، آداب!

بُرا نہ مانیں، میں اس قسم کی براہِ راست شاعری کے بڑا خلاف ہوں ایک آدھ چیز پہلے بھی (بادلِ نخواستہ) چھاپ چکا ہوں۔ مزید نہ چھپوائیں۔ آپ اس عمر میں زندہ ہیں۔ میں آج سے بھی پہلے مر چکا ہوں بات یہ ہے کہ میں شاعری اُسے ہی سمجھتا ہوں۔ جو اشاروں اور کنایوں میں ہو۔ میں اشتہار کو پسند نہیں کرتا۔ (مدیر)

(غالباً یہ میرے ہی خط کے جواب میں جنابِ آزاد نے نظم کہی ہے)

ایک خط کے جواب میں

اے آسمانِ صدق و صفا کے مہِ تمام — اے تیری یاد مرجعِ تکریم و احترام
ہر لفظ تیرا بادۂ اخلاص کا ہے جام — میرے سخن سے آج نہیں ہے تو شاد کام
تیری طرف سے گرچہ شکایت کی بات ہے
لیکن مری نظر میں محبت کی بات ہے

ظاہر ہوا ہے یہ ترے تازہ پیام سے — تجھ کو ذرا سا شکوہ ہے میرے کلام سے
چھلکی ہے مے جو میرے تغزل کے جام سے — شاید کہ ہٹ گیا ہوں کچھ اپنے مقام سے
کل تھا جو ذکرِ عظمتِ انساں لیے ہوئے
وہ دل ہے آج کیوں غمِ جاناں لیے ہوئے

بے سود فرد و ازدحام میں تفاوت — [illegible]
محبوب کا ہر غم کہ زمانے کے غم کی بات — [illegible]

اک نظم ایک ملک کی تصویر بن گئی ہے
اک شعر ایک قوم کی تقدیر بن گیا ہے

میرے کلام میں ہے جہاں میرا بھی درد بھی — ساون کی تیرگی بھی، سحر کا تبسم بھی
دو رنگ کرب کا بھی، طرب کا وقار بھی — دل صبر و شکر بھی ہے ہوا، نا صبری بھی

غم میں بھی ہوں خوشی کے بلند کیے جتنے
نکلے ہیں جو لب پہ ترانے لیے ہوئے

مانند جام جم ہے مری شاعری کا جام — غم کہیں جنوں کا، خرد کا کہیں پیام
اک زندگی ہے ذکر صبح تو اک شام ہے تمام — لیکن کہیں نہیں ہے تصنع کا اہتمام

خود غزل لفظوں کے لیے زباں سے نکل گیا
جو دل میں آگیا وہ تغزل میں ڈھل گیا

میرے کلام میں ہے سیاست کا رنگ بھی — تصویر صلح بھی ہے تماشائے جنگ بھی
ہے ولولہ بھی جوش جنوں بھی امنگ بھی — تیغ و تفنگ بھی ہے رباب اور چنگ بھی

اس میں ہے خامشی بھی ترنم بھی اس میں ہے
فریاد بھی ہے اس میں تبسم بھی اس میں ہے

گہرائی بحر کی بھی پہاڑوں کا اوج بھی — میرا سخن ہے ساحل دریا بھی موج بھی
اس میں دکھائی دے گی جوانوں کی فوج بھی — دراج و سار و طوطی و بلبل کے زوج بھی

ساحل کا ہے سکوت بھی ندی کا شور بھی
لہروں کے زمزمے بھی بھنور کا ہے زور بھی

محمود کا بیاں بھی ہے ذکر ایاز بھی — گویا نیاز بھی ہے مرا شعر ناز بھی
اس میں ہیں زندگی کے مسائل بھی راز بھی — میرے سخن میں سوز بھی ہے اور ساز بھی

محبوب کا الم بھی زمانے کا غم بھی ہے
بے کیفی حیات بھی ہے کیف و کم بھی ہے

شاید کچھ اس میں فلسفۂ زندگی بھی ہو — علم و عمل کے ذکر کی تابندگی بھی ہو
ممکن ہے شمع فکر کی رخشندگی بھی ہو — پھر زیست کی گداز سے پائندگی بھی ہو

شاید نہاں ہو اس میں خموشی بھی ذکر بھی
اقبال کا گداز بھی، غالب کی فکر بھی

مانا کہ اپنے دل کے سکوں سے ہوں دور بھی　　ہوں فیض یابِ لذتِ کیفِ حضور بھی
ہوں اپنے ہوش میں بھی نشے میں ہوں چور بھی　　ہوں صاحبِ جنوں بھی مگر باشعور بھی
دیوانگی کو دل میں جو پالے ہوئے ہوں میں
اس کو بہ فیضِ عقل سنبھالے ہوئے ہوں میں

خم اس میں عشق کی تو خرد کا سبو بھی　　اس جام میں ہے علم کی مے کا سرور بھی
جس بزم میں ہے جوشِ جنوں کا وفور بھی　　اس میں ضیا طراز ہے شمعِ شعور بھی
دل سرنگوں ہے عقل کے دربار میں بھی
آوارہ حسن و عشق کے بازار میں بھی

اس میں ہے سازِ دیر تو سوزِ حرم بھی ہے　　یزداں کا ہے جلال و جمالِ صنم بھی ہے
شاہی کی اس میں عظمت و جاہ و حشم بھی ہے　　جمہور کا اسی میں پرافشاں علم بھی ہے
دل اپنا ذرے ذرے پہ قرباں کیے ہوئے
یہ کائنات کو ہے جلو میں لیے ہوئے

پیغمبروں کا ذکر مری شاعری کی جان　　قائم اسی کے دم سے ہے میرے سخن کی آن
کچھ منکروں نے بھی تو دکھائی ہے آن بان　　یہ بھی ہیں میری بزمِ تکلم کے میہمان
ذرے بھی بزم میں ہیں ستاروں کی ضو بھی ہے
ظلمت کی تہ بھی اور چراغوں کی لو بھی ہے

تلخابۂ حیات کے ساغر پیے ہوئے　　کیا جانے کتنے زخم ہوں دل پر لیے ہوئے
اک ہاتھ اپنا دستِ جنوں میں دیے ہوئے　　اک ہاتھ سے ہوں چاک گریباں سیے ہوئے
ہیں پاؤں خار پر تو نظر پھول پر مری
گل ریز و خار بیز ہے یوں رہگزر مری

اس شاعری میں فکر کی پیدا جھلک بھی ہے　　کیفیتِ حیاتِ بشر کی لہک بھی ہے
درد و گدازِ عشق و جنوں کی کسک بھی ہے　　اک گلبدن کے ذکر کی اس میں مہک بھی ہے
حیرت میں ہوں میں اس کو فقط گلبدن کہوں
یا نوبہارِ نازِ فضائے حسیں کہوں

اس نوبہارِ ناز سے اک دل کی بات تھی　　وہ نغمہ جس میں اک مری مشکل کی بات تھی
طوفاں میں گھر کے لذتِ ساحل کی بات تھی　　منزل سے دور راحتِ منزل کی بات تھی
میں بات کر رہا تھا بڑے احترام سے
اپنی نیازمندیٔ دل کے مقام سے

دشمن بجا ہے کل جو یہاں تھا ہوا کلام ‏— شاید تری نگاہ میں تھی وہ خراب نظم
در اصل میرے اُن سے لبوں [illegible] تھا وہ جام — میری شکست کی تھی مری زندگی تمام

میرا لہو تھا وہ جو مرے [illegible] کی [illegible] ندی
[illegible] ترے پیچھے کی [illegible] ندی

اس پہ بھی اپنے آپ کو سب خبر ہی ہیں — کہتا نہیں ہے پھول [illegible] خوشبو ہوگا
[illegible] ہوں میں کہ [illegible] یار ہوں گا — جس خاص ہے اور مرا قتل ہوا ہیں

• کیسے کٹی ہے جوش بھی کس نے بتائی ہے
پھر [illegible] نہیں [illegible] کی [illegible] کی ہے

فضل کریم فضلی

○

آرزوئے دل نہ بڑھنی تھی مگر بڑھتی گئی — مختصر سی بات، قصۂ مختصر، بڑھتی گئی
ہم نے چاہا تھا انھیں حدِ نظر تک ڈھونڈ آئیں — جس قدر بڑھتے گئے حدِ نظر بڑھتی گئی
ویسے ویسے دل میں پیدا وسوسے ہوتے گئے — جیسے جیسے ان کے آنے کی خبر بڑھتی گئی
اور تو سب نقش دل سے خود بخود مٹتے گئے — ایک ان کی یاد تھی جو عمر بھر بڑھتی گئی
بڑھتے بڑھتے بڑھتے چشمِ گریاں بن گیا — کیجیے کیا وسعتِ دامانِ تر بڑھتی گئی
ہر دعائے بے اثر کا یہ اثر الٹا ہوا — ہر دعا کے ساتھ امیدِ اثر بڑھتی گئی
راہ بھی پُر پیچ تھی، رہبر بھی ناواقف سے تھے — دُوریٔ منزل، درازیٔ سفر بڑھتی گئی
داخلِ زنداں اسیرانِ وفا ہوتے گئے — اور بھی کچھ رونقِ دیوار و در بڑھتی گئی
زیرِ لب فریاد پر بھی سرگراں صیاد ہے — اور نصیبِ دشمناں یہ لے اگر بڑھتی گئی؟
جیسے جیسے اہلِ فن پر خندہ زن ہوتی گئیں — ویسے ویسے شوخیٔ خونِ جگر بڑھتی گئی

ہے تو فضلیؔ بے ہنر لیکن اب اس کا کیا علاج
اس کے دم سے دمبدم قدرِ ہنر بڑھتی گئی

عبدالحمید عدم

○

بچپنے کا تیز پانی اور ہے
نشۂ عہدِ جوانی اور ہے

آپ کو نیند آ گئی ہے تو کل سہی
صرف تھوڑی سی کہانی اور ہے

بیٹھے بیٹھے بھی تم راضی نہیں
کیا ابھی کچھ بدگمانی اور ہے

جیسے خیر اور کو بھی جانے بھی دو
اس کے در پردہ کہانی اور ہے

کاش ہے تو رک ہی کچھ سکو
تیری پلکوں کی روانی اور ہے

توبہ کرتا ہوں تو آتا ہے خیال
ایک جامِ ارغوانی اور ہے

دشمنوں کے دل تو ٹھنڈے ہو گئے
دوستوں کی مہربانی اور ہے

○

ذرا بحث دیر و کعبہ بڑھ گئی ہے
خدا کو مان اب پردہ اٹھا دے

اگر میں بھول سکتا ہوں تو ظالم
خدا کے واسطے مجھ کو بھلا دے

دعائیں دینے والے خیر تیری
مجھے آج ایک جنونی بددعا دے

کوئی برتاؤ تو کر بے مروت
مجھے جرمِ محبت کی سزا دے

مری توبہ کی ساقی لاج رکھ کچھ
میں مانگوں یا نہ مانگوں تو پلا دے

یہ تنہائی کا جلنا بھی عدم کیا
چراغِ زیست کو ہنس کر بجھا دے

عبدالمجید حیرت

○

دنیا میں جہاں بھی جائیے گا
دُکھ، درد ضرور پائیے گا
راحت بھی ضرور پائیے گا
تکلیف اگر اُٹھائیے گا

پھر کون کرے گا دلنوازی
جب آپ ہی دل دُکھائیے گا
ممکن ہو تو غم سے چھوٹنے کی
تدبیر کوئی بتائیے گا

کانٹوں میں کہیں اُلجھ نہ جائے
دامن کو ذرا بچائیے گا
ہوتی ہے ہر ایک بات کی حد
حد سے نہ قدم بڑھائیے گا

دنیا ہی میں جب نہیں، تو آخر
کیا حشر میں کام آئیے گا
ہر پھول ہے خندہ زن چمن میں
کیا آپ نہ مسکرائیے گا

ہے آپ کا وہ بھی اک دعا گو
حیرتؔ کو نہ بھول جائیے گا

معصوم گناہگار

(ایک باغِ حیوانات کو دیکھ کر)

پروفیسر شور

یہ وہی کٹہرے ہیں جن میں درندوں کی خونخواری
نہ "پاپا" نہ "ملّا" نہ "راہب" نہ "صوفی"
نہ دامِ مسجد و ہیکل، نہ فتراکِ کلیسائی
کسی کو فتوے میں یہ بھری صدیاں گھیر نہیں سکتے
نہ عصمت کی کوئی منڈی، نہ دلّالوں کے پھیرے ہیں
نہ "زرتشتی" نہ "زناری" نہ "بابی" نہ "نصرانی"
نہ چہروں کے نشانوں سے کوئی مغرور پیشانی
نہ ہونٹوں پر ہنسی جھوٹی، نہ زہر آلودہ دلداری
نہ سکّوں کی تلاوت ہے، نہ "کفر و دیں" کی ذلّت
شمار ان کا نہیں زر کے تراشیدہ کمینوں میں
"کلاہِ یار جنگی" ہے، نہ "کفشِ آسماں جاہی"
ضمیر و قلب کو "سونے" کی رو پگھلا نہیں سکتی
کسی پوشاکِ زریں سے نظر دھوکا نہیں کھاتی

نہ ان کا "کفر" یزدی، نہ ان کا "دین" بازاری
نہ یہ ناری، نہ یہ تاتاری، نہ یہ مصری، نہ یہ کوفی
نہ زناروں کے پھندے ہیں، نہ تسبیحوں کی گیرائی
کسی منبر کے اوپر یہ درندے چڑھ نہیں سکتے
نہ شام ذکر و قوالی، نہ چلّوں کے اندھیرے ہیں
نہ سینہ ہے کوئی کالا، نہ ماتھا کوئی نورانی
نہ ہاتھوں پر کسی کے خون سے قشقوں کی تابانی
نہ اخلاقوں کی عیّاری، نہ آدابوں کی پرکاری
نہ یہ سونے کے پیغمبر، نہ یہ جاگیر کی اُمّت
نہ صبحیں ان کے ہونٹوں پر، نہ راتیں ان کے سینوں میں
نہ زنجیروں کی تاریکی، نہ قندیلِ شہنشاہی
ہمائے بام و در، دشت و جبل تک جا نہیں سکتی
یہاں سورج کی تاریکی کہیں پائی نہیں جاتی

یہ حیواں، جن کا "تخت و تاج" سے کوئی نہیں ناتا
اِنھیں خود اپنی نسلوں کو نگل جانا نہیں آتا!

اِس بار

سلام مچھلی شہری

مہک دلوں کے چمن زار
جھوم ساز کے تار،
نظر پڑے ہیں "جنونِ خرد" کے پھر آثار — !

مجھے یقیں ہے ترے جواں شگوفوں پہ
مجھے یقیں ہے شگفتہ، جواں نغموں پہ
مجھے یقیں ہے چراغِ سکوں سے جلووں پہ
ترے نصیب میں ہے فتحِ دائمی اِس بار —!!
عجب فضا ہے، نہ موجِ سکوں نہ طوفاں ہے
جہاں جہاں بھی ہے ملاحِ محنت حیراں ہے
اجل قریب ہے یا زندگی کا ساماں ہے ؟
یہ کیسے رواں ہیں فلک پر "طیورِ آتش بار" ؟!
سوال یہ ہے کہ پھولوں میں آگ ہے کہ نہیں
سوال یہ ہے کہ نغموں میں آگ ہے کہ نہیں
زمیں کی شمع کے جلووں میں آگ ہے کہ نہیں
اگر یہ ہے تو ہم اہلِ چمن بھی ہیں تیار
یونہی بڑھائے چلو کاروانِ صبحِ بہار —؟!!

گڑیا رانی

نور بجنوری

تری مانگ میں سرخ چراغ جلے
کوئی دوری دور سے ہاتھ ملے
ترے شیش محل کا نازک سا سماں
کہیں ہارسنگھار ہے شعلہ فشاں
کہیں پیار کا چاند سسکتا ہوا
کہیں لعل و گہر کی نشیلی شاں
کہیں دھوپ چڑھے کہیں رات ڈھلے
تری مانگ میں سرخ چراغ جلے

ترے در پہ ہجوم بہاروں کا ہے
تری راہ میں ڈھیر ستاروں کا ہے
ترے ہاتھوں کی مہندی سلگتی ہے یوں
تری آنکھوں میں باغ چناروں کا ہے
تجھے کس نے لگا لیا بڑھ کے گلے
تری مانگ میں سرخ چراغ جلے

کوئی بیتے دنوں کی کتھا ریے
ترے ہونٹوں سے چاہ کا زہر پیے
یونہی تیرے گھروندوں میں آگ بھرے
یونہی روپ بدل کے نئے سے نئے
کبھی دور رہے کبھی ساتھ چلے
تری مانگ میں سرخ چراغ جلے

شفقت کاظمی

○

تیرے ہر جور پہ یاں شکرِ خدا ہے اے دوست
کہ یہی مسلکِ اربابِ وفا ہے اے دوست

ہم کو اُس عہدِ وفا سے تھیں امیدیں کتنی
تجھ کو جو عہدِ وفا بھول چکا ہے اے دوست

تیری جانب سے نہ لائی کوئی پیغام کبھی
میری فریاد بھی صحرا کی صدا ہے اے دوست

تیرے آنے کی دوبارہ جو کوئی آس نہیں
کتنی سنسان مرے دل کی فضا ہے اے دوست

تیری یادوں سے بھی تسکینِ تمنا نہ ہوئی
وقت ہم پر کبھی ایسا بھی پڑا ہے اے دوست

کیا عجب ہے کہ تری رنجشِ بیجا کے سبب
تیرے شفقت کو سرِ ترکِ وفا ہے اے دوست

کوثر نیازی

○

باغباں کے طور یہ سمجھا گئے
فصلِ گل میں پھول کیوں مرجھا گئے

اب تو اے ظالم زمانے رحم کر
ان کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے

اس لیے شاید نہ پوچھا حالِ دل
میری حالت دیکھ کر گھبرا گئے

شغل ہے بے منتِ موسم رہا
جام کھنکائے تو بادل چھا گئے

ان خنک جلووں میں گرمی تو نہ تھی
کیوں نگاہوں کو پسینے آ گئے

شامِ غم سے پوچھ لیں گے ہم مزاج
آپ کے گیسو اگر لہرا گئے

دشمنوں سے بھی گلہ جاتا رہا
دوست ہم پر وہ کرم فرما گئے

موت ہے اس جرم کی کوثر سزا
ہم فریبِ زندگی کیوں کھا گئے

یُوسف جمال انصاری

○

سن دصہبا سے دل ہوا جو گداز
میں تھا اپنے سے محوِ ناز و نیاز

روح و دل میں ہیں جھگڑے کتنے
سوئے کعبہ نہیں مری پرواز

پہلے خود کو تلاش کرلوں میں
کھُل ہی جائے گا کائنات کا راز

سفرِ زیست کی نہیں منزل
حدِ آخر بھی نقطۂ آغاز

موت اِک جھٹپٹے کا دریا ہے
زندگی ایک دُور کی آواز

یہ نظارے ہیں یا اشارے ہیں
گلشنِ دہر ہے کہ گلشنِ راز

اے حسیں! بے عمل نہ کہہ مجھ کو
اور اگر کھینچ لوں ردائے مجاز

کسریٰ منہاس

○

نیاز بے اثر کی ناز برداری پہ روتا ہوں
وہ برہم ہیں میں انجام پرستاری پہ روتا ہوں

تری خاطر سے واعظ! میں نے توبہ کر تو لی لیکن
در میخانہ تک آ کر گنہ گاری پہ روتا ہوں

بھلا محشر میں رب کے سامنے پرسش گناہوں کی
نگاہِ منفعل میں رحمتِ باری پہ روتا ہوں

بہے ہیں خشک آنسو شدتِ سوزِ محبت سے
وفائے عشق میں آنکھوں کی ناداری پہ روتا ہوں

مجھے بربادیٔ دل کا گلہ تھا عشق سے پہلے
نگاہِ شوخ اب تیری نگوں ساری پہ روتا ہوں

ابھی اک جلوۂ دلکش نگاہوں کے مقابل تھا
کھلی جب آنکھ تو میں اپنی بیداری پہ روتا ہوں

ابھی تک احترامِ عشق سے بیگانہ ہے کوئی
دلِ حسرت زدہ تیری وفاداری پہ روتا ہوں

قفس کے سامنے آ کر نظر سے یوں نہاں رہنا
مذاقِ حسن تیری آشنا داری پہ روتا ہوں

نہ وہ اگلی سی دھڑکن ہے نہ وہ اگلی سی بیتابی
مرو لے درد! دل کی سرد بازاری پہ روتا ہوں

نہ کہنے کی جو باتیں تھیں وہ لب تک آ گئیں کسریٰ!
پشیماں ہو کے اب انجام سے خواری پہ روتا ہوں

جمیل ملک

○

خوشبوئے پیرہن سے سلگتے رہے دماغ
آئی شبِ فراق تو گُل ہو گئے چراغ

دل کی لگی بھڑک کے نگاہوں تک آ گئی
پلکوں پہ شامِ وصل جلائے ہیں دل کے داغ

اُس چشمِ مے فروش سے ہنگامِ بادہ نوش
پھوٹا وہ سیلِ نور کہ ٹوٹے اُٹھے ایاغ

آخر کھلا کہ تو ہے مرے گھر کی روشنی
یوں تو ترے بغیر بھی جلتے رہے چراغ

وہ گُل کھلیں کہ جن کی مہک لازوال ہو
اِس ایک دُھن میں ہم نے سجائے ہیں کتنے باغ

جب چشم و دل بجھے تو شبستانِ شوق میں
ہم نے ہتھیلیوں پہ جلائے ہیں شب چراغ

جو وادیٔ جمال میں گُم ہو گئے جمیل
اپنی طلب کے ساتھ ہی اُن کا بھی کچھ سراغ

مظہر امام

○

انکار میں اقرار کی بات آہی گئی ہے
باتوں میں حرم یار کی بات آہی گئی ہے

آیا ہے کبھی ذکر اگر دار و رسن کا
گیسو و قدِ یار کی بات آہی گئی ہے

آرائشِ عالم پہ کبھی بحث جو چھڑی
اس گیسوئے خمدار کی بات آہی گئی ہے

جب سُرخیِ گلشن کا کبھی ذکر ہوا ہے
تیرے لب و رخسار کی بات آہی گئی ہے

ڈھونڈا ہے اگر زخمِ تمنا نے مداوا
اک نرگسِ بیمار کی بات آہی گئی ہے

مل بیٹھے ہیں زنداں میں اگر شام کو احباب
تیرے در و دیوار کی بات آہی گئی ہے

بے مہریِ احباب کا شکوہ جو کیا ہے
دلداریِ اغیار کی بات آہی گئی ہے

چھیڑا ہے کوئی تلخ فسانہ جو کسی نے
شیرینیِ گفتار کی بات آہی گئی ہے

جلیل حشمی

○

ہم زمانے میں محبت کے بھکاری ٹھہرے
دوست ہیں سب کے مگر دشمنِ جاں ہیں اپنے

آج کی رات کہیں شعلۂ گل ہی بھڑکے
جانے کل صبح کہاں ہوں گے ہم اڑتے پتے

جانِ من! شب کے یہ آداب ہیں تیرے کیسے
بانکپن میری غزل کا تری محفل میں لٹے

وہ صبا ہے تو رہے کس لیے گلشن سے پرے
یہ شبِ گل ہے تو کیوں سیج پہ کانٹوں کی کٹے

کیوں پھرے دشت میں دیوانے ہوئے کس کے لیے
ہم کو معلوم نہیں پوچھئے ان آنکھوں سے

مر چکیں سب کی تمنائیں سسک کر لیکن
دل کی دیوار سے راتوں کو کوئی سر پٹکے

کہیں منزل سے بھٹک جائے نہ دیوانہ کل
جادۂ شہرِ بہاراں میں بچھا دو کانٹے

ڈال دل کھول کے ان ٹوٹے ہوئے شیشوں میں
سنگ آئے ہیں بہت راہ میں ہم پہ پیارے

یہ تری یاد کا عالم شبِ تنہائی میں
جیسے لہرا کے کرن کالی گھٹا سے چھوٹے

ان بھری راہوں میں سب میرے ہیں میں کس کا ہوں؟
دوں صدا کس کو — لگے کون کلیجے سے مرے

کون اترے گا مرے دل کے گلستانوں میں
کون گزرے گا مرے چہرے کے صحراؤں سے

راکھ اس گھر میں وہ اڑتی ہے کہ جیسے حشمی
طاق میں شمع نہ تھی صحن میں مہتاب نہ تھے

احمد ظفر

○

احمد ظفر کسی پہ بھروسہ نہ کیجیے
کانٹے ہیں تو گل کی تمنا نہ کیجیے

تخلیق کی لگن ہے تو جاں تک لٹائیے
محفل میں دل کی بات کا چرچا نہ کیجیے

اس حسنِ لازوال کو دیکھیں تو اس طرح
اس حسنِ لازوال کو رسوا نہ کیجیے

جلتے چراغ کس نے بجھائے ہیں بارہا
یہ سحر ہے تو سحر کی پروا نہ کیجیے

کیا جسم دلنشیں تھا کہ اب مشتِ خاک ہے
سوچیں ضرور اس قدر سوچا نہ کیجیے

ہم اہلِ دل ہیں اہلِ نظر، اہلِ آرزو
محرومیوں کا جال بچھایا نہ کیجیے

لتا منگیشکر

شاعر ندیم

فضا میں گونج رہی ہے جو دل کا درد لیے
ہوا کے دوش پہ لہرا رہی ہیں نغمہ ہائے نوا
نفس نفس ہے ترنم کی سرخوشی کو فروغ
ترے لبوں سے چھلکتی ہوئی جواں کرنیں
یہ گنگ گنگ ابھرتے ہوئے گلِ نغمہ

ترے گلو کی ادا تیری نغمہ ریز آواز
بکھر رہے ہیں خلاؤں میں راز شوخیٔ ساز
روش روش ہے نئی کیفیت نیا اعجاز
یہ تیری لے یہ ترا سوز یہ تری پرواز
جہاں کو بخش رہے ہیں نئے نئے انداز

ہجومِ فتنۂ دوراں میانِ ماہ رخاں
امید و بیم سے پر داغ بیشمار دماغ
ہزار سلسلہ ہائے ستم جلو میں لیے
کوئی خموش پسِ پردۂ جفائے رسوم
چراغِ رہگزرِ باد بن گئی ہے حیات

کسی کے حسن کی لغزش کسی نظر کا خمار
فریبِ کشمکشِ دہر حد سے پرے آزار
زمانہ درد کے ماروں سے برسرِ پیکار
خیالِ تازہ کو سوزش میں ڈھونڈتا ہے فشار
ہر ایک سمت اندھیرا ہر ایک سمت غبار

ہر ایک لمحہ بدلتی ہے کروٹیں گیتی
ہر ایک زلف پریشاں ہر اک کلی مایوس
کوئی نہیں ہے مسیحا کوئی نہیں غمخوار
تصوراتِ خوش آیند ایک خوابِ گراں
ہر ایک رخ نگہِ قہر ہر طرف شورش

ہر ایک لمحہ اجڑتے ہیں مفلسوں کے شباب
ہر ایک سینہ ہے صد چاک ہر جگر ہے کباب
ہر ایک ہاتھ میں کشتہ ہر اک دعا زہراب
سرور و مستی و جوش و طرب ہوئے نایاب
ہر اک قدم پہ تلاطم ہر ایک گام سراب

کہاں کہاں نہ ہوئی پست عظمتِ آدم
کہاں کہاں نہ ستاروں نے ٹھوکریں کھائیں
کہاں کہاں نہ کیے رقص طوق نے لے کر
کہاں کہاں نہ رسن کو گلے لگایا ہے
کہاں کہاں نہ سزاوارِ دار ٹھہرے ہیں

کہاں کہاں نہ مٹی شوخ زندگی کی لکیر
کہاں کہاں نہ نگوں ہو گیا خطِ تقدیر
کہاں کہاں نہ بجائی ہے پاؤں کی زنجیر
کہاں کہاں نہ لکھی اپنے خون سے تحریر
کہاں کہاں نہ ہوئی ہم پہ کاوشِ تعزیر

کبھی کبھی اسی پُر ہول تیرہ گاہی پر
کبھی کبھی ترے آہنگِ سادہ کی تاثیر
کبھی کبھی ترے نغموں کا ہو کے شگفتہ
کبھی کبھی تو سمجھتے ہیں غم کے بادل
کبھی کبھی تو دلِ فسردہ بہکتا ہے

ستم کشوں کی تمنا چہک ہی جاتی ہے
زبانِ غمزدگاں کو فزوں نما سکتی ہے
خزاں کو چھیڑ کے فصلِ بہار آتی ہے
کبھی کبھی تو فضا گیت گنگناتی ہے
کبھی کبھی تو مسرت بھی بار پاتی ہے

یہ زرد زرد یہ تری مہ جبینی تابانی
منشیہ تری آتش فشاں ادائیوں کی قسم
اندھیری شب جو اچھتا ہے گھٹا کے پیچ میں
فسونِ زیست میں ملتا نہیں ستارۂ شام
تری صداؤں کے سیوے میں فرد کھو دیں

نظامِ کہنہ کو دیتے ہیں ایک شکلِ جمیل
خامِ فکر ترا صبح و آشتی کی دلیل
سحر لئے ہے ترا شعلۂ نوا قندیل
جنونِ عشق کی ہوتی نہیں کبھی تکمیل
بس ایک نادبی ہے جو بس اک یہی ہے سبیل

گلوں پہ گرتے ہیں جس طرح قطرۂ شبنم
چمک کے جیسے کوئی مہر صبح جو نکلے
زمانۂ شب میں کبھی دامنِ سحر میں کبھی
تری عطا کا یہ صدقہ ترے کرم کا طفیل
عنایتوں کا تصادم لطافتوں کا خروش

شرابِ ناب چھلک جائے جیسے ساغر و جام
رباب چھیڑ کے کوئی جیسے چاند کے بام
فسردہ ذہن پہ ہوتی ہے بارشِ الہام
جلائے بیٹھا ہوں افکار گردشِ ایام
سلام لکھتا ہے شاعر ترے خلوص کے نام

سکوتِ رنج و الم کی اداس راہوں میں
تھکی ہوئی مری نظریں تھکی رہیں لیکن
ابھی حیاتِ گریزاں کے کام آئے جا
ابھی رکا تو نہیں ہے سفینۂ غمِ دل
یہ آسرا بھی بڑا آسرا ہے جینے کو

جہاں جہاں بھی حوادث سے دل ہوا دو نیم
"فساد سامنے در موجِ کوثر و تسنیم"
ابھی تو سخت ہیں اوقات مرحلے ہیں عظیم
ابھی ہوئی تو نہیں ہے سکوں کی تنظیم
"چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نوبہار دیکھے گا"

بیوی کی بغاوت

راجہ مہدی علی خاں

وہ اک آہ بھر کر چھپا آفتاب ‏ ‏ تپائی پہ بندی نے رکھ دی شراب
نہ میری نگاہوں سے گر جائیے ‏ ‏ تبسم بہ لب نوش فرمائیے
خیال آ رہے ہیں مجھے پئے بہ پئے ‏ ‏ بہت ہی مزیدار ہوگی یہ مے
یہ دو گھونٹ کیا میں بھی پی لوں جناب! ‏ ‏ جو پی لوں نہیں کھائیے پیچ و تاب
ہوں اولاد میں بھی بڑے باپ کی ‏ ‏ کروں کیوں نہ تقلید میں آپ کی
کسی دن ابھی میں بھی تو پی کے آؤں ‏ ‏ ذرا میں بھی گھر بھر میں آفت اٹھاؤں
جو پی آئی گھر بھر کو پیٹوں گی میں ‏ ‏ کبھی آپ کو بھی گھسیٹوں گی میں
کسی بات پر ہو گئی گر میں تیز ‏ ‏ تو پھینکوں گی کھانا الٹ دونگی میز
میں توڑ دوں گی چینی کی سب تھالیاں ‏ ‏ لغت میں نہ ہوں۔ دونگی وہ گالیاں
پیوں گی میں ہر روز اتنی شراب ‏ ‏ کہ اک روز ہوگا یہ خانہ خراب
جب اس گھر پہ ہوگا فلاکت کا راج ‏ ‏ نہ پھر بھی اتاروں گی مستی کا تاج
یہ گھر سارا نیلام کر دوں گی میں ‏ ‏ شرابی کا ہر کام کر دونگی میں

بہت کچھ کرے گی کنیز آپ کی
کہ لڑکی ہے یہ بھی بڑے باپ کی

(۲)

ابھی میں بھی کھڑکی سے دیکھا کروں ‏ ‏ ابھی میں بھی آنکھوں کو سیکا کروں؟

یہ پبلک میں منہ پہ حیا کی نقاب؟
پھروں میں بھی کھولے ہوئے کتاب!
میں سائیکل پہ روز گھوما کروں؟
نگاہوں سے چہروں کو چوما کروں
کروں میں بھی سڑکوں پہ آوارگی!
حسیں مرد وضع سے کروں دل لگی؟
میں مردوں کو آنکھوں پہ آنکھیں دکھاؤں!
بھی جب وہ منہ سے تو ٹھینگا دکھاؤں!
کروں اُن پہ بیہودہ فقرے میں چست!
جو پوچھیں وفا بھی: میں بولوں خدا حافظا!
میں بس میں رکھوں اُن کے پیروں پہ پیر
وہ جانے لگیں تو کہوں: "شب بخیر!"
جو سینما میں بیٹھے کوئی پاس مرد
چکھاؤں اُسے اپنی چپل کا درد
میں سڑکوں پہ پھیروں اُنہیں پھانس کر
ملے جو بھی لے جاؤں میں پھانس کر
نہ ہو کالے پیلے کی کچھ بھی تمیز
کہوں: "واہ کیا گھیر لائی میں چیز"
چھپیں مجھ سے ڈر کر نقابوں میں مرد
اگر دیکھیں مجھ کو ہو جائیں زرد
ہر اک گھر میں جاتے ہوں پرچے مرے
سبھی مردوں میں ہوں چرچے مرے
میں نام اپنے والد کا روشن کروں؟
میں بھی سات سو عشق کر کے مروں؟

کہ لڑکی ہوں میں بھی بڑے باپ کی
کروں کیوں نہ تقلید میں آپ کی

۲

میں مردوں کے کوٹھوں پہ جایا کروں!
میں باہر بھی دل کو لگایا کروں؟
میں دے جاؤں اس گھر کو تنہائیاں!
مرے ساتھ ہوں میری ہمسائیاں
لپ اسٹک سے گلنار کر کے یہ لب
چلیں چہلیں کرتی ہوئی سب کی سب
پھریری ہو اک عطر کی، کان میں
ہو اک جھرجھری سی دل و جان میں
ہو سگرٹ کا ٹن ایک ماچس کے ساتھ
چلیں جھومتی دے کے ہاتھوں میں ہاتھ
دھواں اپنے منہ سے اُڑاتی ہوئی
بڑھیں آگے اودھم مچاتی ہوئی

جہاں آئے آوازِ چنگ و رباب
ذکیں دیکھ کر بزمِ رقص و شراب

نگاہوں کی اُن سیر چشموں پہ چڑھیں
ذرا ہچکچائیں پھر آگے بڑھیں

وہ بیٹھے ہوں سُرمہ لگائے ہوئے
ہوں گالوں میں پاؤڈر رچائے ہوئے

وہ ہوں جھریوں کو چھپائے ہوئے
گر حلق میں ہوں بنائے ہوئے

کہیں اُٹھ کے وہ ہم سے آداب عرض!
بجا لائیں رنڈی کا پہلا فرض.

ادا سے گلوری کریں پیش وہ
کہیں ہم سے طے پھر کم و بیش وہ

چھڑیں جب ستار اور سارنگیاں
پئیں وسکی ہم، کھائیں نارنگیاں

ہر اک سانس اپنی نشے میں ہو غرق
نہ آئے فقرات اور رونے میں فرق

کہیں ہم "ارے مردود گاؤ گاؤ"
کوئی تان اچھا سا ہم کو دکھاؤ

حسیں رت میں جب چھیڑیں ٹھمریاں
قطاروں میں بیٹھی ہوں ہم "قمریاں"

ہر اک ہاتھ سینے پہ ساتھ آہِ سرد
دکھائیں انہیں اپنی "الفت کا درد"

وہ گھونگھٹ سے پھینکیں نگاہوں کی چوٹ
تو ہم پھینک دیں اُن پہ سو سو کے نوٹ

وہ ناچیں کمر کو ہلاتے ہوئے
قدم ہوں وہ گھنگھرو بجاتے ہوئے

وہ دیکھیں ہمیں مسکراتے ہوئے
نگاہوں سے اُلفت جتاتے ہوئے

پکاریں یہ ہم "واہ کیا تان لی
ہماری تو اللہ قسم جان لی۔

مچل کر کہیں اُن سے بے تاب سب
"یہ حرکت، یہ مُرکی، یہ توڑے، غضب!

اسی طرح ہم داد دیتے رہیں
حسینوں کی "بیداد" دیتے رہیں

بجیں رات کے دو تو ہم لوٹ آئیں
محبت کے ہم لے کے غم لوٹ آئیں

کہیں آ کے سب اپنے شوہر سے ہم
ابھی بستروں سے اٹھو ایک دم

کہ بھوک ہے گرم کھانا کھلاؤ
"اپی" تھک گئے پیر اٹھ کر دباؤ"

موجِ خوں

احمد ندیم قاسمی

شادی کے تیسرے دن بعد راحت علی کو ایک احساس ہوا کہ اس نے ساجدہ کو اپنی بیوی بنا کر جلد بازی سے ... یکایک اس کے
اس کی ... ساجدہ اس کے ذہن پر بادل کی طرح چھائی ہوئی تھی۔

کچھ دیر پہلے جب گاڑی جہلم کے پل پر سے گزر رہی تھی تو ساجدہ نے ... ایک بات کہہ دی تھی ... کی طرح ... کر کے سفر کے بعد ... ایسا لگتا ہے جیسے گاڑی "جلد جلد جلد" پکار رہی ہے۔ اس پر راحت علی نے کہا تھا "تمہیں اپنے میکے جانے کا کتنا شوق ہے بیگم۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان دنوں میں بھی تمہارے ساتھ ہی رہوں گا۔ پر ... ہے کہ تمہارے ماں باپ ... کے لیے تمہیں ... بچھڑے ... ہیں ... تمہیں ... تمہارے ... کھانے کے لیے کتنی مدت سے ... اگر میں تمہارے انتظار میں اتنی مدت تک ... رہنے کے بعد بھی ... تمہارا ... تمہیں لینے آ گیا۔ ... یوں کریں کہ جہلم میں اتر ہی کیوں نہ جائیں۔ پنڈی کی طرف ... جائیں؟"

اس پر ساجدہ جس طرح مسکرائی تھی وہ ایک عجیب مسکراہٹ تھی۔ اس مسکراہٹ میں حیا بھی تھی، غرور بھی تھا اور اس شکاری کی سی ... بھی، جو ہرن کو جال میں پھنسا دیکھ کر اسے جال میں سے نکالنے اور ذبح کرنے سے پہلے ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ جاتا ہے۔ اور آنکھیں بند کر کے سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگانے لگتا ہے۔ اس نے صرف اتنا کہا تھا "بھاگ تو جائیں پر وہ پرلی طرف کھڑکی کے پاس بھائی جان جو بیٹھے ہیں!"

راحت علی نے چند مہینے پہلے جب ساجدہ کو پہلی بار دیکھا تھا، تو اسے پہلی بار یقین آیا تھا کہ اجنتا کے غاروں جیسی دیویاں آج بھی زندہ ہیں۔ ایسا چلتا چلتا رنگ کہ اسے دیکھنے کے بعد آدمی کچھ دیکھ ہی نہ سکے۔ ... کے نیچے اتنی بڑی بڑی آنکھیں کہ بچوں کے چہروں پر بھی بڑی معلوم ہوں۔ اتنی لمبی پلکیں کہ اگر قمقمہ اس کے سر پر چمک رہا ہو تو پلکوں کے سائے اس کے سارے چہرے پر چلمن سی کا [illegible]۔ پتلی ستواں سی جھکی ہوئی ناک اور اتنے باریک ہونٹ جیسے سرخ ریشم کے ایک تار پر سرخ ریشم کا ایک تار رکھا ہو۔ ننھی سی گول سی ٹھوڑی اور ایسی شفاف گردن کہ پانی کا گھونٹ بھی اترتا دکھائی دے جائے۔ اس کے جسم کی ساری قوسیں اور تمام زاویے ان دیویوں کے سے تھے۔ راحت علی نے جب بھی ان دیویوں کی تصویریں دیکھی تھیں تو صحت اور جوانی سے لبالب بھرے ہوئے ان کے جسموں نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کیا تھا کہ ان مورتیوں کے خالقوں نے ذرا سا مبالغہ ضرور کیا ہے۔ سنگ تراش مصور اور

شاعر، سید ہی ساری صاف نظر آنے والی حقیقت میں فنی حسن صرف یوں پیدا کر سکتے ہیں کہ چلتے چلتے یا ان جیسے معاملوں میں وہ اسے مبالغہ بنا جائیں۔ مگر ساجدہ کو دیکھ کر ایک پل کے لیے راحت علی کو خیال آیا تھا کہ کبھی کبھی شاعر بھی مبالغہ کرتا ہے۔ یہ جب اس نے دیکھا تھا کہ چھلکتی ہنسی جیسے ہنسی اور چہرے پر اترتی ہوئی کرنوں کی چلتی رہی ہے۔ تو اس نے سوچا تھا کہ بعض حقیقتیں ہی مبالغے کی حد تک حسین ہو سکتی ہیں۔

راحت علی اپنے ایک دوست عبدالمنان کا شہ بالا بن کر برات کے ساتھ لاہور سے جالندھر آیا تھا۔ علامت کہ جب دلہن کی سہیلیاں عبدالمنان کو کان سے پکڑے ہوئے تھیں تو ظاہر ہے کہ راحت علی شہ بالا بھی دولہا کے منارے کے لیے ان کے ساتھ ہو لیا۔ دلہن کی حویلی کے صدر دروازے کے قریب پہنچ کر ایک لڑکی چیخ اٹھی "بھاگو بہنو۔ ہمارے ساتھ تو یہ کوئی غیر مرد بھی آ رہا ہے" سب لڑکیاں چیخ کر دروازے کی طرف بھاگیں تو آگے جاتا ہوا عبدالمنان ان کے ریلے میں گر پڑا۔ ایک لڑکی اس کے اوپر سے کودی اور پھر سب لڑکیاں اس پر سے پھلانگتی بھاگ گئیں۔ راحت علی نے لپک کر عبدالمنان کو اٹھایا تو سامنے سے لڑکیوں نے دو تاروں کی روشنی اس کے چہرے پر چاندنی کی طرح مسلط کی اور پھر چیخ کر ہنستی اور تالیاں بجاتی ہوئی اندر بھاگ گئیں۔ اوپر ڈیوڑھی کی چھت پر بھی ایک لڑکی اٹھی ہوئی تھی اور راحت علی نے عبدالمنان کو مشورہ دیا کہ "سنہری موقع ہے بھاگ نکلیں"۔ عبدالمنان لڑکیوں کی اس بدتمیزی کی وجہ سے خفا تھا۔ کچھ کہے بغیر پلٹا تو سامنے سے اس کے منہ پر ایک اور تارے کا چھناکا پڑا۔ اور دونوں دم بخود کھڑے رہ گئے پھر ایک لڑکی یوں رُخ رُخ ہنسنے لگی جیسے دولہا کو بیل سمجھ کر اندر حویلی میں ہنکار رہی ہے۔ مجبور ہو کر دونوں حویلی میں آئے تو وہاں تیز روشنی نے رات کو دن بنا رکھا تھا۔ راحت علی نے پلٹ کر جب اس لڑکی کی طرف دیکھا جو عورتوں کو اندر بلا لائی تھی۔ تو ایکدم اس کا جی چاہا کہ وہ دوکر آنے لگے "منہ چھپانے کیا دیکھ رہے ہو؟" لڑکی رعب سے بولی "آگے چلو"۔ راحت علی نے لڑکی کی آواز پہچان لی۔ یہی تھی جس نے ایک غیر مرد کے ہونے کی موجودگی کا نعرہ مارا تھا اور شاید یہی تھی جس نے منہ کے بل گرے ہوئے دولہا پر سے پھاندنے کی ابتدا کی تھی۔ یہی ساجدہ تھی۔

عورتوں اور لڑکیوں سے ٹھنسے ہوئے ایک کمرے میں جب عبدالمنان اور راحت علی کے سامنے "بیڑی گھوڑی" لا کر رکھی گئی تو ساجدہ آئی مہمان کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور "بیڑی گھوڑی" میں سجے ہوئے ایک طشت میں سے ایک ایک عجیب بیہودہ سا بت اٹھا کر دولہا سے اس کا تعارف کرانے لگی "یہ آپ کے ابا جان ہیں۔ مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی توند سے پہچانیے" ساتھ ساتھ عورتوں کے قہقہے ایک ساتھ بلند ہوئے اور کسی نے کہا "یہ ساجدہ کم بخت تو شیطان کی خالہ نکلی"۔ ساجدہ دولہا سے مخاطب تھی "یہ آپ کی امی جان ہیں۔ دھجیوں کی طرح لٹکتی ہوئی جھریوں سے پہچانیے۔ یہ آپ کے ماموں جان ہیں ہتھیلی پر رکھی ہوئی بیر برابر افیون کی گولی سے پہچانیے۔ اور یہ آپ کے شہ بالا جان ہیں۔ الّو کی سی صورت سے پہچانیے"۔ عورتیں یوں چلا چلا کر ہنس رہی تھیں جیسے رو رہی ہوں۔ اور ساجدہ آخری بت کو راحت علی کے اتنا قریب لے آئی جیسے اس کے منہ میں ٹھونس دے گی۔ بولی "یہ آپ ہیں۔ وہی کچھ ذرا سی ناک ہے کہ نہیں؟ وہی چھوٹے برابر آنکھیں ہیں کہ نہیں؟ وہی چھاج کے سے کان ہیں کہ نہیں؟ وہی غار سا دہانہ ہے کہ نہیں؟" پھر وہ عورتوں کے مجنونانہ قہقہوں کے درمیان اس بت کو راحت علی کے سامنے نچانے لگی "ہے کہ نہیں؟ ہے کہ نہیں؟ ہے کہ نہیں؟" اور راحت علی ہکا بکا بظاہر اس بت کو دیکھتا رہا مگر دراصل وہ ساجدہ کو دیکھتا رہا جو ہنسیاتی دھندلکوں سے نکل کر یہاں چلی آئی تھی اور اپنے ساتھ اتنا بے پناہ اتنا ناقابل برداشت اور قدموں تلے سے زمین کو نکال دینے والا حسن سمیٹ لائی تھی کہ حقیقت اور مبالغے کی حدیں آپس میں خلط ملط ہو گئی تھیں۔

راحت علی کو عبدالمنان پہلے سے بتا چکا تھا کہ دلہن کی خاص سہیلی کی طرح برسوں کی پرانی رسم کے مطابق دولہا کے شہ بالے کو بھی

[illegible]

[illegible]

... ساجدہ کی کلائی پر ... [illegible]

بھی محسوس کیا۔ پھر اچانک ساجدہ کی چیخیں نکل گئیں ... [illegible]

[illegible] اور تنومند لڑکی ہے۔ ... بڑی بوڑھی ... [illegible]
طرف بڑھی مگر فوراً رک گئی جیسے کوئی ضروری بات کہنا بھول گئی ہو۔ ... راحت علی کی آنکھوں میں ... [illegible]

"[illegible]" کوئی بڑی بی بولی "[illegible]"

برات جب واپس لاہور پہنچی تو راحت علی ہاتھ دھو کر عبدالمنان کے پیچھے پڑ گیا کہ وہ بی بیو سے کہہ کر ساجدہ کے رشتے کی بات کرنے میں اس کی مدد کرے۔

ایک دن عبدالمنان نے راحت علی کی موجودگی میں مذاق مذاق میں یہ ذکر چھیڑا تو رضیہ نے ساجدہ کی تعریفوں کے پُل باندھ دیئے۔ بولی یہ زمانے اس روز سے کیا ہو گیا تھا۔ ویسے تو وہ ... رہنے والی لڑکی ہے کہ ... پرانی ... سہیلی نے بھی اس کی زبان سے کبھی کوئی ایسی ویسی بات نہیں سنی۔ بس یوں لگتا ہے کہ ... اس روز ... راحت بھائی چپ چاپ بیٹھے ... کھاتے رہے مگر اچانک اس کی کلائی پر ہاتھ ... چوڑیوں کی کرچیاں اس کی جلد میں اتر گئیں۔ میں جب ... تو اس نے بتایا کہ ڈاکٹر تک نوبت پہنچی ہے ... روزانہ ... کے ٹیکے ... ساجدہ کو جب معلوم ہوا کہ رشتہ اسی چوڑی توڑ کی طرف سے آیا ہے

تو میں سے کیسے کہیں، تو وہ بولی کہ راحت بھائی ویسے بہت بھلے آدمی ہیں۔"

"میں بیچارہ شہری آدمی" راحت علی نے اپنی صفائی پیش کی۔ "مجھے کیا معلوم کہ [illegible] کیسے آتے جاتے تھے۔ حنان نے مجھے ذرا سا بتایا تو تھا مگر مجھے اس انتہا کی خبر نہ تھی۔ میں نے تو ویسے ہی [illegible] سے اب تک ہاتھ پیدا نہیں ہوا۔ خدا کی قسم میں اس خیال سے چپ چاپ بیٹھا ہوں [illegible] جب محسوس کیا کہ ہاتھ [illegible] تو میں نے بالکل اندھوں کی طرح اس کی کلائی پکڑ لی۔ آپ ہی بتائیے بھابی میں کیا کرتا۔ اس میں میرا کیا قصور ہے۔"

"جانے مجھے کیا ہو گیا تھا حنان" بعد میں اس نے عبدالحنان کو بتایا تھا "سوچو تو مجھے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ساجدہ کی کلائی پر ہاتھ پڑنے سے پہلی چوڑیاں ٹوٹیں تو میری آنکھیں کھلیں۔ اگر چوڑیاں نہ ٹوٹتیں تو قسم کھا کر کہتا ہوں، خدا جانے میں کیا کر بیٹھتا۔ مگر جب ہاتھ پر [illegible] اور پھر یہ بھی شکر کرو کہ میں نے اسے [illegible] کرتا تو خدا کی قسم بچوں کی طرح رونے بیٹھ جاتا [illegible] کی وجہ سے نہیں۔ جانے کس وجہ سے۔ بس مجھے رونا آ جاتا۔ عورتوں کے سامنے رونا آ جاتا۔"

عبدالحنان اور اس کی بیوی جب بھی چلے گئے۔ ساجدہ کے والدین سے ملے۔ راحت علی کے خاندان کے افراد اور اصلی تفصیلیں بھی دیا کرتے رہے۔ رضیہ نے حنان کو یہ بھی بتایا کہ جب ایک بار اس نے ساجدہ سے یہی پوچھا تو وہ بولی "کلائی پکڑی تھی [illegible] مجھے بھی تو وہ کچھ ایسے برے نہیں لگے تھے۔" راحت علی کے ماں باپ مر چکے تھے اور وہ اپنے خاندان کا واحد فرد تھا۔ اس لیے آخر میں رضیہ کے کہنے پر اس نے کہیں سے دور رشتہ کی ایک خالہ کا بھی سراغ لگا لیا جو عبدالحنان اور رضیہ کے ہمراہ جا کر بات پکی کر آئی اور تین مہینے بعد کی بات تاریخ بھی مقرر ہو گئی۔

شادی کے دن لڑکیوں نے راحت علی کو خوب بنایا مگر وہ احمقوں کی طرح چپ چاپ بیٹھا رہا۔ جلد ہی سے اس کے لیے ایک شہ بالا ڈھونڈ نکالا گیا جس نے ساجدہ کی خاص سہیلی زرینہ کے [illegible] کی تین چار چوٹیں کھانے کے بعد فرار اختیار کر لی اور سہیلیوں کو [illegible] ہوا ایک کھڑکی میں سے کود تو ایک انگلی ٹوٹ [illegible] بیٹھا مگر اسے حیرت سے پکڑ کر لا بٹھایا گیا اور اس کے زخم پر نمک چھڑک کر اس پر پٹی باندھ دی گئی۔ اس پہ وہ [illegible] پر اتر آیا۔ مگر راحت علی مسکراتا رہا اور ننگی ننگی گالیوں جیسے گیت سنتا رہا اور سوچتا رہا کہ جب وہ پہلی بار ساجدہ سے تنہائی میں ملے گا تو اس کی کلائی پر سے ٹھوس سونے کے کنگن [illegible] جو اس نے ساجدہ کے لیے بڑے شوق سے بنوائے تھے، اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دے گا اور کہے گا یہ لو [illegible] کہ میں بھی [illegible] لگا ہوں مگر ساجدہ اس کے سامنے بار بار زخمی کلائی کو [illegible] ہنستی ہوئی ابھرتی رہی اور وہ سوچتا رہا کہ وہ اس کی کلائی پر کہاں کہاں پیار کرے گا اور اگر کلائی پر چوڑیاں ہوئیں تو انہیں کتنی نرمی سے ادھر ادھر ہٹا کر اپنے ہونٹوں کے لیے جگہ بنائے گا۔

شادی کے بعد راحت علی کو ساجدہ کے ساتھ صرف دو دن گزارنے کا موقع ملا مگر ان دو دنوں میں اس کی کیفیت ایسی رہی جیسے وہ [illegible] ہے۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور ہتھیلیاں اور تلوے ہر وقت بھیگے رہتے تھے۔ عبدالحنان نے اسے سمجھایا بھی کہ دولہاؤں کے یہ تیور نہیں ہوتے مگر راحت علی بولا "میں کیا کروں حنان۔ میں ابھی تک یہ فیصلہ ہی نہیں کر پایا کہ میں اس لڑکی سے پیار کروں یا اس کی پوجا کروں یا اس سے نفرت کروں۔ وہ جس نے میرے ہاتھ کی ہڈیاں توڑ ڈالی تھیں اب دلہنوں کی

[illegible] ہیں جیسے [illegible] سے [illegible] ہے [illegible]
[illegible] کر [illegible] ہیں [illegible]
[illegible]

عبداللطیف صاحب باتیں ہی کر رہے تھے کہ [illegible] ساجدہ [illegible] چائے [illegible] پیالہ [illegible] سے کوئی بات نہ کر سکے [illegible] ساجدہ کا [illegible] راحت علی ساجدہ کو دیکھتا رہا اور ساجدہ ایک دم سامنے کے [illegible] گاڑی چلنے لگی تو ساجدہ نے [illegible] راحت علی [illegible] ہے [illegible] راحت علی [illegible] تو [illegible] ہیں [illegible] لگا [illegible] ہوں [illegible] کتابیں جو میں نے [illegible] ہی [illegible] کتنی مدت سے [illegible] ہیں۔ مگر [illegible] آنکھیں [illegible] نہیں [illegible] ہے [illegible] ہیں:

اس پر ساجدہ جس طرح مسکرائی تھی وہ [illegible] راحت علی [illegible] کی طرح [illegible] جو [illegible] سے [illegible] چہرہ [illegible] کہ سگریٹ کے بے شمار کش لگا رہے تھے۔

چند دن [illegible] کے قیام کے بعد ساجدہ میں اور راحت علی سے تنہائی میں ملی۔ وہ اس وقت [illegible] والے دروازے کو [illegible] سگریٹ پی رہے [illegible] ساجدہ [illegible] اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی تو راحت علی چونکا [illegible] اور بولا: کیا بات ہے؟

ساجدہ کی مسکراہٹ اس کے چہرے پر [illegible] راحت علی نے [illegible] آہستہ سے بولی: آپ کیوں [illegible] بات ہے؟

راحت علی نے جیسے [illegible] آپ کو [illegible] لگا۔ ساجدہ [illegible] حیران [illegible] کھڑی رہ گئی جیسے دودھ کا ایک پیالہ [illegible] والی آواز میں بولی: میں آپ کو یہ بتانے آئی تھی کہ [illegible] نے اجازت دے دی ہے اور ہم آج شام کی گاڑی سے لاہور جا رہے ہیں۔

راحت علی نے اسی طرح [illegible] ساجدہ کی طرف دیکھے بغیر کہا: [illegible] تو دو چار دن اور رک جاؤ۔ میری طرف سے اجازت ہے۔

یہ کہہ کر وہ پلنگ پر بیٹھ گیا اور ساجدہ پر [illegible] جیسے اس کی [illegible] راحت علی کو دیکھتی رہی جیسے اسے بہلانے کی کوشش کر رہی ہے۔ پھر اسے [illegible] پلنگ پر [illegible] اور راحت علی کے سینے پر سر رکھ کر اور بازوؤں کو اس کے شانوں پر [illegible]

گزارا۔ دو سیر راحت اور ساجدہ صبح شام بی بی کی گاڑی سے چلی گئے۔"
"بہت اچھا۔ چلو" راحت علی ساجدہ کے دونوں ہاتھ زور سے پکڑ کر [illegible] گر [illegible]
مر جاؤ۔

وہ اسی روز شہر سے چلے آئے۔ پھر کوئی ایک مہینہ بعد جب محلہ میں ساجدہ کی ماں اور پاس پڑوس سب کو معلوم ہوا اس موضوع پر باتیں کرتے رہے کہ لڑکیاں بیاہے جانے کے بعد یکایک بہتے برسوں کے کہے سے جدا ہو کر ایک کیسے الگ ہو جاتی ہیں۔ تو یکایک ساجدہ تن تنہا ہی ماں سے بیٹی کی طرح ملنے آئی۔ بس سے اتر کر اس ہاتھ سے بھنچے۔ پھر ساجدہ کے ابا کو پکڑ کے گیٹ میں جیسے کر رہیں۔ راحت علی گر چکی اور رہے "نہیں مگر وہاں راحت علی نے کہا۔ ان کا ملازم ایک بس سے کہہ یا تھا اس نے سلام کر کے بکس ان کے حوالے کیا اور رشتہ ہراتفاق فرشتے کی طرح دے دیا۔

"صاحب نے سلام بولا ہے اور بولا ہے کہ بیگم صاحب ابھی شہر ہی سے نکلیں گی۔ جہاں سے آئیں کہہ دینا کہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔"

ایک سہما ساجدہ کی رشتہ داروں اور سہیلیوں سے بھر گیا۔ پورا محلہ امڈ آیا۔ سب نے تک بات بات پر ناک پر انگلیاں رکھی جاتی رہیں۔ مگر آنکھیں بھی ٹپ ٹپ کر اور منہ میں اچکا اچکا کر خندہ ساز شیں بھری جاتی رہیں۔ آخر کار ساجدہ کی امی سے سیدھے سیدھے چلا کر ہاتھ پورے ہجوم میں یوں عام ہو گیا کہ راحت علی تھوڑا سا پاگل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم خوبصورت تو ہو مگر صرف خوبصورت ہو۔ تمہاری خوبصورتی دوسرے سے خالی ہے۔

"یہ دوسرے کیا ہوتا ہے بہن؟" بتانے والی سے کسی نے پوچھا۔

"اور دوسرے تو کچھ ہوتا ہے۔ یہ یہاں نہیں ہوتا۔ ادھر بڑے بڑے شہروں میں ہوتا ہے۔" پھر اس نے راحت علی کے پاگل پن کی وضاحت جاری رکھی۔ "وہ کہنے لگا ساجدہ بی بی سے کہ میں تمہیں دور سے دیکھ کر دھوکا کھا گیا تھا۔ میں کہتا تھا تم جیتی جاگتی سانپ ہو پر تم مورتی نکلیں۔"

"مورتی یہ کہا اس نے؟ پر گڑیا اور مورتی میں،" کسی نے پوچھا۔

"وہ تناسے والی بولی۔ "اسے ہم کوئی پاگل ہوں کہ پاگلوں کی باتوں کا مطلب بتاتی پھروں۔ ہاں تو پھر بہن مصیبت کی بات یہی ہے کہ کل تو غضب ہو گیا۔ کل جب ساجدہ نے سوتے ہوئے راحت علی کو یوں ہی ذرا سا چھو لیا تو اس نے ساجدہ کے منہ پر اپنے ہاتھ کا تھپڑ جڑ دیا اور بکنے لگا کہ تم صرف خوبصورت ہو۔ تم صرف ایک عام سی عورت ہو۔ شادی سے پہلے میں نے تمہارے حسن کے ہاتھ میں جو تلوار دیکھی تھی۔ وہ کہاں ہے؟ جاؤ۔ اپنے آپ کو میری نفرت سے بچانے جاؤ۔"

"پاگل ہے۔ صاف پاگل ہے۔" کسی نے کہا۔

"بدتمیز ہے وحشی ہے درندہ ہے۔" نذیرہ دیں ساجدہ کے گھٹنے کے پاس بیٹھی ہوئی چلا اٹھی "ہائے بچہ۔ قسم پروردگار کی میں تمہاری جگہ ہوتی تو اسے چھٹی کا دودھ یاد دلا دیتی۔ ساری میں پوچھتی ہوں جس نے تمہارے منہ پر تھپڑ مارا تو کیا تمہارے ہاتھ پر فالج گر گیا تھا؟ جواب میں تم اسے تھپڑ مارنے کے بجائے رونے لگیں اور پھر بیٹھے بھاگ آئیں۔ میں ہوتی تو قسم پروردگار کی۔ اس کے دونوں کانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتی اور پوچھتی کہ کیوں میاں۔ اب بتاؤ۔ وہ اور دو کتنے ہوتے ہیں۔" پھر ذرا سا رک کر بولی "کمینہ۔"

[illegible] بات چیت [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] ساجدہ [illegible] راحت علی [illegible] [illegible] سہیلیاں جب راحت علی [illegible] [illegible] دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر [illegible] [illegible] ساجدہ [illegible] تو وہ ہاتھوں کو دونوں بغلوں میں چھپا لیتی ہیں جو انھیں پکڑنا چاہتے ہیں۔

پھر ایک روز جب رات کے گیارہ بجے تک کیرم اور تاش کھیلنے کے بعد سب لوگ سونے چلے گئے اور ساجدہ کی سہیلیاں اپنے اپنے گھروں کو چلی گئی تھیں تو ایک سنّاٹے کے قریب [illegible] اپنے خاوند کے ساتھ [illegible] دونوں ہاتھوں میں چھپا کر وہیں دروازے پر بیٹھ گئیں۔ سارے گھر میں ہنگامہ مچ گیا۔ [illegible] میں نہیں ہے اور اس کے کمرے کا کنڈی والا دروازہ باہر سے کھلا ہے۔ ایک سے لے کر سب گھر والے ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے۔ پھر سب ایک دم راحت علی کے کمرے کی طرف بھاگے۔ وہاں پہنچ کر وہ پھر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے مگر جلد ہی ساجدہ نے [illegible] معمہ حل کر دیا۔

فوراً دلہن کے نوجوان رشتہ دار ایک کار میں بیٹھ کر جہلم کی طرف روانہ ہو گئے اور ساجدہ کے ابا نے عبداللطیف کو تار بھیج کر فوراً پہنچو۔ مگر جب تک یہ حضرات جہلم پہنچے، راولپنڈی سے [illegible] کے نام [illegible] کا خط آ چکا تھا کہ ہم بخیریت ہیں اور آپ کی خیریت نیک مطلوب ہے۔ صورت احوال یہ ہے کہ ہمیں معاف کر دیجئے۔ چھوٹے غلطیاں کرتے رہتے ہیں اور بڑے معاف کرتے رہتے ہیں۔ اور آپ ہمیں معافی کی چٹھی لکھ دیں تو ہم دونوں آپ کی قدمبوسی کے لیے فوراً حاضر ہو جائیں گے۔

راحت علی جب ساجدہ کو مکلاوے پر جہلم لایا تھا۔ اور سسرال میں اپنی بہت سی نئی رشتہ داروں اور ساجدہ کی سہیلیوں میں گھر

بیاہ کر صوفے پر جا کر بیٹھا تھا اور سامنے دیکھا تھا تو یکایک اسے محسوس ہوا تھا کہ اس نے ساجدہ سے شادی کر کے جھک ماری ہے۔

"یہ کون ہے؟" اس نے سوچا تھا۔ "یہ جو ساجدہ کے بالکل اُلٹ ہے لیکن پھر بھی خوبصورت ہے۔ جس کی شخصیت میں وجاہت ہے اور جس کا رنگ اتنا صاف ہے کہ زبان تک کر اس کا ذائقہ محسوس ہوتا ہے۔ جس کی آنکھیں صرف اتنی بڑی ہیں کہ اس سے بھی بڑی ہوں تو مصنوعی معلوم ہوں۔ جو ایک ڈال کی طرح خمیدہ ہے۔ خوب لمبی اور جڑی ہوئی بھویں ہیں۔ جو ذرا سی ناک ہے ذرا سی پتلی اگر اس جیسے پورے چہرے کی ناک ہوتی تو پورے چہرے کا توازن بگاڑ دیتی۔ جو ہرے بھرے ہونٹ ہیں تو جیسے ہر وقت مسکراتے رہتے ہیں۔ ہے جیسے مست سا زہر آلود خون پڑے پڑے گر گیا ہو اور سے صرف ہوتی قطرہ سی ہے۔ گردن میں لچک ہے، اور جسم کے خطوط میں رعنائی بھی ہے اور توانائی بھی۔ یعنی ایک ایسا بھرپور پن جس کی وجہ سے سارا جسم گداز سا نظر آتا ہے۔" راحت علی نے سوچا تھا کہ اگر وہ مصور ہوتا تو اس لڑکی کی تصویر کھینچ کر اس کے نیچے "عورت" لکھ دیتا۔

یک ساتھ سب نے اس لڑکی کی طرف دیکھا جس کی طرف راحت علی مسلسل دیکھے جا رہا تھا۔ پھر وہ بولی تھی "یہ بلنے والے بھائی تو مجھے بالکل خریداروں کی طرح دیکھے جا رہے ہیں۔"

"ہائے زرینہ" کوئی بڑی بی بولی "گالی مت بکو۔"

"گالی مت بکو زری۔" راحت علی نے راولپنڈی کے ایک ہوٹل میں اپنے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا "میں تو تمہیں اپنا ایک خیال بتا رہا تھا۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ دنیا کی ساری عورتیں چاہے وہ ساجدائیں ہوں، چاہے زرینائیں، جب بیوی بن کر مرد کے قریب آتی ہیں تو اپنی شخصیت کے خول میں سے نکل آتی ہیں اور سیدھی سادی عام عورتیں بن جاتی ہیں۔ میں تو تمہیں یہ بتا رہا تھا کہ ساری دنیا میں صرف ایک عورت بستی ہے۔ البتہ ہر گھر میں اس کا نام مختلف ہے!"

"پھر وہی بک بک!" زرینہ اونگھ کر بولی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ زرینہ کے نام اس کی امی کا خط آیا تھا۔ دنیا کی تمام ماؤں کی طرح انھوں نے بھی یہ کڑوی گولی آنکھیں بند کر کے نگل لی تھی۔ انھیں فوراً جہلم بلا بھیجا تھا اور یہ فرمائش بھی کی تھی کہ آتے ہوئے پہلے مری کی تین چار پنکھیں بھی لیتی آنا۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہے" راحت علی نے کہا "کہ تمہاری امی ہم سے نہ صرف خفا نہیں ہیں بلکہ خوش ہیں۔"

"خوش کیوں نہ ہوں" زرینہ بولی "میں نے انھیں باقاعدہ شادی کے دس ہزار کے خرچے سے بچایا ہے کہ نہیں؟"

دس روز بعد جب وہ دونوں جہلم پہنچے تو زرینہ کی ماں دس منٹ تک زرینہ کو سینے سے لگائے روتی رہیں۔ وہاں سے فارغ ہو کر انھوں نے راحت علی کے سر اور پیٹھ پر تین چار بار ہاتھ پھیرا اور اس کا کندھا چوما۔ پلٹ کر وہ زرینہ سے لپٹ گئیں — اور راحت علی نے ایک کرسی پر بیٹھ کر اپنی سامنے کی جیب میں سے کنگھی نکالی اور بال سنوارنے لگا۔

ایک دم اتنی بہت سی پڑوسنیں قطار اندر قطار صحن میں اُمڈ پڑیں۔ اور زرینہ، اس کی امی اور راحت علی ان میں گھر کے رہ گئے۔ جتنی عورتیں تھیں یوں حسرت سے دیکھے جا رہی تھیں جیسے وہ کوئی بہت بڑا معرکہ سر کر کے لوٹے ہیں۔ اکا دکا نوجوان لڑکیوں نے راحت علی سے چھیڑ چھاڑ کی بھی کوشش کی اور بعضوں نے اپنی چوڑیوں بھری کلائیاں بھی اس کے سامنے یہ کہہ کر پھیلا

دیکھ لیا تھا وہ ساجدہ کے [illegible] ہی [illegible] تھے قتل [illegible] راحت علی [illegible] جب [illegible] اس کے سامنے [illegible] نہیں لا [illegible] ہے۔

[illegible] سب [illegible] ساجدہ [illegible] وقت اس کے ہاتھ میں [illegible]

راحت علی کے چہرے پر [illegible] ایک ایسا رنگ [illegible] پیچھے ہی [illegible] اور [illegible] طرف دیکھا اور سب کے [illegible] سب سے [illegible] تھیں یہی ادھر ادھر [illegible] راحت علی [illegible] ساجدہ [illegible]

ساجدہ کے [illegible] چہرہ [illegible] سے [illegible] تھے [illegible] جیسے [illegible] جلا ہے۔

وہ آنکھیں پھیلائے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ [illegible] راحت علی کی [illegible] اس کے قریب آ کر [illegible] بڑی بڑی آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھنے لگی اور پھر ایک دم، جیسے [illegible] راحت علی کے منہ پر تھپڑوں کی بوچھاڑ کر دی۔ راحت علی بازو [illegible] جیسے ساجدہ کی چوڑیوں [illegible] ہے۔ پھر اچانک اس سے [illegible] ساجدہ کی چوڑیوں بھری کلائی [illegible] لال چوڑیاں چھنک کر ٹوٹیں اور ہر طرف [illegible] کے ٹکڑے [illegible] کی طرح بکھر گئے اور ساجدہ کی کلائی کے [illegible] راحت علی کی انگلیاں [illegible] راحت علی پر جھپٹی اور اس کے ہاتھ [illegible] راحت علی نے ہاتھ سے [illegible] خون کی ایک دھار [illegible] عورتوں کو [illegible] ساجدہ کو کندھے سے جھٹک کر [illegible] کیا بکواس ہے۔"

ساجدہ نے راحت علی کے ہاتھ پر سے ہونٹ ہٹا کر ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی کلائی چھڑا لی اور اپنے دانتوں پر پھیلا ہوا راحت علی کا خون زرینہ کے منہ پر تھوک دیا۔ زرینہ دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر روتی ہوئی وہیں جھک گئی اور ساجدہ واپس جانے کے لیے پلٹی ہی تھی کہ اندر کمرے میں سے زرینہ کی امی سو سو کے نوٹ ہاتھ میں لیے ہوئے چیختی چلاتی باہر نکلیں اور پکاریں "یہ لے اپنا دس ہزار کا حق مہر جس کی خاطر تو میری بچی پیٹے کو کاٹ کھا رہی ہے۔ میں تو تجھ جیسے ہزاروں سو تیں قربان کر ڈالوں اس جوڑے پر سے!"

ساجدہ نے جس کے ہونٹ راحت علی کے خون سے سرخ ہو رہے تھے، ذرا سا رک کر زرینہ کی امی کی طرف بے پناہ نفرت سے دیکھا اور پھر رستہ بناتی ہوئی عورتوں کے ہجوم میں سے گزر کر باہر چلی گئی۔

"لائیے اپنے بیٹے سے دیجئے۔" ساجدہ نے زرینہ کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔

"یہ لے بیٹا" اس نے نوٹوں کا بنڈل اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"یہ صفیہ آپ نے کہے دیئے ہیں نا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں ہاں بیٹا" وہ بولیں۔

"ارے یہ تو حق ہے یہ چندہ۔" روتی ہوئی زرینہ کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا "بیٹی تم نے آپ کی جیب کر دیئے۔"

بلکہ وہ یوں باہر لپکا جیسے ذرا سا بھی رُک گیا تو اسے بہت دیر ہو جائے گی۔ زرینہ نے یہ دیکھا تو کھڑی ہو گئی اور آنکھیں پھاڑ کر اسے جاتا دیکھنے لگی اور اس کی ماں دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر روتی ہوئی وہیں بیٹھ گئیں۔ مگر وہ تو چلا گیا۔ وہ باہر سڑک پر آگیا اور بھاگنے لگا۔ ٹھیک سامنے ہی ساجدہ کے ابا، اس کا بھائی اور عبدالمنان اسی کی طرف آ رہے تھے۔ مگر وہ انہیں نہ دیکھ سکا۔ وہ تو صرف ساجدہ کو دیکھ رہا تھا جس سے اب وہ صرف چند ہی قدم کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔

سنترے

خواجہ احمد عباس

بمبئی پہنچنے میں چند ہی منٹ باقی تھے۔

دفعتاً ایک ستارہ ٹوٹا اور روشنی کی لکیر بناتا ہوا خلا کی تاریکی میں جیسے ڈوب گیا۔

ہوائی جہاز کی کھڑکی کے قریب بیٹھی دلہن آشا نے سوچا۔ ستارہ ٹوٹتا ہے تو بدشگونی ہوتی ہے۔ جانے کیا ہونے والا ہے۔ ایک نامعلوم خوف سے وہ کانپ اٹھی۔ مگر پھر اس نے اپنے دل کو سمجھایا۔ یہ سب وہم ہے۔ اگر ہر بار ستارہ ٹوٹنے پر ہوائی جہاز کریش (CRASH) ہو جایا کرے تو لوگ ہوائی جہاز میں سفر کرنا ہی چھوڑ دیں۔ اور پھر اس وقت تو اس سے زیادہ خوش قسمت لڑکی ساری دنیا میں نہ ہوگی جو آج پہلی بار ... سے بڑے بزنس مین کی بیوی بننے جا رہی ہے — بلدیو راج اوبل — جس کے ہاتھ میں اس وقت آشا کا ہاتھ تھا۔ جس کے ساتھ وہ کل بمبئی سے ہانگ کانگ جانے والے ہوائی جہاز میں ساری دنیا کی سیر کو روانہ ہونے والی ہے۔ بلدیو راج ساہنی جو سیٹھ کروڑی لال کا اکلوتا بیٹا ہے اور ہونے والا جانشین بھی۔ سیٹھ کروڑی لال جو بڑے بڑے ہوٹلوں کے مالک ہیں جو سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دہلی میں راج محل، بمبئی میں تاج کا رٹز، مسوری میں ہمالیہ گرینڈ، نینی تال میں لیک ویو، کلکتہ میں ایسٹ انڈیا، مدراس میں گرینڈ پیلس، بنگلور میں مارٹ جن، ... میں ... ، ... میں میرینا ... یہ فہرست دہرا کر وہ آپ ہی آپ مسکرا دی۔ جب سے بلدیو سے ... ہوئی ہے یہ نام اتنی بار سن چکی تھی کہ زبانی حفظ ہو گئے تھے۔

بلدیو کو اپنے باپ کی اس 'ہوٹل ایمپائر' پر بڑا ناز تھا اور اس نے آشا سے وعدہ کیا تھا کہ جب یہ سلطنت اس کے قبضے میں آئے گی تو وہ دہلی میں ہندوستان کا سب سے بڑا، سب سے خوبصورت اور سب سے عالیشان ہوٹل تعمیر کرائے گا اور اس کا نام ہوگا آشا پیلس۔ اور یہ وعدہ یاد کر کے آشا نے بڑی محبت اور تشکر سے بلدیو کا ہاتھ دبا دیا۔ بلدیو کا ہاتھ جو سگریٹ نوشی اور ہینڈ کریم کے استعمال سے نرم رہتا تھا۔ جس پر محنت نے کوئی گٹھا نہیں ڈالا تھا جس کی انگلیوں کے ناخن راج محل ہوٹل کی حسین منیکیورسٹ لڑکیاں بڑے اہتمام سے تراشتی تھیں ان کو نوکیلا بنا کر ان پر نیل پالش لگاتی تھیں۔

بلدیو کے ہاتھ کی نرمی اور گرمی میں کتنے ہی خوش آئند وعدے تھے۔ بمبئی سے وہ بوئنگ میں قاہرہ جائیں گے وہاں نیل کے کنارے دنیا کے مشہور ہوٹل نائل ہلٹن (NILE HILTON) کے کمرہ پنج اسویٹ میں ٹھہریں گے۔ اونٹ پر بیٹھ کر اہرام مصر کے سامنے تصویر کھنچوائیں گے۔ کیبرے میں نیم برہنہ مصری لڑکیوں کا ناچ دیکھیں گے۔ پھر لندن جائیں گے۔ وہاں کے سب سے بڑے ہوٹل سیوائے میں ٹھہریں گے۔ بکنگھم پیلس کے سامنے سنتری کے گارڈز کے ساتھ تصویر کھنچوائیں گے پھر پیرس میں فرانس کے سب سے مہنگے ہوٹل جارج پنجم میں ٹھہریں گے

اور پھر نیو یارک میں وال اسٹریٹ، اور پھر شکاگو۔ اور پھر ہالی وڈ (LOS ANGELES) جہاں آشا اپنی فیورٹ ایکٹرس سے ملاقات کرے گی اور گریگری پیک (GREGORY PECK) کے ساتھ تصویر کھنچوائے گی جو "ٹائم" اور "لائف" میں شائع ہوگی۔ جسے دیکھ کر اس کی ساری سہیلیاں رشک سے جل مریں گی اور پھر وہ ٹوکیو جائیں گے اور وہاں کے امپیریل ہوٹل میں قیام کریں گے۔ اور پھر ہانگ کانگ اور سنگاپور کے مشہور ریستورانوں کا معائنہ کرتے ہوئے واپس آجائیں گے۔ "بات یہ ہے ڈارلنگ" اس نے خود ہی تو آشا کو سمجھایا تھا "ڈیڈی اس سفر پر مجھے بھیج رہے ہیں تاکہ میں دنیا کے سب بڑے بڑے ہوٹلوں کے انتظام کا اچھی طرح سے معائنہ کرسکوں جیسے طور طریقوں کو اپنے ہوٹلوں میں رائج کرسکوں۔ ان سب ہوٹلوں کے مالک میرے ڈیڈی کے دوست ہیں۔ ہندوستان میں جا کر تعلیم وہ چکے ہیں۔ اس لیے ان میں سے ہر ایک نے بڑے اصرار سے ہمیں مدعو کیا ہے اور چونکہ ہر جگہ میرے ساتھ ہنی مون سوئٹ ریزرو کیا گیا ہے اس لیے ڈیڈی نے کہا تم جاؤ تو اپنے ساتھ اپنی کسی ڈارلنگ کو لے جاؤ سو ڈارلنگ ہندوستان واپس آ کر ہماری شادی ہو گی۔ کیا ہی اچھا ہو کہ ساری دنیا کا دورہ کر کے ہنی مون منا لیا جائے اور پھر شادی ہوگئی" لہجے میں اس نے کہا تھا۔

AINT THAT GONNA BE WONDERFUL, SWEETIE-PIE?

اور جونی کا وہ بچگانہ لہجہ یاد کر کے آشا مسکرا دی۔

ہوائی جہاز میں تقریباً مکمل اندھیرا تھا۔ زیادہ تر مسافر سو رہے تھے۔ سامنے کی سیٹ پر ایک مرہٹے تاجر سیٹھ صاحب بڑے زور سے خراٹے لے رہے تھے جن کی آواز ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ پر بھی حاوی تھی۔ ان کے برابر میں سیٹھانی بچے کو گود میں لیے سو رہی تھی۔ راستے کی دوسری طرف ایک اینگلو انڈین جوڑا ایک ہی کمبل تانے سو رہا تھا۔ ان سے اگلی سیٹ پر ایک کھدر پوش منسٹر اپنی سیٹ کے اوپر لگی ہوئی ننھی سی ریڈنگ لائٹ جلائے ایک امریکن جاسوسی ناول پڑھ رہے تھے۔ ان کے برابر میں شارک اسکن کا سوٹ پہنے ایک سندھی بیوپاری تھا جو منسٹر صاحب سے کانا پھوسی کرتے کرتے سو گیا تھا۔

آشا نے سوچا یہ نائٹ ایئرسروس کا سفر بھی کتنا دلچسپ اور کتنا عجیب ہوتا ہے اور اس اندھیرے ہوائی جہاز میں جو اپنی مستقل رفتار سے اندھیرے کے سمندر میں تیرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اس کو ایسے ہی ایسا محسوس ہوا کہ وہ صرف تین گھنٹے پہلے دہلی کے پالم ایئرپورٹ سے نہیں روانہ ہوئی ہے بلکہ جیسے ہمیشہ سے اس نائٹ ایئر سروس میں سفر کر رہی ہے اور یہ زندگی کا ہوائی جہاز ہمیشہ یونہی اسی لاانتہا فضا میں اڑتا رہے گا۔ چلتا رہے گا کیونکہ وقت کے اس سمندر کا کوئی کنارہ نہیں۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ اور یہ تمام مسافر یہ ساری دنیا ایک گہرے سناٹے میں ڈوب جائیں گے اور کائنات کے نظام میں اتنا فرق بھی نہیں پڑے گا جتنا کروڑوں ستاروں میں سے ایک ستارہ ٹوٹ جانے سے پڑتا ہے۔

اور اسی لمحے میں یکایک ہوائی جہاز کی ساری روشنیاں جل اٹھیں اور کچھ لوگ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے مگر وہ اینگلو انڈین جوڑا اسی طرح کمبل میں لپٹا لیٹا رہا اور سیٹھ جی بدستور خراٹے لیتے رہے۔ آشا نے دیکھا کہ سیٹھانی بچے کو دودھ پلاتے پلاتے سو گئی تھیں اور بچہ ابھی تک ماں کی چھاتی سے چپٹا ہوا تھا۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ کھدر پوش منسٹر صاحب نے روشنی ہوتے ہی وہ امریکی جاسوسی ناول جس کے اوپر ایک نقاب پوش پستول باز اور ایک نیم برہنہ عورت کی تصویر بنی ہوئی تھی، بند کر کے جلدی سے اپنے کھدر کے تھیلے میں ڈال دیا جس کے دونوں طرف مہاتما گاندھی کی تصویر چھپی ہوئی تھی اور اس میں سے پنج سالہ پلان کے بارے میں ایک سرکاری رپورٹ نکال کر ہاتھ میں سنبھال

کلکتہ سے [illegible] جب [illegible] تو [illegible] آئے [illegible] کی [illegible] میں [illegible]
[illegible] سے [illegible] ہوائی اڈے [illegible] نکال [illegible] اور [illegible] سے [illegible] کی [illegible]
کی [illegible] کے [illegible] کی طرف [illegible] سے [illegible] کر دیا۔

وہ [illegible] ہوائی [illegible] مسافروں [illegible] کا [illegible] سے [illegible] ہوا [illegible]
مستقل [illegible] ہوائی [illegible] ٹالیوربی کے ہوائی اڈے پر [illegible]:
ٹالیوربی!
ٹالیوربی!
ٹالیوربی!
ہوائی [illegible] جہاز [illegible] ٹالیوربی [illegible] ٹالیوربی [illegible] ٹالیوربی [illegible] ٹالیوربی [illegible]
[illegible] سے [illegible] ہوائی اڈے [illegible] سے [illegible]
[illegible] کی [illegible] کے تمام [illegible] کی [illegible] ایک [illegible]
سے [illegible] ایک [illegible] ——— ٹالیوربی، ٹالیوربی، ٹالیوربی۔
اور وہ ہوائی جہاز سامنے [illegible] کی طرف جا رہا تھا۔

وہ اب بھی ہوائی جہاز میں بیٹھی ہوئی تھی
وہ ہوائی جہاز اب بھی ٹالیوربی کے ہوائی اڈے پر تیار تھا۔
مگر وقت اور تھا، دنیا اور تھی، وہ خود بھی کچھ اور تھی۔
وہ اس دن کتنی خوش تھی، جب [illegible] کی اطلاع [illegible] اس کی [illegible] اور پھر خوبصورت بھی ہو تو بلا وجہ بھی خوش ہو سکتی ہے مگر اس دن خوش ہونے کی کتنی ہی وجوہات تھیں۔ اس دن اس کا [illegible] کا نتیجہ بھی نکلا تھا اور وہ پاس ہو گئی تھی۔ اس [illegible] سے [illegible] کا [illegible] ملا تھا۔ [illegible] کے لیے اس نے [illegible] کے لیے وہ پہلے [illegible] ہے۔ نیویارک کے لیے [illegible] سے۔ سرکاری خط حسب معمول دیر سے ملا تھا۔ انٹرویو اگلے دن صبح کے گیارہ بجے تھا اور وقت پر پہنچنے کی صرف ایک صورت تھی کہ ناٹ ایرمیل سے روانہ ہو جائے۔ [illegible] کے [illegible] سے [illegible] ایرپورٹ آتے آتے چلتے چلتے ماں نے ہدایت کی تھی کہ دیکھو رستے میں کوئی انجان آدمی بات چیت کرنے کی کوشش کرے تو اسے جواب نہ دینا ایسے آدمی بڑے خطرناک ہوتے ہیں اور دیکھو میں نے [illegible] کو تار دے دیا ہے۔ وہ تمہیں لینے [illegible] آجائیں گی یا اپنے کسی نوکر کو بھیجیں گی۔ جب ناٹ ایرمیل کے سب مسافر اکٹھے ہو گئے تو آمنا کی ماں نے ایک معمر خاتون سے بیٹی کا تعارف کرا کے کہا یہ [illegible] میری بچی پہلی بار ہوائی جہاز میں بیٹھ رہی ہے کرپا کر کے اس کا خیال رکھئے گا۔ [illegible] کو جھنجھلاہٹ بھی ہوئی کہ ماں مجھے کیا بالکل دودھ پیتی بچی سمجھتی ہیں۔ مگر پھر سفر کے خوش آئند خیال سے وہ مسکرا دی اور بولی "ماں تم بالکل

نہ گھبراؤ میں ایک سیکنڈ کے لیے بھی مسز نارائن کا پلو نہیں چھوڑوں گی۔"

مسز نارائن کافی مشہور سوشل ورکر تھیں اور مختلف کانفرنسوں میں شرکت کے لیے اکثر ہی ہوائی جہاز سے سفر کیا کرتی تھیں۔ انھوں نے آشا کو ہدایت کی کہ سیٹ نیچے جھکا کر وہ بھی اسی طرح کمبل اوڑھ کر لیٹ رہے اور خود بھی سیٹ میں دھنس کر دوسرے مسافروں کی طرح وہ تو سو گئیں مگر آشا محض سوچتی رہی کہ کرسی اگر گدے دار آرام کرسی ہو تو اس پر کیسے سویا جا سکتا ہے اپنے بدن کو ہر طرف سے موڑ توڑ کر اس نے سونے کی کوشش کی مگر جب کامیاب نہیں ہوئی تو وہ بیٹھی بیٹھی ایئر ہوسٹس کو کام کرتے ہوئے دیکھتی رہی جو مسافروں کو گولیاں، کان بند کرنے کے لیے روئی، سر کے نیچے رکھنے کے لیے تکیے، اوڑھنے کے لیے کمبل اور اطمینان قلب کے لیے اپنی خفیف مسکراہٹیں تقسیم کر رہی تھی۔ پھر روشنیاں گل کر دی گئیں اور نہ جانے کتنی دیر آشا وہیں اور وہ بھی بے مستقل اندھیرے میں جھانکتی رہی جس کے آسمان پر دور بہت دور ستارے جھلملا رہے تھے لیکن ابھی تک اسے یہ نہ معلوم تھا کہ ان میں اس کی قسمت کا ستارہ کون سا ہے۔

اور پھر ہوائی جہاز نیچے اترنا شروع ہوا اور روشنیاں جل اٹھیں اور ایئر ہوسٹس نے اعلان کیا کہ وہاں ایک گھنٹے کے لیے ناگپور کے ہوائی اڈے پر رکے گا۔

اس نے مسز نارائن سے کہا "مگر میں تو سمجھتی تھی کہ یہ ہوائی جہاز سیدھا دلی جائے گا؟"

"جائے گا مگر ایک گھنٹے کے بعد۔"

"اور ایک گھنٹے تک ہم کیا کریں گے؟"

"تم ایئرپورٹ کے ریستوران میں جاؤ وہاں ایئرلائنس کی طرف سے کچھ ناشتہ اور کھانے پینے کو ملے گا۔"

"جی اور آپ؟"

"جی میں تو ناگپور ہی تک آئی ہوں ہماری کانفرنس یہیں ہو رہی ہے۔"

جب تقریباً سب مسافر اتر گئے تو آشا نے ایئر ہوسٹس سے کہا "اگر کوئی حرج نہ ہو تو میں یہیں ٹھہری رہوں؟"

"نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ وہاں رہ ہی نہیں جائے گا کلکتے جائے گا ادھر سب مسافروں اور سامان کا ادلا بدلی ہوتا ہے۔ تم کو نہیں معلوم؟"

اور پھر اس نے آشا کو بتایا کہ پانچ پانچ منٹ کے وقفے سے چار ہوائی جہاز ناگپور پہنچتے ہیں ایک دلی سے۔ ایک بمبئی سے ایک کلکتہ اور ایک مدراس سے اور سب جگہ کے مسافر یہاں جمع ہوتے ہیں اور پھر جس کو جہاں جہاں جانا ہوتا ہے وہاں جانے والے ہوائی جہاز میں چلا جاتا ہے۔

"مگر یہ سب ناگپور میں کیوں ہوتا ہے؟"

"اس لیے کہ ناگپور ہندوستان کے بیچ میں ہے۔" ایئر ہوسٹس نے ہنس کر آشا کو باہر نکالتے ہوئے کہا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ناگپور کے سنگترے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ جاؤ ریستوران میں آرنج جوس پیو فری۔"

"[illegible] چاہیے۔ [illegible] جوس [illegible] بہت [illegible] کے بہت سے ہیں"
"[illegible] جوس" [illegible] کی [illegible] کے لیے۔
"[illegible] صاحب [illegible]"
"[illegible] کے [illegible] ہے [illegible] جوس"
"[illegible] [illegible] قسم کے [illegible] کی [illegible] بیچ [illegible] [illegible] [illegible] کرسی پر بیٹھ [illegible] [illegible] کے [illegible] اور [illegible] کرسی پر رکھ دیا۔

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] بھی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] سے پوچھا۔

[illegible] آپ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کیے گئے ہیں۔

[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اب [illegible] دہلی سے [illegible] [illegible] سے بھی [illegible]

آشا نے سوچا [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اور دو گلاس [illegible] کے [illegible] رکھ دیے

لیجئے۔ نوجوان نے آشا کی طرف ایک گلاس بڑھایا۔ "چکھ کر دیکھیے انگور کے شربت کا مزہ کیسا ہے۔"
آشا نے ایک گھونٹ لیا اور کہا "کھٹا ہے"
نوجوان نے بھی ایک گھونٹ لیا اور کہا "ہوں۔ کھٹا ہے"
آشا نے دوسرا گھونٹ لیا اور کہا "اب کھٹا بھی نہیں ہے"
نوجوان نے دوسرا گھونٹ لیا اور کہا "کھٹ میٹھا کہہ سکتے ہیں"
آشا نے تیسرا گھونٹ لے کر کہا "بلکہ خاصا میٹھا ہے"
نوجوان نے تیسرا گھونٹ اتنا لمبا لیا کہ گلاس خالی ہو گیا۔ پھر وہ بولا۔ "برف کی آمیزش [illegible] میں یہ مزہ کہاں۔ بڑا ایک گلاس اسی جوس کا لاؤ۔ کہو آپ بھی پئیں گی نا!"
"ٹھیک ہے۔ میرا مجھے بھی ایک گلاس اور دو"

جب بیرا نئے گلاس لایا تو نوجوان نے آشا کی طرف اپنا گلاس اٹھا کر کہا۔

"چیئرز"

"جی!" آشا نے پوچھا۔

"انگلستان میں جب دو دوست شراب پینے بیٹھتے ہیں تو اس طرح ایک دوسرے کا جام صحت پیتے ہیں۔"

آشا نے ڈر کر پوچھا "آپ شراب بھی پیتے ہیں؟"

"کبھی کبھی!" نوجوان نے جواب دیا۔ "اگر دوست مصر ہوں۔ لیکن آپ فکر نہ کریں۔ اس وقت میں وہسکی نہیں پی رہا۔ دوستوں کا جام صحت اورنج جوس سے بھی پیا جا سکتا ہے۔ سو چیئرز!"

"دوست!" آشا نے اپنا گلاس حیرت سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا کہ وہ ماں کی ہدایت کے خلاف کیوں اس نوجوان سے بے تکلف ایسی باتیں کر رہی ہے کہ وہ اتنا بے تکلف ہوا جا رہا ہے۔

"چیئرز!"

"چیئرز!"

نوجوان نے اپنا جوس کا گلاس آشا کے گلاس سے ٹکرانے کے بعد ہونٹوں سے لگایا اور غٹ غٹ کر کے ایک سانس میں پی گیا پھر اس نے خالی گلاس کو میز پر الٹا کر رکھ دیا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ میں آپ کی صحت اور مسرت کا خواہش مند ہوں۔"

آشا کو ایسا لگا جیسے اسے چیلنج کیا جا رہا ہے سو اس نے بھی گلاس اٹھایا اور ہمت کر کے ایک سانس میں پینے لگی۔ فوراً بہر کے سنگتروں کا ٹھنڈا کھٹ میٹھا رس اس کے گلے کو گدگداتا ہوا اس کی رگوں کے جوان خون میں سرایت کر گیا اور گلاس کو میز پر الٹا رکھتے ہوئے نہ جانے کیوں اس کے منہ سے نکلا "ایسے ایسے تو میں ایک سو گلاس پی سکتی ہوں!"

سب مسافروں کے ساتھ اندھیرے لاؤنج میں بیٹھے وہ ٹیلی ویژن پر بھی کشمیر کی بہار دیکھ رہے تھے۔ یہ رنگین ڈاکومنٹری فلم بہت ہی حسین تھی اور ماں جیسی مناظر کو دیکھ کر آشا سوچ رہی تھی کہ کاش وہ بھی ایک دن کشمیر پہنچ جائے گی......

"دہلی جانے والا ہوائی جہاز تیار ہے کرپا کر کے دہلی جانے والے یاتری......"

ایئرپورٹ لاؤڈ سپیکر کی آواز لاؤڈ سپیکر پر گونجی نوجوان نے نہ صرف اپنے دو ایئر بیگ اور موٹا ڈفل بیگ شیفر لو اور کیمرہ بلکہ آشا کا ایئر بیگ اور مٹھائی کی ٹوکری جو وہ مسز ریاسو امی کے لیے لے جا رہی تھی۔ سب سامان اپنے کاندھے پر لادا اور دوسرے سب مسافروں کے ساتھ وہ دہلی والے جہاز کی طرف چل پڑے۔

راستے میں آشا نے کہا "لائیے یہ ٹوکری میں لے لوں آپ کے پاس پہلے ہی بہت بوجھ ہے۔ میرا سامان آپ کیوں ڈھوتے ہیں؟"

اور نوجوان نے جواب دیا "اس لیے کہ مجھے بوجھ اٹھانے کی عادت ہے۔ اور اس کے علاوہ مجھے بعض لوگوں کا سامان ڈھونے میں مزا بھی آتا ہے!"

جا کر وہ برکی بیٹھ گئیں۔
بیگم شمس نے اطمینان کی سانس لی اور بیٹھ گئیں۔
آمنہ نے نوجوان سے کہا "آپ ذرا دوسری طرف کھسک جائیں تو یہ بیچاری بھی ذرا جگہ پا سکیں۔"
وہ سامنے والی سیٹ پر سمٹ کر بیٹھ گیا اور جب وہ کسی قدر پرسکون ہو گئیں تو اس نے پوچھا۔
"کہیں دور جا رہی ہیں؟"
"کیمبل پور۔" آمنہ نے جواب دیا۔
"آپ وہیں کی ہیں یا ابھی ہندوستان سے آئی ہیں۔"
"پڑھتی تو نہیں ہوں مگر اس وقت وہاں سے آ رہی ہوں۔ ہم لوگ کیمبل پور میں رہتے ہیں۔"
"تو ہندوستانی کہاں سے ہیں؟"
"میرے بابا سکھ خاندان کی ... سے ہیں پہلے کیمبل پور ہی میں رہتے تھے۔ پھر لاہور میں رہنے لگے تھے۔"
"اور اس کے بعد؟"
"بی اے میں سیکنڈ ڈویژن یونیورسٹی سے کیا ہے۔ میرے بابا اب وہاں رہتے ہیں۔ میری بہن اسکول میں پڑھاتی ہے جس سے گزارہ ہو جاتا ہے۔"
اب ہوائی جہاز ہوا میں تھا۔ بیگم شمس نے دونوں کو تکنے اور ... مسافروں کو چائے ... دینے لگی۔
آمنہ نے دیکھا کہ اس نوجوان سے باتیں کرنا اچھا لگتا تھا اس نے بتایا کہ اس نے بی اے انگریزی سے کر کے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا ہے اس کے بابا اسے آگے پڑھنے کے لیے ولایت بھیجنا چاہتے ہیں لیکن بہن اور ماں کو تنخواہ ملتی ہے اس میں گھر کا خرچ بھی مشکل سے پورا ہوتا ہے۔ ہاں اگر اسکالرشپ مل جائے تو وہ جا سکتی ہے۔
"اسکالرشپ تو آپ کو نہیں ملے گا۔"
"کیوں؟"
"اس لیے کہ ہم نہیں چاہتے۔"
"آپ نہیں چاہتے کہ میں آگے پڑھوں، گورنمنٹ کے خرچ پر انگلستان ہو آؤں۔ مگر وجہ؟"
"ہے ایک وجہ۔ مگر پرائیویٹ۔"
"آپ بہت مذاق کرتے ہیں۔ آپ کو تو انجینئر کے بجائے ایکٹر ہونا چاہیے تھا۔"
"سچ؟"
"ہاں اور کیا؟" اب وہ بھی مذاق پر اتر آئی تھی۔ "صورت شکل بھی خاصی ہے آپ کی۔"
وہ ہنسنے لگا۔

آشا بولی: "آپ رہنے والے کہاں کے ہیں؟"

"پیدا ہوا تھا میں وہیں۔ مگر اب ہم لوگ دہلی میں رہتے ہیں۔"

"اب آپ کو جالندھر ڈیم جانا پڑے گا۔ کیوں؟"

"ہاں اور کیا۔ وہاں کام کرنے کے لئے ہی تو گورنمنٹ نے دو برس ولایت میں ٹریننگ دلائی ہے۔ ڈیم کے ساتھ جو بجلی گھر بن رہا ہے اس میں کام کروں گا۔"

"وہاں جنگل میں آپ رہیں گے۔ آپ کا جی نہیں گھبرائے گا؟"

"شاید گھبرائے گا۔ پھر ضرورت پڑی تو دل بہلانے کا کوئی انتظام کیا جائے گا۔"

"آپ کی مسز بھی آپ کے ساتھ جائیں گی؟"

"میری شادی نہیں ہوئی۔"

"اوہ!" ... اور دفعتاً آشا یہ سوال کر کے جھینپ گئی اور چپ ہو گئی۔ نئے مسافر نے ایئر ہوسٹس سے روشنیاں گل کرنا شروع کر دیں اور نوجوان نے کہا "اچھا جی اب سونا چاہئے گڈ نائٹ۔" یہ کہہ کر اس نے سیٹ کے سرہانے اور کمبل اوڑھ کر دراز ہو گیا۔ تھوڑی دیر ہی میں سارے ہوائی جہاز میں سناٹا چھا گیا۔ خراٹوں کی ملی جلی آوازیں آنے لگیں۔

آشا نے اندھیرے میں اپنے برابر کی سیٹ سے کہا "یہ تو بتایئے کہ آپ کا نام کیا ہے؟"

مگر نوجوان نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سو چکا تھا۔ اور آرام سے لیٹا سوتا رہا جب تک ایئر ہوسٹس نے دہلی پہنچنے کا اعلان نہ کر دیا۔

"دیکھئے آپ یہاں ٹھہریئے۔" پالم پر اتر کر نوجوان نے آشا کی چیزیں اسے دیتے ہوئے کہا۔ "میں گھر والوں کو ٹیلیفون کروں کوئی نظر نہیں آ رہا ہے۔"

لیکن وہ ... فون کی طرف چلا ہی تھا کہ دفعتاً اس کے پورے خاندان نے اسے گھیر لیا اور دور سے اس ملاپ کو دیکھتے ہوئے آشا کو اندازہ ہوا کہ جس نوجوان کی ہمراہی میں وہ ناگپور سے یہاں آئی تھی وہ کس قسم کے خاندان سے تھا۔ اس کی ماں اور بہنیں جو جیتا جیتا گھر کر اس سے لپٹ رہی تھیں شلواروں میں ملبوس ہوئے تھیں باپ کے سر پر صافہ بندھی تھی۔ شریف سیدھے سادے متوسط درجہ کے لوگ معلوم ہوتے تھے۔ وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ نوجوان ضرور اپنے گھر والوں سے اس کا تعارف کرائے گا کہ اسے خود مسز راما سوامی کے گلے کا مقابلہ کرنا پڑا۔

"تم آشا ہو۔ آشا شاستری۔" ایک موٹی بوڑھی سفید بالوں والی خاتون نے اپنے موٹے موٹے شیشے کی عینک میں سے اسے گھورتے ہوئے پوچھا اور جیسے ہی آشا نے سر ہلا کر کہا "ہاں" کہ بڑی بی نے اسے گلے سے لپٹا لیا۔ "جیتی رہو بیٹی۔ میں تمہاری ماں کی بچپن کی سہیلی ہوں۔ ہم لوگ بنگلور میں ساتھ پل کر جانتے ہیں کیا دن تھے وہ بھی! مگر اب یہاں کھڑی کس کا انتظار کر رہی ہو؟ چلو موٹر باہر کھڑی ہے۔ ڈرائیور تمہارا سامان لے لے گا۔ ارے واہ تم تو اتنی لمبی ہو گئی ہو جیسے بانس۔ میں نے تو جب دیکھا تھا تو تم اتنی سی تھیں

[illegible]

[illegible]

[illegible]

میں ہوائی جہازوں میں پٹرول بھرنے کے منظر کو بے تحاشہ دیکھ رہا تھا جیسے چاندنی رات میں تاج محل کا نظارہ کر رہا ہو۔

[illegible] مجھے دیکھ کر کتنے [illegible]

دہلی پہنچ کر ایک ہفتہ ٹھہری۔ ہر شام کو کناٹ پلیس کے چکر لگائے۔ ہر روز [illegible] ٹی ہاؤس [illegible] پی۔ ہر دوپہر [illegible] (ALPS) میں آئس کریم [illegible] کھائی۔ رفیوجی مارکیٹ سے نہ جانے کتنی غیر ضروری چیزیں خرید ڈالیں۔ اتوار کے دن پکنک کرنے قطب تک گئی۔ ہر جگہ یہ امید لے کر گئی کہ شاید کہیں وہ کمبخت نظر آجائے۔ وہ جس کے سانولے چہرے پر مسکراتے ہوئے دانت ایسے کھلتے ہیں جیسے پھول۔ مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔

آخر کار وہ فضا کی آوازوں سے جو شاید مدراس جانے والے جہاز کا اعلان تھا ...... شانہ دوسرے مسافروں کے پیچھے اپنا ایئر بیگ تھامے آہستہ آہستہ چلتی رہی اور ہوائی جہاز کی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے من ہی من میں دعا کرتی رہی: "میں اس کو یہاں ناگپور کے ہوائی اڈے پر چھوڑ جاؤں گی جہاں اسے پایا تھا میں اسے بھول جاؤں گی، پھر اسے بھول جاؤں گی۔ ہم ملے......"
اور سب مسافر اپنی اپنی جگہ بیٹھ چکے تھے۔ صرف ایک سیٹ خالی تھی۔ ایئر ہوسٹس نے اس کی طرف اشارہ کیا اور شانہ وہاں بیٹھ کر سیٹ بیلٹ باندھنے لگی تب اس نے دیکھا کہ برابر والی سیٹ پر کوئی بیٹھا ہے، وہ اسے غور سے دیکھ رہا ہے جیسے شانہ کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو ... کر رہا ہو۔ شانہ نے دیکھا کہ ایک ادھیڑ عمر کا گورا چٹا ... آدمی ہے ... جو گول ... سوٹ پر ... کی چوڑی چکلی ٹائی لگائے ہوئے ہے جس پر ایک ننگی عورت کی تصویر بنی ہوئی ہے جسے دیکھ کر شانہ کو ایسی ابکائی آئی جیسے پہلے ایئر پورٹ ریسٹورنٹ میں سنگتروں کا رس پی کر آئی تھی۔ "آپ چاہیں تو ادھر کھڑکی والی سیٹ پر آجایئے۔" اس شخص نے اپنے ہاتھ میں پہنی ہوئی انگوٹھیوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ شانہ نے دیکھا ... دانت ... اور شاید شراب کی کثرت سے پیلے ہو گئے ہیں۔ اور گو اس نے تیز خوشبو والا سینٹ لگایا ہوا ہے پھر بھی اس کے بدن میں سے ... ہوئے سنگتروں کی بو پھوٹ رہی تھی۔

سو شانہ نے کہا "جی نہیں شکریہ میں ٹھیک ہوں۔" اور شانہ اسکی سوٹ والے سے ... انگریزی رسالے کا مطالعہ شروع کر دیا۔ شانہ نے دیکھا کہ میگزین کا نام ہے GAY NIGHTS اور سر ورق پر جو تصویر چھپی تھی اسے دیکھ کر اسے پھر ابکائی آگئی۔

مدراس کے ہوائی اڈے پر ... ... تھا کہ شانہ نے اپنے ... آنکھیں اپنے چہرے پر ... پھر ... تک وہ سوتا رہا تھا لیکن ایئر ہوسٹس کے اعلان کے بعد وہ اٹھ بیٹھا تھا اور اپنے پورٹ فولیو میں سے اس نے یوڈی کولون (EAU DE COLOGNE) کی بوتل نکالی تھی اور تقریباً چلو بھر خوشبو دار لوشن اپنے چہرے پر پھیر لیا تھا اور پھر اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے اس نے شانہ سے کہا "اس سے میں بالکل فریش ہو جاتا ہوں۔ لیجئے آپ بھی۔"
"جی نہیں شکریہ۔" شانہ اس قسم کے آدمی سے زیادہ بات نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن وہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔

"آپ مدراس ہی میں رہتی ہیں کیا؟"

"جی ہاں"

"تو وہاں کیا سیر کرنے گئی تھیں؟"

"جی نہیں ایک اسکالرشپ کے لیے انٹرویو تھا۔"

"خوب تو اسکالرشپ مل گیا؟"

"جی نہیں ملا"

"تو پھر اب کیا ارادہ ہے؟"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

گھر میں تنگی تھی اور تجھے نوکری کی ضرورت تھی۔ [illegible] بلدیو سے ملنے [illegible]
ہوٹل میں ریسپشنسٹ (RE[illegible]) کی نوکری دے دی۔ [illegible]
مہینے تک تو تیرے کام سے خوش ہو کر [illegible]
ہی چپ چاپ [illegible] بار بلدیو نے عادت سے مجبور ہو کر دست درازی کرنے کی کوشش کی تھی
سے کیا ہوتا ہے جتنے بھی [illegible] نوجوان لڑکیاں کام کرتی ہیں [illegible] وہ بار ہا ہی کوشش
کرتے ہی ہیں۔ اب یہ لڑکی کے کردار پر منحصر ہے کہ وہ اپنے آپ کو بچا لیتی ہے یا اپنی عزت کو برقرار رکھتی ہے۔ تو نے کبھی اپنے آپ
کو نہیں بیچا۔ اور کیونکہ تو نے دوسری چھچھوری اور آوارہ لڑکیوں کی طرح [illegible] اور چند ٹکوں کے عوض اپنے بدن کو فروخت
نہیں کیا تو وہ جو ہر لڑکی کو ایک کھلونا سمجھتا تھا۔ وہ بھی تیری عزت کرنے پر مجبور ہو گیا۔ متاثر ہو کے اس نے تیرا تبادلہ دلی میں اپنے ہیڈ آفس
میں کر دیا۔ RECEPTIONIST سے تو پرسنل سکریٹری ہو گئی۔ تجھے راج محل جیسے عالیشان ہوٹل میں رہنے کو کمرہ ملا۔ اپنے بزنس کے
معاملے کے لیے بلدیو سارے ملک کا دورہ کرتا اور ہر جگہ تو ساتھ ہوتی چاہے ہوائی جہاز ہو یا ایئر کنڈیشنڈ ٹرین [illegible] سو ہو گئی جس میں سے
پورے چار سو تو گھر بھیجتی رہی۔ تب ہی تو تیرے ماں باپ نے بھی اس نوکری کی مخالفت نہیں کی۔ تو نے اپنے میں بھی تو تبدیلی محسوس کی ہوگی
وہ دبلی پتلی سانولی سی سہمی چھوٹی سی لڑکی کہاں ہے جو دو برس پہلے ہوائی جہاز میں اکیلے سفر کرتے گھبراتی تھی، آج تو ایک اسمارٹ فیشن ایبل
نوجوان کیریر وومن ہے۔ تیری تصویریں "السٹریٹڈ ویکلی" اور "کرنٹ" میں چھپتی ہیں۔ بلدیو کے ساتھ بڑے بڑے گھروں میں تجھے ڈنر اور
پارٹیوں میں عزت دی جاتی ہے۔ مانا کہ لوگ تیرے اور بلدیو کے بارے میں سیکنڈل کی باتیں بھی کرتے ہیں۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔
تجھے معلوم ہے کہ تو نے کوئی پاپ نہیں کیا ہے .... بلکہ
اپنے اثر سے بلدیو کو بہت سی پرانی عادتوں سے بچایا ہے۔ اب اس نے شراب پینی کم کر دی ہے۔ پچاس سگریٹوں کے بجائے صرف

میں سگریٹ روزانہ پیتا ہے۔ اب ہر مجبوری کے پیچھے وہ نہیں جاتا۔ جو کھیلنا بھی کم کر دیا ہے۔ تب بھی وہ خود راستے چلتے ہوئے بھی شکار کرتا پھرتا ہے کرتے ہیں۔ جب سے تم بھی سکتے ہیں۔ جیسی آشا نے تو بلدیو کی زندگی ہی بدل دی ہے" اور اب کہ جب بدیسی آشا کو اپنے ساتھ سادھو سادہ پہنا کے سفر پر بھیجنے کو کہا ہے تو ظاہر ہے کہ ماں نے سادھو نے بیٹے کو شادی کی اجازت بھی دے دی ہو گی۔

ایک بار پھر وہی ناگپور ایرپورٹ۔ مگر اب وہ پہلے سے زیادہ شاندار بن گئی تھی۔ مگر ابھی صرف ایک ہی ہوائی جہاز آیا تھا اس لیے زیادہ گہما گہمی نہیں تھی۔

پھر وہی ایرپورٹ ریستوراں۔

پھر وہی بوڑھا بیرا۔

پھر وہی سوال "میڈم چائے یا آرنج جوس؟"

بلدیو نے کہا "آرنج جوس دونوں کے لیے۔"

آشا نے کہا "نہیں میں چائے پیوں گی۔"

بلدیو نے اصرار کیا "چائے تو کوئی وقت بھی پی لینا۔ سنگترے کا رس پیو۔ تمہیں نہیں معلوم ناگپور کے سنگترے سارے ہندوستان میں مشہور ہیں"

"معلوم ہے" آشا نے کہا۔ اور اس نے سوچا اب میں انہیں کیسے بتاؤں بلدیو کہ سنگترے کے رس میں میرے لیے کتنی یادوں کا زہر گھلا ہوا ہے۔

اتنے میں بیرے نے دو بھرے ہوئے گلاس سامنے لا کر رکھ دیئے۔

بلدیو نے گلاس اٹھایا اور ایک گھونٹ لے کر کہا۔ "واہ واہ کتنا میٹھا ہے۔ میں سوچتا ہوں اپنے ہر ہوٹل کے لیے ہوائی جہاز سے ناگپور کے سنگترے منگوایا کروں تاکہ یہ فریش آرنج جوس ہمارے ہر کسٹمر (CUSTOMER) کو صبح ناشتے پر مل سکے۔ اسے پیو نا — پیو تو آشا۔"

آشا نے گلاس اٹھایا اور ایک گھونٹ لیا۔ رس نہ صرف کھٹا تھا بلکہ اس میں ایک عجیب قسم کی کڑواہٹ تھی۔ جیسے نیم کے پتوں کا عرق گھلا ہوا ہو۔ اور ایک کسیلا پن تھا جیسا سڑی ہوئی ترکاری میں ہوتا ہے اور ایک عجیب قسم کی بدبو تھی جیسے پھوڑے میں سے رستی ہوئی پیپ میں ہوتی ہے۔ ابکائی آئی اور اسے متلی ہونے لگی۔

اس نے بیرے سے کہا "اسے لے جاؤ، مجھے نہیں چاہیئے۔"

"تو چائے لاؤں" بیرے نے پوچھا۔

"نہیں۔ صرف سادہ پانی"

اتنے میں کسی دوسرے جہاز کے مسافر آنے شروع ہو گئے اور ریستوراں میں بھیڑ ہو گئی۔

"چلو آشا" بلدیو نے کہا "پورا گھنٹہ گزارنا ہے اور یہاں تو بھیڑ بڑھتی ہی جائے گی۔ سینما ہی دیکھیں۔ وہ پہلا نارنگین ٹیلی کو منظری

[illegible] کشمیر کی بہار "

کشمیر کی بہار ——— کشمیر کی بہار

[illegible] میں جب [illegible] سر پر [illegible] کشتیاں [illegible] [illegible]

بہت ہے۔

" چلو تم چلو میں ابھی آتی ہوں "

وہ [illegible] مسکرا [illegible] [illegible] سے [illegible] ۔

" [illegible] ہاں تو ! "

وہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ۔ [illegible]

" [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ۔ [illegible]

[illegible] ۔ ۔ ۔

وہ [illegible] [illegible] [illegible] "

" [illegible] [illegible] ! "

وہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] سے ہاتھ [illegible] کرتا پڑا ۔

" [illegible] [illegible] [illegible] "

ایک [illegible] [illegible] ۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] ۔ ایک [illegible] چہرہ ۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ۔ [illegible]

دیکھو !

دیکھو !

دیکھو !

مگر نہیں آشا نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ اب بہت دیر ہو چکی ہے اب اس [illegible] کا خیال چھوڑ دو ۔ [illegible] [illegible]

کسی جنگل میں [illegible] جانا ہو گا ۔ تو کل پیرس جا رہی ہے ۔ پیرس اور لندن اور نیو یارک ۔ [illegible] [illegible] [illegible]

کیا واسطہ جس کا تو نام بھی نہیں جانتی ۔ تیری جگہ اس وقت خدیجہ کے پاس ہے ۔ جس نے تیرا [illegible] ۔ ہوائی جہاز کا ٹکٹ خرید لیا ہے ۔

اندھیرے [illegible] میں آخر کار اس نے بدریہ اور [illegible] کو ڈھونڈ ہی نکالا ۔ ان کے پیچھے ایک کرسی خالی تھی وہ پیچھے سے وہاں

بیٹھ گئی ۔

سینما کے پردے پر چنار کے سرخ پتے جھڑ رہے تھے اور کشمیری عورتوں کا ایک درد بھرا لوک گیت [illegible] رہا تھا ۔

بدریہ اور [illegible] کانا پھوسی کر رہے تھے ۔

"کیوں یار یہ لونڈیا تو نے اچھی پھانسی ہے؟ پچھلی دفعہ جب ملا تھا تو وہ بنگالن تھی تیرے پاس۔ مگر سنا ہے تو اس سے الگ ہو گیا ہے؟"

"بکواس! نہیں اسے چلتا کرنے کی فکر میں ہوں یار۔ مگر یہ زیادہ بکتی ہے۔ سو اسے دنیا دکھانے لے جا رہا ہوں۔"

"مگر لوگ کہتے ہیں تو اس سے شادی کر رہا ہے؟"

"پاگل ہو گیا ہے۔ تو تو جانتا ہی ہے اپنی زندگی کا اصول۔ کھانے کا، رہنے کا۔ جلنے کو میں رہا ہوں۔ ایسی تو نے جانے کتنی آئیں اور گئیں۔"

اور آج اس نے محسوس کر کے کتنا تعجب ہوا کہ یہ سن کر اس کے دل پر کوئی چوٹ نہیں لگی۔ بلکہ ایسا معلوم ہوا جیسے دفعتاً بہت سی زنجیریں جو اسے جکڑے ہوئے تھیں جسم سے ٹوٹ کر زمین پر گر پڑی ہیں۔

سنہ کے پردے پر دھندلے نظارے پھر جھلک آئے تھے۔ شالیمار کے فوارے۔ ڈل جھیل کی سطح پر شکاروں میں نوجوان جوڑے ہنستے کھلکھلاتے سیر کر رہے تھے۔ ایک کشتی والے کی بچی مسکرا رہی تھی۔ ... پانی ... ہاتھ ... کشمیر میں بہار آ گئی تھی۔

"..... لاسٹ کال فور مس شاستری ..... لاسٹ کال فور مس شاستری ......؟"

"بمبئی جانے والا ودیان اب اڑنے کے لیے بالکل تیار ہے۔" لاؤڈ اسپیکر کی آواز ایئرپورٹ کی سنسان بلڈنگ میں گونجتی رہی کیونکہ سب مسافر اپنے اپنے ہوائی جہازوں میں جا چکے تھے اور پھر ایک ایک کر کے وہ سب اڑ گئے۔

دلی جانے والا ہوائی جہاز۔

مدراس جانے والا ہوائی جہاز۔

کلکتے جانے والا ہوائی جہاز۔

بمبئی جانے والا ہوائی جہاز جس میں ایک سیٹ خالی تھی۔

اور جب سب جہاز اڑ گئے اور ایئرپورٹ کے وسیع میدان میں صرف سرخ اور نیلی اور سبز روشنیاں ٹمٹماتی ہوئی رہ گئیں۔ تو......

میدان کے ایک اندھیرے کونے میں دو مسافر کھڑے رہ گئے جو کہیں نہیں جا رہے تھے۔ جن کی منزل آ گئی تھی۔

"آج رات میں تمہیں بھیلائی لے جاؤں گا۔ پہلے تم دیکھ لو کس ماحول میں مجھے رہنا اور کام کرنا ہے۔ وہاں بڑے شہروں کی چہل پہل نہیں ہے۔ بس فولاد کا کارخانہ ہے اور اس میں کام کرنے والے ہیں......"

"اور تم ہو۔"

"ہاں میں ہوں مگر ساتھ میں گھر بھی ہے۔ کارخانے میں کام کرنے والے انجینئروں اور مزدوروں کے لیے مخصوص ہے۔ تنخواہ صرف چار سو روپے ماہوار ہے۔ دو کمروں کا مکان ہے۔"

"اور تم ہو۔"

"میری بیوی [illegible] ... [illegible]
[illegible] سامنے [illegible]:
"اور تم؟ ... [illegible]"
"میرا نام نرمل ہے۔ [illegible] ... [illegible]"

شوہر؟

"میرے شوہر بھی اگر نہیں پیتے ہیں [illegible]
[illegible] نہیں ہے گا۔"

"تو پھر اب؟"

"اب ہم کچھ پئیں گے۔"

"میرے پینے [illegible]
پوچھے بغیر [illegible] جانتے ہیں ... جوس؟"

"اورنج جوس" نرمل نے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب تو اورنج جوس پسند ہے۔ میں [illegible] تھا۔"

"تم واقعی؟" نرمل نے [illegible] گلاس بھر رہا تھا۔

نرمل نے گلاس بھر دیا۔

آشا نے گلاس اٹھایا۔

نرمل نے آشا کی آنکھوں میں دیکھا اور وہاں اسے اپنی صورت نظر آئی۔

آشا نے نرمل کی آنکھوں میں دیکھا اور وہاں اسے اپنی صورت نظر آئی۔

نرمل نے اپنا گلاس آشا کے گلاس سے ٹکرایا۔

"چیئرز"

"چیئرز"

"پیو آشا"

نرمل نے گلاس منہ سے لگایا، ایک گھونٹ لیا اور ہونٹ چاٹنے لگا۔

آشا نے گلاس منہ سے لگایا اور ایک لمحے کے لیے اس کی خوشبو ہی سونگھتی رہ گئی۔ تازہ رس بھرے ناگپور کے سنگترے کی خوشبو جو کسی سینٹ سے کم نہیں ہوتی۔ پھر اس نے بھی ایک گھونٹ لیا اور حیران رہ گئی۔
سنگترے کا عرق ٹھنڈا تھا۔ کھٹ مٹھا تھا۔ کھٹا جیسے بچپن میں توڑی ہوئی کچی کیریاں۔ جیسے چرائی ہوئی جامنیں، جیسے پہلی ملاقات۔
ایک عجیب و گداز کھٹاس جو مدتوں چٹخارہ دیتی رہتی ہے۔ اور ساتھ میں میٹھا بھی۔ رس بھری مٹھاس۔ جیسے کیوڑے میں بسی ہوئی گنڈیریوں میں

مٹھاس ہوتی ہے۔ جیسے دودھ پیتے بچوں کے ہونٹوں میں مٹھاس ہوتی ہے۔ جیسے جنت کے ثمروں میں مٹھاس ہوتی ہے۔

نرمل نے ایک لمبا گھونٹ لیا اور گلاس ختم کر دیا۔

آشا نے ایک لمبا گھونٹ لیا اور گلاس ختم کر دیا۔

بیرے نے کہا: "اور پئیں گے سرکار؟"

"ضرور۔" آشا نے کہا: "مجھے تو ایک گلاس اور چاہئے۔"

بیرے نے جگ سے انڈیل کر دو اور گلاس بھر کر ان کے سامنے رکھ دیئے اور اپنی بوڑھی آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے سوچتا رہا کہ یہ نئی عمر ہے۔ دو ہی سنگتروں کا رس جسے پی کر یہ لڑکی چند منٹ بیٹے تے کر چکی ہے اب گھنٹوں لیکر پی جائے گی۔

اور نرمل نے آشا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"ایک نہیں۔ ابھی تو تمہیں پورے ایک سو ایک گلاس پینے پڑیں گے۔"

تنہائی

مجنوں گورکھپوری

مکتوب: ... گورکھپور

۷-جولائی

۵ جون ۱۹۵۰ء

مکرمی سلام علیک

آپ کے خط ... [illegible] ... ہوں۔ حقیقت یہ ہے
حالات وہ ہیں ... [illegible]
کی ... [illegible] ... نقوش کی خدمت ... [illegible]
اب ... [illegible] ... آپ ... نہیں ... [illegible]
کیسے کیسے حالات اور کیسی کیسی ... [illegible] ... اس وقت بھی جس حالت سے گزر رہا
ہوں بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا بیان نہیں ہو سکتا۔ ... [illegible] ... بہتر رہے گا
لیکن ... [illegible] ... اب نہیں ... آپ اور نقوش یاد
آتے ہیں اور میں دونوں سے شرمندہ ہوتا رہا ہوں۔ اب معذرت کا وقت گزر گیا۔
میں آپ سے یہ نہیں کہوں گا کہ مجھے معاف کر دیجیے۔ ... [illegible]
اور تنہائی کے کچھ صفحات ... [illegible] ... بھیج رہا ہوں ... [illegible]
میں اشاعت ... [illegible]
... آئندہ دو ماہ ... آپ کو ... [illegible]
کم ... آپ کو یقین ... [illegible] ... تنہائی ... نقوش کی
خدمت میں پیش کروں گا ... [illegible] ... رسید سے مطلع کیجیے۔

آپ کا مخلص: مجنوں گورکھپوری

نہ مطبوعہ کے لیے ملاحظہ ہو نقوش ... [illegible] ... ۱۹۵۲ء

(۱۴)

ساجدہ شہر میں ایک دو روز رہ کر مجھ سے ملنے ضرور آئی تھی۔ وہ جس طرح اپنا معاملہ صاف صاف بتا دیتی تھی اس کی بنا پر میں دل سے قائل تھی کہ اس کی طبیعت اور کردار پر حیرت بھی تھی اور رشک بھی۔ میں کبھی کبھی سوچتی رہ جاتی تھی کہ ساجدہ کا کردار کس قدر بلند ہے۔ وہ قامت میں [illegible] رنگ روپ پر ناز کرنے والی عورتیں اس کے سامنے اپنے جسمانی حسن کا احساس دل پر لاتے ہوئے شرماتی تھیں۔ [illegible] بہت کم لوگ اس کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ جو مرد بھی ایک طرف اکثر مردوں [illegible] کے جیسے [illegible] نگاہ سے [illegible] میں ایسی سحر کر دینے والی کشش پائی تھی کہ وہ اس سے اور اس دل کی روشنی سے [illegible] جس محفل میں پہنچتی تھی چھا جاتی تھی۔ [illegible] خاندان کے [illegible] پہلوؤں کے [illegible] وہ بیسیوں کو ایک خوش باش شگفتہ مزاج اور بے پروا زندگی گزار رہی [illegible] عورت سمجھیں گے مگر مجھے پوچھئے تو [illegible] ایک طرف تو وہ [illegible] تھا جس کا ازدواجی زندگی کے مقصد [illegible] اور دوسری طرف عورت کی [illegible] وہ اپنے دل کی اندرونی تہوں میں [illegible] کی نہایت وسیع صلاحیت چھپائے ہوئے تھی جس کو وہ [illegible] رائگاں [illegible] نہیں تھی بلکہ [illegible] کا دوسرا حق دار بنتا تھا اسی پر صرف کرتی تھی۔ مجھ سے زیادہ ساجدہ کے اس پہلو سے شاید ہی کسی دوسرے نے دیکھا ہو۔

ساجدہ سے مجھے پرویز کے حرکات و سکنات اور اس کے حال کی مختصر خبر ملتی رہتی تھی مگر جو [illegible] بہت زندہ دلی اور اچھی رہنے میرے دل میں شبہ پیدا ہو چلا تھا کہ اس نے اگر مجھے دل سے بھلا نہیں دیا ہے تو کسی وجہ سے ذہنی فیصلہ کر رکھا ہے اور [illegible] نہیں مجھ سے میری زندگی کی [illegible] ہو۔ [illegible] اپنے [illegible] کا رونا بھی [illegible] ہر حال میں [illegible] ایک ملاقات میں نے ساجدہ سے کہا: "ساجدہ! مجھے کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ پرویز نے کسی مصلحت سے مجھے بھلا دیا ہے یا شاید اپنے [illegible] پیدا کی تھی وہ روز لوگوں ہی سے سست اور عارضی تھی یا وہ مجھے اس پر اعتبار نہ کرنا چاہتے تھے۔"

"نہیں نہیں" ساجدہ نے ایک ذرا سے توقف کے بعد جواب دیا۔ "تم نے شاید اپنی تمام عقل کے باوجود ان کو ٹھیک طور پر نہیں سمجھا۔ وہ عارضی اور وقتی جذبات اور جذبوں کے آدمی نہیں ہیں۔ ان کی زندگی عارضی مشاغل سے بنی ہوئی نہیں ہے۔ یہ وہ ہے کہ وہ ذاتی خوشی اور فکر کو تمام بندگانِ خدا کی زندگی کے تقاضوں کے مقابلے میں کچھ نہیں سمجھتے۔ وہ اپنی ذاتی زندگی کی ہر راحت اور ہر خوشی کو عام خلق کی فلاح و بہبود پر قربان کر دیتے ہیں اور اسی کو اپنی سب سے بڑی خوشی کا سامان سمجھتے ہیں۔۔۔"

"مگر ساجدہ تم کو معلوم نہیں کہ وہ میرے ساتھ کیسی سرد مہری برت رہے ہیں۔ نہ محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ مجھے کہنا نہ چاہیے مگر میں واقعی یہ سمجھنے لگی تھی کہ ان کی زندگی میں ایک خلا تھا جس کو میں نے پُر کر دیا ہے اور اس لیے قدرتاً مجھے امید ہو گئی تھی کہ وہ بھی مجھے چاہتے ہیں تاکہ میں بھی کہ اپنی زندگی میں کوئی اہم اور مستقل جگہ دیں گے لیکن شاید مجھے دھوکا ہوا۔ میں محبت کی ترسی ہوئی تھی اس لیے پرویز کی محبت کا دیوتا کہ کسان کی پہلی جنبش تنہا جان کی بہر کرہ کرتی تھی۔ میں ان کی محبت کو ایک آسمانی برکت سمجھے ہوئے تھی اور خیال تھا کہ یہ برکت ہم دونوں کو ان تمام روحانی اذیتوں سے بچا لے گی جن کے ہم شکار ہیں مگر اب تو یہ سب ایک خواب بے تعبیر ہے۔ جہاں تک تصور کر پاتی ہوں مجھے اپنی ساری زندگی خالی اور بے معنی معلوم ہوتی ہے۔ اب میں سوچتی ہوں کہ خیر آئندہ جو ہوگا سو ہوگا فی الحال میں رخصت لے کر بستی سے چلی جاؤں اور پھر یہاں واپس نہ آؤں۔ تم پرویز کی خیر خواہ کی حیثیت سے

[illegible]

[illegible]

[illegible] خود ثابت ہو سکتی ہے۔ بہرحال ان باتوں کو ذہن میں رکھو [illegible] کوشش کرو۔

شاہدہ ایک عورت کے مسائل پر [illegible] کی سیرت بیان کر رہی تھی اور میں وہ سب کچھ سن رہی تھی۔ مجھے [illegible] تمام عمر یا کسی کو کوئی الزام نہیں دیا جا سکتا۔ میں نے کہا: شاہدہ [illegible] زیادہ [illegible] کے ساتھ [illegible] ان کو دیکھا ہے اور ان کو پہچاننے کی کوشش کی ہے اور [illegible] تمہاری باتوں سے حرف بحرف اتفاق ہے مگر [illegible] ہے کہ سلجھنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ میں نے [illegible] مشکل کے حل کرنے میں مدد مانگی تھی اور [illegible] رکھ دیا مگر خدا کے لیے مجھے بتاؤ کہ میں کروں کیا۔

شاہدہ نے بڑے پیار اور بڑی انکساری کے ساتھ کہا: کشور! اس وقت میرا ذہن خود الجھن میں ہے میں کچھ نہیں کہہ سکتی [illegible] پھر کب تم سے ملیں گے۔ آج کل [illegible] ان کی ایک جھلک دیکھ پاتے ہیں [illegible]

لیکن آج میں نے قصد کر لیا ہے کہ حامی ہوں کہ پہلی ہی ملاقات میں ان کا دامن پکڑ لوں گی اور تصادم جو حال ہے وہ نہ جو کچھ سوچتی اور سمجھ کر تو پہلی ہو جاتی کہ
واضح اشارے ہی ہوں۔ سے بیان کروں گی مگر چلتے چلتے ایک بار پھر شاہدہ کو منظور بھائی رضی کے بڑے بھائی ہیں۔

(۱۵)

تیس دن گزر گئے جو لوگ شاہدہ خلاف معمول کچھ دن غائب رہی ہر روز شام کو میرے پاس آتی اور کہتی کہ
کی تا ادھر شامیں جو تمھارے ساتھ رہے گی۔

میں اس کتابچے کا جو مطالعہ کرنے لگی لیکن اس کے مشورے سے کچھ بھی کر نہ سکی۔ آج جب چائے سے ہم لوگ فارغ
ہو چکے تو میں نے کپکپاتے ہوئے یہ پوچھا: شاہدہ! تمہاری ملاقات کا جو وعدہ کیا تھا کیا ہوا؟

شاہدہ نے ایک حسرت ناک انداز کے ساتھ جواب دیا: میں جو وکالت نامے کی تیاری کر رہی تھی اس پر ابھی اختیار نہ کر سکی کہ
اس دوران میں شاہدہ نا [illegible] ایک بہت ناخوشگوار واقعہ پیش آگیا ہے جو مجھے تو ذیرِ تحریر کرنے کی ہمت نہیں [illegible]
نازک اور تکلیف دہ بن گیا ہے۔

"وہ کیا؟" میں نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔

شاہدہ نے کہا: کیا کہوں بڑا غضب ہوا۔ یہ غضب روز ہی ہوا کرتے ہیں لیکن ان میں کثیر مادہ پرویز اور شاہدہ ہیں یا تھے۔
تم کو یاد ہوگا کہ عبدالرزاق نے رضیہ پر کتنے ظلم ڈھائے ہیں لیکن سب سے بڑا ستم انھوں نے یہ کیا کہ رضیہ کو ایک منزلہ
ایک رات اپنے گھر میں بند کر دیا اور جس [illegible] لوگوں کی زبانوں پر یہی ہے لیکن منظر کے دو سال میں معلوم ہوا
کہ تم نے اپنی رپورٹ میں لکھ دیا ہے کہ رضیہ کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی گئی۔ منظور بھائی اس کے لیے تم کو مشکل ہی سے معاف کر پائیں گے
جس لہجے میں آج وہ تعجب سے اس معاملے کا تذکرہ کر رہے تھے اس سے پتا چلتا تھا کہ وہ بہت آزردہ اور دلگیر ہیں۔

میں کچھ دیر کے لیے تو سناٹے میں آگئی لیکن دھیرے دھیرے جب ساری روداد پر غور کیا تو پرویز اور اس کی جماعت کے خلاف
جس کی وہ نمائندگی کر رہے تھے یکایک غصے کا ایک سیلاب امڈ پڑا جس کی خود مجھے توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ میں غصہ کو [illegible]
اور شاہدہ کو تندی کے ساتھ جواب دیا: آج اپنے منظور بھائی سے کہہ دینا کہ میں اب اپنے گمان سے بہت اونچی ہستی پا رہی ہوں۔ یہ ٹھیک ہے
کہ عبدالرزاق کی بیوی میری سہیلیوں میں ہیں اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ ان کی بیوی نے ایک مرتبہ ڈاکٹری معائنے سے پہلے اس طرف اشارہ کیا تھا
لیکن میں نے صاف کہہ دیا تھا کہ میرا منصبی ضمیر گوارا نہیں کرتا کہ کسی کو بلا وجہ رسوا کروں یا واقعے کو توڑ مروڑ کر کسی عورت کی بابت کوئی غلط رپورٹ
لکھ دوں ——— اور میں نے وہی کیا جو عبدالرزاق کی بیوی سے کہا تھا اور پھر پرویز کس منہ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ میں نے صحیح رپورٹ لکھی یا غلط
ان کو کیا معلوم؟ انھوں نے تو ایک مرتبہ بھی آ کر اس کا ذکر مجھ سے نہیں کیا ورنہ ممکن تھا کہ میرا ایمان ان کے چلنے [illegible] پر جاتا اور میں غلط
رپورٹ لکھ دیتی۔ اب ان سے جا کر میرے پیغام کے طور پر کہہ دو کہ رضیہ کے ساتھ جس قسم کی زیادتی وہ سمجھتے ہیں نہیں ہوئی ہے اور اگر میرے
معائنے اور اس وقت تک کے وقفے کے اندر کسی دوسرے موقعے پر اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوئی ہے تو میری رپورٹ صحیح ثابت ہوگی۔
وہ جس سے چاہیں اس کا معائنہ کرا لیں۔ آخر میں ان سے یہ بھی کہہ دینا کہ جس نادار، مفلس و پامال طبقے کی وہ نمائندگی کر رہے ہیں اس کا ہر فرد

[illegible] سے کہ [illegible] میں [illegible]
[illegible] تھی [illegible] ہر [illegible] کہ [illegible]
[illegible] جس کے [illegible] ان کو [illegible] کر [illegible]
[illegible] خیالات [illegible] بات [illegible] کر [illegible]
[illegible] سے [illegible] حقیقت [illegible]

شاید [illegible] کے [illegible] سب [illegible] وقت [illegible] مجھے [illegible]
[illegible] کہ [illegible] سے [illegible]
[illegible] پہلے [illegible] کی [illegible] سے [illegible]
[illegible] کہ [illegible] ہے [illegible]

[illegible] احساس [illegible] ہو [illegible]
[illegible] جان [illegible] وقت [illegible] کہ [illegible] تھی [illegible]
[illegible] کو [illegible] سے [illegible] کے [illegible] کوئی طاقت [illegible]
[illegible] سکتی [illegible] دل [illegible]
شاید [illegible] چکی [illegible]

(۱۶)

چند روز سے کچھ اور بیمار ہو گئے اور پھر تو زندگی رفتار اور حالت سے ہی بالکل بے خبر رہی۔ اس دوران میں شاید ہی کبھی ہوش آتی۔ میں ایک شدید کرب و اذیت میں زندگی کی گھڑیاں گزار رہی تھی۔ ہر گھڑی ایسی طویل معلوم ہوتی تھی جیسے [illegible] حشر برپا [illegible] مجھے یہ ہونے لگا کہ باوجود اس کے کہ میں نے شاید کو گزشتہ حالات میں بڑے خلوص اور محبت کے ساتھ رخصت کیا تھا شاید وہ ابھی تک میری طرف سے دل میں کچھ کدورت لیے ہوئے ہے۔ میرا جی بے اختیار چاہتا تھا کہ تمام قاعدے قانون سے بے پرواہ ہو کر اٹھ کھڑی ہوں اور اس کے سینے پر سر رکھ کر کہیں چلی جاؤں جہاں [illegible] دماغی کلفتوں سے لمحہ بھر کے لیے پناہ مل جائے۔

عشق و محبت کی داستانوں سے دنیا کی تواریخ اور افسانے بھرے پڑے ہیں۔ میں جب کبھی کوئی کہانی [illegible] پڑھتی تھی تو مجھے اس کے اندر رموز و کنایات جو کچھ بھی مضمر ہوں لیکن میری سمجھ میں یہ نہ آتا تھا کہ اگر کسی ایک فریق کو دوسرے کی رفاقت نصیب نہ ہو تو ساری زندگی عذاب کیسے ہو جاتی ہے اور محبت کا انجام خودکشی اور موت پر کیوں ہوتا ہے۔ میں محبت کو زندگی کی ایک کھیل سمجھتی تھی اور اس محبت کی قائل نہ تھی جو ہر حال [illegible] اس کے کہ محبوب پاس ہے یا دور، انسان کے اندر ناامیدی نہ پیدا کرے مگر اب میرا اپنا تجربہ ہو رہا تھا کہ محبت [illegible] روگ بھی ہو سکتی ہے۔ محبت کو کوئی مرحلہ نہ ملے اور ساری زندگی محبت سے خالی رہ جائے تو محرومی ضرور ہے لیکن کوئی اذیت نہیں ہے مگر محبوب کو پا کر نہ پانا ایک ایسی مصیبت ہے جس سے بڑا عقوبت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ [illegible] یہی "دیار یار" میں رہ کر "یار" سے اس طرح

چند روز تک ایک نا قابلِ برداشت آزمائش تھی۔ شاہدہ نے بھی اب سکوت اختیار کر لیا تھا جو مجھے بخشی معلوم ہوتا تھا اور اب تو حبیب بھی جو مجھ پر ساری رحمتیں کی حالت میں وصلِ حبیب کے برابر ہوتا ہے بہت سے عذر سے باہر معلوم ہوتا تھا۔

آخر کار مجھ سے زیادہ صبر نہ ہو سکا۔ ایک سینچر کے دن میں اپنی وضع خود داری کو طاق پر رکھ دینے کے لیے مجبور ہو گئی۔ شاہدہ صاحبہ تو پہلے سے الگ ہو کر بھی میری دشمن تھی۔ مجھے یہ خیال ہو گیا تھا کہ زندگی میں شاہدہ کے سوا کوئی دوسری ہستی ایسی نہیں جو مجھ کو ساتھ لے کر چل سکے اور میری ساتھی بن سکے۔ میں اس کے خوف اور اس کی کشش دونوں کی قائل ہو چکی تھی۔ اسی احساس اور اسی احتیاط کی بنا پر میں نے اس کو ایک خط لکھا اور اس کے ساتھ پرویز کے نام بھی ایک مختصر سا خط معذرت کر دیا جس کو میری محبت کا تحفہ کہنا چاہیے:

پیاری شاہدہ!

میں تو شاید کچھ زیادہ مدت نہیں گزری ہو گی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ زمانہ سے بے جو اور پرویز کی بیعت لیتے ہوئے ایک زمانہ گزر چکا۔ معلوم نہیں تم اس کو کیا سمجھو گی۔ نہ جانے کیوں مجھے ہول سا ہو رہا ہے۔ میں بھی ہوش و حواس میں نہیں، دل مشتعل ہے مگر اب کس منہ سے یہ بات کروں۔ اب تو یہ بس مناسب مجھ سے زیادہ دل پر نقش معلوم ہوتا ہے اور پھر تم تو ہوشمندی اور سفر ایسے کی دلیل ہو۔ مجھے تو یہ شکایت کرنے کا حق نہیں ہے کہ اتنے دنوں سے نہ تم نے میری خبر لی اور نہ پرویز کی خیریت لکھی۔ بیان واقعہ اور اظہارِ حال کا حق شاہنشاہ سے سرکاری نامہ نگار کو حاصل ہے اور حال یہ ہے کہ زمین و آسمان اجنبی ہو رہے ہیں اور زندگی کی ایک ایک گھڑی قیامت کی طرح بتانا معلوم ہو رہی ہے۔ اگر مصلحت اجازت دے اور وقت نکال سکو تو کم سے کم مل جاؤ یا اپنی مجبوریوں کی تفصیل سے آگاہ کر دو تاکہ مجھے کسی کو تمہاری طرف سے کوئی بدگمانی نہ رہے۔ ایک رقعہ اسی خط کے ساتھ پرویز کے نام بھی بھیج رہی ہوں۔ ان سے جب اور جہاں ملاقات ہو دے دینا اور کیا لکھوں۔

تمہاری

کشور!"

اور پرویز کے نام رقعہ یہ تھا:۔

پرویز صاحب!

کسی قسم کی شکایت کرنے کا مجھے حق ہے کہ نہیں یہ اس کا فیصلہ آپ پر چھوڑتی ہوں لیکن حسرت کا ایک اردو شعر اور کسی فارسی شاعر کا ایک فارسی شعر سنائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اردو شعر یہ ہے ؎

سو طرح اس نے مجھے مجبور اگر رہنا ۔۔۔۔۔ نہ کہو: تجھے کتنے تو رو رو اگر رہنا

اور غالب کا یہ شعر شاید زیادہ حسب حال ہے

اگرچہ [illegible]

[illegible]

آپ کی بہن

کشور :

خط میں سے مصرعہ پڑھ [illegible] شاہدہ سے زبانی کہلوایا [illegible]
[illegible]
جواب نہیں آیا [illegible]
تھا۔ [illegible]
[illegible]
[illegible] جیسا جانتے ہو آؤں؟

میں نے لحاف میں منہ چھپائے ہوئے کہا: "ابھی سے آؤ!"

[illegible]
ہے جو اس طرح [illegible] ہوں۔ پہلے بھی میری زندگی [illegible]
زندگی خالی تھی اور اب اس امکان کی ایک جھلک مل گئی ہے کہ [illegible]
وہ ایک جھلک دکھا کر میری زندگی کی حدود سے باہر نکل گیا تھا اور میری محرومیوں کے احساس کو شدت کے ساتھ بیدار کر گیا تھا۔ میں جب بھی سوچا
سوچا کرتی تھی کہ اگر بستی چھوڑ کر چلی جاؤں تو اپنی زندگی کے ساتھی کے ساتھ [illegible]
کچھ دنوں سے یہ خیال مجھے بری طرح ستا رہا تھا کہ [illegible]
اور آج یہ خیال یقین کی صورت بن کر چھایا ہوا تھا۔

بیٹے کا شغل ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ اماں میرے کمرے میں چلی آئیں اور مجھے ایک لفافہ دے کر کہا کہ "بیگم صاحب کا خط آیا ہوا ہے اور جواب مانگ رہا ہے"

میں نے کہا: "تم جاؤ میں جواب لکھ رہی ہوں"

جلد جلدی میں نے لفافہ کھولا تو اس میں دو پرچے تھے۔ پہلا رقعہ شاہدہ کا تھا:

اچھی کشور!

مجھے تمہارے ساتھ اتنی محبت اور ایسی شدید ہمدردی ہے کہ میں تمہاری ہر بات اور ہر حرکت کو نہ صرف معاف کر سکتی ہوں بلکہ اس کی قدر کرتی ہوں۔ تمہارا خط جو نذیر کے نام کا ایک پرزہ تھا جس شائستگی اور ضبط کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ ایسی ہی شائستگی اور ضبط کو

تمہارے "سلیقہ" کیا ہے جس کے بغیر محبت میں نباہ نہیں ہو سکتا۔ میں تم سے ملنے کے لیے خود بھی بے چین تھی، اب بھی ہوں۔ لیکن میرے راستے میں بڑی رکاوٹ تھی۔ تین ہفتے سے ابو بیمار ہو گئے کہ ہسپتال لے جایا گیا ہے۔ اپنے مکان میں بیکار و تنہا پڑے ہوئے ہیں۔ ابو نے اور میں نے بہت چاہا کہ تمہارے پاس آ جائیں مگر انہوں نے قبول نہیں کیا۔ ڈاکٹر سیتا رام لال جو ان کے ڈاکٹر ہیں اور ان کے پرانے دوست ہیں اور جن کو میں کہا ہو را شہر "گھر کا سنت" سمجھتا ہے ان کا علاج کر رہے ہیں۔ صبح سے شام تک شدید بخار رہتا ہے۔ کسی وقت اترتا نہیں۔ ٹائیفائیڈ کے قسم کا مرض سمجھ کر علاج کیا ہے وہ یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ بے انتہا نزار اور نحیف ہو گئے ہیں۔ میں نے تم کو اطلاع بھیجنا چاہی تو انہوں نے منع کر دیا۔ آج تمہارا رقعہ پا کر مجھے اجازت دی ہے کہ میں تم کو حقیقتِ حال سے آگاہ کر دوں۔ ان کا میں ایک پرزہ جو ایک پوری داستان ہے ملفوف کر رہی ہوں۔ اگر تم کسی وقت آج میرے پاس آ سکو تو میں تم کو تمہارے پرویز کے پاس لے چلوں......

باقی ملاقات کے وقت ......

تمہاری معترف

شاہدہ!"

پرویز کا رقعہ یہ تھا:-

" ڈیر کشور!

تم نے دو اشعار میں اپنا حال بیان کیا ہے اور خوب بیان کیا ہے۔ میں بھی صرف دو اشعار تم کو سنانا چاہتا ہوں اور پھر فیصلہ تم پر چھوڑتا ہوں کہ مجھے کیا کہنا اور کیا نہ کہنا اور کیا کرو اور کیا نہ کرو۔

عجب دردیست دور از یار بودن
صبوری کردن و ناچار بودن

یہ شعر نامی کا ہے اور دوسرا شعر جو میری حالت کی نہایت اچھی ترجمانی کرتا ہے۔ یہ شعر خواجہ حسن دہلوی کا ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ امیر خسرو کے منظورِ نظر تھے۔

گفتی کہ چیست جدائی از من
این از فلک است از حسن نیست

[illegible]

رات، چور اور چاند

بلونت سنگھ

(مسلسل)

[illegible] جوبن پر تھا۔

خاص طور پر پنجاب جیسی جگہ میں یہ لوگ بڑی جلدی کھانے پینے سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ [illegible] کر کھیتوں میں کام کرنا ہوتا ہے۔ [illegible] اونچے پیڑوں پر چلتے چلتے رک جاتے تھے۔

[illegible] چاندنی رات [illegible] سے [illegible] وہ کھیتوں [illegible] ہو کر جانا [illegible] کہ [illegible] وہ ان پگڈنڈیوں سے [illegible] زیادہ واقف نہیں تھا۔ [illegible] سیدھے [illegible] راستے کو ترجیح دی۔

کچھ دور تک نہر کے کنارے کنارے چلنے کے بعد وہ [illegible] راستے پر [illegible] لوگ [illegible] دونوں کناروں [illegible] ہوئے تھے اور [illegible] جب [illegible] گزرنے [illegible] جاتا تھا۔ پیدل اور گھوڑ سوار [illegible] کنارے کنارے سفر کرتے تھے۔

پرتھی پال سنگھ نے [illegible] چاندنی رات میں دور دور تک کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ [illegible] دکھائی دے رہے تھے۔ کہیں کہیں کھیتوں میں کام کرتا ہوا کوئی آدمی یا کوئی سانڈنی سوار [illegible]۔ [illegible] خاموشی کا راج تھا۔ چاندنی راتوں کے کیا کہنے۔ بہت دور سے [illegible] کی اڑتی ہوئی صدائیں سنائی دے جاتی تھیں۔ سب سے نمایاں منظر [illegible] راستے کا تھا جس کے دونوں کناروں پر ایک دوسرے سے ملے ہوئے ببول اور شریں کے اونچے اونچے درخت [illegible] دور تک چلے گئے تھے۔ دور [illegible] سے دیکھنے والے کو معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی طویل [illegible] کا سینہ چیرتا ہوا [illegible] کی دھندلاہٹ میں گم ہو گیا ہو۔

پرتھی پال سنگھ [illegible] رنگ [illegible] بدن کا [illegible] انسان تھا۔ وہ [illegible] اس کی [illegible] بھی بہت [illegible] اس کے بدن میں وہ قوت اور کس بل نہیں تھا جس کی توقع کسی دیہاتی نوجوان سے کی جا سکتی ہے۔

طویل راستہ چند لمحوں کے لیے اس کی نگاہ کے سامنے رہا اور پھر اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ دس بجے تھے۔ وقت کچھ زیادہ

[illegible] سنسان ہو چکا تھا جیسے ... [illegible] ... [illegible]

[illegible] ... [illegible]

[illegible] تھے۔

وہ جیسے ٹھٹک سا سمٹ کر رہ گیا۔

[illegible] ... [illegible] ——— [illegible]

[illegible] ——— [illegible] ... [illegible]

[illegible] ... [illegible]

[illegible] ہو رہے تھے۔

کچھ دیر وہاں کھڑے رہنے کے بعد اس نے پھر قدم بڑھایا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی شخص اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ جو اس کے اپنے پاؤں کے علاوہ اس کے پیچھے قدموں کی چاپ بھی سنائی دے جاتی تھی۔ ... [illegible] ...

[illegible] ... پھر بھی ..... [illegible] ——— وہ پھر رک گیا۔ [illegible] ... [illegible] ہو گئی۔ آخر [illegible] ... [illegible] وہ اس راستے پر چلتا ہے اسی وقت سے ... [illegible] ... [illegible] ہی نہیں رہا ..... اس خیال کے آتے ہی ... [illegible] ... لیکن [illegible] ہو سکتا۔ وہ ... [illegible] ... [illegible] تھی۔

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ آخر کون ہو سکتا ہے۔ جو یوں پیچھے ——— لیکن اس وقت اس کی عجیب سی حالت ہو رہی تھی۔ کیا وہ خوفزدہ ہو گیا تھا ... [illegible] ... وہ ایک ... [illegible] ... آخر وہ بزدل ہے ... ویسے گھبرانے کا کیا نہیں تھا۔ ... [illegible] بالفرض ... [illegible] ... اس کے پیچھے پیچھے چلنے کی ضرورت ... [illegible] کیا ہے۔ وہ ... [illegible] ... اس کی کچھ میں نہیں آتا ... اب وہ ... [illegible] کھڑا تھا لیکن ... [illegible] ... آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ ... ہو سکتا ہے اس کے کان ہی بج رہے ہوں۔ کیونکہ دور دور تک خاموشی طاری تھی ......

ایک بار پھر وہ چل دیا لیکن پھر وہی بات۔ لیکن وہ رکا نہیں ..... پھر اجنبی آواز ...... اب پھر اجنبی آواز ...... معاملہ پھر رک گیا اور اس نے گھوم کر دیکھا۔ ایک ... [illegible] ... یقیناً یہ اس کا وہم نہیں تھا۔ وہ کوئی لڑکی یا کوئی بچہ نہیں تھا۔ یہ تو اس کی آنکھوں دیکھی بات تھی۔ ہو نہ ہو اس میں ضرور کوئی بھید ہے۔ ... [illegible] ... مگر اس معاملے کو اس قدر ... [illegible] ہی کیا تھی، اور وہ بھوت بھی نہیں تھا۔ اس میں ضرور کوئی بھید ہے۔

تاریکی میں ہلتے ہوئے دکھائی دینا بھی کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ وہ عجیب ذہنی کشمکش میں گرفتار ہو گیا۔ کئی قسم کے شکوک دل میں پیدا ہو گئے۔ اس نے اس سوال کے ہر پہلو پر غور کیا لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا شاید وہ سایہ دوبارہ دکھائی دے جائے۔ نہیں اب کچھ بھی نہیں دکھائی دیتا تھا لیکن کیسا عجیب قسم کا احساس تھا۔ ایک اجنبی جاندار چند قدم کے فاصلے پر کھڑا سانس لے رہا تھا۔

شاید وہ بھی نظروں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ شاید آسمان کی بے وقعتی کے سبب پر نظر کی جو روشنی چمک رہی تھی جس کے پاس ہی [illegible]
انسان کی آنکھیں کچل کر رہا ہے۔ آن کرب . . .

[illegible] سب کچھ اس کے ذہن پر اس کی یادداشت جتنی کچھ بھی ہو اس سے [illegible]
اس کو ہیں دیا کریں [illegible] وہاں اس کے وجود کے سوا کوئی شے نہیں ہے۔

[illegible] کرنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ قدم بقدم آگے بڑھنے لگا۔ [illegible] کان ادھر کر سنا وہ بہت قریب سے [illegible]
کی جانب [illegible] قدموں کی [illegible] جانب سنائی دینے لگی۔ [illegible] کی جانب آواز اور بھی زیادہ [illegible] لگنے کی
کوشش کی اور اب [illegible] صاف طور سے سنائی دینے لگی جیسے اس کا پیچھا کرنے والے [illegible] نہیں تھی۔ پھر [illegible] وہ
آواز اور بھی قریب [illegible] رفتہ رفتہ آواز [illegible] کے درمیان فاصلہ کم ہونے لگا۔ اس کا دل [illegible] دھک دھک
کرنے لگا۔ وہ حیران [illegible] کون ہو سکتا ہے جو اس کا پیچھا کر رہا ہے [illegible] کوئی [illegible] پر بساط
کرنے پر مجبور [illegible] نیچے سے پاؤں کی جانب کی آواز [illegible] بھی پیدا
ہو گئی۔ اب [illegible] نہیں [illegible] اس کا پیچھا کرنے والا بہت قریب آ گیا
گیا ...... [illegible] آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ راستے کے [illegible] زندگی کے ساتھ آگے
بڑھ رہا تھا۔ [illegible] پاؤں تلے کچلے جا رہے تھے اور ان کی آواز [illegible] کی آواز میں گھل مل کر عجیب قسم کے ادب و شور
میں تبدیل ہو چکی تھی [illegible] اس طرح آگے بڑھ رہا تھا جیسے کوئی جن اس کی گردن پیچھے
کر چلا آ رہا ہو۔ [illegible] اس کا تنفس دبا کر رہا۔

[illegible] سامنے دکھائی دے رہا تھا۔ اس کو
یاد آیا کہ [illegible] جہاں تک [illegible] کی سیر کرنے چلے آیا کرتے تھے۔

[illegible] پیچھے سے [illegible] کی آواز آئی لیکن اس نے پیچھے کی جانب
گھوم کر نہیں دیکھا۔ پھر جب وہ [illegible] دوسرے کنارے پر [illegible] پیچھے سے بھی اسی قسم کی آواز سنائی دی۔ سامنے [illegible] سا
پل دکھائی دینے لگا۔ وہ پوری قوت سے اس کی جانب دوڑ پڑا۔ اس قدر تیز [illegible] پیچھا [illegible] پل کے نیچے پانی کے [illegible] کی
[illegible] سانس لیتے ہوئے [illegible] پیچھے کی جانب دیکھا لیکن [illegible]
کوئی نہیں تھا۔ [illegible] کوئی نہیں تھا ...... لیکن اب وہ اپنے [illegible] نہیں [illegible] سکتا تھا کہ یہ سب کچھ اس کا وہم تھا بلکہ یہ حقیقت تھی
کہ اس کا [illegible] اور [illegible] سے تعاقب کیا گیا تھا لیکن وہ بال بال بچ گیا تھا۔ پیچھا کرنے والا کون شخص تھا اس کا پیچھا کرنے سے اس کی غرض
کیا تھی۔ کیا وہ اسے جان سے مار دینا چاہتا تھا یا اس وہم میں تھا کہ اس کی بغل میں نوٹوں کا پلندہ دبا ہوا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا [illegible]
کے سایوں کی تاریکی [illegible] کھلی فضا اور دور دور تک پھیلے ہوئے کھیت اور [illegible] ساکن [illegible] ہوئے تاحد نگاہ دکھائی دے
رہے تھے۔ اب خوف کی بھی کوئی بات نہیں تھی۔ [illegible] علاقہ تو تھا ہی [illegible] ہے کسی نے شرارت کرنے کے خیال سے اس کا پیچھا کیا ہو لیکن
اس پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہو سکی ہو۔

[illegible] ان کے علاوہ [illegible]
[illegible]
[illegible] بات نہیں کی۔
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
کہ اس کی [illegible]
وہاں کوئی بھی کھڑا نہ تھا۔
دھنا پتی پال سنگھ کے قدم رک گئے اور چند لمحوں کے بعد [illegible] ہو کر رہ گیا۔
[illegible]
بالکل [illegible]
[illegible]۔۔۔
پرتھی پال سنگھ نے جانے کیوں جس سانحہ کو اس کا پیچھا کرے وہ وہی شخص تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کے پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ وہ بزدل نہیں تھا لیکن اس پراسرار واقعہ کے باعث اس کے ہوش ٹھکانے نہیں رہے تھے۔
اس وقت پرتھی پال سنگھ نے پہلے تو یہ سوچا کہ پیچھا کرتے چلے جاؤں لیکن پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے اجنبی کہہ رہا ہو میاں! اتنی دیر سے تم میرا پیچھا کر رہے ہو اب آگے پیچھا کر کے کہاں جاؤ گے۔
وہ آہستہ آہستہ اجنبی کی جانب بڑھا۔ [illegible] رات میں وہ اتنی جرأت کر سکتا تھا حالانکہ اجنبی کا رویہ بہت مشکوک اور عجیب تھا۔ اسے تعجب ہو رہا تھا کہ آخر اس کا پیچھا کیوں کر رہا ہے۔ باوجود اس کے [illegible] اجنبی کی خاموشی اور بھی تعجب خیز تھی۔ [illegible] اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے اسے کہیں دیکھا ہے۔ کمال!
یہ نئی الجھن پیدا ہو گئی تھی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں پھوٹ پڑیں۔ اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے ہکلا کر کہا میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے؟
اجنبی چپ رہا۔
پرتھی پال سنگھ نہر کے کنارے پر پہنچ گیا۔ وہ حیرت سے اجنبی کے منہ کو تک رہا تھا۔ آخر وہ جواب کیوں نہیں دیتا اور جب وہ اس سے صرف آٹھ دس قدم کے فاصلے پر تھا تو دفعتاً اجنبی نے حرکت کی۔ اس کے دانت بجنے اور چیخ کی آواز کے ساتھ سڑک کی [illegible]

وہ اس کے قدموں پر آن گری ——— اور اس کے بعد پھر خاموشی۔

قدموں کی آہٹ سن کر پرتھی پال سنگھ اور آگے بڑھا کہ شاید وہ اس کی صورت پہچان سکے۔ وہ قد و قامت سے ٹھٹک گیا۔ وہ اس کی صورت سے واقف تھا لیکن وہ اسے اب بھی نہیں پہچان سکا۔

"میں پالا سنگھ ہوں۔"

پرتھی پال سنگھ کو بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ ابھی تک وہ یہ بات یاد نہ کر سکا کہ اس نے اسے کہاں دیکھا ہے لیکن نام پالا سنگھ تو اس نے سن رکھا تھا۔ وہ اس نام کے شخص کے اوصاف سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ شخص اچھے کیرکٹر کا آدمی نہیں ہے بلکہ بدمعاش ہے لیکن وہ اس کا پیچھا کیوں کر رہا تھا۔ آخر اسے اس کا کیا حق تھا لیکن شاید اس کا پیچھا کرنے والا کوئی اور ہو۔ یہ کیوں نہ وہ اس سے دریافت ہی کرے۔

"کیا تم ہی میرا پیچھا کر رہے تھے؟"

"ہاں!" برملا جواب ملا۔

پرتھی پال سنگھ کو کچھ غصہ بھی آیا اور کچھ تعجب بھی ہوا۔ اس نے پیشانی پر بل ڈال کر پوچھا "کیوں؟"

اس پر پالا سنگھ کا بھاری بھرکم ہاتھ ہوا میں اٹھا اور دائرہ نما بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پڑا اور پھر جب پرتھی پال لڑکھڑا کر گرا تو اسے احساس ہوا کہ اس کی گردن اور رخسار کی رگیں جل اٹھی ہیں اور ایک کان میں بھائیں بھائیں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ ایسا لگا جیسے ساری دنیا اس کی آنکھوں تلے سے کھسک گئی۔ اس کی کس کر بندھی ہوئی پگڑی بل کھاتی ہوئی پرے جا گری۔

پرتھی پال سنگھ کو بے حد طیش آیا۔ آنکھیں ابل پڑیں۔ آنکھ جھپکتے میں ربڑ کی طرح اچھلا اور چیتے کی سی تیزی کے ساتھ حملہ آور کی جانب بڑھا اور بڑی تندی سے جھپٹ پڑا۔

ان معاملات میں پالا سنگھ کا ہاتھ بہت صاف تھا۔ اس نے اندھا دھند آگے بڑھتے ہوئے دشمن کے پیٹ میں گھونسا رسید کیا۔ وہ ہچکی کی صدا کے ساتھ آگے کو جھک گیا۔ پھرتی سے بڑھ کر اس نے ٹھوڑی پر جھانپڑ رسید کیا تو پرتھی پال سنگھ تیورا کر جو گرا تو منہ کے بل پیشانی اور ناک کے بل گرا اور دور تک گھسٹتا ہوا چلا گیا ——— پیشانی، ناک اور ہونٹ بری طرح چھل گئے۔

پالا سنگھ بھی جوش میں کود پڑا۔ شاید پرتھی پال سنگھ کے جسم میں اٹھنے کی سکت باقی نہیں رہی تھی لیکن نہ معلوم کس جذبے کے تحت وہ بڑبڑا کر اٹھا اور سیدھا کھڑا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ پالا سنگھ نے اس کے جبڑوں تلے زور کے دھاکے سے گھونسہ جڑ دیا۔ پرتھی پال سنگھ کو محسوس ہوا کہ اس کے مسوڑھوں سے گرم گرم نمکین خون نکل کر اس کے لعاب دہن میں مل رہا ہے اور اس کے ساتھ اس کے ذہن پر بادل سے چھا رہے ہیں۔

پالا سنگھ نے حضور صاحب (حیدرآباد دکن) کا بنا ہوا مضبوط وزنی بھاری بھرکم کڑا آگے بڑھا کر انتہائی نفرت سے ہتھیلی کے نچلے حصے کا ایک جھانپڑ اس کے رخسار پر رسید کیا اور گوشت کی ایک بوٹی کٹ کر علیحدہ ہو گئی۔ پرتھی پال سنگھ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے رخسار پر دہکتا ہوا انگارہ رکھ دیا گیا ہو۔

معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ٹانگ میں گہری چوٹ آئی ہے۔ اس کے حواس قریب قریب مختل ہو چکے تھے اور وہ لڑکھڑا کر اور

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

گرنیل کو شروع کیا ۔

پالا سنگھ کے لیے تو یہی سزا تھا۔ اس نے نہایت بے جگری سے چوہدری پال کو [illegible] میں [illegible] کی گردن پر باندھ کر دیا اور قریب تھا کہ وہ اس کا گلا گھونٹ دے اور گردن کی رگیں [illegible] کر کوئی آدمی اکٹھے ہو کر آن پہنچے اور انہوں نے [illegible] تھپڑوں، گھونسوں اور پاؤں کی ٹھوکروں سے بے رحمی سے مار مار کر پالا سنگھ کو [illegible] بالوں سے گھسیٹ کر [illegible] کی کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا اور یہ طے پایا کہ رات بھیگ جانے پر اس کے جسم کو [illegible] جائے۔

مردم شماری کمشنر کے نام

فکر تونسوی

عالی جناب مردم شماری کمشنر صاحب!

کل یکی ڈاک سے آپ کا ارسال کردہ مردم شماری کا فارم موصول ہوا [illegible] پڑھ کے جناب آپ کے [illegible] معلوم ہوا ہے کہ آپ نے اپنے دستخطوں [illegible] آپ کا [illegible] مردم شماری کر کے [illegible] چاہتے ہیں [illegible] ہے کہ فارم کا ہر خانہ تفصیل کے ساتھ پُر کیا جائے اور تفصیل کو [illegible] تاکہ معاشرے کی پوری تصویر [illegible] گئے ہیں [illegible] جاتے ہیں۔

چونکہ آپ کا مقصد نیک ہے اس لیے میں پوری ایمانداری سے تمام کوائف عرض کر رہا ہوں۔

تاریخِ پیدائش

سب سے پہلے آپ نے تاریخ پیدائش پوچھی ہے [illegible] مجھے میری تاریخ پیدائش کا کچھ علم نہیں۔ والدہ صاحبہ کہتی ہیں [illegible] وہ اپنے ماتھے کے [illegible] گئی اور [illegible] پیدائش [illegible] اس لیے مجھے [illegible] مطلب تھا [illegible] زندگی بھر مجھے ایک [illegible] لیکن [illegible] والد صاحب سے [illegible] میرے ساتھ [illegible]

جس دن میں پیدا ہوا تھا [illegible] والد محترم [illegible] جرم میں [illegible] تھے چنانچہ [illegible]
جا سکتی ہے (لیکن ایسا کرنا ایک قبیح حرکت ہو گی)

نام

آپ نے میرا نام پوچھا ہے۔ خاندانی [illegible] رکھا مگر [illegible] کہ [illegible] کے نواسا

ہمارا [illegible] کا [illegible] مطلب [illegible] صاحب [illegible] ہوتے [illegible] لیکن [illegible] کی [illegible]
[illegible] سے [illegible] میں [illegible] کے [illegible] سے [illegible]
[illegible] کو [illegible] کے [illegible]
[illegible] سے [illegible] کی [illegible] کے [illegible]
معلوم نہیں ہوتا۔
سکتے ہیں [illegible] سے [illegible]

ولدیت

جیسے [illegible] آپ نے [illegible] صاحب [illegible] ہے [illegible] سے [illegible]
[illegible] کے [illegible] سے [illegible] کی [illegible]
کہ اس کی [illegible] کر گئے۔ [illegible] گئے تھے [illegible] سے [illegible]۔
[illegible] صاحب کے [illegible] کی [illegible] مناسب [illegible] کے [illegible]
ان کے اصل [illegible] کا انکشاف کیا ممکن ہے [illegible] کی [illegible]
آج کل [illegible] صاحب [illegible] ہے [illegible] ہماری [illegible]
[illegible] ضروریات کی خاطر [illegible] انکار کیا ہے [illegible] صاحب کا [illegible] قصور [illegible]۔

ذات

آپ نے [illegible] پڑھی ہے [illegible] سے [illegible] تھے اور [illegible] پہلے [illegible]
سے بھاگ کر جہاں آن بسے تھے۔ [illegible] کی [illegible] سے [illegible] روایت [illegible]
سے ملتا ہے۔ [illegible] کے [illegible] کے [illegible] روایتی معلوم ہوتا ہے [illegible]
بھاٹیہ کے ساتھ [illegible] راجپوت [illegible] ہے۔ [illegible] کی [illegible] ہے [illegible]
لکھنے لگے راجپوتوں کی بات [illegible]
ایک بزرگ کا خیال ہے کہ ہماری اصل [illegible] بھاٹیہ ہے [illegible] بزرگ [illegible] بھاٹیوں کہلاتے [illegible]
[illegible] کہتے ہیں کہ ہم موسیقی اور شاعری [illegible] کے [illegible] میں [illegible] بڑی [illegible] کے
باوجود مجھے ہماری [illegible] کے مقابلے پر راجپوت [illegible] بھاٹ اور بھاٹیہ [illegible] ہے [illegible]
کی خاطر کون اپنا مرتبہ گرا دیتا ہے۔

عمر

عمر کے سلسلے میں کیا بتاؤں۔ تاریخ پیدائش میں کنفیوژن کے باعث صحیح [illegible] نہیں۔ گذشتہ صفحے [illegible] نے [illegible]

کرتے ہوئے کہا: "عینک کا برداشت کرنا ثبوت ہے، معلوم ہوتا ہے عمر چالیس کے پیٹے میں جا پہنچی ہے۔"

پامسٹری کے ایک ماہر نے کہا تھا کہ چالیسویں برس میں پہنچتے ہی تم اچانک مشہور ہو جاؤ گے۔ چنانچہ پرسوں جب فٹ بال کے مقابلے میں شامل ہو کر بھاگتا پھرتا تھا کہ میری ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی اور اخبار میں میری تصویروں کے ساتھ یہ خبر چھپ گئی اور میں ملک بھر میں مشہور ہو گیا۔ لہٰذا ہم چالیس ہی کو مان لیتے ہیں لیکن ذہنی طور پر میں پچیس برس کا ہو چکا ہوں جیسے کہ ثبوت کی ضرورت ہے۔

شادی شدہ یا کنوارہ

میری شادی کی کیفیت یہ ہے کہ مجھے شادی شدہ ہی سمجھئے کیونکہ بیوی کی موجودگی میں مجال انکار ممکن نہیں۔ شادی زندگی کا ایک ثبوت بھی ہے اور ذمہ داری بھی، اور تعلق کی علامت ہے۔ مثلاً گزشتہ سال میں نے چاہا کہ میں اس کے بعد ایک سیکنڈ ہینڈ کار کی واضح پیش کش ہو رہی تھی لیکن میرے ایک بچے نے کہا کہ میرے علاوہ اخراجات نہ بڑھائیے، پہلے ان کا حل تلاش کیجئے، مکانات کے بارے میں سوچئے گا۔ چنانچہ بچے کے مستقبل کی خاطر میں نے اپنا مستقبل خراب کر لیا تھا۔ اس کے باوجود مجھ پر طفیل ہو گی۔

شادی کے بعد میرا خانہ آباد ہو گیا۔ نہ صرف بیوی سے بلکہ متعدد اور چیزوں سے بھی ——— مثلاً بچوں سے جو ہم میں سے بعض بڑے ہیں، چارپائیوں سے، مہمانوں سے، انگیٹھیوں سے، ساڑھیوں سے اور بچیوں سے، اور ان سب کی خاطر مدارات سے۔ خود سے سوچتا ہوں اگر میری شادی نہ ہوتی تو یہ سب چیزیں کہاں جاتیں؟ کون ان کا ٹھکانہ کرتا؟ شادی نے مجھے ہر حیثیت ہمدردی کرنا سکھا دیا ہے۔

لیکن کبھی کبھی جب رات گہری ہو جاتی ہے، سارا کنبہ خواب استراحت میں محو ہوتا ہے تو میں چند بیداری چند کر آداب میں لگا رہتا ہوں مگر وہ حسب معمول نہیں آتی چنانچہ مجھ پر ایک بار پھر کنوارہ بننے کی دھن سوار ہو جاتی ہے اور میں گزرے ہوئے دنوں کی طرح سارے گھر پر ایک ملنگ چھلتا ہوا حلیہ پہنتا ہوں اور راہ فرار پر ابھی دو ہی قدم چلتا ہوں کہ بیوی کی آواز آتی ہے: "جلدی نہیں آرہی تو ذرا رنگ ... یہ سب مچھروں کی کارستانی ہے۔ اس بار آپ کے لیے ایک مچھر دانی ضرور لے آؤں گی۔"

میں اسے یہ نہیں بتاتا کہ مجھے تو گھر بسنے کے مچھر کاٹ رہے ہیں بلکہ چپ چاپ چارپائی پر لیٹ جاتا ہوں اور سوچنے لگتا ہوں کہ جو بیوی مجھ سے اتنی محبت کرتی ہے اسے چھوڑ دینے سے زیادہ بہتر ہے کہ ایک مچھر دانی خرید لائی جائے۔

آمدنی

میری آمدنی کیا ہے؟ ——— اس سلسلے میں پامسٹری کے ایک عالم کا قول دہرانا مناسب سمجھتا ہوں جس نے کہا تھا تمہاری ماہانہ آمدنی ایک ہزار روپیہ ہے لیکن معلوم ہوتا ہے جوتشی مذکور نے ہاتھ میرا دیکھا، آمدنی کسی اور کی بتا دی ——— جس دن اس نے ایک ہزار ماہانہ آمدنی کی پیش گوئی کی تھی اس دن میں نے فرطِ مسرت سے سیونگز بینک میں سے ایک سو روپیہ نکلوا کر غریبوں اور محتاجوں کو کھانا کھلا دیا تھا۔ بس اس کے بعد وہ جوتشی والا آیا نہ ایک ہزار روپیہ، سیونگز بینک میں وہ ایک سو روپیہ دوبارہ کبھی جمع نہیں ہو سکا، البتہ گزشتہ سال ایک مہینہ ایسا آیا تھا جب مجھے ایک ہزار روپے کی آمدنی ہوئی تھی لیکن بعد میں سرکار نے وہ روپیہ مع سود واپس وصول کر لیا کیونکہ میں نے وہ روپیہ بطور قرض لیا تھا۔

[illegible] ہیں جو [illegible] کی ایک [illegible] کی
[illegible] ہو گیا ۔۔۔ [illegible]
[illegible]
[illegible] کی بات [illegible]
کمال ہو گئی ۔۔۔
[illegible] تھا
[illegible] جاتا ہے ۔۔۔ [illegible]
ہر وقت [illegible] ۔۔۔ [illegible] ہے۔

مکانیت

مکان کا یہ رشتہ عجیب ہے کہ ابا جان کے پاس ایک مکان تھا۔ والد محترم نے جب انتقال فرمایا تو میری عمر [illegible]
انتقال فرمایا کہ ہمارے پاس صرف ایک مکان تھا [illegible] والد صاحب [illegible]
[illegible] کہ مکان کس کا ہے۔ والد صاحب کا یا چچا جان کا ۔۔۔ اور جب معاملہ [illegible] تیرہ سال تک کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکے تو میں [illegible]
سے بھاگ گیا اور دوبارہ کبھی قدم نہیں رکھا۔

جو خیالات باغیانہ تھے میں [illegible] برس سے سولہ برس کی عمر تک فٹ پاتھ پر سوتا۔ [illegible]
ہوتی تو ایک دوست کے [illegible] رات بسر کرتا۔ ایک بار [illegible] نے [illegible] بیماریوں کے [illegible] رین بسیرا [illegible]
زمین بھی ایک تھا۔ [illegible] دوست بنا کر وہاں اٹھا لایا جہاں ایک [illegible] بیمار [illegible] انسانیت کی یہ ذلیل [illegible]
[illegible] خیالات [illegible] باغیانہ تھے لہٰذا ایک دن [illegible]
دیا گیا۔ اس وقت سے کرایے کے مکانوں میں رہنا شروع کر دیا۔ چالیس برس کی عمر تک یہ جذبہ [illegible] اور کرایے کے مکانات
مجھے اپنی پناہ میں لیتے رہے۔ اس دوران میں ایک مکان کرایہ پر لیا تھا جس میں پہلے بندر رہتے تھے۔ میرے آنے کے بعد بھی وہ
بندروں میں [illegible] سول وار رہی لیکن بالآخر فریقین میں ایک سمجھوتہ ہو گیا۔ یعنی یوں کہ بندر صبح شام کھانا ہمارے ہاں تناول فرمائیں گے اور
باقی وقت گھر سے باہر گزاریں گے ۔۔۔ مگر ان میں سے ایک بندر انتہائی سرکش اور کینہ ور تھا۔ آخری وقت تک اس نے سول نافرمانی
جاری رکھی۔ یعنی موقع پاتے ہی ہمارے اکلوتے کمرے میں گھس آتا اور ہمارے کھانے پینے کی چیزیں اٹھا کر بھاگ جاتا۔ رات کو ہمارے برآمدے
ہی میں [illegible] کرتا تھا ۔۔۔ آخر ایک بار جب اس نے میرے ننھے بچے کو کاٹ کھایا تو میں نے وہ مکان چھوڑ دیا۔

آج کل میں جس مکان میں رہتا ہوں وہ میرا اپنا ہے۔ اگرچہ باغیانہ خیالات بالآخر تنگ آ کر مجھ سے بغاوت کر کے چلے گئے،
ایک کمرہ ہے ایک باورچی خانہ، ایک ننھا سا باتھ روم اور مختصر سی بالکونی۔ اس سے زیادہ کی نہ ہوس ہے نہ گنجائش۔ بڑی شان کی کوٹھیاں
اور بنگلے دیکھ کر اب حسرت بھی نہیں ہوتی کیونکہ اب عقل مند ہو گیا ہوں۔ ایک بار ایک دوست کے وسیع لان میں بیٹھ کر ایک غزل لکھی تھی۔

احباب نے کہا: سوال کٹھن سا ہے پچھلی بار آپ نے جو سوال سنایا تھی وہ نہایت سہل تھی۔
میں نے کہا: وہ میں نے اپنے ہی مکان میں بیٹھ کر کہی تھی۔
مجھے خوف ہے کہ اگر تماشائیوں کو یہ علم ہو جائے کہ میرے مکان میں جو بھی آ کر کھڑا ہو جاتا ہے وہ زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے وہ سب وہ میرا
اڈہ ہی مجھ سے چھین کر ڈھا دیں۔

تعلیم

علم فضل میں یکتا ہوں۔ مثلاً مجھے یہ علم ہے کہ کرتا کا بٹن کاج میں کیوں کر جاتا ہے اور زیادہ جیبوں والی بنیان یا دو جیبوں والی کیوں ہوتی ہیں۔ مجھے یہ علم ہے کہ اگر ایک روپے کا ایک بیچ آتا ہے تو ایک آنہ میں کچھ بھی نہیں آئے گا کیونکہ ایک آنہ کا تو بچ ہونے سے پہلے بھی ایک آنہ کا جیب میں ہونا لازمی ہے) اس کے علاوہ اور بھی سینکڑوں چیزوں کا علم رکھتا ہوں مثلاً یہ کہ دو آدمیوں میں لڑائی کروانے کا سب سے آسان طریقہ کونسا ہے۔ مجھے شطرنج کھیلنے میں بھی اور اس کی اہمیت ہے اور یہ کہ بنیادی طور پر ہر انسان میں بے وقوفی کے خصائص موجود ہیں ملنے یا نہ ملنے کی بات نہیں۔
بہت دیر بعد یہ علم بھی ہوا کہ علم کا بھی فائدہ ہے اگر اس پر عمل کیا جائے لیکن جب مجھے اس بات کا علم ہوا اس وقت تک میں کافی کاہل ہو چکا تھا لہٰذا میں اس تجویز پر عمل نہ کر سکا۔ ارادہ ہے کہ اگلے جنم میں احتیاط برتوں گا اور علم کا فائدہ ضرور اٹھاؤں گا۔ مثلاً کسی بنک کا مینجر بن جاؤں گا)

اولاد

اولاد میں میرے تین بچے ہیں اور ایک بلی۔ بلی کو بیٹی کا درجہ دیتا ہوں اور جلد ہی کوئی اچھا سا خاندانی بلا تلاش کر کے اس کے ہاتھ پیلے کر دوں گا۔
باقی تین بچوں میں دو لڑکیاں ہیں ایک لڑکا۔ جب سے یہ تینوں بچے پیدا ہوئے ہیں میرے گھر میں ہی رہ رہے ہیں۔ اگر گھر سے باہر کبھی جائیں بھی تو شام کو پھر لوٹ آتے ہیں ان کے بوٹ پھٹ جائیں تو مجھ سے نئے بوٹ کا تقاضا کرتے ہیں اور اگر میں خرید کر نہ دوں تو بسورتے ہیں ــــــ جاؤ، ہم تم سے نہیں بولیں گے۔
اگر بچے اپنے باپ سے نہ بولیں تو محلہ برادری والے اعتراض کرتے ہیں اس لیے میں انھیں بوٹ خرید کر دیتا ہوں اور پھر وہ بوٹ پہن کر محلہ بھر کو دکھاتے ہیں اور باپ کی ساکھ بناتے ہیں۔
میں اور میری بیوی دونوں ان کی تربیت میں جی جان سے جٹے رہتے اور وہ ان دو تربیت گاہوں میں دو الگ الگ راستوں پہ بیک وقت تربیت حاصل کر رہے ہیں مثلاً اگر میں ایک بچے سے کہوں کہ محلہ کے بچوں سے مت لڑا کرو تو بیوی اسے کہتی ہے کہ ضرور لڑا کرو ورنہ محلہ کے لڑکے تمھیں گھگو سمجھیں گے بزدل رہے۔ ایک بار میں نے اپنی بیٹی سے کہا، باسی روٹی مت کھایا کرو لیکن شام کو جب لوٹا تو وہ باسی روٹی کھا رہی تھی، میں نے احتجاج کیا تو بیوی کہنے لگی: کھانے دو، بچی ہے آہستہ آہستہ سمجھ جائے گی۔ میں نے بھی اسے کھانے کے لیے کہا ہے
اور ہمارے بچے اتنے زیرک ہیں کہ اس دوہری تربیت پر ذرا بھی نہیں گھبراتے۔ چپ چاپ اپنا کام کیے جاتے ہیں سامد

بہرحال [illegible]

مذہب

[illegible]

آج کل [illegible]

[illegible]

سیاسی خیالات

آپ کے [illegible] سیاسی خیالات [illegible]۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میرے اندر سیاسی خیالات پیدا ہوگئے۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ میرے اندر سیاسی خیالات آگئے ہیں تو وہ [illegible]۔ ایک بار [illegible] کا ایک پھول سونگھ رہا تھا کہ ایک صاحب آگئے اور بولے

"آپ کے سیاسی خیالات [illegible] گلاب کا پھول سونگھ رہے ہیں۔ لوگ اعتراض کریں گے۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ آپ کے سیاسی خیالات کا تقاضا ہے کہ جب تک [illegible] سونگھنے کی عادت پیدا نہ ہو جائے اس وقت تک آپ بھی اس خوشبو سے پرہیز کریں اور قربانی کا ثبوت دیں۔"

"قربانی سے کیا ہوگا؟"

"آپ سیاسی رہنما بن جائیں گے۔"

—— آج کل میرے گھر کوئی نہیں آتا اور میں بلا جھجک گلاب کی خوشبو سونگھتا ہوں۔ اسی خوشبو کم بخت نے مجھے سیاسی لیڈر نہیں بننے دیا لہٰذا میرے اندر سے سیاسی خیالات نکل گئے اور صرف گلاب کی خوشبو باقی رہ گئی۔

اب سوائے خفیہ پولیس کے میرے سیاسی خیالات سے کوئی آگاہ نہیں، خود میں بھی نہیں۔"

مرمر کی ماں

احمد سعید

چینی کے سفید گلدان میں سفید گلاب کے پھول، وہ بھی اس طرح ترتیب دیے ہوئے جیسے کچھ سپاہی کاڑھ دیے گئے ہوں یا ایک ہی ڈیزائن کے مطابق جگہ جگہ ٹانکے گئے ہوں۔ یہ تھیں شیریں ریاض، اور شیریں کے شوہر ریاض احمد کو بھی وہ نمایاں ہی بہت بھلے لگتے تھے۔ تکیوں کے غلاف اور میز پوش پر نکلے ہوئے زردی مائل گلاب، موتیا اور رات کی رانی کی طرح دکھائی دیتی تھی لیکن ریشمی دھاگے کے پھول اور اصل پھولوں میں کتنا فرق تھا۔ ایک میں خوشبو تھی، وہ ہوا میں جھک جاتے تھے، کھل اٹھتے تھے۔ دوسرے چپ چاپ ساکت بے حرکت رہتے تھے۔ ریاض احمد ڈپٹی کمشنر کو سہاگ کی رات ہی اس بات کا احساس ہو گیا تھا۔ اس رات اس نے دلہن کا گھونگھٹ اٹھاتے وقت یوں محسوس کیا تھا جیسے وہ چینی کے بند سفید مرتبان کو ڈبے میں سے نکال کر انگیٹھی پر رکھ رہا ہو۔ اور اسے خدشہ ہو کہ وہ خفیف سی ٹھیس لگنے پر کہیں ٹوٹ نہ جائے...... ریاض احمد نے گلستانوں میں ہی بو کر پھر سے اڑتے تھے۔ منو بی تتلیوں کو ایک پھول سے دوسرے کی طرف اڑتے تھا۔ ریاض کا رس چوس کر تیسرے پر ملا تامل جا بیٹھتے دیکھ کر اسے یقین ہو گیا تھا کہ شادی کے معاملے میں دیسی عورت کا بھی دنیا میں کوئی جواب نہیں۔ چنانچہ جب وہ ملازمت کے سلسلے میں تربیت حاصل کرنے کے بعد وطن لوٹا تو اس نے پرانی وضع کی دلہن تلاش کرنے میں تین برس صرف کر دیے۔ ایک ایسی عورت جو پردہ نہ کرنے کے باوجود نماز روزہ کی پابند ہو۔ ایک ایسی لاجونتی جو ہاتھ لگتے مرجھا جائے اور انگریزی فر فر بولنے کے باوجود ان دیکھے سات پردوں میں بند ہو۔ ریاض احمد کے یار دوست تو اس کے دقیانوسی خیالات سن کر بھنا گئے اور اس کے گھر اور خاندان والوں کو بھی اس بات پر پہلے بڑا اچنبھا ہوا کہ وہ ولایت سے ہو آنے کے باوجود دوسرے لڑکوں کے برعکس یوں معلوم ہوتا تھا جیسے حج کر کے آیا ہو۔

"...... بس فرق صرف اتنا ہے کہ اس کی داڑھی باہر نہیں اندر اگی ہوئی ہے۔"

"پڑھ لکھ کر گنوا لیا ہے۔" ریاض کے دوست اسے کہتے۔

"نہ معلوم اسے کیا ہو گیا ہے جو اپنی قیمت وصول نہیں کرتا۔" ریاض کے والدین کہتے۔

لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اسے بیوی اولاد پیدا کرنے کے لیے چاہیے تھی۔ بچے کے لیے ایک ماں اور اپنے لیے ایک رفیقہ حیات۔ غرض مند دیوانہ ہوتا ہے۔ جب ایسے دو دل جائیں تو سونے پر سہاگہ۔ ریاض احمد کی نگاہِ انتخاب بھی آخر کہاں جا کر رکی۔ اس کے اپنے ہی ڈسٹرکٹ میں درگاہ والے شاہ شریف کے متولی حضرت پیر جمال کی دختر نیک اختر، شیریں جمال ایک ایسی لڑکی نظر آئی، جو

وہاں شوہر صاحب کے اندر یہ بچوں والی بات تھی تو انھوں نے بچہ گود لینے کی بیگم کو ایک نیت بھی دکھا تھا تب سے
کے دل میں گھر کر گئی تھی۔ منصوبہ بنا کر بیٹھے اور بیاہ سے پہلے لڑکے کی بات پکی کر لی۔ پھر اب جسے بیٹی بنا کر پالی تھی
لیکن انھوں نے کہا بڑا ہو کر یہ کسی صاحب کی بہت محبوب تھی ۔۔۔۔ ڈاکٹروں نے یہ بتا دیا تھا
مجھ سے محبت مہربانی کرنی ہے۔ اس کا اور شکل صاف ظاہر ہے کہ اسے
ملاقات میں بنا ہر کسی پیشہ ور قبول کر لیا ہو۔

شیریں کی جو جماعت رہتی تھی وہاں تو اس نے اپنے آپ کو کبھی اس وقت بھی نہیں دکھا تھا۔ مگر یہ بات تو تھی
معلوم ہے کہ اس سے پہلے وقت کبھی کہ وہ اگر اکیلا جا کے نہیں۔ جیسے
زمین کے بیچ بیابان کا سے کرنے لگنے کے بعد جانے کس شے
کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد بزرگ ریاض احمد سے مل گئے۔ چونکہ پیر صاحب شیریں
کے والد اپنے مریدوں میں بڑا درجہ رکھتے تھے۔ وہ کسی بات پر ان کے سامنے سکتے تھے۔ وہ ان کے معاملے میں کرامت سے چھوٹی سے
خود کو رہتے تھے۔ یہ بات جب شوہر ایک وقت میں صرف چار کو
دیتے باقیوں کو کا۔ یوں کسی کو ان کے کردار اور حرکت پر انگلی اٹھانے کا موقع نہ تھا۔ جب شیریں کی ریاض احمد
سے شادی بھی پیر صاحب کے مریدوں نے چپکے سے قبول کر لی۔

لیکن دس برس کی رفاقت کے بعد بھی کوئی بچہ نہ ہوا تو ان کے گھر بچوں کی کمی
کا احساس بڑھتا چلا گیا اور بچے کے بغیر ریاض محسوس کرتا جیسے شیریں اب تک کنواری ہو کی عزت بھی
کبھی کبھار شوہر کے احساس محرومی کے باعث ٹھنڈی آہیں نکل جاتیں لیکن ملک بھر کے
مختلف ڈاکٹروں اور حکیموں کا علاج بھی کروا کر دیکھ لیا تھا۔ جو بے اثر ثابت ہوا تھا۔ صاحب نے گنڈے تعویذ ٹونے ٹوٹکے کے
ذریعے بیٹی کی گود ہری کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیکھا یہ بھی بے سود کہ لڑکی کو انگریزی تعلیم دلانے
اور اپنی برادری کو چھوڑ کر ایک غیر شخص کے ساتھ اس کی شادی کرنے کی ہے۔ بہرحال جب پیر صاحب کی اس بارے میں کوئی
پیش نہ چلی تو انھوں نے شیریں اور ریاض دونوں کو اپنے خرچ پر علاج معالجے کے لیے یورپ اور امریکہ بھیج دیا۔

غیر ممالک کے ڈاکٹروں نے بھی دیسی معالجوں کی طرح جیسے یک زبان ایک ہی رائے دینے کی سازش کر رکھی تھی۔
وہی جواب دیا جیسے سن سن کر ان کے کان پک گئے تھے کہ جسمانی لحاظ سے تو وہ دونوں ٹھیک ٹھاک ہیں۔ انھوں نے ریاض
کو البتہ یہ مشورہ ضرور دیا کہ بیوی کو مغرب کی دل کھول کر سیر کرائے۔ اس کے مطابق انھوں نے اوپیرا تھیٹر، میوزک ہال، حتیٰ کہ
نائٹ کلبوں تک کی سیر کرڈالی۔ وہاں کی بے حجابی اور بے شرمی دیکھ کر شیریں پر جھرجھری سی طاری ہو جاتی۔ شیریں نے کئی بار ریاض
سے کہا کہ وہ کسی مغربی لڑکی سے شادی کر لے شاید اس کے من کی مراد اس طرح پوری ہو جائے لیکن اگر اس کے باوجود ریاض کی
خواہش پوری نہ ہوئی تو وہ سنگ مرمر کی ایک اور دیوار اپنے گرد کھڑی کر لے گا۔ وہ جواب دیتا۔ اگر قسمت میں ہی اولاد نہیں تو پھر

شکوہ کیوں۔ شاید اس میں بھی کوئی مصلحت ہو۔" ریاض نے شیریں کو ایک طویل لیکچر دیتے ہوئے کہا لیکن شیریں کو معلوم تھا کہ ساس اس وقت دماغ سے سوچ رہا تھا، دل سے نہیں۔

یورپ اور امریکہ سے واپسی پر ریاض تو بیرکام میں محو ہو گیا لیکن اس کی والدہ نے بہو کا علاج اپنے ذمے لے لیا۔
"خدا بڑا رحیم و کریم ہے۔ اس سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ ہمارے خاندان میں ایک سائیں آیا ہے وہ بے اولاد عورتوں کا علاج کرتا ہے۔ چلو اس کو بھی دکھا لیں۔" اس نے کہا۔
"... وہ آئیں تو گاڑی میں چلیں گے۔" شیریں نے ساس کا دل رکھنے کے لیے جواب دیا۔ "جی! آپ سب لیے کیوں خواہ مخواہ اتنا ہلکان ہوتی ہیں۔ میں نے تو انھیں کہہ دیا ہے کہ .... آپ دوسری شادی کر لیجئے۔"
"چل پگلی۔ ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔ مجھے ریاض نے بتایا ہے کہ تم نے اسے اجازت دے دی ہے لیکن یاد رکھو نہ تو وہ ایسا کرے گا، نہ میں ہی اسے ایسا کرنے کی اجازت دوں گی۔"
"لیکن ..."
"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ جہاں اتنے علاج کیے یہ بھی آزما دیکھو۔ فکر نہ کرو ریاض کچھ نہیں کہے گا۔"
"انھیں ساتھ لے جانے میں کیا حرج ہے۔ ایسی جگہ پر کوئی مرد بھی تو ساتھ ہونا چاہیے۔"
"... تمھارے جیسے کیسوں میں سائیں عورت کے ساتھ مرد والے کو اجازت نہیں دیتا۔ میں جو تمھارے ساتھ ہوں گی میں بھلا کوئی ایسی ویسی جگہ تمھیں تھوڑے لے جا رہی ہوں۔"

"آؤ آؤ۔ میں تمھاری ہی انتظار کر رہا تھا۔" جب شیریں اور اس کی ساس سائیں ذونشاہ کے ڈیرے پر پہنچیں تو اس نے انھیں دیکھ کر جواب دیا۔ "فکر نہ کرو۔ خدا تمھاری گود ہری کرے گا۔" نہ صرف اس کے الفاظ بلکہ اس کی شکل صورت دیکھ کر ساس بہو ٹھٹھک کر رہ گئیں۔ الفاظ پر اس لیے کہ سائیں کے متعلق لوگ کہتے تھے کہ اسے بنا پوچھے اپنے ملاقاتیوں کی آمد اور ان کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ باقی رہی شکل و صورت، اس کے اعتبار سے بھی وہ نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ سرخ و سفید رنگ جس پر بڑھاپا نور کر کنارا اور جھریوں کا ثبوت بھی بمشکل ملتا تھا۔ کمان کی طرح سیدھا، چاق و چوبند۔ سر کے بال ضرور براق سفید تھے جو عمر کی غمازی کرتے تھے۔ چہرے بشرے سے عجیب طمانیت اور ہمدردی ٹپکتی تھی۔ جلالی آنکھوں میں سرخ ڈورے، ان میں ایک ناگفتہ بہ خمار، جب وہ جلال میں آتا تو ان میں سے انگارے سے نکلتے۔ سننے میں آیا تھا کہ اگر وہ کسی سے نظریں ملا کر بات کرتا یا نظر اٹھا کر دیکھ بھی لیتا تو اس کا بیڑہ ضرور پار ہو جاتا۔
جب شیریں اور اس کی ساس اس کے ہاں پہنچیں تو وہاں سائیں کے پاس اس کے سائلوں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ مردانہ کیا زنانہ کیا دونوں کمرے بھرے ہوئے تھے۔ آدھ پون گھنٹے میں چند عورتوں کو فارغ کر کے وہ یک لخت اٹھ بیٹھا جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو اور لپک کر اندرون خانہ سے تین چار ماہ کا ایک بچہ اٹھا لایا۔ یہ اس کی آخری نوجوان دلہن کے بطن سے تھا

"دیکھو خدا کی قدرت! اگر ادھر کی [illegible] سال ہو تو جیسے [illegible] کریں اب پھر [illegible]
اس کے گھر کسی شے کی کمی نہیں! [illegible] [illegible] کو مخاطب کر کے کہا [illegible]
جہاں [illegible] ایک دوسرے [illegible] [illegible]
چپل گئے ایک دوسرے [illegible] [illegible] صاحب کے [illegible]
[illegible] گئے [illegible] کے [illegible] ہو گئے۔

[illegible] نے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] ہوگا۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] تھے۔

[illegible]
[illegible]
[illegible] رہی ہوں۔

چاندنی [illegible] کے [illegible]۔

دوسرے عورت کے [illegible] رکھ دیں۔ [illegible]
[illegible]
[illegible] عورت نہائی۔

"آپ اس طرف نہ دیکھیں۔"

"بارہ تو بج چکے ہیں۔"

"لیکن یہاں کا منظر ..... کتنا حسین معلوم ہوتا ہے۔"

"[illegible] کیا کہہ رہی ہو؟"

"نہیں [illegible] ..."

جب عورت نے [illegible] اس کے [illegible] سے پھسل گیا اور وہ [illegible] طرح [illegible] کرتے ہوئے

قطرہ قطرہ کر کے ٹپک رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے دریا کی لہروں پر جوار بھاٹا اٹھا ہو۔ اب وہ مرد کے ہاتھوں سے نکل کر تھکی ماندی سی
سے چٹانوں کی ریت پر بیٹھ گئی۔

"شاباش" سرکنڈوں کے پیچھے سے اس کے مرد کی آواز آئی۔

"گھبرایئے نہیں، تشریف رکھیئے۔"

خضاب۔ دن کے گاؤں سے زیادہ نرم، چاندنی سے زیادہ سپید پرندے اڑتے تھے یا رستہ کھال میں۔ انھیں دیکھ کر عورت کا جی چاہا کہ کبوتروں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہے جب وہ اڑتے ہوئے ستاروں کے گنبد اور مینار پر بیٹھتے دکھائی دیتے۔ عورت نے تب کبوتر ایک ٹکری میں بند کر دیے جب وہ انھیں بند کر کے سونے لگے اور جو اس کے شوہر کے پاس پہنچی تھی۔

چاندنی میں ایک سیماب وش شعلہ سا یکدم نمودار ہو گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تنگ مرکنڈوں سے بے نقاب ہو گیا تھا۔ اپنے آپ کو اس حالت میں دیکھ کر عورت پہلے تو گھبرا سی گئی۔ مرد اسے سرکنڈوں کے پیچھے سے دیکھ کر مبہوت ہو گیا۔ سفید گلاب کی پنکھڑی جس پر سیاہ بھنورا سا بیٹھا تھا کھل رہی تھی [illegible]۔ عورت نے جلدی جلدی اپنے جسم پر ٹپک رہی بوندوں کو ہاتھوں سے پونچھا۔ ہوا کے جھونکے تیزی سے اس کے جسم کے اردگرد لپٹ لپٹ جاتے اور وہ اور چاندنی اس کے جسم سے گرم گرم بھاپ سی اٹھتی۔ اس عورت کا جی چاہا کہ وہ ٹھنڈی ٹھنڈی ریت سے لپٹ جائے یا اس کے اوپر بہہ جائے۔ اس نے یکدم اٹھ کر پھر بیٹھی ٹوکری میں سے کبوتر نکال کر اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیے۔ کبوتروں کو اس وقت یوں محسوس ہوا جیسے ان کے سامنے کبوتروں کا ایک جوڑا آ گیا ہو۔

جب عورت نے انھیں اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لیا تو ان کی آنکھیں اپنے آپ بند ہو گئیں۔ اس کے ذہن میں سینکڑوں برس پہلے شہزادہ سلیم اور مہرالنسا کی پہلی ملاقات کا منظر گھوم گیا۔ ۔ ۔ ۔ جب شہزادہ نے اس حسینہ کو کچھ دیر کے لیے اپنے دو کبوتر سنبھال کر رکھنے کو کہا اور واپسی پر اس کے ہاتھ خالی پا کر اس سے پوچھا کہ وہ کس طرح اڑ گئے تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو بہت بھولی بھالی سنگ مرمر کی عورت کے ہاتھوں سے دونوں کبوتر پھڑ پھڑا کر فضا میں اڑ گئے۔ دور ان کے پروں کی آوازیں سنائی دیں۔ اور وہ پیا جیسی عورت چونک کر اٹھ بیٹھی اور کبوتروں کو ادھر ادھر دیکھنے لگی لیکن وہ نہ جانے کہاں ہوا میں جا چکے تھے شاید۔ وہ ان کو پکڑنے کے لیے جیسے ان کی طرف لپکی لیکن اس کا پاؤں ایک ننھے سے بیٹے گڑھے میں جا پڑا۔ اور وہ ریت پر گر پڑی۔ چاندنی اب سنگ مرمر کے بت کو پہلے کی طرح اپنی آغوش میں لے رہی تھی۔

عورت نے یکدم اٹھ کر پانی کی ٹھنڈی ٹھنڈی لہروں سے نہایا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے رگ و ریشے میں ایک لہر دوڑ گئی ہے۔ اس نے اپنے اندر دریا کے پانی کی ایک لرزش سی محسوس کی اور تھک کر اپنا جسم ریت پر ڈھلکا دیا۔ سرکنڈوں کے پیچھے سے ایک سایہ سا نکل کر آگے بڑھا اور سنگ مرمر کی مورت سے لپٹ گیا۔

چند ماہ بعد معلوم ہوا کہ سنگ مرمر کے رگ و ریشے میں زندگی کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔

———

وقت کی کوکھ

نوید انجم

بھابی کے ۔۔۔ وہ تھام کر رو پڑی

اس کی آنکھیں ایک دم [illegible] ۔ [illegible] سے چھپنے لگی ۔۔۔ [illegible]

بھابی سے [illegible] ۔۔۔ [illegible] ۔۔۔ [illegible]

[illegible]

[illegible] ۔۔۔ زندگی [illegible] کے [illegible] سے [illegible]

مٹھیوں سے بے رنگ کی ادا کر رہی تھی

ماں کا جی [illegible] اف مولا [illegible] تو [illegible]

اس نے مڑ کر ایک نظر بھابی کو دیکھا ۔ پھر [illegible] کے پاس بیٹھی ہوئی ایک عورت پر اس کی نظر جم گئی [illegible]

اس عورت کا بدن مضبوط تھا اور [illegible] ۔ [illegible] ایسا تھا جیسے وہ کوئی [illegible]

مشقت کی عادی ۔ اس کا قد لمبا اور ناک نقشہ تیکھا تھا ۔ جانے اس کے چہرے کو دیکھ کر [illegible] معلوم کرنا چاہتی تھی

مگر اس عورت کا چہرہ کسی [illegible] سے عاری تھا ۔ وہ ایک بے حسی [illegible] آتے جانے والوں پر ایک نظر ڈالتی ۔ وہ [illegible]

ریزگاری کے قریب پڑے ہوئے ایک کشکول میں [illegible] زندگی [illegible] توبہ توبہ کرتے ہوئے

۔ اور یونہی وہ عورت کبھی کبھار اپنے بچوں کی طرف بھی دیکھ لیتی جن کی نگاہوں میں بے پناہ مظلومیت اور بے بسی رچی بسی تھی۔

ان معصوم ننھے بچوں کی خاموش آنکھیں بڑی خوفناک تھیں ۔ رعنا کی ہمت نہ ہوئی کہ دوبارہ ان بچوں کی جانب دیکھے

پلٹ کر اس نے بھابی کی طرف دیکھا جو زیر لب توبہ توبہ کر رہی تھی ۔ توبہ ہے بھابی کیا یہ اس عورت کے بچے ہیں؟"

بھابی نے منہ پھیر لیا ۔ چلو چلو رعنا ۔ وہ وہاں کھڑا ہونا نہ چاہتی تھی

رعنا نے اپنا نازک سا پرس کھولا ۔ ایک [illegible] نکالی کشکول میں پھینکی اور بھابی کا بازو مضبوطی سے تھام کر آگے بڑھ گئی۔

گھر پہنچ کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی ۔ کچھ دیر بعد [illegible] وہ کھڑکی میں کھڑی باہر سڑک کی جانب دیکھتی [illegible] کر

وہ قد آدم آئینے کی طرف آئی اور خود کو دیکھنے لگی۔

اس کا چہرہ معصوم تھا، رنگ صاف۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ جو سہیل کو بہت پسند تھا ــــ وہی سہیل جو اس کا محبوب تھا ـــ نہ صرف محبوب بلکہ شوہر بھی اور اب چند ہی دنوں [illegible] اس کی ناک ستواں تھی جسے کئی بار سہیل نے شرارت سے کھینچا۔ اور وہ گلاب سے سرخ ہونٹ ـــ جنھیں اس نے کئی بار اپنے ہونٹوں سے چھوا تھا اور وہ [illegible] کے ساتھ [illegible] کو اس کے لمس سے بچا نہ سکی [illegible] کی وہ آہیں جو وہ شرارت کے طور پر [illegible] خوبصورت سر پر ـــ آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے وہ مسکرا دی ـــ لیکن یہ کیا [illegible] پر سے غائب ہو گئی اور ہونٹوں کی جگہ ایک سوراخ ـــ گہرا اور تاریک [illegible] ـــ آنکھیں، وہ حسین آنکھیں [illegible] کہاں گم ہو گئیں اور بے نور سے دو گڑھے [illegible] کی مانند اس کا [illegible] لگے ـــ اور پھر اسے ایسے لگا جیسے وہ [illegible] بازار میں کھڑی ہوئی [illegible] کا نشانہ بن رہی ہو ـــ مارے وحشت کے اس کے حلق سے ایک خوفناک چیخ نکل گئی ـــ اسے احساس ہوا کہ ان دنوں میں کیا کچھ ہو سکتا ہے اور وہ ـــ وہ رضا نہیں ایک سسکتی ہوئی زندگی ہے ـــ اس نے گھبرا کر اپنے منہ [illegible] اور سسکتی ہوئی مسہری پر گر گئی۔

بھابی اس کی چیخ سن کر بھاگی آئی ـــ اسے یوں روتا دیکھ کر [illegible] تو وہ بھی حیران ہوئی [illegible] اس نے اسے [illegible] بولی [illegible] کیا بات ہوئی رانی؟ ـــ میری رضا!

رضا [illegible] ہو گئی [illegible] رانی ـــ رضا رانی ـــ رانی!

بھابی نے اسے [illegible] پوچھا "کیا بات ہوئی؟"

"کچھ ۔۔ نہیں" ـــ اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

اس کی بڑی بڑی آنکھیں ـــ نم آلود ـــ بھیگی بھیگی ـــ کتنی پیاری لگ رہی تھیں! بھابی کو وہ بھی پیاری نظر آئی اور اس کے بازوؤں کو پکڑ کر کھینچتے ہوئے وہ بولی "اٹھو ـــ اٹھو ـــ" پھر رازداری کے لہجے میں بولی "کہیں سہیل سے تو کوئی بات نہیں ہوئی ـــ؟"

وہ شرما گئی ـــ حیا کی سرخی نے اس کے چہرے کو بہت زیادہ حسین بنا دیا۔ اس نے کہنا چاہا "کیسی بات کرتی ہو بھابی! بھلا [illegible] بات پر میں یوں رو سکتی ہوں ـــ" مگر وہ کچھ نہ بول سکی۔ اس کے ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ کیا میں واقعی سہیل کی کسی بات پر [illegible] ـــ [illegible] کوئی جواب نہ مل سکا اور گھبرا کر اس نے اپنے ذہن میں سے ایسے الٹ پلٹ سوال نکالنے کی کوشش میں [illegible] "وہ [illegible] نہیں"

بھابی کچھ سمجھ نہ سکی [illegible] پھر بولی "پگلی! ارے ابھی آ جائے گا۔ وہ بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

وہ [illegible] طرح شرمائی تو بھابی نے اسے چھیڑنا شروع کر دیا۔

شام ہوئی تو وہ آیا ـــ ممی اور ڈیڈی [illegible] واقع ہوئے تھے ـــ بس ذرا سی ضد کر کے رضا نے بھابی کی مدد سے باغ جناح میں سیر کے لیے جانے کی اجازت لے لی اور سہیل کے ہمراہ باغ میں آ گئی۔ وہ دونوں گلستان فاطمہ کے ایک کونے میں جا کر

ہو گئے [illegible] بہت [illegible] [illegible] نظر [illegible] بیٹھا [illegible]
[illegible] گئے [illegible] [illegible] بھی نہیں [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ——— [illegible]
[illegible] گیا ہو ——:

وہ جب واپس گھر [illegible] [illegible] ——— [illegible]
کی کتاب [illegible] [illegible] [illegible] سنتی ہیں۔

[illegible] [illegible] [illegible] ہے۔

[illegible] [illegible] [illegible] رہی ہے۔

رضا [illegible] [illegible] [illegible] ——— [illegible]
ہے ایک سالگرہ پیری ہے ———!

[illegible] مس رضا ——— میں نے [illegible] دیکھا ہے۔ [illegible] ہے [illegible]
[illegible] ہے ———!"

سہیل نے پوچھا تو رضا نے ساری بات کہہ سنائی ——— [illegible] [illegible] [illegible] گیا اور [illegible]
بھابی کی طبیعت خراب ہو گئی ——

سہیل نے کہا ——— ماں ——— ابھی دور ہے ——— جانے کتنے اور بچے اس دنیا میں ———
رضا کانپ گئی بات کاٹ کر بولی "سہیل کوئی اور بات کرو ———"

نعیم نے کہا "مس رضا! ایک بات اور سنئے گا ——— یہ کتاب جو آپ کے ہاتھ میں ہے اس میں [illegible] کا ایک
افسانہ ہے جس میں ایک ایسا ہی کیریکٹر پیش کیا گیا ہے۔ پڑھ کر دیکھئے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ دنیا میں فریب ———"

رضا کسی اور خیال میں کھوئی ہوئی تھی اس کے ذہن میں دوپہر کے واقعات پھر رہے تھے ——— وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہے
اور اس کی شکل بدل گئی ہے ——— [illegible] اس نے سہیل کا ہاتھ پکڑا اور وحشت زدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ سہیل نے بڑے پیار سے
اسے دلاسا دیا ——— تم نے خود ہی تو یہ ذکر چھیڑا اور اب خوف زدہ کیوں ہو گئی ہو ———؟"

نعیم کو احساس ہوا کہ اس سے کوئی غلطی ہو گئی تھی ——— معذرت کرتے ہوئے بولا: "مجھے اجازت دیجئے ———"

رضا کا دل چاہا کہ اس سے کتاب لے کر گھر جاتے ہی پڑھے مگر خاموش رہ گئی۔

سہیل اسے گھر تک چھوڑنے آیا ——— وہ کچھ خاموش خاموش تھی۔ کچھ بھابی آئے ہوئے تھے مگر وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی
گئی۔ بھابی اس کے پیچھے پیچھے آئی ——— دیکھا کہ مسہری پر بیٹھی ہوئی بکھرے ہوئے بالوں میں اپنی مخروطی انگلیاں یوں پھیر رہی ہے جیسے کنگھی
کر رہی ہو ——— دوپٹہ مسہری پر آدھا نیچے اور آدھا اوپر کی جانب پردے کی طرح لٹک رہا ہے اور گلے کے بٹن کچھ کھلے کچھ بند ہیں
وہ ٹھٹھک کر رہ گئی ——— "رضا ——— رضا!" بھابی نے سرگوشی کی۔

اس نے پلکیں اٹھا کر ایک کرب ناک نگاہ بھابی کی طرف دیکھنے لگی — بھابی وہ عورت!"
بھابی نے جلدی سے کہا، یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے — پھر وہ اس عورت کے ذکر کو —
وہ خاموش ہو گئی

سارا کمرہ اندھیرے نے اپنی لپیٹ میں لے لیا — سڑک کے دونوں کناروں پر بجلی کے کھمبے نظر آنے لگے جیسے ایک لمبی سی کالی کا سایہ ابھر رہا ہو۔ — وہ لمبے کمرے کی کھڑکی سے باہر اندھیرے میں دیکھنے لگی — وہ روشنی دیکھ کر اسے محسوس ہوا کہ ایک بم کا گولہ ہے جو بھڑک رہا ہے اور لپٹ کی دھیمی دھیمی روشنی — وہ آگ ہے جو کسی بھی وقت ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے کر بھسم کر سکتی ہے — پھر یہ تمام دنیا ختم ہو جائے گی — ان تمام خوبصورت بالوں اور راتوں سے کرہ ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے گی — وہ اس خیال سے کانپ اٹھی اور لرز کر رہ گئی

پھر وہ جلدی سے پلنگ کے کنارے کی طرف آئی۔ اسے محسوس ہوا جیسے یہ پراسرار خاموشی نے بتایا ہو کہ یہ جواب ہے — ماحول پر سناٹا مسلط ہو گیا اور تاریکی میں ہر چیز ڈوب گئی ہے — جانے کا وہ [illegible] زندگی کی ہر شے کو نگلنے کے لیے تیار ہے۔

گھبرا کر اس نے دروازہ کھولا اور آہستگی کے ساتھ اندر داخل ہوئی — دروازہ بند کیے بغیر وہ چوکھٹ کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے دیکھا بھابی اپنی چارپائی پر خاموش بیٹھی ہوئی ہے اور سامنے میز پر رکھا ہوا ٹیبل لیمپ روشن ہے۔ ننھے سے لیمپ کی ذرا سی روشنی نے کمرے کی تاریکی میں مل جل کر ایک عجیب سی فضا پیدا کر دی تھی۔ جیسے کسی روشنی اور کسی تاریکی کا جادو سامنے اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ بھابی کے کمرے میں پھیلا آیا تھا ----

رعنا کو ایسے لگا جیسے وہ ساکت رہ جائے اور پتھر کا ایک مجسمہ بن گئی — اس سے اپنا قدم آگے نہ بڑھایا گیا اور لرزش نے اس کے پیروں کو جوتیوں سمیت گویا دبوچ لیا! اس کے سینے کے اندر جیسے تبدیلی سی آ گئی اور دل کی دھڑکن کی آواز اتنی تیز ہو گئی کہ رعنا کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا دل اس کے بدن سے علیحدہ ہو کر گھڑی کی ٹک ٹک کی طرح چلنے لگا ہو۔ جلدی سے اس نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر اسے سنبھالا کہ کہیں وہ واقعی اس کے منہ کے راستے ہی نہ باہر آ گرے — اور متوحش نظروں سے بھابی کو گھورنے لگی۔
بھابی کے بے حس و حرکت جسم میں حرکت ہوئی اور رعنا کو سسکیوں کی آواز سنائی دی — بھابی بڑی آہستگی کے ساتھ اٹھی اور ٹیبل لیمپ کے پاس جا بیٹھی — بھابی کے چہرے پر ہلکی سی روشنی پڑی تو رعنا نے دیکھا کہ وہ رو رہی تھی۔ وہاں انگارہ سی آنکھوں میں آنسوؤں نے شبنمی قطرے کیا اس دہکتی ہوئی آگ کو بجھانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے جو بھابی کے سراپا میں بھڑک رہی تھی۔
پھر بھابی نے اپنے چہرے سے اپنی آنکھوں کے ان قطروں کو پونچھا جو اگر کسی سیپ کے منہ میں گرتے تو موتی بن جاتے اور قندیل میں پڑی ہوئی اپنے شوہر کی تصویر اپنے ہاتھوں میں لے کر دیکھنے لگی ——
رعنا کو یوں محسوس ہوا جیسے دل ہر قسم کی بندشوں سے آزاد ہونے کے لیے جدوجہد کرنے لگا ہو — اس کے بھیا کی تصویر تصور میں اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی — مسکراہٹ کی وہ دلربا لہریں اس کا خوبرو بھیا جمیل — ہاں دیکھو تو جمیل اسے دیکھ کر ہنس رہا ہے —— پگلی! پگلی! تم مجھے دیکھ کر اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو —— ارے یہ آنسو کس لیے؟

وہ بے اختیار چلا اٹھی ——— حالانکہ [illegible] کر [illegible] دیکھ [illegible] اس کو [illegible] کے [illegible] پر [illegible]
پر [illegible] تصویر [illegible] کی طرف [illegible] ——— [illegible] ——— [illegible]

اس کا دل چاہا [illegible] سے [illegible] تھے [illegible] ہو کر [illegible] میں [illegible]
[illegible] تھی ——— [illegible] عجیب تھا ——— [illegible] خیال [illegible] تھا [illegible] اس کے [illegible] نہیں تھا۔ [illegible]
کے [illegible] کہہ کر بولی: بھابی [illegible] جلدی [illegible] سکے!

[illegible] جیسے [illegible] کہ [illegible] کو [illegible] ——— پھر ایک سانس [illegible] کہ اس کے [illegible]
[illegible] ——— اس ——— اس ——— وہ [illegible] لگے ——— ۔

[illegible] نے بات [illegible] کر کہا ——— تو بھابی: یوں ہی کوئی کتاب پڑھ لیں ——— [illegible] کے [illegible] سے [illegible]
[illegible] کا احساس ہوتا ہے ——— :

بھابی نے بے دلی سے کہا۔ "نہیں ——— تم تنہا نہیں تھیں ———"

اور رضیہ کو یوں محسوس ہوا جیسے [illegible] کہا ——— وہ تنہا نہیں ہے ——— [illegible] ہے ———
اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کرے ——— پھر وہ پلنگ سے اتری اور دروازہ کھول کر [illegible] کی طرف چل دی لیکن [illegible]
ذرا جھجک [illegible] کہ اسے [illegible] کا خیال آیا [illegible] کی [illegible] لگی ———
کوئی کتاب اس کے [illegible] نہیں ——— [illegible] اگر وہ سوچنے لگی کہ کیا کرے ——— پھر اس نے [illegible] سے
کے پاس [illegible] سے فون کر دیں۔ اس نے سوچا کیوں نہ سہیل کو فون کرے کہ [illegible] دیکھ [illegible]
کے [illegible] کوئی زیادہ [illegible] تھی ——— یہ سوچ کر اس نے [illegible] کیا [illegible] کہ وہ سہیل [illegible] ہو گئی ———
ایسے میں اسے سہیل کا خیال آیا۔

"ہیلو!" اس نے فون کیا۔ "بھلا بوجھو تو سہی ——— میں کون ہوں؟"

"ارے پہچان: ——— ارے میں ہی ہوں ——— دراصل مجھے کوئی کتاب چاہیے ——— وہ بولی۔"

وہ ہنس رہا تھا ——— اسے بھی ہنسی آ گئی: "بھلا اس میں اتنی مشکل کیا بات ہے؟"

"تم نے نسیم سے وہ کتاب کیوں نہ لے لی؟"

وہ چونک گئی۔ سہیل سمجھا کہ وہ [illegible] کی کتاب پڑھنا چاہتی تھی ——— اور اس کتاب کا خیال آتے ہی اسے وہ عورت یاد آگئی
——— اور پھر وہ خوفناک [illegible] ——— معذور ——— سیاہ پلکوں والی عورت! وہ سہم گئی۔ کمرے میں کسی کی آہٹ آئی، پھر جیسے کسی کے سانس
لینے کی آواز گونجنے لگی ——— اس کے کانوں کے پردوں سے آوازیں ٹکرانے لگیں ——— کمرہ [illegible] سے بھر گیا۔ وہ چیخ پڑی
——— نہیں سہیل ——— مجھے وہ کتاب نہیں چاہیے ———"

"رضیہ ———!" اسے بھابی کی آواز سنائی دی ——— اس نے پلٹ کر دیکھا، بھابی اس کے پیچھے کھڑی تھی
فون میں سہیل کی آواز آ رہی تھی: "تم ڈر گئیں! بھئی بڑی ڈرپوک ہو ——— بڑی بزدل ہو ———" وہ چھیڑنے لگا۔

[illegible] ہی آپ [illegible] گیا [illegible] مجھے [illegible] کتاب [illegible] ادھر [illegible] سالی ماں [illegible] سے [illegible] علیحدہ کر دیا

بھابی کی [illegible] دیکھ [illegible] نہیں ہے [illegible] وہ [illegible] ہے ——

[illegible] ہوتی [illegible] پھر [illegible] سے بولی "[illegible] رضا [illegible] چاہیں ——

"[illegible]"

[illegible] وہ دوسرے کمرے میں تھی —— بہت [illegible]

بھابی [illegible]

"[illegible] بتاؤں —— وہ پھٹ کر [illegible] سے [illegible] میں [illegible] گئے —— [illegible]

[illegible] وہ [illegible] ہو گئی ——

رضا نے سوچ کر وہ [illegible] ہو گئی۔ [illegible] وہ [illegible] تھی —— [illegible] کیوں دیکھ رہی ہو جیسے خواب دیکھ رہی ہو ——

[illegible] پھولوں کی [illegible] رضا نے [illegible] اٹھایا "[illegible] —— نہیں! —— [illegible] رضا ہوں —— [illegible]؟ [illegible] وقت لے گا؟ [illegible] نہیں —— ابھا کل [illegible] بھابی —— بابی!

بھابی [illegible] آج دیکھو رضا —— وہ مجھے یوں [illegible] دور چلے گئے ——!

وہ بھابی کی بات [illegible] رضا کی فکر کیوں کرتی ہو —— ابھی انھیں گئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں —— بھابی!

بھابی نے رضا کی طرف دیکھا "رضا —— کیا تمہیں چار دن کچھ نہیں ہوتے —— [illegible] انھیں [illegible] پاس ہی ہونا چاہیے تھا —— میں انھیں بتاتی کہ ان کی خواہش پوری ہو [illegible] —— !" وہ رک گئی۔

رضا کو کچھ یقین نہ آیا "[illegible] واقعی —— سچ بھابی!"

بھابی نے صوفے پر بازو رکھ دیے اور سر جھکا لیا —— "ہاں! —— میں ماں بننے والی ہوں مگر —— کاش! میں انھیں بتاتی کہ ان کی یہ خواہش پوری ہونے دیکھ کر میں کتنی خوفزدہ ہوں —— کتنی ڈر گئی ہوں میں ——!"

رضا جیسے خوشی کے مارے دیوانی ہو گئی "ارے بھابی! ہمیں بتایا تک نہیں —— ارے بھیا کتنے خوش ہوں گے —— وہ تو بس آنے ہی والے ہوں گے!"

"اونہہ! بھابی نے [illegible] "کاش یہ جنگی مشقیں ختم ہو سکتیں ——!"

رضا ایک دم جیسے بہت بڑا سیاست [illegible] کا روپ دھار بیٹھی "امن کے لیے یہ سب چیزیں ضروری ہیں ——"

"امن —— امن" بھابی نے اس کی طرف [illegible] نظروں سے گھورا —— دنیا میں کون ہے جو سکون نہیں چاہتا امن نہیں چاہتا اور پھر —— پھر رضا تم کیا جانو جب میں سوچتی ہوں کہ وہ پائلٹ ہیں اور خدانخواستہ کسی روز یہ جنگی مشقیں ——"

"بھابی!" اس نے [illegible] بات کاٹی ——

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اسے بڑی حسرت ہو رہی تھی

اخبار کا کالم ختم کیا ... پھر سب ٹھیک ہو گیا تو سارا کا خیال ہی چھوڑ دیا۔ ساتھ کمرے میں جا کر پڑھنے لگی لیکن پھر [illegible] گرمی لگی تو جب اپنی اخبار لیے اس کے کمرے میں آئی ... اسے دالی ... یہ خبر پڑھی ہے؟"

"کیا؟"

"وہ جو ہمارے گاؤں ... زخمی تھا ..."

وہ مر گئی ... [illegible]

ارے سنو تو ... اسے گرفتار کر لیا گیا ہے ...

"نہیں" اس نے تعجب سے کہا، یہ بھابی سے اخبار چھین لیا ... اور پڑھنے لگی ... مگر اخبار کے حروف جیسے اس کی نظروں کے سامنے پھیلنے لگے ... اور آنکھوں کے سامنے چھوٹے چھوٹے معذور بچے پھرنے لگے ...

بھابی کہہ رہی تھی ... "کہتے ہیں کہ کل شام وہ [illegible] وہ سڑک پر ... بچے لیے بھیک مانگ رہی تھی کہ ایک شخص نے جو کہ بہت امیر تھا وہاں اس کے بچوں پر ترس کھا کر اسے بھیک دی ... اور ..."

اس نے اخبار ایک طرف پھینک دیا ... اور ... اور؟"

"اس شخص کا ایک ہی بچہ تھا ... بھابی کو واقعات سنانے میں کمال حاصل تھا ... اور وہ بچہ دو تین سال ہوئے بچپن ہی میں گم ہو چکا تھا ... اس شخص کو سڑک میں پڑے ہوئے ایک معذور بچے پر بار بار بے اختیار پیار آتا ... اور بچے کا نام اس کے منہ میں گھومنے لگا ... مگر عورت بچے کو کسی اور نام سے بلاتی رہی ... مگر اس آدمی سے نہ رہا گیا اور اس نے اپنے بچے کا نام لے کر پکارا ... بس بچے نے جھٹ سے پلٹ کر اسے دیکھا ... وہ بچہ بول نہیں سکتا تھا ... اس بیچارے کی زبان کٹی ہوئی تھی ..."

"ہائے —!" رضا مارے حیرت کے منہ کھول بیٹھی۔

بھابی بولی "تب پولیس کو بلا کر اس شخص نے اس عورت کو گرفتار کرا دیا —— اس عورت نے اپنے جرم کا اقرار بھی کیا —— ہے ہے —— کتنی خوددار عورت تھی —— لوگوں سے بھیک مانگنے کی خاطر —— سنا ہے کہ کوئی تین چار ہزار روپیہ تو اس کا بینک میں بھی جمع ہوا ہے"

رضا نے حسب عادت "استغفر اللہ —— ایسی عورت کو سخت ترین سزا ملے"

بھابی بولی: "بس کمبخت جیسی کئی کو ایسے ہی ایک کے آگے بھیک دینا چاہئے"

اس دن رضا کو دن بھر یہ واقعہ یاد آتا رہا —— اسے یوں محسوس ہوتا جیسے ابھی ابھی اس کے آگے سے کوئی عورت گزر رہی —— سارا دن وہ مرجھائی کلی کی مانند بستر پر پڑی رہی۔ چہرہ سایہ ہو گیا ہوا اور آنکھیں دہشت زدہ سی۔ بعض اوقات جب اسے یہ خیال آتا کہ وہ بھی بچے جننے والی ہے تو مسرت کی ایک لہر اس کے تن بدن میں دوڑ جاتی مگر دوسرے ہی لمحے جیسے سہم کر رہ جاتی —— اللہ —— کہیں کوئی عورت آ کر اس کی خوشیاں لوٹ نہ لے ——

نعیم حسب معمول شام کے وقت آیا اور اس کی طبیعت خلاف معمول دیکھ کر بہت گھبرایا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ وہ اس عورت کے ذکر پر اپنا موڈ خراب کیے بیٹھی ہے تو بڑا ہنسا اور لگا اسے چھیڑنے۔ اس کی ان باتوں پر وہ مسکرا کر رہ گئی —— وہ کہنے لگا۔

"بیگم —— ایسا ہوتا ہی کیا ہے —— تم خواہ مخواہ ڈرتی ہو۔"

رضا بات کاٹ کر بولی "بس نعیم بس —— اس کا ذکر نہ کرو"

وہ پرانی بات کو پھر سے چھیڑتے ہوئے بولا "میں نے ایک افسانے میں پڑھا ہے کہ ایک عورت پیسے کی خاطر اپنی ہی اولاد کو معذور کر کے لوگوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ روپے کی مالک بنی رہتی ہے —— فرق صرف یہ ہے کہ یہاں یہ عورت دوسروں کے بچوں کو اپنی بھیک کی خاطر ——"

"بیگم —— اللہ —— نہیں نہیں بھلا کوئی اپنی اولاد کو کیسے دکھ پہنچا سکتا ہے ——"

"پیسہ —— پیسہ سب کچھ ہے ——"

رضا نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا —— "بس بس —— اور کچھ نہ کہو"

آہستگی کے ساتھ اس نے اس کا نرم و نازک ہاتھ اپنے منہ پر سے ہٹایا اور اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا —— وہ شرما گئی ——

اور نہیں کچھ عرصہ کے بعد جب اس نے رضا کا گھونگھٹ اٹھایا اور آنکھوں میں جھانکنا چاہا تو وہ چھوئی موئی کی طرح سمٹ کر رہ گئی —— سرخ سرخ کپڑوں میں وہ ایک گٹھڑی کی طرح پڑی ہوئی تھی اور وہ سر جھکائے ایک ہاتھ سینے پر رکھے کہنے لگا —— "بیوی آنکھیں کھولو —— میں ہوں تمہارا غلام"

اور پھر ہاتھوں میں مہندی رچائے ذرا سا گھونگھٹ نکالے آنکھیں لاج کے مارے بند کیے رہی —— رخصتی کے وقت بھابی نے کیسی شرارت کی تھی —— اپنے بڑھے ہوئے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے بولی تھی "اے رضا ذرا خیال رکھنا —— اتنی جلدی یہ روگ نہ لگے —— ویسے یہ روگ ہے بڑا پیارا" —— وہ سرگوشی کر گئی تھی

اور پھر [illegible] چھوڑ جائی [illegible] کے سامنے کھڑے ہو ۔۔۔ وہ [illegible] تھا [illegible]
[illegible]
چلتے ہی پہلے کچھ نہیں۔

[illegible] جیسے [illegible] ساتھ [illegible] خوش [illegible]
[illegible] جواب [illegible]

[illegible] ۔۔۔
وہ چونک [illegible] سن رہی تھی ۔۔۔

جانتی ہو [illegible] ۔۔۔ [illegible] ۔۔۔

[illegible]

[illegible] عجیب [illegible] ۔۔۔

وہ پھر [illegible] کیا مطلب ہے ؟

جانتی بھی ہو ۔۔۔ [illegible]
[illegible] ایک [illegible]
رمکو بھابی پر غصہ آنے لگا ۔۔۔ [illegible] ۔۔۔ ایک ۔۔۔ [illegible] کیا حال ہوا ۔۔۔

بھابی بولیں [illegible] نے [illegible] ۔۔۔ [illegible] بات کی ۔۔۔

بات کاٹ کر وہ بولی : بھابی جاؤ بھی نا ۔۔۔ بس

[illegible] عورت [illegible] ساتھ [illegible] ایک [illegible]
[illegible] کے متعلق پوچھا [illegible] نے کہا [illegible] اور [illegible]
[illegible] اور [illegible] ۔۔۔ اور [illegible] عورت نے کہا ہے کہ وہ [illegible]
[illegible] بچوں کو لے کر [illegible] اور پھر ۔۔۔

[illegible] ۔۔۔ پھر بھابی نے کیا کہا اس نے کچھ سنا ہی نہیں [illegible] اس [illegible] نے [illegible] کہ
یہ بھی دور ہے [illegible] کیا ایک عورت کے بچوں سے ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ نہیں ۔ ۔۔۔

میکے سے وہ واپس آئی تو اداس اداس سی۔

پھر دن گزرنے لگے ۔ پہاڑ کے سے دن ۔۔۔ وہ زندگی کی اس راہ پر آ پہنچی تھی جہاں چوراہے بنتے ۔۔۔ زندگی میں سے بہت سی نئی نئی پگڈنڈیاں جنم لیتی تھیں [illegible] نئی راہیں نئے راستے ۔۔۔ اور وہ درمیان میں کھڑی دل ہی دل میں ڈر کے [illegible] رہی تھی کہ کہیں اس کے قدم سیدھی راہ پر چلنے کی بجائے غلط راستے پر نہ پڑ جائیں ۔۔۔ [illegible] کی بجائے [illegible] کی جانب نہ کھینچ لیں۔
پھر ماہ گزرنے لگے ۔۔۔ چاند ہر ماہ اپنی صورت بدلنے لگا ۔۔۔ اس کا روپ بھی [illegible] گرگٹ کی مانند رنگ بدلنے لگا [illegible]

پریشان ہو گیا۔ وہ خوفزدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی رہی، وہ [illegible] زور زور سے [illegible] کے [illegible] سے کسی نے اس کو مجبور کیا ہے اور وہ [illegible] کے قابل نہیں [illegible] گرنے اور [illegible] کر رہ جاتیں [illegible] رہ گئے جیسے [illegible] ہاتھوں میں پانی سے بھرے ہوئے کچے گھڑے دبے ہوئے ہیں [illegible]

صبح سویرے جب [illegible] نے ہوئے [illegible] کے [illegible] تو وہ سہمی ہوئی ہو کر رہ جاتی۔ [illegible] ایک [illegible] آواز پیدا کر [illegible]

اور پھر وہ [illegible] سے اس کے ساتھ [illegible] سہیل کی طرف دیکھتی اور سہیل [illegible] کچھ [illegible]

وہ اپنے ہاتھوں سے [illegible] گھٹ کر رہ گئی ہوتی اور [illegible] رہ جاتی۔

"نہیں ایسے [illegible] تمھیں کیا ہو گیا ہے؟"

[illegible] اس کی نگاہیں اپنے [illegible] کے ہاتھوں پر جا ٹھہرتیں اور وہ [illegible] سے پوچھتا [illegible] کیا ہو گیا ہے؟ اور [illegible] کچھ نہ آتا تب آنسو اس کی پریشانی اور غمگین آنکھوں سے [illegible] کی مانند [illegible] لگتے۔

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا اس کی پریشانی زیادہ ہوتی جا رہی تھی۔ [illegible] کے [illegible] روز بھابی بنا [illegible] پیٹ لیے آن موجود ہوتی۔ "چلو گی [illegible]؟"

وہ کچھ نہ کہہ سکی بس خوفزدہ نگاہوں سے بھابی کے پیٹ کو گھور کر رہ گئی۔

بھابی جیسے [illegible] کے ساتھ بولی: "وہاں اسے [illegible] گے۔ [illegible] کو ......"

اس کا دل چاہا کہ زور سے چیخیں مارے اور بھابی کے بال نوچ کر رکھ دے۔ اس کے پیٹ کو پھاڑ ڈالے اور پیدا ہونے والے ایٹم کے ذرات بن کر فضا میں بکھرے اور تحلیل ہو جائے۔ مگر وہ کچھ نہ کر سکی۔ بڑی بے قرار ہو کر اضطراری کیفیت کے ساتھ اس نے پاس [illegible] پکارتے ہوئے کہا: "نہیں بھابی ۔۔۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں!"

بھابی چلی گئی تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

اور اس روز صبح سویرے اخبار پڑھتے ہوئے سہیل نے اسے خبر پڑھ کر سنائی: "ارے دیکھا تم نے ۔۔۔ فرانس نے پھر ایٹم بم کا تجربہ کر دیا ۔۔۔ بڑا کامیاب تجربہ ......"

وہ چیخ اٹھی ۔۔۔ "سہیل!"

وہ گھبرا کر اخبار چھوڑتے ہوئے اٹھ [illegible] کیا ہوا ۔۔۔ [illegible]"

اس نے اپنے نچلے لب کو دانتوں سے کاٹ کاٹ لیا اور جواب میں کچھ نہ بولی ۔۔۔ اور اسی وقت بھابی کے ہاں سے نوکر نے یہ اطلاع آ کر پہنچائی ۔۔۔ "بی بی کے ہاں لڑکا ہوا ہے۔"

اس نے مدہوشی کے سے عالم میں یہ خبر سنی اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے میکے میں وہ عورت اپنا ایک بچہ چھوڑ کر [illegible]

[illegible] ۔۔۔ وہ معذور بچہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

پھر کچھ وقت اور گزرا ۔۔۔ اور بچہ پیدا ہوا

[illegible] اسے ۔۔۔ تو وہ بیٹھ گئی۔

[illegible] وقت جانے سے پہلے [illegible] جلدی آ جاؤں گا۔ چھٹی لے لوں گا ۔۔۔ [illegible]
[illegible] ۔۔۔

وہ چونک گئی۔ اس نے دیکھا [illegible] کوئی بھیک مانگ رہی ہے ۔۔۔ اس نے بیٹھ کر سامنے
کی [illegible] دیکھنے کی کوشش کی

دہشت زدہ ہو کر وہ پلنگ پر جیسے ڈھے گئی ۔۔۔ وہی عورت [illegible] بھیک مانگ رہی ہے ۔۔۔ اسے یوں محسوس
ہوا جیسے اس کے پیٹ میں کسی معذور بچے نے کروٹ لی ہے ۔ وہ خود بھی تو اپنے پیٹ کی ریڑھی میں اپنے معذور بچے کو لیے بیٹھی ہے
۔۔۔ اور ۔۔۔ اب ۔۔۔ اب؟

وہ بھی اپنے بچے کو لے کر بازاروں میں پھرے گی ۔۔۔ وہ بھیک مانگے گی ۔۔۔ نہیں اسے بھیک مانگنے کی ضرورت کیا ہے؟
وہ بھیک نہیں مانگے گی وہ تو صرف اپنے بچے کی نمائش کرے گی ۔۔۔ یہی دورِ جدید پیدا ہونے والا معذور بچہ ۔۔۔ ہاتھ پیر سے محروم ۔۔۔
نقل و حمل کرتا گوشت کا ایک جاندار لوتھڑا ۔۔۔ ایٹم کی اولاد ۔۔۔ وہ اس کا بچہ نہیں!!

اسے شدت سے یہ محسوس ہونے لگا جیسے اس کے پیٹ میں اس کا بچہ نہیں! ایٹمی دور کا ایک بگولا ہے جو ایک دم اس کے

پیٹ کر چاک کر کے فضا میں تحلیل ہو کر سارا جہاں نیا بن جائے گا — سنہرا — سنہرا!!

اور دیکھو! اسے ہر طرف رنگ نظر آ رہا ہے — سیاہ، سرخ فضا میں پھیلا ہوا ہے — مگر اس کی پہچان کا دن جیسا دو۔
یہ تو تجربہ اس کی زندگی کا جسے دیکھا ہے میں نے — وہ ایک سنہرا ہو گا جیسا وہ کچھ نہیں —!

اور فضا میں تیرتے ہوئے — دیکھو! اگر اس کی طرح سفید فاختاؤں کا ہجوم کر دے یہ ناتائیدہ ہی میں سے نفیس
ہوائیں — انھیں بچاؤ — وہ سنہری دنیا کا امن زرد ہو جائے گا۔ پھر تو پکڑ جائے گا — جیسے اس کا شعور ختم ہو رہا ہے۔

اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ بچہ نہیں رہی ہے بلکہ بستر پر بیٹھ کر کنگھی کر رہی ہے — اس کی رگ رگ میں کسمساہٹ
پیدا ہو رہی اور آنکھیں پھیلنے لگیں — ساتھ سفید فاختاؤں کے پیروں کی پھڑپھڑاہٹ پیدا ہونے لگی — یہ پروں کی پھڑپھڑاہٹ
فاختاؤں کی نہیں، یہ تو نورانی فرشتوں کے پروں کی ہے۔ یہ سارا آسمان سفید سفید فرشتوں کے سفید پروں سے ڈھک گیا ہے — سیاہ بادل
نہیں — یہ ان کی فاختائیں نہیں، یہ تو رحمت سفیدی کا روپ دھار کر آئی ہے۔

جیسے ان کے سارے جسموں میں درد نے پناہ لے لی اور تکلیف کے مارے اس نے اپنے دانت بھینچ لیے، پھر اس
نے جیسے آخری بار ایک لمبا سانس لیا اور خود کو سفید پروں والے فرشتے کے حوالے کر دیا — اور اس کا بدن نور و نکہت و سپید ہو گیا

اس کی آنکھیں کھلیں تو اس نے دائیں طرف دیکھنا چاہا، مگر جیسے گونج کے ایک لمحے کے تجربے کا احساس ابھی باقی تھا
اس دھندلکے کی چادر میں سے ہر چیز پھیکی پھیکی، بہم بہم سی تھی، اس نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں۔

پھر سفید پروں والے فرشتے نے آہستہ سے جھک کر کہا: "اپنے بچے کو دیکھیے۔"

اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں — سفید — سفید — ہر چیز سفید — اور سامنے ایک نرس کھڑی تھی، وہ کہہ رہی تھی۔
"بچے کو دیکھو......"

"نہیں — نہیں!" وہ درد بھری آواز میں چلائی: "نہیں! میں اسے نہیں دیکھ سکتی — میں نہیں دیکھنا چاہتی!"
اور اس نے آنکھیں زور سے بند کر کے دیوانوں کی طرح رونا شروع کر دیا۔

———

پربت کیسے دُکھ ہوئے

صالحہ صدیقی

سب تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ ہم لوگ کار میں بیٹھے رہے تھے۔ [illegible] کوشش کر رہی تھی۔ [illegible] ہو گئے۔ [illegible] آپ [illegible]

[illegible] بھائی جان نے [illegible] [illegible] [illegible] جان سے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] صاحب [illegible] بھائی جان اور بھابی جان [illegible] ہو گئے [illegible] اور [illegible] تمہارے [illegible] تیس سال [illegible] بڑی مشکل سے [illegible] ہے۔"

اب مجھ سے آنسو ضبط نہ ہو سکے اور [illegible] شہاب نے بتایا کہ وہ ایک [illegible] ہمارے پاس [illegible] میں نے سوچا کچھ تو مل جائے گا۔ [illegible] بھائی [illegible] زیادہ [illegible] پیار آتا ہے [illegible] اچھا [illegible] اور پھر [illegible] کے چکر میں [illegible] پردیسی [illegible] وہ ایک [illegible] کی روشن [illegible] گیا۔ چلتے وقت اس نے مجھے ایک بڑے سے [illegible] PAINTS [illegible] اکیلی گھبراؤ گی۔ خالی وقت میں تصویریں بنایا کرو۔ تمہارے ہاتھ میں [illegible] ہے۔"

اس کے جانے کے بعد گھر بڑا سنسان ہو گیا۔ اوپر کی منزل میں بھائی جان اور بھابی جان رہا کرتے تھے۔ [illegible] میرا کام تو بس یہ رہ گیا تھا کہ ان کے خطوں کا انتظار کرتی رہوں اور تصویریں بناتی رہوں۔ ایک دن شہاب کا خط آیا۔ لکھا تھا کہ کرسمس کی چھٹیوں میں [illegible] چاہئے تاکہ [illegible] دیکھی جائے۔ [illegible] گھر میں پڑے پڑے اکتا ہی گئی تھی اس لیے سب سے زیادہ مجھے خوشی ہوئی۔ بھائی جان اور بھابی جان بھی فوراً رضامند ہو گئے اور دو دن بعد ہی ہم تینوں [illegible] میل سے روانہ ہو گئے۔ [illegible] بھی سفر میں شریک ہو گیا۔ بڑا ہی خوبصورت موسم تھا۔ سفر بہت ہی اچھا گذرا۔ [illegible] پلیٹ فارم پر جبکہ ہمارا سامان اتر رہا تھا ایک صاحب [illegible]

دو بھائی جان سے لپٹ گئے۔ صحن میں پیپل کے بڑے بڑے درخت لگے ہوئے ہیں۔ ان کا سایہ گھنے کی طرح سفید تھا اور جسم ضرورت سے زیادہ موٹا تھا۔ اطراف سے پتے چلا کر یہ بزرگ وہ رہے ہے کہ پاس سے آموں ہوتے ہیں اور برسوں سے جیسے رہتے ہیں والے ہیں کہ کیسے لگتا ہے کہ پیپل کے نیچے زمین پر بیٹھے ہوئے بوڑھے ہوش میں بیٹھے ہیں۔

عجیب تعلق تھا۔ بہت بحث کے بعد یہ پاماں کی ماں پڑھی اور ساتھ ہی پہلی بار ان کا گھر دیکھ کر یہ وقفہ رہنے کو بہت ہی خوش ہوتیں کہ شکوہ بیچ دو دیں بس کام رہا۔ ایک چھوٹے سے ٹیلے کے سرے پر چھوٹا سا بنگلہ سبزہ اور رنگ برنگے پھولوں سے گھرا ہوا تھا۔ خاص طور پر اس نے غضب کا ایک کمرہ و باغ ڈھلان پر کھلتا تھا۔ اس کے آگے برآمدہ تھا۔ اس برآمدے میں دو ستون پر بیلیں شاعرانہ انداز سے گلے مل رہے تھے۔ یہاں سے دور دور تک اچھا نظارہ ہوتا تھا جس سے سوچا جا سکتا ہے برفباری کا نظارہ اچھا ہوتا جا سکتا ہے۔

ماموں جان کی دو لڑکیاں تھیں۔ صاف حسن سے رنگ اس کے نام رامس ہونا زلف لمبے لیکن انھیں پیار سے راحی اور نازی کہا جاتا تھا۔ راحی نازی سے دو سال بڑی تھی۔ بھائی جان اگرچہ عمر میں ماموں جان سے کہیں چھوٹے تھے مگر بہت جلد دونوں میں دوستی ہو گئی۔ وہ دونوں دنیا و مافیہا سے بے خبر سارا سارا دن باغ کے کسی کونے میں بیٹھے کیس میں گم رہتے۔ راحی اور نازی بڑی جلدی گھر سے گھل مل نہیں سکتی مگر دوں کے سامنے خاص طور پر شہاب کی موجودگی میں وہ بہت کم بولتیں۔ مجھے ان کا یہ شرمیلا پن بہت اچھا لگتا تھا کہ بھائی جان کے دل میں بھی دونوں کے ارمان جاگ رہے تھے۔ میں سوچتی تھی کہ کیسے افسانوی طریقے پر یہ ملاقات ہوئی ہے۔ ایسا افسانہ میں نے کبھی نہ پڑھا تھا۔ بجائے مجھے حسوفی بھائی آتی پیاری سی مل سکتی ہے مگر یہ نہیں سمجھ سکتی تھی کہ ان میں سے کون سی اپنے شہاب کے لیے زیادہ مناسب رہے گی۔

ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔ سب لوگ شام کی چائے پی رہے تھے۔ باہر بوندا باندی ہو رہی تھی۔ کچھ ناموں کا ذکر تھا بھائی جان کو راحش نام زیادہ پسند تھا اور مجھے نازش۔ پتہ نہیں شہاب کو کیا سوجھی ایک دم بولا: "مجھے تو رامش پسند ہے۔" اس کا مطلب نام سے تھا مگر وہ ایسا بے ڈھنگا جملہ بولا تھا کہ خود ہی جھینپ گیا اور کہنے لگا "وہ میں یہ کہ ... یہ مطلب ہے اس کے معنی بڑے اچھے ہیں ....."

یعنی مانگ ... سب نے بات ٹالی۔ بھائی جان نے بھی موضوع بدلنے کے لیے جھٹ اُلٹے سیدھے گزرانے شروع کر دیے مگر اتنی دیر میں راحی کا چہرہ پسینوں سے تر ہو چکا تھا۔ کسی لڑکی کا تمتماتا چہرہ میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ کسی بہانے اُٹھ کر چلی گئی۔ شہاب کی آنکھیں تیرتی کسی سے زمین پر گڑی ہوئی تھیں۔ بہت ہی بے تکا سا ماحول ہو گیا۔ اس کے بعد جتنی بار بھی میرا راحی سے سامنا ہوا مجھے یہی آواز گونجتی معلوم ہوتی کہ "مجھے تو رامش پسند ہے۔ مجھے تو رامش پسند ہے۔ مجھے تو راحی ......"

ہماری واپسی کے دن قریب آ رہے تھے۔ برفباری زور شور سے ہو رہی تھی۔ دیوالی ہونے کی خوشی میں ماموں جان نے بڑی شاندار پارٹی دی۔ بہت سے لوگ آئے۔ ان میں کئی نوجوان راحی اور نازی کے امیدوار بھی تھے۔ اس دن ان دونوں بہنوں نے خلاف عادت شوخ رنگ کی ساڑیاں پہنی تھیں اور لپ اسٹک بھی لگائی ہوئی تھی۔ کسی بات پر راحی کو بے بی پر بیساختہ پیار آ گیا۔ اس نے اسے گود میں اُٹھا کر چوم لیا لیکن جونہی بے بی کو گود سے اتارا میں نے دیکھا کہ راحی کے ہونٹوں کے نقوش بے بی کی پیشانی پر بن گئے ہیں۔ اس نے بھی دیکھا اور شرمندہ سی ہو کر بولی "اوہ معاف کیجئے گا۔" میں نے بے بی کا منہ گندا کر دیا۔ مجھے خیال نہیں رہا کہ ......"

کر دیا تھیں۔ میں منتظر رہا۔

مجھے یہ تو تمام باتیں معلوم ہی ہیں۔ اس نے بہت کچھ کیا لیکن ہم بالکل ہی ٹھیک نہیں پائی۔ اس وقت وہ بڑی شفقت سے بولی تھی۔ داتا۔ جب سب MUSICAL CHAIRS کھیلنے لگے۔ ایک جیلیاں آ کر سے اپنی جگہ چھوڑ کر بیٹھ گئی۔ جب سب بیٹھتا بیاہ دل، وہ چکر کہیں بھی گر کر بیٹھ جاتے۔ میں نے محسوس کیا جیسے اچانک سے کوئی کرسی دونوں کے بیچ میں شہاب سے لگ رہی ہے کہ سب میری جان پر بن آئی۔ پاس ہی کوئی زنگ لگ گئی اور میرے پاؤں ہی میں جھٹکے سے لگے۔ میں نے غور کیا کہ شہاب سے لگی پیشانی پر پیار سے سب جیسے بالکل ہی اپنی جان دے رہا سا میری کمر پر ہاتھ رکھے ہوئی تھی۔ میں کچھ بھی نہ سمجھ سکی وہ ان سے بیٹھے آگے۔ اس وقت وہ ہر سمت میں ہم لوگ واپس آ رہے تھے۔ پہلے سے وہ دیکھتے رہے کہ سب۔ سب ہی نہ ہوں سے پڑھ رہی تھی۔ چلتے وقت نانی نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں اس کے گھر کی تصویر بنا کر بھیجوں اور اس میں جو ہے اس کا منہ نکلاؤں۔ میں نے وعدہ کر لیا کہ ضرور بنا دوں گی۔ مالکن کا سر اتنا اچھا لگتا تھا کہ ایسا لگتا تھا جیسے شہاب اپنا تمام کچھ اس رنگ کی تصویر میں چھپا آیا ہو۔ وہ بظاہر بڑا خوش تھا کہ اس کی ہنسی اس کے مذاق سب سنتے ہی تھے۔ بچوں کے شوق پر وہ ہر کسی ہو لیا۔ مجھے یقین ہے وہ ہر وہ ہے کر سے اس جگہ کو تو ہوا ہو گا۔ ہم گھر پہنچے تو دیکھا اس کا خط آیا۔ کہا ہے ہم نے جلدی سے اس کا جواب لکھ کر ٹھیک ٹھاک کر دیا۔ سب بالکل ہی کچھ نہ تھا اس سے پیغام تیار رکھا اور زندگی اپنے پرانے ڈھب پر چلنے لگی۔

ایک دن میں چھٹی کر کے سارا دن پڑھ رہی تھی کہ سب لوگ آتی ہوئی اندر گھسی ــ

ڈول نہ دن ڈولن کی

مالی اچھی صورت کی ا

وہ ساتھ ساتھ آ ئیاں بھاگی جا رہی تھی۔ مجھے شبہ سا ہوا سی لگی۔ پاس جا کر پوچھا۔ تمہاری اچھی صورت والی مالی اس وقت کیا کر رہا ہے؟ میرا مطلب بھائی جان سے تھا۔

وہ بولی "یہاں تھوڑی ہیں"

میں نے کہا "اوپر چلو گی نا۔ تم اوپر ہی سے تو آ رہی ہو آخر؟"

بولی "واہ! وہ تو کرسٹے میں ہیں۔"

میرا دل چھوٹا۔ یا اللہ یہ چار سال کی بچی نے کیسے کہہ دیا۔ کیا قدرت نے اتنی سی بچی کے دل میں بھی یہ بات ڈال دی ہے۔ شہاب تمام خود کی شرارت ہے۔ وہ بڑا پاجی لڑکا ہے۔ مجھے کرسٹے میں گزارے ہوئے وہ سب دن یاد آ گئے خاص طور پر وہ پانی والی شام۔ اس کے بعد مجھے نانی کی فرمائش یاد آئی۔ اس شام میں اس گھر کی تصویر بناتی رہی اور کچھ سوچتی رہی۔

دن گزرتے رہے۔ خزاں کے دن آ چلے تھے۔ پت جھڑ شروع ہو چکی تھی۔ شہاب کا خط کبھی کبھی آ جاتا تھا البتہ ان کے خوابیدہ پابندی سے مل رہے تھے۔ ستمبر ختم ہونے والا تھا۔ شاید ۲۹ تاریخ تھی۔ اس منحوس دن مجھے ایک خط ملا۔ یہ نانی کا تھا۔ شہاب کا میں نے بیتابی سے کھولا۔ کرسٹے سے ماموں جان نے لکھا تھا کہ رامی کی کسی کیپٹن سے منگنی ہو رہی ہے۔ ہم سب کو شرکت کی دعوت دی تھی۔ مجھ پر تو جیسے بجلی ہی آن گری۔ میں تو سب ہی لٹ گئی۔ دوڑی دوڑی گئی۔ بھائی جان کو خط دکھایا۔ مسکرا کر بولیں: "بیچارہ کیا ہوا۔ دوسری بہن کیا کم ہے!"

بلکہ پہلی نظر میں ہی ہے۔ مجھے جیسے پہلی دفعہ بہاں جان پر حقہ آگیا۔ مگر اس بیچاری کا کیا قصور۔ انہیں تو شاید [illegible]
تھا۔ نہیں شہاب کے دل کی بات کیوں کسی کو شناسائی تھی اس لیے ہی چپ رہی اور اپنے کمرے میں آگئی۔ دل چاہا وہ ان [illegible]
کے بھید اندر کہیں گم شدہ کے رہ گئے۔ ماموں جان نے بھی کہا تھا کہ انہیں نے شک ہے ایک دعوت نامہ شہاب کو بھیجا ہے۔

اس کے بعد بہت دنوں تک شہاب کا کوئی خط نہیں آیا۔ میں انتظار کرتی رہی۔ وہ چھٹیاں ختم ہوتے ہی چلے گئے۔ پھر
کی چھٹیاں شروع ہو گئیں۔ میں نے شہاب کو لکھا کہ وہ چھٹیاں ہمارے ساتھ گزارے۔ اس کا جواب آیا کہ میں اس مرتبہ [illegible] نے
لکھا تھا کہ وہ اس سال بھی برفباری دیکھنا چاہتا ہے کوئٹہ جائے گا۔ مجھے بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی تھی مگر میرا بالکل ارادہ نہیں تھا [illegible]
سے ملنا نہیں چاہتی تھی لیکن شہاب کہتے تھے کس کی چلتی ہے۔ وہ خود مجھے لینے آگیا اور بہت اصرار کیا تو میں مان گئی۔ بھائی جان [illegible]
پہلے ہی دن ایبٹ آباد کا پروگرام بنا چکے تھے اس لیے وہ ہمارے ساتھ نہیں گئے۔

پھر ایک سال بعد انہی دنوں میں ہم کوئٹہ گئے۔ ماموں جان نے بڑے جوش سے ہمارا استقبال کیا۔ بہت ہی خوش تھے
سٹیشن سے گھر تک کے راستے میں ہی شکایتیں کرتے رہے کہ رانی کی منگنی پر کیوں نہیں آئے۔ مجھے رانی کو دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ مجھے
یقین سا تھا کہ صرف اپنے مجاز کی وجہ سے وہ شہاب کی محبت کا اعتراف نہ کر سکی ہوگی اور اب شہاب سے مل کر کہیں وہ تڑپ نہ جائے
کچھ یہی اندیشہ خود شہاب کو بھی تھا۔ ہم جب وہاں پہنچے اور ٹیلے پر چڑھ رہے تھے تو شہاب کی گردن جھکی ہوئی تھی شاید وہ انہی خیالات میں تھا
۔ وہ سوچ رہا ہوگا کہ رانی اسے دیکھ کر کسی بہانے دوپٹہ کا پلو آنکھوں پر سے رگڑ ڈالے گی۔ اس کی مسکراہٹ میں غم کی جھلک ہوگی۔
اس کا لباس سادہ ہوگا۔ اس کی انگلی میں کوئی انگوٹھی نہ ہوگی ...... کوئی نہیں ...... خاص طور پر اسے وہ منگنی کی انگوٹھی تو سخت ناپسند ہوگی
لیکن جب چڑھائی ختم ہوئی اور ہم ان سنتریوں کے پاس سے ہو کر برآمدے میں پہنچے تو وہاں دونوں بہنیں کھڑی تھیں۔ معلوم [illegible] مسکرا رہی تھیں
جس سنتری سے رانی ٹیک لگائے کھڑی تھی اس پر سرخ پھولوں کی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ خود رانی نے سرخ رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ کاجل کی لکیر جو
اس کی آنکھوں کی چمک کے سامنے ماند پڑی ہوئی تھیں۔ اس کی تیسری انگلی میں ایک بڑا سا ہیرا جگمگا رہا تھا۔ عجیب انداز سے اس نے
ہاتھ اٹھایا اور مسکرا کر سلام کیا۔ کمرے میں صاحب کی چمک میں انگوٹھی ہیرے سے شعاعیں پھوٹیں۔ جب ہم اندر بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو پتہ چلا
کہ آج شام رانی کے منگیتر کی دعوت ہے۔ نازی نے کہا: ”چلیے آج ہم آپ کا ان سے بھی تعارف کرا دیں گے۔“

شام ہوئی تو شہاب چپکے سے کہیں نکل گیا۔ کیپٹن آیا۔ وہ واقعی بڑا خوبصورت نوجوان تھا۔ بالکل راجکمار لیکن کسی بات میں
شہاب کا پاسنگ بھی نہیں یا شاید یہ صرف میرا خیال تھا۔ شاید تعصب یہی ہو جو آج میرے سینے میں بیدار ہو رہی تھی۔ رانی ساڑھی کے پلو سے
سر ڈھانپے شرمائی ہوئی بیٹھی تھی کیپٹن کے مذاق پر چپکے چپکے ہنس رہی تھی۔ کتنی خوش نظر آ رہی تھی وہ میرا دل چاہا اس کی آنکھوں میں جھانک کر
دیکھوں کیا اس کی روح بھی یونہی ہنس رہی ہے؟ کیا اسے واقعی کیپٹن بہت پسند آیا ہے یا یہ سب کچھ بے وجہ کر رہی ہے۔ فریب دے رہی
اپنے: کیپٹن کو، اپنی بہن کو، کیپٹن کو، مجھ کو، شہاب کو، خود اپنے آپ کو! وہ جان بوجھ کر دھوکا کھا رہی ہے۔ اس کی روح بیتاب ہے اس
کے اندر کوئی چیز ٹوٹے جا رہی ہے۔ وہ رونا چاہتی ہے مگر ہنس رہی ہے ...... کیوں؟ صرف اس لیے کہ اب عقلمندی کا تقاضا یہی
ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکنا چاہا مگر وہ جھکی ہوئی تھیں۔ میرا دل چاہا میں اسے مجبور کر کے پوچھوں: ”کیا تم واقعی خوش ہو؟ بتاؤ تم۔
دیکھو تمہیں میری قسم سچ سچ بتا دو۔“

[illegible] کیپٹن کے لطیفوں پر ہنس رہی تھی [illegible] [illegible] ..... [illegible] [illegible] پیار سے [illegible] ..... میں نے آنسو [illegible] کردیا ہو [illegible] ..... [illegible] —— [illegible] محبت نہیں شہر کی [illegible] تھیں۔

میں کمرے میں [illegible] دونوں [illegible] کو دیکھ رہی تھی [illegible] کوشش کے باوجود [illegible] جانے [illegible] کیپٹن کے لطیفوں پر ہنس رہی ہے [illegible] بالکل نہیں۔ پھر مجھے [illegible] سے باہر [illegible] ایک [illegible] مجھے اب [illegible] کھانے پر [illegible] ایک [illegible] نے [illegible] کہاں [illegible] ہو گیا [illegible] نازی [illegible] باہر گئے [illegible] کے پاس بیٹھے ہی [illegible] نے دیکھا تھا: کیپٹن [illegible] مسکراہٹ چھپانے [illegible] میری جان [illegible] گئی [illegible] میں کیا ایک [illegible] رہی۔ ماموں جان بولے "وہاں کھڑی کیا کر رہی ہے؟" میں نے جلدی سے جواب دیا: "وقت ہی کچھ اتنا خوبصورت ہے"
یہ بات کوئی بھی نہ سمجھ سکا۔ نازی ڈوبتے ہوئے سورج اور سرخ آسمان کو دیکھ کر بس ذرا سا مسکرا دی۔ بے وقوف!

تھوڑی دیر بعد شہاب آگیا۔ اُف خدا! اس کو پیارا اس چہرہ کہیں [illegible] ابھی نہ چھوڑ دے۔ میں تو ڈر ہی گئی۔ اس نے کھانا بھی ٹھیک سے نہ کھایا۔ وہ بہت ہی خاموش تھا۔ اتنی شدت کا احساس میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ ایسا لگتا تھا کوئی دھیرے سے اس کی پلکوں کو اگر چھو لے گا تو ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگیں گے۔ اس کی شکل بڑی کسیلی ہو رہی تھی۔

خدا خدا کر کے وہ وقت گزر گیا اور جب دوسری صبح طلوع ہوئی تو میں حیران ہی رہ گئی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آتا تھا۔ شہاب کی آنکھیں اگرچہ رات بھر جاگنے کی وجہ سے سوجی ہوئی تھیں مگر وہ اب رات والا شہاب نہ رہا تھا۔ وہ رات بھر میں بالکل بدل گیا تھا۔ وہ اپنی پرانی عادتوں پر لوٹ آیا تھا۔ بات بات پر اس کی وہی چہلیں تھیں۔ مگر میں وہی اور ادھر نازی پورے شرمائی ہو گئی۔ کس قسم کا انسان ہے یہ؟ میں سوچتی رہی۔ رات بھر میں اس نے جانے کیا سوچا کیا سمجھا —— اس کی باتوں میں وہ پہلے جیسی شوخی کہاں سے آگئی اس کے قہقہوں میں کس چیز کی جھنکار سمٹ آئی ہے۔ وہ کیوں اتنا خوش دکھائی دے رہا ہے۔ کیا وہ نہیں دیکھ رہا کہ اس کی رانی کی کیپٹن سے منگنی ہو گئی ہے؟ کیا اسے اب اس کا رنج نہیں؟ کیا پہلی محبت آخری نہیں ہوتی؟ آخر باتوں ہی باتوں میں میرے منہ سے نکل گیا "شہاب آخر تمہیں آج ہو کیا گیا ہے؟ کیا رات کوئی خواب دیکھ لیا جس کے نتیجہ میں تمہارے چہرے پہ چمک لگ گئے؟"
بولا "خواب؟ نہیں تو۔ خواب تو میں دکھاؤں گا اب"
"میرے منہ سے بے ساختہ نکلا "کس کو؟" اس نے پہلے رانی اور پھر نازی کو دیکھا۔ تینوں کی نظریں جھک گئیں۔ جانے کیوں؟
میں کچھ بھی کچھ نہیں سمجھی۔ بس اتنا ضرور دیکھا کہ نازی کی نگاہوں میں عین اسی وقت خلوص کی دھیمی دھیمی خوشبو سی پھوٹنے لگیں۔ وہ کچھ ایسی لڑکی تھی جو بد سبب کو نہ جانتے ہوئے بھی عبادت کر کے خوش ہونا چاہتی ہو۔ شہاب نے میرے سوال کا مختصر سا جواب دیا۔ "دیکھتے رہ جاؤ گی۔"

کیا مطلب ہوا اس کا، یہ میں آج تک نہیں سمجھ سکی۔

شہاب کا موڈ اس شام ایسا تھا کہ وہ بے بات کے ہی ہنسے جا رہا تھا۔ پاگلوں کی طرح بے اختیار ہنس رہا تھا۔ سب گانے کی فرمائش کر رہے تھے۔ بہت اصرار پر وہ مانا اور پھر اس نے ایک غزل سنائی۔ یہ غزل میں شاید کبھی نہ بھول سکوں گی۔ بہت کچھ دکھ بھرے تھے بیر، تو وہ تو بھی نہ تھا کہ ایسے دکھ بھرے سوز میں وہ یہ غزل سنا سکتا لیکن جب اس نے گانا شروع کیا تو ایسا لگا کہ دنیا جہان کا دکھ سمٹ کر اس کے گلے میں آ گیا ہے۔ سوز سے اس کی آواز بھاری ہوئی جاتی تھی۔ سب خاموش تھے۔ میرا دل چاہا میں اسے منع کر دوں کہ "یہ غزل مت گاؤ شہاب! خدا کے واسطے چپ ہو جاؤ۔ بس کرو شہاب اب چپ ہو جاؤ" مگر اس کو مست دیکھ کر میں خاموش رہی۔ وہ کھویا ہوا تھا اور گا رہا تھا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ اگر یہ ہی گاتا رہا تو اس کے دل کے تمام آبلے منظر عام پر آ جائیں گے ان آبلوں کو چھپانے ہی کے لیے تو وہ طاہراً اتنا خوش بنا ہوا تھا۔ اس نے ٹھان لیا تھا کہ ان آبلوں کو چھپائے چھپائے پھرے گا۔ کسی کو خبر نہیں ہونے دے گا کہ ان ہنستی ہوئی آنکھوں کے پیچھے کیسے کیسے طوفان اٹھ چکے ہیں اور اٹھ سکتے ہیں مگر اس وقت وہ خواہ مخواہ جذباتی ہونے لگا۔ وہ بہت اُداس تھا ۔ ۔ میرا دل چاہا اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دوں۔ سب کے کانوں میں انگلیاں دے دوں۔ اس کے ذہن سے غزل کے الفاظ چرا لوں۔ میں پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ آخر میں نے اس کے ساتھ گانا شروع کر دیا۔

لکڑی جلے بن کوئلہ ہووے کوئلہ جلے بن راکھ
ہم پاپی کچھ ایسے جلے کوئلہ بنے نہ راکھ

اس شعر پر وہ ایک دم رک گیا۔ شاید اسے احساس ہو گیا کہ وہ کوئی غلطی کر رہا ہے۔ جذبات کی رو میں جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ وہ نازی کی طرف دیکھنے لگا جو آتش دان میں جلتی ہوئی آگ کو گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔ آگ کی تپش سے اس کے گال تمتما رہے تھے۔ شہاب اب سنبھل چکا تھا۔ بولا،

"آپا! تم نے نازی کی فرمائش بھی پوری کی یا نہیں۔ وہ تصویر والی؟"

میں نے جواب دیا "ہاں بنی ہوئی رکھی ہے مگر میں لانا بھول گئی۔"

شہاب بولا "کوئی بات نہیں نازی۔ میں اگلے ہفتہ پھر کرسٹ آؤں گا تب لے آؤں گا۔" اور نازی اسے شکر گزار نظروں سے دیکھنے لگی۔ جانے کن سے تاثرات چھپانے کے لیے رانی نے منہ پھیر لیا۔

دوسری شام بے وجہ ہی اداسی پھیلی جا رہی تھی۔ میں نے جب یہ بات کہی تو شہاب بولا "اس کی روک تھام یہی ہے چلیے سب پکچر دیکھنے چلتے ہیں۔"

میں نے جانے کیا بہانہ بنا لیا کیونکہ میں جانا نہیں چاہتی تھی۔ رانی نے کہا کہ اس کے سر میں شدت کا درد ہے ـــ کیا واقعی اس کے سر میں درد تھا؟ نازی اور شہاب پکچر دیکھنے چلے گئے۔ اس دن نازی نے آتشی رنگ کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ بہت ہی پیاری لگ رہی تھی۔ میرا دل چاہا یہ اور بھی زیادہ پیاری لگے اور میں شہاب سے کہوں "دیکھو شہاب نازی کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھو بھلا دن بدن کیا ہوتا جا رہا ہے۔"

دوسرے دن ہم لوگ تاش کھیل رہے تھے۔ میں نے جھٹ رانی کو پارٹنر بنا لیا۔ مجبوراً نازی اور شہاب پارٹنر بنے۔ وہ

روز شیف سے ہے تھے اور غزل بی تھے۔ سنتے ہیں سب باتیں سے مطلق ہوتی آگئی۔ سب ہم سے جاتی تھی۔ میں نے بہت روکا
کیا مگر وہ رونے چلی گئی۔ آخر میں نے اسے تماشا شروع کر دیا: "غزل، جو ایک آنسو بھی بہا، سمجھو تمہارا ایک روپیہ کٹ گیا۔" اور وہ رونے لگی۔
شہاب بولا: "کیا آنسو بہانا آسان کام ہے، اس کا بھی حق ہے۔"
میں نے چونک کر شہاب کی طرف دیکھا۔
تیسرے دن ہم لوگ لوٹنے کے بعد تھے۔ سامان تانی شہاب دے رہی۔ ایک دکان پر ایک کھلونا تانی کو دیکھ کر شہاب نے
کہا: "نانی یہ شال لے دو اور وہ نانی نے بغیر جواب دیے پرس کھول کر شال دلادی۔ آگے دکان سے اس نے ایک مجھ کو ریا اور
نانی کو دے کر بولا: "لو یہ تم پہن لو۔ ... نانا یا میرا احسان کسی کا نہیں لیتا۔"
مجھے شہاب کی اس بھولی چالاکی پر بہت ہنسی آئی۔ مجھے نہیں لگا وہ ورنہ بہانہ تو کر کر پیچھا چھڑا دیتے تھے۔ اور سب سمجھ
رہے تھا ——— لیکن اس نے مانا اور میرے سامنے ایسا احسان کر کیوں کیا ——— ؟
پھر دس روز بعد ہم لوگ واپس آ رہے تھے۔ رخصت کے وقت نانی کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے اور جب ٹرین
چلی تو میں نے دیکھا کہ شہاب رو رہا تھا۔ میں نے چاہا اس سے پوچھوں: "کیوں رو رہے ہو شہاب؟" مگر وہ خود ہی بولا: "تم نے شیشہ
پر نانی کو دیکھا تھا آپا؟ اس سے میری بڑی ہی جولی مالش بن گئی تھی آپا!"
"ہاں شہاب!" میں نے جواب دیا۔
"اور وہ چاندی کی بالیاں بھی ہیرے کی ہیں اسے دلوائی تھیں، وہ آپا وہ جھلا بھی تو۔ ..." اس کا گلا رندھا ہوا تھا۔
"ہاں ہاں شہاب میں نے دیکھا تھا ——— اس کے جوڑے میں تمہارے پسندیدہ پھولوں کا گجرا بھی تو تھا۔" خوشی سے
میرا سانس پھولنے لگا۔ اب شہاب کا علاج آسان تھا مگر وہ رو کیوں رہا ہے۔ شاید جدائی کا صدمہ ہوگا۔ خیر اب میں کچھ ایسا کر دوں گی
کہ یہ کبھی جدا نہ ہوں۔ پھر میرا شہاب کبھی نہیں روئے گا۔ میں نے اس کے آنسو پونچھ ڈالے۔ "ہاں شہاب! اسے تمہارا بہت خیال
ہے۔ وہ تمہارے تحفے بڑے سنبھال سنبھال کر رکھتی ہے۔ خاص خاص موقعوں پر پہنتی ہے۔ تمہارے ساتھ جانے پر کبھی انکار
نہیں کرتی اور ......"
"بس بس آپا یہ سب نہ کہو۔"
"پھر رو کیوں رہا ہے پگلے؟"
"اس لیے نہیں کہ مجھے اس سے محبت ہے۔ اس لیے نہیں کہ ہم جدا ہو رہے ہیں بلکہ اس لیے کہ مجھے اس سے کوئی
دلچسپی نہیں ہے آپا ——— قسم خدا کی آپا۔ یہ سب تحفے میں نے فریب دینے کے لیے دیے تھے۔ میں سب کو فریب دے رہا تھا
خاص کر دادی کو۔"
میرا دل دھک سے رہ گیا۔ ایسا لگا جیسے کسی نے میرے منہ پر طمانچہ مار کر مجھے اونچائی سے دھکیل دیا ہو۔ "کیا بکتے ہو
شہاب؟ کیا تمہیں نانی اچھی نہیں لگتی؟" میں زور سے چیخی۔
"نہیں بالکل نہیں۔" وہ دھیرے سے بولا۔

میرا دل چاہا میں اس کے بال نوچ لوں، اس کا منہ لہولہان کر دوں۔ غالب رہا مگر جب میں اس سے کچھ نہ کہہ سکی تو میری چیخ نکل گئی اور صرف اتنا کہہ سکی۔

"شہاب! یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ تم نے بہت برا کیا، بہت برا کیا۔ سوچو تو نازی پر کیا بیتے گی ـــــ تم بے شمار لوگوں کو نہیں نازی کو بھی دھوکہ دے رہے ہو۔ نازی بیچاری کا کیا قصور۔ وہ بے نام کھیلنے کی ضرورت ہی کیا تھی شہاب۔ آخر کچھ تو سوچو....."

"برا نہ تو یہ تم پر بات کیا کہتا؟" یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رونے لگا۔

ٹھیک ہی تو کہتا تھا۔ میں اسے بچوں کی طرح سینے سے لگا کر پیار کرنے لگی۔ واقعی ٹھیک ہی تو کہتا تھا۔ وہ تو بیچارہ کیا کرتا؟ اور پھر میں اور کیا کرتی؟" مجھے ایسا لگا شہر کی گھڑیال آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہا ہے "بہت کیسے رکے ہوئے ہو؟ کیا شہاب گا رہا تھا کیا یہ امی گا رہی تھی یا کیا یہ نازی گا رہی تھی؟"

آپا

محمد طفیل

میں ابھی بمشکل پہنچا ہی تھا کہ ایک تانگہ آ کر رکا۔ اس پر سے لڑکے نے اتر کر پوچھا: "طفیل صاحب یہی ہیں؟"
لڑکے کو میں نے جواب دیا: "جی ہیں"
وہ تم نے جا کر تانگے میں بیٹھی ہوئی خواتین سے کہا: "ہیں"
ان میں سے ایک صاحبہ نے کہا: "جاؤ"
وہ پھر آ کر کہا: "بلا رہی ہیں"
میں نے کہا: "عرض کر دو مجھے خود ہی تشریف لائیں"
چنانچہ تانگے پر سے دو مستورات اتریں۔ ایک برقعہ میں تھیں اور ایک بغیر برقعہ کے۔ بے پردہ خاتون نے تعارف کرایا "میں شکیلہ ہوں"۔
"آداب ـــــ" اور بڑی حیرت سے ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا۔ حالانکہ پردہ دار خاتون سے مصافحہ کرنا عجیب لگا۔ مگر میں نہ جانے یوں کرنے پر کیوں مجبور ہوا۔

شکیلہ نے تعارف کرایا: "یہ شملہ کی سہیلی رضیہ ہیں۔"

شکیلہ کون ہیں۔ پہلے یہ بتا دوں، پھر آگے چلوں ـــــ شکیلہ میری منہ بولی بہن ہیں اور مشہور افسانہ نویس۔ برسوں سے ہم ملتے تھے مگر آمنا سامنا پہلی بار ہوا۔

اب شکوے: "آپ وقت مقررہ پر پاکستان کیوں نہیں پہنچیں جو تاریخ آپ نے لکھی تھی۔ اس دن میں اسٹیشن پر گیا تھا۔ تاکہ کسٹم وسٹم کے چکر میں آپ کو زیادہ پریشان نہ ہونا پڑے۔ مگر آپ نہ آئیں۔ آج آئیں بھی تو بغیر اطلاع کے۔"
"میں چاہتی تھی کہ بغیر اطلاع کے پہنچوں۔"
"آخر کیوں؟"
"اچانک ملاقات پر زیادہ خوشی ہوتی ہے نا!"
"ہوتی ہوگی ـــــ" یہ تھا شکیلہ کی سادگی کا پہلا وار جو خطا گیا۔ میں نے سوچا اگر شکیلہ مجھے بتا کر آتیں، اسٹیشن پر ملتیں تو شاید بھائی اپنی بہن سے ملنے کا حق ادا کر سکتا۔ مگر اس وقت میں چپ ہی رہ گیا۔

رضیہ کہنے لگیں "ہم آپ کا مکان ڈھونڈ ڈھونڈ کے تھک گئی ہیں۔ ہم سے تو خفا ہو رہے ہیں کہ آخر شاہد صاحب ایک کو نہ پہچان سکا ہے۔"

"ٹیلیفون کر دیا ہوتا۔"

"وہ بھی کیا تھا۔ کوئی صاحب بولے کہ جنہیں صاحب ابھی آئے ہی نہیں۔ رہتے وہیں ہیں جہاں سے آپ بول رہی ہیں۔ —— مجبوراً آ گئی ہیں۔"

"اچھا تو پھر چلیے گھر۔"

چنانچہ ہم سب تانگہ پر گھر کی طرف چلے۔ راستے میں شکیلہ نے بتایا۔ رضیہ کہتی تھیں: تمہارا بھائی ڈھونڈے سے گھر کا جو پتہ بتلایا وہاں تو وہ رہتے نہیں۔ اس لیے واپس چلو۔"

میں نے ہنس کر کہا: "یہ رضیہ کا اندازہ غلط نہیں۔"

گھر کے پاس پہنچ کر میں نے تانگہ رکوایا تو رضیہ اور شکیلہ کے منہ سے مارے حیرت کے یک ساتھ نکلا "ارے۔"

"کیا بات ہے؟"

ہمیں گھر سے ہو کر جس نے آپ کا پوچھا تھا۔ مگر کسی نے بتایا ہی نہیں۔ یہ جو آپ کے مکان کی بغل میں ڈاکٹر صاحب ہیں، یہ تو کہتے تھے یہ شفیق صاحب ہوں گے دروازے میں بیٹھے ہیں۔"

"اچھا!"

"جی ہاں۔"

"قصہ یہ ہے۔ میں کسی سے ملتا نہیں ہوں۔ شام آیا، صبح چلا گیا۔ یہ سب لوگ مجھے صورتاً جانتے ہیں مگر کسی کو یہ معلوم نہیں۔ میں کون ہوں۔ کیا کرتا ہوں۔ کیا نام ہے۔"

شکیلہ نے کہا: "آپ نے اپنے نام کی تختی ہی لگائی ہوتی۔"

"یہ سمجھ کے نہیں لگائی۔ اس سے ذرا شان ٹپکتی ہے اور میں اسے پسند نہیں کرتا۔"

"شان ٹپکتی ہے تو ٹپکے۔ ہم ایسے لوگوں کا تو برا حال نہ ہو۔"

سامان اوپر آیا۔ شکیلہ نے ایکدم گھوم کر سارے کمرے دیکھ ڈالے۔ بڑی اترا کر رضیہ سے کہہ رہی تھیں۔ میرے بھائی کے پاس دو ریڈیو سیٹ ہیں۔ دو صوفہ سیٹ ہیں۔ یہ دیکھو الماری کتنی خوبصورت ہے۔ تصویریں دیکھو کتنی شاندار ہیں۔ غالباً یہ چغتائی کی ہے۔ غرض شکیلہ رضیہ سے بڑی شان میں باتیں کر رہی تھیں کہ میرا بھائی یہ ہے اور میرا بھائی وہ ہے اور وہ میں نہ مانوں۔ میں نہ مانوں کی تفسیر بنی شکیلہ کو گھور رہی تھیں۔

میں نے اندازہ لگایا۔ شکیلہ میں اتنی معصومیت ہے کہ بالکل بچی معلوم ہوتی ہے۔

شکیلہ بڑی گپ باز ہیں۔ اتنی کہ میں نے اپنی زندگی میں اتنی گپ باز خاتون کوئی نہیں دیکھی۔ مردوں میں بھی کوئی نہ دیکھا۔ گھنٹوں ہی بول سکتی ہیں۔ ایک بات ماننی پڑتی ہے کہ ان کی باتیں بور قسم کی نہیں ہوتیں۔ بلا وجہ ہی بلا وجہ ہوتی ہیں جس میں خلوص، معصومیت اور بیوقوفی سبھی کچھ شامل ہوتا ہے۔ اگر خلوص، معصومیت اور بیوقوفی (وہ آدمی شریف ہی نہیں جو بقدر ضرورت بیوقوف نہ ہو) میں سے ایک چیز

جو کچھ وہ ٹھیک کیا باتوں میں کتنی دل کشی ہوتی جو وہ مجھ سے چھپا جاتے
جب بھی وہ کوئی کتاب پڑھتیں تو مجھے بڑی مصیبت رہتی۔ وہ بڑی بڑی باتیں کرتیں جب سامنے کوئی نہ ہوتا جو بیٹھا ہوتا
جلا کر کہتیں پڑھتی ہو اچھی کتابیں ہیں؟
"جی ہاں"
"میں سمجھ گیا کہ کیا ہو؟"
"جب ہی تو کہہ رہی تھی"
"میری باتیں جو سمجھ نہ سکو وہ مجھ سے پاس آ کر پوچھا کرو۔ میں نہیں دیکھتی کہ تم ان سے کوئی مطلب نکال رہی ہو یا
وقت کو ضائع کر رہی ہو۔ کیا میری باتیں تمہیں ناپسند ہیں؟"
"نہیں تو! نہیں۔ بالکل نہیں"
ایک بار شوہر نے میری اس حرکت پر اپنی باتوں کا سلسلہ منقطع کر دیا اور پہلی بار انہوں نے کئی منٹ تک کچھ نہ کہا۔
مجھے محسوس ہوا جیسے وہ کسی تکلیف کے سامنے در ماندہ ہو گئے ہوں۔
ایک دن میں نے غور کر کے دیکھا کہ وہ چپ چاپ سی بیٹھی ہیں۔ کیا باتیں تھیں۔ عجیب باتیں تھیں وہ، میری چوری سے کہہ رہی تھیں۔ سمجھ دی ہی
بڑا مزا ہے"
"ہو گا۔ میں اس مزے سے ناآشنا ہوں"
"ہائے اتنے بڑے مزے ہیں"
"اچھا"
"تو میں چوری کیا کرو"
"جب سب کچھ مل جاتا ہے تو میں کیوں چوری کروں؟"
"خلفہ ہزار روپیہ اپنے ہاتھ سے دے دے مگر اس کی ایک کوڑی چرانے میں ہزار روپوں سے زیادہ کا لطف ہے"
"یہ بات ہے تو میں بھی چرایا کروں گی"
"ہاں ہاں ضرور"
"اختر صاحب کو میری چوریوں کا سب علم ہے۔ وہ مجھ سے چھپا چھپا کے روپے رکھتے ہیں۔ تنخواہ لا کر تو مجھی کو دیتے ہیں۔ البتہ
کتابوں کی رائلٹی یا امتحانوں کے پرچوں سے جتنا روپیہ آتا ہے۔ اسے مجھ سے چھپا کر رکھتے ہیں۔ بسا اوقات ایسا ہوا۔ انھوں نے روپے رکھے
ہم نے موقع پا کر چرا لیے۔ گھر میں شور مچ گیا۔ میرے روپے کس نے چرائے ہیں۔ میں انجان سی بن کر کہتی۔ پتہ نہیں کس کم بخت نے چرا لیے۔
ایک بار اختر صاحب کو پرچوں کی جانچ کا روپیہ آیا۔ فوراً ہی ان کے باہر جانے کا پروگرام بن گیا۔ انھوں نے نوٹ گن کر لفافے
میں رکھ دیے اور لفافے کے اوپر لکھ دیا کہ اتنے روپے رکھے ہیں اور تالا بند کر کے چابی ساتھ لے گئے۔
میں نے ان کے جانے کے بعد تالے کو چابی لگوائی۔ دس دس کے تین نوٹ نکال مزے کرتی رہی۔ اختر صاحب واپس آئے

تو پھر قصور ہو گیا۔ روپے کس نے چرائے ہیں۔ ہم نے حسبِ عادت کہہ دیا۔ ہمیں کیا خبر آپ ہی بھول گئے ہوں گے۔
کہنے لگے تو روز کہہ دیتی ہے کہ میں بھول جاتا ہوں۔ اب کے تو میں لفافے پہ لکھ کے گیا تھا کہ اتنے روپے ہیں۔ اب کیسے بھول گیا۔

شامتِ اعمال میری بھی بھابی آ نکلی۔ اختر صاحب نے ان سے بھی پوچھا۔ میں سمجھتی تھی۔ یہ ذرا سی بچی ہے۔ اسے کیا خبر ہوگی مگر اس نے توتلی زبان میں میری طرف اشارہ کر کے بتایا۔ بیا صاحبہ نے چرائے ہیں۔

اتنی ہی باتیں ہو پائی تھیں کہ میں شیو کر کے سیدھا اندر گیا اور پوچھا کیا باتیں ہو رہی تھیں؟

دونوں ہنس پڑیں اور ہنستی ہی چلی گئیں۔

شکیلہ کا ابھی کوئی بچہ نہیں۔ اولاد کے غم نے بیچاری کو نڈھال کر رکھا ہے۔ بات بات پر رو دیتی ہیں۔ شکیلہ اپنی ذات میں اگر ایک طرف دلچسپیوں کا مرقع ہیں تو دوسری طرف غموں کی پوٹ بھی۔ آزردہ خاطری کی کوئی ذرا سی بھی بات ہو جائے تو پھر غم ہی غم۔

شکیلہ اپنی زندگی سے بڑی بیزار ہیں اور ساتھ ہی اتنی بے احتیاط کہ مصیبتوں کو خود دعوت دیتی ہیں۔ دکھ بھی دکھ ہو جیسے۔ مالی نہیں۔ ذہنی دکھ۔ شادی کے فوراً بعد اختر صاحب بیمار ہو گئے تھے۔ بیماری بھی مہلک۔ اختر صاحب ہسپتال داخل ہوئے تو یہ بھی چوبیس گھنٹے وہاں موجود۔ ڈاکٹر منع کرتے تھے۔ مگر یہ نہ مانتی تھیں۔ کہتی تھیں شوہر کے بعد خود جی کر کیا کروں گی۔ چنانچہ انھوں نے اپنی زندگی ختم کرنے کی ایک ترکیب سوچی۔ وہ یہ کہ پاس کی وارڈ میں جو سب سے خطرناک مریضہ تھیں۔ اُن کی تیمارداری میں دن رات جُٹی رہتیں۔ اُس کے گلے میں بانہیں ڈال دیتیں۔ ساتھ لیٹ جاتیں۔ مریضہ حیران کہ لوگ مجھ سے دور بھاگتے ہیں۔ مگر یہ ہیں کہ یوں مجھ پہ قربان ہیں۔ بات ہی عجیب تھی۔ کہ موت کے کنارے کھڑے ہونے والے لوگ صحت کو ترس رہے تھے اور جو صحت مند تھے۔ وہ موت چاہتے تھے۔

شکیلہ کو پھولوں کا بے حد شوق ہے۔ انھوں نے گھر پہ طرح طرح کے پھول لگا رکھے ہیں۔ دن رات ان کی دیکھ بھال کرتی رہتی ہیں اور خوش رہتی ہیں۔ انھیں اس حد تک پھول عزیز ہیں کہ اختر صاحب سے بھی بھڑ جاتی ہیں۔ وہ ضرور سوچتے ہوں گے کہ کسی بھی چیز سے اتنا پیار اچھا نہیں ہو سکتا۔

ایک دن ہم لارنس گارڈن گئے۔ بہار کے دن۔ پھول اپنے جوبن پر۔ شکیلہ انھیں دیکھ کر کھل اٹھیں۔ باغ کی اور پھولوں کی بیحد تعریف کرتی رہیں جھومے جا رہی تھیں۔ ایک جگہ رُک کر پوچھنے لگیں یہ طفیل اس پھول کا نام بتاؤ!"

"مجھے کیا معلوم"

"اس کا یہ نام ہے"

"بھلا اس کا؟"

"بھئی مجھے کچھ پتہ نہیں"

"اچھا تو جناب نرے ایڈیٹر ہی ہیں"

جتنی دیر ہم باغ میں رہے۔ شکیلہ نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ یہ پھول فلاں ہے۔ یہ پھول ہمارے ہاں بھی ہیں۔ ان پھولوں کی خوشبو بڑی اچھی ہوتی ہے۔ یہ پھول بڑا نازک ہوتا ہے۔ یہ پھول بہت کم ہوتے ہیں ——— اخاہ یہ پھول کتنے خوبصورت

میں نے لکھا تھا:

[illegible]

[illegible] کر دکھایا۔

میں نے پوچھا: "آپ کو کوئی [illegible] پسند نہیں؟"

"ہے تو"

"کون سا؟"

"[illegible]"

میں اٹھنے لگی [illegible]۔

"بھئی بیٹھے کیوں جا رہے ہو؟"

"مجھے آپ چائے لا کر دیں؟ [illegible]"

"اچھا"

اچھا سے ایک بات یاد آئی۔ شکیلہ اکثر [illegible] "اچھا" ہے۔ [illegible] لہجے کو بدل بدل کر پڑھتے ہیں۔ بعض اوقات تو یہ شبہ ہوتا ہے جیسے یہ ترنم میں کچھ کہہ رہے ہوں۔

اب آپ ان کی گفتگو سنیں۔

"ہم چلا جا رہا تھا، صبح ابھی تو طبیعت خراب سی کر رہی تھی۔ تھوڑی سی چلی، پھر تھکا [illegible] کھانا بھی نہیں کھایا، ہم تھا!"

اب اس شعر کا دوسرا مصرعہ سنئے۔ جب یہ کسی کی گفتگو سنتی ہیں تو یوں ساتھ دیتی ہیں۔ "اچھا" کے لفظ کو خوب کھینچ کے پڑھئے گا۔

"اچھا" صرف ان کا ہے۔ باقی سب مخاطب کا۔

"میں صبح دفتر گیا۔ ارے اچھا۔ دیکھا تو فلاں دوست بیٹھا ہے۔ ارے اچھا۔ اس نے کہا بھئی ہمارا یہ کام جلدی کرا دو۔ ارے اچھا۔"

جب یہ خود بول رہی ہوں تو پھر کسی کی مجال نہیں کہ وہ بیچ میں بول سکے (کم از کم میری تو مجال نہیں)۔ جب کوئی دوسرا بول رہا ہو۔ پھر بھی کسی کی مجال نہیں کہ وہ ہر فقرے کے بعد "ارے اچھا" سنے بغیر آگے بڑھ سکے۔ انھیں باتیں سننے کا شوق ہے۔ باتیں کرنے کا شوق ہے۔ سنانے کا زیادہ، سننے کا کم، ادھر میں ایسا ہوں نہ سننے کا شوق، نہ سنانے کا۔ میرا خیال ہے شکیلہ مجھ سے مل کر قطعاً خوش نہ ہوئی ہوں گی۔

ایک رات میرے چھوٹے بھائی کو یہ سوجھی کہ کل شکیلہ آپا چلی جائیں گی۔ اس لیے آج کی رات جاگ کر کاٹی جائے۔ پہلے بھی رات کو گیارہ بارہ بجے تک باتوں کا سلسلہ رہتا تھا۔ اس لیے میں نے ناک چڑھا دی۔

بھائی نے کہا: "تاش کا پروگرام ہے۔"

شکیلہ بولیں "بھئی چچا! طفیل آج تاش ہوگی"

"مجھے نہیں آتی" (پھر شکیلہ ہی کے انداز میں ہنسنے کے ساتھ) "ہم بھی"

بہرحال دھر لیے گئے۔ بڑی بی نہیں (شکیلہ مجھ سے سات برس بڑی ہیں) اس لئے نہ ہو سکا۔ بیٹھ گئے ہیں اور میاں طفیل پارٹنر، شکیلہ اور میری بھابی پارٹنر، خوب خوب ہاتھ ہوئے۔ شکیلہ کو یہ گھمنڈ تھا، میں عمدہ کھیلنے والی ہوں، اس لیے میرے مقابلے میں کوئی کیا کھیلے گا۔ ادھر اپنی قسمت میں کسی بھی معاملے میں خدا نے ہار لکھی ہی نہیں۔ اس لیے مات ہوتی تو کیسے ہوتی۔

شکیلہ اور میری بھابی کا چھتے پیسے برا حال ہو گیا۔ بارہ بج گئے۔ ایک بج گیا۔ دو بج گئے۔ رفتہ رفتہ میں نے اپنی کارستانی فطرت پر شروع کر دی۔ میں جا بجا پر جماہیاں لے رہا تھا۔ مگر ان بیٹھنے والی اللہ کی بندیوں نے مجھ پر ترس نہ کھایا۔ تھک ہار کر میں نے بیگم کو آواز دی۔

"اسے نیک بخت! چائے بنا کر پلا دے"

"میں نہیں اٹھ سکتی"

"اری اٹھ جا! جنت میں مکان ملے گا"

"مجھے نہیں چاہیے، جنت میں مکان!"

"یہ دیکھ سو روپیہ بطور انعام لے لے، مگر اس وقت اٹھ کر چائے بنا دے"

"مجھے نہیں چاہیے سو روپیہ"

شکیلہ بولیں "اری کم بخت سو روپیہ مل رہا ہے۔ اٹھ کر جلدی سے چائے بنا دے۔ اگر طفیل مجھے دس روپے دینے کا وعدہ کرے تو ابھی اٹھ کر چائے بنا دوں"

خیر چائے دس روپے لینے والی نے بنائی، نہ سو روپیہ پانے والی نے، ہم کھیلتے رہے اور صبح تک کھیلتے رہے۔

شکیلہ کو کھانے پینے کی چیزوں سے قطعاً دلچسپی نہیں۔ چیزیں ان کے سامنے رکھ دیجئے، قطعاً لطف اندوز نہ ہوں گی۔ کھائیں گی، تو وہ بھی اتنا، جتنا کہ ایک برس کا بچہ بغیر ڈکار لیے کھا لے۔

ایک دن یہ مجھ سے گویا ہوئیں "طفیل آج بہت زیادہ کھا لیا ہے۔ کباب اچھے تھے۔ سالن شاندار تھا"

"چلو اچھا ہوا آج آپ نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا"

"بلکہ آج تو دو دن کا اکٹھا کھا لیا"

"آخر کتنا کھایا؟"

"بھئی ڈیڑھ چپاتی کھا گئے"

کھانے کا حال تو آپ نے سن لیا۔ اب ذرا چلنے پھرنے کا بھی حال سن لیں ـــ "آج ہم بہت پیدل چلے۔ بہت پیدل چلے۔ بس تھک گئے"

"آخر کتنے میل؟"

"بھئی ہم انارکلی کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک پیدل ہی تو چلتے چلے گئے"

[illegible] کہیں کہیں اردو لکھ جاتے۔ [illegible] ہے۔ [illegible] تعلق تنقید کرے اور چاہتا ہے کہ [illegible] ہیں۔ [illegible] مشہور ہو جاتا ہے۔ [illegible]

جب بولتی ہے تو لگتا ہے صحت، ہاجرہ اور خدیجہ۔"

میں نے پوچھا: "آپ نے صرف نام نہیں لیا۔"

"جیلانی بانو کیا ہیں؟"

"خواتین ہیں۔"

"ہاں وہ خواتین، وہ تو ہیں۔ مگر افسانہ نگار نہیں ہیں۔"

"جس طرح آپ خاتون ہیں اور افسانہ نگار نہیں ہیں۔ اسی طرح باقی افسانہ نگار خواتین ہیں جو نقادوں سے کہتی ہیں کہ ہم عورت ہیں، افسانہ نگار نہیں ہیں۔ اس لیے ہمارا تذکرہ افسانہ نگار خواتین کے ساتھ نہ کیا جائے۔"

"یہ بات ہے تو کیا صحت، ہاجرہ اور خدیجہ نے نقادوں سے کہا ہے کہ ہم افسانہ نگار ہیں؟"

"ہاں ہاں انھوں نے ضرور کہا ہوگا ورنہ نقادوں کو پتہ کیسے چلتا کہ خواتین بھی افسانہ نگار ہو سکتی ہیں۔ یہ لوگ کان سے کم سنتے ہیں۔ ذہن سے نہیں۔"

"اب دیکھیے جیلانی بانو کتنے اچھے افسانے لکھتی ہے۔ مگر نقاد چپ ہیں۔ بولیں گے تو اسے ایک نئی لکھنے والی جیلانی بانو بھی ہے —— جی ہاں جی!"

میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے۔ خواہ کوئی کتنا ہی باتونی کیوں نہ ہو۔ شکیلہ کو اس سے یہی شکوہ ہوگا کہ آپ بڑے چپ چپ رہتے ہیں —— چنانچہ ایک دن مجھ سے —— "مجھے یہ پتہ نہ تھا کہ آپ بالکل چپ شاہ ہیں۔ آپ کی خاموشی نے تو مجھے بالکل بور کرکے رکھ دیا ہے۔ اب ایسے کیجیے کہ ہم گھڑی سامنے رکھ کر باتیں کریں۔ ایک گھنٹہ تم بولو۔ ایک گھنٹہ میں بولوں گی۔"

میں نے سراسیمہ ہو کر اس کے جواب میں کہا تھا: "آپ آپ ہی بولتی جائیں۔ مجھے حالات نے بولنا سکھایا ہی نہیں۔"

"اب تو آپ کے حالات بڑے اچھے ہیں۔"

"میں ماضی کی بات کرتا ہوں۔ بچپن ہی میں آدمی بولنا سیکھتا ہے۔"

"اب چھوڑو بھی ماضی کو۔"

"جس دن میں نے ماضی کو پیش نظر نہ رکھا۔ اس دن میری موت واقع ہو جائے گی۔"

"چلو ہٹو۔ بکواس نہ کرو۔"

"پھر یہ حالات بھی کن سے زیادہ اچھے ہیں؟"
"مرشد سے یہاں ہم تم۔"

اسی طرح باتوں باتوں میں شکیلہ نے مجھ کو اس سے یہاں تک کہہ دیا کہ یقین مانئے میں یہ سب کچھ کر کے بہت خوش ہوں۔ اس لیے کہ ان میں بن کا پیا ہے۔ خلوص ہے۔ کوئی اور وجہ اب ہے کہ کر آ دیکھے میری طبیعت کا کیا یہ ہی بنی جا۔

میں نے سنا تھا کہ شکیلہ نے اپنی شادی کے فوراً بعد، اپنا سارا زیور کا اور بیشتر غریبوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ یہ بات اپنی جگہ بڑی کی ہے۔ اس لیے کہ آج کل ایسے لوگ کہاں، یہ بات تو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی تھی۔

میں نے باتوں باتوں میں شکیلہ سے پوچھا تھا آج کل آپ کے من بھاتے مشاغل کون کون سے ہیں؟ جواب ملا۔ یوں تو کچھ نہیں ——— گھر گھر جا کر چندہ ضرور اکٹھا کرتی ہوں۔

"کس لیے؟"

اس لیے تاکہ اردو کے چند ایک اسکول چلائے جا سکیں۔ اگر ادھر توجہ نہ دی گئی تو پھر پندرہ بیس برس کے بعد بہار میں اردو جاننے والا کوئی نہ ہو گا۔

یہ بھی باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ ان کے ہاں قیمتی چیز کوئی نہیں۔ اس لیے کہ ضرورت مند لوگ میاں بیوی کو گھیرے رہتے ہیں۔ نقد روپیہ ایسے معقول خرچ "لوگوں" کے پاس رہتا کہاں ہے۔ جو ان کے پاس رہتا۔ اس لیے جتنا بھی قیمتی سامان تھا۔ وہ بھی سب کام آ گیا۔

استاد دردمند دل، جو غریبوں اور محتاجوں کے لیے عملی ہمدردی رکھتا ہو کسی اور کو کاہے کو نصیب ہوا ہو گا ——— ایک دن اخبار سامنے آیا تو میں نے جلی جلی سرخیاں دیکھ کر چھوڑ دیا۔ انھوں نے پڑھا تو مجھ سے کہا "یہ بھی کچھ پڑھا؟"

"کیا؟"

"تو سنو:۔"

"ایک جوڈیشل مجسٹریٹ کے بارے میں خبر آئی ہے کہ انھوں نے شقاوت و بربریت کے سارے ریکارڈ توڑ دیئے۔ مجسٹریٹ صاحب ایک روز سو کر جو اٹھے تو ان کے ہاتھ کی گھڑی گم تھی۔ بہت تلاش کی گئی۔ لیکن گھڑی نہ ملی۔ مجسٹریٹ صاحب کو اپنے گھر کی ملازمہ پر چوری کا شبہ ہوا۔ چنانچہ انھوں نے اس کو اتنی بے دردی سے مارا کہ وہ اپنی جان بچانے کی خاطر، اپنے تین چھوٹے چھوٹے بچوں کو گھر ہی میں چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ مجسٹریٹ صاحب نے نوکرانی کے بھاگ جانے پر اس کے تینوں بچوں کو تختۂ مشق بنانا شروع کیا اور اس اقبالِ جرم کی مہم میں ایک مقامی تھانیدار کی امداد بھی حاصل کر لی۔ ان بچوں کی پٹائی سے بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو ان کے اختراع پسند ذہن نے ایک انتہائی وحشیانہ سزا ایجاد کی کہ تینوں بچوں کے جسم میں کیلیں ٹھونکنی شروع کر دیں۔ بچوں کی عمریں علی الترتیب سات سال، پانچ سال اور تین سال تھیں۔ بچے اس سزا کی تاب نہ لا کر چیخیں مارتے مارتے

[illegible] گئے ہوئے تھے [illegible] [illegible] میں [illegible] [illegible] [illegible] ہسپتال [illegible] [illegible] سات سال [illegible] [illegible] کے [illegible]

[illegible] ہو گئی۔

[illegible] ہے۔ [illegible]

[illegible] سے رخصت ہوئی۔

میں وہی شکیلہ کو [illegible] شروع کر دیا۔ جلدی جلدی [illegible] اور پھر جلدی ہی [illegible] جاؤں ——— جانے پہنچنے کے بعد [illegible] گیا: جانے کیوں ہیں؟

مجبوراً [illegible] جاؤں [illegible] جانے کیوں [illegible] کہ دھوپ تیز ہو رہی ہے۔

مجبوراً دفتر چلا گیا۔

[illegible] کی گاڑی دو ڈھائی بجے چھوٹتی تھی۔ بارہ بجے گھر واپس آیا تو [illegible] حیران ہوا کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ پوچھا: آپ اس قدر خوش کیوں ہیں؟"

"تم بڑے سنگدل ہو۔"

"وہ کیسے؟"

"تمہیں علم تھا کہ میں آج واپس جا رہی ہوں، پھر بھی تم دفتر چلے گئے۔"

"میں کہاں جاتا تھا۔ آپ نے ہی تو دھکے مار کے نکالا تھا۔"

"میں تو بار بار اس لیے کہتی تھی تاکہ تم جلدی سے یہ کہہ دو کہ میں آج نہیں جاتا۔ مگر تم میرے دل کی بات سنے بغیر میری زبان پر ہی اعتبار کر کے چلے گئے۔"

کھانا وانا کھانے کے بعد سامان تانگے میں رکھا جا رہا تھا۔ بچوں سمیت سب حیران اور چپ سے تھے کہ شکیلہ آپا کیوں جا رہی ہیں۔ ان کا ایک سوٹ کیس میں نے بھی سیڑھیوں سے اتارا۔ یقین کیجئے وہ سوٹ کیس مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے میں اپنے کسی عزیز کی میت اٹھائے سیڑھیوں سے اتر رہا ہوں۔

شکیلہ ہمارے ہاں میری بہن اور میرے گھر والوں کی مہمان بن کر آئی تھیں۔ مگر شکیلہ کی باتوں نے خلوص سے اور محبت سے سب کو

اپنا بنا لیا۔ اب میری یہ انفرادیت ختم ہو گئی کہ شکیلہ صرف میری بہن ہے۔ اب جسے دیکھو وہ شکیلہ ہی کی باتیں کرتا ہے۔ شکیلہ ہی کی یاد کرتا ہے۔ شکیلہ ہی کے غم میں گھلا جا رہا ہے۔ عجیب جادوگرنی ہیں یہ، جس نے سب کے دلوں کو موہ لیا۔ جیت لیا۔

یہ تو میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ شکیلہ میری منہ بولی بہن ہیں۔ حالانکہ یہ جانتا ہوں کہ بہن تو بس بہن ہی ہوتی ہے۔ سگی، سوتیلی، منہ بولی، یہ سارے ہی اضافی اور فضول لفظ ہیں۔ جب کہ خون کے رشتے کی بات بھی، میرے نزدیک زیادہ اہمیت نہ رکھتی ہو۔

یہ سید ہیں۔ وہ بھی اصلی، براہ راست رسول صلعم کی چودھویں پشت میں۔ اس لیے قدر رکھتا ہوں۔ توبہ استغفار کرتا ہوں۔

سمندر کی لہریں

جاویدہ اخلاق

اس کی پرسکون زندگی سب سے بڑھ کر باعث تعجب تھی پڑوسیوں کے سامنے بڑا اسرار لگتی تھی اور افسانوی کی حد تک وہ ایک تیوری سے خوش نظر آتی تھی۔ وہ صاف ستھرے خوبصورت کپڑوں اور ایک نوکر کے ساتھ رہتی تھی۔ کبھی کبھی صبح کے وقت وہ سبک بگھی میں [illegible] سیر کو جاتی نظر آتی مگر [illegible] ایک دن بھی نظر نہیں آتا تھا۔ پاس پڑوس کے تمام لوگوں کے لیے وہ ایک معمہ تھی۔ ایک ایسی اخلاقی پہیلی جس کا حل مشکل تھا لیکن کراچی جیسے شہر میں پڑھی لکھی خاتون نہیں کبھی۔ [illegible] اختیار کرے تو لوگوں کا تجسس ایک بیماری کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ وہ کون ہے کہاں سے آئی ہے، اس اکیلے پن سے زندگی کے پیچھے کون سا افسانہ ہے، غرض کہ طرح طرح کے سوالات کے جواب میں وہ خاموش رہتی۔ شاید وہ کسی زمانے میں بے حد حسین ہوگی مگر اب ایک اندرونی مستقل اذیت سے چہرے پر زردی کے آثار تھے اور آنکھیں ہمیشہ اوپر کو اٹھی رہتی تھیں جیسے زندگی نے تھکا دیا ہو۔

اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ایک مغرور خود پسند عورت ہے جو ازدواجی زندگی کی بندشوں کی قائل نہیں۔ وہ بڑی سیدھی سی ایک گھر بسانے کا وقار، کسی انسان کی محبت و الفت اور ایک بسے گھر کی خوشبوؤں کو نہ کر اس کے احساس سے بھی بیگانہ ہو چکی تھی یا شاید عکس کو اجنبیوں قابل نفرت تھا۔ یہ سچ تھا یا غلط بظاہر وہ ایک پرسکون زندگی گزار رہی تھی جس میں کوئی اضطراب نہ تھا کوئی الجھن نہ تھی۔ شاید وہ کرب کی حدود سے بھی آگے نکل چکی تھی جہاں پہنچ کر ہر احساس خود بخود سکون پذیر ہو جاتا ہے اور کوئی اذیت باقی نہیں رہتی مگر گزشتہ پانچ مہینوں کا شاید یہ پہلا دن تھا کہ آج شام وہ باہر نہیں جا سکی تھی۔ ایک مانوس سی تحریر ایک جانے پہچانے خط نے یادوں کے کتنے چراغ روشن کر دیے تھے کہ وہ محو ہو کر رہ گئی تھی۔

فضا شام ہی سے تیرہ و تار تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد دھند کا غبار سا پھیل کر تمام کھاڑی کو ڈھانپ لیتا اور بارش کی آواز تیز تر ہو جاتی۔ دور پہاڑیوں پر چند لمحوں کے لیے روشنی کی قطاریں مدھم جگمگاتی نظر آتیں اور پھر نظروں سے اوجھل ہو جاتیں۔ ان خیالات و واقعات کی طرح جو ماضی کی تاریکیوں سے ابھرتے اور چند لمحوں کے لیے اس کے دماغ میں جھلملا کر پھر سے غائب ہو جاتے۔ کتنے عرصے کی طویل خاموشی اور ڈس لینے والی بیگانگی کے بعد آج اسے اپنے خاوند کا خط موصول ہوا تھا۔ گزشتہ پانچ مہینوں میں یہ اس کا واحد خط تھا جس کے ایک ایک لفظ نے اس کے دل و دماغ پر اتنے چرکے لگائے تھے کہ اس کی روح بھی شدت درد سے چلا اٹھی تھی۔ اور گزشتہ

چند لمحوں میں وہ کیا کیا عذاب نہیں سہتے تھے۔ کتنے تپتے ریگ زاروں اور کون کون سے جہنموں میں سے گزرنا پڑا تھا لیکن اب سب کچھ گزر جانے کے بعد عجیب بے حس سا کر دینے والی تھکن نے اسے گھیر لیا تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی گزشتہ زندگی کا ہیولیٰ سا بن ابھرا تھا۔ اس وقت اس کو وہ باتیں یاد آ رہی تھیں جو کہ وہ قطعاً بھول چکی تھی اور سمجھتی تھی کہ اب اس کی زندگی میں ان کا کوئی کام نہیں۔ کھڑکی سے چند گز کے فاصلے پر ایک پہاڑی نالہ کف اڑاتا، پتھروں سے سر پٹختا تیزی سے بہہ رہا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے سفید جھاگ کے مخروطی شیشے [illegible] ہو رہا ہے گویا ہستی ہمای کو کا تماشہ اور وہ اس میں گم ہے۔ اسی سے حالات و واقعات گم گم کر ابھرتے اور جیتے جیتے بلبلے پانی [illegible] کے پردے پر رقص کرتے ہوئے رفتہ رفتہ نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

آہستہ سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور وہ چونک کر پلٹی۔ کمرہ روشن ہو گیا تھا۔ درمیانی میز پر چند تاروں کے ایک گلدستہ کو ٹھیک سے [illegible] آتی ہوئی نرم آنچ ہوا میں آہستہ آہستہ لرز رہا تھا۔ فضا خاموش تھی۔ سامنے کے کمرہ میں اس کے دونوں بچے گہری نیند سوتے نظر آ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر فرشتوں کی سی معصومیت اور مسکراہٹ تھی۔ دروازے کے پاس اس کا پرانا ملازم سفید داڑھی والا اور ایک ہاتھ میں [illegible] تھا۔ یہ سب کچھ کسی خواب کے منظر کی طرح لگ رہا تھا۔

"دو بجے ہیں ——— بیگم صاحب!" وہ استفہامیہ انداز میں بولا۔

"ٹھیک ہے۔" [illegible] عجیب سی تھی۔

"بیگم صاحب! صبح ساڑھے سات بجے ٹیکسی آ جائے گی اور پھر دس بجے کی ٹرین پکڑ سکیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے بہت ہی مختصر سا جواب دیا۔

وہ چند لمحے اس نے مزید حکم کا انتظار کرتا رہا اور پھر خاموشی سے پردہ اٹھا کر باہر نکل گیا۔

بارش لگاتار ہو رہی تھی نالے کا پانی اور شور تیز ہو گیا تھا۔ پانی اب بڑی بڑی چٹانوں سے ٹکراتا، شور مچاتا رواں دواں تھا۔ انسانی احساسات و جذبات، خوشیوں اور غموں سے بے نیاز۔ ایک دن اسی نالے کے کنارے اس کے پرانے ملازم نے ایک اشرفی پڑی پائی تھی جس پر ملکہ وکٹوریہ کی تصویر تھی۔ اسے ان سربلند چوٹیوں، چیڑ کے گھنے جنگلوں، پہاڑی نالوں سے شدید محبت تھی مگر ان سربلند بلند اور گنگناتے آبشاروں نے اسے کھوٹے سکوں، رنگین دھوکوں اور ناکامیوں کے سوا کچھ نہ دیا اور اب اسے ایسا معلوم ہوتا تھا اس کے چاروں طرف کھوٹے سکوں کے انبار لگے ہیں اور وہ ان کے بوجھ تلے پسی چلی جا رہی ہے۔ تمام احساسات، جذبات، یہ خوشی و غم، بے پایاں محبت اور ناقابل برداشت نفرت سب باتیں کھوکھلی، عارضی اور نقلی نظر آ رہی تھیں۔ کسی چیز پر اعتماد نہ رہا تھا۔ شاید تغیرات اور حوادث کا نام ہی زندگی ہے۔

کئی برس پیشتر جبکہ اس کا شعور بھی پوری طرح بیدار نہیں ہوا تھا اس کی منگنی کر دی گئی۔ وہ سٹپٹا سی گئی، کچھ کچھ سمجھی کچھ نہ سمجھی یا شاید اس نے سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی۔ کہیں دور گھاٹیوں میں تنہائی سی جاگ اٹھی اور اس کے خوابیدہ احساسات و جذبات جھنجھنا اٹھے طبیعت میں یکایک سنجیدگی سی آ گئی۔ بچپن دور کھڑا اسے حیران نگاہوں سے تکتا رہتا۔ ایک نئی زندگی ایک نیا تجربہ، خوشی اور خوف کے ملے جلے احساسات میں وہ گم سم سی رہتی جیسے پرندہ اپنی پہلی اڑان سے پہلے دبک سا جاتا ہے۔ شادی کا دن نزدیک آ گیا۔ ایک دن اسے اکیلا پا کر اس کا بھائی آہستہ سے آ کر اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔

[illegible] مجھے بھی مشرقی تہذیب کا اتنا ہی خیال ہے جتنا کہ گھر کے باقی افراد کو [illegible]
[illegible]
[illegible] ۔

[illegible] ۔

[illegible]
[illegible] ۔

[illegible]
[illegible] ۔

[illegible] مسکراتے ہوئے [illegible] اور چپکے سے چل دیا۔

شادی کے بعد اسے ایک مکمل زندگی ملی۔ [illegible] اور ایک رنگین گھر کا سا ماحول تھا۔ اس نے [illegible]
کے سامنے [illegible] جہاں نیلی جھیلیں [illegible]
[illegible]
اور ایک [illegible] چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ تھا اور یہی سکون اس کی فطرت بن چکا تھا۔ [illegible]
[illegible] رنگ برنگی [illegible]
تھا۔ [illegible] سمندر [illegible] ہوائی جہازوں کا شور [illegible] چاروں طرف [illegible] ہزاروں [illegible] تھے۔
شروع شروع میں وہ گھبرائی بھی مگر اس کے خاوند نے صرف اس سے محبت ہی نہیں کی بلکہ ایک مخلص دوست کی طرح اس کا ساتھ دیا۔
اس کا [illegible] ہمیشہ [illegible] شفقت [illegible] رفتہ رفتہ [illegible] کوشش سے وہ ان ہنگاموں [illegible] کی عادی ہو گئی جیسے زندگی کا حصہ
ہوں۔ وہ دونوں [illegible] ہر دل عزیز تھے۔ [illegible] آپس میں [illegible] محبت تھی اور اسی محبت میں ڈوب کر وہ اس کی کمزوریوں خامیوں کو
بھی نظر انداز کر جاتی۔ کبھی کبھی [illegible] خوشی [illegible] جھگڑا [illegible] مگر ہر بار وہ [illegible] پیار سے
مناتا کہ وہ سب کچھ بھول جاتی۔ اکثر دونوں کو زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہوتا [illegible] آہستہ آہستہ [illegible]
ہوئے کہتا۔ ڈیری! میرا خیال ہے اب گھر میں ایک ننھی منی بچی ہونی چاہئے [illegible] اور اس کی شکل و صورت بالکل تمہاری طرح ہو۔ وہ
زیر لب مسکراتا۔

لڑکی کیوں؟ لڑکا ہونا چاہیے۔ وہ چڑ جاتی۔

مگر میں پہلے لڑکی چاہتا ہوں۔ وہ اپنی ضد پر قائم رہتا۔

دن گزرتے رہے اور وہ بچے صرف ان کے تصور میں ہی جھلکتے رہے۔ کوئی خواب بھی حقیقت نہ بن سکا اور خلا وسیع تر ہوتا چلا گیا۔
وہ حیرت انگیز طریقے سے بدل رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے شراب نوشی زیادہ کر دی۔ اب وہ زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتا۔
گو عیش و آرام اور تفریحات میں کوئی خاص فرق نہ آیا تھا مگر زندگی بکھری بکھری سی لگتی تھی۔ کچھ عجیب سی بے اطمینانی تھی جس کے اظہار سے [illegible]

شاید گارڈ ورڈ والے نے سچ کہا ہے کہ انسانوں میں ایک جدت پسندی ہے جس کی وجہ سے وہ نت نئے عشق کی تلاش میں رہتا ہے لیکن اگر اس کو تسکین حاصل ہو جائے تو جہاں پہلے طبیعت میں ایک تشنگی تھی وہاں اب ایک سیری آجاتی ہے۔ طبیعت اکتا جاتی ہے۔ احساس مفلوج ہو جاتا ہے اور یہ مرض لاعلاج ہے۔

وہ یہ سب کچھ سمجھ رہی تھی۔ اس تبدیلی اس بیگانگی کو شدت سے محسوس کر رہی تھی مگر خاموش رہتی۔ اور پھر اچانک اسے کچھ دنوں کے لیے اپنے وطن جانا پڑ گیا۔ جس دن وہ روانہ ہونے والی تھی وہ قدرے پریشان و متفکر سا نظر آتا تھا۔ ہوائی جہاز کے روانہ ہونے سے چند لمحے پیشتر اس نے اس کے چہرے پر ایک ایسی گہری اداسی کی جھلک دیکھی تھی کہ گھر پہنچنے تک اس کے دل سے تمام شکوک اور بدگمانیاں زائل ہو چکی تھیں وہ اس پرسکون ماحول میں واپس پہنچ کر پھر سے اس کے لیے مضطرب ہو گئی۔ اس نے کئی دفعہ جلد واپس جانے کا ارادہ کیا مگر کوئی نہ کوئی رکاوٹ حائل ہو جاتی اور پھر اس دن اس کی چھوٹی بہن کی شادی تھی۔ وہ بالکل اسی طرح کا دن تھا جس دن اس کی شادی ہوئی تھی۔ تمام رات لڑکیاں ڈھولک کے ساتھ گاتی رہیں۔ صبح رخصتی کے ہنگاموں میں کسی نے ایک خط لا کر دیا۔ وہی جانی پہچانی تحریر۔ اس نے بے تابی سے لفافہ چاک کیا مگر چند لمحوں تک اسے کچھ بھی نہ آ سکی کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ الفاظ بڑے بڑے دھبوں کی طرح آنکھوں کے سامنے ناچ رہے تھے

"فرخندہ! میں نے مجبوراً دوسری شادی کر لی ہے۔ وہ ایک انگریز عورت ہے۔ میں اسے کہہ چکا ہوں کہ میں نے تمہیں طلاق دے دی ہے اس لیے اب تم واپس آنے کی کوشش نہ کرنا۔ مجھے افسوس ہے مگر میں مجبور تھا۔ امید ہے تم بھی مجھے جلد بھول جاؤ گی۔"

اور جب اسے ہوش آیا تو اس نے دیکھا کرسیوں کے ٹکڑے اور سامان کے ادھ جلے پھول جل کر خاکستر ہو چکے ہیں۔ نیلی جھیل پر لاوا اُبل رہا ہے۔ دنیا کے سارے پھولوں میں آگ لگ گئی ہے اور زندگی کے ایک کنارے کا مسافر دوسرے کنارے نہیں جا سکتا۔ زعفران کے کھیت جھلسے پڑے ہیں اور چشمے سوکھ گئے ہیں۔ اسے یہ سب کچھ ایک خواب نظر آ رہا تھا۔

وہ گھر کے کسی فرد کو حقیقت سے آگاہ کیے بغیر اچانک تیاری کر کے روانہ ہو گئی۔ کار اور ریل کا سفر اس نے سوتے جاگتے کی سی حالت میں طے کیا اور پھر ہوائی جہاز اسے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں میں گم ہو گیا۔ تمام رات وہ جگمگاتے شہروں پر برستے بادلوں کے اوپر چاندنی کی کرنوں میں پرواز کرتی رہی۔ وہ خوفزدہ تھی۔ صبح اسے لینے کوئی نہیں آئے گا۔ کسی کی منتظر نظریں آسمان کو نہیں تکیں گی اور کوئی دھڑکتا دل اس کے لیے کار کا دروازہ نہیں کھولے گا۔ اس نے کسی کو اطلاع ہی نہیں دی تھی۔ اس کا کوئی نہیں تھا، وہ کہاں اور کس کے پاس جا رہی ہے؟ یہ وہ انسان نہیں تھا جس نے آسمانی صحیفوں کے درمیان انتہائی محبت اور فخر کے ساتھ اسے قبول کیا تھا جس نے اسے محبت کرنا سکھا دیا تھا۔ یہ کوئی اور تھا جسے وہ ہرگز نہیں جانتی تھی۔ وہ پہلا انسان نہ جانے کہاں کھو گیا؟ افسوس انہوں نے اکٹھے کتنے سہانے خواب دیکھے تھے کتنی دلفریب شامیں، رنگین راتیں اور مسکراتی صبحیں تھیں کتنی خوشیاں اور قہقہے تھے۔ وہ ان سب کا بوجھ اٹھائے اس وسیع دنیا میں اسے کہاں ڈھونڈتی پھرے گی۔ چند معمولی الفاظ تمام گذشتہ زندگی کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیتے ہیں مگر وہ پہلی نظر، ایک لمس، ایک بوسہ۔ وہ ہلکی سی لرزش، ایک سسکی، چند آنسو، خنک چاندنی اور ادھ جلے پھول، دل کی گہرائیوں میں جا گزیں ہو کر غیر فانی ہو جاتے ہیں۔

اسے لینے کوئی نہیں آیا تھا مگر اسے اپنے گھر کا راستہ بخوبی معلوم تھا اور اب وہ اپنے خوشنما فلیٹ کے دروازے پر ایک اجنبی کی طرح کھڑی کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہی تھی۔ کسی نئے نوکر نے اسے پہچانے بغیر دروازہ کھول کر ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ تمام ماحول اجنبی سا نظر آ رہا تھا۔ کارنس پر سے اس کی تصاویر اٹھا دی گئی تھیں۔ کمرے میں نقشہ بدلا ہوا تھا۔ وہ اپنے ہی گھر میں

کسی وحشی کی طرح چاروں طرف حیرانی سے تکتا ہوں سے ... رہی تھی۔
— جی، صاحب وہ بیرصاحب کی دونوں بڑے صاحب تھیں۔ آپ کس سے ملنا چاہتی ہیں؟ وہ اوپر سے سامان دیکھ کر دوبارہ سوال کیا۔

وہ چونک پڑی۔ ہاں وہ مجھے یاد آ گئی۔ تم نے کیا تو نہیں تھا۔ صاحب سے ملوں ... سکتی تھی۔ آپ اور پھر ... چند لمحوں کے لئے ... کے وہ ... سنگ مرمر سے ... کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ ... دیکھ ... ہنگامی ... رہیں۔
— میں اپنے گھر آئی ہوں۔ ... ... پرانی تھی۔
— مگر میں یہیں سے کہہ رہا ہوں ... مجھے بھی ذہنی عادت ... وہ ... سے ... نکل ... سے کہ جیسا میں ... سے ... چھوڑ ... سے ... آواز ... تو تمہیں کیا حاصل ہوگا۔
— میں تم سے ... کر ... ہوں ... سے ... آ ... مجھے ... ہوگا۔
— دیکھو ... چلی جاؤ۔ اس ... سے ... چلی جاؤ۔ وہ ... گیا۔
— کہاں چلی جاؤں؟ ... سے ... جانی پہچانی ... سے ... دیکھے ہوئے ... جیسے ... کے ... آسمان میں کہیں جگہ نہیں۔
— ... چلی جاؤ۔ وہاں کئی ... سے ... جا ... سے ... تصنعات ہیں۔ ... کسی ہیلی کے پاس ٹھہر جاؤ۔ وہاں مفصل گفتگو ہو سکے گی۔ ہم دہاں ... کر ... ہیں۔ ... جلدی جلدی چلی جاؤ۔
وہ خاموشی سے ... سیڑھیاں ... آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے لگی اور وہ ریلنگ کے سہارے جھکا چپ چاپ اسے جاتے دیکھتا رہا۔ ایک موڑ ——— دوسرا موڑ ——— پھر ... اس کی ساری کا ... پھر ... لہرا کے غائب ہو جاتا۔ کتنی سیڑھیاں کتنے موڑ، ان گنت ... بے جلنے ... اور ... تھے۔ ... وہ ... اڑا اڑ کے اسے اپنی یاد دلاتے ... لفظوں سے اوجھل ہو گئے۔ وہ نیچے ... کے ... کے ... گم ہو کر رہ گیا تھا، نہ جانے کتنے لمحے جو ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گئے۔
اور پھر بہت عرصہ بعد اس نے اپنے ایک دوست سے ... کے اندازہ میں ... کہا تھا میری دوسری شادی جلد ہی ناکام ثابت ہوئی اور پھر اسی طرح تیسری بھی مگر مجھے قطعاً کوئی غم نہیں۔ میں اب ایک تنہا انسان ہوں۔ تمام احساسات و جذبات سے بے پروا مگر ایک احساس باقی ہے۔ ایک ... میرے ذہن میں مستقل اذیت بن کر رہ گئی ہے۔ وہ لمحہ جب وہ میرے ... قدموں سے اکیلی سیڑھیاں اترتی ہوئی سڑک کے بے پناہ ہجوم میں غائب ہو گئی تھی اسے فراموش نہیں کر سکتا۔ اکثر ... سے ... اچانک میرے ذہن میں جاگ اٹھتی ہے اور پھر کہیں سکون باقی نہیں رہتا۔ شاید وہ نام ہو ——— زندگی بھر اسی طرح میرے ذہن میں سیڑھیاں اترتی رہے گی اور کبھی نہ اتر سکے گی ——— ایک لامتناہی سلسلہ ——— کتنی عجیب بات ہے ——— ... گو یہ سب کچھ ... کیونکہ اب وہ ایک دوسرے انسان کی بیوی ہے۔ مگر یہ سیڑھیاں! یہ مستقل اذیت ——— وہ آہستہ آہستہ عجب اذیت اور مایوسی کے لہجے میں بڑبڑا رہا تھا۔
اور وہ دوسرا آدمی ——— ایک پڑھا لکھا خوبصورت اور معزز انسان ——— جس سے وہ اپنے خاوند کی مرجودگی میں کئی ... چکی تھی

جیسے وہ اس سے مانوس اور روح سے مانوس آیا ہو کہ وہ جسے چھوڑ سے پہ جانے والا ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتا تھا اس بچھلی کی یاد کرتی تھی۔ سچے ہوتے رہنے اور جذبہ صبر کا خوش پوش و خوش گفتار انسان جو ہر مرد سالگیں سے وہ پسند کیا جاتا خصوصاً عورتوں میں وہ بہت کچھ خود میں طرح پہل چکی تھی مگر آنے والے حالات کا کسے علم تھا۔

زندگی کی وہ اس منزل پر جیسے جیسے ایک دوسرے پر وہ ظاہر اسے مل گیا کسی دور دراز شہر میں بہار کی خدمت ہو رہی تھی سے انہیں دیا ایک اکٹھا کر دیا تھا۔ دونوں کو ایک دوسرے کو کچھ کرنے میں محسوس ہوئی۔ ایک گزرے خوشگوار دنوں کی یاد کی وجہ سے دونوں کے ذہن ابھی تک ہیں گے دونوں و لطیف رفاقت کے احساس سے یا یہ جو روایتی مگر جس آمد دونوں ایک دوسرے کے نزدیک آئے گئے۔ دونوں کی زندگیوں میں ایک خلا تھا جس کو عارضی طور پر ایک دوسرے کی موجودگی نے پر کر دیا۔ دل شکستہ سے بے ہوا، اس کی زندگی ہمارے سے بے کار پانوں مار رہی تھی اور وہ بھی سادہ زندگی کے سبب دو راہ کھڑا تھا۔ اگر وہ کوئی وعدہ اس دروازے کی راہ بہت سے گزرا تھا تو کبھی یا دو ہی راستے ہوں گے ان دونوں تنہائی کا سلسلہ بھی ہو چکا تھا۔ بڑھ جانے محبت اور جب ماک بنا گئی رفاقت کے معنی جانتا تھا یا پھر زیست کی ہر ہی راہوں اور زندہ دلی اور اور طرف سے ملکہ زیادہ بنتی ہی چنتے گئے وہ سمٹ کر جاتے سے رہ ول چاہنے لگا۔

جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ اسے پسند کرتا ہے یا شاید محبت کرتا ہے تو آخر ایک دن اس نے اس کو شادی کر ہی لی۔ وہ خوش تھی اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتی تھی۔ اسے وہ بے حد پسند کرتی۔ اس کی موجودگی ہی اسے سکون و راحت بخش دیتی تھی مگر یہ بھی وہ خوش رہنا بھی کی کئی روز تک سخت تذبذب کی حالت میں اس کے متعلق سوچتی رہی۔ اس کی نسبت کش کر خیر جانی ہو چکی تھی اس کی زندگی بن گئی تھی وہ اب محبت کے بغیر زندہ نہ رہ سکتی تھی۔ وہ بہ بے پایاں محبت اس پر وہ رہنا چاہتی تھی تاکہ اس میں ڈوب کر گزشتہ تلخی کو بھی بھول جائے لیکن اگر یہ بھی خواب ثابت ہوا۔ زندگی کے بازار میں اگر یہ تحول رنگ میں دے گیا تو اس کے مند کر رکھ دیکھتے جیسے وہ اس سے کچھ نا بہت کچھ ہی نہیں کر سکتی تھی بلکہ شاید وہ بے حد خفیف تھا۔ عجیب و غریب ہے ادا جس پر قدیم عہد کی تبت نقش اور کسی نا ذبا شہر زبان میں عبارت کندہ ہو کوئی انسان وہ عجیب و غریب زبان سیکھے بغیر اس کی ماہیت کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا شاید وہ بہتے ہوئے سمندر وں کے کنارے عظیم انسان معبدوں میں پوجا گیا تھا کسی حسین دیوی کے ماتھے پر جھلملا رہا تھا نیل کے کنارے قلوپطرہ کے دل کی دھڑکن بن چکا تھا شاید اسے لمس ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اور کسی سپیرے کسی مار کے انفتی نے اسے رشک سے دیکھا تھا۔ وہ اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کبھی ان جانے خوف سے لرز رہی تھی کانپ رہی تھی مگر اس کے مضبوط ہاتھوں کا سہارا پا کر سنبھل گئی اور شادی کے بعد تو تمام محبت و پرستش اس نے اس کے سپرد کر دی تھی۔ کتنے نیرین محات سے وہ بھی اور اب ان کے دو بچے تھے۔ وہی بچے جو اس کی پہلی ناکام زندگی میں اکثر اس کے تصور میں جھانکا کرتے تھے۔

پھر زندگی بے حد پرسکون تھا مگر یہ سکون بھی زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا اور کچھ عرصے کے بعد ہی وہ اس کی سطح کے نیچے ابھرتی کا ہلکا ہلکا تلاطم محسوس کیا کرتی۔ رفتہ رفتہ وہ بھی بدل رہا تھا۔ بیزار اور چڑچڑا سا۔ وہی بے اطمینانی، وہی سکون کی آرزو، نت نئے جھگڑے زندگی کا وہی پرانا تماشہ، صرف وقت، مقام اور کردار بدل گئے تھے۔ خلا کوئی نہ تھا مگر تشنگی مٹ جانے پر وہ اکتا گیا تھا اور دن بہ دن اس کی بیزاری اور جھنجھلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اس کی بدلتی ہوئی عادات پر بھونچکا سی رہ جاتی۔ تمام خوش فہمیاں غلط ثابت ہو رہی تھیں

[illegible] سے [illegible]
[illegible] آپ کو [illegible]
[illegible] ذکر [illegible] وقت
[illegible] جاتے ہیں۔ [illegible]
[illegible] کو [illegible]
[illegible] جاتے [illegible] سے [illegible]
[illegible] بیٹھا
میں کھو چکا ہو۔

وہ پہروں اس کے متعلق سوچتی [illegible] اسے ہمیشہ بھی عادت کو پڑھنے میں [illegible]
[illegible] کی محبت کی [illegible] شکست [illegible] ایک ایسی عجیب [illegible]
کوئی نام نہ تھا [illegible] سب کچھ کہتے ہوئے [illegible]
شاید وہ بیمار ہی تھا [illegible] تکمیل [illegible]
کی تکمیل کرتی [illegible] زندگی [illegible] بے اطمینانی و [illegible] سے [illegible]
میں جاری ہوتی ہیں کیونکہ ایک [illegible] صحت مند دل و دماغ ہی ہوتا ہے۔

مگر اسے سب سے زیادہ دکھ اس وقت ہوتا جب وہ اپنے [illegible] دماغ کی عادت اور اپنی کمزوری پر رو پڑنے کے بجے
[illegible] اپنی [illegible] ناکامیوں، پریشانیوں اور تکلیفوں کا باعث اسے گردانتا۔ [illegible] ظاہر [illegible]
کر گیا اور ایک [illegible] کی بات پر ناراض ہو کر وہ [illegible] چپ چاپ [illegible] روانہ ہو گیا [illegible]
کوئی پیغام تک نہیں چھوڑا تھا۔ گھر واپس آ کر جب اس نے اس کا خالی کمرہ دیکھا تو حیران سی گئی [illegible] بیٹھا تھا
اور ایک دفعہ پھر وہ بھرے بازار میں لاکھوں مسکراتی ہوئی نظروں کا نشانہ بنی ہنستا کھڑی تھی۔ کیا اس کی تمام محبت و پرستش کا یہی صلہ تھا؟
حادثات کو کیوں اس کی زندگی سے اتنی دلچسپی ہے۔ اس کا کوئی بھی خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

زندگی کی یہ دوسری شکست سب کچھ جلا کر خاکستر کر گئی۔ کوئی احساس کوئی جذبہ باقی نہ رہا۔ خوشی نے مٹ کر غم کے احساس
سے بھی بیگانہ کر دیا۔ نفرت نہ کر سکی مگر محبت کو بھی بھول گئی جیسے وہ کبھی اس کی زندگی میں آئی ہی نہ تھی۔ سب کچھ فراموش کر بیٹھی کوئی اذیت باقی
نہ رہی۔ سچی جوانی کی بے پناہ [illegible] سے گھبرا کر وہ چند دنوں کے لیے یہاں آئے تھے مگر وہ اسے سڑک کے کنارے [illegible]
چھوڑ کر چل دیا جہاں وہ بجھ کر رہ گئی۔ سر سے پاؤں تک برف کی ایک سل۔ احساسات و جذبات سے عاری جسے کسی کی طنز، کسی کی ہنسی،
کسی کی پرتجسس و مشکوک نظریں تکلیف نہیں پہنچا سکتی تھیں۔ دیگروں کی رائے زنی سے بالاتر وہ ایک ایسی جلتی زندگی گزار رہی تھی جو دوسروں کے
نزدیک قابلِ اعتراض تھی کہ آج اچانک چار مہینے بعد کاغذ کے ایک ٹکڑے نے تمام گزشتہ گھاؤ ہرے کر دیے تھے اور کتنی بھولی بسری
یادیں [illegible] اٹھی تھیں۔ ایک سطری خط میں اس نے حسبِ عادت اسے ستم کرنے ہوئے اس کے خلاف تمام زہر اگلنے کے بعد آخر میں اپنی

بلندی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ان کہ وہ اب بھی اسے اسی طرح چاہتا ہے اور اس کا منتظر ہے۔ خط ملتے ہی وہ فوراً اس کے پاس آنے کے لیے روانہ ہو جائے۔

اور یہ خط اس نے لکھا تھا۔ وہ اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ اس کی بیماری بھی ختم ہو چکی ہوگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب وہ جا کر کیا کرے گی۔ کیا پھر سے وہ زندگی دوبارہ [illegible] محبت وہ بے پناہ خلوص [illegible] واپس آ سکتے ہیں؟ وہ احساسات وہ [illegible] جو کبھی اس کے تھے، واپس آ سکتا ہے؟ محبت تو ایسی چیز تو نہیں کہ جب دل چاہا [illegible] سے حاصل کر کے بیزار ہو جائے۔ وہ خزاں رسیدہ جنگلی خودرو پودوں کی طرح [illegible] پھولوں سے لدی [illegible] کے کنارے [illegible] بڑی آہستگی سے [illegible] اپنی محبت کو کسی [illegible] کسی سبب کے درخت نے [illegible] تو وہ [illegible] حلقوں کی طرف پرواز کر جاتی ہے۔ [illegible] ہیں۔ محل ویران [illegible] ہو جاتی ہیں اور وہ انسان تمام زندگی اس محبت کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا ہے مگر وہ کبھی لوٹ کر نہیں آتی۔

[illegible] کا تصور [illegible] اس کا [illegible] مگر اب اس کے پاس ان [illegible] کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ وہ اب اسے کیا دے سکتی تھی۔ یہ خالی بے رنگ زندگی [illegible] اور مردہ احساسات و جذبات وہ اسے کسی وقت بھی تحفہ پیش کر سکتی ہے۔ [illegible] کیا ہے اب۔

وہ [illegible] جیسے بیٹھی تھی [illegible] آئی۔ [illegible] کر کے [illegible] اور [illegible] ہوئے [illegible] کہ صبح نہیں ہو رہی اس لیے وہ اسے جلدی نہ جگائے۔ اور پھر اسی پرانے اطمینان و دلجمعی کے ساتھ جو لوگوں کے لیے باعث حیرت و لعنت تھی، اپنے بیڈ روم کی طرف چلی گئی۔ [illegible] ہو گئی۔

فیض احمد فیض

○

یہ جفائے غم کا چارہ، وہ نجاتِ دل کا عالم
ترا حسن دستِ عیسیٰ، تری یاد روئے مریم

دل و جاں فدائے راہے کبھی آ کے دیکھ ہمدم
سرِ کوئے دلفگاراں شبِ آرزو کا عالم

تری دید سے سوا ہے تری یاد میں بہاراں
وہ چمن جہاں گری ہے ترے گیسوؤں کی شبنم

یہ عجب قیامتیں ہیں تری رہگزر میں گزراں
نہ ہوا کہ مر مٹیں ہم، نہ ہوا کہ جی اٹھیں ہم

لو سنی گئی ہماری، یوں پھرے ہیں دن کہ پھر سے
وہی گوشۂ قفس ہے، وہی فصلِ گل کا ماتم

حالی کی قطعہ نگاری

ڈاکٹر سید عبداللہ

فارسی قطعہ عرب سے لی ہوئی صنف ہے۔ اس کا مقصد کسی حقیقت کا مختصر مگر مسلسل بیان ہے اور مسلسل بیانی کی یہ کوشش ابتدا ہی سے فارسی شاعری میں ظاہر ہو رہی ہے۔ اس کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاعری کے متعلق بعض لوگوں کے یہ خیالات بلکہ الزامات کہ ایرانی ذہن کے لائق نہیں کہ یہ لوگ تسلسل بیان پر قادر نہ تھے۔ دراصل یہ ایک زمانہ ایسا بھی آیا تھا جب غزل کی مقبولیت کے سبب اور اسی طرح کے مخالف ہو گئے تھے۔ میں نے جن وجوہات کا ذکر کیا ہے ان میں سے ایک مشکل یہ بھی تھی کہ ہمارے کلاسیکل شاعر مضمون کے تسلسل کو نہ جانتے تھے اور نہ اس کو برقرار رکھ سکتے تھے۔ ظہیر الدین احمد اس سلسلے میں اتنے نیک نام ہو چکے ہیں کہ اب ان کا ذکر کرتے ہوئے ان پر رحم آتا ہے لہٰذا ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیجئے کیونکہ وہ بچارے تو محض شعور کے دامن میں گم ہونے کے جرم میں مارے گئے اور بعض معنی تعلیم کا نہیں اصل غلطی تو اس ذہن کی ہے جس نے آج سے ایک سو سال پہلے یہ مشرقی کو بے جرم مار پھینکنے کی رسم ڈال رکھی۔

خیر یہ تو محض جملہ معترضہ تھا۔ کہنا صرف یہ ہے کہ قطعہ کی صنف ذوقِ تسلسل کی تسکین کے لیے وضع ہوئی۔ ابتدا آزادی (یعنی قصیدے کی عام رسوم و قیود سے آزادی) اس کی ایک بنیادی صفت قرار پائی چنانچہ مطلع کی قید سے آزاد تو قطعہ مسلسل مضمون کو ادا کرنے کے لیے وقف ہوا اور آج تک اس کی یہی صفت اس کی شناخت کی بنیادی علامت ہے۔ اس کے باقی اوصاف قطعی نہیں اور ان میں تغیر ہر دور میں رد و بدل ہوتا رہا۔

قطعہ (ق ط ع) لغوی معانی کے اعتبار سے ٹکڑے یا کٹے ہوئے کسی جز کو کہتے ہیں اور جب اس میں اصطلاح کا رنگ پیدا ہوا تو بھی یہ بنیادی معنی اس میں باقی رہا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ مضمون کا تسلسل اور ربط اور اس کی جزئیت اس کی بنیادی صفت ہے مگر یا قطعہ کسی وسیع تر اور طویل تر بیان کے لیے نہیں یہ تو حقیقت کی ایک جھلک دکھانے کے لیے وجود میں آیا تھا۔ اصل میں قصیدے کا ایک کٹا ہوا ٹکڑا ہے جس میں بعض صفات قصیدے کی پائی جاتی ہیں اگرچہ اس میں مطلع نہیں ہوتا مگر اس کا یہ تصور رعایت ابتدائی زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ بعد میں ارتقا یافتہ قطعے کی قصیدے سے بجز اس کے کچھ مشابہت نہ رہی کہ قصیدے کی طرح یہ رباعی اور غزل سے مختلف چیز ہے اور یہ بھی کہ اس میں بھی قصیدے کی طرح ایک مرکزی مضمون موجود رہتا ہے۔

قطعہ کی ہیئت و ساخت کے متعلق مختلف زمانوں میں مختلف تجربے ہوئے —— اور یہاں ہیئت سے میری مراد تعداد اشعار بھی ہے جو کم از کم دو اشعار اور زیادہ سے زیادہ دس بارہ اشعار تک پہنچی ہے۔ (بعض اوقات شاید اس سے بھی زیادہ) مگر متوازن قطعہ ہمیشہ مختصر

[illegible] قطعہ [illegible] ہے [illegible] قطعے کی [illegible] قصیدے [illegible] مطلع [illegible] قطعہ [illegible] [illegible] غزل [illegible] قطعے [illegible] قطعے [illegible] ہے۔ [illegible]

[illegible] سعدی کا یہ قطعہ —

[illegible]

اسی طرح [illegible] قطعے میں [illegible] حکایت کو لانے کا رواج [illegible] میر کا یہ قطعہ دیکھئے جو ایک غزل کے اندر ہے —

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا — یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر — میں بھی کبھو کسو کا سرِ پر غرور تھا

اس قطعے کے پہلے مصرعے میں ایک واقعہ ہے۔ تیسرے مصرعے میں مکالمہ ہے اور آخر میں ایک حقیقت کا انکشاف ہے۔ یعنی اجزا [illegible] یہ قطعہ مکمل ہوا ہے۔ میر کے ایک دوسرے قطعے میں محض ایک قول پر بنا رکھی گئی ہے اس میں کوئی مکمل واقعہ نہیں مگر واقعہ کا ابتدائی طاش ضرور ہے —

بلبلیں پائیز میں کہتی تھیں ہوتا کاش کہ — یک مژہ رنگِ فراری اس چمن کا آشنا
گو گل و لالہ کہاں سنبل سمن ہم نسترن — خاک یکساں ہو گئے ہیں لگ گئے کیا آشنا

میر کا یہ قطعہ ایک غزل کے اندر ہے اور یہ بھی میر کی ترجیحات میں سے ہے کہ انھوں نے قطعے کے بہت سے تقاضوں کو بدل ڈالا یہاں تک کہ ان کے بعض قطعات میں قصیدے و رباعی کی طرح مطلع بھی ہے — بہر حال علی العموم — واقعہ کا بیان قطعے کی داخلی خصوصیت ہے۔ اگرچہ بعض شاعروں کے یہاں محض بیانِ حقیقت ہی قطعے کا مقصد معلوم ہوتا ہے یعنی حقیقت کا کوئی رخ یا اخلاقی فلسفیانہ اور دنیوی زیرکی کا کوئی نکتہ واقعہ بنائے بغیر بھی قطعے کا موضوع بن جاتا رہا۔ مثلاً سعدی کا یہ قطعہ —

ہم گریاں ما بہ درس صبح شد ناچیز رم صبح و چو پرتو شما
اے شکر خیوہ ماسے ساز تا بہ گرہ پشت مہ ست وفا

بہرحال یہ سب تو اسباب اور تجربات ہیں جس طرح جدید دور کے قطعہ نگاروں نے (مثلاً اختر انصاری اور عندلیب شادانی وغیرہ) نے قطعے میں ہیئت و معنی کے کئی تجربے کیے ہیں اور قطعے کے پرانے آداب و ساخت کا احاطہ اور وسعت کی۔

قطعے میں صاحب ذوق و روح کے ساتھ خصائص کے مانند تو لنگ ... اور اس کی بھی اہمیت ہے اطلاق میں مطالعہ آتی اور تخیل کا امتزاج قطعے کی روح کے پیمانہ گراہ ہے۔ قطعے میں اس سے معنی و برجستگی سے حرکت رہی ہے۔ کی دو راضی کی بات برجستہ انداز میں برجستہ اور دل نشین ہو جائے۔ قطعے کو جو چیز سب سے زیادہ نقصان پہنچاتی ہے وہ اس کا انتشار ہی ہے یہ رنگ کہ ادائے بیان میں بھی برجستگی اور یکجائی کی ضرورت ہے۔

ماحصل کلام یہ ہے کہ قطعے کے لیے چند چیزیں ضروری ہیں۔ اوّل بیان کا تسلسل، دوم مناسب اختصار، سوم برجستگی و ندرت، سوختی و شوخی اور بات، چہارم کسی حقیقت یا فلسفے کا اظہار۔ ان صفات کے علاوہ واقعہ نگاری سے قطعہ میں اضافہ ہو سکتا ہے اگرچہ یہ ضروری نہیں۔ اس کا اتنا اہم نہیں کیا۔ میری دانست میں دو اشعار والے قطعے اور رباعی میں فرق ہے۔ ان دونوں میں جب بات کہی جاتی ہے تو دو مصرعوں میں ایک طور دوسری بات کہ رباعی میں حقیقت کو بیان حکایت کا رنگ اختیار نہیں کرتا مگر قطعے کی ایک مخصوص صنعت یہ ہے کہ اس میں حقیقت کے لیے حکایت یا واقعہ کا ڈھانچہ تیار کرنے سے بات زیادہ موثر ہو جاتی ہے۔ اسی طرح رباعی کی روح نسبتاً سنجیدہ ہے۔ اس میں طنز و مزاح کی چھیڑ یا حقیقت کی درشت بیانی مناسب ہے البتہ قطعات میں برجستگی ادا اور لطیف طنز کی گنجائش ہے۔ اس سلسلے میں ایک بات قابل غور ہے اور وہ یہ کہ جس چیز کو ہم قطعہ بند کہتے ہیں کیا وہ بھی قطعہ ہوتا ہے ... اس سے کوئی مختلف چیز ہے۔ غزل میں آئے ہوئے قطعہ بندوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصول تسلسل کے لحاظ سے تو وہ قطعہ ہی بنتا ہے مگر اس میں مکمل قطعے کی صفات نہیں پائی جاتیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ غزل میں قطعہ بند لانے کی ضرورت کیا ہے؟ ظاہر اس سے بات کا زور ادا مقصود ہوتا ہے اور غزل کی پریشان خیالی کے اندر مربوط مضمون کا پیوند لطف دیتا ہے۔ یہ قطعہ بند عموماً مختصر ہوتے ہیں مگر میر و غالب کی غزلیات میں قدرے طویل قطعے بھی ہیں بلکہ ایک غزل میں ایک سے زیادہ قطعے بھی ہیں مثلاً غالب کا مشہور قطعہ

اے تازہ واردان بساط ہوائے دل

پیوند کاری کی یہ خاص کوشش اگرچہ میر و سودا کے یہاں کچھ زیادہ ہے جس کے سماجی و سیاسی اور نفسیاتی اسباب ہیں مگر ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

اس طویل تمہید کے بعد اب میں حالی کی قطعہ نگاری کا تجزیہ کرتا ہوں۔

حالی اور اکبر — جدید زمانے کے دو ایسے شاعر ہیں جن کے یہاں قطعہ نگاری کا فنی شعور خاص طور سے نمایاں ہے جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اکبر کو حالی کے مقابلے میں قطعے پر زیادہ قدرت ہے مگر حالی کے قطعے بھی خصوصیات کے مالک ہیں اور ان میں حالی کا رنگ طبیعت جھلکتا ہے۔

حالی کے [illegible] ۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ۔

حالی [illegible] قطعات [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] حالی کے قطعات میں

[illegible] ہے۔

حالی نے مضمون کو مؤثر بنانے کے لئے [illegible] جیسے مثلاً خطاب کا [illegible] سادہ [illegible] مکالمہ [illegible] سے خطاب اور تقابل کا استعمال ——— ان سب کا مقصد بعض خلاقی حقیقتوں کا اظہار ہے۔ جہاں تک [illegible] مکالموں میں [illegible] ہے کہ حالی نے قطعہ نگاری کا ایک نیا تجربہ کیا ہے۔ [illegible] وہ کامیاب بھی رہے ہیں اور کہیں کہیں لڑکھڑاتے بھی ہیں۔ کامیابی اس کی [illegible] طویل بحر والے قطعات کا تجزیہ کرکے [illegible] مختصر نظموں کے۔ [illegible] ہے ——— میری رائے میں [illegible] قطعے کو [illegible] کوئی آسان کام نہیں۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ [illegible] قطعہ بن سکتی ہے مگر ان کا یہ خیال غلط ہے کیونکہ قطعے میں [illegible] اس کے [illegible] ہیں۔ اسی طرح رباعی [illegible] کہ اس کو قطعہ کہہ دینا بھی بے معنی بات ہے۔ قطعہ چار مصرعوں میں بھی [illegible] جا سکتا ہے مگر قطعے کی فطرت یہ چاہتی ہے کہ اس کا دامن رباعی سے وسیع ہو تاکہ بات [illegible] سے کھل کر کہی جا سکے۔

قطعے کی دوسری سرحد اس سے بھی زیادہ صبر آزما ہے یعنی اگر تعدادِ اشعار میں [illegible] پیدا ہو جائے (یعنی شعر زیادہ ہو جائیں) تو مضمون پھیکا ہو جاتا ہے۔ ——— حالی ان صبر آزما مراحل میں کہیں کامیاب ہوئے ہیں، اور کہیں پاؤں سنبھال نہیں سکے مگر ان حالات میں شاید کوئی اور بھی سنبھل نہ سکتا۔

مختصر یہ ہے کہ حالی روایتوں کے شناسا تھے اس لیے انہوں نے قطعے کی بنیادی شرائط سے اطلاع کا عملی ثبوت بہم پہنچایا ہے اور قطعے کی تکنیک کا خاص خیال رکھا ہے اور اس نقاد شاعر سے یہی توقع تھی۔

ان سب باتوں کے باوجود حالی کے قطعات میں کچھ کمزوریاں بھی ہیں جن کا تعلق ان کے علم اور شعور سے نہیں ان کی [illegible] طبیعت سے ہے۔ حالی کا یہ طبعی خاصہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں بات کو پھیلا کر بیان کرنا چاہیں وہاں ایک طرح کی بے ڈھنگی پیدا ہو جاتی ہے ——— مثلاً اگر

نمک پیدا ہوا بھی سے نہ پھیکا پھیکا ــــــ

ان کہیاں میں سپاٹ پن ست ہے اور کاوشِ معنی کی بھی ہوتی تاہم ان کے سب قطعات میں موجود نہیں۔ صاف زبان میں صاف صاف بات کہنے کی صورتیں رہ جاتی ہیں۔ بعض قطعے تو خود ان کے اپنے ہی قول کے مطابق ناقص ہیں۔ نمک ہی اور ان کے اس قطعے میں جو جبر کے عدم مناسبت کے سبب ایسا اثر کم چھوڑتے ہیں۔

قطعاتِ حالی کی ایک اور کمزوری یہ ہے کہ ان کا منطقی طرزِ خطاب زیادہ صاف کہہ ہے۔ قطعہ اپنی نوعیت میں یہ چاہتی ہے کہ نام گفتگو کا نمونہ شاعر کی زبان سے ادا ہو مگر کہ بیان اندر سے خود بخود اپنا نقش مرتسم کرتا جائے مگر حالی اکثر ایسی مثالوں سے سمجھا دیا مسائل سمجھا دیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس خلاف دلی بیان سے قطعے میں وہ بات نہیں پیدا ہو سکی جو بیان میں مضمر ہو کر اپنی تہ میں تاثیر رکھتی ہے۔

ایک دوسرا سبب یہ کہ حالی اپنی عام عادت کے مطابق بیان میں اختصار کی جگہ بسط و وضاحت پسند کرتے ہیں۔ مثالیں ہے ہی تقاضا عادت کے زیر اثر انہوں نے چھوٹے قطعوں سے اکثر دامن بچایا ہے اور لمبے مکالموں یا حکایتوں کا سہارا ڈھونڈا ہے جو طویل بیان کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قطعے میں واقعے کا ہونا پسندیدہ ہے مگر قطعے کی حکایت اور عام حکایت میں شاذ فرق ہے۔ مثلاً عام حکایات میں اختصار ضروری نہیں سمجھا جاتا مگر قطعے کی حکایت میں اختصار بنیادی چیز ہے۔ الا یہ کہ حکایتوں کے زمانے کے قطعات کی طرح قطعے کو تاریخی واقعہ نگاری کا وسیلہ بنانا مقصود ہو۔ جو ان قطعے میں واقعہ نگاری مقصود نہیں تو قطعہ اپنی خصوصیات کھو دیتا ہے۔ مستوی کے حکایتی قطعات پڑھ کر ایسا محسوس ہوگا کہ ان میں واقعہ نگاری کی طرف مائل ہونا ہے۔ ان کے یہاں واقعہ محض ان کا بہانہ ہے۔ بہر حال حکایت میں واقعے پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا اور واقعہ مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ صرف واقعے کی رمز کا انکشاف مقصود ہوتا ہے اور یہی سعی سے کیا ہے۔

حالی کے یہاں طولِ بیان و تفصیلات کا میلان کچھ زیادہ پایا جاتا ہے۔ اگرچہ وہ بھی واقعات سے کسی حقیقت ہی کا انکشاف کرتے ہیں مثلاً قطعہ (چیونٹیوں کا بڑا بن جانا) قطعہ (سبب ترقیِ پسماندہ نارہ کی تضحیک) قطعہ (رہی گر کے بیک مالی کی توقع رکھنی) قطعہ (مزدوروں پر سخت گیری کرنے کا انجام) قطعہ (ماشہ دوکان کا ساتھ) وغیرہ وغیرہ ــــ ان میں سے اکثر میں حالی نے زندگی یا کسی اخلاقی حقیقت ہی کا انکشاف کیا ہے مگر ان میں سے بعض قطعات بے ڈھنگے ہو گئے ہیں مثلاً قوم کی پاسداری اور چشمہ بازی کا انجام بہت اچھی حکایتیں ہو سکتی تھیں مگر ان میں آخر تک پہنچتے پہنچتے حکایت کا زور کم ہو گیا ہے یوں ان نظموں کا ڈھانچہ قطعاتی ہی ہے لیکن بیان کا زور کم ہے اور آخر میں تو عبارت کی لہر بہت کمزور پڑ جاتی ہے۔

حالی کے زوردار قطعے وہ ہیں جن کے آخر میں تضمین ہے۔ ایسے قطعے جیسی موزوں تضمین کے اردگرد بُنے گئے ہیں۔ ہر ایک قطعہ آخری شعر کی تضمین کی طرف بڑھتا گیا ہے اور آخر میں مصرعِ تضمین پر پہنچ کر اثر کی انتہا ہو جاتی ہے مثلاً مشاعرہ کی طرح پر غزل نہ لکھنے کا عذر ــ کر پڑھیے۔ اس قطعے میں ایک وحدت یا تدریج ہے جس کے دو تین باقی اشعار پیچھے گئے ہیں اور قطعے کی تفصیل یا اثر کو کمزور کرنے کی بجائے اثر میں اضافہ کر رہی ہے۔ چیونٹیوں کا پر بن جانا بھی ایک تضمینی قطعہ ہے۔ اس میں واقعہ بھی دلچسپ ہے اور بیان بھی اور تضمین نے تو خاص زور پیدا کر دیا ہے۔

میں کہہ آیا ہوں کہ قطعے میں دو چیزیں آ جاتی ہیں۔ ایک چیز تو ہے کسی حقیقت کا اظہار۔ یہ واقعہ و مکالمہ کی صورت میں ہو تو بہتر ہے اور دوسری اس کا برجستہ اندازِ بیان جس میں طنز کی نیت یعنی تاثیر کوٹ کوٹ کر بھری ہو۔ حالی بیانِ حقیقت اور واقعہ و مکالمہ کی حد تک تو ٹھیک

[illegible] حالی [illegible] قطعات [illegible] کے تحت [illegible] ہے۔
[illegible] قطعہ [illegible] دیجیے ؎

[illegible] / [illegible]
[illegible] / [illegible]
[illegible] / [illegible]

یہ قطعہ کتنا سپاٹ، کتنا خشک، کتنا بے نمک ہے۔ ہر قطعے کے آخری مصرعے میں [illegible] [illegible] حالی [illegible] قطعے [illegible] اس قسم کا ایک [illegible] قطعہ [illegible] ؎

[illegible] / اپنے [illegible]
[illegible] / [illegible]

اس قطعے میں ایک [illegible] ہی ہوتی ہے مگر [illegible] اس سبب کہ بات سپاٹ [illegible] سپاٹ انداز بیان اطلاع یا علم کی حد تک [illegible] ہے [illegible] لکھے گئے [illegible] حالی نے ظرافت کی جن اقسام سے کام لیا ہے مثلاً تضاد یا حقیقت [illegible] تضاد PARADOX سے یا ترکیب [illegible] سے یا لفظی الٹ پھیر سے یا [illegible] سے یا تمثیل سے وغیرہ وغیرہ — یہاں تک کہ اکبر [illegible] WIT سے بھی کام لیا ہے۔ اگرچہ انھوں نے یہ انداز بہت کم اختیار کیا ہے اور یہ اچھا ہی کیا ہے کیونکہ [illegible] دراصل حالی اس میدان کے مرد نہ تھے یہ میدان اکبر ہی کے اشہب قلم کے لیے مخصوص تھا۔ حالی نے اکبر کے رنگ میں جو قطعہ کہا ہے وہ درج ذیل ہے ؎

جب تک نہ شاہزادہ اٹھارہ سال کا ہو / تخت پدر پہ اس کو ممنوع ہے بٹھانا
قانون ہے بنایا یہ ان مقننوں نے / عالم میں آج کل جو مانے ہوئے ہیں دانا
لیکن کریں نہ اس کی قبل از بلوغ شادی / کہتے ہیں وہ عبث ہے قانون یہ بنانا
نزدیک ان کے گویا عقل و دانش / ہے گندم سے آساں میڈر کو بس میں لانا

اس قطعے کے آخری مصرعے میں لفظی مزاح موجود ہے مگر اکبر کے اسی قسم کے قطعات کو اس کے برابر رکھ کر دیکھیے تو فرق خود بخود واضح ہو جائے گا۔

سطور بالا میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ میں حالی کے قطعات پر خواہ مخواہ اعتراض کر رہا ہوں۔

میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حالی کے قطعات بیانیہ حیثیت کا اثر زیادہ ہے جس کی وجہ سے ان میں ساختی ڈھیل پیدا ہو گئی ہے اور وہ ایسے کے پسیپے جیسے جسم میں معنی اور ذات جان نہیں ڈال سکے ورنہ یہ امر واقعہ ہے کہ شروع میں حالی نے قطعہ نگاری کا ایک بلند معیار قائم کیا ہے ـــــ اور قطعے کی اس روایت کو زندہ کیا ہے جس کا سلسلہ سعدی سے جا ملتا ہے۔ انہوں نے قطعات کی صورت اشعار کے ساتھ میں اپنے وقت کو رچا لیا ہے اور اگر غور کیا جائے تو قطعے میں صورتِ اشعار کی جو آزادی ہے اس کے پیش نظر صورت اشعار موضوع و مضمون کی نوعیت کے مطابق … زور کی بہائی ہی سے متعین ہو سکتی ہے۔ اس لیے کسی خاص وزن کی ضرورت نہیں۔

حالی کے دیوان میں کچھ ایسے قطعے بھی ہیں جو موزوں غزل سے کچھ زیادہ ہی لمبے ہیں اور دیوان میں بھی ان کو قصائد ہی کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ یہ قطعات بعض واقعات تاریخی یا موضوعات وقتی کے ساتھ وابستہ ہیں اور بعض کا رنگ مذہبی ہے۔ ان سب میں مضمون کا تسلسل پایا جاتا ہے مگر یہ نثری قسم کی نظمیں ہیں ان میں ایک آدھ کے سوا کسی میں کوئی خاص بات نہیں پائی جاتی۔ ان کے اصل اور معیاری قطعات وہی ہیں جن کے ذکر میں کہہ آیا ہوں کہ حالی نے غور کر جہاں بھی سمیٹنے کی کوشش کی ہے وہاں ہی ان کے بیان ایجاز سے اعجاز پیدا کیا ہے مثلاً حالی کی رباعیات اور غزل دونوں میں اختصار کی ضرورت نے جمالِ حسن پیدا کیا ہے۔ حالی کی بعض رباعیوں میں بھی قطعات کا رنگ پایا جاتا ہے اور ادا کی شوخی و برجستگی اور آخری مصرع کے زور نے ان میں بھی بڑی قوت پیدا کر دی ہے۔

ماحصل کلام یہ ہے کہ حالی کی رباعیات ان کے قطعات سے زیادہ مؤثر ہیں مگر قطعہ نگاری میں بھی وہ صرف شاعر ثابت ہوئے ہیں ـــــ ان کے قطعات واعظ و حکما کی بنیاد پر کھڑے ہیں اور ان میں ظرافت کا لطیف رنگ بھی پایا جاتا ہے مگر ان کے لہجے میں جو عمومی طور پر ملامت پائی جاتی ہے اس لیے طویل بیان کے بعد ملائم طنزیہ بیان نرم پڑ جاتا ہے۔ جہاں ایسا نہیں ہوا اور طنزیہ بیان میں چبھن ہے (مثلاً "دلی کی شاعری کا تنزل" میں) وہاں قطعہ خوب چست بیٹھا ہے۔

بہرحال حالی کے قطعات ان مختصر نظموں کے پیش رو ہیں جن کی حسین تر شکل شبلی، اقبال، اکبر اور ظفر علی خان کی واقعاتی اور تاریخی نظموں میں ملتی ہے جو یقیناً حالی کے قطعات (اور دوسری نظموں) سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہوں گی۔

اردو ادب اور تحقیق

مظفر علی سید

نقاد اور محقق ہمارے زمانے کے بدنام ترین لوگ ہیں۔ نقاد یا لفظ تو جیسے کے طور پر عام آدمی کے لیے استعمال کی صورت میں کچھ نہ نقاد کہتا ہوں نہ محقق، حق بجانب دونوں کو کہا جاتا ہے۔ ہمارے معمولی نوعمروں سے لے کر سلسلے وار پڑھنے والوں تک کے لیے یہ دونوں لفظ محبوبیت کی ایک ایسی فضا کے تنے ہیں کہ ان سے نفرت زیادہ ہوتی ہے اور خوف کم محسوس ہوتا ہے۔

ہمارا زمانہ تقسیم کار کا زمانہ ہے۔ ایک صاحب میں وہ بات کہنے کے ماہر ہیں ... طرف اگر آپ ... کا جائزہ لینا ہے تو کسی ماہر خصوصی سے رجوع کرنا پڑے گا۔ صنعت و حرفت میں یہ تقسیم کار کے ... ادب میں بھی اس طرح داخل ہو گئی ہے کہ ایک خواہ ... ہوتا تو ... آتا ہے ایک شاعر کا غلط ہونا سمجھ میں نہیں آتا۔

محمد حسین آزاد نے آب حیات لکھی تو اس بات پر غور کرنا پسند نہ کیا کہ یہ تنقید کی کتاب ہوگی یا تحقیق کا ... مرقع۔ بعد کے لوگ اس الجھن میں پڑ گئے کہ یہ کیا ہے۔ کسی نے کہا تذکرہ نما مرقع ہے کسی نے کہا تنقید کی کتاب ہے ... یہ بھی ماننا شروع کر دیا ہے کہ اپنے وقت کا بہت بڑا تحقیقی کارنامہ بھی ہے۔ آزاد نے ایک موضوع انتخاب کیا ... کے لیے ... ہو گیا۔ ذہانت، ذوقِ ادب اور تحمل سب کی ضرورت تھی اور چونکہ ان میں سے کوئی چیز ان پر حرام نہ ہوئی تھی انھوں نے سب کو ملا جلا کر ایک ایسی تحریر ہمارے سامنے پیش کی کہ اردو کا ایک عام پڑھنے والا اسے مزے لے لے کر پڑھتا ہے اور ایک شکی مزاج عالم اس میں نت نئی باتیں دریافت کرتا رہتا ہے۔

غالب نے آتش کے بارے میں کہا ہے کہ اچھے شاعر تھے مگر یک فنی تھے۔ اس بلیغ فقرے میں ایک جہان معنی مضمر ہے۔ آتش اردو کے ان چند شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے غزل کے سوا کچھ نہ کہا اور اس کے باوجود غزل میں کسی نئے انداز یا اسلوب کے حامل نہ ہو سکے۔ جو ادیب یا شاعر اپنے آپ کو ایک ہی صنفِ کلام تک محدود کر لیتا ہے وہ اس میں بھی کوئی مجتہدانہ شان پیدا نہیں کر سکتا۔ ہمارا زمانہ اس کے برعکس سوچتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سوچتا نہیں کہتا ہے۔ فلاں صاحب غزل بہت اچھی کہتے ہیں، فلاں رباعی کے استاد ہیں، فلاں نے قطعات اچھے کہے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس۔ یہ بات بہت کم لوگ سمجھتے ہیں یا سمجھنا چاہتے ہیں کہ مختلف اصنافِ کلام، لفظوں کی مختلف ترتیب پیش کرتے ہیں اور ان میں سے کوئی ترتیب ایسی نہیں کہ ایک پر حرام ہو اور دوسرے پر حلال۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی کا ذہن ہی ایسا ہو کہ ایک خاص ترتیبِ الفاظ سے باہر نہ نکل سکے مگر یہ کہ سب ذہن ایک سے ہو جائیں یا ایک ایسی

خواہش ہے جو ہماری جمہوریت بھی پیدا نہیں کر سکتی۔

ہمارے بہت سے ادیب جو خود کو تحقیق نگار کہتے ہیں، اکثر اوقات نقادوں سے گلہ کرتے ہیں۔ اس شکوے شکایت کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اگر اُن کا نام کسی لمبی فہرست میں آ جائے تو خوش ہو جاتے ہیں۔ مگر بعض حالات میں رُکے۔ حدود سے بڑھ کر اس صنف کو اہم سمجھتے ہیں جسے تنقید کہا جاتا ہے۔ یہ بات اب عام طور سے مان لی جاتی ہے کہ تنقید ایک اہم صنفِ ادب ہے اور اس کے لکھنے والے بھی زیادہ حقارت کے مستحق نہیں۔ نقاد لوگ اس حقارت کا استعمال اپنے تخلیقی ہم عصروں سے بدلے کی خاطر ایک دور میں کرتے رہے ہیں جو بیت جانے پر وہ طعنہ جو محققین کرام کے نام نامی سے موسوم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تنقید عصر ہے تو تحقیق حقیر تر۔ نقاد تو پھر بھی زندہ ادیبوں کے کسی کام آتے ہیں یا آ سکتے ہیں، یہ محقق لوگ تو گزرے ہوئے اکا دُکا رجحانوں اور ان کتابوں یا مصنفوں پر اپنی توجہ صرف کرتے ہیں جن کو کوئی نہیں جانتا اور کوئی نہیں جاننا چاہتا۔

تخلیق، تنقید اور تحقیق ہماری زبان میں باہم دست و گریباں ہیں۔ اگرچہ اس جنگ و جدل کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں انگریزی زبان کے چند ایک محقق حضرات نے سترھویں صدی کے شاعروں پر توجہ کی۔ ان کا کلام نئے سرے سے مرتب کیا، اس پر حواشی اور دیباچے لکھے جس میں اس دور کی شاعری کے پس منظر میں ان شاعروں نے جو کوشش کی تھی اُسے واضح کیا۔ یہ کلام ان کے ذریعے سب سے نوجوانوں میں رائج ہوا اور وہ نوجوان جو نئے زمانے میں نئی قسم کی شاعری کرنا چاہتے تھے اُن کو اس پرانی شاعری میں کئی ایک ایسی چیزیں نظر آئیں جو انگریزی ادب میں فراموش کر دی گئی تھیں اور جن کو ایک نیا موڑ دیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ ان محقق حضرات کے ذریعے انگریزی شاعری کا ایک پورا دور پہلی مرتبہ سامنے آیا۔ اس نے شاعری کے ایک نئے دور کو جنم دیا اور اس طرح روایت کا تجربے سے رشتہ بندھا۔

تجربہ اور روایت کی بحث ہمارے دور کی معمولی بحثوں میں سے ہے اور ہم اپنے نقادوں کو اس بحث کی دونوں اطراف میں بڑی آسانی سے تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے ادب ہمیشہ روایت ہے۔ دوسرا کہتا ہے ہر چیز ہمیشہ نیا تجربہ ہے۔ ایک کہتا ہے کہ حال، ماضی کی کوکھ سے پیدا ہوتا ہے اور چاہے نہ چاہے اُسے پیدا ہونا ہی پڑتا ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو خود جنم دیتے ہیں۔ تخلیقی ادب کا ماضی سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ ایک گروہ غالب کا یہ شعر پڑھتے سنتا ہے ؎

برزہ شناساں ز پئے جادہ شناساں بردار
اے کہ در راہِ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت

اور دوسرا یہ شعر ؎

تو اے کہ محوِ سخن گسترانِ پیشینی — مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست

دونوں گروہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ یہ شعر ایک ہی آدمی نے کہے تھے اور محقق حضرات خصوصاً اس بات پر توجہ نہیں کرتے کہ غالب نے پہلا شعر کب کہا اور دوسرا کب۔ وہ اس بات کو جان سکتے تھے کہ پہلا شعر اس نے اس وقت کہا جب وہ اپنے لکھے ہوئے کو ماضی کی شاہراہ سے مربوط کرنا چاہتا تھا اور دوسرا شعر اس وقت کہا تھا جب اس کا واسطہ ماضی پرستوں سے پڑا تھا جو باندھی ہوئی لیک پہ چلنے پر فخر کرتے تھے اور جو بھی کوئی نیا راستہ نکالنا چاہتا تھا اس کو گمراہ سمجھتے تھے۔

[illegible] کے بارے میں کہا ہے کہ [illegible] شاعری [illegible] کی بنا پر [illegible] حاصل کرتے رہتے ہیں [illegible] کی دولت سے زیادہ طباعت و اشاعت کے [illegible] ہیں جو سرکاری اداروں کے ذریعے [illegible] کی کوشش ہی کرتے ہیں۔

آزادی کے فوراً بعد یہ محسوس کیا جانا چاہیے تھا کہ جن [illegible] ورثے کو محفوظ اور شائع کرنے کے لیے کوئی [illegible] زبان کے بیشتر [illegible] علمی نسخوں کی صورت میں [illegible] ہندوستان کے کتب خانوں میں رہ گئے تھے یا ناقدری کی بنا پر [illegible] جن کا رواج [illegible] پٹنہ، لکھنؤ، علی گڑھ، رامپور، دہلی اور حیدرآباد [illegible] ان کی طرف بھی توجہ کی ضرورت تھی [illegible] لندن، پیرس [illegible] کے عجائب گھروں اور کتب خانوں میں بے شمار قدیم تحریریں محفوظ تھیں۔ بقول اقبال ؎

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

ہماری وزارت تعلیم اور یونیورسٹیاں اس قومی امانت کو واپس لینے یا اس کی عکسی نقلیں حاصل کرنے کے لیے بہت کچھ کر سکتی تھیں اس کام کی اہمیت کا احساس ہی نہ کیا گیا۔ نتیجہ یہ کہ اہل علم کے دل سیپارہ ہوتے رہے اور علم ہماری دسترس سے دور ہوتا گیا۔

ہماری نت نئی حکومتوں کو یہ الزام تو دیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے انڈیا آفس لائبریری کی تقسیم کے لیے کچھ نہ کیا مگر مختلف ادارے جو سرکاری امداد سے وجود میں آئے اس کی کسی حد تک تلافی کر سکتے تھے اگر یہ اہل علم، اس کام کے بارے میں صحیح نقطۂ نظر اور دیانت سے کام لیتے۔ ان کے مقابلے میں تو تجارتی اداروں نے بھی بہتر کام کرنے کی کوشش کی ہے۔ امداد یافتہ اداروں نے آج تک اردو کی کوئی ایسی پرانی کتاب شائع نہیں کی جو پہلے اس سے بہتر حالت میں نہ چھپ چکی ہو۔ فغان دہلی، دیوان شیفتہ اور حیات جاوید ایک ادارے نے شائع کیں اور یہ تینوں کتابیں [illegible] ایڈیشنوں کی نقل ہیں، کتابت کی بے شمار غلطیوں کے اضافے کے ساتھ۔ نہ ان کتابوں کو نئے انداز سے مرتب کیا گیا نہ ان میں نیا مسالہ شامل ہو سکا۔ یہاں تک کہ ان کی ظاہری صورت بھی پہلے سے بہتر نہ بن سکی۔ معلوم نہیں اس انداز کے کام کے لیے سرکاری امداد کی کیا ضرورت تھی۔ بلکہ اس سے بہتر کام تو بغیر امداد کے بھی ہوتے رہتے ہیں۔ یہی عالم کراچی کے ایک امدادی ادارے کا ہے جس نے بیش قرار امداد پانے کے بعد صرف 'باغ و بہار' کا ایک ایڈیشن شائع کیا اور وہ بھی ایک برطانوی ایڈیشن کی نقل۔ پاکستان کی کسی یونیورسٹی نے اردو ادب سے متعلق کوئی کتاب شائع نہ کی۔ حالانکہ آزادی سے پہلے پنجاب یونیورسٹی کبھی کبھار ایسی غلطی کر دیا کرتی تھی۔

بزم اقبال، اقبال اکیڈیمی، مجلس ترقی ادب، ادارہ ثقافت اسلامیہ، اکادمی، اردو ٹرسٹ، اور انجمن ترقی اردو کی جدید مطبوعات میں اول تو صرف دس پانچ کتابیں ایسی نکلیں گی جو اردو ادب سے متعلق ہوں۔ پھر کئی برسوں کی امداد کے بعد بھی ہنوز روز اول کا سا معاملہ ہے۔ ہمارا قومی ورثہ بدستور کیڑے مکوڑوں کی خوراک بن رہا ہے یا ان عجائب گھروں اور کتب خانوں کی زینت ہے جو ہماری دسترس سے باہر ہیں

ان اداروں کے مقابلے میں ہندوستان کے افراد، تجارتی فرموں اور چھوٹے چھوٹے اداروں کا کام دیکھیں تو غیرت سے آنکھیں جھک جاتی ہیں۔ بنگالی مسلمان تو اداروں کے بغیر ہی ایسا کام کر گزریں اور ہم اداروں کے باوجود کچھ نہ کر سکیں، اس سے شرمناک بات کیا ہوگی۔

قومی ورثے کو محفوظ کرنے والے ذخیرۂ کتب کے اجارہ حاصل کرنا اداروں کا کام، دیگر میں ملتا، شاید اس سے بہتر کام ہمارے اداروں کے بس میں نہیں تھا۔ ایک صدی پہلے ایک ہندو تاجر نے تاجرانہ مصلحتوں سے کام لے کر اس قومی ورثے کو چھاپنے کے بیڑے کا ارادہ کیا اور یوں نولکشور پریس وجود میں آیا۔ اس اکیلے آدمی نے اپنے تنخواہ دار ملازموں کی مدد سے وہ کام کیا کہ ہمارے امداد یافتہ ادارے اہل علم کی امداد سے بھی شاید ایک صدی تک نہ کر سکیں۔ منشی نولکشور تو خیر ایک لاجواب شخصیت تھے۔ ہمارے ادارے تو نظامی پریس بدایوں تک کا مقابلہ نہیں کر سکے جس نے اردو ادب کی کئی ایک کتابیں دیدہ زیب انداز میں چھاپ کے انھیں رواج دیا۔ اس ادارے کی پشت پر بھی اس زمانے کے دو ایک اہل علم تھے جو نام و نمود اور بیش قرار معاوضوں کی بجائے علمی کام میں دلچسپی رکھتے تھے۔

یہاں یہ سوال کرنا بالکل ٹھیک ہوگا کہ آخر اس قومی ورثے میں ایسے کیا لعل جڑے ہیں کہ اسے محفوظ کیا جائے یا زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچایا جائے۔ کیا ہم عصر اور جدید ادب کافی نہیں ہوتا؟ کیا اس کام پر ضرورت سے زیادہ توجہ دینے سے مردہ پرستی کا رجحان پیدا نہیں ہوگا؟ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ماضی سے بے تعلقی ماضی پرستی کو جنم دیتی ہے، ہم اپنے قومی ورثے سے جتنی گہری واقفیت پیدا کریں گے اتنی قدر نئے کام کی طرف مائل ہوں گے۔ ہمارے دور میں بدترین قسم کی مردہ پرستی کا رواج ہے اور اس کا اصل باعث یہ ہے کہ ہم اپنے ماضی کے کارناموں اور شخصیتوں سے اچھی طرح واقفیت نہیں رکھتے۔ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ ان میں کون واقعی قابل احترام ہے اور کیوں! جب ہم یہ جان لیں گے تو عزت و احترام کی بنیادیں بھی مضبوط ہو جائیں گی۔ اور ہمارا معیار نظر بھی بلند ہوگا۔

ہمارے تخلیقی فن کار اس قسم کے کام پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور اس حد تک وہ بالکل درست ہیں کہ جس انداز میں یہ کام ہمارے یہاں ہوتا ہے اس سے نہ ہونا ہی بہتر ہے مگر اس صورت حال سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ ماضی کا تمام ورثہ دریا برد کر دینا چاہیے۔ یہ غلط فہمی بھی عام طور پر پائی جاتی ہے کہ تخلیقی فن کار کو ایسے کاموں سے دور رہنا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم اگر سچا ہے تو تخلیق کے لیے زہر کا حکم نہیں رکھتا، اکسیر کا کام دیتا ہے۔ شبلی، حالی اور آزاد کی تخلیقی صلاحیتوں نے علم و فضل کی دولت سے جلا پائی تھی اور آج بھی یوں ہی ممکن ہے۔ اس سے ذرا چھوٹے پیمانے پر حسرت موہانی کی شخصیت ہے۔ جنھوں نے ماضی کا ورثہ محفوظ کرنے کی انفرادی کوشش کی اور اس کوشش میں ان کی شاعری دبنے کی بجائے اور نمایاں ہوئی۔ "انتخاب سخن" کی گیارہ جلدوں میں اردو غزل کی روایت کا بہترین حصہ محفوظ ہو گیا ہے اور ان میں ایسا ذخیرہ بہت سا ہے کہ حسرت موہانی اس طرف توجہ نہ کرتے تو اب تک تلف ہو چکا ہوتا۔ تیس ایک سال پہلے کئے گئے اس کام پر ہمارا زمانہ اب تک کوئی خاص اضافہ نہ کر سکا۔ شاہ حاتم، قائم، مصحفی، جرأت وغیرہ سے ہماری جو واقفیت ہے۔ آب حیات کے بعد حسرت موہانی ہی کے ذریعے پیدا ہوئی ہے۔ ہمارے زمانے نے ان ناموں کی قدر کرنا تو سیکھ لیا مگر اس قدر دانی کا جو حق تھا اسے ادا نہ کیا۔

حسرت موہانی مرحوم کا یہ کام بہ حیثیت تحقیقی کام تو نہیں کہا جا سکتا مگر اُس قسم کے شاعروں کی فخریہ جہالت کے مقابلے میں یہ کام بھی علمی ہی کہلائے گا۔ تحقیقی کام اسے اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ ترتیب و تدوین کے جدید علمی اصول یہاں استعمال نہیں کئے گئے۔ یہ جدید علمی اصول یورپ کی درسگاہوں اور کتب خانوں میں متعین کئے گئے۔ ان میں سے بعض ہماری کلاسیکی زبانوں کے علماء کی نظروں سے بھی اوجھل

میں ہے مگر اس کے علاوہ بھی تحقیقی کام یورپ کے علماء نے ہی شروع کیا۔ سب سے پہلے شاعروں کے [illegible] ہوئے جن میں ڈاکٹر گلکرسٹ نے اردو [illegible] کا کام کیا۔ اسی طرح [illegible] ضرورت بھی محسوس کی۔ [illegible] انگریزی لکھنے میں [illegible] مقبول ہوئے [illegible] بنگال کی طرف سے شائع ہوئے۔ اگرچہ [illegible] گارساں دتاسی کی اہمیت کا ذکر یہاں نہیں کیا جا سکتا ہے۔ [illegible] سب سے پہلے یہ فن تحقیق کے امام کی حیثیت کا مالک ہے۔ [illegible] فرانسیسی علماء میں [illegible] کے انتقالات کئے [illegible] اردو ادب کی تاریخ [illegible] مشرقی علوم [illegible] قومی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے کارناموں کا اس ملک میں صحیح اندازہ نہیں کیا گیا۔ اس کی "تاریخ ادبیات ہندوستانی" اگرچہ [illegible] اردو میں ترجمہ نہیں [illegible] مگر یہ بات بھی جانتے ہیں کہ جزوی غلطیوں اور تسامحات کے باوجود اردو کے ادیبوں شاعروں کی اس سے معتبر [illegible] ڈکشنری [illegible] نہیں۔ اس کے خطبات اردو میں چھپ کر اپنی علمی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی اس نے اردو ادب پر بہت سا کام کیا۔ فرانسیسی زبان میں کئی ایک اردو تحریروں کے ترجمے کئے اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ کہ اردو شاعری کے چند ایک [illegible] علمی اصولوں کی بنیاد پر مرتب کئے۔ چند ایک تصانیف کے علاوہ اس سلسلے میں اس کا سب سے بڑا معرکہ کلیات ولی کی ترتیب و تدوین تھا۔ جس سے ہمارے یہاں پورا فائدہ اٹھایا نہیں گیا۔ اس کے طویل دیباچے سے جو اب تک اردو میں ترجمہ نہیں ہوا۔

دتاسی کے علاوہ دوسرا بڑا نام ڈنکن فاربس کا ہے جس نے ایک عمدہ ہندوستانی انگریزی لغت کے علاوہ "باغ و بہار" کا بہترین ایڈیشن بھی نئے سرے سے مرتب کر کے شائع کیا جس کی اہمیت کا یہاں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اب تک علماء اس کی نقل کئے چلے جاتے ہیں۔ افسوس کہ دتاسی اور فوربس کی طرح کے لوگ یورپ میں پیدا ہونے بند ہو گئے ورنہ یہ کام اس سے بہت آگے جا سکتا تھا۔ مشرقیات سے دلچسپی رکھنے والے یورپی علماء نے عربی، فارسی اور ترکی پر اپنی توجہ مرکوز کر دی اور اردو زبان کی وسعت اور معنویت کو فراموش کر دیا۔ ای۔ جی۔ براؤن، نکلسن، ریوزن، اور ان کے بعد آربری نے اردو ادب کو کوئی خاص اہمیت نہ دی اور ان کے پڑھائے ہوئے ہندوستانی علماء نے بھی ان کی طرح فارسی عربی ادب پر ہی توجہ دینا پسند کی۔ مولوی محمد شفیع، پروفیسر اقبال مرحوم اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے خود اردو ادب پر کوئی خاص کام کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

جدید علمی بنیادوں پر اردو ادب کی دنیا میں تحقیق و تفتیش کا کام ہمارے علماء نے بڑی دیر میں شروع کیا اور اس کی سربراہی ایک پرانی قسم کے عالم نے کی۔ مشہور شاعر اختر شیرانی کے والد حافظ محمود شیرانی مرحوم مستشرقین کے شاگرد نہ تھے مگر برٹش میوزیم کی ملازمت کے دوران میں جدید علمی اصولوں سے انھوں نے ضرور آگاہی پیدا کی ہو گی۔ "پنجاب میں اردو" اور "تنقید شعر العجم" ان کے مشہور کارنامے کہے جاتے ہیں۔ دوسری کتاب فارسی شاعروں پر نئی تحقیق پیش کرتی ہے مگر انہی کی ایک دوسری کتاب "فردوسی پر چار مقالے" کی طرح اردو میں لکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے پرتھوی راج راسو پر کچھ تاریخی کام کیا اور محمد حسین آزاد کی تحقیق میں غلطیاں نکالیں۔ یہ مقالات شیرانی میں قصہ چہار درویش اور میر جعفر زٹلی پر ان کے مضامین کا بھی اسی سلسلے میں تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کا مرغوب انداز تحقیق خوردہ گیری اور نکتہ چینی کا ہے۔ ان کی توجہ اس بات پر زیادہ مرکوز رہتی ہے کہ پچھلے لوگوں نے کیا کیا غلطیاں کیں اور کیا کیا حماقتیں ان سے سرزد ہوئیں۔ ان کا علم و فضل اس قابل تھا کہ اس سے کوئی مثبت قسم کا کام لیا جاتا۔ "پنجاب میں اردو" اس قسم کا ایک کام تھا اور قدرت اللہ قاسم کا تذکرہ

"مجموعہ نغز" بھی جو انھوں نے ایڈٹ کرکے پنجاب یونیورسٹی سے شائع کیا۔ پنجاب میں ان کا طریق تمام ان شاگردوں کے حلقے پر ان کا اثر اس بات کا متقاضی تھا کہ اردو ادب میں تحقیق کا ایک نیا دور شروع ہوتا مگر ان کی ذات سے خود دگیری اور تفاصیل پرستی کے رجحانات نے بعد ترجمانی اور تحقیقی کام میں مذہبی مناظرے کا سا انداز پیدا ہوا۔ ندوہ اور علیگڑھ سے ان کی لڑائیاں ساری عمر چلتی رہیں اور بہت سا وقت اور کاغذ ان پر برباد ہوا۔ انجمن ترقی اردو نے بھی جو ان کی مربی اور ہمنوا تھی۔ ان سے کوئی اچھا کام نہ لیا۔ وہ اس طرح ایک خاص وقتی انتشار عام ذاتی اور گروہی مناقشوں کا شکار ہو کے رہ گیا۔ شیرانی مرحوم نہ پوری طرح پرانی قسم کے عالم تھے نہ پوری طرح نئی قسم کے وہ درختوں کے پتوں اور ان کے رگ ریشوں پہ بے حد توجہ کرتے تھے اور درخت کو بھول جاتے تھے۔

اسی زمانے میں انجمن ترقی اردو نے منشی نولکشور کے انداز پر مگر خالص علمی دعووں کے ساتھ قومی ورثے کو محفوظ کرنے کا پروگرام شروع کیا۔ ان دو اداروں میں کوئی فرق تھا تو یہ کہ منشی نولکشور کی توجہ قومی مرحلے کے تخلیقی حصے کو محفوظ کرنے پر مرکوز تھی اور انجمن نے اس کے علمی حصے کو اپنا مخصوص میدان بنایا۔ شاعروں کے دیوان، مثنویاں اور قصے کہانی کی کتابیں انجمن کے زیر اہتمام بھی طبع ہوئیں۔ مگر ان میں کوئی ایسی نہ تھی کہ بنیادی اہمیت کی مالک ہوتی یا کوئی بڑا کام سمجھی جاتی۔ زیادہ تر توجہ شعراء کے تذکروں پر کی گئی۔ مولوی عبدالحق معتمد انجمن نے بہت سے تذکرے مرتب کرکے انجمن کے زیر اہتمام طبع کرائے۔ میر، گردیزی اور قائم کے تذکرے، مصحفی کے تین تذکرے، مخزن شعرا، گلشن ہند اور چمنستان شعراء انھوں نے ایڈٹ کرکے چھاپے۔ اس کے علاوہ ذکر میر، سب رس، قطب مشتری، من لگن، دیوان تاباں، دیوان اثر، مثنوی خواب و خیال، باغ و بہار، آرائش محفل (افسوس) اور رانی کیتکی کی داستان بھی ان کے دیباچوں کے ساتھ طبع ہوئیں —
ترتیب و تدوین کے ساتھ ساتھ انھوں نے چند ایک مضامین بھی لکھے اور بیجاپور کے ملک الشعراء نصرتی پر ایک پوری کتاب تصنیف کی۔ ملک کے اہل علم نے ان کے ساتھ تعاون کیا اور انجمن کے لیے کتابیں مرتب اور تصنیف کیں۔ شیخ چاند مرحوم کی تصنیف "سودا"، احسن مارہروی اور ان کے بعد نورالحسن ہاشمی کی مرتبہ "کلیات ولی" مرزا فرحت اللہ بیگ کے مرتبہ "دیوان یقین" اور "دیوان نظیر" نواب حبیب الرحمن خاں شروانی کا مرتبہ "تذکرہ میر حسن" اور مسعود حسن رضوی کا مرتبہ "دیوان فائز" اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ آزادی کے بعد انجمن مہاجر ہوئی تو یہ کام جاری نہ رکھا جا سکا اور "دیوان فغاں" کے علاوہ کوئی نئی کتاب انجمن نے شائع نہ کی اور یہ دیوان بھی خود انجمن کے قائم کردہ معیار کو برقرار نہ رکھ سکا۔

ترجمہ اصطلاحات، انگریزی اردو لغت اور قواعد پر مولوی عبدالحق کے وقیع کام کا ان کتابوں میں اضافہ کیا جائے تو ایک بہت بڑی علمی شخصیت کی تصویر ابھرتی ہے مگر اس میں شک نہیں کہ انجمن کے وسائل بھی بہت وسیع تھے اور بہت سے اہل علم کا تعاون اُسے حاصل تھا۔ پھر بھی جدید علمی اصولوں پر مولوی عبدالحق کا انداز ترتیب اور ان کے دیباچے پورے نہیں اترتے۔ منشی نولکشور آنجہانی کی طرح اُن کا مقصد بھی قومی ورثے کو محفوظ کرنا تھا، اور اس محدود مقصد کو سامنے رکھا جائے تو ان کے کام کی اہمیت نمودار ہوتی ہے۔ آزادی کے بعد یہ کام جاری نہ رہ سکا تو اس کی بڑی وجہ مولوی صاحب کا بڑھاپا ہے۔ اگرچہ بعض دوسرے اہم کاموں میں وہ اب بھی جوانوں کی طرح مستعد ہیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ وہ اپنے طویل تجربے اور اختیار سے کام لے کر نوجوان محققوں کی ایک جماعت تیار کر دیتے مگر شیخ چاند مرحوم کے بعد کوئی ایسا نوجوان انجمن نے پیش نہ کیا۔

لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر مسعود حسن رضوی اپنے ذاتی کتب خانے اور انفرادی کام کے لیے معروف ہیں اور ایک متانت طبیعت

[illegible] ہے [illegible] تحقیقی مضامین بھی لکھے [illegible] [illegible] حالات بھی [illegible] [illegible] کوئی دلچسپی رکھتے نظر نہیں آتے [illegible] [illegible] اور [illegible] کی تحریر پیش کر دی [illegible] [illegible] ان کے مضامین [illegible] [illegible] [illegible] اور اس سے [illegible] [illegible] [illegible] کی ادبی [illegible] کا اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ حال ہی میں ان کی دو کتابیں "لکھنؤ کا شاہی اسٹیج" اور "لکھنؤ کا عوامی اسٹیج" شائع ہوئی ہیں جن سے اردو ڈرامے کی تاریخ پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ ان کے تحقیقی مزاج کا اندازہ ان کی تصنیف "آب حیات کا تنقیدی مطالعہ" سے بھی ہو سکتا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے صرف [illegible] اعتراضات کرنے والوں [illegible] کے جواب دیئے ہیں بلکہ آب حیات کے مصنف کو اردو تحقیق کی تاریخ میں پہلی مرتبہ وہ خراجِ تحسین ادا کیا ہے جو [illegible] سال سے فرض تھا۔ آب حیات [illegible] اردو زبان کی بہترین کتابوں میں سے نہیں بلکہ اس میں بڑی [illegible] سے بے شمار کتابوں کا [illegible] ہے۔ [illegible] اس کام کے حق میں صفیر بلگرامی، مولوی عبدالحی، [illegible]، فرحت اللہ بیگ، حافظ محمود شیرانی اور قاضی عبدالودود کے ہاتھوں ہوئی تھی اس کتاب نے بڑی حد تک اس کی تلافی کر دی۔

ایک اور قابلِ احترام شخصیت جو اردو ادب کی تحقیق سے وابستہ ہے مولوی امتیاز علی عرشی صاحب ہیں۔ وہ رضا لائبریری، رامپور کے مہتمم ہیں اور ان کے کام کی پشت پر والیِ ریاست کی علم دوستی اور ہندوستان پریس رامپور کی طباعت ہے۔ مگر انھوں نے اپنے بلند علمی معیار کی مدد سے ان ذرائع کو بہت اچھی طرح استعمال کیا ہے۔ شاہ عالم کی نادراتِ شاہی، انشاء اللہ خاں کی دونوں نثری کہانیاں اور مکاتیب غالب کے جو ایڈیشن انھوں نے شائع کیے ہیں وہ کئی لحاظ سے بے مثل ہیں۔ حال ہی میں انجمن ترقی اردو ہند کے لیے انھوں نے جو "دیوانِ غالب" مرتب کیا ہے اُسے بڑی آسانی سے دیوانِ غالب کا بہترین علمی ایڈیشن کہا جا سکتا ہے! احمد علی یکتا کے تذکرہ "دستور الفصاحت" کو انھوں نے جس طرح ایڈٹ کیا ہے۔ وہ ان کے تحقیقی مزاج اور انداز کی بہترین مثال ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ جو اردو شعرا کے تذکروں کی تاریخ ہے۔ اپنی جگہ ایک الگ تصنیف کا درجہ رکھتا ہے۔ جس طرح "مکاتیب غالب" کا دیباچہ غالب کی زندگی کا ایک عمدہ خاکہ بھی ہے۔ مسعود حسن رضوی کی طرح وہ تنقیدی نظر بھی رکھتے ہیں جو اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ کونسا کام ان کی محنت کا مستحق ہے۔ اس کے بعد وہ دقتِ نظر اور وسعتِ مطالعہ دونوں سے کام لیتے ہیں اور اپنی تحقیق کے نتائج سنجیدگی آمیز سادگی کے ساتھ

واضح کر دیتے ہیں اور اس لیے ان کی تحقیق بھی فنی مناقشوں سے بہت دور ہے۔ ان کے کام کی رفتار بہت زیادہ تیز نہیں ہے وحیدان کے کام کا اندازہ ہے مگر یہ حوالہ بیش بہا ہوتی ہے کہ وہ اردو کی ان ڈری کتابوں کو بھی نئے سرے سے مرتب کر دیں جو اب تک صرف ہیں جیسی کی حاشیہ نشینی مثلاً کلیات میر، کلیات سودا وغیرہ۔ اب تک ان کی توجہ زیادہ غالب پر مرکوز رہی ہے اور اس کام میں مولوی حیثیت رشید، علامہ رسول مہر، مالک رام اور مختار الدین احمد سے ان پر بہت اضافہ کیا ہے مگر افسوس ہے کہ اب ایسا کام نہیں کیا جس کو کوئی دوسرا آسانی سے انجام نہ دے سکے۔

ادبی تحقیق کے میدان میں ایک شخصیت ایسی بھی ہے جس کے ساتھ عزت سے زیادہ خوف کے جذبات وابستہ ہو گئے ہیں اور جو حافظ محمود شیرانی کے تحقیقی مزاج کو منطقی انتہا تک لے گئے ہیں۔ یہ ہیں قاضی عبدالودود جو ناقد اور محقق ہونے کے ایک بیرسٹر بھی ہیں اور ایک رسالہ "معاصر" نکالنے کے علاوہ بہت سے ادبی اور تحقیقی جرائد میں مضامین لکھتے ہیں۔ خوردہ گیری اور تفصیل پرستی کا جو رجحان شیرانی مرحوم کے یہاں نظر آتا ہے وہ قاضی صاحب کی ہر تحریر کی ہر سطر میں ملے گا۔ ان کا المیہ یہ ہے کہ ایک آدھ مختصر سی کتاب کے علاوہ ان کی کوئی تصنیف یا تالیف دیکھنے میں نہیں آتی۔ اردو زبان کا شاید ہی کوئی عالم اور محقق ایسا ہو جو ان کی زد سے بچا ہو۔ محمد حسین آزاد، نواب نصیر حسین خیال، شاد عظیم آبادی، گارسیں دتاسی اور مولوی عبدالحق یہ تو ان کے محبوب شکار ہیں۔ ان کے تحقیقی مزاج کا بہترین نمونہ ان کا مضمون "غالب بطور محقق" ہے جس میں انھوں نے غالب کو جاہل محض ثابت کرنے اور اسی وجہ سے رد کرنے پر اپنی پوری علمی طاقت صرف کر دی ہے اور سینکڑوں کتابوں، مضامین اور قلمی تحریروں کا حوالہ دیا ہے۔ انھوں نے زیادہ توجہ اس بات پر صرف کی کہ فارسی لغات نویسوں کے خلاف غالب کا جہاد کس پایے کا تھا۔ یہ سوچنا انھوں نے گوارا نہیں کیا کہ اس جہاد کا باعث کیا تھا اور یہ بھی کہ غالب کے خلاف جو پرچم انھوں نے بلند کیا ہے اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ ان کے اس طرح کے مضامین سے غالب کی شہرت کو تو کوئی فرق نہیں پڑا۔ البتہ ان کا اپنا اور چند ایک نوجوان محققین کا مزاج اس سے مزید بگڑ گیا ہے۔ اس میں قطعاً کوئی شک نہیں کہ اردو زبان کو قاضی صاحب جیسا وسیع المطالعہ عالم آج تک نہیں ملا۔ مگر یہ بات بھی اردو زبان و ادب اور اس کے مختلف اداروں کی بدقسمتی کی ایک دلیل ہے کہ ان سے آج تک کوئی ایسا کام نہیں لیا گیا جو اردو ادب کے شایان شان ہو اور ان کی علمی حیثیت سے بھی فروتر نہ ہو۔ شاید اُن میں تنقیدی نظر کی اس حد تک کمی ہے کہ کام کرنے سے پہلے یہ غور نہیں کرتے کہ وہ ان کی توجہ کا مستحق بھی ہے یا نہیں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ اُن کے علمی دبدبے کے سامنے بڑی آسانی سے ماند پڑ جاتے ہیں مگر ان اساتذہ کے پُر اغلاط کام پر توجہ کر کے مثبت کام سے اپنے آپ کو محروم رکھنا قابل معافی گناہ نہیں۔ اس سے تو بزعم خویش قسم کے علماء کو معاف کر دینا زیادہ آسان ہے۔ جو جتنا بڑا جوہر رکھتا ہے اس سے اتنی ہی بڑی توقعات وابستہ ہو جاتی ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ اب ایک نقاد کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں مگر اُن کی پرانی تحریریں زیادہ تر تحقیق و تفتیش سے متعلق ہیں اور اُن کی تنقید سے زیادہ محنت اور گہرائی کی حامل ہیں۔ "اردو شعراء کے تذکرے" اُن کا ایک طویل مضمون ہے جو کتابی شکل میں بھی چھپ چکا ہے۔ اس کے علاوہ خان آرزو کی اردو فرہنگ "نوادر الالفاظ" کو انھوں نے عالمانہ انداز میں ایڈٹ کیا ہے۔ ان کی انگریزی تصنیف "اردو نثر۔ سرسید کے زیر اثر" تنقید سے زیادہ تحقیق کا کارنامہ ہے۔ اُن کا تحقیقی مزاج بھی سنجیدگی اور متانت کا حامل ہے۔

[illegible] تحقیق [illegible] ۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کی کتاب "میر تقی میر" [illegible] تذکرہ بنا کر [illegible] "نکات الشعرا" [illegible] "آب حیات" [illegible] کیا گیا ہے اور شاید ہی کہیں [illegible] دوسروں سے [illegible] کے ساتھ یہ نیا [illegible] سلوک [illegible] دنیا میں [illegible] رہے گا۔ جب تحقیق کا عمل [illegible] حال ہی میں [illegible] کا ایک [illegible] کی سوانح عمری تحریر کی ہے۔ اسی کی تحقیق کے [illegible] گیا۔

معلمین اردو کی تحقیقات کا موضوع نقاد اور ادیب اور شاعر ہوتے ہیں جو کسی نہ کسی امتحان کے نصاب کا حصہ ہیں۔ جو خوش قسمت اس دائرے میں نہیں آتے اُن کو ہاتھ نہ لگانا۔ ان کے نزدیک گناہ کبیرہ سمجھا جاتا ہے۔ امدادی کتب کو بازار سے نکلنے میں علمی اور ادبی کارنامے بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ یہاں تک بھی خیریت تھی اگر ان کتابوں میں کوئی نئی بات یا کوئی وقیع کام پایا جاتا۔ ایسی تالیفات میں جلد بازی اور عبارت آرائی کے نمونے قدم قدم پر ملتے ہیں اور چونکہ مؤلفین کی اپنے موضوعات سے کوئی گہری واقفیت نہیں ہوتی اس لیے ان میں جا بجا ابہام رہ جاتے ہیں۔ ان مقامات نے محققین کے ایک نئے گروہ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی ہے اور نوجوانوں کی تحریروں کا موضوع وہ نوزائیدہ تالیفات ہیں جو معلمین اردو نے اپنے طلباء کی رہبری کے لیے مرتب کی ہیں۔ ان نوجوانوں کی تحریروں میں تاہم ذہن کی کارفرمائیاں بھی ہیں اور ان کی عیب جوئیاں اکثر اوقات "طبقاتی نزاع" کی یاد دلاتی ہیں مگر ان سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ وہی کام بہتر انداز میں بھی کیا جا سکتا تھا۔ ڈاکٹر ابو اللیث کی تالیف "لکھنؤ کا دبستان شاعری" اور "مصحفی" پر ڈاکٹر وحید قریشی کے مضمون کا یہی عالم ہے۔ وحید قریشی ہمارے جانے پہچانے نقاد ہیں اور یہ بات بڑی حیران کن ہے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ جیسے پرانے بزرگ تحقیق چھوڑ کے تنقید کی طرف راغب ہوتے ہیں اور نوجوان تنقید نگار تحقیق کی طرف لوٹتے ہیں۔ اصولاً اس میں کوئی خرابی نہیں اس لیے کہ مطالعہ رائے کو جنم دیتا ہے اور رائے کو صائب بنانے کے لیے مزید مطالعے کی ضرورت پڑتی ہے مگر ہمارے اکثر نوجوان اس چکر سے نکلتے ہی نہیں۔ حال ہی میں ہندوستان کے ذہین اور باخبر نقاد ڈاکٹر محمد حسن بھی تحقیق کی جانب مائل ہوئے ہیں اور مبتلا کا تذکرۂ شعراء مرتب کرنے میں مصروف ہیں۔ ہمارے نقاد جب تحقیق کی جانب مڑتے ہیں تو اپنے تنقیدی پس منظر کو فراموش کر دیتے ہیں۔ پھر ان میں اور کسی پرانی طرز کے عالم میں

مرقع نغز تو اسی سے جا ملا۔ وحید قریشی، ڈاکٹر مختار الدین احمد اور نثار احمد فاروقی پر تو اس عہد اردو کے تحقیقی مزاج کا اثر بھی ہے اور یہ تحقیقی مزاج اور تفصیل پرستی کا رجحان ہمارے زمانے کا عام رجحان بن کے رہ گیا ہے۔

پھر بھی محققین کے اس گروہ میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اس رائے کو محنت شفقت کے ساتھ ملا کر ایک متوازن نتیجہ پیدا کرتے ہیں۔ اردو کی نثری داستانوں پر ڈاکٹر گیان چند جین کی کتاب اور اردو مثنوی پر ڈاکٹر عبد السلام کے مضامین جدید تحقیق کے اس شیوہ کو پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح آمنہ خاتون نے نشاط اللہ خان کی زندگی اور کلام پر بہت اچھا کام کیا ہے۔ ایک حد تک بیگم کلب علی خان فائق رامپوری کا بھی اسی ضمن میں لیا جا سکتا ہے۔ ... اردو کے بڑے شعراء پر انہوں نے جو تحقیقی مضامین لکھے ہیں انہیں پڑھ کر یوں لگتا ہے جیسے ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں اور مطالعے کی وسعت اور گہرائی کا قائل نہ ہو۔ نگار کے داغ نمبر میں حیات داغ پر ان کا مضمون، صحیفہ کا نمبر جو کلام (سعادت) ... حیات مومن (اورینٹل کالج میگزین) اور میر دہلی میں (صحیفہ) ہماری تحقیق میں ایک نئی آواز کو پیش کرتے ہیں۔ ہمارے محققین نے آج تک اس اختصار کے ساتھ کسی بڑے شاعر کی زندگی کا ریکارڈ اور مکمل تصویر پیش کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ فائق صاحب کے ان مضامین میں دو خوبیاں ایسی ہیں جو ہمارے زمانے کے کسی ادبی محقق میں بیک وقت نہیں ملتیں۔ ایک تو یہ کہ وہ جس شاعر کو موضوع بناتے ہیں، اس کو اپنے سماجی پس منظر میں دیکھتے ہیں (ہمارے محقق حضرات اس بات کے عادی ہیں کہ سماجی پس منظر کو الگ پیش کیا جائے اور شاعر کو الگ)۔ دوسرے وہ شاعر کے کلام کو اس قدر غور اور توجہ سے پڑھتے ہیں کہ وہی ان کا سب سے بڑا ماخذ بن جاتا ہے (یہ خوبی بھی ہمارے محققوں میں خال خال پائی جاتی ہے اور اکثر اوقات غلط نتائج بھی پیدا کرتی ہے)۔

اس جائزے کے بعد ہمیں دیکھنا ہے کہ ارباب تحقیق کی محنت اور شغف سے ہمیں کیا حاصل ہو سکتا تھا اور کیا واقعی حاصل ہوا ہے۔ جس قومی ورثے کو محفوظ کرنے اور نئے دور تک مناسب شکل میں اور تاریخی پس منظر کے ساتھ پہنچانے کا مقصد یہ تحقیق انجام دے سکتی تھی۔ اس میں سے محض ایک ابتدائی قسم کی کامیابی حاصل ہوئی ہے اور یہ کامیابی بھی زیادہ تر افراد کی مرہون منت ہے۔ ابھی تک اردو زبان و ادب کے بڑے بڑے کارنامے حشرات الارض کی خوراک بن رہے ہیں، بدیسی عجائب گھروں اور کتب خانوں کی زینت بنے ہیں یا غلط ملط انداز میں طبع ہوئے ہیں۔ ان حالات میں عام پڑھنے والوں کے لیے تو کیا، اچھے خاصے نقادوں تک کے لیے ہمارا ادبی ماضی اچھی طرح واضح نہیں ہے۔ تنقیدی کام کرنے والا جب کسی موضوع پر کوئی کام کرنے بیٹھتا ہے تو یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ تحقیق اس کی کچھ زیادہ مدد نہیں کر سکتی اور اگر اسے یہ کام کرنا ہے تو تعین، تشریح اور تاویل وغیرہ کو ملتوی کر کے اسے خود تلاش اور تفحص سے کام لینا پڑے گا۔ اکثر اوقات وہ اپنے اصلی کام کو بھول کر یہ خدمت سر انجام دیتا ہے اور ماضی کی قدر و قیمت متعین کرنے کا فریضہ دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔

اردو ادب اور زبان کے بارے میں تحقیق کے کئی شعبے ایسے ہیں جن میں مزید کام کی بے حد گنجائش ہیں اور جن کے بغیر نہ اردو ادب اور زبان کے مختلف ادوار کا صحیح نقشہ سامنے آ سکتا ہے، نہ ہمارا ماضی ہمارے لیے کسی فیضان یا تخلیقی انگیخت کا باعث بن سکتا ہے۔

سب سے پہلے ماضی کے ادبا و شعراء کے کارناموں کی ترتیب و تدوین ہے۔ اب تک اردو کے کئی ایک اچھے شعراء مثلاً

[illegible] ... کام کرنا آسان نہیں تھا۔

ہمارے ہاں بہت سے شعراء [illegible] ... ہے۔

ہمارے قدیم و متاخر شعراء [illegible] ... حالی نے غالب کی زندگی [illegible] ... سوانح عمری [illegible] ... ہے۔

[illegible] کام کے سلسلے میں [illegible] ہمارے ہاں تحقیق [illegible] کسی کی تاریخ وفات متعین کرنے کے سلسلے میں [illegible] ہمارے محققین آپس میں جھگڑتے ہیں لیکن آج تک کوئی ابھی [illegible] درجہ و تاسیس کے بعد دریافت شدہ مواد [illegible] سکے۔

ہمارے قدیم اور جدید شعراء کے بارے میں سوانحی [illegible] فارسی میں موجود ہے [illegible] جیسے ہمارے زمانے میں [illegible] فارسی سے [illegible] ہمارے شعراء کے [illegible] اردو میں ترجمہ نہیں ہوا۔ میر کی خود نوشت سوانح عمری [illegible] دریائے لطافت کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ [illegible] انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں بھی موجود ہے [illegible] اس کام کا غالب حصہ ابھی تک اردو میں منتقل نہیں ہوا۔

اردو زبان اور ادب نے برصغیر ہند و پاکستان کی تاریخ کے جس دور میں نشوونما پائی اس پر دیسی اور بدیسی مورخین نے کم توجہ دی ہے۔ اورنگ زیب کے بعد کا عہد چھوٹی چھوٹی سلطنتوں اور بے شمار سیاسی آویزشوں سے بھرا پڑا ہے اور اس لیے ایک پریشان کن موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب بھی ہمارا کوئی محقق کسی ادیب یا شاعر پر قلم اٹھاتا ہے تو اسے طور پر اس دور کی تاریخ لکھنے لگ جاتا ہے۔ نہ وہ اس کام کے شایان محنت کرتا ہے نہ کسی مضبوط تاریخی شعور کا مالک ہوتا ہے۔ چنانچہ تحقیقی کارناموں کے تاریخی حصے بے حد الجھے ہوئے اور اصل کام سے جدا جدا لگتے ہیں۔ اردو ادب کا تاریخی پس منظر ایک ایسا موضوع ہے جو کسی ادب دوست مورخ کا منتظر ہے۔

اردو طباعت اور صحافت کی تاریخ بھی ہمارے کئی ایک تحقیقی مسائل کو حل کر سکتی ہے۔ اور ان کے ابتدائی ادوار کو اب تک کسی نے موضوع بنا کر مستقل کام نہیں کیا۔ کئی ایک الجھنیں اور غلط فہمیاں اس کام کے بغیر رفع نہیں ہو سکتیں۔

اردو زبان کے صرف و نحو اور لغت پر بھی تاریخی اور تحقیقی کام اب تک ملتوی ہوتا رہا ہے۔ زیادہ تر کام جو اردو زبان کی تاریخ

پڑھا ہے۔ بہ ذریعہ حاصرہ بائی صحبت کا مطالعہ کرتا ہے۔ شیرانی مرحوم نے پنجاب میں اردو، عکس تو بہت سے اداروں کی توجہ اس علم کے حصول
جائزوں کی طرف مبذول ہوئی مگر شیرانی مرحوم کا ایک تو پنجاب سے کوئی جذباتی تعلق نہ تھا دوسرے انھوں نے صرف پنجابی زبان کے حوالے
سے بھی اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی مگر ان کے بعد آنے والے لوگ اس قسم کے خطروں سے نہ بچ سکے۔ پھر بھی لسانیات کے
میدان میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور، مسعود حسن رضوی، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، احتشام حسین اور حال ہی میں ڈاکٹر شوکت سبزواری کے کام اپنی
جگہ پر کچھ اہمیت ضرور رکھتے ہیں۔ "دکنیات" کے علاوہ اردو کا یہ موضوع ہے جس میں ہمارے محققین نے کوئی خدمت انجام دی ہے
ایک اور یہی خدمت کو وسیع ہونا چاہیے۔ دوسرے یہ کام اس انداز میں لکھنے کی ضرورت ہے کہ ہر اردو زبان والا مطالعہ کر
پا سکے۔

بوڑھا اور رات

ابو سعید قریشی

[illegible] جزئیات [illegible] جیسے [illegible]

بوڑھے [illegible] گودی [illegible] تھا۔

اس کے [illegible] کھیت کے [illegible] اس کی [illegible] کر بند باندھتا اور زمین کا سینہ چیرتا تھا۔

اس کے خاندان میں سپاہی کا پیشہ مقدس فریضے کی طرح چلا آتا تھا۔ ہر گھرانے میں ایک جوان [illegible] اس کے کسی بزرگ کا قول تھا کہ [illegible] جانے کب [illegible] پڑ جائے۔

فتح محمد خود بھی جنگ کے کئی میدان دیکھ چکا تھا اور اس کے بدن پر گہرے [illegible] کئی نشان تھے۔

اور اس روز اپنے بیٹے فتح علی کو رخصت کرتے وقت [illegible] اس نے علی کا نعرہ [illegible] بیٹے کو سینے سے لگاتے وقت اس کو محسوس ہوا جیسے مجاہدوں کا ایک لشکر بھی وہی نعرے لگا رہا ہے:

علی علی بہادرو!

علی علی دلاورو!"

"جب تک اس نعرے کی گونج باقی ہے بیٹا!" بوڑھے نے کہا: "تمہیں کوئی خوف نہیں ہونا چاہیے۔"

نوجوان نے اپنے باپ کے ہاتھ چومے، انہیں آنکھوں سے لگایا اور رخصت لیتے ہوئے کہا: "بچھیا کو رات اندر ہی باندھنا بابا! چیتے کو اس کی خوشبو آ جاتی ہے اور کھیت میں الاؤ جلاتے رکھنا ورنہ [illegible] ایک [illegible] نہیں چھوڑیں گے۔ تین چار دن سے لومڑی بھی آ رہی ہے پرندوں کے پیچھے۔"

"اللہ کے سپرد! اللہ کے سپرد [illegible] سب کا ——!" بوڑھے نے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

کہا —— "اب جاؤ! خدا تمھاری مرادیں پوری کرے۔"

شہر کو جانے والی پگڈنڈی چٹانوں کے نیچے چھپ گئی۔ بوڑھے نے پٹکے کو کاسے چیڑ کے پتوں پر شکرانے کے دو نفل پڑھے کہ اللہ نے آج میرے بیٹے کو بھی اس قابل کیا۔ —— اور وہ پھر کام میں گم گیا حتیٰ کہ سورج سفیدوں کے نیچے چھپ گیا اور چاند چیڑھوں کے تنوں سے ابھرا۔

عشا کی نماز کے بعد اس نے اپنے بیٹے اور مجاہدوں کی سرخروئی کے لیے ہاتھ اٹھائے جو خدا کا نام لے اپنے وطن کے اس حصے کی آزادی کے لیے لڑ رہے تھے جس پر دشمن ہمسایہ قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ دعا کے بعد اس کو ایسی کامیابی کا یقین ہو گیا اور مصلے پر ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔

لیکن یکایک ڈربے کی جانب سے مرغیوں کا شور بلند ہوا اور اس کے ساتھ ہی گدی کتے کی گرج سنائی دی —— بوڑھا سمجھ گیا کہ لومڑی آئی ہے۔

اس کا ہاتھ اپنی بندوق کی طرف بڑھا لیکن جب وہ باہر پہنچا تو چاند اور الاؤ کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ لومڑی کی گردن کتے کے منہ میں ہے۔

"فاحشہ —— اب کہاں جائے گی بچ کر!" —— اور دروازے میں کھڑا وہ لومڑی اور کتے کا تماشہ دیکھتا رہا حتیٰ کہ لومڑی کی جدوجہد ختم ہو گئی۔

"موتی!"

موتی نے لومڑی کو چھوڑ دیا اور دُم ہلاتا ہوا اپنے مالک کی طرف بھاگا۔

"شاباش موتی شاباش!" بڈھے نے کتے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "جیتے رہو! جیتے رہو!"

ڈربے کے باہر لومڑی کی لاش کچی چاندی کی طرح چمک رہی تھی۔ بوڑھے کو وہ میمیں یاد آگئیں جو عالمگیر جنگ ختم ہونے کے بعد اتحادی فوجیوں کے پیچھے پیچھے گھوما کرتی تھیں اور جن کے ہونٹ مرغ کھائی ہوئی لومڑیوں کی طرح لال تھے۔

"مکار! ایک رات تو تجھ کو بھی بھا نساد ے گئی تھی فتح! افوہ یہ ہے —— کیسی ظالم مہک آ رہی تھی کافر کے کپڑوں سے —— بخشیو پاک پروردگار —— آ ہی چلا تھا شیطان کے پھسلانے میں، پر اس وقت وہ یاد آ گئی تھی جنتی —— یوں لگ رہا تھا جیسے پاس کھڑی ہے اور کہہ رہی ہے" اپنے بیٹے کی ماں کو بھول گئے؟ —— اور پل بھر کو اس کی آنکھوں کے آگے پانی بھری دُھند چھا گئی۔

مگر موتی غرّایا جیسے پوچھ رہا ہو اب کیا حکم ہے۔ لومڑی کی خوبصورت چمکدار کھال پھر بوڑھے کے سامنے ابھری۔ لومڑی کا چھوٹا سا خوبصورت منہ کھلا ہوا تھا۔

گلوبند بنتا ہے کھال کا —— ولایت میں تو سالیاں اس طرح پہنے پھرتی تھیں جیسے انھی کی کھال ہو۔ اری مرتو! تمارا بھی کوئی جانور کا —— پر نہیں وہ بھی رہے گا۔ فیشن! فیشن! —— اور کبھی کبھی تو یہ بھی پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون سا منہ کس کا ہے۔ یہ عورت ہے یا بھوکی لومڑی —— وہ تو بچ گیا بھوکی تھی اس چلن والی —— کتنا تو کھانا کھا گئی تھی —— بھوکی نہ ہوتی تو کالے آدمی کے پیچھے کیوں آتی کم بخت! —— ایسی جنگ سے بچائیو مولا جس میں جیت نہ ہو —— فتح! فتح! اللہ نہ کرے جو آج تیرے وطن پر بھی کسی کا قبضہ ہو جائے تو تیری بیٹیاں

بتیسیوں بھی۔ —— وہ اپنے تصور سے کانپ اٹھا —— اس دن سے کیا ہو رہا —— اس رات سے پہلے موت آ جائے!

اور اس کے ساتھ اس کے دل میں بیروں کے خلاف جو نفرت کا جذبہ بند ہوتا تھا وہ پھر بھڑکنے لگتا ہے —— کی کھال پر یوں ہاتھ پھیرنے لگا جیسے کوئی کسی دل نواز کو سہلا دیتا ہے —— سب نے کتنے بخشیں خود ہیں —— وہ سب ایک سے کمائیں —— پھر کیا سگا بھائی ہاں ہے —— پا ہے وہ بیل کی جوڑیاں جوڑ دولت کی ایک مدت سے ہے دولت کی —— مزدور کی نہ جھکی! اور نمونہ زمین جو کہ گئے ہیں جیسے کہ بیگ تھیں —— وہ شیطان بھی لڑکے ہی کا دوسرا نام ہے ہمارے! یہ ہماؤں کے سر پر چنگل پانی ہی، تو اپنے بہت کھیتیاں اور جھونپڑی کی چھوکر۔

اچھا بھئی موتی! اب اس کو تماشا نے کام تیرا —— وہ بے تحاشا حیوانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ کمال کی زبان بھی تھی —— اپنے پیچھے —— باقی سب تیرا —— اس نے اسے تو —— صبح ہو گئی —— کیا ہے آدمی جو کہ جانور پیٹ بھرنے کے لیے سب کر کام کرنا پڑتا ہے۔

بوڑھی کی کھال آتا رہنے کے بعد اس نے اپنا سر اور دھویا اور پھر کے نیچے آکر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

اچھا بھئی موتی! ذرا دھیان رکھنا۔

اپنا کام ختم کرنے کے بعد وہ اب اور تا جیسے بوڑھے کی بات سمجھ گیا ہو۔

یہ تو جاگتوں کی دنیا سے بہت دور ہے جانتا ہے ہم تو بس بڑھاپے کا کرتے ہیں۔ مگر اب تو ان میں بھی اونگھ جاتا ہے اور ایک دو بجے بھی کسی طرح رات کا پہرہ دیتا اور بیل نہ جاگتی۔ نئے پیسے بھی تو نہیں مل جاتے۔ جس نے موتی کو جھک کر بٹھایا اس کو بیل —— ارے بہت ہو گیا موتی!

وہ ہنسا، جماہی لی اور سوچ جیسے اب سو جانا ہے وہ حقہ اٹھ جانے لگا۔

دفعتاً کہیں دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آئیں۔ —— بوڑھا بڑبڑایا —— کم بختوں نے جب حملہ کر دی لیکن کتوں کا کام ہی بھونکنا ہے —— اور پھر وہ کروٹ بدل کے سو گیا۔

مگر کتوں کی آوازیں بلند ہوتی گئیں۔ اب کے ان میں موتی کی آواز بھی شامل تھی۔

شور قریب آ گیا۔ موتی کی آواز میں غصہ تھا، وحشت تھی۔ —— یکایک اس کے فاصلے بدلتے گئے۔

بوڑھا چونک پڑا۔

چاند کی روشنی میں ایک سیاہ بگولا مکئی کے کھیت میں گھوم رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ مکئی کے ڈنٹھل ٹوٹنے کی آواز آ رہی تھی جیسے شریر جانوروں کی ٹولی کھیت میں گھس آئی تھی۔ موتی کبھی سائے کی ایک طرف دکھائی دیتا کبھی دوسری طرف جیسے وہ موقع تلاش کر رہا تھا کہ کب اور کہاں حملہ کروں —— اور پھر ریچھ اور کتا آپس میں گتھ گئے۔ بوڑھے سپاہی کا ہاتھ بندوق کی لبلبی پر تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کب فائر کروں۔ اس کو ڈر تھا کہ کہیں کتا گولی کی زد میں نہ آ جائے لیکن اتنے میں دونوں جانور آنکھ سے اوجھل ہو گئے اور پھر کھیت کے بیچ کرنے سے ایک وحشیانہ چیخ سنائی دی۔ بوڑھا سمجھ گیا کہ موتی کا پلہ بھاری ہے اور ریچھ کے بدن میں موتی کے گڑتے ہوئے دانتوں کے تصور سے اس کے اپنے دانت بھی کچکچا اٹھے جیسے وہ بھی وحشی کے گوشت میں گڑے ہوئے تھے۔

ایک اونچا ـــ سورما کا دانگڑہ فتح محمد کے سامنے کھیت سے نکل کر بھوری پہاڑیوں کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ بڑھتے کی بندوق سے ایک شعلہ لپکا، ایک دھماکہ ہوا، اور وہ سورما کا دانگڑہ رات کے سایوں کی طرف بڑھا۔ سرکی ٹہنیاں ٹوٹنے کی آواز آئی اور پھر سنسنی پھیل کر ختم ہو گئی۔

کیا ہوا منی؟ ادھر آ۔۔۔ ارے! ۔۔ ۔ اس کے سپاہی کی پیشانی پر ان گنت جھاڑیاں اُگ آئیں ـــ داؤ لگا ہی گیا تو شکار جاتے جاتے۔ اوہ ذرا سا کچھ تو چھپنے دے بابا۔ تیرے بغیر تو بیڑا پار بھی نہیں ہو سکتا ـــ ہونہہ! کوئی بات نہیں، ٹھیک ہے، بچاؤ ہو گیا بچہ جی! ایسے ہی ہاتھ لگا ہے جیسے نوالہ منہ ہو جاتا ہے۔۔۔ اس نے چھلی بجائی ـــ ابھی! ریشم کی مالا کیا ہے:

اس نے اپنی جیب سے ریشمی رنگ کا ایک ٹکڑا نکالا جس کو وہ رومال کے طور پر استعمال کرتا تھا اور اس کو اچھی طرح لپیٹ لیا۔ پہلے ـــ کیسا ہی زخم ہو، خون بند کرنے کے لیے اس سے بہتر دوائی انگریز ڈاکٹر بھی نہیں جانتا۔ ـــ مولا فضل کہتے تھے اپنا ـــ اور اس۔ دو دن سے یہاں کی بیٹ لوں گا۔ اول تو ایل بی نے دن نکلنے سے پہلے ہی اس کا دوسرا کام تمام کر دیا ہوگا۔ اب تو نکل گیا ہے ناگڑ گڑ۔

سینہ تان کر جو بیٹھے دو دن، پھر دیکھیو تماشہ۔ تھالو بہادر بنا دیکھو گے تو نا جا ر بات ہی کیا ہوتی۔۔۔

اور اب اس بڑھیا کے منہ میں کچھ ڈال دیں ـــ اس نے صندوق سے خالی کارتوس نکال کر پیالہ کارتوس بھرتے ہوئے کہا۔ فتح علی کیا کہہ رہا تھا اس دن ـــ ہاں! کہہ رہا تھا کہ بابا اب تو رائفل لے لو اور اس کو آرام دو۔ بندوق فتح محمد نے اسے ۔ مار کر کہہ ڈالا دیا تھا کہ بیٹا: اس کا میرا پرانا ساتھ ہے۔ اتنا پرانا کہ تیری عمر بھی اتنی نہیں ہوتی۔ تیرا چاچا فوج میں بھرتی ہو جائے گا۔ ماں تو ایک تو اس کے ساتھ کچھ انسیت ہو گئی ہے، دوسرے اصل بات یہ نہیں ہوتی کہ بندوق نئی ہے یا پرانی۔ اصل چیز تو نشانہ باندھنے والی آنکھ ہے اور انگلی جو بہ جاتی ہے کہ لبلبی کب دبے گی۔ ـــ نہیں سمجھے؟ خیر کوئی بات نہیں۔ ایک روز آپ سے آپ سمجھ جاؤ گے۔ اس کا بھی وقت مقرر ہوتا ہے جیسے برفوں کے پگھلنے، انگوروں کی بیل پر بور آنے کے۔ جھونپڑے پر دانے پڑنے کا وقت، فصلوں کی کٹائی اور پہاڑی میں لوگوں کے چلنے چلنے کی تیاری اور حملہ کرنے کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ جس نے یہ بھید پا لیا وہ زندگی میں کبھی دھوکا نہیں کھائے گا۔ ۔۔۔ رہی رائفل، تو فوج میں تو خیر ٹھیک ہے کہ جتنی دور سے مار کر سکو اتنا اچھا ـــ وہ بھی اس لیے کہ آج کل کی جنگیں ہی ایسی ہیں جہاں ہمیں دشمن نظر نہیں آتا۔ ملنے کے بہت سارے مجبوری ہی ہیں ـ رائفل میں سو عیبوں کا ایک عیب تو یہی ہے کہ خدا نہ کرے نشانہ بال برابر بھی چوک گیا تو گولی کہاں سے کہاں نکل گئی اور کون جانے کہیں کوئی بچہ پھول ہی چن رہا ہو، یا کوئی مسافر ہی سستا رہا ہو پیڑ کی چھاؤں میں۔ ـــ نا بابا رائفل کو دور ہی رکھو گھر سے ـــ اب تم کہو گے کہ بارہ بور کی کمی ہے تو دونالی کیوں نہ ہو ـــ سو اس میں بھی بھید ہے۔ دونالی ہوتی تو خطرہ کم ہو گیا نا کہ ایک نہیں تو دوسرا کارتوس تیار رہتا ہے۔ یہی نا ـــ لیکن جب خطرہ ختم ہو گیا تو بات ہی کیا رہ گئی بیٹے ـــ نہیں سمجھے؟ کھانا ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے۔

کارتوس بھرتے وقت اس کو یہ سب باتیں یاد آ گئیں ـــ اور اب وہ وقت قریب آ رہا ہے بیٹا جب یہ ساری باتیں آپ سے آپ تیری سمجھ میں آ جائیں گی اور تجھ کو خطرے میں مزا آنے لگے گا ـــ کیونکہ ہوتی ہے خطرہ نہ ہوتا تو آدمی جانور ہی ہو جاتا ـــ کھاؤ پیو اور جگالی کرو ـــ

جگالی کے تصور سے اس کو اپنی گائے کی بچھیا کا دھیان آ گیا اور اس کی مونچھیں پھڑک اٹھیں ـــ بچھیا یعنی گائے! ـــ

[illegible]

[illegible]

اور حلنے کو گیا ... [illegible]

[illegible]

اس کو دیکھا سا لگا ... [illegible] ... تاریخ ہو گئی۔

[illegible] ... گھر سے قصور ... [illegible] ... ایک ... [illegible] ... اس نے اپنی بندوق ... [illegible] ... اور اپنی چیند ... [illegible] ... دوسرے گھونٹ۔ ایک او گھونٹ ... [illegible] ... تو تو کل تک یہ سپنا دیکھ رہا تھا کہ یہ بچھیا گائے بن گئی ہے اور میرے بیٹے کی ہونے والی بہو اس کا دودھ دوہ رہی ہے۔ یہ قصور خود میرا ہے، کہتا ہی رہ گیا کہ اللہ کے بندے ایسی کنڈلی ٹھیک نہیں، ہوا کے اشارے پر بھی کھل سکتی ہے، پر میرا تو نشہ ٹوٹا جا رہا تھا جانے کے بغیر ... کل یہ گھال ہوئی بات ——— اب سنڈا روتا بیٹھ کے :

گھمسے پھر ڈکارا ہی ——— دراصل وہ بدستور ڈکار رہی تھی لیکن اپنے خیالات میں کھو کر وہ اس کی آواز سے بے خبر ہو گیا تھا، اس کی آواز سے سینہ پھٹا جا رہا تھا۔

اللہ تجھ کو صبر دے ——— اس نے گوری کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ——— اور پھر سوچنے لگا کہ اس بے زبان جانور نے آخر کیا قصور کیا تھا جس کی یہ سزا ہے ——— اور جیسے اپنے سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے اس نے رات کی طرف دیکھا۔

ڈھلتی رات کے اندھیروں نے اس کے ذہن کو اور بھی دھندلا دیا ——— دیواروں کی پھیلی ہوئی باہیں دھند میں چھپ ہوئے

یہاں شاں کی بوٹیاں اور جھینگروں کی متواتر چیخ بھی ایسی سوال کرتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔

بڑا سے بھید بھری ماننے سے تھے ۔۔۔ سالوں سے اس چکر میں پڑتا ہے ۔۔۔ جو کام تم کو سونپا گیا ہے آدمی کو تو ڈرنے سے بہت ہے۔

ننھی کسی کاش چمپکا اور اونچے پہاڑوں کے سامنے پیلی زرد اور سامنے شفق پر رات کا جادو رفت بن کر جھکا۔

ناگوں بھری دوستی پچھلا رسمی بات، اصلی ہی رات، برسوں پہلے ایک عورت کو اٹھا کر لے گئی تھی اور اس کے زیور اور بچے کو ایک کھوپڑی میں دبا کر وہ رات بیکار ہو کر آئی تھی اور روتی کر بین کرتا چھوڑ گئی تھی۔

بڈھے سپاہی کا قہقہہ ہوا ایسی بلند ہوا اور اس کے گلے سے ایسی آواز نکلی جس طرح برسوں سے سوئی ہوئی توپ کا دہانہ جاگ اٹھے۔

کمہاروں کا بچہ ہے! ۔۔۔ اور پھر وہ بڑبڑانے لگا ۔۔۔ جانوروں کی معصوم کہانیاں ادھوری رہ کر بھی ۔۔۔ مگر تیرا انصاف سمجھ میں نہیں آتا۔

پہاڑوں کے پیچھے ایک سفید لکیر سی پھیل گئی ۔۔۔ اور بڈھا سوچنے لگا کہ سورج کے بیس کہیں ہوئے ہوتے ایسا کیوں ہوا؟ مگر گائے بدستور بین کر رہی تھی اور رسی اس کے ارد گرد گھوم رہا تھا اور بھونک رہا تھا۔ کبھی وہ اس کی ٹانگیں چاٹنے لگتا اور کبھی اس کے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا جیسے دلاسا دے رہا ہو۔

جانوروں کو بھی تو معلوم ہوتا ہے نا ۔۔۔ بڈھے نے کہا۔ یہ بھی باتیں کرتے ہیں ۔۔۔ سمجھ کی بات اور ہے، وہ تو آدمی بھی کبھی کبھی آدمی کی بات نہیں سمجھتا۔

کاشی کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو بہہ رہے تھے۔

صبر کر بیٹی، صبر کر ۔۔۔ بڈھے نے کہا ۔۔۔ آدمی بھی تو آخر صبر کرتا ہے نا ۔۔۔ پر آدمی آدمی ہے ۔۔۔ ویسے یہ سب کہنے کی باتیں ہیں، درد ہو گا تو رونا ضرور آئے گا۔ آدمی ہو یا جانور ۔۔۔ اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ رونے سے دل کی بھڑاس نکل جاتی ہے۔ میں بھی رویا تھا جب فتح علی کی ماں چلی گئی تھی، تو بھی رو ۔۔۔ اس نے گائے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا ۔۔۔ اور اب ڈیوٹی!

اس نے اپنے ٹرنک کا ڈھکنا صاف کیا جس پر مٹے مٹے رنگوں میں اس کی پلٹن کا بسکوٹ شاخاب پر تول رہا تھا صندوق سے اس نے گرم پٹیوں کا جوڑا نکالا اور اپنی پنڈلیاں کسنے لگا جیسے برسوں گزرے پریڈ پر جاتے ہوئے کسا کرتا تھا۔ اس کے کانوں میں بگل کی آواز گونج اٹھی۔

مگر یہ رونے کی آواز کہاں سے آ رہی تھی؟ ۔۔۔ وہ چلتے چلتے چونک پڑا، کوئی بڑھیا بین کر رہی ہو جیسے ۔۔۔ مر گیا ہو جیسے کوئی کسی کا۔

اس کے قدم آپ سے آپ رک گئے، اپنے خیالات میں مگن وہ کالے جنگل کو بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا اور اب اس کے سامنے کالے بیروں کی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ بھورے ریچھ بیر کھانے کے لیے اکثر ادھر آ نکلتے ہیں۔ فتح محمد کو یقین تھا کہ ایس پی کے بیٹے نے موذی کو ان جھاڑیوں سے ادھر نہیں جانے دیا ہوگا۔

اسے ایک مدت ہوئی بتا دیا گیا تھا اور جب سے اس کی سونگھنے کی طاقت بہت تیز ہو گئی تھی جھاڑیوں کی جانب سے ہر ایک جھٹکے سے اس کو یقین ہو جاتا کہ کوئی نزدیک ہی ہے۔

کتا بھونکا اور اس کے سارے بدن میں جنبش ہوئی اور ایک لمحہ بعد وہ پھیلا ہوا بوڑھے کی طرف بڑھا جیسے کوئی انجانی دھمک پڑی تھی۔

بوڑھا پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ سب سے پہلے آدمی کے چہرے پر حملہ کرتا ہے کیونکہ اس کو خوف جسم سے نفرت ہے۔

ہرنی اور ہرن! اس وقت دیکھ رہے ہیں!

کتا اس وقت دیکھ ہی رہا تھا کہ ہرن غائب ہو گیا — پھر کچھ دیر یوں محسوس ہوا جیسے کوئی جنگلی انسان اور سینہ تانے کھڑا ہے ———

بوڑھے سپاہی کی ساری توجہ بندوق کی نالی سے پیچھے اس کی آنکھ کی جگہ تھی آنکھ میں بجلی آئی اور شعلہ بن کر لپکی۔

سنسناتی ہوئی گولی تیزی سے گزرتا ہوا اس کی کھوپڑی سے نکل گیا اور وہ بوڑھے سے چند گز کے فاصلے پر ڈھیر ہو گیا۔

مردود! بوڑھے نے مردہ جسم کو ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ تو سمجھتا تھا کہ میری فصلوں میں بے بگڑا ناچ کرتا پھرے گا ——— اور پھر ہرنی سے مخاطب ہو کر ——— تیرا بھی یہی حشر ہونا تھا ——— وہ خوش ہے نا ——— اب اس کو تیری کوئی ضرورت نہیں۔ ہرن اور ہرنی کے اس طرف جو پہاڑ ہے ادھر چلتا ہے۔ ——— یہ ہرنی اور پرے سے آتے ہیں خانہ خراب!

کتا چلتے چلتے رک گیا، زمین کو سونگھنے لگا اور اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

کہیں ہرنی مل گئی کھوج! شاباش! اب زیادہ دور نہیں جانا پڑے گا۔

دفعتاً ایک پہاڑی کے موڑ پر سے آبشار کا شور سنائی دیا ——— ہرن بے چارہ نا مرتا ——— یہیں آتا ہو گا وہ ہرنی پانی پینے کے لیے ——— کمینہ، رذیل، چھپ کر حملہ کرتا ہے سفلہ ——— پر تجھ کو تو معلوم ہی ہے، میری برادری سے تو اس کی پرانی دشمنی ہے ——— تیار ہو جا اب!

یکایک اس کا چہرہ بھیگ گیا اور وہ سمجھ گیا کہ آبشار آ گیا۔

پگھلی چاندی کی ایک چادر پہاڑ کے اوپر پھیلی ہوئی تھی اور اس کے اوپر رنگوں کی پھوار اڑ رہی تھی۔ بوڑھے نے ہاتھ بڑھا کر روشنی کی اس پھوار کو پکڑنا چاہا اور وہ اس حرکت پر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ یہ پھوار سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ بھی اسی کا جزو ہو، میں بھی پھوار ہوں اور یہ ساری دنیا رنگوں کا کھیل ہے جس کی حقیقت صرف روشنی ہے۔

گڈریے اس آبشار کو پریوں کا جھرنا بھی کہتے تھے، اس کا پانی اوپر سے گرتا اور رفتہ رفتہ زمین کے متوازی بہتا ہوا یکایک غائب ہو رہا تھا۔ یہاں زمین کی سطح پر کچھ ایسے سوراخ تھے کہ پانی کے اوپر غبارے تیرتے ہوئے نظر آتے اور چھوٹی بڑی گھنٹیاں بجتی رہتی تھیں۔ مشہور تھا کہ ان بلبلوں پر پریاں ناچتی ہیں۔ ان کی پازیبوں کی صدا بے خبر سیاحوں کو ادھر کھینچ لاتی ہے اور جب وہ پاؤں دھونے کے لیے پانی میں اترتے ہیں تو پریاں انہیں نیچے کھینچ لیتی ہیں۔

جل ترنگ کی آواز سے بڈھے کے بھی کان کھڑے ہو گئے۔

شاید یہ پانی کہیں بہہ رہا ہے یا ٹپک رہا ہے۔ اور یہ آواز ان کی دھڑکنوں کے سنگ ہے۔ — یہاں —

وہ پیاسا — یہ سب دھکا سہتے ہیں رہے بار — ان کو منزل پکار رہا ہے۔ — روشنی کا ہوا کرتا تھا جیسے۔

بیچ کے گویا نجات — ان کا سفر بے دشمنی کی دوڑ بن گیا۔ تھکا ہوا کتا جو ابھی ابھی پانی پینے کے لیے بڑھا تھا اچانک سے دیکھنے والے کہیں غائب ہو گیا۔

پہلے تو خیر بہرحال چھپا اور اب تو — کون جانے — بڈھے نے کہا۔ — آج ہی ٹھیک ہی لگتے ہوں — خیر — تو میرا یہیں تک کا ساتھ تھا — کیا سائیں — جیسے فوج کے سپاہی کو اپنی کمان کا کوئی گمان ہو۔ کارخرا اور پھر وہیں — پر ہر گاہ وہ ابھی باقی ہے فتح محمد — حسب عادت وہ کہ جبھی زندہ ہے جو کوئی چیز نہیں پا سکتی — پر مرنا تو اب اچھا ہی ہے گی تو نے — — آپ آدمی اب اکیلا ہی دوڑ رہا تھا رستے کا جیتنے سے — ایک بار آ جاتے سامنے — پھر رہا — ایک ایک بڈھا انگور ان کھائی زور کچھ پر ختم ہو دو گا۔

اس نے ماحول کا جائزہ لیا۔ کچھ عجیب ہوا۔ دریا نہیں جس پر سرے کا شاید تک نہیں تھا اور ساتھ بھی ابھی وہ ایسے سوز پیٹ نیچے زمین نظر آتی تھی۔ یوں دکھائی دے رہا تھا کہ یہ کوئی دوسرا ہی جگہ ہے۔ اوپر کہیں کہیں برف کی چٹانیں چمک رہی تھیں جیسے کسی نے انھیں خاص طور پر کاٹ کر وہاں لگا دیا تھا۔

ہر طرف اس طلسمات کا حالت — سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کون سی دنیا ہے۔ سفید پتھر کی سلوں سے پانی کے جھرنے بہہ رہے تھے جیسے اس کی گائے کے تھنوں سے دودھ کی دھاریں بہا کرتی تھیں۔

گائے کے تصور سے اس کو پھر بچھیا یاد آ گئی۔

سلی اشقی! تجھ کو اس معصوم پر بھی رحم نہ آیا — جڑوں سے ناخن نہ نکال دیتے میرے تو تجھے کو باپ نہ کہیو — جوڑا جوڑ کر رکھ دوں گا خدا کی قسم — ایک ذرا سامنے آ جا۔

آگے چل کر پہاڑوں کے اندر ستون بنے ہوئے نظر آئے۔ کچھ نیچے سے اوپر جاتے ہوئے جیسے چھت کو اٹھانے کے لیے زور دے رہے ہیں اور کچھ اوپر سے نیچے آتے ہوئے جیسے فرش کو سہارا دینے کے لیے — اور ان کے بیچ روشنیاں جھلملا رہی تھیں اور آیا تھیں دھند تیر رہی تھی اور کہیں بانسری بجا رہی تھی۔

آج نرگس دنیا میں آ نکلا بندے؟ آنا ہی تھا ادھر تو چالیس برس پہلے آیا ہوتا۔ یہاں تو میں بھی مان لوں کہ پریاں رہتی ہیں اور چالیس برس پہلے تو ہر جوان عورت پری تھی پیارے — فتح محمد کی ماں ساتھ ہوتی اور یہیں کسی غار میں ڈیرہ ہو جاتا تو یہی پرستان تھا۔

یکایک اس کا پاؤں کسی چیز سے پھسلا۔

انتڑیوں کا ڈھیر اور کھال کا ایک ٹکڑا۔

کھال سفید تھی۔

بوڑھے کے چہرے پر درشتی چھا گئی جیسے ان حسین پہاڑوں اور غاروں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور ان کے بجائے بنجر پہاڑ پھیلے ہوئے تھے۔

جب وہ چوپایہ بھاگ رہا تھا ۔۔۔ وہ بڑے آہستہ سے اس کے پیچھے ساتھ آ رہی تھی ۔۔۔ وہ چوکنا ہو کر
پلٹ سکتا ہے ورنہ وہ پیچھے حملہ ہی نہیں کرے گا وہ بھی۔

تھا اس کو پیٹ بھرنے کو نہیں ملا تھا ۔ سب سے نامراد ہو گیا ۔۔۔ ورنہ پہاڑوں اور ندیوں
کا پیچھا کر گئی۔

مگر کوئی بات نہیں وقت بہت۔

چاند کے سیدھے ہاتھ پر ایک کٹا ہوا سا ٹکڑا ۔ بیچ میں سے ہے نیچے جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا وہ گھوم کر دیکھا۔

بڑھتے ہوئے سانس کو روکنے کے لیے وہ رکی۔

چیتا اچھلا ۔۔۔ بڑھ کر اس کی گردن پکڑ لی اور پنجوں کو کھنچ کر ... گرا ۔۔۔ لیکن وہ ترس بھا
تھا ۔۔۔ اس نے آواز نکالنے کی بجائے صرف چیتے کی طرف سانس لی۔

پھر حملے کا ہوا ۔۔۔ ایک چیخ، آنکھ اور ایک ادھ کھلی ... سے گرے۔

یکایک وہ زور سے ... کے منہ میں ڈال دیا ۔۔۔ اس کا دوسرا ہاتھ اپنے شکار کی طرف بڑھا اور
چاقو مارا۔ چیتے کے پیٹ میں اتر گیا۔

اس کا خیال تھا کہ چیتے کے ... کا سانس رک جائے گا لیکن چیتے کے دانت اس کی
گردن تک آ گئے ۔۔۔ کسی کے پاس ... اور اس طرف ... کی لہر۔

تھا اس کو اپنی حالت کا احساس ہوا اور کرنی ... اس کو اپنے اندر ایک برقی لہر محسوس ہوئی اور اس کے جسم سے
پیرو ... ہو ... جیسے ... جنگل میں ... گئی تھی اور ... بجلی ہو جاتی تھی

"یا علی ۔۔۔!"

آسمان کے گنبدوں، پہاڑوں کی چوٹیوں، آبشار کی لہروں، غاروں کی گہرائیوں ۔۔۔ ندیوں، ... سے
گونجتی ہوئی مدد کے لیے پکار سارے میں پھیل گئی۔

نعرے کے ساتھ اس نے چیتے کو جسم پر سے پھینک دیا اور جس طرح دبا ہوا پہلوان اکھاڑے میں غیر متوقع طور پر اوپر آ جاتا
ہے، چیتا نیچے تھا اور بوڑھا اوپر۔

اس کا چاقو والا ہاتھ پھر بلند ہوا۔

مردود!

لعین!

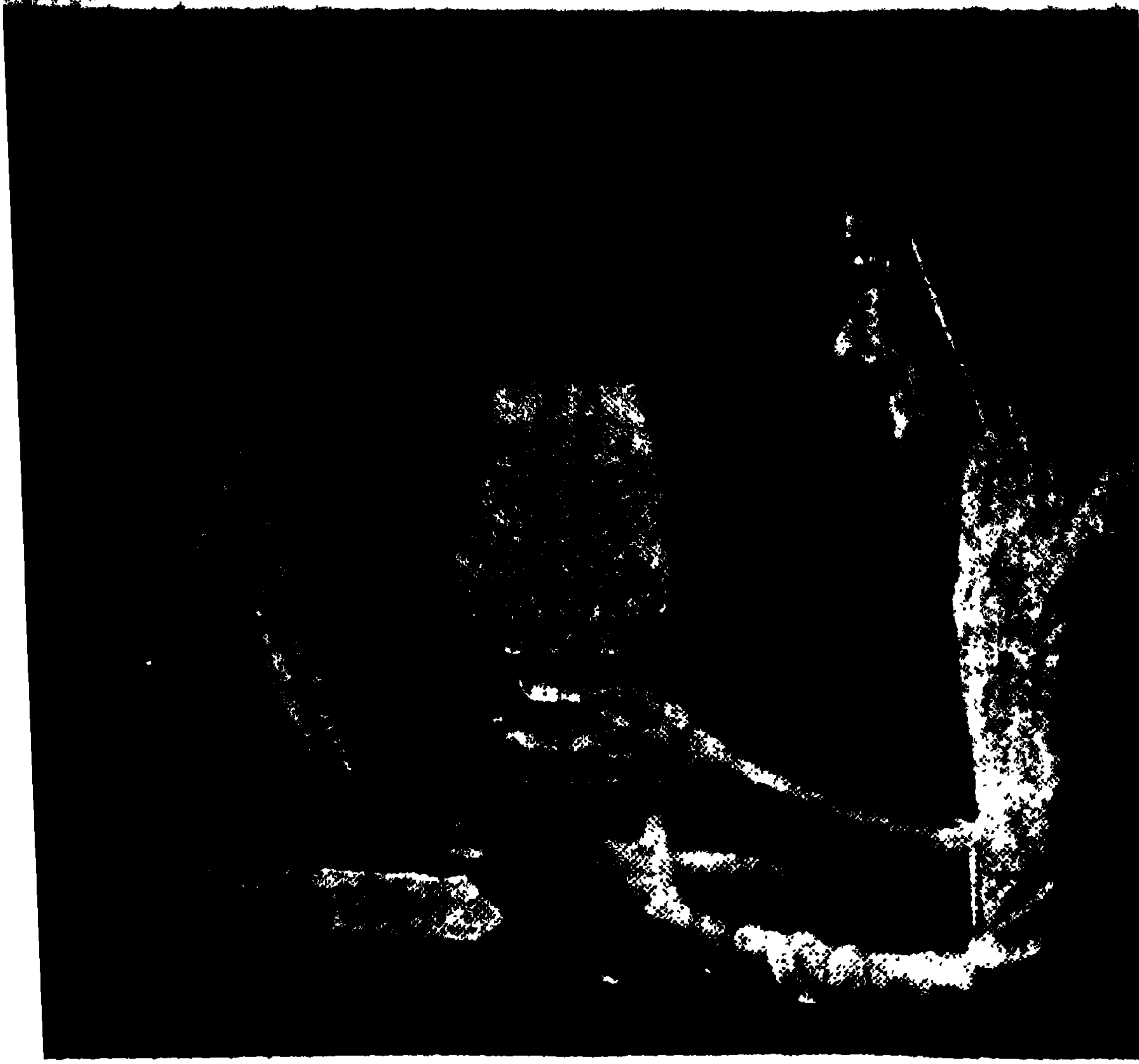
کرنجی!

لیکن اس کا دوسرا ہاتھ اب تک چیتے کے منہ میں تھا ۔۔۔ چیتے نے بلا کی ایک پھرتی کی جھرجھری لی اور ایک خوفناک گرج
کے ساتھ اس کا منہ کھل گیا۔

ہر شخص نے پنجہ باہر کھینچنا چاہا لیکن درد کا ایک ریلا آیا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

اور بہت دنوں بعد جب کوہ پیماؤں کی ایک جماعت اُدھر سے گزری تو انھوں نے دیکھا کہ برف کے شیشے میں دو ڈھانچے پڑے ہیں ——!

ان میں سے ایک نے جو بے شمار جنگلی جانوروں کا شکار کر چکا تھا کہا، کہ اتنا بڑا درندہ میں نے آج تک نہیں دیکھا۔
اور اتنا بہادر انسان! —— اس کے دوسرے ساتھی نے کہا جس کے بال برف کی طرح سفید تھے اور جو اس بات کی تحقیق کر رہا تھا کہ انسان کی قوتِ برداشت کی حد کیا ہے —— کائنات میں آدمی کا کیا مقام ہے؟



ہماری کتابیں

نبی اُمیؐ عمر ابو النصر قیمت تین روپے	**خدیجہؓ** عبد المجید زہراوی قیمت چار روپے	**خالدؓ** عباس محمود العقاد قیمت چار روپے
عرب کے تین مدبر عمر ابو النصر قیمت تین روپے	**مضامین جمال الدین افغانی** نیا اڈیشن قیمت پانچ روپے	**ہماری داستانیں** سید وقار عظیم قیمت پانچ روپے
صاحب محمد طفیل مدیر نقوش قیمت تین روپے	**باغ و بہار** سید عبد الحمید عدم کی تازہ غزلوں کا نیا مجموعہ ہر غزل سرور و کیف سے معمور قیمت دو روپے آٹھ آنے	**اندازے** فراق گورکھپوری قیمت پانچ روپے
انتقاد سید عابد علی عابد قیمت تین روپے		**بھابی** شوکت تھانوی قیمت چار روپے آٹھ آنے
نمک مرچ شوکت تھانوی قیمت تین روپے	**نیلوفر** شوکت تھانوی قیمت چھ روپے	**غزالہ** شوکت تھانوی قیمت چھ روپے
قول و قرار سید عبد الحمید عدم قیمت دو روپے آٹھ آنے	**روزن** قتیل شفائی قیمت تین روپے	**پیچ و خم** سید عبد الحمید عدم قیمت تین روپے

ادارہ فروغ اردو، لاہور